اس آیت میں صراحت کے ساتھ اللہ کی خوشنودی کو جنت اور اس کی نعمتوں سے بڑی چیز قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آخرت کی تمام کامیابیوں اور نعمتوں کی اصل اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی ہی ہے اور بندہ مومن کو جنت اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی رضامندی کا گھر ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے) اس ٹکڑے کی تشریح بخاری و مسلم کی حدیث میں موجود ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو پکارے گا اے اہل جنت! وہ کہیں گے ہم حاضر ہیں اور خیر کی تمام کائنات تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اللہ کہے گا کیا تم راضی خوش ہوگئے۔ وہ کہیں گے، پروردگار! بھلا ہم کیوں راضی نہ ہوں جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا کر دیا جو اپنی کسی مخلوق کو عطا نہیں کیا۔ اللہ فرمائے گا کیا میں تم کو اس سے بہتر شے عطا نہ کروں۔ وہ کہیں گے۔ پروردگار! اس سے بہتر چیز اور کیا ہوگی؟ تو اللہ فرمائے گا میں تمہیں اپنی دائمی خوشنودی عطا کرتا ہوں اب اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔"

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ واہلہا)

انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس پر اللہ کی پرستش اور اطاعت واجب ہے۔ وہ زندگی کے تمام مطالبات و معاملات میں اس کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا مکلف ہے۔ دنیا میں اس کی زندگی کا یہی مقصد اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے تاکہ وہ آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کرسکے۔ کار خلافت کی انجام دہی اور اقامت دین کی جدوجہد کا بھی آخری مقصود یہی ہے کہ آخرت میں وہ اپنے مالک کے سامنے سرخ رو ہو، مالک اپنے بندے سے خوش ہو اور اس کو اپنے فضل و کرم سے نوازے۔

اس مسئلے پر ابھی قرآن و احادیث کی مزید نصوص اور پیش کی جاسکتی ہیں لیکن جتنا کچھ لکھا جاچکا ہے اس سے بھی پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی کو محض ذریعہ اور وسیلہ قرار دے کر اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو گھٹانا ایک غلط نقطہ نظر ہے جو قرآن و حدیث کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

اس تفصیل کے بعد آپ کے سوالات کا الگ سے جواب دینے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن آپ کے مزید اطمینان خاطر کے لیے مختصر جوابات دے رہا ہوں۔

۱۔ رضائے الٰہی حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کی نظر میں وفادار، فرماں بردار اور اس کے فضل و کرم کا مستحق ثابت ہوجائے۔

۲۔ قیامت میں مومن صالح کی سرخ روئی، اس کے چہرے کی تر و تازگی، اطمینان قلب، اپنے رب کے سامنے سجدہ ریزی اور فرشتوں کی طرف سے سلام اور جنت کی خوش خبری قیامت میں رضائے الٰہی حاصل ہونے کے حسی مظاہر ہیں اور جنت بھی دراصل رضائے الٰہی کا حسی مظہر ہی ہے اور سب سے بڑھ کر دیدار الٰہی اسی کا حسی مظہر ہوگا۔ اس سب سے (باقی [illegible] پر)

رام پور

طلاق نمبر

فی پرچہ
3.50

سالانہ 12/-

ماہنامہ "زندگی" رام پور کا آئندہ شمارہ

پانچواں کُل ہند اجتماع نمبر ہوگا

جو ان شاء اللہ مندرجہ ذیل تفصیلات کے ساتھ جنوری کے دوسرے ہفتہ میں شائع ہو گا۔

- **خطبۂ صدارت** مولانا محمد یوسف صاحب، امیر جماعت اسلامی (ہند)
- **رپورٹ** از اجتماع حیدر آباد تا اجتماع دہلی (تلخیص) جناب افضل حسین صاحب سکریٹری جنرل
- **مقالات** مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی — پروفیسر نجات اللہ صدیقی صاحب

ہماری کوشش ہو گی کہ اس خاص نمبر میں

- **تقاریر** مولانا سید حامد علی صاحب، مولانا عبد العزیز صاحب، پروفیسر نجات اللہ صدیقی صاحب
- **روداد اجتماع طلبہ** اور اس میں شیخ ابراہیم التحاوی (مصر) اور مولانا سید حامد علی صاحب کی تقریر
- **روداد اجتماع متفقین** اور اس میں مولانا سراج الحسن صاحب کی تقریر
- **روداد اجتماع خواتین** اور اس میں قیصر بیگم نیازی صاحبہ کی تقریر
- **روداد اجتماع معلمین** اور اس میں مولانا سید حامد علی صاحب کی تقریر

یا

ان تقاریر کی تلخیص شائع کریں

اس کے علاوہ اس خاص نمبر میں غیر ممالک سے آئے ہوئے مندوبین کے نام، تعداد اور ان کی تقاریر کی تلخیص مولانا مودودی کا خط اور شرکاء اجتماع کے نام ان کا پیغام، غیر مسلم پریس کے اجتماع پر موافقانہ اور مخالفانہ تبصرے، شرکاء کی تعداد حلقہ وار — غرض اجتماع سے متعلق تمام تفصیلات ہوں گی۔

ریکارڈ میں رکھنے کے قابل اس نمبر کی قیمت صرف پانچ روپیہ (-/5) ہو گی
سالانہ چندہ -/5 بھیجنے والوں کو یہ نمبر ان کے چندے ہی میں پیش کیا جائے گا

ایجنٹ حضرات کے لیے خصوصی کمیشن — ایجنٹ صاحبان تعداد سے مطلع فرمائیں

منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور یوپی

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
غیر ممالک سے		ہندوستان سے -/12
ہوائی ڈاک سے		پاکستان سے -/12
۲ ڈالر		ششماہی
		ہندوستان سے -/6
		پاکستان سے -/6
		قیمت طلاق نمبر 3/50

طلاق نمبر

ماہنامہ رامپور

زندگی

(مدیر:۔ سید احمد قادری)

شمارہ: ۱، ۲	ذی الحجہ و محرم ۹۳-۹۴ھ مطابق جنوری و فروری ۱۹۷۴ء	جلد: ۵۲

اشارات	سید احمد قادری	۲
مقالات		
تین طلاقوں کا مسئلہ		۹
تطلیقات ثلاثہ	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۲۱
تطلیقات ثلاثہ کا مسئلہ	مولانا محفوظ الرحمٰن	۳۱
مسئلہ طلاق سے متعلق مسلم شریف کی ایک حدیث	سید احمد قادری	۵۰
تطلیقات ثلاثہ کا مسئلہ	مولانا شمس پیرزادہ	۵۹
ایک مجلس میں تین طلاق	مولانا سید حامد علی	۸۲
ایک مجلس میں تین طلاق کے مسئلے پر سیمینار		۱۴۸
مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی تقریر کے چند اقتباسات		۱۵۰
اسلامک ریسرچ سنٹر کے تین سوالات		۱۵۱

اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن مطبع نا علم پریس بازار نصر اللہ خاں رامپور
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی۔ رام پور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ماہناموں کے خاص نمبر عوام و خواص دونوں ہی حلقوں میں پہنچتے ہیں اس لیے جو کچھ ان میں شائع کیا جاتا ہے وہ لوگوں کی اچھی خاصی تعداد میں پھیل جاتا ہے۔ ایک خالص دینی و فقہی موضوع پر سمینار منعقد کر کے جس طرح احمد آباد کے اسلامک ریسرچ سنٹر نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے اسی طرح ماہنامہ زندگی تین یک جائی طلاقوں کے مسئلے پر یہ خاص نمبر شائع کر کے ایک اچھی مثال قائم کر رہا ہے۔

جس مسئلے پر یہ نمبر شائع کیا جا رہا ہے وہ ایک نازک مسئلہ ہے وہ ایک نازک مسئلہ ہے اس کے بارے میں موافق و مخالف بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چند باتوں کی وضاحت کر دی جائے تاکہ اس مسئلے پر نمبر شائع کرنے کا محرک اور مقاصد سامنے آجائیں۔

(۱) میں نے دسمبر ۷۳ء کے شمارے میں "احمد آباد سمینار" کے عنوان سے ایک مختصر روداد شائع کی تھی اس میں لکھا تھا کہ اس سمینار کے متفقہ بیان کی حیثیت فتوے کی نہیں ہے اور اب پھر واضح کرتا ہوں کہ اس متفقہ بیان کی حیثیت نہ کسی حتمی و قطعی فیصلے کی ہے اور نہ فتوے کی، بلکہ اس کی غرض یہ تھی کہ اہل علم کو ایک ایسے مسئلے پر غور و فکر کی دعوت دی جائے جس پر "متجددین" اعتراضات کرتے ہیں اور اس مسئلے کو ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں جیسے علماء نے اسے اپنے جی سے گھڑ لیا ہے۔ اس کے علاوہ ناواقفی کی بنا پر تین یک جائی طلاقوں کے عام استعمال نے ہر مسلمان ملک میں بہت سے خاندانوں کو متاثر کر دیا ہے۔ "زندگی" کے اس خاص نمبر کا محرک و مقصد بھی یہی ہے جو مقالات شائع کیے جا رہے ہیں ان

کی حیثیت محض اظہار رائے کی ہے کسی قطعی فیصلے اور فتوے کی نہیں ہے۔ ان مقالات کی اشاعت کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بحث و نزاع کا کوئی نیا دروازہ کھولا جائے۔

(۲) اس نمبر کی اشاعت کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جنھوں نے باضابطہ فقہ کی تعلیم حاصل نہیں ہے اس مسئلے کی حقیقت اور دلائل سے اجمالی طور پر واقف ہوں اور انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ شریعت نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ کیا بتایا ہے۔ صحیح طریقہ نہ جاننے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے مسلم معاشرے میں طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ علماء نے مختلف ذرائع استعمال کر کے عوام کو کسی حد تک نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج کے مسائل سے تو واقف کرایا ہے لیکن نکاح و طلاق اور اس طرح کے دوسرے معاشرتی مسائل سے انہیں واقف کرانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ضرورت ہے کہ نماز روزے ہی کی طرح کم سے کم اجمالی حد تک عوام کو معاشرتی مسائل سے بھی واقف کرایا جائے۔

(۳) اس خاص نمبر میں جو مقالات شائع کیے جا رہے ہیں ان کی زیادہ تعداد میں یہ نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے کہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ہر حال میں ایک شمار کیا جانا چاہیے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کے سمینار میں شرکت کی دعوت زیادہ تر ایسے ہی علماء نے قبول کی اور شریک ہوئے جو اس نقطہ نظر کو ترجیح دیتے ہیں یا مصلحت وقت کے تقاضے سے ترجیح دینے لگے ہیں۔

میں نے سمینار میں جو مقالہ پڑھا تھا وہ بھی اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے اس مقالے میں مخالف نقطہ نظر کے دلائل سے میں نے قصداً کوئی تعرض نہیں کیا تھا لیکن دوسرے مقالات میں فاضل مقالہ نگاروں نے اپنے مخالف نقطہ نظر کے دلائل پر بھی چاہے بحثیں کی ہیں اور تردید کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب مختصراً اس پر اظہار خیال کیا جائے۔

میں نے ان مقالات میں جو باتیں محسوس کی ہیں انہیں اس غرض سے یہاں پیش کر رہا ہوں کہ مقالہ نگار حضرات ان پر غور فرمائیں۔

(الف) ان مقالات میں جن میں تین یک جائی طلاقوں کو ہر حال میں ایک شمار کرنے کا نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے مسلم شریف کی اس روایت سے بھی مقالہ نگاروں نے استدلال کیا ہے جو بواسطہ طاؤس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ــــ اس روایت پر میرا ایک مضمون "مسئلہ طلاق سے متعلق مسلم شریف کی ایک حدیث" کے عنوان سے اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ درخواست ہے کہ مقالہ نگار

حضرات اس مضمون کو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پڑھیں۔

(ب) اپنے مقالات میں جن لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو ان کا اجتہاد قرار دیا ہے انھوں نے شاید غور نہیں کیا ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے تین یکجائی طلاقوں کے ایک ہونے کو قرآن و حدیث دونوں ہی کے لحاظ سے "منصوص" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ یہ مسئلہ "اجتہادی" ہے۔ یہ دونوں باتیں کس طرح صحیح ہوں گی؟ بعض مقالہ نگاروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "تین طلاقوں کے بارے میں قرآن مجید کی جو آیت ہے وہ اس باب میں "نص قطعی" ہے کہ طلاق مغلظہ اس وقت واقع ہوگی جبکہ تین طلاقیں یکے بعد دیگرے مختلف مجلسوں میں واقع کی جائیں گی" انھوں نے مسند امام احمد کی وہ حدیث بھی پیش کی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا تھا اور پھر اسی کے ساتھ وہ اس مسئلے کو "اجتہادی" بھی لکھتے ہیں اور حضرت عمر کے فیصلے کو ان کا اجتہاد قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں جس مسئلے کے بارے میں قرآن کی "نص قطعی" اور حدیث دونوں موجود ہوں وہ "اجتہادی" کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا نص قرآنی اور ارشاد نبوی کے خلاف فیصلہ کرنے کا نام "اجتہاد" ہے؟

میرا خیال ہے کہ اپنے پسندیدہ نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے جوش میں اس تضاد پر غور کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ اب اس پر غور فرما لیا جائے۔

(ج) بعض مقالہ نگاروں نے ایک مصری مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب "عمر الفاروق" کی چند عبارتوں کا ترجمہ پیش کیا ہے محمد حسین ہیکل نے محض اپنے عقلی قیاسات کی بنیاد پر فیصلہ فاروقی کے اسباب بتانے کی کوشش کی ہے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے جو اسباب بتائے ہیں کیا ان میں کوئی معقولیت بھی ہے؟ پہلا سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ عراق و شام کی بکثرت کنیزیں مدینہ منورہ میں آگئی تھیں، مدینہ اور جزیرۃ العرب کے لوگ ان پر فریفتہ تھے ان کنیزوں کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے اپنی بیویوں کو بعجلت تین طلاقیں دینی شروع کر دیں تاکہ ان کی محبوب کنیزوں کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اب ان کے دلوں پر تنہا قابض ہیں ــــ اس سے قطع نظر کہ یہ بے ہودہ بات بالکل بے ثبوت ہے سوال یہ ہے کہ کیا خود حضرت عمرؓ نے ان کنیزوں کی پاسداری میں یہ فیصلہ

کر دیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوں گی تاکہ ان کنیزوں کو جلد سے جلد یہ اطمینان ہو جائے کہ اب وہ اپنے آقاؤں کے دلوں پر تنہا قابض ہیں؟ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر بالفرض اس وجہ سے لوگ بکثرت ایک ہی مجلس میں اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دینے لگے تھے تو انہیں ایک ہی شمار کرنا چاہیے تھا تاکہ اس ظلم کا کچھ تو سدِ باب ہو سکتا جو طلاق دینے والے اپنی بیویوں پر کرنے لگے تھے یعنی جو چیز تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کا سبب بن رہی ہے اس کو محمد حسین ہیکل نے تین طلاقیں قرار دینے کا سبب بنا ڈالا ہے۔

دوسرا سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ "جب کوئی شخص کسی آزاد عربی یا عجمی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ یہ شرط پیش کرتی تھی کہ مرد اپنی پہلی بیوی کو تین طلاقیں دے دے تاکہ وہ اس کے لیے حلالہ کے بغیر حلال ہی نہ ہو سکے" اس سے قطع نظر کہ یہ بھی ایک بے ثبوت دعویٰ ہے۔ سوال پھر یہی ہے کہ یہ چیز تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کا سبب بن سکتی ہے یا تین طلاقوں کو تین قرار دینے کا؟ دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ اگر لوگ ایک مجلس میں تین طلاقیں بکثرت اس لیے دینے لگے تھے کہ وہ جلد سے جلد اپنی بیویوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور دوسری پسندیدہ عورتوں سے شادی رچالیں تو انہیں تین قرار دے کر نافذ کر دینا طلاق دینے والوں کی خواہش کے مطابق فیصلہ ہوگا یا اس کو ان کے لیے سزا قرار دیا جائے گا؟ پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ حضرت عمر نے طلاق دینے والوں کو سزا دینے کے لیے مجلس واحد کی تین طلاقوں کو تین قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جو لوگ اس طرح کی لاطائل باتیں لکھتے ہیں ان کو محسوس کرنا چاہیے کہ وہ حضرت عمرؓ کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں یا ان پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔

(د) بعض مقالات میں مفسرین کی طرف باتیں منسوب کرنے میں احتیاط نہیں برتی گئی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ تفسیروں میں ان لوگوں کی طرف سے بھی دلائل پیش کیے گئے ہیں جو آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ تین طلاقیں الگ الگ تین وقتوں میں دینا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور تینوں طلاقیں بیک وقت دے دی جائیں تو یہ غیر شرعی طلاقیں ہوں گی اور نافذ نہ ہوں گی بلکہ ایسی صورت میں صرف ایک طلاق واقع ہوگی۔ مقالہ نگار نے اس طرح کی عبارتوں کو خود ان مفسرین کی رائے قرار دیدیا ہے جس سے وہ لوگ دھوکے میں مبتلا ہوں گے جنھوں نے وہ تفسیریں خود نہیں پڑھی ہیں۔ ایک مقالے میں امام رازی کی تفسیر سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے: - ثم القائلون اختلفوا علی قولین الاول هو [illegible]

کثیر من علماء الدین انہ لو طلقہا اثنتین او ثلٰثا لا تقع الا واحدۃ وھذا القول ھو الاقیس

فاضل مقالہ نگار نے تفسیر رازی میں پوری بحث پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور غالباً "وھذا القول ھو الاقیس" کا جملہ پڑھ کر لکھ دیا کہ امام رازی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی بات انھوں نے تفسیر نیشاپوری اور تفسیر مظہری کی طرف منسوب کر دی حالانکہ ان مفسرین میں کوئی ایک بھی اس رائے کو ترجیح نہیں دیتا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا چاہیے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ نے تو ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین ہونے پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔ لکنھم اجمعوا علی ان من قال لامراتہ انت طالق ثلٰثا یقع ثلٰثا بالاجماع پھر جہاں انھوں نے اپنے موقف کے دلائل بیان کیے ہیں وہاں لکھا ہے:۔ والحجۃ لنا السنۃ والاجماع (تفسیر مظہری جلد اتحت آیت الطلاق مرتان) یہاں مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ مقالہ نگار نے ان مفسرین کی طرف رائے کے انتساب میں سخت بے احتیاطی برتی ہے

(۵) بعض مقالہ نگاروں نے لفظ "مرتان" کی تفسیر میں متعدد حنفی علماء کے حوالے دیے ہیں یہ حوالے اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں جیسے وہ علماء بھی اس رائے کے حامی ہیں جو مقالہ نگار کی ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

الطلاق مرتان کی تفسیر کرنے والے مفسرین اور علماء چار گروہوں میں تقسیم ہیں۔ ایک گروہ علمائے شیعہ کا ہے، ان کی رائے میں اس آیت نے تین طلاقیں بہ تفریق دینا لازمی قرار دے دیا ہے اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے اور جو چیز شرعاً حرام ہو وہ معتبر اور نافذ نہیں ہو سکتی اس لیے اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالے تو وہ طلاقیں لغو اور باطل ہوں گی اور ایک طلاق بھی واقع نہ ہوگی دوسرا گروہ امام شافعی اور ان کے متبعین کا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں مرتان کا لفظ 'اثنتان' کے معنے میں ہے۔ تین طلاقیں بہ تفریق تین طہر میں دینا بہتر ہے لیکن یکجائی تین طلاقیں حرام و معصیت نہیں ہیں بلکہ مباح ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور طلاق دینے والا گنہگار بھی نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا یہ فعل خلاف اولیٰ ہوگا۔

تیسرا گروہ امام ابن تیمیہ اور ان کے ماننے والوں کا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت نے بہ تفریق تین طلاقیں دینا ضروری قرار دیا ہے۔ کوئی شخص ایک طہر میں ایک ہی طلاق دے سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالتا ہے تو ان تین کو ایک شمار کیا جائے گا اور ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔

چوتھا گروہ حنفی مفسرین اور فقہاء کا ہے ان کی تفسیر یہ ہے کہ اس آیت نے بہ تفریق طلاق دینے کی ہدایت کی ہے۔ "مرّتان" کے معنے مرّۃ بعد مرّۃ کے ہیں اور احادیث نے بیک دفعہ تین طلاقیں دینے کو معصیت قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں یا بیک کلمہ تین طلاقیں دے دے تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور وہ گنہگار ہوگا۔ حنفی مفسرین اور فقہاء اور شافعی مفسرین اور فقہاء اس بات پر تو متفق ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں لیکن وہ اس فعل کے معصیت ہونے پر متفق نہیں ہیں شوافع 'مرتان' کو 'اثنتان' کے معنے میں لیتے ہیں اور حنفیہ اس کو مرّۃ بعد مرّۃ کے معنے میں لیتے ہیں اور اپنی اس تفسیر کو اپنے موقف کی دلیل بناتے ہیں چنانچہ امام نسفی مدارک التنزیل میں لفظ 'مرتان' کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں:- وھو دلیل لنا فی ان الجمع بین الطلقتین والثلاثۃ بدعۃ فی طھر واحد۔ یہ درحقیقت امام شافعی اور ان لوگوں کا جواب ہے جو بیک مجلس تین طلاقوں کو مباح قرار دیتے ہیں۔

جو لوگ تین یکجائی طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں وہ فقہائے احناف پر یہ تنقید تو کر سکتے ہیں کہ جب آپ لوگ تین یک جائی طلاقوں کو ہدایت قرآنی کی خلاف ورزی اور معصیت سمجھتے ہیں تو پھر ان کا اعتبار کر کے انہیں واقع کیوں قرار دیتے ہیں۔ فقہائے احناف کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اعتراض اور تنقید کا جواب دیں اور انھوں نے جواب دیا بھی ہے لیکن لفظ 'مرتان' کی جو تشریح وہ کرتے ہیں اس کو ایسے انداز میں پیش کرنا کہ جیسے وہ بھی تین یک جائی طلاقوں کو ایک قرار دینے کی حمایت کر رہے ہیں، کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

جو لوگ تین یکجائی طلاقوں کو ہر حال میں ایک قرار دیتے ہیں ان سے گفتگو کے نکات یہ ہیں: ایک یہ کہ جب آپ کے نزدیک بھی ایک مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالنا حرام اور معصیت ہے تو ایسی طلاقوں کو آپ شیعوں کی طرح بالکل لغو اور باطل کیوں نہیں قرار دیتے۔ سوال یہ ہے کہ معصیت کا ارتکاب کے ساتھ ساتھ ایک طلاق بھی کیوں واقع ہوگی؟ اگر آپ حدیث کا حوالہ دیں گے تو پھر گفتگو حدیث کے میدان میں ہونی چاہیے۔ گفتگو کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا ہر اس قول کو جو منکر اور معصیت ہو اسلامی شریعت نے

لغو، باطل اور بے اثر قرار دیا ہے؟ اپنی بیوی کو اگر کوئی شخص ماں کہہ دے تو قرآن نے اس کو منکر اور جھوٹ کہا ہے لیکن ظہار کو گناہ اور حرام ہونے کے باوجود اس نے باطل اور بے اثر قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس سے ایک شرعی حکم وابستہ کیا ہے ایسی جھوٹی بات کہنے والے کو بھی اس نے بیوی کی قربت سے اس وقت تک روک دیا ہے جب تک وہ کفارہ ادا نہ کرے۔ بلاشبہ قرآن نے جاہلیت کے خیال کو رد کر دیا ہے لیکن اس نے ظہار کو باطل اور بے اثر قرار نہیں دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز گناہ ہونے کے باوجود شرعاً مؤثر ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ جب جھوٹی بات بولنے کا اثر مترتب ہوتا ہے تو "تین طلاق" بولنے کا اثر کیوں مترتب نہ ہوگا جبکہ وہ جھوٹ بھی نہیں اور مرد کو طلاق کے استعمال کا حق بھی دیا گیا ہے اس میں معصیت کا پہلو صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ اس نے طریقہ استعمال میں شرعی تعلیم کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ مختصر اشارہ غور و فکر کے لیے پیش کیا گیا ہے ورنہ اس پر تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

(د) اس سلسلے میں متعدد احادیث ایسی ہیں جن کو بعض محدثین و علماء ضعیف قرار دیتے ہیں اور بعض ان کو ضعیف نہیں کہتے۔ مثال کے طور پر ابو داؤد نے طاؤس کے واسطے سے یہ روایت کی ہے کہ ابو الصہباء نے حضرت ابن عباس سے غیر مدخول بہا عورت کے بارے میں یہ سوال کیا تھا کہ عہد رسالت، عہد صدیقی اور ابتدائے عہد فاروقی میں ایسا تھا یا نہیں کہ تین طلاقیں ایک ہوتی تھیں اور حضرت ابن عباس نے ان کی تصدیق کی تھی کہ ہاں ایسا ہی تھا۔ ابو داؤد کی اس روایت کو ابن قیم نے صحیح قرار دیا ہے اور نووی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ، دارقطنی اور طبرانی کی یہ حدیث کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے حضور سے سوال کیا۔

"اگر میں تین طلاقیں دے دیتا تو کیا پھر بھی مجھے رجوع کا حق رہتا؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں اس صورت میں بیوی تم سے جدا ہو جاتی اور تم گنہگار ہوتے۔"

اس حدیث کو ابن قیم نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن ہمام نے اس کی صحت کی دلیل دی ہے۔ اس صورت حال میں کسی ایک نقطہ نظر کو ترجیح دینے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ بحیثیت مجموعی کس کے دلائل زیادہ قوی اور تسلی بخش ہیں۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ ہر شخص اس محدث یا امام کا قول پیش کر دیتا ہے جو اس کے اپنے پسندیدہ نقطہ نظر کی تائید میں ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ تحقیقی نہیں خالص تقلیدی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا یہ چند باتیں بہت اختصار کے ساتھ اس لیے پیش کی گئی ہیں (باقی صفحہ [illegible] پر)

تین طلاقوں کا مسئلہ

(سید احمد قادری)

نکاح وطلاق سے متعلق قرآن کی آیات اور احادیث کا جو مطالعہ میں نے کیا ہے اس سے یہ بات بوضاحت ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت میں نکاح ایک بہت ہی سنجیدہ، بنیادی اور قابلِ احترام معاملہ ہے جو اس لیے کیا جاتا ہے کہ باقی رہے۔ یہاں تک کہ موت زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ میاں بیوی کے درمیان یہ ایک ایسا رشتہ ہے جس کے استحکام پر خاندان اور معاشرے کا استحکام اور جس کی خوبی اور بہتری پر معاشرے کی خوبی وبہتری موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ اور ناخوشگوار عمل ہے جو بدرجۂ مجبوری، آخری چارۂ کار کے طور پر ہی کیا جانا چاہیے۔ آخری انقطاع سے بچنے یا سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کرنے کے لیے صحیح طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت وبیک مجلس وبیک کلمہ نہ دی جائیں بلکہ انہیں متفرق طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ تعلیم قرآن کی آیتوں میں اجمال اور احادیث میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ میرے مطالعۂ قرآن وحدیث سے بظنِ غالب یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص صحیح طریقے کی خلاف ورزی کر کے، یہ جانتے ہوئے کہ تین طلاقیں بیک وقت دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں بیک مجلس، یا بیک کلمہ تین طلاقیں دے ڈالے تو وہ واقع ہو جاتی ہیں ——— یہی جمہور امت کا مسلک ہے اور دلائل کے اعتبار سے یہی مسلک قوی بھی ہے۔ امت کے جو ائمہ وعلماء ایسی تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں، بلاشبہ ان کے پاس بھی دلائل ہیں لیکن مجھے ان سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا — اس مختصر مقالے میں تمام موافق ومخالف دلائل کو استقصار کے ساتھ جمع کرنے کا وقت نہیں ہے اس لیے میں جمہور کے مسلک کے دلائل اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اس مسلک کے مخالف دلائل کی

طرف محض اشارے کیے جاسکیں گے۔

آیت طلاق کی شان نزول

جاہلیتِ عرب میں طلاقیں دینے اور پھر عدت میں رجوع کر لینے کی کوئی حد و تعداد متعین نہ تھی۔ ایک عورت کو سیکڑوں بار طلاقیں دی جاسکتی تھیں اور پھر عدت میں رجوع کیا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ستانا چاہتا تو اس کو طلاقیں دے دے کر عدت ہی میں رجوع کر لیا کرتا۔ نہ خود اس سے تعلقات زن و شو قائم رکھتا اور نہ اس کو آزاد کرتا اس طرح وہ عورت بالکل مجبور اور بے بس ہو کر رہ جاتی تھی۔ ابتدائے اسلام میں جب تک طلاقوں کے متعلق اللہ کا حکم نہیں آیا تھا، یہی دستور باقی تھا۔

مالک عن ھشام بن عروۃ	عروہ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں یہ رسم تھی
عن ابیہ انہ قال کان الرجل	کہ مرد جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو عدت
اذا طلق امراتہ ثم ارتجعھا قبل	ختم ہونے سے پہلے اس کو رجوع کر لینے کا حق
ان تنقضی عدتھا کان ذالک	تھا اگرچہ وہ ایک ہزار بار طلاق دے۔ نبی
لہ وان طلقھا الف مرۃ فعمد	صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص
رجل الی امراتہ فطلقھا حتی	نے اپنی بیوی کو طلاق دی یہاں تک کہ جب
اذا شارفت انقضاء عدتھا	اس عورت کی عدت ختم ہونے کا وقت قریب
راجعھا ثم طلقھا ثم قال	آیا تو اس نے رجوع کر لیا اور پھر طلاق دی
واللہ لا اویک الی ولا تحلین	اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بخدا نہ میں
لی ابدا فانزل اللہ تعالی	تجھے اپنے پاس آنے دوں گا اور نہ تو کبھی
" الطلاق مرتان فامساک	میرے لیے حلال ہوگی تو اللہ نے یہ آیت
بمعروف او تسریح	نازل کی۔ طلاق (رجعی) ہے دو بار تک
باحسان	اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے، یا
(موطا مالک ج ۲ باب جامع الطلاق)	چھوڑ دینا بھلی طرح سے۔

اللہ تعالیٰ نے طلاق کی تعداد متعین کر دی اور رجعت کی حد بھی بتا دی یعنی یہ کہ طلاقوں کی تعداد

صرف تین ہے اور رجعت کا حق دو طلاقوں تک ہے۔ تیسری کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ — پھر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار) تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ آیت، طلاقوں کی تعداد تین تک محدود کرنے اور رجوع کرنے کی حد تعین کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ یہی دو باتیں بہ نص صریح اس سے ثابت ہوتی ہیں۔

طلاق دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

اس سوال کا کوئی تفصیلی جواب اس آیت میں موجود نہیں ہے۔ "مرتان" کے لفظ سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دو طلاقیں بیک کلمہ نہ دی جائیں بلکہ "میں نے تجھے طلاق دی' میں نے تجھے طلاق دی" دو بار کہا جائے۔ تفریق مجلس کے لیے اس میں کوئی محتمل لفظ بھی موجود نہیں ہے محدث ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی یہی تفسیر اختیار کی ہے اور امام رازی نے بھی اسی تفسیر کی تائید کی ہے۔ یعنی یہ کہ لفظ "مرتان" سے رجعی طلاق کی تعداد معلوم ہوتی ہے۔ تفریق مجلس کا ثبوت اس میں نہیں ہے۔ سورۃ الطلاق کی آیت فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ (پس انہیں طلاق دو عدت پر اور ان کی عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو) سے بھی صرف اتنا بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ طلاق ایسی حالت میں دی جائے کہ عدت کے زمانے میں کمی یا زیادتی واقع نہ ہو اور اس کو شمار کرنا بھی آسان اور متیقن ہو۔ طلاق دینے کا ٹھیک اور صحیح طریقہ کیا ہو اس کا جواب اس آیت میں موجود نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم طلاق دینے کے صحیح طریقے کی توضیح نہ فرماتے تو قرآن کی آیتوں سے اس کا بصراحت جاننا ممکن نہ ہوتا۔ ہم حدیث نبوی ہی سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا یا بیک دفعہ تین طلاقیں دے ڈالنا معصیت ہے اصل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں جماع نہ کیا گیا ہو۔ اگر احادیث سے قطع نظر کرلی جائے تو قرآن کی آیتوں سے طلاق دینے کا تفصیلی طریقہ معلوم نہیں ہوتا۔

بیک مجلس یا بیک کلمہ تین طلاقیں، تین واقع ہوں گی یا ایک؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے بھی ہمیں سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ قرآن سے اتنی بات تو بہ صراحت معلوم ہوتی ہے کہ طلاق رجعی کی تعداد دو ہے اور تیسری طلاق کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا لیکن طلاق دینے کا صحیح طریقہ وضاحت کے ساتھ ہمیں احادیث سے معلوم ہوتا ہے البتہ قرآن سے اشارۃً یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو تین طلاقوں کا جو حق دیا ہے اگر وہ اس کو بیک دفعہ استعمال کرے تو یہ فعل طلاق دینے والے کی اپنی مصلحت کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنے حق رجعت کو ختم کر دے گا۔ یہ اشارہ سورۃ الطلاق کی اس آیت سے نکلتا ہے۔

لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ　　تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ
بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا　(الطلاق: ۱)　　(صلح و موافقت) کی کوئی صورت پیدا کر دے

اگر بیک مجلس تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنے باقی رہتے ہیں کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کر دے۔ کیونکہ تین کو ایک شمار کرنے کی صورت میں تو بہر حال رجعت کا حق اور موافقت کی صورت باقی ہی رہے گی۔

قرآن کا یہ فقرہ طلاق دینے والے کو متنبہ کرتا ہے کہ اگر تم نے طلاق دینے کا پورا حق ایک ہی بار استعمال کر لیا تو پچھتاؤ گے اور پھر بیوی سے صلح کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔

قرآن سے اشارۃً بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ بیک مجلس یا بیک کلمہ دی ہوئی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی بلکہ بعض ائمہ نے تو بیک مجلس تین طلاقیں دے ڈالنے کو جائز قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ نے "من جوز الطلاق الثلث" کے باب میں سب سے پہلے الطلاق مرتان والی آیت دلیل کے طور پر پیش کی ہے۔

اس مسئلے کا تفصیلی جواب حاصل کرنے کے لیے ہم مجبور ہیں کہ احادیث نبوی اور آثار صحابہ کا مطالعہ کریں۔ اس ماخذ سے ہمیں یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں یا بیک کلمہ، خواہ طہر کی حالت ہو یا حیض کی ــــ تین طلاقیں دے ڈالے تو تین ہی واقع ہوں گی اور وہ گنہگار ہوگا۔ ہم ذیل میں اس کی تھوڑی سی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے ۔ یہ حدیث دو سبب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ ایک یہ کہ عہد رسالت کا غالباً یہ پہلا واقعہ ہے جس کی وجہ سے ہمیں ایقاع طلاق کا صحیح طریقہ معلوم ہوا ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس واقعہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رض نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دے دی ۔ سیدنا عمر رض دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ۔ آپ نے ان سے فرمایا : عبداللہ کو حکم دو کہ وہ مراجعت کرلیں پھر حضور نے ایقاع طلاق کا صحیح طریقہ بتایا اور وہ یہ ہے کہ " تین طلاقیں بہ تفریق تین طہروں میں دی جائیں ۔ حضرت عبداللہ کے حالت حیض میں طلاق دینے اور حضرت عمر کے سوال سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ان دونوں جلیل القدر صحابیوں میں سے کسی نے بھی قرآن کی کسی آیت سے یہ نہیں سمجھا کہ حالت حیض میں طلاق دینا ایک غلط کام ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کی اگر کوئی شخص خلاف ورزی کرے تو اس کا حکم کیا ہوگا ؟ اس حدیث میں اس سوال کا صریح جواب موجود ہے ۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ حدیث متعدد طرق سے روایت کی ہے ۔ ایک ٹکڑے میں تو واقعہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ذکر ہے اور دوسرا ٹکڑا یہ ہے :۔

قال فکان ابن عمر اذا	راوی حدیث نے کہا (اس واقعہ کے
سئل عن الرجل طلق امراتہ	بعد) جب ابن عمر سے کسی ایسے شخص کے بارے
وھی حائض یقول اما انت	میں سوال کیا جاتا جس نے اپنی بیوی کو حالت
طلقتھا واحدۃ او اثنتین	حیض میں طلاق دی ہو تو وہ کہتے اگر تو نے
فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو رسول اللہ
وسلم امرہ ان یراجعھا ثم	صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا ہے کہ
یمھلھا حتی تحیض حیضۃ	مراجعت کرے اور اس کو مہلت دے یہاں
اخری ثم یمھلھا حتی تطھر	تک کہ دوسرا حیض آجائے پھر اس کو مہلت
ثم یطلقھا قبل ان یمسھا	دے یہاں تک کہ وہ طاہر ہو جائے پھر اسے

واما انت طلقتها ثلثا فقد	کو طلاق دے اس سے پہلے کہ اس طہر میں
عصیت ربك فیما امرك به	اس سے جماع کرے اور اگر تو نے تین
من طلاق امراتك وبانت	طلاقیں دے دی ہیں تو اپنے رب کی تو
منك — وفی روایۃ اخری	نے نافرمانی کی طلاق کے معاملے میں اور
وان كنت طلقتها ثلاثا	وہ تجھ سے جدا ہوگئی۔ دوسری روایت
فقد حرمت علیك حتی	میں ہے اگر تو نے اس کو تین طلاقیں دی
تنكح زوجا غیرك	ہیں تو وہ تجھ پر حرام ہوگئی۔ یہاں تک کہ
وعصیت الله فیما امرك	تیرے سوا کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے
من طلاق امراتك	اور تو نے اللہ کی نافرمانی کی طلاق کے
	معاملے میں۔

حضرت ابن عمرؓ کے اس مفصل فتوے کو امام بخاری نے بھی اپنی صحیح کی تعلیقات میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث سے بصراحت و وضاحت معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص حالت حیض میں بھی اپنی بیوی کو بیک دفعہ تین طلاقیں دے تو وہ طلاق بائنہ ہوگی اور بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ابن عمرؓ لوگوں کو یہ مسئلہ بتاتے رہے اور فتویٰ دیتے رہے۔ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی صحابی کا ایسا قول جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو مرفوع کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابن عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے ایسا فتویٰ دیا ہو اور بلانکیر دیتے رہے ہوں جن اتفاق سے احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ فتویٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی بنیاد پر دیا کرتے تھے۔ مصنف ابن شیبہ دارقطنی اور طبرانی میں ہے۔

فقلت یارسول الله ارایت	(ابن عمر کہتے ہیں) میں نے کہا، یا
لو طلقتها ثلاثا كان یحل	رسول اللہ اگر میں تین طلاقیں دے دیتا تو
لی ان ارجعها فقال لا كانت	کیا میرے لیے مراجعت حلال ہوتی؟ آپ نے
تبین منك وكانت معصیۃ	فرمایا نہیں، وہ تم سے جدا ہو جاتی اور تمہارا
	تین طلاقیں بیک دفعہ دے دینا گناہ کا کام ہوتا

۲۔عویمر عجلانی کی طویل حدیثِ لعان تمام کتب حدیث میں مروی ہے۔امام بخاریؒ نے اس کو "من جوز الطلاق الثلٰث" کے باب میں روایت کیا ہے۔اس حدیث کے آخر میں ہے :۔

فلما فرغا قال عویمر کذبت علیھا یارسول اللہ ان امسکتھا فطلقھا ثلثا قبل ان یامرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	پس جب دونوں (یعنی عویمر اور ان کی بیوی) لعان سے فارغ ہوئے تو عویمر نے کہا اگر میں اس کو اپنے پاس روک لوں تو جھوٹا ہوں۔پھر انھوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اس سے پہلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں۔

یہاں میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ نفس لعان سے میاں بیوی میں فرقت واقع ہوجاتی ہے یا تفریق حاکم کی ضرورت پڑتی ہے۔دیکھنا صرف یہ ہے کہ حضرت عویمرؓ نے حضور کے سامنے بیک مجلس تین طلاقیں دیں آپؐ نے نہ اس پر انکار کیا اور نہ یہ کہا کہ تین طلاقیں دینا لغو ہے۔کیونکہ فرقت صرف لعان سے واقع ہوجاتی ہے' بلکہ آپ نے تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

عن ابن شہاب عن سھل قال فطلقھا ثلث تطلیقات عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانفذہ رسول اللہ ؐ (ابوداؤد)	سہل نے کہا کہ عویمر نے تین طلاقیں حضورؐ کے سامنے دیں۔پس حضورؐ نے ان کو نافذ فرمادیا۔
(۳)عن عائشۃ رضی اللہ عنھا ان رجلا طلق امرأتہ ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتحل للاول قال لاحتی یذوق عسیلتھا کما ذاق الاول	حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں پھر اس نے دوسرے مرد سے نکاح کیا۔پھر اس نے بھی (قبل جماع) طلاق دیدی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا اب یہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہے آپ نے فرمایا نہیں جب تک دوسرا

بھی اسی طرح اس کا مزا نہ چکھے جس طرح
پہلے نے چکھا تھا۔

امام بخاری نے یہ حدیث بھی من جوز الطلاق الثلث کے باب میں روایت کی ہے۔ اس حدیث سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ تین یکجائی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس واقعہ تک یہ مسئلہ اتنا مشہور و معروف ہو چکا تھا کہ حضور ﷺ کی طرف مراجعت کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ بلاشبہ اس حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ اس شخص نے بیک مجلس تین طلاقیں دی تھیں یا بتفریق دی تھیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام بخاری کا اس حدیث کو من جوز الطلاق الثلث کے باب میں روایت کرنا بے وجہ ہے؟ اس کے علاوہ حدیث کے الفاظ سے تبادر یہی ہوتا ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت دی گئی تھیں۔

(۴) ان رجلا جاء الی عبد اللہ	ایک شخص عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس
ابن مسعود فقال انی طلقت	آئے اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں
امرأتی ثمانی تطلیقات فقال	دی ہیں۔ ابن مسعود نے فرمایا اس کے
ابن مسعود فماذا قیل لک قال	بارے میں تم سے کیا کہا گیا۔ اس نے جواب
قیل لی انها قد بانت منک	دیا مجھ سے کہا گیا کہ وہ عورت تجھ سے جدا
فقال ابن مسعود صدقوا هو	ہوگئی۔ انھوں نے فرمایا لوگوں نے سچ
مثل ما یقولون (موطا مالک)	کہا یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا لوگ کہتے ہیں

اس حدیث سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ یہی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت تمام اہل فتویٰ یہی فتویٰ دیتے تھے۔

۵۔ نعمان بن ابی عیاش انصاری، عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے اس شخص کے بارے میں مسئلہ پوچھنے کے لیے آئے جو اپنی بیوی کو قبل مباشرت سے پہلے تین طلاقیں دے چکے تھے۔ عطاء کہتے ہیں کہ اس موقع پر میں نے کہا کہ باکرہ کی طلاق تو ایک

فقال لی عبد اللہ بن عمرو	پس عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے
بن العاص انما انت قاص الواحدة	مجھ سے کہا تم محض قصہ گو ہو۔ ایک طلاق

تبينها والثلث تحرمها حتى تنكح زوجا غيره (موطا مالك)

اس کو جدا کر دے گی اور تین طلاقیں اس کو حرام کر دیں گی جب تک وہ عورت دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے

(٦) محمد بن ایاس بکیر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو مباشرت سے پہلے تین طلاقیں دے دیں پھر اس کی رائے ہوئی کہ اس سے نکاح کرے وہ فتویٰ لینے کے لیے آیا اور میں اس کے ساتھ گیا۔

فسال عبد الله بن عباس وابا هريرة من ذالك فقالا، لا نرى ان تنكحها حتى تنكح زوجا غيرك قال فانما كان طلاقى اياها واحدة فقال ابن عباس انك ارسلت ما كان لك من فضل (موطا مالك)

اس نے ابن عباس اور ابو ہریرہ سے اس کے بارے میں پوچھا ان دونوں نے کہا تم اس سے اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتے جب تک وہ تمہارے سوا کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے۔ اس نے کہا میں نے دراصل اس کو ایک طلاق دی تھی۔ ابن عباس نے کہا تمہیں جو اختیار تھا تم نے اپنے ہاتھ سے کھو دیا

(٧) ان رجلا قال لعبد الله بن عباس انى طلقت امراتى مائة تطليقة فما ذا ترى على فقال له ابن عباس طلقت منك بثلث وسبع وتسعون اتخذت بها آيت الله هزوا (موطا مالك)

ایک شخص نے ابن عباس سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں آپ کے خیال میں مجھ پر کیا چیز عائد ہوتی ہے۔ ابن عباس نے کہا وہ تین طلاقوں کے ذریعے تجھ سے آزاد ہو گئی اور ستانوے طلاقوں کے ذریعے تم نے اللہ کی آیتوں سے استہزا کیا۔

(٨) عن مالك بن الحارث قال جاء رجل الى ابن عباس فقال ان عمى طلق امراته ثلثا فقال له ان عمك عصى الله فاثمه الله

مالک بن الحارث نے کہا کہ ایک شخص ابن عباس کے پاس آیا اور کہا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں کہا تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور شیطان کی

واطاع الشیطن فلم یجعل له مخرجا (شرح معانی الآثار طحاوی)	اطاعت کی پس اللہ نے اس کے لیے مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی
(۹) عن انس قال لا تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ (طحاوی)	حضرت انسؓ نے تین یکجائی طلاقوں کے بارے میں فرمایا اس کے لیے حلال نہیں جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔
(۱۰) وروی وکیع عن الاعمش عن ابی حبیب عن ابی ثابت قال جاء رجل الی علی بن ابی طالب فقال انی طلقت امراتی الفا فقال له علی بانت منک بثلاث (محلی)	ابوثابت سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت علی کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں آپ نے فرمایا وہ تین طلاقوں سے بائن ہوگئی
(۱۱) روی وکیع ایضا عن معاویۃ ابن ابی یحیی قال جاء رجل الی عثمان بن عفان فقال طلقت امراتی الفا فقال بانت منک بثلث (طحاوی)	وکیع نے معاویہ بن ابی یحیی سے یہ روایت کی ہے کہ ایک شخص حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں انھوں نے کہا وہ تین طلاقوں سے جدا ہوگئی

(۱۲) نفیع حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکاتب یا غلام تھے انھوں نے اپنی بیوی کو جو حرہ (آزاد) تھیں دو طلاقیں دے دیں پھر رجوع کرنا چاہا تو ازواج مطہرات نے ان کو حکم دیا کہ پہلے حضرت عثمان سے مسئلہ پوچھ لیں انھوں نے حضرت عثمان سے فتویٰ طلب کیا تو انھوں نے فرمایا تمہاری بیوی تم پر حرام ہوگئی۔ (موطا امام مالک)

ان احادیث نبوی و آثار صحابہ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں یا بیک کلمہ تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں۔ ان احادیث و آثار کی سندوں پر اور اس مسئلے کی تفصیلات پر لمبی چوڑی بحثیں اس مختصر مقالے میں سما نہیں سکتیں اور ان بحثوں کا اعادہ مفید بھی نہیں کیونکہ صدیوں سے اس کا سلسلہ جاری ہے اور مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔

موجودہ حالات میں راقم الحروف کے نزدیک قابل غور بات یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین

اور تین کو ایک قرار دینے والے دونوں مسلکوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کتنی گنجائش نکل سکتی ہے اور
کس حد تک یہ دونوں مسلک ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔ دونوں مسلکوں کے دلائل اور
اس مسئلے کی تمام بحثوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دونوں مسلکوں کے ماننے والوں
میں افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس مجلس مذاکرہ کے لیے جو سوالات قائم کیے گئے ہیں
ان کے جواب میں راقم نے اپنے مطالعہ اور حقیر علم کی حد تک افراط و تفریط سے بچکر اپنی رائے
پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں سوالات و جوابات نقل کیے جا رہے ہیں۔

سوال ۱: کیا محض طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرانے سے یعنی بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق
کہہ دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں جبکہ طلاق دینے والا شخص کہتا ہو کہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی

جواب ۱: اگر تین بار طلاق کا لفظ دہرانے والا کہتا ہے کہ اس کی نیت ایک طلاق کی تھی۔ مزید
دو بار طلاق کا لفظ اس نے تاکید کے لیے استعمال کیا تھا تو میرے نزدیک ایک طلاق رجعی واقع ہوگی

سوال ۲: کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دیتا ہے لفظ تین کی صراحت کے ساتھ لیکن وہ کہتا
ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تین کا لفظ جب تک استعمال نہ کیا جائے طلاق واقع ہوتی ہی نہیں۔ اس صورت میں
تین طلاقیں واقع ہوں گی یا ایک؟

جواب ۲: میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور موجودہ صورت حال کے پیش نظر میں اس نتیجہ پر پہنچا
ہوں کہ اگر طلاق دینے والے نے اس خیال کے تحت تین کی صراحت کے ساتھ طلاق دی ہے کہ اس
کے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جانا چاہیے۔

سوال ۳: کیا ایک مجلس کی تین طلاقوں کے منعقد ہونے پر اجماع ہے؟ اگر نہیں تو ان علماء اور فقہاء
کے نام تحریر فرمائیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔

جواب ۳: ایک مجلس کی تین طلاقوں کے منعقد ہونے پر اجماع کا دعویٰ بھی چلا آرہا ہے اور اس
کا انکار بھی۔ ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اساطین امت نے اس پر اجماع کا انکار کیا ہے اور
اب تو اہل حدیث حضرات کی کثیر التعداد جماعت بھی اس پر اجماع کا انکار کرتی ہے۔ اختلاف مسالک بتانے
[illegible]
[illegible]

ان الطلاق بلفظ الثلاث	لفظ سے جو طلاق دی جاتی ہے اس کا حکم
حکمه حکم الطلقة الثالثة	تیسری طلاق یعنی طلاق مغلظہ کا ہے اور
وقال اهل الظاهر وجماعة	اہل ظاہر اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اس
حکمه حکم الواحدة ولا تاثیر	کا حکم ایک طلاق کا حکم ہے اور اس میں لفظ
للفظ فی ذالك (بداية المجتهد ج کتاب الطلاق)	کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔

خود قاضی ابن رشد کا اپنا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم ایک ہی طلاق کا ہونا چاہیے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مغلظہ ہونے پر اجماع کا دعویٰ محل نظر ہے۔

سوال ۲: آپ کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقوں کے مسئلے کا کیا حل ہے؟ اسے ایک شمار کیا جانا چاہیے یا تین؟

جواب: جیسا کہ میں اوپر مقالے میں واضح کر چکا اگر کوئی شخص جان بوجھ کر بیک مجلس اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے تو تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ میرے نزدیک تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کی جتنی گنجائش نکل سکتی ہے اس کا ذکر میں نے سوال ۱ اور ۲ کے جواب میں کیا ہے۔ جو لوگ یہ جان کر اور سمجھ کر کہ بیک دفعہ وبیک کلمہ تین طلاقیں دے ڈالنے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، تین طلاقیں دے ڈالیں۔ ایسے لوگوں کی دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص تین طلاق دینے کی نیت سے "میں نے طلاق دی، میں نے طلاق دی، میں نے طلاق دی" کہے تو یہ تین طلاقیں ہوں گی ان کو ایک قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

طلاق کے بارے میں ایک قابل اصلاح خیال

معلوم نہیں کس طرح یہ جاہلانہ خیال پھیل گیا ہے کہ جب تک تین بار طلاق طلاق طلاق کے الفاظ نہ بولے جائیں یا جب تک تین طلاق کا لفظ استعمال نہ کیا جائے اس وقت تک طلاق نہیں پڑتی۔ یہ ایک غلط اور جاہلانہ خیال ہے اس کو صحیح کر لینا چاہیے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر ایک بار بھی کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے تو طلاق پڑ جاتی ہے اور اگر شوہر عدت میں رجوع نہ کرے تو عدت ختم ہونے کے بعد نکاح ختم ہو جائیگا اور بیوی جدا ہو جائے گی۔ ایک طلاق بھی بیوی کو علیحدہ کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے بیک وقت دو یا تین طلاقیں دینا سخت نادانی کا کام ہے

تطلیقاتِ ثلاثہ

(از سعید احمد اکبر آبادی)

اسلام میں طلاق کی تین قسمیں ہیں ۔ (۱) رجعیہ جس میں عدت گذرنے سے پہلے پہلے مطلِّق اپنے قول یا عمل سے طلاق واپس لے سکتا ہے ۔ (۲) طلاق بائنہ جس میں مطلق عدت ختم ہونے کے بعد تجدید نکاح کر سکتا ہے ۔ (۳) اور طلاق مغلّظہ اس میں مطلِّق حلالہ کے بغیر تجدید نکاح نہیں کر سکتا۔ اس وقت موضوع بحث یہی تیسری طلاق ہے۔ اس لیے ہم اس پر ہی گفتگو کریں گے ۔ اس طلاق مغلظہ کا حکم قرآن مجید کی حسب ذیل آیات سے بطریق نص ثابت ہے

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (البقرہ)	طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے) وہ تو دو ہی مرتبہ ہے ۔ اس کے بعد یا تو معروف کے ساتھ عورت کو روک لیا جائے یا احسان کے ساتھ چھوڑ دیا جائے ۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ)	اگر دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد پھر ایک طلاق اور دے دی تو اب جب تک کسی اور سے نکاح نہیں کرے گی وہ پہلے مرد کے لیے حلال نہیں ہوگی ۔

ان آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ طلاق مغلظہ اس وقت واقع ہوگی جبکہ مرد آگے پیچھے دو طلاق دینے کے بعد یہ فیصلہ کر لے کہ اسے اب عورت کو اپنی زوجیت میں نہیں لینا ہے اور اس فیصلہ کے مطابق وہ ایک

طلاق اور واقع کر دے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگر کوئی شخص آگے پیچھے نہیں بلکہ تین طلاقیں ایک ساتھ واقع کرے گا تو اس کا یہ فعل قرآن کے مذکورہ بالا حکم کے خلاف ہو گا۔ چنانچہ ایک حدیث جس کی اسناد امام مسلم کی شرط پر ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک ساتھ دے دی ہیں تو آپ غیظ و غضب کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظھرکم — کیا ابھی جبکہ میں تم لوگوں میں موجود ہوں کتاب اللہ سے اس طرح کھیلا جائے گا۔

علاوہ ازیں مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں اور پھر ان کو اس کا شدید غم اور صدمہ ہوا تو آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا۔ "تم نے طلاق کس طرح دی؟" رکانہ نے جواب دیا "میں نے تین طلاقیں دی ہیں۔" آپ نے پھر دریافت فرمایا۔ "کیا ایک مجلس میں؟" انھوں نے جواب دیا۔ "جی ہاں، ایک مجلس میں"۔ اب آپ نے فرمایا:۔

فانما تلك واحدة فارجعها — تو یہ تو ایک ہی طلاق ہوئی، تم اسے واپس لے لو

رکانہ کا بیان ہے کہ اس ارشادِ نبوی کے مطابق میں نے رجوع کر لیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اسی روایت کی روشنی میں حضرت عبداللہ ابن عباس کی رائے یہی تھی کہ طلاق ایک ساتھ نہیں بلکہ طہر میں الگ الگ ہونی چاہیے[1] اور یہی طلاق سنت بھی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی اور حضرت عمر کے ابتدائی دو برس تک تین طلاقیں جو ایک مجلس میں اور دفعۃً دی جائیں ان کا حکم یہی تھا کہ وہ ایک سمجھی جاتی تھیں لیکن اپنی خلافت کے دو برس گذرنے کے بعد حضرت عمر نے مذکورہ بالا تینوں طلاقوں کو تین طلاق یعنی طلاق مغلظہ ماننے کا حکم صادر فرما دیا۔ کیوں؟ حضرت عبداللہ بن عباس اس فیصلہ میں خود حضرت عمر کے الفاظ نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

ان الناس قد استعجلوا فی امر کان لھم فیہ اناۃ — وہ چیز جس میں (قرآن و سنت کے مطابق) لوگوں کے لیے سوچنے کا موقع تھا

[1] مسند امام احمدؒ تبویب شیخ ساعاتی جلد ۱۷ صفحہ ۷

فلو امضیناہ علیھم — اس میں انھوں نے بڑی جلد بازی سے کام لیا ہے پس بہتر ہے کہ ہم ان پر اپنا حکم نافذ کریں

(مسند احمد ج ۱ ص ۷)

حضرت عمر کا یہ قول نقل کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ فامضاہ علیھم چنانچہ حضرت عمر نے یہ حکم نافذ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے اس ارشاد سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو گئی کہ حضرت عمر کا یا اقدام بے وجہ نہیں تھا بلکہ لوگوں نے کسی وجہ سے ایک راہ جلد بازی کی اختیار کر رکھی تھی جو سر تا سر قرآن وسنت کے منشاء و مقصد کے خلاف تھی۔ اس بنا پر حضرت عمر نے ان لوگوں کو متنبہ کرنے کے خیال سے یہ اقدام فرمایا تاکہ انہیں محسوس ہو کہ اس جلد بازی کے باعث انھوں نے کس طرح شریعت کے یسر کو اپنے لیے عسر بنا لیا ہے اور اس باب میں ان کا حال ان بنی اسرائیل کا سا ہو گیا ہے جن کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ اللہ کی سب کھانے کی چیزیں ان لوگوں کے لیے حلال تھیں مگر جب انھوں نے خود اپنے اوپر بعض چیزیں حرام کر لیں تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا۔ اب رہی یہ بات کہ وہ وجہ آخر کیا تھی جس کے باعث حضرت عمر کے زمانے میں لوگوں نے جلد بازی کی راہ اختیار کی تھی؟ اس سوال کے جواب میں عہد حاضر کے مشہور اور بلند پایہ مصنف محمد حسین ہیکل اپنی معرکۃ الآرا کتاب عمر الفاروق میں لکھتے ہیں۔" غالب گمان یہ ہے کہ عہد فاروقی میں جو لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے وہ طلاق دینے کے بعد ان سے شفقت اور نرمی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عراق و شام کی کنیزیں بکثرت آ گئی تھیں اور مدینہ اور جزیرۃ العرب کے لوگ ان پر فریفتہ تھے اور اپنی من موہنیوں کو خوش کرنے کے لیے بیویوں کو بعجلت و شدت بیک لفظ تین طلاقیں دینے لگے تاکہ ان کی محبوبہ کو اطمینان ہو جائے کہ اب وہ ان کے دل پر تنہا قابض ہے اس کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی تھے جن کے باعث صدر اول کے مسلمانوں کی ایک جماعت نے طلاق ثلاثہ کو ازراہ بے پرواہی و ایذا رسانی ایک کھیل بنا لیا تھا ان میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرد کسی آزاد عربی یا عجمی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ یہ شرط پیش کرتی تھی کہ مرد اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تاکہ وہ اس کے لیے حلالے کے بغیر حلال ہی نہ ہو سکے۔ اب اگر حلالے کے بعد شوہر اپنی پہلی بیوی سے مراجعت کرتا بھی تھا تو اس سے گھر میں ایسی بدمزگی پیدا ہوتی تھی کہ زندگی

اجیرن بن جاتی تھی۔ غرض کہ اس قسم کے اسباب تھے جن کے باعث حضرت عمرؓ نے یہ حکم جاری کیا کہ جو طلاقیں بیک مجلس میں اور دفعۃً واحدۃً دی جائیں گی ان کا حکم طلاق مغلظہ ہونے میں وہی ہو گا جو ان تین طلاقوں کا ہے جو طلاق سنت کے مطابق تین طہروں میں دی گئی ہو۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ جو شخص نکاح کی گرہ کو اتنا بے حقیقت سمجھتا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالتا ہے وہ بے حد اور یاوہ گو انسان ہے اور اسے اس بے حسی اور یاوہ گوئی کی سزا ملنی چاہیے[1]

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے جو کچھ لکھا ہے بالکل صحیح ہے اور اس سے خود حضرت عمرؓ کے مذکور بالا قول کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک ایک اور چیز بھی ہے جو اس موقع پر پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ سے بہ سند صحیح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

"میرے پاس جب کبھی محلل اور محلل لہٗ لائے جائیں گے میں ان دونوں کو رجم کر دوں گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عرب سوسائٹی میں تحلیل کا رواج ہوتا جا رہا تھا اور اسی رواج کے زیر اثر لوگوں نے عجلت پسندی کی راہ سے بیک وقت تین طلاقیں دینے کا طریقہ اختیار کر لیا ہو گا۔ اور ظاہر ہے یہ رواج معاشرے میں جنسی بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط کا ایک ایسا ہی بڑا ذریعہ بن سکتا ہے جیسا کہ متعہ۔ اس بنا پر جس طرح حضرت عمرؓ نے متعہ قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے اسی طرح طلاق کی کثرت اور اس کے اثرات مابعد سے جو صورت حال پیدا ہوتی جا رہی تھی اس کے انسداد کی شکل یہ نکالی کہ ایک طرف ایک ہی مجلس میں اور دفعۃً دی گئی تین طلاقوں کا حکم طلاق مغلظہ قرار دے دیا اور دوسری جانب تحلیل کو بالکل ممنوع اور حرام قرار دیا۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔ زواج المحلل حرام بالجماعۃ الصحابۃ[2] اور شیخ محمد عبدہٗ لکھتے ہیں:۔

"ان نکاح التحلیل شر من المتعۃ واشد فسادا وعارا"[3]

حضرت عمرؓ کا یہ اقدام ایک سخت قسم کی معاشرتی خرابی کو روکنے کے لیے ایک ایسا ہی اجتہاد تھا جیسا کہ ان کے دوسرے اجتہادات تھے۔ بہر حال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خاص مسئلہ زیر بحث میں حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد کو قبول عام حاصل ہوا اور تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو تسلیم کر لیا اور اس کا

لہ اردو ترجمہ از حبیب اشعر ص ۶۸۳

ٖلہ الفتاوی للشیخ محمد شلتوت ص ۳۰۱ ٖلہ ایضاً

وہی ہو گیا جو اجماع صحابہ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے اور اسی پر ان کا فتویٰ ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ ایک مسئلہ مجتہد فیہا ہے اور اس بنا پر اس بات کی گنجائش ہے کہ سوسائٹی کے حالات بدل جانے یا ایک امرجنسی پیدا ہو جانے کی صورت میں اس پر ازسرِ نو نظر ثانی کی جاسکتی ہے یہ نظر ثانی جن وجوہ اور دلائل کی بنیاد پر ہو سکتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ قرآن مجید میں تین طلاقوں کے بارے میں جو آیت ہے وہ اس باب میں نص قطعی ہے کہ طلاق مغلظہ اس وقت واقع ہوگی جبکہ تین طلاقیں یکے بعد دیگرے مختلف مجلسوں میں واقع کی جائیں۔

۲۔ فامساک بمعروف او تسریح باحسان سے ضمناً تیسری طلاق کے واقع کرنے میں مقصد اور ارادے کا بھی اشارہ نکلتا ہے۔

۳۔ طلاق سے متعلق قرآن مجید میں اور احادیث نبویہ میں جو تصریحات ہیں ان سب کو یکجا طور پر پیش نظر رکھا جائے تو ان سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(الف) طلاق اگرچہ مباح اور مشروع ہے لیکن ابغض المباحات ہے اور نکاح میں اصل اس کی بقا ہے۔

(ب) طلاق اس وقت دی جائے جبکہ شوہر اور بیوی دونوں کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

(ج) لیکن طلاق سے قبل ایک پنچ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کر دینا چاہیے۔

(د) طلاق واقع کرنے سے مرد کا مقصد عورت کو ستانا اور اسے تکلیف دینا نہیں ہونا چاہیے۔

(ہ) طلاق حالت غضب میں نہیں دینی چاہیے۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد ص۲۲۴ میں حضرت عائشہ رضؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق۔ ابو العباس المبرد نے الکامل میں اغلاق کے معنی بیان کیے ہیں۔ تنگ دلی، بے چینی، مجبوری۔ حافظ ابن قیم نے اس کے معنی غضب کے لیے ہیں۔ اس بنا پر اس ارشاد نبوی کا مطلب یہ ہوا کہ غضب اور مجبوری کی حالت میں جو طلاق دی جائے وہ طلاق ہی نہیں ہے۔ چنانچہ امام مالک کا مذہب یہی ہے اور اس کی خاطر انھوں نے جو شدائد برداشت کیے ہیں وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

(و) طلاق کے بارے میں مرد کی نیت کا اعتبار ہونا چاہیے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے "باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ والسکران والمجنون وامرھما والغلط والنسیان فی الطلاق والشرک۔ اور اس کے بعد حدیث "انما الاعمال بالنیات" نقل کی ہے۔

اب ذرا صرف ہندوستان اور پاکستان میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں ہر جگہ آج کل جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کا جائزہ لیجیے وہ حالات یہ ہیں۔

(۱) آج مسلمان عام طور پر طلاق کے مسائل سے ناواقف ہیں۔ اور وہ رجعیہ اور بائنہ اور مغلظہ کے فرق کو نہیں جانتے۔ اس لیے جب کبھی غصہ کی حالت میں ناراض ہو کر یا کسی اور سبب سے بیوی سے ترک تعلق کا اعلان کرنا چاہتے ہیں تو بے تکلف طلاق کا لفظ دو تین مرتبہ بول جاتے ہیں۔

(۲) لیکن جب غصہ فرو ہو جاتا ہے تو ان کو اپنی حرکت پر ندامت ہوتی ہے اور وہ عورت سے زوجیت کا تعلق پھر قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو بتایا جاتا ہے کہ بیوی پر تین طلاقیں پڑ گئی ہیں اور اب وہ حلالہ کے بغیر ان کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔

(۳) حلالہ کرنے اور کرانے والے دونوں پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے اسی لیے مرد اور عورت دونوں میں سے کوئی بھی اس پر آمادہ نہیں ہوتا اور یوں بھی ان کی غیرت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

(۴) شوہر ہزار کہتا ہے کہ مجھ کو نہ طلاق مغلظہ کا حکم معلوم تھا اور نہ میری نیت یہ تھی لیکن اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی اور فیصلہ برقرار رہتا ہے۔

(۵) اس بدنصیب عورت کی جوانی کی عمر ڈھل چکی ہے اسی لیے کچھ اس بنا پر اور کچھ طلاق سے داغدار ہونے کے باعث اب اس کی کہیں شادی بھی نہیں ہو سکتی۔

(۶) اس عورت کے لیے گذر بسر کا ذریعہ یہی ایک نکاح تھا اب جب یہ منقطع ہو گیا تو اس کے لیے معاش کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ جب ایک انسان اس طرح معاش سے مجبور اور تنگ دست ہو جاتا ہے تو پھر اس سے کوئی گناہ مستبعد نہیں ہوتا۔

(۷) علاوہ ازیں یہ معاملہ صرف ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ان پر کیا گذرے گی؟ اور والدین کی باہمی مفارقت کے ان کے دل و

پر نفسیاتی اور اخلاقی اور ذہنی اثرات کیا ہوں گے۔ ارباب نظر پر یہ پوشیدہ نہیں ہے۔ غرضکہ یہ حالات ہیں جنہوں نے مسلم سماج میں ایک عظیم تہلکہ برپا کر رکھا ہے عالم اسلام کی عدالتوں کی روئداد ملاحظہ کیجیے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس طرح کے افسوسناک واقعات کس کثرت سے رونما پیش آرہے ہیں ــــ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ امن و چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر ان کے عشرت کدہ دل تک ان ہزاروں ستم رسیدہ مظلوم انسانوں کی داد فریاد اور آہ و شیون نہیں پہنچ سکتی تو کیا اسلام کے پاس بھی ان کے لیے کوئی مدد نہیں ہے؟ جواب یہ ہے ــــ کہ ہے اور لازمی طور پر ہے۔ خود حضرت عمرؓ کے اقدام سے یہ صاف ظاہر ہے کہ طلاق کے احکام میں اس قدر لچک ہے کہ اسلامی سوسائٹی کے خاص حالات کی اصلاح کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی کسی آیت کے منطوق میں تقیید اور تخصیص کا عمل کیا جا سکتا ہے۔ پس جب یہ ہو سکتا ہے تو اگر کسی زمانۂ مابعد میں کسی اور قسم کے ناگفتہ بہ حالات سماج میں پیدا ہو جائیں اور ان کی اصلاح قرآن کے اصل منطوق کی طرف رجوع کرنے سے ممکن العمل ہو سکتی ہو تو پھر اس راہ کو اختیار کرنا کیوں بدرجہ اولیٰ درست اور انسب نہ ہو گا۔ اس بنا پر طلاق سے متعلق قرآن مجید کی آیات اور مذکورۃ الصدر تنقیحات کے پیش نظر موجودہ معاشرے میں ہمارے نزدیک علمائے مجتہدین کے لیے اس امر کی کافی گنجائش ہے کہ وہ حسب ذیل فیصلے کریں۔

١۔ تین طلاقیں جو ایک مجلس میں ایک ہی لفظ سے دی جائیں وہ ایک طلاق سمجھی جائیں گی اور طلاق رجعیہ ہو گی۔

٢۔ تین طلاقیں جو ایک ہی مجلس میں تین لفظوں سے دی جائیں اور شوہر شدید غضب کے عالم میں ہو اور غصہ فرو ہونے کے بعد وہ یہ کہے کہ میں نے دوسری اور تیسری طلاق کے الفاظ پہلی ہی طلاق کو مؤکد کرنے کے لیے کہے تھے، یا بے سمجھے بوجھے غصہ میں زبان سے نکل گئے تھے اور تین مغلظہ کے حکم سے ناواقف تھا اور نہ اس کا ارادہ تھا۔ تو ان صورتوں میں مرد کی تصدیق کی جائے۔ اسلامی شریعت کی درحقیقت اسپرٹ ہی یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو رشتہ ازدواج کو قائم رکھنے کی تدبیر کی جائے۔ ہاں البتہ جب شوہر نے یہ ٹھان ہی لیا ہے کہ اسے اس رشتہ کو منقطع کر دینا ہے تو اب مجبوری ہے۔

اب آئیے جو حضرات مذکورہ بالا تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں

اور اس کے شدید مخالف ہیں ان کے دلائل کا بھی جائزہ لیں۔ ان حضرات کا سب سے زیادہ زور اس پر ہے کہ حضرت عمرؓ کا حکم اجماع صحابہ کا حکم رکھتا ہے جو قطعی الدلالۃ والثبوت ہوتا ہے اور اسی بنا پر ائمہ اربعہ کا باہم اس میں کوئی اختلاف نہیں ــــــ اس کے جواب میں گذارش یہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتوے کی جلد ۳، ۴ میں اور امام عالی مقام کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمہما اللہ نے اغاثۃ اللهفان الکبریٰ والصغریٰ میں اور پھر اپنی کتاب زاد المعاد اور اعلام الموقعین میں طلاق ثلٰثہ کے مسئلے پر بہت مفصل جامع اور مدلل گفتگو کی ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے۔ مخالف حضرات کے دلائل کا جواب مل جائے گا۔

اجماع صحابہ کی نسبت حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق دونوں طرح کی روایات ہیں۔ بعض میں ہے کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور بعض روایات میں اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ طلاق مغلظہ ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ لیکن زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، عکرمہ، طاؤس، محمد بن اسحاق، فلاس بن عمرو، حارث عکلی، داؤد بن علی اور ان کے اکثر اصحاب، بعض اصحاب مالک، بعض اصحاب حنفیہ، بعض اصحاب احمد بن حنبل ــــــ ان سب کا فیصلہ یہ تھا کہ طلاق ثلٰثہ کا حکم ایک طلاق کا ہے[۱] پس جب صورت حال یہ ہے تو اجماع کا دعویٰ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

علامہ ابن قیم کے مندرجہ بالا بیان سے یہ بالکل واضح ہو گیا کہ درحقیقت حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اجماع نہ عہد صحابہ میں ہوا، نہ عہد تابعین میں، اور عہد تبع تابعین میں۔

چنانچہ حافظ ابن تیمیہ بھی لکھتے ہیں۔ سلف اور خلف میں مالک، احمد بن حنبل اور داؤد وغیرہم کے اصحاب میں ایسے حضرات تھے جو یا تو طلاق ثلٰثہ لغو قرار دیتے تھے یا اس سے ایک طلاق رجعی واقع کرتے تھے اور یہی صحابہ و تابعین سے بھی منقول ہے۔[۲]

پس اول تو یہ دعویٰ کرنا ہی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم پر صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا تھا اور اگر یہ اجماع تھا بھی تو یہ اجماع سکوتی تھا جو مرتبہ میں بہرحال اجماع تقریری سے کم ہوتا ہے

[۱] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۴ تا ۳۲

[۲] فتاویٰ شیخ الاسلام ج ۲ ص ۱۵۱

اور پھر یہ امر بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو اجماعی فیصلہ کسی خاص زمانے میں اس وقت کے مخصوص حالات و ظروف کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔ علماء اصول فقہ کے بیان کے مطابق جب تک وہ زمانے اور اس کے وہ حالات باقی رہیں گے اس وقت تک اجماعی فیصلہ واجب العمل ہوگا لیکن جب وہ حالات بدل جائیں گے تو اب وہ اجماعی فیصلہ واجب العمل نہ رہے گا اور اس کے بجائے نئے حالات اور نئے تقاضوں کی روشنی میں کوئی دوسرا فیصلہ کرنا ہوگا ——— آج مسلمانوں کو یہی صورت حال درپیش ہے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا یہ حالات ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عالمگیر ہیں اور ہر اسلامی ملک کے علماء و مفکرین ان پر غور و خوض کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے فیصلے کیے ہیں۔ چنانچہ مصر جو جامعہ ازہر کے باعث علوم دینیہ و اسلامیہ کا مرکز ہے اور جہاں اکابر علماء اور محققین اسلام ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس کے اجلہ علماء نے اس خاص مسئلہ میں بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ شیخ محمود شلتوت اپنے فتاویٰ میں صاف لکھتے ہیں

الطلاق بالثلاث لا یقع	جو تین طلاقیں ایک مرتبہ دی جائیں ان
الا واحدۃ رجعیۃ ویرد الرجل	سے ایک طلاق رجعی ہی واقع ہوگی اور مرد
زوجہ بکلمۃ الرجعۃ او	کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو واپسی کا لفظ
بالمخالطۃ الخاصۃ [1]	یا مخالطت خاص کے ذریعے واپس لے

علامہ سید رشید رضا اپنی تفسیر المنار میں لکھتے ہیں کہ "بعض فقہا اور دانشوروں نے ہماری حکومت مصر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تین طلاقوں کے مسئلے میں اصل کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا جائے جن کے دلائل کو سب سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد علامہ ابن قیم نے نہایت بسط و تفصیل سے اپنی کتاب اعلام الموقعین، اغاثۃ اللہفان اور زاد المعاد میں بیان کیا ہے اور پھر ان دونوں حضرات کی تائید و موافقت امام شوکانی، سید صدیق حسن اور دوسرے ہندوستانی علمائے متاخرین نے کی ہے [2]

چنانچہ اسی سلسلے میں حکومت مصر نے ایک قانون بنایا جو ۱۰ مارچ ۱۹۲۹ء کو منظور کیا گیا۔

[1] الفتاویٰ ص ۳۰۶

[2] تفسیر المنار ج ۹ ص ۶۸۳

یہ قانون طلاق سے متعلق ہے اور اس میں بہت سی دفعات ہیں۔ اس کی دفعہ ۱۳ یوں ہے :۔

"وہ طلاق جس کے بعد اشارۃً یا لفظاً عدد ہوں ان سے ایک طلاق رجعی ہی واقع ہوگی"[1]

علاوہ ازیں عہد حاضر کے ایک اور جلیل القدر عرب عالم اور مفسر شیخ جمال الدین القاسمی نے نہایت عمدہ کتاب "الاستیناس لتصحیح انکحۃ الناس" کے نام سے لکھی ہے اور اس میں طلاق کے مسئلے پر نہایت مفصل گفتگو کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جو تین طلاقیں دفعۃً واحدۃ واقع کی جائیں ان سے ایک طلاق رجعی ہی واقع ہوگی۔ شیخ نے اس مسئلے پر مبسوط و مفصل گفتگو کے بعد آخر میں جو عبارت لکھی ہے ہم اسے نقل کرتے ہیں اور اسی پر یہ مقالہ ختم کرتے ہیں۔

"اللہ کی قسم دل رنج و الم کے مارے پاش پاش ہوا جاتا ہے اور آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں کہ آج جہالت اور علم دین سے بے خبری کے باعث مسلمانوں کی حالت کیا ہوگئی ہے۔ چنانچہ آج ہماری عدالتیں اور محاکم شرعیہ مظلوم عورتوں کی شکایتوں سے پُر ہوتے ہیں اور حالت یہ ہوگئی ہے کہ شوہر اپنے ظلم و عدوان اور بیویوں کے ساتھ حق تلفی، سخت بے رحمی کا معاملہ کرنے کے باعث اسلام کے لیے ننگ و عار بن گئے ہیں۔ دوسری قومیں یہ سب کچھ دیکھتی ہیں اور ہمارا مذاق اڑاتی ہیں اور اسلام کے ساتھ تمسخر کرتی ہیں۔

ربنا لا تجعلنا فتنۃ للذین کفروا واغفر لنا ربنا انک انت العزیز الرحیم"[2]

---

[1] حیاۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ از شیخ محمد بہجۃ البیطار ص ۵۲

[2] بحوالہ حیاۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ص ۵۷

ـقات ثلثہ کا مسئلہ

(فاضل دیوبند)

(اسلامک ریسرچ سنٹر احمد... ۵ر۶ر نومبر ۷۳ء کو تطلیقات
ثلثہ کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہو ... ـا گیا)

طلاق ثلثہ کے موضوع پر غور وفکر کرنے کے لیے ... ـں ہیں ان پر غور
کرنے کے بعد ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمارے لیے موجودہ حالات ... ـدہ قابل
قبول اور قابل عمل ہے۔

۱۔ کیا تین طلاق کو ایک سمجھنے کا خیال دورِ نبوت سے ہی آرہا ہے اور کیا احادیث میں اس کے لیے کوئی بنیاد موجود ہے یا نہیں؟ اگر اس کی بنیاد ہو اور دور نبوت سے ہی بحث وگفتگو کی گنجائش چلی آرہی ہے تو اب ہمارے لیے اور مسئلوں کی طرح یہاں بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارے معاشرے کے لیے کون سی صورت زیادہ مناسب ہو اس کو اختیار کر لیا جائے۔

۲۔ غور وفکر کی دوسری بنیاد یہ کہ کیا تین طلاقیں ایک ساتھ کوئی محمود اور پسندیدہ شے ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہ ایسی شکل پر غور وفکر کیا جائے جو سنت کے مطابق اور شریعت کے منشا کے عین مطابق ہو

۳۔ غور وفکر کی تیسری بنیاد کیا فقہ حنفی میں اس کی گنجائش ہے کہ امام ابو حنیفہ کے اقوال سے ہٹ کر کسی دوسرے امام یا مجتہد کے قول پر عمل کیا جائے۔

۴۔ غور وفکر کی چوتھی بنیاد ہمارے معاشرتی اور سماجی حالات ہیں کون سی صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہے ... تعاون کی ضرورت کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اس میں معاشرہ کے لیے زیادہ سے زیادہ ... کی ضمانت ہو

لیجیے! اب ہم پہلی بنیاد پر غور کریں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تین طلاق کو ایک شمار کرنے کا خیال لغو و باطل نہیں، بلکہ اس کی بنیاد ہے اور اہل سنت والجماعۃ کا ایک طبقہ ہمیشہ سے اسے تسلیم کرتا آیا ہے اس کے لیے ہم مختصراً چار احادیث نقل کرتے ہیں۔

بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ ابوصہبا نے ابن عباسؓ سے کہا کیا آپ کو معلوم ... طلاقیں دورِ نبوت اور دورِ ابوبکر اور خلافتِ عمر کے ابتدائی سالوں میں ایک ... ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہاں یہ بات مجھے معلوم ہے۔ مسلم ... حاکم بیہقی میں ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضورؐ اور ابوبکرؓ کے زمانے ... کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہی سمجھی جاتی تھی۔ حضرت عمر ... کہ لوگ اس معاملے میں جلد بازی سے کام لینے لگے جن میں ان کے لیے ... ن کو جاری کر دیں۔ سو آپ نے اس کو جاری کر دیا

ابوداؤد کی ... ی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

... ق ثلثا بفم ... واحدۃ

کسی نے اگر ایک ہی جملے سے تین طلاقیں دیں تو وہ ایک ہی رہیں گی۔

مسند احمد جلد اول میں واقعہ مذکور ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور حضورؐ نے ان کو مراجعت کرنے کا اختیار دیا۔ ان احادیث میں سے اگر کوئی حدیث ضعیف بھی ہو یا محل کلام ہو تو اور متعدد طریقوں سے جو مرویات آتی ہیں وہ اس ضعف کی تلافی کر دیتی ہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنوی عمدۃ الرعایۃ جلد دوم صد۷ پر تحریر فرماتے ہیں۔

والقول الثانی انہ اذا طلق ثلثاتقع واحدۃ رجعیۃ وھذا ھو المنقول عن بعض الصحابۃ وبہ قال داؤد الظاہری واتباعہ وھو احد القولین لمالک و بعض اصحاب احمد

دوسرا قول یہ ہے کہ شوہر اگر تین طلاق دے دے تب بھی ایک رجعی پڑے گی۔ اور یہ وہ قول ہے جو بعض صحابہ سے منقول ہے اور داؤد ظاہری اور ان کے متبعین اسی کے قائل ہیں۔ امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام احمد کے بعض اصحاب بھی اسی کے قائل ہیں۔

علامہ عینی عمدۃ القاری شرح بخاری ص۵۳۷ جلد ۹ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

طاؤس، ابن اسحق، حجاج بن ارطاۃ، نخعی، ابن مقاتل اور ظاہر یہ اس طرف گئے ہیں کہ اگر شوہر بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دے تو ایک واقع ہوں گی۔ ان لوگوں نے ابو صہبا کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جو مسلم شریف میں ہے آپ ناموں کی فہرست پر نگاہ ڈالیے یہ حضرات اپنے وقت کے جلیل القدر علماء کی فہرست میں آتے ہیں حضرت طاؤس زبردست فقیہ ہیں۔ محمد بن اسحق امام المغازی ہیں۔ حجاج بن ارطاۃ کوفہ کے مشہور فقیہ ہیں۔ ابراہیم نخعی ابو حنیفہ کے استاد ہیں اور محمد بن مقاتل رازی امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے شاگرد رشید ہیں۔

علامہ عینی کی جو عبارت اوپر منقول ہوئی قریب انہیں الفاظ کے ساتھ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں بھی لکھا ہے۔ امام نووی شارح مسلم نے ص۴۷۸ جلد اول میں بھی قریب قریب وہی الفاظ نقل کیے ہیں نیل الاوطار جلد ۶ ص۲۴۵ پر علامہ شوکانی تحریر فرماتے ہیں۔ اور اہل علم کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ طلاق طلاق کے پیچھے واقع نہیں ہوتی اور ایسی صورت میں صرف ایک طلاق پڑتی ہے۔ صاحب بحر نے اس کو ابو موسے اشعری اور ایک روایت حضرت علی سے اور ابن عباس سے طاؤس، عطا، جابر بن یزید، ہادی، قاسم، ناصر، احمد بن عیسے، عبد اللہ بن موسے بن عبد اللہ اور ایک روایت زید بن علی سے نقل کی ہے اسی طرف متاخرین کی ایک جماعت گئی ہے جس میں علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اور محققین کی ایک جماعت شامل ہے اور ابن المنذر نے اس کو اصحاب ابن عباس، عمرو بن دینار وغیرہ سے نقل کیا ہے اور مشائخ قرطبہ محمد بن لقی، محمد بن عبد السلام وغیرہ کی ایک جماعت کا فتویٰ اس قول پر نقل کیا ہے۔ ابن مغیث نے اس کو عبد اللہ بن مسعود، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں بیان کیا ہے کہ ان کے جد امجد ابو البرکات مجد الدین عبد السلام حرانی بھی کبھی کبھی طلاق ثلثہ کے ایک طلاق رجعی ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر ص۲۴۸ جلد دوم میں هو اختیار کثیر من علماء الدین کا لفظ نقل کیا ہے یعنی یہی مسلک بہت سے علماء دین کا پسندیدہ ہے روح المعانی جلد ۲ ص۱۳۷ پر ہے

خالف فی ذالک الامامیۃ — اس مسئلے میں امامیہ اور بعض اہل سنت
والبعض من اهل السنۃ کالشیخ — والجماعت کے افراد جیسے علامہ ابن تیمیہ اور ان

احمد بن تیمیہ ومن اتبعہ کے متبعین احناف کے خلاف ہیں

امام طحاوی نے بھی معانی الآثار صـ۳۲ جلد ۲ میں ابن عباس کی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے فذھب قوم الی ان الرجل اذا طلق امراتہ ثلثا معًا وقعت علیھا واحدۃ امام طحاوی نے بھی لفظ قوم سے کثیر افراد ہی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں بتلایا ہے کہ ابتداہی سے یہ مسئلہ اجتہادی رہا اور کوئی واقعہ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ حضور تک پہنچا اور آپ نے اس کی آخری شکل متعین فرمادی وہ لکھتے ہیں ھذہ مسئلہ اجتھادیۃ کانت علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یرو فی الصحیح انھا رفعت الیہ فقال فیھا شیئا ۔ ہمارے احناف بھی مثلاً قہستانی اور طحطاوی درمختار صـ۱۰ جلد دوم کے حاشیہ میں اس کو نقل فرماتے ہیں ۔ انہ کان فی الصدر الاول اذا ارسل الثلاث جملۃ لم یحکم الا بوقوع واحدۃ الی زمن عمر رضی اللہ عنہ ثم حکم بوقوع الثلاث سیاسۃ لکثرتہ بین الناس ۔ جامع الرموز صـ۳۲ اور مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر صـ۳۲۸ میں قریب قریب وہی الفاظ ہیں لہٰذا اس کو ترک کر دیا گیا ہے ۔ عصر حاضر کے علماء میں علامہ شبلی نعمانی نے بھی الفاروق میں طلاق ثلثہ کو تین ماننا حضرت عمر کے اولیات میں سے شمار کیا ہے ۔ آخر مسلم شریف ہی میں تو موجود ہے کہ عمر نے اس کو جاری کر دیا اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں تین کا تین سمجھنا عمومی طور سے نہ تھا ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جاری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ۔ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے اس خیال کو کہ تین طلاق لفظ واحد سے ہو تو ایک ہی سمجھی جائے گی اس کی نظیریں لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ شریعت لعان میں چار قسموں کو ضروری قرار دیتی ہے مگر ایک ہی لفظ سے اگر کوئی چار قسمیں کھالے تو ہمارے فقہاء اس کو ناکافی سمجھتے ہیں وہ الگ الگ چار قسموں کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔ اسی طرح اگر شریعت تین طلاق کو مباح کرتی ہے اور ایک جا استعمال کو معصیت بھی بتلاتی ہے تو ضروری ہے کہ ان کو الگ الگ کہا جائے اور ایک جملے سے ادا کی جانے والی تین طلاق کو ایک ہی سمجھا جائے ۔ بالکل اسی طرح جس طرح رمی جمار کے لیے سات کنکریوں کا ہونا ضروری ہے ۔ اگر کوئی ایک دفعہ میں سات کنکریاں مار دے تو وہ ایک ہی سمجھا جائے گا جس طرح کسی نے قسم کھائی کہ وہ حضور پر ایک لاکھ درود شریف پڑھے گا ۔ اب اگر اس نے صلی اللہ علیہ وسلم مائۃ الف کہہ دیا تو یہ ناکافی سمجھا جائے گا بلکہ الگ الگ ایک لاکھ

در دو پڑھنا پڑھیں گے جب جا کر وہ قسم پورا کرنے والا کہلائے گا۔ ہمارے علمار ان قیاسات کو قیاسات مع الفارق بتلاتے ہیں مگران تاویلوں کی حیثیت اتنی قوی نہیں کہ اس میں گفتگو کی گنجائش نہ ہو۔

ان تمام تحریروں پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تین کو ایک کہنے کا خیال بعد کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد دورِ نبوت اور دورِ صحابہ ہی میں ملتی ہے اور اس کے حق میں بھی نقلی اور عقلی دلائل ہیں اور شروع ہی سے علمار اہلسنت والجماعۃ کا ایک طبقہ اسی کو مانتا آرہا ہے لہٰذا طلاق ثلثہ کو ایک باور کرنے کا خیال لغو و باطل نہیں بلکہ اگر اصح نہیں تو صحیح ضرور ہے، راجح نہیں تو مرجوح کہہ لیجیے مگر لغو و باطل نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ غور وفکر کی دوسری بنیاد تھی کہ کیا تین طلاق ایک ساتھ کوئی محمود اور پسندیدہ شے ہے اس کا جواب بالکل نفی میں ہے۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ناپسندیدہ ہی نہیں سخت معصیت کا موجب ہے۔

نسائی میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنکر غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ اَیُلْعَبُ بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جارہا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ اس حرکت پر حضورؐ کے غصہ کی کیفیت دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا کیا میں اسے قتل نہ کردوں۔

امام طحاوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص ابن عباس کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی ہیں انھوں نے جواب دیا

ان عمك عصى الله فاثم　　تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ

واطاع الشیطن　　کا ارتکاب کیا اور شیطان کی پیروی کی۔

عبداللہ بن عمر کے قصے میں دارقطنی اور ابن ابی شیبہ نے جو تفصیل لکھی ہے کہ حضورؐ نے جب عبداللہ بن عمر کی بیوی سے رجوع کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے پوچھا اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا پھر بھی رجوع کر سکتا تھا۔ فرمایا لا کانت تبین منك وکانت معصیة۔ نہیں، وہ تجھ سے جدا ہو جاتی اور یہ فعل معصیت ہوتا۔ علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جو شخص ایسا آتا

جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں اسے وہ مارتے تھے اور اس کی طلاقوں کو نافذ کر دیتے تھے۔ سعید بن منصور نے یہی بات صحیح سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے نقل کی ہے۔ اس معاملے میں صحابۂ کرام کی عام رائے وہ ہے جس کو صاحب فتح القدیر نے جلد ۲ صفحہ ۱۹۶ پر نقل کیا ہے کہ امام محمد نے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ ان الصحابۃ رضی اللہ عنھم کانوا یستحبون ان یطلقھا واحدۃ ثم یترکھا حتی تحیض ثلثۃ حیض۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ آدمی بیوی کو صرف ایک طلاق دے اور اس کو چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اسے تین حیض آ جائیں یہ ابن ابی شیبہ کے الفاظ ہیں خود امام محمد کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ کانوا یستحبون ان لا یزیدوا فی الطلاق علی واحدۃ حتی تنقضی العدۃ ان کو پسند یہ طریقہ تھا کہ طلاق کے معاملے میں ایک سے زیادہ نہ بڑھیں یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے اسی لیے ہمارے فقہائے کرام اس طلاق ثلاثہ کو طلاق بدعی کہتے ہیں ظاہر ہے کہ بدعت کہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ طلاق حدیث سے ثابت نہیں بلکہ وہ مانتے ہیں کہ یہ ثابت ہے صرف موجب عتاب اور معصیت ہونے کی وجہ سے اس کو مغلظہ اور طلاق بدعت کہا جاتا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۴۵ جلد دوم میں فرمایا کہ کرہ ایضا جمع الطلقات الثلاث فی طہر واحد ایک ہی طہر واحد ایک ہی طہر میں تین طلاقوں کا جمع کرنا سخت ناپسندیدہ ہے اور یہ فعل شرعی حکمتوں اور مصالح کو باطل کرنے والا ہے

سابقہ تحریروں سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ تین طلاق اک ساتھ شریعت کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے ایک تو نفس طلاق کو ہی ابغض الحلال کہا گیا ہے چنانچہ ابو داؤد میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما احل اللہ شیئا ابغض الیہ من الطلاق اللہ نے کسی ایسی چیز کو حلال نہیں کیا ہے جو طلاق سے بڑھ کر اسے ناپسند ہو اسی لیے ہمارے فقہا کی تصریح ہدایہ اولین میں موجود ہے۔ الاصل فی الطلاق ھو الحظر شریعت نے کچھ عظیم مصلحتیں تھیں جن کی وجہ سے طلاق کو مشروع کیا ہے اور کہا ہے کہ بوقت شدید ضرورت اس کا استعمال درست ہے اور اصول فقہ کا یہ قاعدہ ہے ما ثبت بالضرورۃ فھو یتقدر بقدر الضرورۃ جو چیز کسی خاص مجبوری اور ضرورت کے لیے مباح کی جائے گی وہ صرف اسی قدر مباح ہو گی جس سے ضرورت پوری ہو جائے۔ مثلاً بوقت ضرورت مردار حلال کیا گیا ہے تو اس میں قید لگا دی گئی ہے کہ صرف اتنی مقدار میں مردار حلال ہے جس سے رشتہ زندگی

کو باقی رکھا جا سکے۔ غیر باغ ولا عاد ــــ اب اگر کوئی شخص ایک ہی دفعہ میں تین طلاق استعمال کرتا ہے تو وہ سخت معصیت کا کام کرتا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو دو طلاق کو بھی بدعت کہتے ہیں۔

ہدایہ اولین میں ہے:۔

وقال مالك انه بدعة ولا يباح الا واحدة لان الاصل في الطلاق هو الحظر والاباحة لحاجة الخلاص وقد اندفعت بالواحدة

دو طلاق بھی بدعت ہے۔ صرف ایک مرتبہ میں ایک ہی مباح ہے کیونکہ نفس طلاق خود اولاً ناپسندیدہ شے ہے اور طلاق کی اباحت ایک ضرورت کے تحت تھی اور وہ ضرورت ایک سے پوری ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاق بیک وقت معصیت ہے تو کیوں نہ ایسی معصیت کے روکنے کا انتظام کیا جائے اور اس کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے اور شریعت کی مصلحتوں کو طلاق کے سلسلے میں باقی رکھا جائے۔ علامہ فخر الدین رازی تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۲۲ میں اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

...... هو اختيار كثير من علماء الدين لو طلقها اثنين او ثلاثا لا يقع الا واحدة وهذا القول هو الاقيس لان النهي يدل على اشتمال المنهي عنه على مفسدة راجحة والقول بالوقوع سعي في ادخال تلك المفسدة في الوجود وانه غير جائز فوجب ان يحكم بعدم الوقوع

بہت سے علماء دین کا کہنا ہے کہ جو بیک وقت دو یا تین طلاق دیتا ہے تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور یہی قول قیاس کے مطابق سب سے زیادہ موافق ہے کیونکہ کسی چیز سے منع کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ چیز کسی مفسدہ اور خرابی پر مشتمل ہے اور وقوع طلاق کا قائل ہونا اسی مفسدہ اور برائی کو وجود میں لانے کا سبب ہے اور یہ بات جائز نہیں لہذا عدم وقوع کا حکم لگانا واجب ہے

اور بالکل یہی بات تفسیر نیشاپوری میں واقع ہوئی ہے۔ الفاظ یکساں ہونے کی وجہ سے ہم اسے نقل نہیں کریں گے اور یہی رائے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی حنفی کی ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور و معروف تفسیر مظہری میں الطلاق مرتان کے تحت لکھا ہے:۔

وكان القياس ان لا يكون	اور قیاس کا اقتضا یہ ہے کہ دو طلاق
الطلقتان المجتمعان معتبرة	مجموعی معتبر نہ ہوں اور جب دو طلاق مجموعی
شرعا واذا لم يكن الطلقتان	معتبر نہ ہوں گی تو بیک وقت تین طلاق
المجتمعات معتبرة لم يكن الثلاث	بطریق اولیٰ معتبر نہ ہوں گی کیونکہ دو کا عدد
مجتمعة بالطريق الاولى لوجودهما (مظہری ج ۱)	تین کے اندر مع ایک زائد عدد کے موجود ہے

اس رائے کی وجہ انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھ دی ہے وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔ اس پر اس طرح بھی غور کیجیے کہ اللہ پاک نے بندوں کو نکاح کرنے کا حکم چند شرائط کی پابندی کے ساتھ دیا ہے ان میں ایک شرط یہ ہے کہ ایامِ عدت میں نکاح نہ ہو۔ پس جو شخص ایامِ عدت میں عورت سے نکاح کرے تو اس کا نکاح منعقد نہ ہوگا اور یہ نکاح ایسا ہوگا جیسے نکاح کیا ہی نہیں۔ پس اس طرح اگر کوئی شخص ایامِ منہی عنہا اور اوقاتِ ممنوعہ میں طلاق دیتا ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہونا چاہیے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی، جو حضرت تھانوی مرحوم کے استاد بھی تھے، لکھتے ہیں۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ معناه مرة	آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک طلاق
بعد مرة فالتطليق الشرعي	کے بعد دوسری طلاق دی جائے پس شرعی
على التفريق دون الجمع و	طلاق وہ ہے جو متفرق طور پر متفرق طہروں
الارسال مرة واحدة (حاشیہ نسائی ص ۹۹ جلد ۲)	میں دی جائے نہ کہ بیک وقت ایک مجلس میں

مولانا موصوف اس طلاق ثلثہ کو سرے سے غیر شرعی قرار دیتے ہیں اور علامہ سندھی حنفی بھی قریب قریب یہی تحریر فرماتے ہیں۔ بحوالہ سابق معلوم ہوا کہ بیک وقت تین طلاق بہرحال معصیت اور گناہ ہے۔

۳۔ غور و فکر کی تیسری بنیاد تھی — کیا فقہ حنفی میں اس کی گنجائش ہے کہ بوقت شدید ضرورت دوسرے مجتہدین کی آرا پر عمل کیا جا سکتا ہے اس کے متعلق میں واضح الفاظ میں عرض کر دوں کہ عرف و مصلحت اور حالات کی جتنی رعایت فقہ حنفی میں ملحوظ رکھی گئی ہے شاید ہی کسی دوسری جگہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملاً فقہ حنفی کو تنفیذ احکام سے ایک طویل مدت تک واسطہ رہا۔ ہمارے فقہا ان احکام کو جن میں مصالح عامہ کے پیش نظر حکم لگایا گیا ہے استحسان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ ان مسائل میں شرعی دلائل کچھ اور ہیں، مگر شریعت کا مجموعی مزاج اور اس کا عمومی قانون یُسر اور لوگوں کے حالات کی اور بات کے تقاضے

لہٰذا اس کی مناسبت سے ایک دوسرا قابل عمل طریقہ اختیار کیا گیا اسی کو استحسان کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فقہ کی دنیا میں علامہ شامی کو کون نہیں جانتا، عالم اسلام میں جو شہرت اور مقبولیت ان کو حاصل ہوئی اس سے شاید کوئی دوسرا بہرہ ور ہوا ہو۔ انھوں نے خاص اسی عنوان پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف۔ یہ رسالہ ۱۳۰۱ھ میں دمشق سے شائع ہو گیا ہے اس میں علامہ نے بڑی تفصیل سے ان مسائل کا ذکر کیا ہے جن میں عرف اور مصلحت، نیز زمانے کے تقاضوں کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے اور ان مسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ایک زمانے میں حرام اور ممنوع تھے مگر دوسرے زمانے میں وہ ایک شدید ضرورت بن گئے لہٰذا ان کا حکم بدل گیا۔ دراصل یہ بات قانون کے لیے خصوصاً اس قانون کے لیے بہت ضروری ہے جو ابدی ہو۔ دنیا میں کوئی قانون لشمول قانون اسلام ایسا نہیں ہے جو جزئیات کا اس طرح احاطہ کیے ہو کہ بس اس میں اب تغیر کی گنجائش نہ ہو۔ مثلاً علامہ شامی مثال پر فرماتے ہیں:۔

واعلم ان المسائل الفقهية	یہ بات واضح رہے کہ کچھ مسائل تو
اما ان تكون ثابتة بصريح النص	ایسے ہیں جو صریح نص سے ثابت ہیں انہیں
وهي الفصل الاول واما ان تكون	ہم نے فصل اول میں بیان کیا ہے اور کچھ
ثابتة بضرب اجتهاد ورای	مسائل وہ ہیں جو رائے اور اجتہاد سے ثابت
وكثير منها ما يبينه المجتهد على	ہیں۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ بہت سے مسائل
ما كان في عرف زمانه بحيث	تو مجتہد نے اپنے دور اور رواج کے اعتبار
لو كان في زمان العرف الحادث	سے قائم کیے ہیں حالانکہ وہی مجتہدین اگر اس
لقال بخلاف ما قاله اولا ولهذا	زمانے میں ہوتے تو اپنے قول کے خلاف فتویٰ
قالوا في شروط الاجتهاد انه لابد	دیتے اس لیے مجتہد کی شرائط میں سے ایک اہم
فيه من معرفة عادات الناس	شرط یہ بھی ہے کہ وہ رسم و رواج اور مصلحت
فكثير من الاحكام الى قوله	وقت کا نباض ہو کیونکہ اکثر احکام زمانے کے
بانه لو كان في زمنهم لقال بما قالوا	اختلاف سے متغیر ہو جاتے ہیں۔ رواج کی تبدیلی

اور کسی نئی ضرورت کے پیدا ہو جانے سے یا اس لیے کہ زمانے کے لوگ بدر وش ہو گئے اور تساہل برتنے لگے۔ اسی شکل میں اگر پہلا حکم باقی رہے تو شدید ضرر کا اندیشہ ہے اور ان قواعد شریعت کی مخالفت

لازم آئے گی جن کی بنیاد آسانی اور دفع ضرر پر ہو تاکہ دنیا کا نظام اعلیٰ طریقے پر چل سکے۔ اسی بنا پر تم دیکھو گے کہ مشائخ فقہ اکثر مواقع پر مجتہد کی منصوصات تک سے اختلاف کرتے ہیں جن کی اساس اور بنیاد مجتہد کے دور کے مطابق تھی مگر اب نہ رہی مشائخ نے اسی بنیاد پر ایسا کیا کہ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ مجتہد آج ہوتا تو وہی حکم لگاتا جو انھوں نے دیا۔

نظر کو وسعت دیں گے تو مذکورہ عبارت کی وضاحت آپ کو فقہ حنفی میں نظر آجائے گی اور خود علامہ شامی نے بھی تقریباً سو مثالیں ایسی نقل کی ہیں جن میں عرف اور مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے متاخرین نے متقدمین کے خلاف فتوے دیے ہیں۔ ہم دو چار مثالیں نقل کرتے ہیں۔

پہلے علماء کا فتویٰ تھا کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینی ناجائز ہے مگر متاخرین علماء نے موجودہ دور کو سامنے رکھتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں کا مسجد میں جانا ثابت ہے مگر متاخرین علماء نے حالات اور زمانے کی رعایت سے اسے ممنوع قرار دیا

بہت سے مسائل میں احناف نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کو ترک کر کے دوسرے ائمہ کے اقوال پر فتویٰ دیا ہے۔ مثلاً وہ عورت جس کا شوہر کھو گیا ہو اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے ــــ چار سال تلاش و جستجو کے بعد نکاح فسخ کر دیا جائے اور اس عورت کو شادی کی اجازت دے دی جائے۔

امام صاحب کا مسلک تھا کہ گواہ بظاہر ثقہ ہو تو شہادت دے سکتا ہے مگر امام محمد و ابو یوسف رحمہ اللہ ظاہری عدالت کو ناکافی قرار دیتے ہیں کیونکہ امام صاحب کے زمانے میں اکثر لوگ ثقہ عادل ہوتے تھے اور صاحبین کے زمانے میں یہ بات نہ رہی

مزارعت، معاملت وقف میں امام ابوحنیفہ کا قول معمول بہ نہیں ہے بلکہ امام محمد و ابو یوسف رحمہما اللہ کے اقوال پر فتویٰ ہے ــــ ماءِ مستعمل کو امام صاحب نجاست غلیظہ فرماتے ہیں اور امام محمد طاہر غیر مطہر کہتے ہیں اسی قول پر فتویٰ ہے۔

ہدایہ جلد اول ص۱۱۱ پر یہ عبارت ملے گی۔

لو کان الامام انتقل الی اٰیۃ | اگر امام نماز میں بھول گیا اور بھول کے

تفسد صلوٰۃ الفاتح وتفسد	بعد دوسری آیت شروع کر دی۔ اب مقتدی
صلوٰۃ الامام ان اخذ	نے لقمہ دیا اور امام نے لے لیا تو امام ومقتدی
بقولہ۔	دونوں کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ یہ عام مشائخ کے خلاف ہے جیسا کہ صاحب محیط نے ذکر کیا ہے۔ آگے کہتے ہیں۔ والصحیح انہ لا تفسد صلوٰۃ المقتدی ولا صلوٰۃ الامام صحیح بات یہ ہے کہ اس سے نہ مقتدی کی نماز فاسد ہوگی اور نہ ہی امام کی سب کی نماز ہو جائے گی۔

پہلے قدیم فقہاء کے نزدیک وصی کو یتیم کے مال میں مضاربت کا حق حاصل تھا مگر متاخرین اس کو ناجائز بتلاتے ہیں۔

علامہ شامی نے 'نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف' میں لکھا ہے کہ حدیث میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس شرط پر آٹا پیسنے کو دے کہ اجرت کے بدلے تہائی آٹا اس کا ہوگا تو ناجائز ہوگا اس حدیث سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کپڑا بننے والے کو اس شرط پر سوت دے کہ وہ اس کا کپڑا بُن دے اور اجرت کے معاوضے میں ایک تہائی کپڑا لے لے تو یہ معاملہ ناجائز ہوگا۔ لیکن چونکہ بلخ میں یہ طریقہ عموماً معمول ہے اس لیے بلخ کے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور یہ قرار دیا ہے کہ رواج کی بنا پر حدیث میں تخصیص کر دی جائے گی یعنی یہ حدیث صرف آٹے کی حد تک محدود رہے گی۔ علامہ شامی کے خاص الفاظ یہ ہیں:۔

ومشائخ بلخ کنصیر بن یحییٰ و	اور مشائخ بلخ مثلاً نصیر بن یحییٰ ومحمد بن
محمد بن سلمہ وغیرہ کانوا	سلمہ وغیرہ اس اجارے کو کپڑے میں جائز
یجیزون ھذہ الاجارۃ فی الثیاب	کہتے ہیں کیونکہ ان کے شہر میں یہ چیز معمول بہ
لتعامل اھل بلدھم والتعامل	تھی اور لوگوں کا کسی شے کو معمول بنا لینا ایک
حجۃ یترک بہ القیاس ویخص	ایسی حجت ہے جس سے قیاس کو ترک کر دیا جائے
بہ الاثر	گا اور حدیث میں تخصیص کر دی جائے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کی کوئی حد ہوگی یا نہیں۔ اس طرح تو فرائض اور

ارکان تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ علامہ شامی نے خود اس سوال کو نقل کر کے اس کا مفصل جواب دیا ہے اور وہ حدود بتلائے ہیں جہاں تک مختلف تبدیلیوں کی گنجائش ہو سکتی ہے وہ لکھتے ہیں:—

فنقول فی جواب ھذا الاشکال ان العرف نوعان خاص وعام وکل فیھما اما ان یوافق الدلیل الشرعی والنصوص علیہ الی قولہ یترک بہ القیاس چونکہ یہ بات بہت مفصل ہو جائے گی اس لیے ہم عرض کریں گے کہ اس بحث کو براہ راست اسی کتاب میں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ اوپر کی مثالیں دینے سے ہمارا مقصد یہ بتلانا ہے فقہ حنفی میں بہت توسع ہے فقہ حنفی صرف ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال وآراء کا نام نہیں بلکہ بوقت ضرورت دیگر فقہاء ائمہ کے اقوال پر عمل کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ احناف کی کتابیں اٹھا کر دیکھیے آپ کو ایسے الفاظ کثرت سے مل جائیں گے والفتوی علی قولہما فتوی صاحبین کے قول پر ہے یا علیہ الفتوی بلکہ ہمارے ائمہ میں سے امام محمد کے متعلق شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسلک اعتدال میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد نے مدینہ میں جمعہ کی نماز پڑھائی بعد میں معلوم ہوا کہ جس کنوئیں سے انھوں نے غسل فرمایا اس میں چوہا مرا ہوا ہے لہذا پانی ناپاک ہو گیا۔ امام محمد نے فرمایا کہ ہم نے اپنے بھائی مالکیوں کے مسلک پر نماز پڑھائی ہے۔ یہ بات فقہ حنفی کے لیے عیب نہیں بلکہ اتنی بڑی خوبی اور دور اندیشی کی بات ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو فقہ حنفی ناقص ہوتی لہذا اس بنیاد پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ طلاق ثلثہ والے مسئلے میں اگر دیگر فقہاء کے مسلک پر فتوی دے دیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہ ہوگی کیونکہ ضرورت اس کی شدید متقاضی ہے جیسا کہ ہم چوتھی بنیاد میں اس پر گفتگو کریں گے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض احناف اور جلیل القدر علماء یہ میلان رکھتے ہیں۔ مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی سے کسی سائل نے طلاق ثلثہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ سائل کے گاؤں میں ایک واقعہ ایسا ہوا تھا کہ ایک حنفی شخص نے تین طلاق دینے کے بعد کسی اہل حدیث عالم سے فتوی پوچھ کر رجوع کر لیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس کا پانی کاٹ کر دیا مفتی صاحب نے یہ جواب دیا۔

"ایک مجلس میں تین طلاق سے تینوں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ ائمہ اربعہ کے علاوہ بعض علماء اس کے ضرور قائل ہیں کہ اس طرح ایک رجعی طلاق ہوتی ہے اور یہ مذہب اہل حدیث حضرات نے بھی اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس

طاؤس، عکرمہ اور ابن اسحاق سے منقول ہے۔ پس کسی اہلحدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور مستحق اخراج از مسجد ہے۔ ہاں حنفی المذہب کا کسی اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا یہ باعتبار فتویٰ ناجائز تھا لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہو تو قابل درگذر ہے "

اخبار الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۹ر شعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۶ء

ہمارے علمائے احناف میں سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا فتویٰ مجموعہ فتاویٰ ص۱۴۳ پر موجود ہے وہ لکھتے ہیں :۔ اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک تین طلاق ہوں گی اور بغیر تحلیل کے نکاح درست نہ ہوگا مگر بوقت ضرورت کہ اس عورت کا علیحدہ ہونا اس سے دشوار ہو اور احتمال مفاسد زائدہ کا ہو تو کسی اور امام کی تقلید کرلے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس کی نظیر مسئلہ نکاح زوجہ مفقود اور عدت ممتدۃ الطہر موجود ہے کہ حنفیہ عند الضرورۃ قول امام مالک پر عمل کر لینے کو درست رکھتے ہیں۔ چنانچہ رد المحتار میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک اور فتویٰ ملاحظہ کرتے چلیے "اور بعض سلف صالحین اور علماء متقدمین میں سے اس کے بھی قائل ہیں اگرچہ ائمہ اربعہ میں یہ بعض نہیں ہیں لہٰذا جن مولوی صاحب نے مفتی اہلحدیث پر جو فتویٰ دیا ہے یہ غلط ہے اور مفتی اہلحدیث پر اس اختلاف کی بنا پر کفر و مقاطعہ و اخراج از مسجد کا فتویٰ غیر صحیح ہے بوجہ شدت ضرورت اور خوف مفاسد اگر طلاق دینے والا ان بعض علماء کے قول پر عمل کرے گا جن کے نزدیک اس واقعہ مرقومہ میں ایک ہی طلاق ہوتی ہے تو خارج از مذہب حنفی نہ ہوگا۔ کیونکہ فقہائے حنفیہ نے بوجہ شدت ضرورت کے دوسرے امام کے قول پر عمل کر لینے کو جائز رکھا ہے۔"

دستخط حبیب المرسلین عفی عنہ مہر دارالافتاء مدرسہ امینیہ دہلی

بحوالہ الجواہر العالیہ ص۱۰۷ مرتب مولانا ابوعبیدہ اعظمی

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں میں نے پڑھا ہے کہ جب زمانے میں انہوں نے حیلہ ناجزہ تصنیف فرمائی اور اس میں نکاح مفقود الزوج کے سلسلے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیا تو کسی نے کہا کہ آپ لوگ تقلید ابوحنیفہ پر بہت زور دیتے ہیں لیکن امام مالک کے مسلک کے مطابق فتویٰ دینے میں تو تقلید جا رہی ہے۔ فرمایا تم تقلید کو لیے پھرتے ہو میاں

سرے سے اسلام ہی جا رہا ہے ۔ درحقیقت ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ شریعت کی مصلحت کلی کو باقی رکھنے کے لیے کسی خاص امام کی تقلید ترک کرکے دوسرے امام کی رائے پر عمل درست ہے ۔ اس پوری تفصیل سے آپ کو یہ اندازہ کرتے ہیں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ ائمہ احناف بوقت ضرورت اور زمانے کی اقتضا کا لحاظ کرتے ہوئے دوسرے مجتہدین وائمہ کی آراء پر عمل کو جائز رکھتے ہیں لہٰذا طلاق ثلثہ والے مسئلہ میں ہم غور وفکر کرکے دیکھیں کہ واقعی ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ تین طلاقیں واحد شمار کی جائیں یا نہیں ۔ اگر ضرورت شدید ہے تو اسے قبول کریں ۔

غور وفکر کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی اور سماجی حالات ہمیں کون سی صورت اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں ۔ ہمارا ہندی معاشرہ کچھ اس طرح پر چل رہا ہے کہ اس میں دینی قدریں ماند پڑ گئی ہیں ۔ ہمارے عوام دین کا اتنا حصہ بھی حاصل نہیں کرتے جو ان پر فرض عین ہے ۔ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو دنیاوی تعلیم اونچی سے اونچی رکھتے ہیں اور دینی تعلیم اس کی نسبت سے کم ہے ۔ مولانا اسحٰق جلیس ندوی مدیر تعمیر حیات نے ابھی حال ہی میں اپنے ایک اداریہ میں تحریر فرمایا تھا کہ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے گفتگو کے دوران حضرت عمر و عثمان کا تذکرہ آیا تھا تو وہ سادگی سے پوچھتے ہیں ۔ مولانا! ان دونوں میں سے کس کی خلافت پہلے ہے اور کس کی بعد میں ۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ ہم میں ہر شخص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے ۔ اسی جہالت کے پیش نظر جب ایسے لوگ طلاق دینا چاہتے ہیں تو انہیں یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ کے رسول نے کون سا طریقہ بتایا ہے اور پسند فرمایا ہے اور کسے معصیت بتایا ہے ۔ بلکہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے مل جائیں گے جنہیں یہ مسئلہ معلوم ہے کہ ایک طلاق کے بعد رجوع کا اختیار رہتا ہے اس لیے وہ ایک طلاق کو کامل طلاق ہی نہیں سمجھتے اور جب یہ دینی ناواقفیت اور جذبات کی شدت سے مجبور ہو کر تین طلاق دیتے ہیں تو صحیح حکم کے ظاہر ہونے کے بعد وہ سخت نادم ہوتے ہیں اور دنیا بھر کی حیلہ جوئی اور چارہ گری تلاش کرتے ہیں ۔ ایسی غلط تدبیر اختیار کرتے ہیں کہ پھر وہ عورت اس کے نکاح میں بغیر تحلیل کے آجائے یا باقی رہ جائے اس سے متعدد خرابیاں رونما ہوتی ہیں ۔ اگر طلاق دینے والا حنفی مسلک رکھتا ہے اور اسی پر قائم رہنا چاہتا ہے تو لامحالہ تحلیل کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ شرط باندھ کر دوسرے سے نکاح کراتا ہے کہ تم کل طلاق دے دینا اس طرح وہ شریعت کے نزدیک مجرم ٹھہرتا ہے ۔ ترمذی شریف کی روایت ہے :۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن المحلل والمحلل لہٗ	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

یہ حدیث نسائی میں بھی موجود ہے اور ابن ماجہ میں عقبہ بن عامر کی روایت اس طرح ہے:۔

الا اخبرکم بالتیس المستعار قالوا بلی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو المحلل لعن اللہ المحلل و المحلل لہٗ	کیا میں تم کو منگنی کے بکرے سے آگاہ نہ کروں صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ضرور۔ فرمایا وہ حلال کرنے والا ہے۔ اللہ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں پر لعنت کی ہے۔

حضرت عمر کا فتویٰ ابن ابی شیبہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:۔

لا اوتی بمحلل و لا محلل لہٗ الا رجمتھا	میرے پاس جو بھی حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہو لایا جائے گا تو میں اس کو سنگسار کردوں گا۔

امام بیہقی نے جلد ۷ص ۳۳۷ پر نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اگر کوئی شخص اس کی بیوی کو اس کے لیے حلال کردے تو کیا خیال ہے۔ آپ نے فرمایا۔ من یخادع اللہ یخادعہ جو اللہ کے ساتھ چال بازی کرے گا اللہ اس کی چالبازی کو ناکام کردے گا۔ یہ فتویٰ امام طحاوی نے بھی معانی الآثار ص ۳۳ جلد ۲ میں نقل کیا ہے۔ موطا امام مالک میں ہے:۔

والمحلل یفرق بینھما مع کل حال اذا ارید بالنکاح التحلیل	دونوں کے درمیان ہر حال میں تفریق کردی جائے گی اگر ان کا ارادہ تحلیل کا ہے

ہمارے ائمہ میں سے صرف امام ابوحنیفہ کے نزدیک تحلیل سے بیوی زوج اول کے لیے حلال ہوتی ہے مگر امام محمد و ابو یوسف کے نزدیک دیگر ائمہ کی طرح علی وجہ التحلیل کیا ہوا نکاح غلط ہے اور اس سے عورت زوج اول کے لیے حلال نہیں ہوتی ہے۔ ویسے خود امام صاحب بھی تحلیل کو کروہ تحریمی فرماتے ہیں۔

چنانچہ ہدایہ جلد ا ص۳۷۶ میں ہے۔ اذا تزوجها بشرط التحليل فالنكاح مكروه لقوله عليه السلام لعن الله المحلل والمحلل له۔ موطا امام مالک کے حاشیہ میں ہے۔ قال الشافعي و ابو یوسف اذا نكح بشرط انه اذا وطئ طلق بطل۔ امام شافعی و ابو یوسف کا کہنا ہے کہ اگر اس شرط پر نکاح کیا گیا کہ ہم بستری کے بعد اس عورت کو طلاق دے دی جائے تو نکاح باطل ہے۔
مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا ایک فتویٰ ملاحظہ کرتے چلیے۔ اخبار الجمعیۃ دہلی ۶ رشعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۶ ردسمبر ۱۹۳۱ء میں تحریر فرماتے ہیں:۔

مطلقہ عورت کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور پھر اس سے طلاق یا موت زوج کی وجہ سے علیحدہ ہو کر پہلے زوج کے لیے حلال ہو جاتی ہے اسی کا نام حلالہ ہے لیکن زوج اول یا زوجہ یا اس کے کسی ولی کی طرف سے زوج ثانی سے یہ شرط کرنی کہ وہ طلاق دیدے اور زوج ثانی کا اس شرط کو قبول کر کے اس سے نکاح کرنا حرام ہے اور اس پر فریقین پر لعنت کی گئی ہے۔"

اب آپ غور کر کے دیکھیے کہ ہمارے معاشرے میں کون سی شکل رائج ہے۔ بالکل متعۃ النساء کی طرح مشروط نکاح کیا جاتا ہے اور اگلے دن نکاح کرنے والے سے طلاق لے لی جاتی ہے۔ اس شکل میں بعض ایسے شرمناک اور حیاسوز قصے سننے میں آتے ہیں کہ کسی طرح شریعت کا مزاج اس کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ جب ہی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ ایسے لوگوں کو میں سنگسار کر دوں گا۔ بسا اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ نکاح کرنے والا طلاق ہی نہیں دیتا تو اس طرح اس قضیے میں نزاع و فساد کا ایک دوسرا قضیہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان تمام قباحتوں کا ارتکاب تو اس شکل میں ہوتا ہے جب طلاق دینے والا حنفی مسلک پر قائم رہتا ہے لیکن اگر وہ حنفی مسلک پر مستعد نہیں تو فوراً ایسی شکل میں وہ تبدیلی مسلک پر غور کرتا ہے اور یہاں بھی ایسا شخص مجرم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء اس کو شریعت کی اتباع نہیں بلکہ خواہش نفس کی پیروی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس طرح کی تبدیلی کو غلط اور ناجائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شاطبی نے الموافقات جلد ۴ ص۸۲ بیان مقام اتباع رخص المذاہب میں اس کو وضاحت سے لکھا ہے اور خود طلاق دینے والے کے لیے یہ دشواری کہ اگر وہ صرف اس مسئلہ کی حد تک اہل حدیث مسلک پر عمل کرتا ہے اور باقی سب مسئلوں میں اہل حدیث کی مخالفت کر کے ابو حنیفہ کو مانتا ہے تو یہ کھلی خواہش نفس کی پیروی ہے۔ ایسا رجحان شرعی معاملات میں ایک

خطرناک رجحان ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ مذاہب کی صرف رخصتوں کا تلاش کرنیوالا ہوگا اور اگر وہ اس ایک مسئلہ کی وجہ سے مکمل اہل حدیث کا مسلک اختیار کرنے تو اپنے ذہن و قلب کے خلاف کرتا ہے کہ بہت سے مسئلوں میں امام ابوحنیفہ کو برحق مانتے ہوئے جس پر اب تک وہ پوری زندگی عمل کرتا رہا ہے۔ اب صرف ایک مسئلہ کی وجہ سے اس کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہے۔ مزید یہ کہ اس طرح عورت کو غصہ اور جذبات کی شدت میں الگ کر دینے کے نتائج بہت سنگین شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ خصوصاً عورت کی زندگی کے لیے تو انتہائی تباہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔ فوری طور سے بچوں کی نگہداشت ان کی پرورش اور تربیت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے ظاہر ہے حقیقی ماں جس طرح اپنی اولاد کی ساخت و پرداخت پر خون جگر صرف کر سکتی ہے۔ دوسری عورت نہیں پھر اسی مطلقہ عورت کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس کو کس طرح معاشرے میں جذب کیا جائے۔ ۲۵-۵۰ برس شوہر کے ساتھ رہنے کے بعد اب الگ ہوکر وہ کہاں جائے۔ خصوصاً جبکہ وہ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکی ہو۔ ہندوستان میں ہمارا بیت المال بھی نہیں کہ اس کی کفالت ہو سکے۔ خود اس میں کمانے اور پیٹ بھرنے کی استطاعت نہیں۔ علاوہ اس کے وہ پردہ نشین خاتون جس نے اب تک عزت و خودداری کی اعلیٰ زندگی بسر کی ہو کس طرح اپنی معاشی پریشانی کا ازالہ کر سکے اور سکون و اطمینان قلب کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ مجھے اپنے شہر کے متعلق اچھی طرح معلوم ہے۔ ایک صاحب نے جو اچھے خاصے دیندار معروف تھے ۵۰-۶۰ برس کی عمر تک ساتھ رہے۔ اس کے بعد ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں۔ کچھ دنوں تو اس عورت نے اپنے آپ کو سنبھالا مگر اس کے افراد خاندان کی غربت اور معاشی پریشانی کی وجہ سے وہ اس قدر بدحال ہو گئی کہ اس کے دماغ پر جنون کے اثرات ہو گئے اب وہ دربدر کاسۂ گدائی لے کر اپنا پیٹ بھرتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ بھی میری نظر میں ہے — ایک صاحب نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ شادی کے وقت دونوں بہت غریب تھے مگر عورت کی محنت اور کوشش سے محلے والوں کا کہنا ہے کہ چند سالوں میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی۔ اب وہ ایک پختہ مکان اور ایک کارخانے کے مالک ہو گئے۔ بس کسی خانگی معاملے میں بگڑ کر شوہر نے تین طلاقیں دے دیں۔ علیحدگی کے بعد کچھ دنوں تک تو عورت زیورات اور گھر کا اثاثہ بیچ کر گذارہ کرتی رہی مگر اب حالت یہ ہے کہ اس کی زندگی باعث عبرت ہے۔ کسی نے اس عورت کو مشورہ دیا کہ تو دارالقضا میں دعویٰ داخل کر دے کہ شوہر کے مال سے جو اصلاً تیری محنت و کوشش کا نتیجہ ہے کچھ حصہ دلا دیا جائے۔ مگر کفالت کی کوئی شکل نہ

بننے کی وجہ سے وہاں سے بھی محروم ہوئی۔ اس طرح کے دسیوں واقعات آپ کو مل جائیں گے۔ میں م
اقبال ورق والا صاحب کے ان الفاظ سے متفق ہوں کہ مخالفین ان واقعات کو رنگ آمیزی کے ساتھ
کہتے ہیں مگر اس کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ان واقعات کی کوئی نہ کوئی اصلیت بھی ضرور ہے جس
رنگ آمیزی اور مبالغہ کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکومت ایسے قوانین بنانے
تل گئی ہے کہ مطلقہ کا نان ونفقہ اس وقت تک شوہر کے ذمے واجب ہے جب تک وہ دوسری شادی
نہ کرلے۔ ظاہر ہے یہ چیز افراط کی طرف ایک قدم ہے مگر یہ بھی تفریط اور کجی کی بات ہوگی کہ ایسی
کے سلسلے میں ہم بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل نہ سوچیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر طلاق کے مروجہ طریقے میں احنا
کے مسلک سے ہٹ کر بعض دیگر مجتہدین کی آرا پر عمل کرلیا جائے یعنی تین طلاق کو ایک قرار دیا جائے
بہت سی پیچیدگیاں خود بخود دفع ہوجائیں گی اور فریقین ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ایک
کے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اس طرح مخالفین کو مسلم پرسنل لا کے خلاف رنگ آمیزی
بھی نہ رہے گا۔ جس طرح مصری علماء نے پوتے کی وراثت کے سلسلے میں ثلث مال کی اختیاری و
کو لازم کردیا ہے اسی طرح ہم کو مذکورہ بالا چار بنیادوں پر غور وفکر کرنے کے بعد کوئی تبدیلی
جس کی شریعت میں گنجائش بھی ہے اور حنفی مسلک بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ ائمہ کرام تین طلاق
معصیت اور گناہ بھی بتلاتے ہیں ـــــ اور ہمارے حالات، شدت سے متقاضی ہیں تو کیوں
اقوال پر عمل کرلیا جائے جو شروع سے اہل سنت والجماعت کے ایک طبقہ کا معمول رہا ہے۔

اب آئیے سوال نامے میں درج شقوں کے مختصر جوابات بھی سماعت فرمائیے۔

۱۔ طلاق، طلاق، طلاق تین دفعہ کہہ دینے سے اگر کہنے والے کی نیت ایک کی ہو اور ا
محض تاکید کے لیے باقی دو دفعہ مزید کہہ دیا ہو، یا باقی دو سے اس نے کچھ بھی نیت نہ کی ہو، نہ
اور نہ عدم تاکید کی، تو ایک ہی طلاق پڑے گی۔ علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں علامہ ابن حج
نقل کیا ہے کہ فاسق سے فاسق آدمی کا ارادہ تاکید معتبر مانا جائے گا اور یہی ہمارا مذہب بھی
فانہ صرح من هینا تصدیق مرید التاکید بشرطہ وان بلغ فی الفسق ما بلغ
مفتی مہدی حسن صاحب سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند اپنی کتاب اقامۃ القیامۃ، ص۵۹
فرماتے ہیں۔ اگر عورت مدخول بہا ہے اور ایک ہی طلاق دینے کا ارادہ تھا لیکن تکرار لفظ میں م

دی اور دوسری اور تیسری طلاق کو بطور تاکید استعمال کیا ہو تو دیانۃً قسم کے ساتھ اس کا قول
ہوگا اور ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ اس میں اختلاف نہیں۔ علامہ ابن حزم کی کتاب محلی میں بالکل
الفاظ ہیں مگر اس میں دیانۃً کا لفظ اور حلف کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ صرف اتنا ہے کہ اس کے ارا
تاکید کو معتبر مانا جائے گا۔ علامہ ابن حزم محلی جلد ۱۰ ص ۱۸۷ پر فرماتے ہیں :۔

فلو قال لموطوءۃ انت طالق	مدخول بہا عورت سے کسی نے کہا تجھے
انت طالق، انت طالق، فان نوی	طلاق، تجھے طلاق۔ اگر اس نے باقی دو
التکریر (ای التاکید) لکلمتہ الاولی	سے تاکید کا ۔ یا نہ تاکید کا نہ عدم تاکید
فھی واحدۃ و لذالک ان لم ینو	کا، کسی کا ارادہ نہ کیا تو ایک واقع ہوگی
بتکرارہ شیئا فان بذالک ان کل	لیکن اگر مطلب یہ تھا کہ ہر طلاق پہلے والی
طلقۃ غیر الاولی فھی ثلاث ان کررھا	طلاق سے الگ ہے تو تین واقع ہوگی

۲۔ یہی شکل مختلف فیہ ہے۔ احناف تین کے وقوع کے قائل ہیں اور عذر جہالت کو وہ معتبر
مانتے۔ اور علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم اور اہل حدیث حضرات جب تین کو تین سمجھ کر دینے والے کی طلا
کو بھی تبلاتے ہیں تو یہاں تو ارادہ بھی نفس طلاق کا تھا، نہ کہ تین کا، لہذا ان کے نزدیک ایک ہ
۳۔ اہل سنت والجماعۃ کا ایک طبقہ شروع سے ہی اس کے خلاف رہا ہے لہذا امت کا ا
نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں ہمارے بعض علما ائمہ اربعہ کا اجماع بتاتے ہیں، مگر یہ بھی مخدوش ہے۔
مولانا عبدالحی لکھنوی کی جو عبارت ہم اوپر مقالہ میں نقل کر چکے ہیں اس میں واضح طور سے یہ بات م
ہے کہ امام مالک کا ایک قول اور اصحاب احمد کا بھی ایک قول یہی ہے۔ ہم غور و فکر کی پہلی بنیاد
ان فقہائے نام لکھ چکے ہیں جو ایک طلاق رجعی ہونے کے قائل ہیں۔

۴۔ ہمارے نزدیک مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک ہی سمجھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ یہی
رائے ہے جس کے دلائل اوپر نقل کر دیے گئے ہیں۔

مسئلہ طلاق سے متعلق

مسلم شریف کی ایک حدیث

سیّد احمد قادری

طاؤس کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ابتدائی برسوں میں تین طلاقیں ایک شمار کی جاتی تھیں۔ صدیوں سے ایک معرکۃ الآراء روایت ہے۔ راقم الحروف نے، عرصہ ہوا اس روایت پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا، چونکہ آج تک میں اس روایت کو سمجھ نہیں سکا ہوں اس لئے تین یکجائی طلاقوں کے مسئلے میں اس روایت سے میں کبھی استدلال نہیں کرتا۔ احمد آباد سمینار میں بھی جو مقالہ میں نے پڑھا اس میں اس روایت سے کوئی استدلال نہیں کیا۔ لیکن دوسرے مقالات میں اس سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ اپنا وہ غیر مطبوعہ مضمون اس خاص نمبر میں شائع کر دوں تاکہ اس روایت پر بحث کا دوسرا رُخ بھی قارئینِ زندگی کے سامنے آجائے۔

امام مسلمؒ نے تین طریقوں سے یہ روایت صحیح مسلم میں درج کی ہے:

(۱) عن ابن طاؤس عن ابیہ عن	ابن طاؤس اپنے والد طاؤس سے اور وہ
ابن عباس قال کان الطلاق علی	ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں انھوں نے
عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر
وسلم وابی بکر وسنتین من خلافۃ	کے عہد اور خلافتِ عمر کے دو۲ برسوں میں
عمر طلاق الثلث واحدۃ فقال	تین طلاق، ایک تھی پس عمر بن الخطاب نے

عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلوا مضیناہ فامضاھم علیھم۔
(مسلم شریف ج ۱ کتاب الطلاق باب الطلاق الثلث)

کہا لوگوں نے جلدبازی کی اس معاملے میں جس میں ان کے لئے مہلت (سوچنے سمجھنے کا موقع) تھی تو ہم کیوں نہ اس کو نافذ کردیں، پس انھوں نے ان پر نافذ کردیا۔

(۲) عن ابن طاؤس عن ابیہ عن ابی الصھباء قال لابن عباس اتعلم انما کانت الثلث تجعل واحدۃ علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وثلاثا من امارۃ عمر فقال ابن عباس نعم۔

ابن طاؤس اپنے والد طاؤس سے روایت کرتے ہیں وہ ابو الصہباء سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر کے عہد میں اور خلافت عمر کے تین برسوں میں تین طلاقیں ایک کردی جاتی تھیں تو ابن عباسؓ نے کہا ہاں۔

(۳) عن ایوب السختیانی عن ابراھیم بن میسرۃ عن طاؤس ان ابا الصھباء قال لابن عباس ھات من ھناتک الم یکن الطلاق الثلث علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکر واحدۃ فقال انہ قد کان ذلک فلما کان فی عھد عمر تتابع الناس فی الطلاق فاجازہ علیھم۔

ابراہیم بن میسرہ طاؤس سے روایت کرتے ہیں کہ ابو الصہباء نے ابن عباسؓ سے کہا اپنی عجیب و غریب بات بتئے کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر کے عہد میں تین طلاقیں ایک نہیں تھیں تو انھوں نے کہا بے شک ایسا ہی تھا پس جب عمر کے زمانے میں ایسا ہوا کہ لوگوں نے پے در پے تین طلاقیں دینی شروع کیں تو انھوں نے لوگوں پر اس کو نافذ کردیا۔

سب سے پہلے اس روایت کے اضطراب سے ذہن مضطرب ہوتا ہے۔ پہلی روایت میں طاؤس

بلا واسطہ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں جیسے انھوں نے طاؤس ہی سے یہ بات کہی تھی۔ دوسری اور تیسری روایت میں ابو الصہباء کے واسطے سے یہ روایت کرتے ہیں، کہ انھوں نے حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا تھا اس کے جواب میں انھوں نے ابو الصہباء کی تصدیق کی تھی، پھر یہ کہ پہلی روایت میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے دو برسوں کا ذکر ہی اور دوسری میں تین برسوں کا تذکرہ ہے اور تیسری میں نہ دو کا ذکر ہے نہ تین کا۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ بات جو کہی گئی ہے ان عورتوں کی طلاق کے بارے میں ہے جن سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو یا ان عورتوں کی طلاق کے بارے میں ہے جن سے خلوت صحیحہ نہ ہوئی ہو کیونکہ ابو داؤد کی روایت یہ ہے کہ:۔

عن طاؤس ان رجلا یقال لہ	طاؤس سے روایت ہے کہ ایک شخص جن
ابو الصہباء کان کثیر السوال لا	کو ابو الصہباء کہا جاتا تھا ابن عباس سے
بن عباس قال اما علمت ان الرجل	بہت سوال کرتے تھے۔ انھوں نے ان
کان اذا طلق امرأتہ ثلاثا قبل	سے پوچھا کیا آپ کو علم نہیں ہے کہ جب
ان یدخل بہا جعلوھا واحدۃ	کوئی شخص اپنی بیوی کو مباشرت سے پہلے
علی عھد رسول اللہ صلی اللہ	ہی تین طلاق دے دیتا تھا تو لوگ اس
علیہ وسلم وابی بکر وصدرا	کو ایک بنا دیتے تھے رسول اللہ صلی اللہ
من امارۃ عمر قال ابن عباس	علیہ وسلم اور ابو بکر کے زمانے میں اور خلافت
بلی کان الرجل اذا طلق امرأتہ	عمر کی ابتدا میں ؟ ابن عباسؓ نے کہا
ثلاثا قبل ان یدخل بہا جعلوھا	ہاں، جب کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول
واحدۃ علی عھد رسول اللہ	سے پہلے تین طلاق دے دیتا تھا تو لوگ
صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر	اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
وصدرا من امارۃ عمر فلما رأی	ابو بکر کے عہد میں اور خلافت عمر کی ابتدا
الناس قد تتابعوا قال اجیزو	میں ایک بنا دیتے تھے پس جب عمرؓ نے
ھن علیھم۔	لوگوں کو دیکھا کہ وہ بکثرت ایسا کر رہے ہیں

(ابوداؤد کتاب الطلاق باب بقیہ نسخ المراجعۃ بعد التطلیقات الثلاث)

تو کہا کہ تین طلاقیں ان پر نافذ کردو۔

اس روایت کے بارے میں ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے، رواہ ابوداؤد باسناد صحیح (یعنی اس کو ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے)۔

چنانچہ ابوداؤد کی اسی روایت کی وجہ سے اسحاق بن راہویہ اور چند دوسرے فقہاء و محدثین کا مسلک یہ ہے کہ اگر غیر مدخول بہا (جس عورت سے مباشرت نہ کی گئی ہو) کو تین طلاق بیک وقت ہی جائے تو ایک شمار ہوگی۔ اور اگر مدخول بہا (جس عورت سے مباشرت کی گئی ہو) کو تین طلاق بیک وقت دی جائے تو تین واقع ہوگی۔

ایک اور سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلم شریف کی ان حدیثوں کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ جن لوگوں کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہوتی ہیں وہ ان حدیثوں کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کی ابتداء میں بیک مجلس یا بیک کلمہ جو تین طلاقیں دی جاتی تھیں وہ بہرحال ایک رجعی طلاق شمار کی جاتی تھیں۔ اگر یہ مطلب صحیح ہو تو فوراً یہ خیال آتا ہے کہ جو واقعہ عہد رسالت سے لے کر حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک بلا اختلاف شائع و ذائع، منتشر و معلوم رہا ہو اسے متعدد صحابیوں نے بیان کیا ہوگا لیکن تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے سوا کسی ایک صحابی نے بھی یہ واقعہ بیان نہیں کیا ہے کہ عہد رسالتؐ، عہد صدیقیؓ اور ابتدائے عہد فاروقیؓ میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک کردی جاتی تھیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عادتاً ممکن ہے کہ اتنا مشہور و معروف واقعہ بلکہ واقعات ایک کے سوا دوسرا کوئی بیان نہ کرے۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے بہت سے شاگرد تھے ان سے یہ روایت ان کے متعدد شاگردوں نے کی ہوگی، لیکن طاؤس کے سوا ان کا کوئی شاگرد ان کا یہ قول نقل نہیں کرتا کہ عہد رسالتؐ، عہد صدیقیؓ اور ابتدائے عہد فاروقیؓ میں تین طلاقیں، ایک کردی جاتی تھیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کسی پرائیوٹ مجلس میں طاؤس سے یہ بات کہی تھی یا کسی پرائیوٹ مجلس میں جس میں صرف طاؤسؒ، ابوالصہباءؒ اور حضرت ابن عباسؓ

ماہنامہ "زندگی" رام پور کا آئندہ شمارہ

پانچواں کل ہند اجتماع نمبر ہو گا

جو ان شاء اللہ مندرجہ ذیل تفصیلات کے ساتھ جنوری کے دوسرے ہفتہ میں شائع ہو گا —

- **خطبۂ صدارت** مولانا محمد یوسف صاحب، امیر جماعت اسلامی (ہند)
- **رپورٹ** از اجتماع حیدرآباد تا اجتماع دہلی (تلخیص) جناب افضل حسین صاحب کریمی جنرل
- **مقالات** مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی — پروفیسر نجات اللہ صدیقی صاحب

ہماری کوشش ہو گی کہ اس خاص نمبر میں

- **تقاریر** مولانا سید حامد علی صاحب، مولانا عبد العزیز صاحب، پروفیسر نجات اللہ صدیقی صاحب
- روداد اجتماع طلبہ اور اس میں شیخ ابراہیم التحاوی (مصر) اور مولانا سید حامد علی صاحب کی تقریر
- روداد اجتماع متفقین اور اس میں مولانا سراج الحسن صاحب کی تقریر
- روداد اجتماع خواتین اور اس میں قیصر بیگم نیازی صاحبہ کی تقریر
- روداد اجتماع معلمین اور اس میں مولانا سید حامد علی صاحب کی تقریر

یا

ان تقاریر کی تلخیص شائع کریں

اس کے علاوہ اس خاص نمبر میں غیر ممالک سے آئے ہوئے مندوبین کے نام، تعداد اور ان کی تقاریر کی تلخیص مولانا مودودی کا خط اور شرکاء اجتماع کے نام ان کا پیغام، غیر مسلم پریس کے اجتماع پر موافقانہ اور مخالفانہ تبصرے، شرکاء کی تعداد حلقہ وار — غرض اجتماع سے متعلق تمام تفصیلات ہوں گی۔

ریکارڈ میں رکھنے کے قابل اس نمبر کی قیمت صرف پانچ روپیہ (-/5) ہو گی

سالانہ چندہ -/15 بھیجنے والوں کو یہ نمبر ان کے چندے ہی میں پیش کیا جائے گا

ایجنٹ حضرات کے لیے خصوصی کمیشن —— ایجنٹ صاحبان تعداد سے مطلع فرمائیں

منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور یوپی

اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اصل اعتبار روایت کا ہے، راوی کے فتوے کا نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ راوی اپنی روایت بھول گیا ہو۔ لیکن یہ جواب یہاں تسلی بخش نہیں ہے۔ ایک ایسا حکم جو عہد رسالتؐ سے ابتدائے عہدِ فاروقیؓ تک رائج رہا ہو اسے حضرت ابن عباسؓ کس طرح بھول سکتے تھے اور وہ بھی اس حال میں کہ تمام صحابہؓ میں اس حکم کے راوی صرف وہ ہیں۔

پھر یہ بات بھی اس روایت کے بارے میں اُلجھن پیدا کرتی ہے کہ اس کے دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تین یکجائی طلاقوں کو ایک کہنے والے لوگ اس روایت کے دوسرے ٹکڑے کی جس میں حضرت عمرؓ کے فیصلے کا ذکر ہے طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں، اور تین یکجائی طلاقوں کو تین قرار دینے والے لوگ اس کے پہلے ٹکڑے کی قسم قسم کی تاویلیں کرتے ہیں۔ ان تاویلات واقوال کی تفصیل فتح الباری ج ۹ کتاب الطلاق میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اس روایت کے پہلے ٹکڑے کو دلیل بناتے ہیں۔ وہ عام طور سے اس کے دوسرے ٹکڑے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے تین یکجائی طلاقوں کو تین قرار دینے کا فیصلہ محض عقوبۃً وتعزیراً کیا تھا تاکہ لوگ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے باز آجائیں۔ علامہ ابن قیم نے بھی یہی تاویل پسند کی ہے، لیکن اس تاویل کو خود اس روایت کے الفاظ ہی رد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ روایت یہ بتا رہی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا کوئی نیا واقعہ نہیں تھا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مسلسل ہوتا چلا آرہا تھا، اور ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا پھر وہ کیا نئی بات پیش آگئی تھی کہ حضرت عمرؓ کو ایک ایسا تعزیری فیصلہ کرنا پڑا، جو عہدِ رسالتؐ و عہدِ صدیقیؓ کے فیصلے کے خلاف تھا؟ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے لوگ کم ایسا کرتے تھے کہ بیک وقت تین طلاقیں دیں اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ تو پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ رہے گا کہ جب شریعت کا حکم یہ تھا کہ تین یکجائی طلاقیں ایک شمار کی جائیں گی، تو بالفرض سو فیصدی طلاق دینے والے بیک وقت تین طلاقیں دینے لگیں تو کیا فرق پڑے گا؟ شرعی حکم اپنی جگہ باقی رہے گا اور طلاق دینے والے کے زائد الفاظ ہوا میں اُڑ جائیں گے۔ عقوبت وتعزیر کی تاویل پھر بھی ناقابلِ فہم ہی ہے۔

صحیح روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ جو لوگ بیک وقت تین طلاقیں دیتے تھے حضرت عمرؓ ان کی پیٹھ پر درّے مارتے تھے۔ اخرج سعید بن منصور عن انس ان عمر اذا اتی برجل طلق امرأتہ

ثلاثا اوجع ظهره وسنده صحیح (فتح الباری ج ۹ کتاب الطلاق باب من جواز الطلاق الثلاث)

سوال یہ ہے کہ اگر تین طلاق کا فیصلہ عقوبۃً و تعزیراً تھا تو پھر دروں کی سزا کس جرم میں دیتے تھے، کیا ایک جرم کی دو سزائیں انھوں نے مقرر کی تھیں، ایک حلال بیوی کو حرام کر دینا اور دوسری دروں کی مار۔

ایک بہت بڑا سوال یہ بھی ہے کہ کیا کسی امامِ وقت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ تعزیراً کسی کی بیوی کو حرام قرار دے کر میاں بیوی میں تفریق کرا دے۔ قرآن کریم نے ایک ہی نہیں بلکہ دو طلاقوں کے بعد بھی شوہر کو رجعت کا حق دیا ہے اور اللہ کے رسول نے بھی یہ حق کبھی سلب نہیں بلکہ جیسا کہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں۔ آپ نے تین یکجائی طلاقوں کو ایک قرار دیا تھا پھر حضرت عمر کو یہ حق کہاں سے مل گیا تھا کہ وہ عقوبۃً ایک رجعی طلاق کو تین بائن مغلظہ طلاق قرار دے کر شوہر سے رجوع کا حق چھین لیں۔ حاشا وکلا حضرت عمر نے ہرگز ایسی زیادتی نہیں کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کے الفاظ کا جو مفہوم علامہ ابن قیم وغیرہ بیان کرتے ہیں اس کو اپنی جگہ برقرار رکھا جائے تو پھر ان کی تاویل کو خود یہ روایت ہی رد کر دیتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شوکانی نے یہ تاویل پسند نہیں کی ہے اور حضرت عمرؓ کے قول کو مخالف قول رسول قرار دیا ہے، انھوں نے اپنے مسلک کے غلو میں اور جذبات سے مغلوب ہو کر جو بات لکھی ہے، میں یہاں ان کے الفاظ نقل نہیں کروں گا، کیونکہ انھوں نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ بے شعوری میں ان کے قلم سے نکل گئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ شوکانی وغیرہ کا حال یہ ہے کہ وہ اس روایت کے پہلے ٹکڑے کو تو شاید قرآن کی کوئی آیت سمجھتے ہیں، لیکن اُسی روایت کا دوسرا ٹکڑا ان کے لئے قابلِ رد بن جاتا ہے۔ اسی طرح فقہاء احناف اس روایت کے دوسرے ٹکڑے کو اس مسئلہ پر اجماع کی دلیل بناتے ہیں۔ اور پہلے ٹکڑے کی دور از کار تاویلیں کرتے ہیں۔ مسالک و مذاہب فقہ کی یہ روش نہایت نامناسب رہی ہے۔ بہر حال طاؤس کی اس روایت کو محدثین و علماء کی ایک جماعت نے منکر اور شاذ کہا ہے بلکہ بعض نے اس کے وہم و غلط ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ امام بیہقی اس کو شاذ کہتے ہیں۔ ابن عربی اس کی صحت کو مختلف فیہ قرار دیتے اور اس کو مرجوح کہتے ہیں قرطبی اس کو منفرد اور ناقابل استدلال قرار دیتے ہیں۔ ابوبکر رازی اس کے منکر ہونے کا قول ...

کرتے ہیں۔ صاحب الاستذکار اس کے وہم وغلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ غالباً اس کے شذوذ ہی کی وجہ سے صحیح بخاری میں جگہ نہیں دیتے۔

ایک ایسا واقعہ بلکہ واقعات جو عہدِ رسالتؐ سے ابتدائے عہد فاروقی تک مسلسل ہوتے رہے ہوں اور واقعات بھی ایسے جو اپنے اندر ایک اہم شرعی حکم رکھتے ہیں۔ محض ایک راوی کی روایت سے کس طرح قابلِ تسلیم ہو سکتے ہیں، خواہ وہ طاؤسؒ جیسے ثقہ راوی ہی کیوں نہ ہوں، جب کہ اس کی تغلیط و تردید دوسرے دلائل سے ہو رہی ہو اور جب کہ خود اس روایت کے ٹکڑے ایک دوسرے سے اتنے متصادم ہوں کہ کسی طرح ان دونوں کی چول بیٹھتی نہ ہو۔

علامہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۹ باب من جواز الطلاق الثلث میں مُفہِم کے حوالہ سے قرطبی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے:

> عادۃً جس حکم کو شائع وذائع اور منتشر و معلوم ہونا چاہئے، کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی شخص اس کی روایت کرے۔ اس لئے اگر یہ " وجہ " اس کی مقتضی نہ ہو کہ قطعیت کے ساتھ اس روایت کو باطل قرار دیا جائے تو اس کی مقتضی ضرور ہے کہ اس کے ظاہری مفہوم پر عمل کرنے میں توقف کیا جائے۔

میرے خیال میں اس روایت کے بارے میں قرطبی کا یہ فیصلہ متوازن اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مسلم شریف ہی میں متعہ کے بارے میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے۔ اس کے الفاظ تقریباً ویسے ہی ہیں، جیسے حضرت ابن عباسؓ کی روایت زیرِ بحث میں ہیں۔

اخبرنی ابو الزبیر قال سمعت جابر	ابو الزبیر نے مجھے خبر دی کہ میں نے جابر
بن عبد اللہ یقول کنا نستمتع	بن عبداللہ کو کہتے ہوئے سُنا کہ ہم لوگ
بالقبضۃ من الدقیق والتمر	ایک مٹھی آٹا اور چھوہارے کے بدلے
الایام علی عہد رسول اللہ صلی اللہ	میں متعہ کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
علیہ وسلم وابی بکر وصدرا	وسلم کے عہد میں اور خلافت عمرؓ کے
من خلافۃ عمر حتی نہانا عنہا عمر،	ابتدائی زمانے میں یہاں تک کہ عمرؓ نے ہم
(مسلم شریف کتاب النکاح)	لوگوں کو اس سے منع کردیا۔

جہاں تک مجھے علم ہے، علامہ ابن تیمیہ یا حافظ ابن قیم یا شوکانی کسی نے بھی اس روایت کو دلیل بنا کر یہ نہیں کہا ہے کہ فی الواقع عہد رسالت سے لیکر ابتدائے عہد فاروقی تک متعہ جائز اور رائج رہا ہو اور حضرت عمر نے اس جائز اور رائج چیز کو محض اپنے اجتہاد سے ممنوع قرار دے دیا ہو۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی معقول وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ کا منفرد قول اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ متعہ عہدِ رسالت سے ابتدائے عہد فاروقی تک جائز و رائج رہا ہو، جبکہ اس کے خلاف دوسرے دلائل موجود ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت ابن عباس کے منفرد قول کو بالکل صحیح تسلیم کیا جاتا ہے اور حضرت جابر کے قول کو صحیح تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی تاویل کی جاتی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دینا اور متعہ کی ممانعت کر دینا حضرت عمر کا اجتہاد تھا لیکن ان کا یہ کہنا 'اجتہاد' کی بالکل غلط ترجمانی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک الزام ہے۔

اخیر میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بواسطہ طاؤس حضرت ابن عباس کی روایت کی تاویل ضروری ہی ہو تو میرے نزدیک اس کی تاویل یہ ہے کہ عہد رسالت اور عہدِ صدیقی میں عام طور سے لوگ تین بار طلاق کے الفاظ محض تاکید کے لیے بولتے تھے اس لیے ان کو ایک شمار کیا جاتا تھا لیکن حضرت عمر کے زمانے میں لوگ جلد بازی کر کے تین طلاقیں دینے کی نیت سے تین بار طلاق کے الفاظ بولنے لگے اس لیے ان کو ایک شمار کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ حضرت عمر کے الفاظ اس تاویل کی تائید کرتے ہیں۔ "جس چیز میں لوگوں کے لیے مہلت تھی اس میں وہ جلد بازی کرنے لگے"۔ یہ جملہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب ان کے زمانے میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہو جو پہلے نہ تھی اور وہ یہی تھی کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے کی نیت سے لوگ تین بار طلاق کے الفاظ بولنے لگے تھے۔ انھوں نے ان کے تین ہونے کا فیصلہ کر کے نافذ کر دیا۔ یہ فیصلہ شرعی حکم کے عین مطابق تھا حضرت عمر رض کا اجتہاد ہرگز نہ تھا۔

تطلیقاتِ ثلاثہ کا مسئلہ

از :۔ شمس پیرزادہ

اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کے زیر اہتمام ۴، ۵، ۶ ؍ نومبر ۸۳ء کو "طلیقات ثلاثہ" کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی جس میں یہ مقالہ پڑھا گیا)۔

اسلام کا معاشرتی نظام ایک سیدھا سادہ نظام ہے ، جس میں نہ قانونی پیچیدگیاں ہیں اور نہ تکلفات ۔ دینِ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور اس کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ اللہ تعالے نے اس میں کوئی تنگی نہیں رکھی ۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورہ حج) اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خصوصیت الحنفیۃ السمحۃ "سہل اور حنیف دین" بتائی ہے ۔ اسی لئے اللہ تعالے نے شریعت کو سہل اور آسان بنا دیا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ اصولی بات بیان کی گئی ہے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ ، ۱۸۵) اور حدیث میں شدت پسندی اور قانونی موشگافیوں سے منع کر دیا گیا ہے :

اِنَّ الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ (بخاری)	دین آسان ہے اور جو کوئی دین کو مشکل بنائے گا وہ بے بس ہو کر رہ جائے گا ۔

اور فرمایا :۔

هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ ۔ (مسلم)	دین میں تعمق اور شدت برتنے والے

ہلاک ہو جائیں۔

قرآن وسنت کی ان ہدایات کے پیشِ نظر فقہی موشگافیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، لہذا بال کی کھال نکالنا اور شرعی احکام کو مشکل اور دقیق بنا کر لوگوں کے لئے دشواریاں پیدا کرنا دین کی خدمت ہرگز نہیں ہے۔

اسلام کا ضابطۂ طلاق انتہائی سادہ اور اعتدال پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ امت کے اندر جو فقہی بحثیں اُٹھ کھڑی ہوئیں انہی نے اس کو سادہ شکل میں باقی نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اس میں تعمق اور تشدد پیدا کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کو معاشرتی زندگی میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور اس سے مسلم پرسنل لا کے مخالفین بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دریں حالات ملت اسلامیہ کو اسلام کے معاشرتی نظام سے وابستہ اور شرعی احکام پر کاربند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام فقہی موشگافیوں، تعمق اور تشدد کے علی الرغم اُبھرتے ہوئے معاشرتی مسائل کا کتاب وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ اور اجتہادی امور میں دین وملت کے مصالح کا پورا پورا لحاظ کیا جائے۔ اور ان تمام اصرار واغلال کو توڑ دیا جائے جس نے ملت اسلامیہ کو جکڑ رکھا ہے۔ خواہ کسی حلقہ کی طرف سے کتنی ہی مخالفت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ مخالفتوں کے مقابلے میں دین وملت کے مصالح زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

تطلیقات ثلاثہ کے مسئلہ پر بھی غور کرتے وقت ہمیں یہی انداز اختیار کرنا ہوگا۔ کیا زبان سے بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق کے الفاظ نکل جانے پر یا "میں نے تجھے تین طلاقیں دیں" کہہ دینے پر شرعاً تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں کہ جب تک وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے اور وہ اسے پھر اپنی مرضی سے طلاق نہ دے پہلے شوہر کے لئے وہ جائز نہیں ہو جاتی۔ اور خاص طور سے ایسے حالات میں جب کہ لوگ لاعلمی کی بنا پر بیک وقت تین طلاقیں دینے کے عادی ہو گئے ہیں اور جب انہیں تین طلاقیں واقع ہو جانے کا فتویٰ مل جاتا ہے تو پچھتانے لگتے ہیں۔ ایک غلط فہمی لوگوں میں یہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ جب تک ایک ساتھ تین طلاقیں نہ دی جائیں طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں تطلیقات ثلاثہ کا مسئلہ سنجیدہ غور وفکر چاہتا ہے۔ اور اس بات کا متقاضی ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا حل تلاش کیا جائے۔

زمانۂ جاہلیت میں طلاق جاہلیت میں طلاق کے لئے کوئی تحدید نہیں تھی۔ مرد اپنی بیوی کو جب چاہتا طلاق دیتا اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرتا۔ طلاق دینے اور رجوع کرنے کا یہ سلسلہ کسی تحدید کے بغیر جاری رہتا۔ جس سے عورت کو سخت تکلیف پہنچتی اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتی۔

اسلام کا اصلاحی اقدام اسلام نے طلاق کے اس ظالمانہ طریقے اور غیر محدود سلسلہ کو ختم کردیا۔ اور مرد کو دو طلاقوں تک رجوع کرنے کا اختیار دیا تاکہ خاندانی زندگی میں تفرقہ پیدا ہونے سے پہلے مرد کو اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے کا دو مرتبہ موقع ملے، اس کے بعد بھی اگر وہ اس رشتہ کو ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، یعنی تیسری مرتبہ طلاق دیتا ہے تو یہ طلاق مغلظ ہوگی۔ یعنی وہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ دوبارہ اس سے نکاح ہی کرسکتا ہے، تاوقتیکہ وہ عورت دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے اور پھر وہ اسے اپنی مرضی سے طلاق نہ دے۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ مرد بار بار طلاق دے کر عورت کو پریشان نہ کرے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا۔

قرآن و سنّت کی رو سے طلاق دینے کا احسن طریقہ یہ ہے کہ حالت طہر میں جس میں مجامعت نہ کی گئی ہو صرف ایک طلاق دینے پر اکتفا کیا جائے۔ یہ طلاق عدت کے اندر رجعی ہوگی اور عدت گذر جانے پر بائن ہوجائے گی۔ یعنی عدت گذر جانے پر رجوع کا موقع تو باقی نہ رہے گا۔ البتہ مرد اور عورت دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اس احسن طریقے کو چھوڑ کر بیک وقت تین طلاقیں دینا نہ شرعاً درست ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہی ہے۔ مرد کے لئے کسی مجبوری کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اگر وہ عورت کو چھوڑنا ہی چاہتا ہے تو ایک طلاق دے کر چھوڑ سکتا ہے۔ اس لئے جو لوگ بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں۔ ان کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ صریح جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں تاکیدی حکم ہے۔

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ (سورۃ البقرہ ۲۲۹) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں (ضابطے) ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔

اور فرمایا:۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا — اللہ کی آیتوں کا مذاق نہ بناؤ۔

(سورۃ البقرہ ۲۳۱)

کیا قرآن نے آنِ واحد کی تین طلاقوں کو تین طلاقیں قرار دیا ہے

قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ کہیں یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ آنِ واحد کی تین طلاقیں تین شمار ہوں گی۔ جس آیت سے مجلس واحد کی تین طلاقوں کے تین واقع ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے:-

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ۔

(بقرہ ۲۲۹، ۲۳۰)

طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو معروف طریقہ پر (عورت کو) رکھ لیا جائے یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دیا جائے اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا تھا اس میں سے کچھ واپس لے لو الا یہ کہ زوجین کو اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ اگر واقعی تم کو اندیشہ ہو کہ دونوں حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکیں گے تو دونوں پر اس معاملہ میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، جو لوگ حدود اللہ سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔ پھر اگر تیسری مرتبہ طلاق دے دی تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تا وقتیکہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے۔

اس آیت میں " مرّتان " (دو مرتبہ) کا جو لفظ آتا ہے اس سے طلاق کا لفظ دہرانا یا عدد کی صراحت کے ساتھ طلاق دینا مراد لیا جاتا ہے۔ اس بناء پر طلاق، طلاق، طلاق یا تین طلاقیں کہہ دینے

تین طلاقوں کا حکم لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ " مرّتان " کا مطلب لفظ طلاق کو دہرانا نہیں بلکہ دوسری دفعہ طلاق دینا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو دفعہ طلاق دینے کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ لیکن تیسری دفعہ طلاق دینے کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا۔ اس کا یہ مطلب کس طرح صحیح ہوگا کہ اگر کسی نے بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق کہہ دیا تو رجوع کا حق باقی نہیں رہا۔ اور طلاق مغلّظ ہوگی حالانکہ اس شخص نے ایک ہی دفعہ طلاق دی ہے۔ لفظ " مرّتان " کا جو مطلب لیا جاتا ہے وہ درج ذیل وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔

اوّلاً لغت عرب میں " مرّتان " کا مطلب مرّۃً بعد مرّۃ ہے۔ یعنی ایک دفعہ کے بعد دوسری دفعہ نہ کہ محض لفظی تکرار اور اس کی نظیریں قرآن میں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا:

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ۔	کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ انھیں آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (نور ۵۸)	اے ایمان والو! تمہارے مملوک اور تمہارے نابالغ بچے تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں۔

اس آیت کے بعد تین اوقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ " ثلاث مرات " (تین اوقات) میں کا مطلب الگ الگ تین اوقات ہیں نہ کہ زمانۂ واحد میں اوقات کا اجتماع۔ اس سے واضح ہوا کہ " مرّتان " میں تفریق کا مفہوم شامل ہے۔ اگر کوئی مثال اجتماع کی پیش کی جاسکتی ہے وہ اعیان کی ہوگی نہ کہ افعال کی۔ کیونکہ فعل میں زمانۂ واحد میں " مرّتان " کا اجتماع ممکن نہیں۔

ثانیاً رمی جمار کی مثال ہے، سات کنکریاں مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص سات مرتبہ ایک ایک کنکری مارنے کے بجائے ایک ساتھ سات کنکریاں مارے گا تو حکم کی تعمیل نہیں ہوگی، وہ جمہور علماء کے نزدیک ایک ہی رمی شمار ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ الفاظ کہے کہ " میں تینتیس مرتبہ سبحان اللہ کہتا ہوں " تو ایک ہی تسبیح شمار ہوگی نہ کہ تینتیس۔

ثالثاً چار قسموں کی مثال ہے جس کا حکم لعان کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص الگ الگ چار قسمیں کھانے کے بجائے ایک ساتھ کہہ دے کہ "میں چار قسمیں کھا کر کہتا ہوں" تو اس کی ایک ہی قسم شمار ہوگی نہ کہ چار۔

اگر مذکورہ آیت میں مراد طلاق کا عدد ہوتا تو مرّتان کی جگہ لفظ اثنتان استعمال کیا جاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مرّتان سے مراد لفظ طلاق کا کڑا یا عدد نہیں ہے بلکہ الگ الگ دو دفعہ طلاق دینا ہے۔

چنانچہ امام رازیؒ لکھتے ہیں :

طلّقوا مرّتین یعنی دفعتین — دو مرتبہ طلاق دو یعنی دو دفعہ طلاق دو۔

(التفسیر الکبیر ج ۲ ص ۲۶۰)

انّ الطّلاق المشروع متفرق لانّ المرّات لا تکون الّا بعد تفرّق بالاجماع۔ (ایضاً) — مشروع طلاق یہ ہے کہ الگ الگ طلاق دی جائے کیونکہ بالاجماع "مرّات" تفرّق کے بعد ہی ممکن ہے۔

لہٰذا جب دو طلاقیں جو مجموعی طور پر ایک ہی دفعہ دی گئی ہوں دو شمار نہیں ہوں گی، تو تین طلاقیں جو مجموعی طور پر ایک ہی دفعہ دی گئی ہوں کس طرح تین شمار ہوں گی؟۔

پھر جس پس منظر میں تین طلاقوں کا حکم بیان کیا گیا ہے اس کو بھی اگر ملحوظ رکھا جائے تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بیک وقت کئی طلاقیں دینے کا رواج نہیں تھا بلکہ بار بار طلاقیں دی جاتی تھیں اور بار بار رجوع کیا جاتا تھا۔ اس لئے "الطّلاق مرّتان" کا مفہوم یہی بار بار کی طلاقیں ہوگا نہ کہ بیک وقت دی جانے والی متعدد طلاقیں۔

سورۂ طلاق میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب طلاق دی جائے تو عدّت کے لئے دی جائے۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ۔ (طلاق ۱) — اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو عدّت کے لئے طلاق دو اور عدّت کو شمار کرو۔

عدّت کے لئے طلاق دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وقت طلاق دی جائے جب کہ عدّت کا آغاز ہو سکے۔ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دیتا ہے وہ عدّت کا لحاظ نہیں کرتا، کیونکہ پہلی

طلاق دیتے ہی عدت شروع ہو گئی، لیکن دوسری اور تیسری طلاق میں عدت کا لحاظ نہیں رہا۔ حا
ہر طلاق کے لئے عدت کا لحاظ ضروری ہے۔ قرآن نے نہ صرف یہ حکم دیا ہے کہ عدت کا لحاظ کرکے
دی جائے بلکہ عدت کے اندر رجوع کرنے کا بھی حق دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

فَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ (بقرہ ۲۳۰)

جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو بھلے طریقہ سے انھیں روک لو یا بھلے طریقہ سے رخصت کردو۔

یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ جب عدت پوری ہور ہی ہو تو بھلے طریقہ پر روکا جاسکتا ہے یا
عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کا یہ
جو اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے کس نے ساقط کیا ہے۔ اگر کوئی نص ساقط کرنے کے لئے موجو
تو کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہی ہوگا
تیسری دفعہ کی طلاق سے پہلے عدت کے اندر مرد کو رجوع کا حق ہے۔ لہذا بیک وقت دی ہوئی
طلاقوں کے بعد بھی رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر تیسری دفعہ طلاق دو دفعہ دی ہوئی
رجعی کے بعد ہی واقع ہوتی ہے نہ کہ بیک وقت۔ اللہ نے الگ الگ طلاقیں دینے ہی کا اختیار
کو دیا ہے جیسا کہ الطلاق مرتان - سے ظاہر ہے، لہذا جب جمع کرنے کا اختیار ہی نہیں دیا گیا ہے
آن واحد میں دی جانے والی تین طلاقیں کس طرح تین واقع ہوں گی ؟

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایلا (بیوی سے علیحدہ رہنے کی قسم کھانا)
بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ

مطلقہ عورتیں اپنے کو تین حیض تک روکے رکھیں۔

اور اسی سیاق میں فرمایا:

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا۔ (سورہ بقرہ ۲۲۸)

ان کے شوہر تعلقات درست کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران انھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لینے کے حقدار ہیں۔

معلوم ہوا کہ ایلا، میں بھی رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

دوسری مثال ظہار کی ہے۔ یعنی بیوی کو ماں سے تشبیہ دینا۔ زمانۂ جاہلیت میں اسے طلاق بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید قطع تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ظہار کے بعد رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی، لیکن اللہ تعالے نے فرمایا:۔

وَاَنَّھُمْ لیقولون منکرا من القولِ وزورا۔ یہ لوگ ایک منکر اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔ (مجادلہ ۲)

ظہار کو منکر اور زور قرار دینے کے باوجود اس کا صرف کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ یعنی ظہار کو طلاق نہیں ٹھہرایا اور جاہلیت کے اس رواج کو کہ بیوی کو ماں سے تشبیہ دینے کی صورت میں وہ ابدی طور پر شوہر کے لئے حرام ہوجاتی ہے باطل قرار دیا۔

اب زیر بحث مسئلہ کو لیجئے۔ کیا بیک وقت تین طلاق کے الفاظ ادا کرنے پر طلاق مغلظہ کا حکم لگانا ایلا اور ظہار سے بھی زیادہ شدید قرار دینے کے مترادف نہیں ہے؟ دراں حالیکہ اس شدت کے لئے کوئی نص موجود نہیں ہے۔

الغرض مجلس واحد کی تین طلاقوں کا تین واقع ہونا قرآن کی کسی نص سے ثابت نہیں ہے، کیونکہ صریح طور سے قرآن میں کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ آنِ واحد کی تین طلاقیں تین واقع ہوں گی۔ رہا نصوصِ قرآنی کی تعبیر کا مسئلہ تو دلائل مذکورہ کی بنا پر یکجا طور پر دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا ہی قرآن سے زیادہ مناسبت رکھنے والی بات ہے۔

کیا مجلس واحد کی تین طلاقوں کا وقوع، حدیث سے ثابت ہے؟

جس طرح یکجائی تین طلاقوں کے واقع ہونے پر قرآن کی کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ اسی طرح احادیث صحیحہ کی بھی کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ جن احادیث سے اس کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے ان میں سے بعض احادیث تو وہ ہیں جن میں یکجا طور پر تین طلاقیں دینے کی صراحت موجود نہیں ہے اور بعض احادیث ایسی ہیں جن کا محل دوسرا ہے۔ اس لئے ان سے کوئی دلیل فراہم نہیں ہوتی۔ اور بعض احادیث یا تو مضطرب ہیں یا ضعیف، اس لئے ان میں سے کوئی حدیث حجت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ چند خاص حدیثوں کا جائزہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں جن سے عام طور سے مجلس

واحد کی تین طلاقوں کے وقوع پر استدلال کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی کی حدیث ہے:۔

ان امراۃ رفاعۃ القرظی جاءت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ ان رفاعۃ طلقنی فبت طلاقی وانی نکحت بعدہ عبدالرحمٰن ابن الزبیر القرظی وانما معہ مثل الھدبۃ۔ قال رسول اللہ لعلک تریدین ان ترجعی الی رفاعۃ لا حتی یذوق عسیلتک وتذوقی عسیلتہ

(بخاری کتاب الطلاق)

رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ رفاعہ نے مجھے طلاق بتہ (کاٹنے والی طلاق) دی اور میں نے اس کے بعد عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی سے نکاح کر لیا لیکن وہ زوجیت کے لائق نہیں ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا شاید کہ تو رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہے نہیں جب تک کہ تیرا دوسرا شوہر) تجھ سے لطف اندوز ہو لے اور تو اس سے لطف اندوز ہو جائے (یعنی جب تک دوسرا شوہر صحبت کر کے طلاق نہ دے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں)

اس حدیث میں طلاق بتہ (کاٹنے والی طلاق) کا ذکر ہے لیکن اس بات کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ تین طلاقیں یک جا طور پر دی گئی تھیں البتہ صحیح مسلم کی حدیث طلاق کی نوعیت کو واضح کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وطلقھا اٰخر ثلاث تطلیقات

(مسلم کتاب الطلاق)

اس نے اس کو تین طلاقوں کی آخری طلاق دی (یعنی تین طلاقوں میں سے جو آخری طلاق رہ گئی تھی وہ بھی دے دی۔

اس حدیث میں جب مجلس واحد کی تین طلاقوں کی صراحت نہیں ہے تو اس سے اس کے واقع ہونے پر استدلال کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ چنانچہ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ "اس حدیث سے تین یکجائی طلاقوں پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۶)

دوسری حدیث عویمر عجلانی کی ہے جس میں لعان کا قصہ بیان ہوا ہے۔

فلما فرغا قال عویمر	جب دونوں لعان سے فارغ ہوئے
کذبت علیھا یا رسول اللہ ان	تو عویمر نے کہا اگر میں اس (بیوی) کو اپنے
امسکتھا فطلقھا ثلاثا قبل	پاس روک لوں تو جھوٹا ہوں۔ پھر اس
ان یامرہ رسول اللہ صلی	نے اس کو تین طلاقیں دیں قبل اس کے کہ
اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حکم دیں۔

اس حدیث کو اس بات کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب عویمر نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بیک وقت تین طلاقیں دیں اور آپ نے نکیر نہیں فرمائی تو مجلس واحد کی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ لعان کے بعد تفریق ہو ہی جاتی ہے اور نہ رجوع کی گنجائش باقی رہتی ہے، نہ دوبارہ نکاح کرنے کی۔ عویمر نے جو تین طلاقیں دیں وہ محض تاکید و توثیق کے لیے تھیں، ورنہ لعان میں اس کے بغیر ہی تفریق ہو جاتی ہے۔ اس لیے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ چنانچہ فقہ حنبلی کی کتاب 'مغنی' میں ابن قدامہ لکھتے ہیں:

واما حدیث المتلاعنین	(المغنی ج ۷ ص ۲۸۳)	رہی لعان والی حدیث تو اس سے لازم
فغیر لازم لان الفرقۃ لم تقع		نہیں آتا کیونکہ جدائی طلاق سے نہیں ہوئی
بالطلاق فانھا وقعت بمجرد لعانھما		بلکہ مجرد لعان کرنے سے ہوئی۔

تاہم اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے کوئی چیز ثابت کی جا سکتی ہے تو صرف یہ کہ لعان کے بعد تین یکجائی طلاقیں دی جا سکتی ہیں۔ اس میں عموم پیدا کرنا اور جہاں رجوع کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے وہاں کے لیے تین یکجائی طلاقوں کے وقوع کا جواز نکالنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ تیسری حدیث فاطمہ بنت قیس کی ہے جو صحیح مسلم میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

عن فاطمۃ بنت قیس ان	فاطمہ بنت قیس فرماتی ہیں کہ ابو عمرو بن
اباعمرو بن حفص طلقھا	حفص نے اسے طلاق بتہ (جدا کرنے والی)
البتۃ وھو غائب فارسل الیھا	دی اور وہ موجود نہیں تھے اس لیے انھوں
وکیلہ بشعیر فسخطتہ فقال	نے اپنے وکیل کو جو دے کر ان کے پاس بھیجا

واللہ مالک علینا من حق،	فاطمہ نے اس پر برہمی کا اظہار کیا تو اس نے
فجاءت رسول اللہ صلی اللہ	کہا قسم بخدا تمہارا ہم پر کوئی حق نہیں ہے۔
علیہ وسلم فذکرت ذالک لہ	فاطمہ نے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر
فقال لیس لک علیہ نفقۃ	ہوکر روداد پیش کی۔ آپ نے فرمایا تیرا نفقہ
(مسلم کتاب الطلاق)	اس کے ذمے نہیں ہے۔

اس حدیث میں بھی طلاق بتّہ کا ذکر آیا ہے جس کو تین یکجائی طلاقوں کے واقع ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن صحیح مسلم ہی میں یہ حدیث دوسرے طریقوں سے بھی بیان ہوئی ہے چنانچہ ایک روایت میں

فطلقہا آخر ثلاث تطلیقات	اس نے اس کو تین طلاقوں میں سے آخری طلاق دی

اور دوسری روایت میں اس سے زیادہ صراحت ہے۔

فارسل الی امراتہ فاطمۃ	انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس کو
بنت قیس بتطلیقۃ کانت بقیت	ایک طلاق جو باقی رہ گئی تھی دے کر اپنے
من طلاقہا (مسلم، کتاب الطلاق)	وکیل کو ان کے پاس بھیجا۔

جب یہ حدیث تین یکجائی طلاقوں کی صراحت نہیں کرتی تو اس سے ان کے واقع ہونے پر استدلال کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

چوتھی حدیث حضرت ابن عباس کی ہے جس کو صحیح مسلم نے روایت کیا ہے اور جو بہت مشہور ہے۔

عن ابن عباس قال کان	حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ
الطلاق علی عہد رسول اللہ	کے اور حضرت ابوبکر کے عہد میں اور حضرت
وابی بکر وسنتین من خلافۃ	ابوبکر کے عہد میں اور حضرت عمر کی خلافت
عمر طلاق الثلث واحدۃ فقال	کے ابتدائی دو سالوں تک تین طلاقیں ایک
عمر بن الخطاب ان الناس	سمجھی جاتی تھیں لیکن حضرت عمر نے فرمایا
قد استعجلوا فی امر کانت لہم	جس معاملہ میں لوگوں کو غور و فکر کرنے کا
فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیہم	موقع دیا گیا تھا اس میں وہ عجلت باز ہی

فامضاہ علیھم	کام لینے لگے ہیں لہٰذا ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں چنانچہ آپ نے اس کو ان پر نافذ کر دیا

(مسلم کتاب الطلاق)

اس حدیث کو مجلس واحد کی تین طلاقوں کے ایقاع کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے جب حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں تین یکجائی طلاقوں کو نافذ کر دیا تو اس سے اس کے ایقاع اور اس پر اجماع دونوں کا ثبوت ملتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس حدیث سے حضرت عمر کا ایک فیصلہ ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ اور عہد رسالت کا تعامل بھی تو ثابت ہوتا ہے۔ پھر کس دلیل سے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ حضرت عمر کے فیصلہ کو مان لیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ و عہد رسالت کے تعامل کو قبول نہ کیا جائے جبکہ عہد رسالت کا تعامل بہرحال فوقیت رکھتا ہے۔

پھر حضرت عمر کے فیصلہ کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ علامہ ابن قیم نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ حضرت عمر نے تین یکجائی طلاقوں کی شرعی حیثیت میں تبدیلی نہیں کی تھی بلکہ محض تعزیراً ان کو نافذ کیا تھا اور تعزیرات کے باب میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات معلوم ہی ہیں۔ مثلاً شراب کی دکانوں کو جلا دینا، شرابیوں کے لیے اسی کوڑوں کی سزا مقرر کرنا اور شہر بدر کرنا وغیرہ۔ صحابہ کرام نے جب دیکھا کہ حضرت عمر مصالح امت کے پیش نظر تعزیراً ان کو نافذ کر رہے ہیں تو انھوں نے اس معاملہ میں آپ سے اتفاق کیا۔

یہ حدیث سنن ابو داؤد میں جس طریقے سے بیان ہوئی ہے اس میں

اذا طلق امرأتہ قبل ان یدخل بھا جعلوھا واحدۃ	جب کوئی شخص اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دیتا تو انہیں ایک شمار کیا جاتا۔

کے الفاظ ہیں لیکن امام نووی لکھتے ہیں کہ ابوداؤد کی روایت ضعیف ہے۔ (شرح مسلم للنووی جلد ا ص۴۷۸) ان تمام باتوں کے پیش نظر اس حدیث سے تین یکجائی طلاقوں کے وقوع پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

پانچویں حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ہے جو صحیحین میں بیان ہوئی ہے۔

عن ابن عمر انہ طلق امرأتہ	حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ

وھی حائض فی عہد رسول	انھوں نے رسول اللہ ؐ کے عہد میں اپنی بیوی
اللہ - فسال عمر بن الخطاب	کو حالتِ حیض میں طلاق دی حضرت عمرؓ نے
رسول اللہ ؐ عن ذالک فقال	اس کے بارے میں رسول اللہ سے دریافت
لہ رسول اللہ مرہ فلیراجعھا	کیا تو آپ نے فرمایا تو آپ نے فرمایا ۔
ثم لیترکھا حتی تطھر	ان سے کہو کہ وہ رجوع کرلیں پھر اسی حالت
ثم تحیض ثم تطھر ثم	میں بیوی کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ وہ طاہر
ان شاء امسک بعد و	ہوجائے ۔ پھر جب دوسرا حیض آنے کے بعد
ان شاء طلق قبل ان یمس	طاہر ہو جائے ۔ تو چاہیں روک لیں چاہیں
فتلک العدۃ التی امر اللہ	مجامعت سے پہلے طلاق دیں ۔ یہی وہ عدت
ان یطلق لھا النساء	ہے جس کا حکم اللہ نے عورتوں کی طلاق کے
(مسلم کتاب الطلاق)	سلسلے میں دیا ہے ۔

یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس میں تین طلاقوں کا کہیں ذکر نہیں ہے اسی لیے مسلم نے اس حدیث کو طلاق الثلاث کے باب میں نہیں بیان کیا ہے، بلکہ تحریم طلاق الحائض کے باب میں بیان کیا ہے ۔ البتہ بعض روایتوں میں حضرت عبداللہ بن عمر کا یہ بیان ایک سوال کے جواب میں موجود ہے کہ

ان طلقتھا ثلاثا فقد	اگر تو نے تین طلاقیں دی ہیں تو اپنی
عصیت ربک فیما امرک بہ من	بیوی کی طلاق کے معاملے میں تو نے اپنے رب
طلاق امراتک وبانت منک (مسلم کتاب الطلاق)	کی نافرمانی کی اور وہ تجھ سے جدا ہوگئی

اس جواب میں تین یکجائی طلاقوں کی صراحت نہیں ہے ۔ مزید برآں اس کی حیثیت حضرت عبداللہ ابن عمر کے فتوے کی ہے یعنی مرفوع حدیث کا یہ جز نہیں ہے ۔

رہا مصنف ابن ابی شیبہ، دارقطنی اور طبرانی کا مرفوعاً بیان کرنا کہ :-

فقلت یا رسول اللہ ارایت	(ابن عمرؓ فرماتے ہیں) میں نے کہا یا
لو طلقتھا ثلاثا اکان یحل لی	رسول اللہ اگر میں تین طلاقیں دے دیتا تو
ان اراجعھا فقال لا ۔ کانت	کیا میرے لیے رجوع کرنا جائز ہوتا ۔ آپ نے

تبین منك وكانت معصية | فرمایا، نہیں وہ تم سے جدا ہوجاتی ا
گناہ بھی ہوتا

یہ اضافہ والی روایت ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ابن قیم نے اغاثۃ اللہفان میں لکھا
کے ایک راوی شعیب ہیں جن کے ثقہ ہونے میں کلام ہے۔ صحیح طریقوں سے یہ حدیث جہاں کہ
کی گئی ہے اس میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ لہذا اس سے تین یکجائی طلاقوں کا ایقاع ثابت نہ
چھٹی حدیث میں ابن لبید کی ہے جسے نسائی نے روایت کیا ہے۔

عن محمود ابن لبید قال	محمود بن لبید کہتے ہیں کہ رسول اللہ
اخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ	مطلع کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو
وسلم عن رجل طلق امراته	طلاقیں یکجا طور پر دی ہیں۔ یہ سنکر آپؐ
ثلث تطلیقات جمیعا فقام	برہم ہوئے اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب
غضبانا ثم قال ایلعب بکتاب	کھیلا جارہا ہے۔ درآں حالیکہ میں تمہار
اللہ وانا بین اظهرکم حتی	درمیان موجود ہوں۔ ایک شخص آپ کی ی
قام رجل وقال یا رسول اللہ الا	کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا یا رسول
اقتله (نسائی کتاب الطلاق)	کیا میں اسے قتل نہ کر دوں۔

اس میں تین طلاقوں پر آپؐ کے برہم ہونے کا ذکر ہے لیکن ان کے ایقاع کی اس میں
ہے اور آپ کا ارشاد "ایلعب بکتاب اللہ" کیا کتاب اللہ سے کھیلا جائے گا۔ واضح کر
بیک وقت تین طلاقیں کتاب اللہ سے کھیلنا ہے۔ لہذا یہ بات کس طرح باور کی جاسکتی ہے
کو مؤثر مان کر کتاب اللہ سے کھیلنے کی اجازت دیں گے؟ علاوہ ازیں اس روایت کے با
نے لکھا ہے کہ فیہ انقطاع (یہ روایت منقطع ہے) تفسیر ابن کثیر جلد ا ص ۲۷۷) الغرض
طلاقوں کا واقع ہونا اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔

ساتویں حدیث رکانہ کی ہے جسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔

عن رکانة قال اتیت النبی	رکانہ کہتے ہیں کہ میں نبیؐ کی خدمت
صلی اللہ علیہ وسلم فقلت یا رسول اللہ	حاضر ہوا اور کہا یا رسول اللہ میں نے

انی طلقت امراتی البتۃ	بیوی کو طلاق بتہ (جدا کرنے والی) طلاق
فقال ما اردت بہا	دی ہے۔ آپ نے پوچھا تم نے کیا ارادہ کیا
قلت واحدۃ قال واللہ	تھا؟ میں نے کہا ایک طلاق دینے کا ارادہ
قلت واللہ قال فھو ما	کیا تھا۔ آپ نے فرمایا اللہ کی قسم کھا کر
اردت	کہتے ہو؟ میں نے کہا اللہ کی قسم کھا کر کہتا
	ہوں۔ آپ نے فرمایا پھر اس کا حکم بھی تمہارے
	ارادے کے مطابق ہی ہے " (یعنی چونکہ
(ترمذی، کتاب الطلاق)	ایک طلاق کی تھی اس لیے ایک ہی واقع ہوگی)

اس حدیث کے بارے میں امام ترمذی نے لکھا ہے لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ ہم اس حدیث کو اس طریقے کے سوا کسی اور طریقے سے نہیں جانتے " اس کے ایک راوی زبیر بن سعید ہیں جن کے بارے میں علامہ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں لکھا ہے کہ لین الحدیث ہیں۔ اسی طرح دوسرے راوی عبداللہ کے بارے میں بھی یہی بات لکھی ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس کی سند و متن دونوں میں اضطراب ہے۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ حدیث رکانہ کوئی چیز نہیں۔ امام بخاریؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور علل حدیث کو جاننے والے ائمہ نے کہا ہے کہ اس کے راوی مجہول ہیں (اغاثۃ اللہفان ج ۱ ص ۳۱۶) اس لیے اس حدیث سے بھی مسئلہ زیر بحث میں استدلال نہیں کیا جا سکتا برعکس اس کے ابو رکانہ کی وہ حدیث ہے جس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور جس میں ابو رکانہ کے تین طلاقیں دینے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مراجعت کا حکم دینے کا ذکر ہے۔

فقال انی طلقت ثلاثا	ابو رکانہ نے کہا میں نے اس کو
یا رسول اللہ قال قد علمت	تین طلاقیں دی ہیں یا رسول اللہ! آپ
راجعھا (ابوداؤد، ابواب الطلاق)	نے فرمایا۔ میں جانتا ہوں تم رجوع کر لو

اس حدیث سے ایک طلاق واقع ہونے کی تائید ہوتی ہے لیکن اس کی اسناد میں "بعض بنی ابی رافع" مذکور ہے جو راوی کے مجہول ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

مشہور اور اہم حدیثوں کا جائزہ اوپر پیش کیا گیا۔ ان کے علاوہ کچھ اور حدیثیں بھی ہیں جو یکجائی طلاقوں کے ایقاع کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ دارقطنی وغیرہ کی حدیثیں ہیں جو درجہ اسناد اور متن وغیرہ کے لحاظ سے ایسی نہیں ہیں کہ ان سے حجت قائم ہو سکے۔ اتنے اہم مسئلے میں کمزور، غیر مشہور اور غیر واضح حدیثوں کا سہارا لیکر تین طلاقوں کے وقوع پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ حدیثوں کو قبول کرنے کے معاملے میں اس قدر محتاط تھے کہ آپ نے فاطمہ بنت قیس کی اس مطلقہ کے لیے جسے تین طلاقیں دی گئی ہوں، عدم نفقہ کی روایت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے :-

قال عمر نترك كتاب الله	حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ کیا ایک عورت
وسنة نبينا صلى الله عليه و	کے کہنے پر ہم اللہ کی کتاب اور اپنے نبیؐ کی
سلم بقول امراة لا ندری	سنت کو چھوڑ دیں گے جب کہ ہم نہیں جانتے
انها حفظت او نسيت لها	اس عورت نے یاد رکھا یا بھول گئی۔ مطلقہ
السكنى والنفقة قال الله عز	ثلاث کے لیے سکنیٰ بھی ہے اور نفقہ بھی۔
وجل لا تخرجوهن من بيوتهن	اللہ عز و جل نے فرمایا ہے ان کو اپنے گھروں
ولا يخرجن الا ان ياتين	سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، الا یہ کہ وہ
بفاحشة مبينة (مسلم کتاب الطلاق)	کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔

اس لیے مسئلہ زیر بحث میں جبکہ کوئی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں ہے۔ قرآن کے بیان پر اکتفا کرنا کافی ہے۔ غیر صحیح اور غیر صریح روایتوں سے تین یکجائی طلاقوں کا وقوع شرعاً ثابت نہیں ہوتا۔

کیا تین یکجائی طلاقوں کے وقوع پر اجماع ہے؟

کہا جاتا ہے کہ تین طلاقوں کے واقع ہونے پر اجماع ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ امت کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ اور دورِ صحابہ سے لے کر اب تک اس کے بارے میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث اوپر گذر چکی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں تین طلاقوں کو ایک طلاق سمجھا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ عہد رسالت اور عہد صدیقی

کا اجماع کس چیز پر تھا۔ رہا حضرت عمر کا اجتہاد تو اس کی جو توجیہ علامہ ابن قیم نے فرمائی ہے ا مذکور ہوئی یعنی یہ حکم عارضی تھا اور بطور تعزیر کے تھا۔ محمد حسین ہیکل نے بھی "الفاروق عمر" میں اس پر مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر نے کتاب اللہ کی نص میں اجتہاد کیا تھا جس کی آج ہم مخالفت کرتے ہیں کیونکہ نص قرآنی کا مقصود یہ ہے کہ طلاق بالنفس ایک دفعہ کے دوسری دفعہ دینے پر واقع ہوا اور شوہر کے لیے دو دفعہ رجوع کا موقع باقی رہے کیونکہ اس کے اثر زندگی پر گہرے مرتب ہوتے ہیں اس لیے جب کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تجھے تین طلا ہیں تو ایک طلاق ہی واقع ہوگی کیونکہ طلاق ایک فعل ہے جسے واقع ہونا ہے نہ کہ قول جسے زبا سے ادا کرنا ہے۔ حضرت عمر کے زمانے میں عراق و شام کی لونڈیوں کی کثرت ہوگئی تھی اس لیے لو اپنی عورتوں کو طلاق دینے میں جلدی کر رہے تھے اور ان کو بیک وقت تین طلاقیں دے کر جن لو: کی طرف ان کے دل راغب ہوجاتے تھے ان کو خوش اور مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے اسبا کی بنا پر حضرت عمر نے کلمہ واحد کی تین طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ موصوف آگے لکھتے ہیں :۔

هذا اجتهاد رای خالف عمر فيه من بعد غير واحد من الفقهاء وخالفه اهل عصرنا الحاضر فی طائفة من البلاد الاسلامية ولا ضير على عمر من ذالك ولا ضير على مخالفيه فعمر وغيره من الصحابة لم يكونوا يفتون برائيهم على سبيل الالزام. ولا على انه هو الحق بل على انه رای ان يكن صوابا فمن الله وان يكن خطاء فمن نفسه فهو يستغفر الله منه (الفاروق عمر محمد حسین ہیکل ج ۲ ص ۲۱۳)

یہ حضرت عمر کا اجتہادِ رائے ہے جس کی مخالفت ان کے بعد متعدد فقہاء نے کی ہے اور دورِ حاضر میں بھی بلادِ اسلامیہ کا ایک گروہ اس کا مخالف ہے۔ لیکن نہ حضرت عمر پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ان سے اختلاف کرنے والوں پر۔ حضرت عمر اور دیگر صحابہ اپنی رائے سے جو فتویٰ دیا کرتے تھے وہ نہ بطورِ لزوم کے ہوتا تھا اور نہ اس طور سے ہوتا تھا کہ وہی حق ہے بلکہ ایک رائے ہے اگر درست ہو تو اللہ کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہو تو صاحبِ رائے کی طرف سے لہٰذا آپ اس سلسلے میں اللہ سے استغفار کرتے تھے

موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔

السنة ما سنه الله و رسوله لا تجعلوا خطأ الرأي سنة للامة (ایضا)

سنت وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے سنت قرار دیا۔ رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت نہ بناؤ۔

مصر کی مشہور کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کا مصنف رقمطراز ہے :۔

ولكن الواقع انه لم يجد اجماع. فقد خالفهم كثير من المسلمين ومما لا شك فيه ان ابن عباس من المجتهدين الذين عليهم المعول في الدين فتقليده جائز كما ذكرنا ولا يجب تقليد عمر فيما رآه لانه مجتهد وموافقة الاكثرين له لا تحتم تقليده على انه يجوز ان يكون قد فعل ذالك لتحذير الناس من ايقاع الطلاق على وجه مغاير للسنة فان السنة ان تطلق المرأة في اوقات مختلفة على الوجه الذي تقدم بيانه فمن يجرء على تطليقها دفعة واحدة فقد خالف السنة وجزاءه هذا ان يعامل بقوله زجرا له وبالجملة فان الذين قالوا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پر اجماع ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سے مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی ہے۔ حضرت ابن عباس بلاشبہ مجتہدین میں سے تھے جن پر دین کے معاملہ میں پورا اعتماد کیا جاتا ہے لہذا آپ کی تقلید کرنا جائز ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور حضرت عمر کی ان کی رائے کے معاملہ میں تقلید کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ آپ بھی مجتہد ہی تھے۔ رہا اکثریت کا آپ سے اتفاق کرنا تو اس سے آپ کی تقلید لازم نہیں آتی ممکن ہے آپ نے لوگوں کی تعزیر کی غرض سے اسے نافذ کیا ہو جبکہ لوگ خلاف سنت طریقہ پر طلاق دے رہے تھے کیونکہ سنت یہی ہے کہ عورت کو مختلف اوقات میں طلاق دی جائے جس کے طریقہ کا اوپر بیان ہو چکا۔ تو جو شخص یکبارگی طلاق دینے کی جرأت کرتا ہے وہ سنت کے خلاف کرتا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ زجر کا معاملہ کیا جائے۔

ان الطلاق الثلث بلفظ واحد	مختصر یہ کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تین طلاقیں
یقع به واحدة لا ثلاث لهم وجه	بلفظ واحد ایک واقع ہوتی ہے، تین نہیں،
سدید وهو ان ذالك هو الواقع	ان کا کہنا معقولیت پر مبنی ہے کیونکہ عہد رسالت
فی عهد الرسول وعهد خلیفة	خلیفہ اعظم حضرت ابوبکر کے عہد اور خلافت عمر
الاعظم ابی بکر وسنتین من خلافة	کے ابتدائی دو سالوں تک ایک ہی طلاق واقع
عمر واجتهاد عمر بعد ذالك	ہوتی تھی۔ اس کے بعد حضرت عمر نے جو اجتہاد
خالفه فيه غيره فيصح تقليد	کیا اس کی دوسروں نے مخالفت کی لہذا
المخالف كما يصح تقليد عمر والله	مخالفت کرنے والے کی تقلید بھی اسی طرح درست
تعالى لم يكلفنا البحث عن اليقين	ہے جس طرح حضرت عمر کی تقلید درست ہے
فی الاعمال الفرعیة لانه یکاد	اللہ تعالیٰ نے فروعی اعمال میں کرید کر یقینی
یکون مستحیلا	صورت معلوم کرنے کا ہمیں مکلف نہیں بنایا ہے
(کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه ج۴ ص۲۴۱)	کیونکہ ایسا کرنا عملاً ممکن نہیں ہے ۔

ان تصریحات سے واضح ہوا کہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کے وقوع پر اجماع نہیں ہو بلکہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

مجلس واحد کی تین طلاقیں کن علماء و فقہاء کے نزدیک ایک واقع ہوتی ہیں

اگرچہ ائمہ اربعہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کے ایقاع کے قائل ہیں لیکن علماء و فقہاء کی ایک تعداد صرف ایک طلاق کے وقوع کی قائل ہے۔ مثلاً حضرت ابن عباس، طاؤس، عکرمہ، ابن اسحق، امام رازی، امام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، داؤد ظاہری وغیرہ

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:۔

اور اہل علم کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ طلاق، طلاق کے پیچھے نہیں واقع ہوتی اور ایسی صورت میں صرف ایک طلاق پڑتی ہے۔ صاحب بحر نے اس کو حضرت ابو موسیٰ اشعری اور ایک روایت حضرت علی سے اور حضرت ابن عباس، امام طاؤس، امام عطاء، جابر بن زید، ہادی قاسم، ناصر، احمد بن عیسیٰ، عبداللہ بن عیسیٰ بن عبداللہ اور ایک روایت زید بن علی سے نقل کی ہے

اسی طرف متاخرین کی ایک جماعت گئی ہے جس میں ابن تیمیہ، ابن قیم اور محققین کی ایک جماعت شامل ہے اور ابن المنذر نے اس کو اصحاب ابن عباس عمر و بن دینار وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ اور ابن مغیث نے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبدالرحمٰن عوف اور حضرت زبیر بن عوام سے بھی نقل کیا ہے اور مشائخ قرطبہ جیسے محمد بن تقی محمد بن عبدالسلام وغیرہ کی ایک جماعت کا بھی فتوی اس قول پر نقل کیا ہے۔

(الجواہر الغالیہ از مولانا ابو عبیدہ اعظمی بحوالہ نیل الاوطار ج ۶ ص ۲۴۵)

اہل حدیث کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے۔

علاوہ ازیں اثنا عشریوں کا بھی یہی مسلک ہے اور امامیہ کے یہاں تو تین یکجائی طلاقیں دینے سے طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی۔

حجاج بن ارطاۃ اور محمد بن مقاتل (حنفی) بھی اس کے قائل ہیں کہ اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

تین یکجائی طلاقوں کے وقوع کا اثر اسلام کے نظامِ طلاق پر درحقیقت تین یکجائی طلاقوں کے وقوع کو تسلیم کرنے کے معنے یہ ہیں کہ رجوع کا جو حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے اس کو ساقط کر دیا جائے۔ پھر معاملہ یہیں پر نہیں رکتا، بلکہ اس کو تسلیم کرنے کے بعد دوسرے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص ایک طلاق رجعی کے بجائے ایک طلاق بائن دے اور اس طرح اللہ کے بخشے ہوئے رجوع کے حق کو خود ہی ساقط کر دے تو اس کے وقوع کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور غالباً اسی لیے کچھ فقہاء کو ایک طلاق بائن کی گنجائش نکالنا پڑی ہے۔ حالانکہ قرآن و سنت کی رو سے مدخول بہا کی ایک طلاق رجعی ہی ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اسلام کا پورا نظام طلاق فقہیت اور قانونی الٹ پھیر کی زد میں آجاتا ہے جس سے شرعی احکام کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ جو عظیم مصالح معاشرتی زندگی کی تعمیر میں اسلام نے ملحوظ رکھے ہیں وہ متاثر ہو جاتے ہیں۔ اعتدال باقی نہیں رہتا اور مسلمانوں کے معاشرتی ڈھانچے کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے اس اندازِ فکر کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

مسلم ممالک میں ایک طلاق کا قانون مسلم ممالک نے تطلیقات ثلثہ کے سلسلے میں جو قوانین بنائے

ہیں ان کی حیثیت شرعی حجت کی ہرگز نہیں ہے اس لیے ان قوانین کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ کن ممالک نے اس سلسلے میں اقدامات کیے ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر یعنی بغرض معلومات ذیل میں اس کو تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے:۔

سب سے پہلے مصر نے ۱۹۲۹ء میں آن واحد کی تین طلاقوں کے اصول کو ختم کر دیا اور قانون یہ بنایا کہ متعدد طلاقیں صرف ایک طلاق شمار ہوں گی اور وہ رجعی ہوں گی۔

A divorce accompained by a nember expr-ess lyor impliedly shall count only asingle divorce and such a divorce shall be revocable (Egyption Family lawsof 1929 ART-3

اسی قسم کا قانون سوڈان نے ۱۹۲۵ء میں اردن نے ۱۹۵۱ء میں شام نے ۱۹۵۳ء میں مراکش نے ۱۹۵۸ء میں، عراق نے ۱۹۵۹ء میں اور پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں نافذ کیا۔

(ملاحظہ ہو طاہر محمود کی کتاب مسلم لاریفارم)

تاکیدی طلاقوں کا حکم کبھی محض تاکید کے لیے طلاق کا لفظ دہرایا جاتا ہے جس کی مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں۔ مرد طلاق دیتے وقت انت طالق انت طالق طالق یا طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے لیکن اس کی نیت تین طلاقیں دینے کی نہیں ہوتی بلکہ محض تاکید مقصود ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں متعدد فقہاء ایک ہی طلاق شمار کرنے کے قائل ہیں۔

حنبلی مسلک کی کتاب 'مغنی' میں علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:۔

فان قال انت طالق طالق	اگر کہا تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق
طالق وقال اردت التوکید	ہے اور کہے کہ میں نے تاکید کی غرض سے کہا
قبل منہ لان الکلام یکرر للتوکید	تھا تو اس کا یہ بیان قبول کر لیا جائے گا
کقولہ علیہ السلام فنکاحہا	کیونکہ بات تاکیداً دہرائی جاتی ہے جس طرح
باطل باطل باطل وان قصد	کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اس
الایقاع وکرر الطلقات طلقت	کا نکاح باطل ہے، باطل ہے، باطل ہے (یعنی

ثلاثا وان لم ينو شيئا لم يقع الا واحدة	ایک حدیث میں نکاح کے باطل ہونے کا لفظ تاکید کی غرض سے تین مرتبہ دہرایا گیا ہے لیکن اگر اس کی نیت تین طلاقوں کے ایقاع کی تھی اور طلاقوں کو دہرایا تھا تو پھر تین طلاقیں واقع ہوں گی اور اگر کوئی نیت نہیں کی تھی تو صرف ایک طلاق واقع ہوگی۔
(المغنی جلد اول ص۲۳۲)	

شافعی مسلک کی کتاب منہاج الطالبین میں امام نووی لکھتے ہیں :۔

وان قال انت طالق انت طالق انت طالق وتخلل فصل فثلاث والا فان قصد تاكيدا فواحدة (منہاج الطالبین ص۱۰۷)	اور اگر کہا تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے تجھے طلاق ہے اور درمیان میں فصل واقع ہوا تو تین طلاقیں پڑ گئیں ورنہ اگر اس نے تاکید کی غرض سے کہا تھا تو ایک پڑے گی

حنفی مسلک کی کتاب بہشتی زیور میں مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں :۔

کسی نے تین دفعہ کہا تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق تو تینوں طلاقیں پڑ گئیں یا گول الفاظ میں تین مرتبہ کہا تب بھی تین پڑ گئیں لیکن اگر نیت ایک ہی طلاق کی ہے فقط مضبوطی کے لیے تین دفعہ کہا کہ بات خوب پکی ہو جائے تو ایک ہی طلاق ہوئی لیکن عورت کو اس کے دل کا حال تو معلوم نہیں اس لیے یہی سمجھے کہ تین طلاقیں مل گئیں۔

(بہشتی زیور جلد ۴ ص ۲۲)

مولانا مجیب اللہ ندوی 'اسلامی فقہ' میں لکھتے ہیں :۔

البتہ اگر کسی نے اس طرح کہا کہ تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق تو اگر اس سے اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی بلکہ صرف تاکید کرنا مقصود تھی تو ایک ہی طلاق رجعی پڑے گی۔

(اسلامی فقہ جلد ۲ ص ۱۸۲)

اسی سے ملتی جلتی صورت یہ ہے کہ لوگ شرعی احکام سے ناواقفیت کی بنیاد پر تین کے عدد کی صراحت کے ساتھ طلاق دیتے ہیں لیکن بعد میں جب اس کا علم ہو جاتا ہے تو ایسا شخص کہتا ہے کہ میں

سمجھ رہا تھا کہ تین طلاق کے الفاظ استعمال کیے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔

اس صورت حال کو واقعیت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے اور اس کے اس بیان کے پیش نظر تین طلاقوں کو تاکید پر محمول کرکے ایک طلاق کے وقوع کا حکم لگانا چاہیے۔

خلاصہ بحث اور مسئلہ کا حل

تین یکجائی طلاقوں کے ایقاع کے سلسلے میں دلائل کا جو جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تین یکجائی طلاقوں کے ایقاع پر نہ قرآن کا کوئی صریح حکم موجود ہے، نہ کوئی صریح حدیث ہی ایسی ہے جس میں اس کا صریح حکم بیان کیا گیا ہو اور نہ اس پر اجماع ہی ثابت ہے بلکہ یہ مسئلہ دورِ صحابہ سے لیکر اب تک امت کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے اور دلائل دونوں طرف موجود ہیں۔ ایسی صورت میں جو بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ نصّی اور قطعی حکم کا نہیں بلکہ تعبیر و اجتہاد کا ہے۔ اس لیے اس مسئلے میں جو اختلاف ہے اس کو اجتہادی اختلاف پر محمول کرتے ہوئے فتویٰ اس اجتہادی رائے کے مطابق دیا جانا چاہیے جو مصالح امت کے لحاظ سے انسب ہو۔

ہمارے معاشرے کا حال یہ ہے کہ لوگ بری طرح جہالت میں مبتلا ہیں شرعی احکام سے بہت کم لوگ واقفیت رکھتے ہیں اسی لیے بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں اور بعد میں پچھتانے لگتے ہیں۔ دوسری طرف مردوں کی اس نادانی کے نتیجے میں خاندان کے لیے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اور تیسری طرف مسلم پرسنل لا اور اسلامی نظام معاشرت کے مخالفین شریعت پر حرف زنی کرنے اور اسلامی طرزِ معاشرت کی بڑی بھونڈی تصویر پیش کرنے لگتے ہیں جس سے جدید تعلیم یافتہ ذہن خاصا متاثر ہو رہا ہے اور شرعی قوانین کی حفاظت کی راہ میں بڑی بڑی مشکلات کھڑی ہو رہی ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر مصالحِ دین اور مصالح امت کا تقاضا ہے کہ فقہی مسلکوں کے خول میں بند رہنے کے بجائے وسیع النظری سے کام لیا جائے اور اس اجتہادی رائے کو اختیار کیا جائے جس کے مطابق تین یکجائی طلاقوں سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے مجلس واحد کی تین طلاقوں کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایک طرف عام مسلمانوں میں دینی شعور اور تقویٰ پیدا کرنے کے ساتھ انہیں طلاق دینے کے شرعی طریقے سے واقف کرایا جائے کہ اگر کوئی شخص طلاق دینا چاہے تو صرف ایک طلاق رجعی بحالتِ طہر جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو دینے پر اکتفا کرے۔ اس کے بعد اگر وہ رجوع کرنا نہیں چاہتا تو عدت گذرنے دے۔ عدت گذرنے پر دوبارہ نکاح کا موقع باقی رہے گا اس لیے پچھتانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ ایک طرف تو وسیع پیمانہ پر اس شرعی حکم سے لوگوں کو واقف کرانے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف ہماری شرعی پنچائتیں تین یکجائی طلاقوں سے ایک ہی طلاق واقع ہونے کا فتویٰ دیں۔ واللہ اعلم۔

ایک مجلس میں تین طلاق

(مولانا سید حامد علی)

مسلم پرسنل لا کے جو مسائل ہندوستان اور عالم اسلامی کے مسلمانوں کے لیے پریشان کن اور پیچیدہ بن گئے ہیں۔ ان میں ایک مجلس میں تین طلاق کا مسئلہ سرِ فہرست ہے۔ طلاق کے سلسلے میں احکام اسلام کی پیروی کی جائے تو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ طلاق اس وقت دی جائے جبکہ ناگزیر ہو اور صرف ایک طلاق رجعی دی جائے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ عدت کے اندر رجعت اور عدت کے بعد نکاح کے ذریعے میاں بیوی پھر اکٹھا ہو سکتے ہیں۔ اسلام کی ان ہدایات کے برعکس لوگ بے سوچے سمجھے طلاق دے دیتے ہیں اور تین طلاق سے کم نہیں دیتے۔ جہالت کا عالم یہ ہے کہ ایک فی ہزار مسلمان بھی طلاق سنت کا طریقہ نہیں جانتے۔ انہیں طلاق کا ایک ہی طریقہ معلوم ہے اور وہ کہ ایک سانس میں تین طلاقیں دیدی جائیں۔ وکلا تک طلاق نامے میں تین طلاقیں لکھواتے ہیں۔

ایک مجلس میں تین طلاق دے دینے کے بعد بالعموم سخت ندامت و پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ گھر کی بربادی، بچوں کی پرورش و تربیت کی دشواری، مرد کی بیوی سے محرومی اور عورت کے لیے بآسانی دوسری شادی نہ ہو سکنے اور شادی نہ ہو سکنے کی صورت میں معاش کے حصول اور اخلاق و عفت کی نگہداشت وقت ـــــ یہ سب مسائل ہجوم کر کے سامنے آتے ہیں۔ اس وقت مختلف لوگ مختلف راہیں اختیار کرتے ہیں:

۱۔ کچھ لوگ پوری ڈھٹائی اور ناخدا ترسی کے ساتھ مطلقہ بیوی کو پھر سے گھر میں ڈال لیتے ہیں اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اس سلسلے میں شریعت کے کیا احکام ہیں۔

۲۔ کچھ لوگ حلالہ کا ملعون طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ کچھ لوگ حنفی ہوتے ہوئے اہلحدیث علماء سے فتویٰ لے آتے ہیں۔

۴۔ کچھ لوگ گھر کی بربادی، بیوی سے محرومی اور اولاد کی خستہ حالی کو گوارا کر لیتے ہیں۔

پہلی صورت انتہائی غلط ہے اور فحشار اور بدکاری کی تعریف میں آتی ہے۔ دوسری صورت کے قبیح ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں جیسا کہ احادیث و آثار اور ائمہ فقہ اور محدثین کے اقوال سے واضح ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور اور اختلافی ہے کہ حلالہ کی نیت سے جو نکاح ہوتا ہے، اسے حقیقۃً نکاح کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں اور اس سے عورت سابق مرد کے لیے حلال بھی ہوتی ہے یا نہیں — ؟ سب جانتے ہیں کہ اس مسئلے میں خود حنفی ائمہ کے مابین اختلاف ہے — آخری صورت فی الواقع مسئلے کا حل نہیں ہے۔ پس تیسری صورت رہ جاتی ہے یعنی اہل حدیث مسلک، جس سے لاکھوں خاندانوں کو تباہی و بربادی سے بچایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کتاب و سنت کی رو سے اسے اختیار کرنے کی گنجائش نکل سکے اور ایک مجلس میں تین طلاق کو طلاق مغلظہ بائنہ نہ شمار کیا جائے۔

ذیل کی سطور علمائے کرام کے غور و فکر کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔ امید ہے کہ حضرات علماء مسئلہ کو حل کرنے کی نیت سے ان پر غور کریں گے۔

کتاب اللہ

ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑ جاتی ہے جس کے نتیجے میں عورت مرد کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور دوسرے مرد سے نکاح، خلوت صحیحہ اور طلاق کے بغیر اس کے لیے حلال نہیں ہوتی — کیا یہ بات کتاب اللہ سے ثابت ہے؟

کتاب اللہ کی متعلقہ آیات

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ	طلاق دو بار ہے تو معروف طریقہ پر
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ	روک لینا ہے، یا خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دینا
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا	اور تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ	انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ لو، الا یہ
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ	کہ (مرد اور عورت) دونوں کو ڈر ہو کہ وہ
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ	اللہ کی حدود قائم نہ کر سکیں گے تو اگر اے
عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ	معاشرے کے لوگو! تمہیں ڈر ہو کہ وہ اللہ

حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ٥

بقرہ ۲۲۹-۲۳۰

کی حدود قائم نہ کر سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس امر میں کہ عورت فدیہ دے کر خلع کرالے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہ ظالم ہیں۔ تو اگر اس نے دو بار کے بعد پھر طلاق دے دی تو ان دونوں کے لیے کوئی گناہ نہیں۔ جب تک وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے تو اگر وہ بھی طلاق دے دے تو ان دونوں کے لیے کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر سے نکاح کرلیں۔ اگر انہیں یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم کر سکیں گے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں وہ علم رکھنے والوں کے لیے بیان فرماتا ہے

ان آیات کو بغور پڑھ جائیے۔ ان میں ایک بار، یا ایک مجلس میں تین طلاق کا حکم موجود نہیں ہے۔ تین بار میں تین طلاق دینے کا حکم ہے۔ جن میں سے پہلی دو بار کی طلاقیں قابل رجعت ہیں۔ تین بار کی ان طلاقوں کے بارے میں قرآن مجید نے یہ حکم صادر کیا ہے کہ ایسی مطلقہ عورت تین طلاق دینے والے کے لیے حرام ہیں۔ الا یہ کہ اس کا نکاح کسی اور مرد سے ہوجائے اور وہ بھی کسی وجہ سے اسے طلاق دے دے۔ اس صورت میں وہ دونوں پھر سے نکاح کر کے میاں بیوی بن سکتے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ آیت میں نہ ایک مجلس کا ذکر ہے، نہ تین مجلسوں کا، نہ ایک طہر کا تذکرہ ہے نہ تین طہروں کا، صرف تین طلاق کے دینے کا ذکر ہے۔ آیات عام ہیں۔ تین طلاق جب بھی اور جس طرح بھی دی جائیں گی طلاق مغلظہ بائنہ پڑجائے گی۔ جواباً عرض ہے کہ قرآن پاک میں تین بار طلاق دینے کا ذکر ہے۔ جن میں سے دو بار کی طلاق کے بعد رجعت کی گنجائش ہو نہ کہ ایک بار میں تین طلاق دے دینے کا۔ کم از کم قرآن پاک کے ظاہر الفاظ کا اقتضا تو یہی ہے۔

مفسرین کی تصریحات

اب آیئے مفسرین کی تصریحات کا مطالعہ کریں۔

" اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ " کا کیا مطلب ہے؟ کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ آیت طلاق رجعی کے بیان کے لیے آتری ہے اور مطلب یہ لیتے ہیں کہ طلاق رجعی دو طلاقیں ہیں جن کے بعد رجوع کرنے اور عورت کو چھوڑ دینے، دونوں کی گنجائش ہے۔ تین طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں ہے۔

کچھ دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں مسلمانوں کو شرعی طلاق دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طلاق یکے بعد دیگرے بس دو بار ہونی چاہییں جن کے بعد رجوع کرنے یا عورت کو چھوڑ دینے کا موقع رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کے بعد بھی طلاق دے دے تو پھر یہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔

ان دو اقوال کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی ہیں لیکن بنیادی اہمیت کے اقوال یہی ہیں۔

مفسرین میں امام ابن جریر طبری رح دونوں اقوال بیان کرتے ہیں اور پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں وہ پہلے قول کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

اختلف اهل التاويل فی	تفسیر کرنے والوں کے مابین اس آیت
تاويل ذالك فقال بعضهم هو	کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے کہا
دلالة علی عدد الطلاق الذی	ہے کہ اس آیت میں طلاق کی وہ تعداد بتائی
یکون للرجل فيه الرجعة والعدد	گئی ہے جس میں مرد کو رجعت کا حق ہے اور
الذی تبين به زوجته منه	وہ تعداد جس میں عورت مرد سے جدا ہو جاتی ہے

وہ فرماتے ہیں کہ اہل عرب میں طلاق دینے کے سلسلے میں کوئی حد نہیں تھی وہ طلاقیں دیتے اور رجوع کرتے رہتے۔ اس سلسلے میں وہ کچھ آثار و اقوال نقل کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں:۔

فتاويل الآية علی هذا الخبر	ان آثار کے مطابق جو ہم نے بیان کیے
الذی ذکرنا عدد الطلاق الذی	آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ اے لوگو! طلاق کی
لكم ايها الناس فيه علی ازواجكم	وہ تعداد جس میں تمہارے لیے اپنی بیویوں
الرجعة اذا کن مدخولا بهن	کے سلسلے میں جب ان سے مباشرت ہو چکی ہو
تطليقتان ثم الواجب علی من	رجعت کا حق ہو، دو طلاقیں ہیں۔ پھر تم میں سے

راجع منکم بعد التطليقتين امساك بمعروف او تسريح باحسان لانه لا رجعة له بعد التطليقتين ان سرحها فطلقها الثالثة

جو کوئی دو طلاق دینے کے بعد رجوع کرے اس پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر عورت کو روک لے یا خوبصورتی سے چھوڑ دے کیونکہ دو طلاقوں کے بعد اس کے لیے رجعت کا حق نہیں اگر اسے چھوڑ دیا اور تیسری طلاق دے دی۔

دوسرے قول کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں :۔

وقال آخرون انما انزلت هذه الاٰية على نبي الله صلى الله عليه وسلم تعريفا من الله تعالٰى ذكره عباده سنة طلاقهم نساءهم اذا ارادوا طلاقهن لا دلالة على القدر الذى تبين به المرأة من زوجها

اور کچھ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آیت اللہ کے نبی پر اس لیے اتری ہے تاکہ اللہ اپنے بندوں کو طلاق کا طریقہ بتائے جب وہ اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہیں۔ نہ اس لیے کہ وہ ان پر طلاق کی تعداد واضح کرے جس سے عورت اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ اس سلسلے کے آثار و اقوال نقل کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں :۔

وتاويل الاٰية على قول هؤلاء سنة الطلاق التى سننتها و ابحتها لكم ان اردتم طلاق نساءكم ان تطلقوهن ثنتين فى كل طهر واحدة ثم الواجب بعد ذالك عليكم اما ان تمسكوهن بمعروف او تسرحوهن باحسان

اور ان لوگوں کے قول کے مطابق آیت کی تفسیر یہ ہوگی۔ طلاق کا طریقہ جو میں نے تمہارے لیے مقرر کیا اور جائز ٹھیرایا۔ اگر تم بیویوں کو طلاق دینا چاہو یہ ہے کہ تم انہیں دو طلاقیں دو، ہر طہر میں ایک طلاق۔ پھر اس کے بعد تم پر واجب ہے کہ انہیں معروف طریقے پر روک لو یا خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔

اس کے بعد وہ اپنی رائے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

والذى اولى بظاهر التنزيل ما قاله عروة وقتادة ومن قال

اور قرآن کے ظاہر الفاظ سے قریب بات وہ ہے جیسے عروہ، قتادہ اور ان جیسی بات

مثل قولهما من ان الآیۃ انما	کہنے والوں نے کہا ہے یعنی یہ آیت طلاق کی
هی دلیل علی عدد الطلاق	تعداد پر دلیل ہے۔ اس تعداد پر جس سے عورت
الذی یکون به التحریم وبطول الرجعۃ	حرام ہو جاتی ہے اور اس تعداد پر جس میں رجعت کا
فیه والذی یکون فیه الرجعۃ منه	حق باقی رہتا ہے۔

جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے بات بالکل واضح ہے۔ آیت میں دو طلاقوں کے یکے بعد دیگرے الگ الگ دینے اور ان سے رجعت کی گنجائش کا ذکر ہے۔ پھر تیسری بار طلاق دینے کے نتیجے میں بیوی کے حرام ہونے کا ذکر ہے۔ اس مفہوم کی رو سے (اور یہی آیت کا ظاہر مفہوم ہے) ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا حکم آیت میں نہیں ہے، بلکہ ایک بار میں تین طلاق دینا ہی غیر مشروع اور آیت میں غیر متصور ہے۔

پہلے قول کی رو سے بھی آیت ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے تعرض نہیں کرتی بلکہ جیسا کہ امام ابن جریر طبری نے صراحت کی ہے۔ آیت میں اس شکل کا ذکر ہے کہ کسی شخص نے دو طلاق رجعی دی ہو پھر رجوع کرنے کے بعد یا رجوع کیے بغیر تیسری طلاق دے دی ہو۔

علامہ زمخشری کشاف میں دونوں اقوال کا ذکر کر کے دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں وہ الطلاق مرتان کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الطلاق بمعنی التطلیق	طلاق، تطلیق (طلاق دینا) کے معنے
کالسلام بمعنی التسلیم ای التطلیق	میں ہے جیسے سلام، تسلیم (سلام کرنا) کے معنے
الشرعی تطلیقۃ بعد التطلیقۃ	میں ہے یعنی مشروع طلاق دینا یہ ہے کہ
علی التفریق دون الجمع والارسال	طلاق کے بعد طلاق دی جائے۔ الگ الگ نہ کہ
دفعۃ واحدۃ ولم یرد بالمرتین	ایک ساتھ اور ایک دم۔ ایک ہی بار میں۔
التثنیۃ ولکن التکریر کقوله	اور مرتان سے مراد تثنیہ نہیں ہے بلکہ تکرار
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ ای کرۃ بعد	ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا ارجع البصر
کرۃ لا کرتین ثنتین ونحو ذلك	کرتین (آنکھ کو بار بار لوٹاؤ) یعنی ایک بار
من التثانی التی یراد بها التکریر	اور نہ کہ دو بار۔ اور اس قسم کے تثنیہ کی جو سے
قولهم لبیك وسعدیك وحنانیك	مراد تکرار ہوتی ہے، مثال اہل عرب کے اقوال میں

وهذا ذيك وذ واليك	ہے۔ لبیک، سعدیک، حنانیک
	هذا ذيك اور ذ واليك

پھر وہ پہلے قول کا ذکر کرتے ہیں، مگر ذرا مختلف انداز میں فرماتے ہیں:۔

وقيل معناه الطلاق الرجعي	اور ایک قول یہ ہے کہ آیت کے معنے
مرتان لانه لا رجعة بعد	یہ ہیں کہ طلاق رجعی دو بار ہے کیونکہ تیسری
الثلاث	کے بعد رجعت نہیں۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ علامہ زمخشری نے ثنتان (دو) کے بجائے (مَرَّتَانِ) (دو بار) کہا ہے۔ فلان طلقها فلا تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ کی تفسیر میں وہ اور زیادہ واضح انداز میں لکھتے ہیں:۔

فان طلقها الطلاق المذكور	تو اگر اس نے طلاق دی جس کا وصف
الموصوف بالتكرار في قوله الطلاق	تکرار ہے اور جس کا ذکر الطلاق مرتان
مَرَّتَانِ واستوفى نصابه او	میں ہے اور اس کا نصاب (تین) پورا کر دیا
فان طلقها مرة ثالثة بعد مرتين	یا اس نے دو بار کے بعد تیسری بار طلاق دیدی

امام فخر الدین رازیؒ تفسیر کبیر میں اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ کے تحت دوسرے قول کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

اختلف المفسرون ان هذا	مفسرین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ
حكم مبتدا او هو متعلق بما قبله	نیا حکم ہے جس کے ذکر کی ابتدا یہیں سے ہو یا یہ
قال قوم انه حكم مبتدء ومعناه	ماقبل سے متعلق ہے۔ ایک گروہ نے کہا یہ
ان التطليق الشرعي يجب ان	ایک حکم ہے جس کا آغاز یہیں سے ہے اور
يكون تطليقة بعد تطليقة على	آیت کے معنے یہ ہیں کہ شرعی طلاق ضروری
التفريق دون الجمع والارسال	ہے کہ طلاق دینے کے بعد طلاق دینا ہو الگ
دفعة واحدة وهذا التفسير	الگ، نہ کہ ایک ساتھ، ایک دم، ایک ہی بار
هو قول من قال الجمع بين	میں اور یہ تفسیر ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں
الثلاث حرام وزعم ابو زيد	کہ ایک دم تین طلاق دینا حرام ہے اور

الدبوسی فی الاسرار ان ھذا ہو قول عمر وعثمان وعلی و عبد اللہ بن مسعود وعبد اللہ ابن عباس وعبد اللہ بن عمر وعمران بن حصین وابی موسی الاشعری وابی الدرداء وحذیفۃ رضی اللہ عنہم

ابو زید دبوسی نے "اسرار" میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ قول ہے حضرت عمر رضؓ، عثمان رضؓ، علی رضؓ، عبداللہ بن مسعود رضؓ، عبداللہ بن عباس رضؓ، عبداللہ ابن عمر رضؓ، عمران بن حصین رضؓ، ابو موسیٰ اشعری، ابو درداء اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کا۔

معلوم ہوا کہ یہ قول فقہاء صحابہ کی اکثریت کا ہے :۔

اس کے بعد پہلے قول کا ذکر امام رازی ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

والقول الثانی فی تفسیر الآیۃ ان ھذا لیس ابتداء کلام بل ھو متعلق بما قبلہ والمعنی ان الطلاق الرجعی مرتان ولا رجعۃ بعد الثلاث وھذا قول من جوز الجمع بین الثلاث و ھو مذھب الشافعی رح

اور آیت کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نیا کلام نہیں ہے بلکہ یہ ماقبل سے متعلق ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ طلاق رجعی دو بار ہے اور تین کے بعد رجعت نہیں اور یہ ان لوگوں کا قول ہے جو بیک وقت تین طلاق کے جواز کے قائل ہیں اور یہ امام شافعی کا مسلک ہے۔

بیک وقت تین طلاق کے مشروع ہونے کے قائل امام شافعی اور علامہ ابن حزم ہیں۔ جمہور ائمہ فقہ و حدیث اس طلاق کو غیر مشروع اور بدعت تصور کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضؓ اس پر تازیانے سے سزا دیتے تھے۔

امام رازی رح آیت کی تفسیر میں ایک اور قول نقل کرتے ہیں :۔

القول الثالث فی تفسیر الآیۃ ان نقول انھا لیست کلاما مبتدا بل ھی متعلقۃ بما قبلھا وذالک لانہ تعالی بین فی الآیۃ الاولی ان حق المراجعۃ ثابت للزوج ولم یذکر ان ذالک

تیسرا قول آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایسی بات نہیں ہے جس کا آغاز یہیں سے ہوا بلکہ یہ بات ماقبل سے متعلق ہے اور یہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں یہ بیان کیا کہ رجوع کرنے کا حق شوہر کے لیے ثابت ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ حق دائماً

الحق ثابت دائما الى غاية معينة فكان ذالك كالمجمل المفتقر الى المخصص نبين هذه الاية ان ذالك الطلاق الذى ثبت فيه للزوج حق الرجعة هو ان يوجد طلقتان فقط واما بعد الطلقتين فلا يثبت البتة حق الرجعة بالالف واللام فى قوله الطلاق للمعهود السابق يعنى ذالك الطلاق الذى حكمنا فيه بثبوت الرجعة هو ان يوجد مرتين فهذا تفسير حسن،

ثابت ہو یا کسی وقت مقررہ تک تو آیت مجمل ہوئی جس کے لیے کسی مخصص کی ضرورت ہو تو اس آیت میں اللہ نے واضح فرمایا کہ وہ طلاق جس میں عورت کے لیے رجعت کا حق ثابت ہے وہ یہ ہے کہ فقط دو طلاقیں دی جائیں۔ دو طلاقوں کے بعد رجعت کا حق ہرگز نہ رہے گا۔ یہ بات الف اور لام سے واضح ہوتی ہے۔ جو الطلاق میں ہے اور جو معہود سابق کے لیے ہے یعنی وہ طلاق جس کے بارے میں ہم نے رجعت کے ثابت ہونے کا حکم دیا وہ یہ ہے کہ طلاق دو بار دی جائے تو یہ بہتر تفسیر ہے جو آیت کے نظم کے مطابق ہے۔

امام رازی کے اس قول اور پہلے قول میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی حنفی رح احکام القرآن میں ان آیات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے تین مفہوم بیان کرتے ہیں:۔

قال ابوبكر قد ذكرت فى معناه وجوه احدها انه بيان للطلاق الذى تثبت معه الرجعة يروى ذالك عن عروة بن الزبير وقتادة والثانى انه بيان لطلاق السنة المندوب اليه ويروى ذالك عن ابن عباس ومجاهد والثالث

ابوبکر نے کہا اس آیت کے معنے کے سلسلے میں کئی اقوال بیان کیے گئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اس طلاق کا بیان ہے جس کے ساتھ رجعت کا حق ہوتا ہے۔ یہ قول عروہ بن زبیر اور قتادہ سے مروی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ طلاق سنت کا بیان ہے جو طلاق کا پسندیدہ طریقہ ہے۔ اس قول کی روایت ابن عباس اور مجاہد سے کی گئی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ

امر بانه اذا اراد ان يطلقها	یہ حکم ہے کہ جب کوئی تین طلاق دینے کا
ثلاثا فعليه تفريق الطلاق	ارادہ کرے تو اس کے ذمے ہے کہ وہ طلاق
فيتضمن الامر بالطلاق	الگ الگ کرکے دے۔ اس میں یہ بات
مرتين ثم ذكر بعدهما	بھی آجاتی ہے کہ صرف دو بار طلاق دی جائے
الثالثة	اس کے بعد تیسری طلاق کا ذکر کیا گیا ہے

آخری دو اقوال کی رو سے ان آیات میں طلاق کے ایک ایک کرکے دینے کا ذکر یا حکم ہے نہ کہ ایک بار میں تینوں طلاق دینے کا پہلے قول کی رو سے بھی یہ آیت ایک مجلس میں تین طلاق دینے کے حکم کے سلسلے میں صریح نہیں ہے کیونکہ اس قول کی رو سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ طلاق رجعی دو طلاقیں ہوتی ہیں جن کے بعد چھوڑنے اور رجوع کرنے دونوں کا حق باقی رہتا ہے۔ دو طلاق کے بعد اگر تیسری طلاق دے دے تو یہ حق باقی نہیں رہتا۔ تین طلاق ایک ساتھ دینے کا تذکرہ آیت میں کسی مفہوم کی رو سے نہیں ہے۔

امام ابو بکر جصاص رازی قول ثانی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قال ابو بكر فاما قول	ابو بکر نے کہا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس
من قال انه بيان لما يبقى معه	آیت میں اس طلاق کا ذکر ہے۔ ظاہر آیت
الرجعة من الطلاق فانه وان	سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مقصود
ذكر معها الرجعة عقيبه فان ظاهره	مباح طلاق کا بیان ہے جس کے ماسوا طلاقیں
يدل على انه قصد به بيان	ممنوع ہے۔ اس کے ساتھ اگر اسی حکم کے
المباح منه واما عداه فمحظور	مطابق طلاق واقع کی تو اس کا کیا حکم ہے
وبين مع ذلك حكمه اذا اوقعه	اسے بھی واضح کیا گیا ہے۔ یہ بات کہ اس
على الوجه المامور به بذكر	آیت میں طلاق کو الگ الگ دینے کا حکم
الرجعة عقيبه والدليل على	اور تین سے کم طلاق کے واقع کرنے سے متعلق
ان المقصد فيه الامر بتفريق	حکم یعنی رجعت کا بیان کرنا مقصود ہے۔
الطلاق وبيان حكم ما يتعلق	اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے دو بار فرمایا۔

بايقاع ما دون الثلاث
من الرجعة انه قال الطلاق
مرتان و ذالك يقتضي
التفريق لا محالة لانه
ان طلق اثنتين معا لما
جاز ان يقال طلقها
مرتين وكذالك لو دفع
رجل الى آخر درهمين
لم يجز ان يقال اعطاه
مرتين حتى يفرق الدفع
فحينئذ يطلق عليه واذا
كان هذا هكذا فلو كان الحكم
المقصود باللفظ هو ما تعلق بالتطليقتين
من بقاء الرجعة لادى ذالك الى
اسقاط فائدة ذكر مرتين اذا كان
الحكم ثابتا في المرة الواحدة اذا
طلق اثنتين فثبت بذالك ان
ذكره للمرتين انما هو امر بايقاع
مرتين ونهي عن الجمع بينهما في
مرة واحدة ومن جهة اخرى لو
كان اللفظ محتملا للامرين لكان
الواجب حمله على اثبات الحكم
في ايجاب الفائدتين وهو الامر

طلاق دو بار ہے" اور اس کا تقاضا الگ
الگ طلاق دینا ہے کیونکہ اگر اس نے
دو طلاقیں دیں تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس
نے دو بار طلاق دی۔ اسی طرح اگر کسی شخص
نے کسی کو دو درہم دیے تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا
کہ اس نے اسے دو بار دیے جب تک وہ
الگ الگ نہ دے تب تک اس پر دو بار دینے
کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس صورت میں آیت
کے الفاظ کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ دو
طلاق کے بعد رجعت کا حق باقی رہتا ہے تو
مرتین (دو بار) کے لفظ کا ذکر بے فائدہ ہوگا
کیونکہ اگر وہ ایک ہی بار میں دو طلاق دے
تب بھی یہ حکم ثابت ہے۔ اس سے ثابت ہوا
کہ اللہ کا مرتین (دو بار) کے لفظ کا ذکر دو
طلاق دینے کے حکم اور دو طلاقوں
کو ایک ہی بار میں دے دینے سے منع کرنے
کے لیے ہے۔ ایک اور پہلو سے اگر لفظ دو امور
کو محتمل ہو تو ضروری ہوگا کہ اسے دونوں امور
پر محمول کیا جائے تاکہ دو فائدے ثابت ہوں
اور یہاں وہ دو امور یہ ہیں۔ طلاق کو الگ
الگ دینے کا حکم جب دو طلاق دینے کا ارادہ
کرے اور رجعت کے حکم کا بیان جب اس طرح
طلاق دے تو لفظ دو معنے پر حاوی ہوگا اور

بتفريق الطلاق متى اراد ان يطلق اثنتين وبيان حكم الرجعة اذا طلق كذالك فيكون اللفظ مستوعبا للمعنيين في قوله تعالى الطلاق مرتان وان كان ظاهره الخبر فان معناه الامر كقوله تعالى والمطلقات يتربصن بانفسهن ثلثة قروء والوالدات يرضعن اولادهن وما جرى هذا المجرى مما هو في صيغة الخبر

اللہ کا فرمان الطلاق مرتان (طلاق دو ہے) ظاہر الفاظ کی رو سے اگرچہ خبر ہے مگر معنی حکم ہے جیسے المطلقات یتربصن بانفسهن ثلثة قروء۔ مطلقہ عورتیں تین ماہواری تک انتظار کریں گی اور والوالدات يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ "مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں گی"۔ اور اس طرح کی دوسری آیتیں جن کا صیغہ خبر کا ہے مگر معنے امر (حکم) کا ہے۔

گویا امام ابوبکر جصاص ؒ مصر ہیں کہ الطلاق مرتان میں دو طلاق کا نہیں دو بار طلاق کا ذکر ہے یہ بحث آگے بڑھتی ہے جس کے بعد وہ امام شافعی کا قول نقل کرکے اس کے جواب میں مزید دلائل لکھتے ہیں فرماتے ہیں:۔

وقال الشافعي فيما رواه عنه المزني لا يحرم عليه ان يطلقها ثلاثا ولو قال انت طالق ثلاثا للسنة وهي طاهرة من غير جماع طلقت ثلاثا معا قال ابوبكر فنبدأ بالكلام على الشافعي في ذالك فنقول ان دلالة الآية التي تلونا ظاهرة في بطلان هذه المقالة لانها تضمنت الامر بايقاع الاثنتين في مرتين فمن اوقع الاثنتين في مرة فهو مخالف

اور امام شافعی نے جیسا کہ مزنی نے ان سے روایت کیا ہے، فرمایا ہے کہ تین طلاق (بیک وقت) دینا حرام نہیں ہے۔ اگر اس نے کہا تم پر تین طلاق سنت" اور وہ پاک ہے اور اس پاکی میں اس سے مباشرت نہیں کی گئی ہے تو اس پر بیک وقت تین طلاق پڑ جائیں گی۔ ابوبکر نے کہا اب ہم اس مسئلے میں امام شافعی پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس آیت کی ہم نے تلاوت کی اس سے اس بات کا غلط ہونا واضح ثابت ہے کیونکہ اس آیت میں یہ حکم موجود ہے کہ دو طلاقیں دو بار

تحليمها ومما يدل على ذلك قوله
تعالى لا تحرموا طيبات ما احل
الله لكم وظاهره يقتضي تحريم
الثلاث مما فيها من تحريم ما
احل لنا من الطيبت والدليل
على ان الزوجات قد تناولها
هذا العموم قوله تعالى فانكحوا
ما طاب لكم من النساء فوجب
بحق العموم حظر الطلاق الثلث
لتحريمها ولولا قيام الدلالة في
ايقاع الثلاث في وقت السنة
وايقاع الواحدة لغير المدخول
بها لاقتضت الآية حظره و
من جهة اخرى من دلائل الكتاب
ان الله تعالى لم يبح الطلاق
ابتداء فمن تجب عليها العدة
الا مقرونا بذكر الرجعة فمنها قوله
تعالى الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ
بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ و
قوله تعالى وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ
بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وقوله تعالى
وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ

میں دی جائیں تو جس شخص نے ایک بار تین
طلاقیں دیں اس نے آیت کے حکم کی خلاف ورزی
کی اور تین طلاق کے حرام ہونے کی ایک اور
دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "جو پاکیزہ چیزیں
اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں
حرام نہ کرو۔ آیت کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ
ہے کہ تین طلاق حرام ہو کیونکہ اس سے ان
پاکیزہ عورتوں کی حرمت ہوتی ہے جو اللہ نے
ہمارے لیے حلال کی ہیں۔ یہ بات کہ آیت
کے لفظ "طیبات" کے عموم میں عورتیں بھی داخل
ہیں۔ اس کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے عورتوں
میں جو تمہیں طیب لگیں ان سے نکاح کر لو۔ ان
الفاظ کے عموم سے وہ طلاق ممنوع ثابت
ہوتی ہے جو عورتوں کو حرام کر دے اور اگر
سنت کے وقت میں تین طلاقوں کے واقع
کرنے اور غیر مدخول بہا کے لیے ایک طلاق کے
واقع کرنے کے سلسلے میں دلائل نہ ہوتے تو آیت
اس کی حرمت کی مقتضی تھی۔ کتاب اللہ
کے دلائل کا ایک اور پہلو۔ اللہ نے عدت والی
عورت کے لیے طلاق مباح نہیں کی مگر اس کے
ساتھ رجعت کا ذکر ضرور کر دیا ہے جیسے اللہ
تعالیٰ کا ارشاد الطلاق مرتان فامساک
بمعروف اور والمطلقات یتربصن الآیۃ

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ فلم يبح الطلاق المبتدأ للذوات العدد الا مقرونا بذكر الرجعة وحكم الطلاق ماخوذ من هذه الآيات لولاها لم يكن للطلاق من احكام الشرع فلم يجز لنا اثباته مسنونا الا هذه الطريقة وبهذا الوصف وقال النبي صلى الله عليه وسلم من ادخل في امرنا ما ليس منه فهو رد اقل احوال اللفظ حظر خلاف ما تضمنته الآيات التي تلونا من ايقاع الطلاق مبتدأ مقرونا بما يوجب الرجعة

اور "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ" الآیۃ تو ابتداءً عدت والی عورتوں کے لیے طلاق کو جائز نہیں قرار دیا مگر رجعت کا ذکر اس کے ساتھ کیا، طلاق کا حکم ان ہی آیات سے ماخوذ ہے، اگر یہ آیات نہ ہوتیں تو طلاق احکام شرع میں سے نہ ہوتی، پس ہمارے لیے طلاق کا اثبات سنت کے طور پر اس وقت جائز ہے جب وہ اس طرح اور اس وصف کے ساتھ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص ہمارے معاملہ (دین) میں وہ چیز داخل کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ قابل رد ہے اور ان الفاظ کے مفہوم کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ جو طلاق ان آیات کے خلاف ہو جن میں طلاق کے اس طرح واقع کرنے کا ذکر ہے کہ اس کے بعد رجعت ہو سکے وہ ممنوع ہے۔

اس کے بعد امام ابوبکر جصاص احادیث و آثار صحابہ نقل کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں:۔

فقد ثبت عن هؤلاء حظر جمع الثلاث ولا يروى عن احد من الصحابة خلافه فصار اجماعا

تو ان صحابہ سے تین طلاق بیک وقت دینے کی حرمت ثابت ہوئی اور کسی صحابی سے اس کے خلاف نہیں تو (اس پر صحابہ کا) اجماع ہو گیا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا حرام ہے اور مذکورہ بالا آیات

میں ایک مجلس میں تین طلاق کا ذکر موجود نہیں ہے، بلکہ تین بار میں تین طلاق دینے کا ذکر ہے۔
اس ساری بحث کے باوجود امام ابوبکر جصاص ان آیات سے یہ مفہوم بھی اخذ کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے بیک وقت تین طلاق دے دیں تو تینوں واقع ہوجائیں گی۔ فرماتے ہیں:۔

قال ابوبکر قوله تعالیٰ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ الآیة یدل علی وقوع الثلاث معا مع کونه منهیا عنها وذلك لان قوله تعالیٰ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ قد ابان عن حکمه اذا وقع اثنتین بان یقول انت طالق انت طالق فی طهر واحد وقد بینا ان ذلك خلاف السنة فاذا کان فی مضمون الآیة الحکم بجواز وقوع الاثنتین علی هذا الوجه دل ذلك علی وقوعهما لو اوقعهما معا لان احدا لم یفرق بینهما وفیها الدلالة علیه من وجه آخر وهو قوله تعالیٰ فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فحکم بتحریمها علیه بالثالثة بعد الاثنتین ولم یفرق بین ایقاعها فی

ابوبکر نے کہا اللہ تعالیٰ کا قول الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان الآیۃ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت واقع ہوجائیں گی باوجودیکہ وہ ممنوع ہیں کیونکہ ارشاد الٰہی الطلاق مرتان میں طلاق کا حکم بیان ہوا ہے جبکہ وہ ایک طہر میں انت طالق انت طالق کہہ کر دو طلاقیں دے۔ ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ ایسا کرنا خلاف سنت ہے تو جب آیت کے اندر اس طرح کا مفہوم موجود ہے کہ اس طرح دو طلاقیں واقع کرنا جائز ہے تو اگر دونوں کو ایک ساتھ واقع کردے تو آیت دلالت کرتی ہے کہ وہ دونوں واقع ہوجائیں گی کیونکہ کسی نے دونوں شکلوں میں فرق نہیں کیا ہے اور اس بات کے لیے آیت میں ایک اور پہلو سے دلالت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" اس جملہ میں اللہ نے دو کے بعد تیسری طلاق پر عورت کے حرام ہونے کا ذکر کیا اور اس بات میں تفریق نہیں کی کہ وہ دونوں طلاقیں ایک طہر

طہر واحد او فی اطہار	میں واقع کی گئی تھیں یا دو طہروں میں تو ان
فوجب الحکم بایقاع	آیت سے یہ لازم آیا کہ سب طلاقوں کے وقوع
الجمیع علی ای وجہ اوقعہ	کرنے کا حکم کیا جائے خواہ وہ کسی طرح دی
من مسنون او غیر مسنون	جائیں مسنون طریقے پر یا غیر مسنون طریقہ پر
ومباح ومحظور	مباح طریقے پر یا ممنوع طریقہ پر "

لیکن امام جصاص کی اس بحث سے خود واضح ہے کہ یہ آیت کا صریح حکم نہیں ہے بلکہ اس سے مستنبط ہے۔ آیت میں جو حکم ہے وہ تین بار طلاق دینے کے سلسلے میں ہے نہ کہ ایک بار میں تین طلاق کے سلسلے میں اس ذیل میں امام ابوبکر جصاص نے ایک طہر یا کئی طہروں کی جو بحث چھیڑ دی ہے اس کا تعلق فی الواقع حدیث سے ہے نہ کہ قرآن سے ۔

اپنے اس قول پر ایک اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں ۔

فان قیل قد مت بدیا	اگر کہا جائے کہ تم نے آیت کے معنے
فی معنی الآیۃ ان المراد بہا	کے سلسلے میں پہلے ہی یہ واضح کیا تھا کہ آیت
بیان المندوب الیہ والمامور	کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ طلاق کا مطلوب
بہ من الطلاق وایقاع الطلاق	اور مامور بہ طریقہ کیا ہے اور تین طلاقوں کا
الثلاث معاخلاف المسنون	بیک وقت واقع کرنا تمہارے نزدیک خلاف
عندک فکیف تحتج بہا فی	سنت ہے تو تم اس آیت سے طلاق کے
ایقاعہا علی غیر الوجہ المباح	غیر مباح طریقے پر واقع کرنے کے سلسلے میں کیا
والآیۃ لم تتضمنہا علی ھذا	استدلال کر رہے ہو حالانکہ آیت کے مفہوم
الوجہ قیل لہ دلت الآیۃ فی	میں یہ طریقہ داخل نہیں ہے ۔ جواب میں کہا
ھذہ المعانی کلہا من ایقاع	جائے گا کہ آیت دو اور تین طلاقوں کے
الاثنتین والثلاث بغیر السنۃ	غیر مسنون طریقے پر واقع کرنے کی شکلوں پر بھی
وان المندوب الیہ والمسنون	دلالت کرتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ
تفریقہا فی الاطہار ولیس یمتنع	مطلوب اور مسنون طریقہ طہروں میں تفرق

ان یکون مراد الآیة	طور پر طلاق دینا ہے اور یہ بات ممتنع نہیں
جمیع ذالک الاتری انہ	ہے کہ آیت کا مفہوم یہ سب کچھ ہو کیا تم
لو قال طلقوا ثلاثا فی اطہار	نہیں دیکھتے کہ اگر اللہ یہ فرماتا کہ طلاق تین
وان طلقتم جمیعا معا	بار (مختلف طہروں میں دو لیکن اگر تم نے
وقعن کان جائزا واذا	تینوں طلاقیں ایک بار دے دیں تو وہ واقع
لم یتنافی المعنیان و	ہو جائیں گی تو یہ فرمانا صحیح ہوتا تو جب دونوں
احتملتهما الآیة واجب	مفہوم ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور
حملها علیهما	آیت دونوں کو محتمل ہے تو آیت کا دونوں
	پر محمول کرنا ضروری ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام ابوبکر جصاصؒ فی الواقع اعتراض کا جواب نہیں دے سکے ہیں اور انھوں نے عدم امتناع اور احتمال کا سہارا لیا ہے جن سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور وہ بھی عورت کی حرمت مغلظہ جیسا حکم، ایسے حکم کے لیے صریح نص چاہیے، نہ کہ احتمالات اور عدم امتناعات۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آیت کا مفہوم یہ ہوتا کہ تین طلاق ایک مجلس میں ہوں یا متعدد مجالس میں، ایک بار میں ہوں یا کئی بار میں، متفرق ہوں یا ایک ساتھ، ہر حال میں عورت حرام ہو جائے گی تو آیت کے الفاظ یہ نہ ہوتے۔ "اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ــ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" ــــ بلکہ یوں ہوتے۔

"اَلطَّلَاقُ اِثْنَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ــ وان طلقها ثلاثا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔

ان الفاظ کے نہ ہونے اور مرتان اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے الفاظ کے ہونے کی صورت میں آیت کے صریح معنے ہیں کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا فِی الْمَرَّةِ الثَّالِثَةِ بَعْدَ الْمَرَّتَيْنِ جیسا کہ امام ابوبکر جصاصؒ علامہ زمخشری اور دوسرے مفسرین نے اس مفہوم کا ذکر کیا ہے۔

ایک اور اعتراض کا ذکر کر کے اس کا جواب دیتے ہوئے امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:۔

فان قیل معنی هذه الآیة	اگر کہا جائے کہ اس آیت کا مفہوم محل

محمول على ما بينه نبقى له
فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وقد
بين الشارع الطلاق للعدة
وهو ان يطلقها في ثلثة اطهار
ان اراد ايقاع الثلث و متى
خالف ذالك لم يقع طلاقه
قيل لم تستعمل الآيتين على
ما تقتضيانه من احكامهما
فنقول ان المندوب اليه
المامور به هو الطلاق للعدة
على ما بينه في هذه الآية وان
طلق لغير العدة وجمع الثلث
وقعن لما اقتضته الآية الاخرى
وهي قوله تعالى فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا
تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ اذ ليس في قوله
فطلقوهن نفي لما اقتضته
هذه الآية الاخرى على ان
في فحوى الآية التي فيها ذكر
الطلاق للعدة دلالة على
وقوعها اذا طلق لغير العدة
وهو قوله تعالى فطلقوهن
لعدتهن الى قوله وَتِلْكَ حُدُودُ
اللهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ

ہے اس بات پر جیسے اللہ نے اپنے ارشاد
فطلقوهن لعدتهن میں بیان فرمایا
ہے (انہیں طلاق ان کی عدت کے وقت دو)
اور شارع نے طلاق للعدۃ کی توضیح یہ کی ہے
کہ طلاق تین طہروں میں دی جائے اگر تین
طلاق دینے کا ارادہ ہو۔ جب طلاق دینے
والے نے اس کے خلاف کیا (اور بیک وقت
تین طلاقیں دے دیں) تو طلاق واقع نہیں
ہوئی (جواب میں کہا جائے گا کہ ہم دونوں
آیتوں پر ان احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں
جن کی وہ مقتضی ہیں۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ
مطلوب اور مامور طلاق عدت ہی ہے۔
جیسا کہ اس آیت میں واضح کیا ہے لیکن
اگر اس نے طلاق لغیر العدۃ دی اور تین
طلاقیں بیک وقت دیں تو تینوں واقع ہو جائیں
گی کیونکہ دوسری آیت الطلاق مرتان
اور فان طلقها فلا تحل له من بعد
کا اقتضا یہی ہے کیونکہ آیت فطلقوهن
لعدتهن میں اس بات کی نفی نہیں ہے
جس کا اقتضا دوسری آیت کرتی ہے۔ علاوہ
ازیں اس آیت کے مفہوم میں بھی جس میں
طلاق عدت کا ذکر ہے یہ بات موجود ہے کہ
طلاق لغیر العدۃ دینے کی شکل میں تینوں طلاقیں

فقد ظلم نفسہ فلولا انہ اذا طلق لغیر العدۃ وقع ما کان ظالما لنفسہ بایقاعہ ولا کان ظالما لنفسہ بطلاقہ

واقع ہوجائیں گی چنانچہ آیت فطلقوھن لعدتھن کے آخر میں ہے۔ وتلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ تو اگر طلاق لغیر العدۃ واقع نہ ہوتی تو اسے واقع کرنے سے اور طلاق دینے سے وہ خود پر ظلم کرنے والا نہ ہوتا۔

اس بحث میں امام موصوف نے ایک بار میں تین طلاق دینے کے سلسلے میں الطلاق مرتان الآیۃ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ گویا ان آیات کی رو سے ایک مجلس میں تین طلاق کا طلاق مغلظہ بائنہ ہونا کوئی ثابت شدہ امر ہو حالانکہ یہی چیز محل گفتگو ہے۔ پھر انھوں نے فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ سے طلاق کے وقوع پر جو استدلال کیا ہے وہ اور بھی عجیب ہے۔ حالانکہ ظلم نفس سے مراد صریح طور پر گناہ اور اس کے نتائج ہیں۔ اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ طلاق لغیر العدۃ واقع ہوجائے اور وہ بھی اس طرح کہ طلاق مغلظہ بائنہ پڑجائے۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا۔

اے نبی! اہل ایمان سے کہد و کہ جب تم بیویوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت شمار کرو اور اللہ اپنے رب سے ڈرو۔ انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں اور یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا۔ تم نہیں جانتے ہو سکتا ہے اللہ اس کے بعد کوئی امر پیدا فرمائے۔

ان آیات میں فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ کا تعلق متعدد امور سے ہے نہ کہ صرف طلاق لغیر العدۃ سے اور

صحیح مفہوم یہی ہے کہ حدود اللہ کی خلاف ورزی کرنے والا گنہگار اور عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا۔ ظلم نفس کا لفظ قرآن مجید میں بالعموم اللہ کی نافرمانی کرکے اپنے نفس کی حق تلفی کرنے اور اسے ہلاکت میں ڈالنے کے مفہوم میں آیا ہے اور یہی مفہوم یہاں بھی ہے۔ اس سے کسی قانونی حکم کا استخراج صحیح نہیں۔

امام ابو بکر جصاصؒ مزید فرماتے ہیں:-

وفی هذه الآیة دلالة علی وقوعها اذا طلق لغیر العدة ویدل علیه قوله تعالی فی نسق الخطاب ومن یتق الله یجعل له مخرجا یعنی والله اعلم انه اذا اوقع الطلاق علی ما امره الله کان له مخرجا مما اوقع ان لحقه ندم وهو الرجعة

اور اس آیت میں تین طلاقوں کے وقوع پر دلالت ہے جبکہ طلاق دینے والا طلاق لغیر العدۃ دے اور اس سلسلۂ کلام میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے ومن یتق اللہ الآیۃ (اور جو اللہ کی نافرمانی سے بچے گا اللہ اس کے لیے راہ نکال دے گا) یعنی اگر اس نے خدا کے حکم کے مطابق طلاق واقع کی تو ندامت کی شکل میں اس کے لیے نکلنے کی شکل یعنی رجعت ہوگی۔

لیکن یہ اس آیت کا مفہوم نہیں ہے۔ یہ مخرج کی ایک ممکنہ شکل ہے۔ یوں بھی یہ پوری آیت کسی متعین شکل کے بجائے عمومی مفہوم ہی پر دلالت کرتی ہے۔ پوری آیت، بلکہ آیات یوں ہیں:-

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ

تو جب وہ اپنی مدت عدت کو پہنچنے لگیں تو انہیں معروف طریقے پر روک لو یا معروف طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو ثقہ لوگوں کو گواہ بنا لو اور اللہ کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔ اس بات کی نصیحت تم میں سے ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لیے راہ نکالے گا اور اسے اس جگہ سے

بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق، ۲،۳)	روزی دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یقیناً اللہ اپنے فیصلے کو نافذ کرکے رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ نے ہر شے کے لیے اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

ان آیات میں امساک بالمعروف، تفریق بالمعروف، طلاق یا رجوع پر گواہ بنانے اور سچی گواہی دینے، کئی امور کا ذکر ہے۔ مسئلہ زیر بحث سے براہ راست ان آیات کا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں گذشتہ آیت میں طلاق للعدۃ کا ذکر ضروری ہے۔ بہرحال ان آیات سے وہ حکم نکالنا صحیح نہیں ہے جو امام موصوف نے نکالا ہے ـــــ پھر ایک بات اور قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص تین طہر میں تین طلاقیں دے تو وہ تقویٰ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس کے باوجود نادم ہونے کی صورت میں اس کے لیے رجوع کا حق باقی نہیں رہتا حالانکہ امام ابوبکر جصاص کی تشریح کی رو سے اس کے لیے بھی کوئی صورت نکلنی چاہیے۔ ایک اور اعتراض کا جواب دیتے ہوئے امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:۔

فان قيل لما كان عاصيا بايقاع الثلاث معا لم يقع اذ ليس هو الطلاق المامور به كما لو وكل رجل رجلا بان يطلق امراته ثلاثا في ثلثة أطهار لم يقع اذا جمعهن في طهر واحد قيل له اما كونه عاصيا في الطلاق فغير مانع صحته ووقوعه لما دللنا في ما سلف ومع ذالك فان الله جعل الظهار منكرا من القول	اگر یہ کہا جائے کہ وہ تین طلاق کے بیک وقت دینے سے گناہگار ہوتا ہے اس لیے وہ واقع نہ ہوں گی۔ کیونکہ یہ وہ طلاق نہیں ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی شخص کو اس بات کے لیے وکیل بنائے کہ وہ اس کی بیوی کو تین طہروں میں تین طلاق دے۔ اگر وہ ایک ہی طہر میں تین طلاقیں دے دے تو وہ واقع نہ ہوں گی۔ کیونکہ کہا جائے گا کہ طلاق کے سلسلے میں اس کا نافرمان ہونا طلاق کے وقوع کے سلسلے میں مانع نہ ہوگا۔ ان دلائل کی بنا پر جو ہم اس سے قبل بیان کرچکے ہیں۔ چنانچہ

وزورا وحكم مع ذالك بصحته
ووقوعه فكونه عاصيا لايمنع
لزوم حكمه والانسان عاص
لله في ردته عن الاسلام
ولم يمنع عصيانه من لزوم
حكمه وفراق امراته و
قد نهى الله عن مراجعتها
ضرارا لقوله تعالى ولا تمسكوهن
ضرارا لتعتدوا فلو راجعها
وهو يريد ضرارها لثبت
حكمها وصحت رجعته

اللہ نے ظہار کو قول منکر و زور فرمایا ہے اس
کے باوجود اس کے صحت وقوع کا حکم دیا ہے
تو عاصی ہونے سے یہ بات ممنوع نہیں ہوئی
کہ حکم ثابت نہ ہو۔ اسی طرح اسلام سے مرتد
ہونے کی صورت میں انسان اللہ کا نافرمان ہوتا
ہے۔ یہ نافرمانی اس بات کے لیے مانع ثابت
نہیں ہوتی کہ اس کا حکم ثابت نہ ہو اور اس
کی بیوی اس سے جدا نہ ہو۔ اسی طرح اللہ نے
نقصان پہنچانے کی نیت سے عورت سے رجوع
کرنے کو منع کیا ہے ولا تمسکوھن ضرارا
لتعتدوا لیکن اگر کوئی شخص نقصان پہنچانے
کی نیت سے رجوع کرے تو حکم رجعت ثابت ہوگا
اور اس کی رجعت صحیح ہوگی۔

یہاں خلط مبحث ہو گیا ہے۔ ظہار کا رواج عرب میں پہلے سے تھا کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ کی طرح حرام کہہ دیتا اور وہ اس کے لیے حرام ہو جاتی۔ ایک صحابی اس رواج کے مطابق اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے۔ بعد میں انہیں ندامت ہوئی اور ان کی بیوی کو پریشانی ہوئی جو مخلص مومنہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے معاملہ کو لیکر آئیں اور یہ مصر ہوئیں کہ ان کے معاملہ کو حل کیا جائے تب یہ آیات نازل ہوئیں

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ
الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ
تَشْتَكِيْ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ
تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ
بَصِيْرٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ
مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَائِهِمْ مَّا هُنَّ

اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو
(اے نبی) تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث
اور اللہ سے شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں
کی گفتگو سن رہا تھا۔ بلاشبہ اللہ سننے اور دیکھنے
والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار
کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں

اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا
الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ
لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ
الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ
لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِیْنَ
یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ
یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ
رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ
ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ فَمَنْ
لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ
مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ
یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ؕ
ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

ان کی مائیں وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے اور وہ منکر اور جھوٹ بات کہتے ہیں اور بے شک اللہ معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنے قول سے رجوع کرتے ہیں۔ انہیں ہم بستری سے قبل ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس بات کی تمہیں نصیحت کی جاتی ہے۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جو شخص غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینوں کے روزے ہم بستری کرنے سے پہلے رکھے اور جسے اس کی طاقت نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھو۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

قرآن مجید نے جس بات کو منکر اور زور کہا ہے وہ یہ ہے کہ بیوی کو ماں کہا جائے۔ یہ ایک ایسی بات جو صریح عقل کے مطابق ہے۔ اس کے باوجود عرب میں یہ طریقہ عورت کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا تھا۔ قرآن مجید نے اس طریقے کو ممنوع نہیں قرار دیا۔ بلکہ مشروع طریقے پر اسے باقی رکھا۔ اگلی آیات میں اس کے احکام بیان کیے اور ان سب کو حدود اللہ سے تعبیر کیا اور وان اللہ لعفو غفور سے یہ بات واضح کردی کہ امر میں معصیت کا جو پہلو ہے اللہ اسے معاف کرتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے رجوع اور تلافی مافات کا طریقہ بتایا اور وہ عورت جو عرب جاہلیت کے رواج کی رو سے حرام تھی۔ اللہ کے حکم سے اس کے حلال ہونے کا راستہ نکل آیا۔

صورت زیر بحث میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ عرب جاہلیت میں نہ طلاق کی کوئی حد تھی، نہ رجوع کرنے کے لیے طلاق کی کوئی تعداد طے تھی۔ اسلام نے طلاق اور رجوع دونوں کے احکام دیے اور یہ بتا

طلاق ایک مرتبہ میں ایک ہی دینا چاہیے۔ دو بار طلاق دینے تک رجعت کا حق باقی رہتا ہے اور تیسری بار طلاق دینے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ ایک بار میں تین طلاق دینا غیر مشروع اور معصیت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو شخص ایک بار میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع طریقہ اختیار کرتا ہے اس کا حکم کیا ہے؟ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ واقع ہوئی تو کتنی؟ اس کی عورت اس پر حرام ہوئی یا رجعت کی گنجائش باقی ہے؟

جہاں تک عرب جاہلیت کا سوال ہے مرد کو اس کے بعد بھی رجعت کی گنجائش تھی اور قرآن نے بھی رجعت کو ختم اور عورت کو مرد پر اس وقت حرام قرار دیا ہے جبکہ وہ تیسری بار طلاق دینے کا مرتکب ہو چکا ہو۔ اس کے علاوہ طلاق کی کسی صورت میں عورت کو صراحتہً حرام قرار نہیں دیا اور نہ رجعت کے طریقے کو منسوخ کیا۔ جو لوگ ایک بار میں تین طلاق کو طلاق مغلظہ بائنہ قرار دیتے ہیں، سوال ان سے یہ ہے کہ ان کے اس فتوے کا ماخذ کیا ہے؟ ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم کم از کم قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ظہار کی مثال دینا صحیح نہیں ہے۔ ظہار کے قول منکر و زور ہونے کے باوجود عرب جاہلیت کی رکاوٹ کو اللہ نے دور فرما دیا اور حرام عورت کو حلال کرنے کا طریقہ اہل ایمان کو بتایا۔ مگر یہ حضرات طلاق کے سلسلے میں اس سہولت کو جو قبل از اسلام لوگوں کو حاصل تھی اور جسے قرآن نے ختم نہیں کیا، ختم کرنا چاہتے ہیں اور ظہار کی مثال دیتے ہیں۔

امام ابو بکر جصاص ؒ نے ارتداد کی مثال اس سلسلے میں دی ہے۔ یہ مثال بھی صحیح نہیں ہے۔ مرتد کی عورت اس لیے اس سے جدا ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے نکل جاتا ہے اور ایک مسلمہ غیر مسلم کے عقد میں نہیں رہ سکتی۔ ارتداد کی کوئی خاص شکل اسلام نے مشروع نہیں کی ہے کہ غیر مشروع شکل اختیار کرنے کی صورت میں کوئی سوال پیدا ہو، یہاں بالکل دوسری صورت ہے۔ ایک مسلمان کے عقد میں ایک مسلمان عورت ہے اس نے اسے غیر مشروع طریقے پر تین طلاقیں دیں۔ گناہ ہونے سے قطع نظر یہ سوال بہر حال پیدا ہوگا کہ یہ طلاق ہوئی یا نہیں اور ہوئی تو اس کی بیوی اس پر ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو گئی یا رجعت کی گنجائش باقی ہے۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ قرآن میں تین بار طلاق دینے اور اس کے بعد بیوی کے حرام ہونے کا ذکر ہے، نہ کہ ایک بار میں تین طلاق دینے کا۔ اس کے برعکس مسلمان عورت غیر مسلم کے عقد میں نہیں رہ سکتی۔ یہ بات کتاب و سنت سے صراحتہً ثابت ہے اور اس میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔

آخر میں ابو بکر جصاص نے ولا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا سے جو استدلال کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ پوری آیت یوں ہے:۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت عدت کو پہنچنے لگیں تو انہیں معروف طریقے پر چھوڑ دو اور انہیں نقصان پہنچانے کی نیت سے روکے نہ رکھو کہ اس طرح تم تعدی کے مرتکب ہو اور جس نے ایسا کیا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اللہ کی آیات کا مذاق نہ بناؤ اور اللہ کے احسانات کو اور اس بات کو یاد کرو کہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی جس سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ سے واضح طور سے امساک بالضرار مراد ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ گناہ ضرور ہے مگر مرد کے اختیار میں ہے اور اگر وہ ایسا کرے اور عورت کو ضرر پہنچانے کے لیے اس سے رجوع کرے تو قانوناً اسے اس حرکت سے روکا نہیں جا سکتا وہ رجوع کر سکے گا۔ البتہ اس سے دینی و اخلاقی اپیل کی جا سکتی ہے اور وہ قرآن نے کی ہے۔ ہاں عورت کو اس مخمصہ سے نکالنے کے لیے اسلام نے دوسرے طریقے فراہم کیے ہیں مثلاً خلع اور فسخ نکاح کا طریقہ۔

ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یقیناً ایک شخص ایک مجلس میں تین کیا ہزار طلاقیں دے سکتا ہے لیکن کیا یہ سب طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ تین سے زیادہ طلاق واقع ہونے کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک بار میں ایک سے زائد طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا کرنا غیر مشروع ہے۔ اسی طرح یہ سوال بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اس صورت میں اس کی عورت اس کے لیے حرام ہوئی یا نہیں۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات سن لیجیے۔ امام ابوبکر جصاصؒ نے طلقوھن لعدتھن والی آیت میں فقد ظلم نفسہ سے فرادیا ہے کہ اس نے تین طلاق ایک بار میں دے کر اپنے آپ کو اپنی بیوی سے محروم کرلیا اور اس طرح اپنے اوپر ظلم کیا۔ یہی الفاظ عورت کو نقصان پہنچانے کی غرض سے روکنے کے سلسلے میں بھی آئے ہیں لیکن اس صورت میں نہ عورت اس کے لیے حرام ہوئی اور نہ اسے اور کوئی دنیوی نقصان پہنچا۔ جو کچھ نقصان ہوا عورت کو ہوا۔ ہاں مرد کی عاقبت خراب ہوئی۔ حالانکہ امام ابوبکر جصاصؒ کی رائے کی رو سے اسے کوئی دنیوی اور قانونی نقصان پہنچنا چاہیے تھا حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں فقد ظلم نفسہ سے گناہ اور اس کے عواقب مراد ہیں نہ کہ کوئی قانونی حکم۔

امام ابوبکر بن عربی مالکی رہ "احکام القرآن" میں الطلاق مرتان کے تحت چار اقوال نقل فرماتے ہیں

المسئلۃ الرابعۃ ان ھذہ الآیۃ	چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ
عرف فیہا الطلاق بالالف واللام	طلاق پر تعریف کا الف لام داخل ہے اور لوگوں
واختلف الناس فی تاویل	سے اس لام کی تعریف کی تفسیر میں چار مختلف اقوال
التعریف علی اربعۃ اقوال الاول	منقول ہیں۔ پہلا قول:۔ آیت کے معنے یہ ہیں کہ
معناہ الطلاق المشروع مرتان	طلاق مشروع دو بار ہے تو جو طلاق اس طریق
فما جاء علی غیرھا فلیس بمشروع	پر نہ ہو وہ غیر مشروع ہے۔ یہ قول حجاج بن ارطاۃ
یروی عن الحجاج بن ارطاۃ	اور روافض سے مروی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا
والرافضۃ قالوا ان النبی صلی	ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کے بیان کرنے
اللہ علیہ وسلم انما بعث لبیان	کے لیے مبعوث ہوئے ہیں تو جو طلاق اس سے
الشرع فما جاء علی غیرہ فلیس	مختلف طریقے پر ہو وہ مشروع نہیں ہے۔
بمشروع۔ الثانی معناہ الطلاق	دوسرا قول:۔ وہ طلاق جس میں رجعت کی گنجائش
الذی فیہ الرجعۃ مرتان وذالک	ہے دو بار ہے۔ یہ اس لیے کہ جاہلیت میں لوگ
لان الجاہلیۃ کانت تطلق وترد	طلاق دیتے اور رجوع کرتے رہتے تو اللہ تعالیٰ
ابدا۔ فبین اللہ تعالیٰ ان الرد	نے واضح فرمایا کہ رجوع صرف دو طلاقوں میں ہے
انما یکون فی طلقتین بدلیل قولہ	فامساک بمعروف او تسریح باحسان

تعالیٰ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ۔ الثالث ان معناه الطلاق المسنون مرتان قاله مالکؒ۔ الرابع معناه الطلاق الجائز مرتان قاله ابوحنیفۃ۔ فاما من قال ان معناه الطلاق المشروع فصحیح لکن المشروع یتضمن الفرض والسنۃ والجائز والحرام فیکون المعنی بکونہ مشروعاً احد اقسام المشروع الثلثۃ المتقدمۃ وھو المسنون قد کنا نقول بان غیرہ لیس بمشروع لولا تظاھر الاخبار والاثار وانعقاد الاجماع من الامۃ بان من طلق طلقتین او ثلثاً فان ذالک لازم	تیسرا قول: آیت کے معنے ہیں طلاق مسنون دو بار ہے۔ یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔ چوتھا قول: آیت کا مفہوم یہ ہے کہ طلاق جائز دو بار ہے۔ یہ قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔ تو جن لوگوں نے کہا کہ آیت کے معنے ہیں طلاق مشروع انھوں نے صحیح کہا لیکن مشروع فرض، سنت، جائز اور حرام سب پر مشتمل ہے تو یہاں اس کے مشروع ہونے کے معنے مشروع کے تین اقسام مشروع۔ فرض، سنت اور جائز ہیں اور یہی مسنون ہے اور ہم کہتے ہیں کہ اس کے سوا طلاق مشروع نہیں ہے۔ اگر اخبار، آثار اور سنت کے اجماع کا اس پر اتفاق نہ ہوتا کہ جس نے دو یا تین طلاقیں دیں وہ اس کے لیے لازم (واقع) ہو جائیں گی۔

گویا امام ابوبکر بن عربیؒ نے تسلیم کیا ہو کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ بائنہ ہونے کا مسئلہ احادیث، آثار صحابہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید کا رخ اس کے خلاف ہی ہے۔

علامہ محمود آلوسی حنفیؒ روح المعانی میں اس آیت کے تحت تین قول لکھتے ہیں۔ پہلے قول کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

وھذا یدل علی ان معنی مرتان اثنتان وھذا ھو الذی حمل علیہ الشافعیۃ الاٰیۃ ولعلہ الیق بالنظم	اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتان کے معنے اثنتان (دو) کے ہیں .... اور شوافع نے آیت کو اسی مفہوم پر محمول کیا ہے اور شاید یہ بات نظم آیات کے زیادہ مطابق ہے۔

دوسرے قول کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

وحملوا الاٰیۃ علی ان المراد	اور انھوں نے آیت کو اس مفہوم پر محمول کیا

التطليق الشرعي تطليقة بعد
تطليقة على التفريق لما ان وظيفة
الشارع بيان الامور الشرعية
والا مرليست نصا في العهد بل
الظاهر منها الجلس وايضا تقييد
الطلاق بالرجعي يدع ذكر الرجعة
بقوله سبحانه فامساك بمعروف
تكرارا وايضا لا يعلم على ذالك
الوجه حكم الطلاق الواحد الا
بدلالة النص وهذا الوجه
مع كونه ابعد عن توهم
التكرار ودلالته على حكم الطلاق
الواحد بالعبارة يفيد حكما
زائدا وهو التفريق ودلالته
حينئذ على ما ذهبوا اليه
ظاهرة اذ كان معنى مرتين
مجرد التكرير دون التثنية
على حد ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ
اي كرة بعد كرة لا كرتين ثنتين
الا انه يلزم عليه اخراج التثنية
عن معناها الظاهر وكذا
اخراج الفاء ايضا وجعل ما
بعدها حكما مبتدأ وتخييرا

کہ شرعی طلاق، طلاق کے بعد طلاق ہے تفریق
کے ساتھ، اس لیے کہ شارع کا کام یہ ہے کہ
وہ امور شرعیہ کو بیان کرے اور یہ بات صریح
نہیں ہے کہ یہاں لام تعریف عہد کے لیے ہے
بلکہ بظاہر وہ جنس ہی کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ
طلاق کے ساتھ رجعی کی قید لگا دی جائے تو
"فامساک بمعروف" کے الفاظ کے ساتھ رجعت
کے تذکرے سے تکرار لازم آئے گی۔ نیز یہ بات
بھی ہے کہ یہ مفہوم لینے کی صورت میں آیت کا
کے واہمہ سے دور ہوگی اور ایک طلاق کا حکم
عبارت النص سے معلوم ہوگا اور اس سے
ایک مزید حکم معلوم ہوگا یعنی یہ کہ طلاق الگ الگ
دی جائے۔ بہر حال جو کچھ ان اصحاب نے مراد لیا ہے
اس پر آیت کی دلالت ظاہر ہو جاتی ہے بشرطیکہ
"مرتین" سے تکرار کا مفہوم لیا جائے، تثنیہ مراد
نہ لیا جائے جیسے آیت "ثم ارجع البصر
کرتین" میں کرتین کے معنے کرۃ بعد کرۃ (بار بار)
کے ہیں نہ کہ دو بار کے۔ لیکن اس صورت میں
تثنیہ کو اس کے ظاہری مفہوم سے نکالنا ہوگا اور
اسی طرح "فا" کو بھی اور اس کے مابعد کو ایک
نیا حکم ماننا ہوگا یعنی طلاق کی کیفیت کی
تعلیم کے بعد مطلق اختیار دیا گیا ہے کہ (رجعت
کی جائے یا چھوڑ دیا جائے) اور یہ حکم پہلے حکم

مطلقا عقیب تعلیمھم کیفیۃ	یہ مرتب نہیں ہے۔ کیونکہ مطلق تفریق پر (بعض
التطلیق ولیس مرتبا علی	اوقات) دونوں میں سے کوئی ایک امر مرتب
الاول ضرورۃ ان التفریق المطلق	نہیں ہوتا۔ کیونکہ تین طلاق کے بعد تفریق کی
لا یترتب علیہ احد الامرین	صورت میں اس کے بعد روکنا جائز نہیں ہے
لانہ اذا کان بالثلث لا یجوز	اور نہ (مزید) چھوڑنا ہے اور اس صورت میں
بعد کا الامساک ولا التسریح	'فا' کو ذکری ترتیب پر محمول کرنا ہوگا یعنی جب
وتحمل الفاء حینئذٍ علی الترتیب	تم نے طلاق کی کیفیت جان لی تو جان لو کہ اس
الذکری ای اذا علمتم کیفیۃ الطلاق	کا حکم روک لینا ہے، یا چھوڑ دینا ہے، روک لینا
فاعلموا ان حکمہ الامساک او التسریح	رجعی طلاق کی صورت میں اور چھوڑ دینا غیر رجعی کی
فالامساک فی الرجعی التسریح فی غیرہ	صورت میں۔

لیکن اس قول کو اختیار کرنے کی صورت میں فَاِنْ طَلَّقَهَا کا ربط کہاں سے ہوگا اور جب مرتین میں تثنیہ کا مفہوم ہے ہی نہیں تو فان طلقھا سے یہ مفہوم کیسے نکل آئے گا کہ تیسری بار کے بعد عورت حلال نہیں رہتی۔

تیسرے قول کا، جسے وہ راجح قرار دیتے ہیں، ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

واذا کان معنی مرتین التفریق	اور جب مرتین کے معنے تفریق مع تثنیہ
معنی التثنیہ کما قال بہ المحققون	کے ہیں جیسا کہ محققین نے کہا ہے اس وجہ سے
بناء علی انہ حقیقۃ فی الثانی	کہ یہ لفظ حقیقت ہو دوسرے معنے میں ظاہر
ظاھر فی الاول اذ لا یقال لمن	ہے پہلے معنے میں کیونکہ جو شخص کسی شخص کو ایک
دفع الی آخر درھمین مرۃ واحدۃ	بار میں دو درہم دے اس کے بارے میں یہ نہیں
انہ اعطاہ مرتین حتی یفرق	کہا جا سکتا کہ اس نے اسے دو بار دیا ہے
بینھما وکذا من طلق زوجتہ	جب تک الگ الگ دو دفعہ نہ دے اسی طرح
ثنتین دفعۃ انہ طلق مرتین	جو شخص اپنی بیوی کو ایک بار میں دو طلاق دے
انہ فھم حدیث ارتکاب خلاف	اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے

الظاهر في التثنية كما هو الظاهر وفي ما بعدها ايضا لصحة التفريق ويكون عدم جواز الجمع بين التطليقتين مستفادا من مرتان الدالة على التفريق والتثنية وعدم جواز الجمع بين الثالثة مستفادا من قوله سبحانه "او تسريح" حيث رتب على ما قبله بالفاء قيل انه مستفاد من دلالة النص

دو بار طلاق دی۔ اس صورت میں یہ اعتراض ختم ہو جائے گا کہ اس مفہوم کے لینے میں تثنیہ کے ظاہری معنے کے خلاف کا ارتکاب کیا گیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور اس کے بعد کے سلسلے میں اعتراض ختم ہو جائے گا کیونکہ بعد کے احکام صحیح طور پر مرتب ہو سکیں گے۔ اور دو طلاقوں کو جمع کرنے کا عدم جواز "مرتان" کے لفظ سے مستفاد ہوگا کیونکہ یہ ماقبل پر فاء کے ساتھ مرتب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دلالۃ النص سے مستنبط ہے۔

اس کے بعد علامہ آلوسی ایک مجلس میں تین طلاق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ثم من اوجب التفريق ذهب الى انه لو طلق غير مفرق وقع طلاقه وكان عاصيا وخالف ذالك الامامية وبعض من اهل السنة كالشيخ احمد بن تيميه ومن اتبعه قالوا لو طلق ثلاثا بلفظ واحد لا يقع الا واحدة احتجاجا بهذه الآية وقياسا على شهادات اللعان ورمي الجمرات فانه لو اتى بالاربع بلفظ واحد لا تعد له اربعا بالاجماع كذا لو رمى بسبع حصيات دفعة

پھر جو لوگ الگ الگ طلاق دینے کو واجب قرار دیتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے تفریق کے بغیر تینوں طلاقیں دے دیں تو سب واقع ہو جائیں گی مگر وہ گنہگار ہوگا۔ شیعہ اور بعض اہل سنت مثلاً شیخ احمد ابن تیمیہؒ اور ان کی پیروی کرنے والوں نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک ہی لفظ سے تین طلاقیں دیں تو صرف ایک طلاق ہوگی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور لعان کی شہادتوں اور رمی جمرات پر قیاس کیا ہے کیونکہ اگر لعان میں ایک ہی لفظ سے چار

واحدة ولم یجزه اجماعا و مثل ذالك لو حلف لیصلین علی النبی صلی الله علیه وسلم الف مرة فانه لا یکون بارًا ما لم یات باحاد الالف

گواہیاں دیں تو اس پر اجماع ہے کہ وہ چار شمار نہ ہوں گی اسی طرح اگر اس نے ستّا کنکریاں ایک ہی بار میں پھینکیں تو اس پر اجماع ہے کہ یہ کافی نہ ہوں گی۔ اسی طرح اگر اس نے قسم کھائی کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہزار بار درود بھیجے گا تو جب تک وہ ہزار بار درود نہ بھیجے تو اس کی قسم پوری نہ ہوگی۔

آگے علامہ آلوسیؒ نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن سے ایک مجلس میں تین طلاق کے ایک ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید سے استدلال کا جواب دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:۔

والجواب عن الاحتجاج بالآیة انها کما علمت لیست نصا فی المقصود

اور آیت سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ تم کو معلوم ہے یہ اس مفہوم میں صریح نہیں ہے۔

لیکن اس جواب سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آیت اس کے مخالف مسلک کے لیے بھی صریح نہیں ہے، بلکہ جہاں تک آیت سے استنباط کا تعلق ہے آیت کا وزن ان لوگوں کے حق میں پڑتا نظر آتا ہے جو ایک مجلس میں تین طلاق کے بعد عورت کو حرام قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ جیسا کہ علامہ آلوسیؒ نے کہا ہے۔ اور یہی بات امام ابو بکر جصاصؒ نے بھی کہی ہے محققین کی تشریح کے مطابق ایک بار میں تین طلاق تین بار طلاق نہیں ہوئی اور قرآن مجید میں عورت کے حرام ہونے کا حکم تین بار طلاق دینے پر دیا گیا ہے نہ کہ تین طلاق۔

علامہ آلوسیؒ نے لعان کی شہادتوں، رمی جمرات اور صلوٰۃ علی النبی کی مثالوں کا جواب بھی دیا ہے مگر ان مثالوں کا آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز علامہ کے جواب میں کوئی جان بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں:۔

یہ ہیں ان آیات سے متعلق اہم مفسرین کی تصریحات۔ دوسرے حنفی مفسرین نے بھی عام طور سے یہی کہا ہے کہ "الطلاق مرتان" کا مفہوم الگ الگ دو بار طلاق ہے نہ کہ یکجا دو طلاق۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ ایک مجلس میں

تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑجاتی ہے۔ ہاں آیت سے اس مسئلہ کے سلسلے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ایک استنباط یہ ہوسکتا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق کو تین بار طلاق پر قیاس کیا جائے اور عورت کی حرمت کے حق میں فیصلہ دیا جائے لیکن اس کے برعکس دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ چونکہ طلاق تین بار نہیں دی گئی ہے۔ اس لیے آیت کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا اور حق رجعت باقی رہتا ہے۔ یہ رائے آیت کے مفہوم سے خصوصاً جس طرح اس کی تشریح علامہ زمخشریؒ اور حنفی محققین نے کی ہے، زیادہ قریب اور زیادہ صحیح محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ قرآن مجید کی آیات ایک مجلس میں تین طلاق دینے کے بارے میں خاموش ہیں۔ ہاں احادیث سے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے آیئے احادیث کی طرف رجوع کریں۔

احادیث

جن روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑجاتی ہے ان میں سے نسبتہً قوی روایات حسب ذیل ہیں:۔

١- عن الحسن قال حدثنا	حسن سے مروی ہے کہ ہم سے عبداللہ
عبد الله بن عمر انه طلق امرأته	ابن عمر نے کہا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو حالت
تطليقة وهي حائض ثم اراد	حیض میں طلاق دی۔ پھر انھوں نے ارادہ کیا
ان يتبعها بتطليقتين عند	کہ دو حیضوں کے وقت انہیں دو طلاقیں اور
القرئين فبلغ ذالك رسول الله	دیں۔ اس بات کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ
صلى الله عليه وسلم فقال يا ابن عمر	وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اے ابن عمر اللہ نے
ما هكذا امرك الله انك اخطأت	تمہیں اس طرح حکم نہیں دیا تھا تم نے سنت
السنة والسنة ان تستقبل الطهر	کی خلاف ورزی کی سنت یہ ہے کہ تم طہر
فتطلق لكل قرء وقال فامرني	کا انتظار کرو اور ہر طہر میں ایک طلاق دو
رسول الله فراجعتها ثم قال	تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور
اذا هي طهرت فطلق عند	میں نے اپنی بیوی سے رجوع کرلیا۔ پھر آپ نے

ذالك او امسك فقلت يا رسول الله لو كنت طلقتها ثلاثا اكان لي ان ارجعها قال لا كانت تبين وتكون معصية (بیہقی، طبرانی، دارقطنی)	فرمایا جب وہ پاک ہو جائے تو اس وقت طلاق دو یا روک لو۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول اگر میں اسے تین طلاق دے دیتا تو کیا میں اس سے رجوع کر سکتا تھا۔ فرمایا نہیں، وہ جدا ہو جاتی اور گناہ ہوتا۔

اس حدیث کے آخری ٹکڑے سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ٹکڑا اس مفہوم میں صریح نہیں ہے۔ طلقتها ثلاثا کا مفہوم تین بار طلاق بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض دوسری احادیث کی روایات میں یہی مفہوم ہے۔ پوری حدیث کو سامنے رکھ کر جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر حالت حیض میں ایک یا دو بار طلاق دی جائے تو رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ لیکن اگر تین بار طلاق دے دی جائے تو حق رجعت باقی نہیں رہتا البتہ حالت حیض میں طلاق دینے کا گناہ باقی رہے گا۔

بہرحال اس ٹکڑے کے مجمل الفاظ سے استدلال کیا جا سکتا ہے لیکن یہی آخری ٹکڑا جس پر استدلال کا دارومدار ہے، سب روایتوں میں نہیں ہے۔ بیہقی نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس ٹکڑے کے راوی صرف شعیب ہیں اور ان کے سلسلہ میں محدثین نے کلام کیا ہے۔ یہی نہیں، تفسیر قرطبی میں اس کے برعکس یہ روایت موجود ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجوع کرنے کا حکم دیا اور یہ تین طلاقیں ایک شمار ہوئیں۔ (تفسیر قرطبی جلد سوم ص۱۲۹)

پھر زریق بن شعیب یا شعیب بن زریق کے علاوہ جنھیں محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، اس حدیث کی سند میں عطار خراسانی بھی ہیں جنھیں امام بخاریؒ شعبہؒ اور ابن حبانؒ نے ضعیف قرار دیا ہے اور سعید بن مسیب نے انھیں جھوٹا کہا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ روایت اس طرح آئی ہے۔

عن عبد الله بن عمر انه طلق امراته وهي حائض على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم	عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تو

فسأل عمر بن الخطاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم مرہ فليراجعها ثم ليمسكها حتى تطهر ثم تحيض ثم تطهر ثم ان شاء امسك بعد وان شاء طلق قبل ان يمس فتلك العدة التي امر الله ان تطلق لها النساء (بخاری کتاب الطلاق)

حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا انہیں حکم دو وہ رجوع کر لیں۔ پھر اسے روکے رکھیں، یہاں تک کہ پاک ہو جائے پھر حائضہ ہو پھر پاک ہو جائے۔ پھر اگر چاہیں تو روک لیں اور چاہیں تو ہمبستر ہونے سے پہلے طلاق دے دیں تو یہ ہے وہ عدت جس کے سلسلے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے وقت طلاق دی جائے۔

اس روایت میں مزید ایک طہر کے انتظار کا ارشاد اس لیے ہے کہ طلاق کا فیصلہ ٹل جائے یا حالت حیض میں طلاق دینے کی سزا کے طور پر ہے۔ بہرحال اس روایت میں وہ آخری ٹکڑا نہیں ہے جس سے استدلال کیا گیا تھا۔ البتہ صحیح مسلم میں اس کے بعد اتنا اور ہے۔

وزاد ابن رمح في روايته وكان عبد الله اذا سئل عن ذلك قال لاحدهم ان طلقت امرأتك مرة او مرتين فان رسول الله صلى الله عليه وسلم امرني بهذا وان كنت طلقتها ثلاثا فقد حرمت عليك حتى تنكح زوجا غيرك وعصيت الله فيما امرك من طلاق امرأتك

اور ابن رمح نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ اور کیا ہے اور عبداللہ بن عمرؓ سے جب اس سلسلے میں سوال کیا جاتا تو وہ سائل سے فرماتے، اگر تم نے اپنی بیوی کو ایک یا دو بار طلاق دی ہے تو یہ وہ صورت ہے جس کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس (رجعت) کا حکم دیا ہے، لیکن اگر تم نے تین طلاقیں دے دیں تو تم پر بیوی حرام ہو گئی جب تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے اور تم نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے سلسلے میں اللہ کی نافرمانی کی۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں مرۃ اور مرتین کے بجائے واحدۃ اور ثنتین بھی ہے صحیح مسلم کی یہ روایت صحیح بخاری میں بھی ہے لیکن اس اضافہ میں عبداللہ بن عمر کا اپنا فتویٰ ہے نہ کہ حدیث رسول پھر یہ تکرار بھی ایک مجلس میں تین طلاق دینے کے لیے صریح نہیں ہے۔ طلقتها ثلاثا سے تین بار طلاق مراد ہو سکتی ہے اور معصیت اللہ کا تعلق حالت حیض میں طلاق دینے سے ہو سکتا ہے اور اسی صورت میں یہ تکرار اوپر سے صحیح طور پر جڑتا ہے۔

۲۔ عن سهل بن سعد ان	سہل بن سعد سے مروی ہے کہ عویمر
عويمر العجلانی بعد ان لاعن	عجلانی نے رسول اللہ کے سامنے اپنی بیوی
زوجته امام رسول الله قال	سے لعان کرنے کے بعد کہا۔ اگر میں نے
كذبت عليها يا رسول الله	اسے روکے رکھا تو اس پر اے اللہ کے رسول
ان امسكتها فطلقتها ثلاثا	جھوٹ باندھا تو رسول اللہ کے حکم دینے سے
قبل ان يأمره رسول الله	قبل انھوں نے بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔

یہ حدیث صحیح بخاری اور دوسری مستند کتب احادیث میں ہے اور سب میں یہ بات مشترک ہے کہ عویمر عجلانی نے لعان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیں اور کسی روایت میں یہ بات موجود نہیں ہے کہ آپ نے عویمر عجلانی پر اس سلسلے میں کوئی تنقید کی ہو۔

لیکن اس روایت سے مسئلہ زیر بحث پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ عویمر عجلانی کی بیوی لعان کے بعد ان کے پاس نہ رہ سکتی تھی۔ دونوں کی جدائی مقدر تھی[1] اس لیے ایک ہو یا تین سب بے ضرورت تھیں۔ رہی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عویمر عجلانی کو ٹوکا کیوں نہیں تو علامہ سرخسی رح نے مبسوط میں اس کے دو جواب دیے ہیں:۔

انما ترك الانكار على العجلاني	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت

[1] فقہاء کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ تفرقہ کے لیے لعان کافی ہے یا قضاء قاضی کے بعد اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ لعان کے بعد کسی طلاق کی ضرورت نہیں ہے۔ لعان کے نتیجہ میں قضائے قاضی سے یا اس کے بغیر دونوں جدا ہو جائیں گے۔

في الوقت شفقة عليه لعلمه انه لشدة الغضب ربما لا تقبل قوله فيكفر فأخر الانكار الى وقت آخر وانكر عليه في قوله فلا سبيل لك عليها او كراهة ايقاع الثلاث لما فيه من سد باب التلافي من غير حاجة وذالك غير موجود في حق العجلاني لان باب التلافي بين المتلاعنين منسد ما داما مصرين على اللعان والعجلاني كان مصرا على اللعان

عویمر عجلانی کو ٹوکا نہیں۔ یہ بات شفقت کی بنا پر تھی کیونکہ شدتِ غضب کی بنا پر وہ آپ کی بات شاید قبول نہ کرپاتے اور کافر ہوجاتے اس لیے حضورؐ نے دوسرے (مناسب) وقت کے لیے ٹوکنے کو مؤخر کردیا اور اتنا فرمادیا کہ تجھے اس پر (اب) کوئی اختیار نہیں ہے یا یہ بات ہے کہ تین طلاقیں ایک ساتھ دینا اس لیے مکروہ ہے کہ تلافی کا دروازہ بلا ضرورت بند ہوتا ہے اور عجلانی کے کیس میں یہ بات موجود نہیں ہے کیونکہ لعان کرنے والے جب لعان پر مصر ہوں تو تلافی کا دروازہ بند ہوتا ہے اور عجلانی لعان پر مصر تھے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فیض الباری میں تفصیل سے اس حدیث پر بحث کی ہے اور علامہ [illegible]ؒ کے جوابات کے علاوہ اور جواب بھی دیے ہیں۔ ان کا پہلا جواب یہ ہے۔

اولا بان التطابق بين الحكاية والمحكي عنه في الصفة ليس بضروري فيمكن ان طلقها في الخارج متفرقا وعبر عنه الراوي ثلاثا اخذا بالحاصل ولا بعد فيه

پہلا جواب یہ ہے کہ صورت واقعہ اور اس کے بیان کے درمیان صفت واقعہ میں مطابقت ضروری نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ عجلانی نے تین طلاقیں الگ الگ دی ہوں اور راوی نے بطور حاصل کے انہیں تین کہہ دیا ہو اور اس میں کوئی بُعد نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے اس جواب سے بہت سی متعلقہ احادیث کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

ان جوابات سے قطع نظر حدیث میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑجاتی ہے کہ وہ اس مسئلے میں حجت بن سکے۔ صرف تین طلاق دینے کا ذکر ہے۔ یہ

بات مسلم ہے کہ عویمر عجلانی اور ان کی بیوی کے درمیان تفریق لعان کی بنیاد پر ہوئی نہ کہ طلاق کی یہ حدیث اگر حجت بن سکتی ہے تو صرف اس امر کی کہ ایک مجلس میں تین طلاق غیر مشروع اور بدعت ہے جیسا کہ امام شافعی کا مسلک ہے۔ جمہور اس کے برعکس ایک مجلس میں تین طلاق کو غیر مشروع اور ما قرار دیتے ہیں اور علامہ سرخسی اور علامہ انور شاہؒ نے انہی کی طرف سے جوابات دیے ہیں۔

۳۔ عن محمود بن لبید قال اخبر رسول اللہ عن رجل طلق امراتہ ثلاث تطلیقات جمیعاً فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظھرکم حتی قال رجل فقال یا رسول اللہ الا اقتلہ و فی بعض الروایات وامضاہ علیہ ولم یردہ	محمود بن لبید سے مروی ہے کہ رسول اللہ کو بتایا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہیں تو آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے۔ پھر فرمایا کیا اللہ کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے جب کہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں۔ ایک آدمی نے اٹھ کر کہا۔ اے اللہ کے رسول کیا میں اسے قتل نہ کر دوں اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے (تینوں) جاری کر دیں۔ انہیں لوٹایا نہیں۔

لیکن بعض روایات کا یہی ٹکڑا جو محل استدلال ہے ثابت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں محمود بن عہد نبوی میں پیدا ضرور ہوئے ہیں لیکن رسول اللہؐ سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔

۴۔ عن عبادۃ بن الصامت قال طلق جدی امراۃ لہ الف تطلیقات فانطلق الی رسول اللہ فذکر لہ ذالک فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما اتقی اللہ جدک اما ثلاث فلہ واما تسع ماۃ وسبعون وتسعون فعدوان وظلم ان شاء اللہ	عبادۃ بن الصامت سے مروی ہے کہ میرے دادا نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیں تو وہ حضورؐ کے پاس آئے اور انھوں نے (ذ کے) اس فعل کا ذکر کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ و نے فرمایا۔ تمہارے دادا نے خدا کا تقویٰ اختیار نہیں کیا۔ تین طلاقوں کا تو انہیں تھا باقی نوسو ستانوے تو ظلم و عدوان ہیں۔ اللہ چاہے گا تو عذاب دے گا اور

عن یزید ان شاء اللہ فہو غفر لہ (مصنف عبد الرزاق) تو معاف فرما دے گا۔

لیکن یہ روایت سنداً بے حد ضعیف ہے۔ اس کے کچھ راوی ضعیف ہیں اور کچھ مجہول۔ پھر یہ روایت درایتہً بھی غلط ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت کے والد کے اسلام پانے کے بارے میں بھی کوئی روایت موجود نہیں ہے چہ جائیکہ ان کے دادا نے اسلام پایا ہو۔ اور حالتِ اسلام میں طلاق دی ہو۔

۵۔ عن فاطمۃ بنت قیس	فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ میرے
قالت طلقنی زوجی ثلاثا فلم	شوہر نے مجھے تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی
یجعل لی رسول اللہ صلی اللہ	اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے (شوہر کے ذمے)
علیہ وآلہ وسلم سکنی ولا نفقۃ (مسلم)	نہ جائے رہائش رکھی اور نہ نان نفقہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑجاتی ہے کیونکہ طلاق رجعی پڑتی تو باتفاق وہ نفقہ کی مستحق ہوتیں لیکن جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے حضرت عائشہ رضی نے فاطمہ بنت قیس کی اس روایت کو قبول نہیں کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو سُن کر فرمایا:۔

لا نترک کتاب اللہ وسنۃ	ہم اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی
نبینا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	سنت کو ایک عورت کے قول کی بنا پر نہیں
لقول امراۃ لا ندری لعلہا	چھوڑیں گے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس عورت
حفظت او نسیت لہا السکنی	کو صحیح بات یاد ہے یا وہ بھول گئی مطلقہ
والنفقۃ قال اللہ عزوجل	کو جائے رہائش اور نفقہ دونوں ملیں گے
لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَ	اللہ عزوجل نے فرمایا لا تخرجوھن الآیۃ
لَا يَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ	انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ
مُّبَيِّنَةٍ	خود نکلیں الا یہ کہ وہ کھلا ہوا بے حیائی
(صحیح مسلم)	کا کام کریں۔

یوں بھی اس حدیث سے مسئلہ زیر بحث میں استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ ثلاثا کا لفظ اس مفہوم میں صریح نہیں ہے کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہوں جبکہ اس حدیث کی دوسری روایات

یں اس کی صراحت موجود ہے کہ یہ تین طلاقیں مختلف اوقات میں دی تھیں۔

عن ابن شهاب ان ابا سلمة	ابن شہاب سے مروی ہے کہ ابوسلمہ
ابن عبد الرحمن بن عوف اخبره	عبدالرحمن بن عوف نے انہیں بتایا کہ فاطمہ
ان فاطمة بنت قيس اخبرته انها	بنت قیس نے انہیں بتایا کہ وہ ابوعمرو بن
كانت تحت عمرو بن حفص بن	حفص بن مغیرہ کی زوجیت میں تھیں تو انھوں
المغيرة فطلقها آخر ثلاث تطليقات (مسلم)	نے تین طلاقوں میں سے آخری طلاق دی

صحیح مسلم ہی کی ایک اور روایت ہے:

عن الزهري عن عبيد الله	زہری سے مروی ہے کہ عبیداللہ بن
ابن عبد الله بن عتبة ان ابا	عبداللہ بن عتبہ نے کہا۔ ابوعمرو بن حفص بن مغیرہ
عمرو بن حفص المغيرة خرج	حضرت علی رضؓ کے ساتھ یمن کی طرف جانے لگے تو
مع علي بن ابي طالب الى اليمن	انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس کو وہ
فارسل الى امرأته فاطمة بنت	طلاق (لکھ کر) بھیجی جو ان کی طلاقوں میں سے
قيس كانت بقيت من طلاقها	بچ گئی تھی۔

امام ابن قیمؒ زاد المعاد میں اس حدیث کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

الحديث جاء بخمسة الفاظ	حدیث پانچ طرح کے الفاظ سے آئی
طلقها ثلاثا طلقها البتة طلقها	ہے۔ طلقها ثلاثا طلقها البتة،
آخر ثلاث تطليقات وارسل	طلقها آخر ثلاث تطليقات، ارسل
اليها بتطليقة كانت بقيت لها	اليها بتطليقة كانت بقيت لها
وطلقها ثلاثا جميعا	اور طلقها ثلاثا جميعا

ان میں سے آخری الفاظ وطلقها ثلاثا جميعا تو اس مفہوم میں صریح ہیں کہ تین طلاقیں بیک وقت دیں مگر ان الفاظ کو شعبیؒ سے صرف خالد نے نقل کیا ہے۔ طلقها ثلاثا کے الفاظ مجمل ہیں اور طلقها البتة اور بت طلاق کے اور بھی مجمل اور طلقها آخر ثلاث تطليقات اور ارسل اليها بتطليقة كانت بقيت لها کے الفاظ صریح ہیں کہ تین طلاقیں ایک ساتھ نہیں دی تھیں۔ اب یا تو

اس حدیث کو مضطرب مانیے اور اس صورت میں اس سے استدلال ساقط ہوتا ہے ورنہ صحیح ترین روایت اور اکثر راویوں کی روایت کی رو سے اس کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تین بار میں تین طلاق دینے سے ہے۔

۹۔ عن ابن شہاب قال اخبرنی عروۃ بن الزبیر ان عائشۃ اخبرتہ ان امراۃ رفاعۃ القرظی جاءت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ ان رفاعۃ طلقنی فبت طلاقی وانی نکحت بعدہ عبد الرحمن بن الزبیر القرظی وانما معہ مثل الھدبۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لعلک تریدین ان ترجعی الی رفاعۃ لا حتی یذوق عسیلتک وتذوقی عسیلتہ (بخاری)	ابن شہاب سے مروی ہے انھوں نے کہا مجھے عروہ بن زبیر نے بتایا کہ حضرت عائشہ نے انہیں بتایا کہ رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول! رفاعہ نے مجھے طلاق بتہ دی اور میں نے ان کے بعد عبد الرحمن ابن زبیر قرظی سے نکاح کیا اور ان کے پاس پلو کی طرح (عضو) ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا شاید تم چاہتی ہو کہ رفاعہ کے پاس لوٹ کر چلی جاؤ۔ نہیں جب تک کہ وہ تمہارا مزہ نہ چکھ لیں اور تم ان کا مزہ نہ چکھ لو

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رفاعہ رض نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی تھی جسے تین طلاق قرار دیا گیا اور اس کے نتیجے میں رفاعہ کی بیوی ان پر حرام ہو گئی۔ حافظ ابن حجر رح فتح الباری میں اس استدلال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

واستدل بقولھا بت طلاقی علی ان البتۃ ثلث تطلیقات وھو عجیب ممن استدل بہ فان البتۃ بمعنی القطع والمراد بہ قطع العصمۃ وھو اعم من ان یکون بالثلث مجموعۃ او	اور رفاعہ رض کی بیوی کے قول "بت طلاقی" سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ "بتہ" تین طلاق ہیں جس شخص نے بھی یہ استدلال کیا ہے اس کا استدلال عجیب ہے کیونکہ بتہ کے معنے قطع کے ہیں اور اس سے مراد قطع عصمت ہے اور وہ عام ہے اس بات سے کہ

بوقوع الثالثۃ التی ھی اٰخر	تین طلاقیں ایک ساتھ ہوں یا تیسری طلاق
ثلث تطلیقات وسیاتی فی	جو تین طلاقوں میں سے آخری ہو، واقع ہوا،
اللباس صریحا انہ طلقہا اٰخر	لباس کے باب میں یہ بات صراحۃً آئے گی
ثلاث تطلیقات فبطل الاحتجاج	کہ رفاعہ نے اپنی بیوی کو آخری تیسری طلاق
(فتح الباری جلد ۹ ص۳۶۷)	دی تھی تو اس سے استدلال ختم ہو گیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صحیح بخاری کتاب الادب میں اس طرح ہے

عن عائشۃ ان رفاعۃ القرظی	حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رفاعہ
طلق امراتہ فبت طلاقہا	قرظی نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور طلاق
فتزوجہا بعدہ عبد الرحمٰن	بتہ دی تو عبدالرحمٰن بن زبیر نے رفاعہ کے بعد
ابن الزبیر فجاءت النبی ص	ان سے نکاح کر لیا تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
فقالت یا رسول اللہ انہا کانت	کے پاس آئی اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول
عند رفاعۃ فطلقہا اٰخر	وہ رفاعہ کے پاس تھی تو رفاعہ نے اسے تین
ثلاث تطلیقات فتزوجہا	طلاق میں سے آخری طلاق دے دی تو اس سے
بعدہ عبد الرحمٰن بن الزبیر	عبدالرحمٰن بن زبیر نے اس کے بعد نکاح کر لیا۔

اس روایت میں پہلے فبت طلاقہا کہا۔ پھر اس کی تشریح فطلقہا اٰخر ثلاث تطلیقات سے کر دی۔ معلوم ہوا کہ اس حدیث کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۔ مسئلہ زیر بحث میں سب سے زیادہ صاف و صریح حدیث حدیث رکانہ ہے جسے ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اور وہ اس طرح ہے۔

عن رکانۃ انہ طلق امرأتہ	رکانہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنی
البتۃ فاتی رسول اللہ صلی اللہ	بیوی کو طلاق بتہ دی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم فقال ما اردت	علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے پوچھا تمہاری
قال واحدۃ قال اٰللہ قال	نیت کیا تھی۔ کہا ایک کی۔ فرمایا بخدا کہا
اللہ قال ھو علی ما اردت وقال	بخدا فرمایا تو جیسی تمہاری نیت تھی ویسی ہی

ابو داؤد وھذا اصح من حدیث ابن جریج ان رکانۃ طلق امرأتہ ثلاثا لانھم اھل بیتہ وھم اعلم بہ وحدیث ابن جریج رواہ عن بعض بنی ابی رافع عن عکرمۃ عن ابن عباس

طلاق ہوئی۔ ابو داؤد نے کہا یہ حدیث ابن جریج کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں کیونکہ یہ لوگ رکانہ کے گھر والے ہیں اور وہ ان کا حال زیادہ جانتے ہیں اور ابن جریج کی حدیث کو بعض بنی رافع نے عکرمہ سے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔

حدیث ابن جریج جس کا حوالہ ابو داؤد نے یہاں دیا ہے ابو داؤد ہی میں اس طرح نقل کی گئی ہے

عن ابن عباس قال طلق عبد یزید ابو رکانۃ واخوتہ ام رکانۃ ونکح امرأۃ من مزینۃ فجاءت النبی فقالت ما یغنی عنی الا کما تغنی ھذہ الشعرۃ لشعرۃ اخذتھا من رأسھا ففرق بینی وبینہ ..... قال النبی ﷺ لعبد یزید طلقتھا ففعل قال راجع امرأتک ام رکانۃ واخوتہ قال انی طلقتھا ثلاثا یا رسول اللہ قال قد علمت راجعھا وتلا یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

ابن عباس سے مروی ہے کہ رکانہ اور ان کے بھائیوں کے باپ عبد یزید نے رکانہ کی ماں کو طلاق دے دی اور مزینہ کی ایک عورت سے نکاح کر لیا تو وہ عورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا وہ میرے ذرا بھی کام نہیں آتا مگر اتنا ہی جتنا یہ بال اس بال کے اور اس نے اپنے سر کا ایک بال پکڑا تو آپ مجھ میں اور اس میں جدائی کرا دیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید سے کہا اسے طلاق دے دو تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے فرمایا اپنی بیوی رکانہ اور اس کے بھائیوں کی ماں سے رجوع کر لو انھوں نے کہا میں نے اسے تین طلاقیں دی ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے پھر آپ نے آیت تلاوت کی۔ یا ایھا النبی ...

(سورۃ الطلاق)

ابو داؤد نے طلاق بتہ والی روایت کو طلاق ثلاث والی روایت سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ابو داؤد کی طلاق ثلاث والی روایت سنداً ضعیف ہے لیکن اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں جیسا کہ ابو داؤد نے کہا ہے بلکہ یہ ہے کہ رکانہ کے والد عبد یزید نے رکانہ کی ماں کو طلاق دی۔ درحقیقت اس روایت میں دو الگ الگ واقعہ بیان کیا گیا ہے جو رکانہ اور ان کی بیوی سے نہیں رکانہ کے والد اور والدہ سے متعلق ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث صحیح ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ بائنہ کے حق میں صریح ہے لیکن ابو داؤد کی یہ روایت فی الواقع صحیح نہیں ہے۔ امام ابن قیم فرماتے ہیں:۔

ان ابا داؤد لم یحکم بصحتہ	ابو داؤد نے اس حدیث کی صحت کا
وانما قال بعد روایتہ ھذا	حکم نہیں لگایا بلکہ اس کی روایت کے بعد صرف
اصح من حدیث ابن جریج	یہ کہا کہ یہ ابن جریج کی اس حدیث سے زیادہ
انہ طلق امراتہ ثلاثا وھذا لا	صحیح ہے جس میں یہ ہے کہ اس نے اپنی بیوی
یدل علی ان ھذا الحدیث	کو تین طلاقیں دیں اور اس سے یہ بات ثابت
عندہ صحیح فان حدیث	نہیں ہوتی کہ یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح
ابن جریج ضعیف وھذا ضعیف	ہے کیونکہ ابن جریج کی حدیث ضعیف ہے اور
ایضا فھو اصح الضعیفین عندہ	یہ حدیث بھی ضعیف ہے تو یہ ان کے نزدیک دو
وکثیرا ما یطلق اھل الحدیث	ضعیف حدیثوں میں سے صحیح تر ہے اور
ھذہ العبارۃ علی ارجح الحدیثین	بسا اوقات محدثین اس عبارت کا اطلاق اس
الضعیفین وھو کثیر من کلام	حدیث پر کرتے ہیں جو دو ضعیف حدیثوں میں سے
المتقدمین ولو لم یکن اصطلاحا	زیادہ راجح ہو اور متقدمین کے کلام میں اکثر یہ بات
لہ ولم تدل اللغۃ علی اطلاق	ہے اور اگر یہ ان کی اصطلاح نہ ہوتی تو لغت میں
الصحۃ علیہ فانک تقول لاحد	صحت کا اطلاق اس طرح کے معاملے پر نہ ہوتا
المریضین ھذا اصح من ھذا	کیونکہ تم دو مریضوں میں سے ایک کے لیے یہ کہتے
ولا یدل علی انہ صحیح مطلقا	ہو کہ یہ اس سے زیادہ صحت مند ہے تو اس کا مطلب

یہ نہیں ہوتا کہ وہ بالکل تندرست ہو۔

یہ انھوں نے سنن ابوداؤد کے حاشیے میں لکھا ہے۔ "اغاثۃ اللھفان" میں وہ فرماتے ہیں:۔

ان ابا داؤد انما رجح	ابوداؤد نے حدیث ابن جریج پر حدیث
حدیث بتۃ علی حدیث ابن	البتہ کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ انھوں نے
جریج لانہ روی حدیث ابن	ابن جریج کی حدیث کو ایسی سند سے روایت
جریج عن طریق فیھا مجھول	کیا ہے جس میں ایک مجہول راوی ہے اور
ولم یروا ابوداؤد الحدیث الذی	ابوداؤد نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا
رواہ احمد فی مسندہ من طریق	جسے احمد نے اپنی مسند میں محمد بن اسحٰق کی سند سے
محمد بن اسحٰق ان رکانۃ	روایت کیا ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک
طلق امراتہ ثلثا فی مجلس واحد	مجلس میں تین طلاقیں دیں۔ اس لیے ابوداؤد
فلذا رجح ابوداؤد حدیث	نے حدیث بتہ کو ترجیح دی اور اس حدیث
البتۃ ولم یتعرض لھذا الحدیث	سے تعرض نہیں کیا، نہ اسے اپنی سنن میں روایت
ولا رواہ فی سننہ ولا ریب انہ	کیا اور یقیناً مسند احمد کی یہ روایت دونوں
اصح من الحدیثین وحدیث	روایتوں سے زیادہ صحیح ہے۔ اور ابن جریج
ابن جریج شاھد لہ	کی حدیث اس کی شاہد ہے۔

امام ابن جوزیؒ نے کتاب العلل میں امام احمد سے نقل کیا ہے کہ حدیث رکانہ لیس بشی (رکانہ کی حدیث کچھ بھی نہیں ہے۔ خلال نے کتاب العلل میں اثرمؒ سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابوعبداللہ سے رکانہ کی حدیث البتہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اس کی تضعیف کی۔ اسی طرح امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے حدیث بتہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا "مضطرب ہے کیونکہ اس میں کبھی ثلاثا آتا ہے اور کبھی واحدۃ، حافظ منذریؒ بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی سند اور متن دونوں میں اضطراب ہے وہ امام بخاری کے علاوہ امام احمد کے حوالے سے بھی فرماتے ہیں کہ ان طرقہ ضعیفۃ۔ پھر اس حدیث کی سند میں زبیر بن سعید ہاشمی بھی ہیں جنھیں بہت سے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ابوداؤد کی البتہ والی روایت مضطرب بھی ہے اور ضعیف بھی۔ اس لیے وہ قابل

استدلال نہیں۔ مسند احمد کی رکانہ والی حدیث جس میں طلاق بتہ کے بجائے طلاق ثلاث کا ذکر ہے اور جو صحیح ہے، آگے آتی ہے۔

۷۔ عن علی قال سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلا طلق البتة فغضب وقال تتخذون آیات اللہ هزوا ولعبا من طلق البتة الزمناه ثلثا لا تحل له حتی تنکح زوجا غیره (دارقطنی)

حضرت علی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی تو آپ غصہ ہوئے اور فرمایا تم اللہ کی آیات کا مذاق اور کھیل بناتے ہو جو شخص بھی طلاق بتہ دے گا ہم اس کو تین طلاق لازم کردیں گے اور اس کی عورت اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک وہ کسی اور سے نکاح نہ کر لے۔

لیکن اس روایت کے ایک راوی کے بارے میں دارقطنی خود فرماتے ہیں۔

اسمٰعیل بن ابی امیة القرشی متروک الحدیث

اسمعیل بن ابی امیہ قرشی ضعیف اور متروک الحدیث ہیں۔

اس سے پہلے وہ اس کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ هو یضع الحدیث (وہ جھوٹی حدیثیں گھڑتا ہے۔) اس روایت کے ایک اور راوی عثمان بن قطر کے بارے میں ابن معین نے کہا۔ لا یکتب حدیثه اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ ابن حبان نے کہا۔ یروی الموضوعات عن الثقات۔ ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کرتا ہے۔

ایک اور راوی عبدالغفور کے بارے میں علامہ محمد طاہر نے فرمایا یضع الحدیث (حدیثیں گھڑتا ہے۔) اس روایت کے بارے میں امام ابن تیمیہ نے فرمایا فی اسنادہ ضعفاء و مجاهیل (اس کی سند میں ضعیف اور مجہول راوی ہیں۔)

۸۔ دارقطنی ہی کی ایک اور روایت ہے:۔

ایما رجل طلق امرأته ثلثا مبهمة او ثلاثا عند الاقراء لم تحل

جس شخص نے اپنی بیوی کو تین مبہم طلاقیں دیں یا تین طلاقیں تین طہروں میں دیں اس کے

لَہٗ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ	لیے وہ عورت حلال نہ ہوگی جب تک کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے

لیکن اس روایت کے ایک نہیں متعدد راوی ضعیف ہیں

یہ ہے ان روایات کا حال جنھیں اس سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت محکمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت ثابتہ اس بات کے حق میں موجود نہیں کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑ جاتی ہے۔ میری نظر میں وہ تمام کوششیں ہیں جن کے ذریعے ان روایات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے زور لگایا گیا ہے۔ مگر پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے ان پر غور کرنے سے رائے یہی بنتی ہے کہ ان میں سے کوئی روایت جرح اور ضعف سے پاک نہیں ہے۔

اجماع

احادیث کے بعد اس مسئلے میں اجماع امت سے استدلال کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ بائنہ ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کے خلاف رائے غلط اور باطل ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بعض دوسرے مسائل کی طرح اس مسئلے میں اجماع کا دعویٰ کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا گیا ہے۔ اجماع کا کوئی ثبوت فی الواقع موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس مسئلے میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ہر دور کے محدثین اور فقہاء کے اختلاف کا ذکر ملتا ہے۔ حافظ ابن حجر باب من جوّز الطلاق الثلاث (جس نے تین طلاق کو جائز قرار دیا) کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

وفی الترجمۃ اشارۃ الی ان	اور ترجمۃ الباب میں اس بات کی طرف
من السلف من لم یجز وقوع	اشارہ ہے کہ سلف میں ایسے لوگ بھی ہیں جو
الطلاق الثلاث (جلد ۹ ص۳۶۵)	تین طلاق کے وقوع کو جائز قرار نہیں دیتے۔

کچھ دور آگے چل کر اسی سلسلہ کلام میں وہ فرماتے ہیں:-

الرابع انہ مذہب شاذ	چوتھی بات یہ کہی گئی ہے کہ ایک مجلس
فلا یعمل بہ واجیب بانہ نقل	میں تین طلاق کے ایک ہونے کی یہ بات مسلک شاذ

عن علي وابن مسعود وعبد الرحمن بن عوف والزبير ومثله نقل ذالك ابن مغيث في كتاب الوثائق وعزاه لمحمد بن وضاح ونقل الغنوي ذالك عن مشائخ قرطبة كمحمد بن تقي بن مخلد ومحمد بن عبد السلام الخشني وغيرهما ونقله ابن المنذر عن اصحاب ابن عباس كعطاء وطاؤس وعمرو بن دينار ويتعجب من ابن التين حيث جزم بان لزوم الثلاث لا اختلاف فيه وانما الاختلاف في التحريم مع ثبوت الاختلاف كما ترى

(فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۹۰)

ہے اس لیے اس پر عمل نہ ہوگا۔ جواب دیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، عبدالرحمن ابن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہم سے اس طرح کی بات منقول ہے اسے ابن مغیث نے کتاب الوثائق میں نقل کیا ہے اور اسے محمد بن وضاح کی طرف منسوب کیا ہے اور غنوی نے اس مسلک کو قرطبہ کے مشائخ کے ایک گروہ مثلاً محمد بن تقی بن مخلد اور محمد بن عبدالسلام خشنی وغیرہ سے نقل کیا ہے اور ابن المنذر نے اسے ابن عباس کے اصحاب مثلاً عطاء و طاؤس اور عمرو بن دینار سے نقل کیا ہے اور ابن تین پر حیرت ہے کہ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ تین طلاق کے لزوم میں اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صریح تحریم میں ہے۔ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ اختلاف ثابت ہے۔

اس سے چند سطر اوپر انھوں نے محمد بن اسحاق صاحب مغازی کو اس مسلک کا قائل بتایا ہے امام طحاوی شرح معانی الآثار میں فرماتے ہیں:۔

فذهب قوم الى ان الرجل اذا طلق امرأته ثلاثا معا فقد وقعت عليها واحدة اذا كان في وقت السنة وذالك ان تكون طاهرا في غير جماع وجنوا

تو ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ مرد جب اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو عورت پر ایک ہی طلاق واقع ہوگی جبکہ وقت سنت میں یعنی اس وقت دی گئی ہو کہ وہ پاک ہو اور اس سے جماع نہ کیا گیا ہو

فی ذالك بهذا الحديث	اور انھوں نے اس سلسلے میں اس حدیث
(جلد ۲ صفحہ)	سے استدلال کیا ہے

واضح رہے کہ امام طحاوی امام ابن تیمیہ سے بہت پہلے کے محدث ہیں۔ وہ امام بخاریؒ کے معاصر ہیں۔ گویا امام طحاوی کے زمانے تک بھی اس مسلک کے قائل اتنے لوگ تھے کہ انہیں قوم (یعنی گروہ) سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں الطلاق مرتان کے تحت لکھتے ہیں :۔

ثم القائلون بهذا القول	پھر اس قول کے قائلین میں اختلاف
اختلفوا على قولين الاول وهو	ہو گیا اور ان کے دو قول ہو گئے۔ ایک قول
اختيار كثير من علماء الدين	جو بہت سے علماء دین کا اختیار کردہ ہے یہ ہے
انه لو طلقها اثنين او ثلاثا	کہ اگر اس نے بیک وقت دو یا تین طلاقیں
لا يقع الا الواحدة وهذا القول	دیں تو صرف ایک واقع ہو گی اور یہی قول قیاس
هو الاقيس لان النهي يدل	سے قریب تر ہے۔ کیونکہ ممانعت سے واضح
على اشتمال المنهي عنه على	ہوتا ہے کہ ممنوع چیز کوئی راجح مفسدہ
مفسدة راجحة والقول بالوقوع	رکھتی ہے اور وقوع کا قول اس مفسدہ کو
سعي في ادخال تلك المفسدة	وجود میں لانے کی کوشش ہے جو غیر جائز ہو تو
في الوجود وانه غير جائز	ضروری ہوا کہ عدم وقوع کا حکم کیا جائے

(تفسیر کبیر [illegible])

امام رازیؒ کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ یہ مسلک زیادہ قرین قیاس ہے دوسرے یہ کہ یہ مسلک شاذ مسلک نہیں بلکہ علماء دین کا ہے۔

امام ابن قیمؒ نے بھی اعلام الموقعین میں متعدد صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے علماء کا ذکر کیا ہے جو اس قول کے قائل ہیں

علامہ عینی عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری میں فرماتے ہیں :۔

ذهب طاؤس و ابن اسحق	طاؤس، ابن اسحاق، حجاج بن ارطاۃ، نخعی
والحجاج بن ارطاة والنخعي و	ابن مقاتل اور اہل ظاہر کا مسلک یہ ہے کہ

ابن مقاتل والظاهرية الى ان الرجل اذا طلق امراته ثلاثا معا فقد وقعت عليها واحدة واحتجوا

جب آدمی نے اپنی عورت کو تین طلاقیں ایک ساتھ دیں تو اس پر ایک ہی واقع ہوگی اور انھوں نے ابوصہبار کی حدیث سے استدلال کیا۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں :-

والقول الثانی انه اذا طلق ثلاثا تقع واحدة رجعية وهذا هو المنقول عن بعض الصحابة وبه قال ابوداؤد الظاهری واتباعه وهو احد القولين لمالك وبعض اصحاب احمد (عمدة الرعاية جلد۲ صلہ)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب اس نے بیک وقت تین طلاقیں دیں تو ایک رجعی واقع ہوگی اور یہ قول بعض صحابہ سے منقول ہے اور اس کے قائل داؤد ظاہری اور ان کے پیرو ہیں اور یہ امام مالک کے دو قولوں میں سے ایک قول اور امام احمد کے بعض اصحاب کا قول ہے

اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں اس قول کو حضرت علی، ابوموسیٰ الاشعری، ابن عباس، طاؤس، عطاء، جابر بن یزید، ہادی، قاسم، ناصر، احمد بن عیسے، عبداللہ بن موسے بن عبداللہ، زید بن علی اور اصحاب ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے واضح ہوا کہ نہ صرف یہ کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ بائنہ ہونے پر اجماع نہیں ہے بلکہ اس کے ایک طلاق ہونے کا مسلک علمار کی قابل لحاظ تعداد کا ہے۔

آثارِ صحابہ

قرآن مجید، احادیث رسول اور اجماع امت کے بعد آثار صحابہ کا نمبر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام کے آثار سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاق کو طلاق مغلظہ بائنہ مانتے تھے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک مجلس کی تین طلاق کے ایک طلاق بائنہ ہونے کے مسلک کو حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا معروف مسلک تو یہی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو وہ تین طلاق مانتے تھے۔ مگر ان کی طرف یہ قول بھی منسوب ہے کہ وہ اس طلاق کو ایک طلاق مانتے تھے۔

ابو داؤد میں ہے :-

عن عکرمۃ عن ابن عباسؓ اذا قال انت طالق ثلاثا بفم واحد فہی واحدۃ

عکرمہ سے مروی ہے وہ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کسی شخص نے ایک منہ سے تین بار انت طالق کہا تو یہ ایک طلاق شمار ہوگی

ایک اور صحیح روایت میں حضرت طاؤس سے مروی ہے

واللہ ما کان ابن عباسؓ یجعلھا الا واحدۃ (عون المعبود جلد۲ ص۲۲۷)

بخدا ابن عباس اسے ایک ہی شمار کرتے تھے۔

ایک طلاق ہونے کے دلائل

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ایک مجلس میں طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑجاتی ہے ' یہ بات نہ کتاب اللہ سے ثابت ہے اور نہ سنت رسول اللہ سے ' نہ اس پر امت کا اجماع ہے ۔ اس کے بعد مزید کسی بحث کی فی الواقع ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن ایجابی طور پر دو احادیث ایسی ہیں جو اس مسئلے کا فیصلہ کر دیتی ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم اور دوسری کتب حدیث میں ہے :-

عن ابن عباس قال کان الطلاق علی عہد رسول اللہ وابی بکر وسنتین من خلافۃ عمر طلاق الثلاث واحدۃ فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیھم فامضاہ علیھم

ابن عباس سے مروی ہے انہوں نے کہا رسول اللہ اور حضرت ابو بکرؓ کے دور اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سالوں تک (ایک وقت) تین طلاق ایک ہی ہوتی تھی تو عمر بن خطاب نے کہا لوگوں نے ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لیے غور و فکر کا موقع تھا جلدی کی تو ہم ان طلاقوں کو نافذ کر دیں تو آپ نے انہیں نافذ کر دیا۔

الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ یہ روایت مختلف اسناد کے ساتھ صحیح مسلم اور دوسری کتب میں آئی ہے۔ روایتہً اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث اپنے اس مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق کے عہد میں اور دورِ فاروقی کے ابتدائی دو سالوں (بعض روایات میں تین سال آئے ہیں) میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق قرار دیا جاتا تھا۔ جب حضرت عمر رضہ نے دیکھا کہ لوگ بجائے اس کے کہ اللہ کی دی ہوئی سہولت و مہلت سے فائدہ اٹھاتے اور ایک مجلس میں ایک طلاق پر بس کرتے۔ انھوں نے ایک مجلس میں تین طلاق کو معمول بنا لیا اور طلاق کے غیر مشروع طریقے پر مصر ہیں تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ لوگوں پر تین طلاق نافذ کر دی جائیں۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے یہ حکم انھوں نے نافذ کر دیا۔

حدیث کا ظاہر مفہوم یہی ہے۔ اس مفہوم کی رو سے دورِ نبوی، دورِ صدیقی اور ابتدائی دورِ فاروقی کا یہ تعامل سامنے آتا ہے کہ ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک طلاق مانا جاتا تھا

جو لوگ اس کے خلاف مسلک رکھتے ہیں انھوں نے اس حدیث کی مختلف تاویلیں کی ہیں ہم ان میں سے قابلِ ذکر تاویلات کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں ایک تاویل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

قیل المراد ان المعتاد فی	کہا گیا ہے کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ
الزمن الاول کان طلقۃ واحدۃ	دورِ اول میں رواج یہ تھا کہ طلاق ایک دی
وصار الناس فی زمن عمر یوقعون	جاتی تھی اور حضرت عمر کے زمانے میں تین طلاق
الثلاث دفعۃ واحدۃ فنفذہ	ایک ہی بار میں دینے لگے تو حضرت عمر نے
عمر وعلی ھذا یکون اخبارا	انہیں نافذ کر دیا تو یہ لوگوں کی عادت کے مختلف
عن اختلاف عادۃ الناس	ہونے کی اطلاع ہے نہ کہ ایک ہی مسئلے میں حکم
لا عن تغیر حکم فی مسئلۃ واحدۃ	کے بدل جانے کی۔

یہ تاویل متعدد اربابِ علم نے کی ہے مگر آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ کہاں تک اس کے متحمل ہیں۔ علامہ ابن ہمام اس تاویل پہ اشکال عائد کرتے ہیں۔

وما قیل فی تاویلہ انہ	اور اس حدیث کی تاویل میں جو کہا گیا ہے

الذی یوقعونہا الآن انما کانت فی الزمان الاول احدی تنبیہ علی تغیر الزمان ومخالفۃ السنۃ فیشکل اذلا یتجہ حینئذٍ قولہ فامضاہ عمر

کہ تین طلاقیں جواب دیتے ہیں دور اول میں ان کا رواج نہ تھا۔ ایک ہی کا رواج تھا الخ جو اس میں زمانے کے تغیر اور سنت کی مخالفت کی خبر ہے تو یہ مشکل ہے کیونکہ اس صورت میں فامضاہ عمر متعلق نہیں ہو پاتا۔

صحیح مسلم کی بعض روایات صراحۃً اس تاویل کی تردید کرتی ہیں:۔

عن طاؤس ان ابا الصہباء قال لابن عباس اتعلم انما کانت الثلاث تجعل واحدۃ علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وثلثا من امارۃ عمر فقال ابن عباس نعم

طاؤس سے مروی ہے کہ ابو صہباء نے ابن عباس سے پوچھا کیا آپ جانتے ہیں کہ تین طلاقوں کو دور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم، دور ابو بکر اور خلافت عمر کے تین خلافت عمر کے تین سالوں میں ایک شمار کیا جاتا تھا۔ انھوں نے فرمایا۔ ہاں۔

پھر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ دور نبوی میں لوگ ایک مجلس میں تین طلاقیں نہیں دیتے تھے، روایات سے اس کے برعکس ثابت ہے۔

۲۔ یہ حکم غیر مدخول بہا کے لیے ہے جیسا کہ بعض روایات میں صراحت ہے۔

عن ایوب عن غیر واحد عن طاؤس ان رجلا یقال لہ ابو الصہباء کان کثیر السوال لابن عباس قال اما علمت ان الرجل کان اذا طلق امراتہ ثلثا قبل ان یدخل بہا جعلوہا واحدۃ علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وصدرا من امارۃ عمر قال ابن عباس بلی کان الرجل

ایوب سے انھوں نے متعدد افراد سے نقل کیا ہے انھوں نے طاؤس سے کہ ایک شخص جسے ابو صہباء کہا جاتا تھا، ابن عباس سے بہت سوال کرتا تھا۔ انھوں نے ابن عباس سے پوچھا۔ کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ آدمی جب اپنی بیوی کو ہم بستری سے پہلے یک وقت تین طلاق دیتا تھا تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر اور خلافت عمر کی ابتدائی دور میں ایک ہی طلاق شمار کرتے تھے

اذا طلق امرأته ثلاثا قبل ان يدخل بها جعلوها واحدة على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابي بكر وصدرا من امارة عمر فلما رأى الناس قد تتابعوا فيها قال اجيزوهن عليهم (ابوداؤد)

ابن عباس نے کہا۔ ہاں۔ آدمی جب ہم بستری سے قبل اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا تو دور نبوی دور صدیق اور ابتدائی دور عمر میں اسے ایک شمار کیا جاتا۔ تو جب حضرت عمر نے دیکھا کہ لوگ پے درپے تین طلاقیں دینے لگے تو ان پر تینوں نافذ کر دیں۔

یہ روایت ثابت بھی ہو جائے تو یہ غیر مدخول بہا کے لیے ہوگی اور دوسری روایات مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کے لیے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ابوداؤد کی یہ روایت ضعیف ہے اور طاؤس سے روایت کرنے والے مجہول لوگ ہیں۔ (شرح مسلم للنووی)

۳۔ یہ حدیث ایک خاص صورت سے متعلق ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں

قال ابن سريج وغيره يشبه ان يكون ورد في تكرير اللفظ كان يقول انت طالق انت طالق انت طالق وكانوا اولاً على سلامة صدورهم يقبل منهم انهم ارادوا التاكيد فلما كثر الناس في زمن عمر وكثر فيهم الخداع ونحوه مما يمنع قبول من ادعى التاكيد حمل عمر اللفظ على ظاهر التكرار فامضاه عليهم (فتح الباری جلد ۹)

ابن سریج نے کہا خیال ہوتا ہے کہ یہ حدیث الفاظ کی تکرار کے سلسلے میں آئی ہے جیسے کہ وہ کہے۔ تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق تو دور اول میں دلوں کی سلامتی کے باعث ان کا یہ قول قبول کر لیا جاتا تھا کہ ان کا ارادہ تاکید کا تھا (تین طلاق کا نہیں) تو جب حضرت عمر کے زمانے میں مسلمان زیادہ ہو گئے۔ فریب وغیرہ بھی زیادہ ہو گئی جس کے باعث تاکید کا دعوے قبول کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عمرؓ نے لفظ کو ظاہر پر محمول کر دیا اور تینوں طلاقیں ان پر نافذ کر دیں۔

امام نووی نے اس تاویل کو صحیح ترین تاویل قرار دیا ہے۔ علامہ ابن الہمام نے بھی فتح القدیر میں اس تاویل کو اختیار کیا ہے مگر آپ خود دیکھیے کہ حدیث کے الفاظ کہاں تک اس کا ساتھ دیتے ہیں

نہ حدیث میں خاص الفاظ کا ذکر ہے نہ اس بات کا کہ جو لوگ تاکید کا دعویٰ کرتے تھے ان کا دعوے مان لیا جاتا تھا اور جو دعوے نہ کرتے تھے ان کے حق میں تین طلاقوں کا فیصلہ ہوتا تھا، نہ دلوں کی صفائی یا کھوٹ کی طرف کوئی اشارہ ہے۔ آخر تاویل کے لیے کوئی بنیاد تو ہو۔

۴۔ یہ حدیث منسوخ ہو چکی ہے ورنہ حضرت ابن عباس اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے اور حضرت عمر کے زمانے میں ان کے خلاف مسلک پر اجماع نہ ہوتا۔ امام نووی اس تاویل کو نقل کر کے اس پر علامہ مازری کی تنقید نقل کرتے ہیں۔

قال المازری وقد زعم من لا خبرة له بالحقائق ان ذلک کان ثم نسخ قال وھذا غلط فاحش لان عمر لا ینسخ ولو نسخ وحاشاہ لبادرت الصحابة الی انکارہ وان اراد ھذا القائل انه نسخ فی زمن النبی فذلک غیر ممتنع ولکن یخرج عن ظاھر الحدیث لانه لو کان کذلک لم یجز للراوی ان یخبر ببقاء الحکم فی خلافة ابی بکر و بعض خلافة عمر فان قیل قد یجمع الصحابة علی النسخ فیقبل ذلک منھم قلنا انما یقبل ذلک لانه یستدل باجماعھم علی ناسخ واما انھم ینسخون من تلقاء انفسھم فمعاذ اللہ لانه

مازری نے کہا جن لوگوں کو حقائق کی خبر نہیں ہے ان کا خیال ہے کہ یہ حکم تھا پھر منسوخ ہوگیا۔ مازری نے کہا یہ واضح طور پر غلط ہے کیونکہ حضرت عمرؓ منسوخ نہیں کر سکتے اور اگر وہ حاشا وکلّا منسوخ کرتے تو صحابہ فوراً انکار کرتے اور اگر قائل کا منشا یہ ہے کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں منسوخ ہوگیا تھا تو یہ بات غیر ممکن نہیں ہے لیکن یہ بات ظاہر حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو راوی کے لیے یہ جائز نہ ہوتا کہ وہ خلافت ابوبکر اور خلافت عمر کے بعض سالوں میں اس حکم کے باقی رہنے کی خبر دیتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ کبھی صحابہ نسخ پر اجماع کر لیتے ہیں اور ان کا اجماع قبول کر لیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کا اجماع اس لیے قبول کر لیا جاتا ہے کہ اس سے ناسخ کے وجود کے لیے دلیل فراہم ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ خود منسوخ

اجماع على الخطاء وهم معصومون عن ذالك فان قيل فلعل النسخ انما ظهر لهم في زمن عمر قلنا هذا غلط ايضا لانه يكون قد حصل الاجماع على الخطاء في زمن ابي بكر والمحققون من الاصوليين لا يشترطون انقراض العصر لصحة الاجماع والله اعلم۔ (شرح نووی)

کریں تو اس سے اللہ کی پناہ۔ کیونکہ یہ غلطی پر اجماع ہوگا اور وہ اس سے معصوم ہیں اگر یہ کہا جائے کہ نسخ حضرت عمر کے زمانے میں ظاہر ہوا۔ ہم کہتے ہیں یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں غلطی پر اجماع ہوگیا تھا اور محققین اصولیین اجماع کی صحت کے لیے زمانے کے ختم ہونے کو شرط نہیں ٹھیراتے۔ واللہ اعلم

حافظ ابن حجر نے مازری کی اس تنقید کا ذکر کر کے جگہ جگہ اس پر تعقب کیا ہے مگر تعقب میں فی الواقع کوئی جان نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث ان تاویلات میں سے کسی تاویل کی متحمل نہیں ہے اور حدیث کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا۔ متعدد حنفی علماء نے بھی حدیث کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر نے جو فیصلہ کیا وہ یا تو ان کا اجتہاد تھا کہ حالات بدل گئے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول نے لوگوں کے لیے جو سہولت فراہم کی تھی شریعت کی نافرمانی کی بنا پر وہ اس کے مستحق نہیں رہے' یا خلیفہ کی حیثیت سے یہ ان کا سیاسی فرمان تھا جس کا مقصد لوگوں کی اصلاح اور ایک مجلس میں تین طلاق دینے کے رواجِ عام کو روکنا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی بات ہو تم اس اجتہاد یا اس سیاست سے کیوں اختلاف کر رہے ہو۔ جواب یہ ہے کہ اصل چیز کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے۔ وہ ہر چیز پر حتی کہ خلیفہ راشد کے اجتہاد پر بھی مقدم ہے اور خلفاء راشدین کے اجتہادات سے اختلاف سلف میں کوئی انوکھی بات نہیں رہی ہے اور سیاسی نوعیت کے فیصلے اور بھی عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ پھر یہ معاملہ تو ایسا ہے کہ اس میں ایک تعامل عہدِ نبوی اور دورِ صدیقی اور ابتدائی دورِ فاروقی کا ہے اور دوسرا دورِ فاروقی کا۔ ہم پہلے تعامل کو دوسرے تعامل پر ترجیح دے رہے ہیں۔

جہاں تک حالات کا تعلق ہے وہ بلاشبہ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ خراب ہیں لیکن حالات کی یہ خرابی اور سنگینی بھی اس کی متقاضی ہے کہ ہم اس مسئلے پر از سر نو غور کریں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں ہی ایک فیصلہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے چند اور انتظام بھی کیے تھے۔ ایک انتظام دینی تعلیم کو عام کرنے کا تھا۔ دوسرا انتظام معاشرے کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے اور تیسرا حدود و تعزیرات کے قیام کا تھا۔ اس سلسلے کی ایک مزید بات یہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایک مجلس میں تین طلاق دینے والوں کو درے مارتے تھے اور آخری بات یہ کہ مسلمانوں کے معاش کی حکومت کفالت کرتی تھی۔ عامۃ المسلمین بھی نادار و رمعذور مردوں اور عورتوں کی کفالت کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے اور مسلمان معاشرہ کی اخلاقی اور دینی حالت آج سے بہت زیادہ بہتر تھی۔ اس کے ساتھ عرب میں طلاق کوئی عار کی بات نہ تھی اور مطلقہ عورتوں کا نکاح بہت آسانی سے ہوجاتا تھا

اب دین کی تعلیم کا انتظام درہم برہم ہوچکا ہے۔ لوگ طلاق کے بنیادی مسائل بھی نہیں جانتے حضرت عمر کا درہ بھی نہ رہا جس کے ڈر سے لوگ تین طلاقیں نہ دیں۔ حدود و تعزیرات کتابوں کے اندر بند ہیں۔ معاشرے کی دینی و اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ماحول اس قدر پُرفتن ہے کہ مردوں اور عورتوں کو عفت و اخلاق کا بچا لینا مشکل ہوگیا ہے اور بے شوہر کی عورت کے لیے تو کتنے ہی فتنے ہیں۔ ہندوستانی سماج ایسا ہے کہ اس میں مطلقہ عورتوں کا نکاح بہت دشوار ہے نتیجہ یہ ہے کہ اگر مطلقہ عورت کی شادی نہ ہو تو، یا طویل مدت تک نہ ہو تو عورت اور معاشرہ دونوں کے اخلاق کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسلامی حکومت موجود نہیں ہے جو بے سہارا عورتوں کی کفالت کرسکے۔ نہ معاشرہ ہی اس طرف متوجہ ہے۔ یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ہم خیال کرتے ہیں کہ دورِ فاروقی کے تعامل سے عہد نبوی اور دورِ صدیقی کے تعامل کی طرف واپس جانا چاہیے۔

مسند احمد میں ہے :۔

حدثنا سعد بن ابراهيم	سعد بن ابراہیم نے ہم سے بیان کیا
قال حدثنا ابی عن محمد بن	انھوں نے کہا ہم سے میرے باپ نے بیان کیا
اسحق قال حدثنی داؤد بن	انھوں نے محمد بن اسحٰق سے انھوں نے کہا مجھ سے
الحصين عن عكرمة مولى بن	داؤد بن حصین نے بیان کیا، عکرمہ مولی ابن عباسؓ
عباس قال طلق ركانة بن	سے نقل کرتے ہوئے کہ رکانہ بن عبد یزید اخی
عبد يزيد اخو بنى مطلب	بنی مطلب نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین

امراته ثلاثا فی مجلس واحد فحزن علیه حزنا شدیدا قال فسأله رسول الله صلی الله علیه وسلم کیف طلقتها قال طلقتها ثلاثا قال فقال فی مجلس واحد؟ قال نعم قال فانما تلک واحدة فارجعها ان شئت قال فراجعها فکان ابن عباس یری انما الطلاق عند کل طهر

طلاقیں دیدیں۔ پھر اس پر انھیں شدید غم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تم نے اپنی بیوی کو کس طرح طلاق دی، پوچھا ایک ہی مجلس میں؟ کہا ہاں آپ نے فرمایا تو یہ ایک ہی طلاق ہوئی تو اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کر لو۔ انھوں نے رجوع کر لیا تو ابن عباس کی رائے تھی کہ طلاق ہر طہر کے وقت ہونی چاہیے۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :-

واخرجه احمد وابو یعلی وصححه من طریق محمد بن اسحٰق وهذا الحدیث نص فی المسئلة لا یقبل التاویل الذی فی غیره من الروایات الآتی ذکرها وقد اجابوا عنها باربعة اشیاء احدها ان محمد بن اسحٰق وشیخه مختلف فیهما واجیب انهم احتجوا فی عدة من الاحکام بمثل هذا الاسناد کحدیث ان النبی صلی الله علیه وسلم رد علی ابی العاص بن الربیع زینب ابنته بالنکاح الاول ولیس کل مختلف فیه مردودا والثانی معارضته بفتوی ابن عباس بوقوع الثلاث کما تقدم من روایة مجاهد وغیره

احمد اور ابو یعلی نے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور اسے محمد بن اسحٰق کی سند سے صحیح قرار دیا ہے اور حدیث اس مسئلے میں صریح ہے اور اس میں تاویل کی گنجائش نہیں جو آگے آنے والی روایتوں میں ممکن ہے۔ اس حدیث کے لوگوں نے چار جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ محمد بن اسحاق اور ان کے شیخ داؤد بن حصین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ متعدد احکام میں اس طرح کی سند کو مانا گیا ہے جیسے کہ یہ روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی زینب کو ابو العاص کے پاس پہلے ہی نکاح کے ساتھ بھیج دیا (اس روایت میں بھی یہی سند ہے) اور ہر وہ شخص جس میں اختلاف کیا جائے وہ لازماً قابل رد نہیں ہوتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ابن عباس کے فتوے کے

فلا يظن بابن عباس انه كان
عنده هذا الحكم عن النبي صلى
الله عليه وسلم ثم يخالفه الا
بمرجح ظهر له وراوي الخبر اخبر
من غيره بما روى واجيب بان
الاعتبار برواية الراوي لا برايه
كما يطرق رايه من احتمال
النسيان وغيره ذالك واما كونه
تمسك بمرجح فلم ينحصر في المرفوع
لاحتمال التمسك بتخصيص وتقييد
او تاويل وليس قول مجتهد حجة
على مجتهد آخر. الثالث ان
ابا داود رجح ان ركانة انما
طلق امراته البتة كما اخرجه هو
من طريق آل بيت ركانة وهو
تعليل قوي لجواز ان يكون بعض
رواته حمل البتة على الثلاث
فقال طلقها ثلاثا بهذه النكتة
يقف الاستدلال بحديث ابن
عباس. الرابع انه مذهب
شاذ فلا يعمل به واجيب
بانه نقل عن علي وابن مسعود
وعبد الرحمن بن عوف و

معارض ہے جیسا کہ مجاہد وغیرہ نے ان سے
روایت کیا ہے اور یہ روایت اوپر گذر چکی ہے
اور ابن عباس کے بارے میں یہ خیال نہیں
کیا جا سکتا کہ ان کے پاس نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کا یہ حکم ہو پھر وہ اس کے خلاف فتویٰ
دیں مگر یہ کہ کوئی مرجح ان کے سامنے ظاہر ہو گیا
ہو اور حدیث کا راوی دوسروں کے مقابلہ
میں حدیث کو زیادہ جانتا ہے جواب دیا گیا
کہ اعتبار راوی کی روایت کا ہے نہ کہ اس کی
رائے کا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نسیان وغیرہ کا
اس کی رائے پر اثر پڑا ہو۔ رہی یہ بات کہ اس
نے کسی مرجح سے تمسک کیا ہو تو یہ مرجح حدیث
مرفوع ہی تک محدود نہیں ہے۔ کیونکہ ہو سکتا
ہے کہ اس نے تخصیص یا تقیید یا تاویل کا سہارا
لیا ہو اور کسی مجتہد کا قول دوسرے کے لیے حجت
نہیں ہے۔ تیسرا جواب اس حدیث کا یہ ہے
کہ ابوداؤد نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ رکانہ
نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی تھی جیسا کہ انھوں
نے رکانہ کے اہل بیت سے روایت کیا ہے اور
یہ ایک قوی تعلیل ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض
راویوں نے بتہ کو تین پر محمول کیا ہو تو یہ کہہ دیا ہو
کہ انھوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اسی
نکتے کے باعث ابن عباس کی روایت سے

الزبير مثله نقل ذالك ابن
مغيث في كتاب الوثائق
له وعزاه لمحمد بن وضاح
ونقل الغنوي ذالك عن جماعة
من مشائخ قرطبة كمحمد بن
تقي بن مخلد ومحمد بن
عبد السلام الخشني وغيرهما
ونقله ابن المنذر عن اصحاب
ابن عباس كعطاء وطاؤس
وعمرو بن دينار ويتعجب من
ابن التين حيث جزم بان
لزوم الثلاث لا اختلاف
فيه وانما الاختلاف في التحريم
مع ثبوت الاختلاف كما ترى
ويقوي حديث ابن اسحاق
المذكور ما اخرجه مسلم
من طريق عبد الرزاق عن معمر
عن عبد الله بن طاؤس
عن ابيه عن ابن عباس
قال كان الطلاق على عهد
رسول الله صلى الله عليه
وآله وسلم وابي بكر وثنتين
من خلافة عمر طلاق الثلاث

استدلال موقوف ہو جائے گا۔ چوتھا جواب یہ
ہے کہ یہ شاذ مسلک ہے۔ اس لیے اس پر عمل نہ ہو گا
جواب دیا گیا ہے کہ حضرت علی، ابن مسعود،
عبد الرحمٰن بن عوف اور زبیر رضی اللہ عنہم سے
اس طرح کی بات نقل کی گئی ہے۔ اس بات
کو ابن مغیث نے کتاب الوثائق میں نقل کیا
ہے اور اسے محمد بن وضاح کی طرف منسوب کیا ہے
اور غنوی نے اسے قرطبہ کے مشائخ کے ایک گروہ
جیسے محمد بن تقی بن مخلد اور محمد بن عبد السلام خشنی
وغیرہ سے نقل کیا ہے اور ابن منذر نے اسے
ابن عباس کے اصحاب مثلاً عطاء، طاؤس اور
عمرو بن دینار وغیرہ سے نقل کیا ہے اور ابن تین
پر حیرت ہے کہ انھوں نے یقین سے کہا کہ تین طلاق
کے لازم ہو جانے میں اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف
اس کی تحریم میں ہے۔ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ
اختلاف ثابت ہے اور ابن عباس کی مذکورہ حدیث
کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جسے مسلم نے عبد الرزاق
عن معمر عن عبد اللہ بن طاؤس عن ابیہ عن ابن عباس
کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے عہد میں اور حضرت
عمر کے عہد کے شروع کے دو سالوں میں طلاقوں
کو ایک شمار کیا جاتا تو عمر بن خطاب نے کہا کہ
لوگوں نے ایک ایسے معاملہ میں جلدی کی جس میں

واحدة فقال عمر ان الناس قد استعجلوا في امر كانت لهم فيه اناة فلو امضيناه عليهم فامضاه عليهم (فتح الباری جلد ۹ ...)

ان کے لیے غور وفکر کا موقع تھا تو کیوں نہ ہم ان پر تین طلاق لازم کر دیں تو انھوں نے ان پر تین طلاقیں لازم کر دیں۔

حافظ ابن حجر نے روایت پر کیے گئے چار اعتراضات میں سے تین کا جواب تو خود دے دیا مگر تیسرے اعتراض کا ذکر کر کے خاموش ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اسے قوی خیال کیا ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض بھی قوی نہیں ہے۔ ابو داؤد نے البتہ کی روایت کو طلاق ثلاث کی اس روایت سے صحیح تر قرار دیا ہے جو انھوں نے ابن جریج سے روایت کی ہے۔ اس روایت کی سند میں مجہول راوی موجود ہے اور وہ یقیناً ضعیف ہے۔ مسند احمد کی مذکورہ روایت کو ابو داؤد نے روایت نہیں کیا ہے نہ اس کی سند میں کوئی مجہول راوی موجود ہے نہ اس روایت کے مقابلہ میں انھوں نے طلاق البتہ والی روایت کو صحیح تر بتایا ہے۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ کسی راوی نے غلطی سے البتہ کو ثلاث کے ہم معنے سمجھ کر البتہ کے بجائے طلاق ثلاث کی روایت کر دی کیونکہ یہاں صرف دو لفظوں کا فرق نہیں ہے بلکہ دو واقعات الگ الگ ہیں۔ ایک روایت کی رو سے رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ میری نیت ایک کی تھی۔ آپ نے قسم دلائی اور نیت کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ روایت اس باب میں خاموش ہے کہ اگر وہ تین کی نیت بتلاتے تو آپ کیا فیصلہ فرماتے۔ دوسری روایت کی رو سے واقعہ اس کے برعکس یہ ہے کہ رکانہ نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ تم نے کس طرح کی طلاق دی۔ کہا تین طلاقیں دیں۔ آپ نے فرمایا ایک مجلس میں؟ رکانہ نے کہا ایک ہی مجلس میں۔ آپ نے فرمایا تو یہ ایک ہی طلاق ہوئی تو اگر تم چاہو تو رجوع کر لو تو انھوں نے رجوع کر لیا۔ اس روایت کی رو سے نہ آپ نے نیت پوچھی نہ رکانہ نے ایک کی نیت بتائی، نہ آپ نے حلف لی، بلکہ رکانہ نے صراحت کی کہ میں نے تین طلاق دی اور ایک مجلس میں دی۔ یہ سنکر آپ نے اسے ایک طلاق قرار دیا اور رجوع کرنے کا رکانہ کو حق دے دیا۔ بہر حال یہ دو واقعے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک ہی روایت صحیح ہو سکتی ہے۔ یہ صرف البتہ اور طلاق ثلاث کے اشتباہ کی بات نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں

هذا الحديث قال فيه ابن اسحٰق حدثني داؤد

اس حدیث میں ابن اسحٰق نے کہا حدثنی

ود اؤد من شیوخ مالک ورجال البخاری وابن اسحٰق اذا قال حدثنی فهو اهل الحدیث و هذا اسناد جید	داؤد (مجھ سے داؤد نے بیان کیا) اور داؤد مالک کے شیوخ میں سے ہیں اور بخاری کے رواۃ میں سے اور ابن اسحٰق جب حدثنی کہیں تو محدثین کے نزدیک ثقہ ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ اچھی اسناد ہے۔

امام ابن قیمؒ اعلام الموقعین میں اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

العزرمی کی اسنادی حیثیت

وقد صحح الامام احمد هذا الاسناد وحسنه فقال فی حدیث عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی صلی الله علیه وسلم رد ابنته علی ابی العاص بمهر جدید ونکاح جدید هذا حدیث ضعیف اوقال واه لم یسمعه حجاج عن عمرو بن شعیب وانما سمعه عن محمد بن عبد الله العزرمی و	امام احمد نے اس سند کو صحیح بتایا ہے اور اس کی تحسین کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس حدیث کے بارے میں جسے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے انھوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی کو ابو العاص کے پاس واپس بھیجا نئے مہر اور نئے نکاح سے۔ اس حدیث کو انھوں نے ضعیف یا لغو بتایا اور کہا کہ حجاج نے عمرو بن شعیب سے اسے نہیں سنا بلکہ محمد بن عبد اللہ عزرمی سے سنا اور عزرمی کی حدیث کوئی قیمت نہیں رکھتی۔

اسی سلسلۂ کلام میں مزید فرماتے ہیں :۔

والحدیث الصحیح الذی روی ان النبی صلی الله علیه وآله وسلم اقرهما علی النکاح الاول واسناده هو اسناد حدیث عکرمة عن ابن عباس هذا وقد قال الترمذی فیه لیس باسناده باس	اور صحیح حدیث وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح روایت کی گئی کہ آپ نے اپنی بیٹی اور ان کے شوہر کو (اسلام لانے کے بعد) پہلے نکاح پر قائم رکھا اور امام احمد کے پاس اس کی سند بعینہٖ رکانہ بن عبد یزید کی روایت کی سند ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ

عند الترمذی فهو حجة ما لم يعارضه ما هو اقوى منه فكيف اذا عضده ما هو نظيره او اقوى منه ا

(اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۲۵)

اس سند میں کوئی حرج نہیں ہے تو یہ سند امام احمد کے نزدیک صحیح ہے اور ترمذی کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے تو وہ حجت ہے جب تک اس سے قوی روایت اس کے معارض نہ ہو اور یہاں تو اس جیسی یا اس سے زیادہ قوی روایت اس کی تائید کرتی ہو۔

ابوداؤد کی ترجیح پر امام ابن تیمیہؒ کی تنقید بیان کرتے ہوئے امام ابن قیم فرماتے ہیں:۔

قال شیخنا رضی اللہ عنہ ابو داؤد لما لم یرو فی سننه الحدیث الذی فی مسند احمد یعنی الذی ذکرناه آنفا فقال حدیث البتة اصح من حدیث ابن جریج ان رکانة طلق امراته ثلاثا لانه اهل بیته ولکن الائمة الاکابر العارفون بعلل الحدیث و الفقه کالامام احمد و ابی العقیل و البخاری ضعفوا حدیث البتة و بینوا ان رواته قوم مجاهیل لم تعرف عدالتهم و ضبطهم و احمد ثبت حدیث الثلاث و بین انه الصواب و قال حدیث رکانة لا یثبت انه طلق امراته البتة و فی روایة

ہمارے شیخ (ابن تیمیہؒ) نے کہا ابوداؤد نے اپنی سنن میں وہ حدیث روایت نہیں کی جو مسند احمد میں ہے یعنی جسے ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اس لیے انھوں نے کہا کہ حدیث البتہ ابن جریج کی روایت سے صحیح تر ہے جس میں یہ ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں کیونکہ اس حدیث کی روایت کرنے والے رکانہ کے گھر کے لوگ ہیں لیکن حدیث کے بڑے بڑے امام جو حدیث کی علتوں اور فقہ سے واقف ہیں مثلاً امام احمدؒ ابن عقیل اور بخاری انھوں نے حدیث البتہ کو ضعیف قرار دیا ہے اور انھوں نے واضح کیا ہے کہ اس حدیث کے راوی مجہول لوگ ہیں جن کی عدالت اور انضباط کے بارے میں معلومات نہیں اور امام احمد نے تین طلاق والی روایت کو ثابت ٹھیرایا ہے اور بتایا ہے کہ یہی روایت صحیح ہے اور انھوں نے کہا کہ

عنہ حدیث رکانۃ فی البتۃ
لیس بشیء لان ابن اسحٰق یرویہ
عن داؤد بن حصین عن عکرمۃ
عن ابن عباس ان رکانۃ طلق
امراتہ ثلاثا واھل المدینۃ
یسمون الثلاث البتۃ
قال الاثرم قلت لاحمد
حدیث رکانۃ فی البتۃ
فضعفہ

(اعلام الموقعین جلد ۲ صفحہ ۲۵)

رکانہ کی وہ حدیث جس میں یہ ہے کہ انہوں
کو طلاق بتہ دی ثابت نہیں ہوتی اور ا
ایک روایت یہ ہے کہ رکانہ کی حدیث
کوئی وزن نہیں رکھتی کیونکہ ابن اسحٰق
داؤد بن حصین سے انھوں نے عکرمہ سے انھ
نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رک
نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں او
اہل مدینہ تین طلاقوں کو بتہ کہتے ہیں ا
کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے رکانہ
حدیث بتہ کے بارے میں پوچھا تو انھو
اس کی تضعیف کی ۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ لوگ مسند احمد کی روایت اور ابو داؤد کی ا رو
روایت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا دونوں ایک ہی روایتیں ہیں اور فرق صرف سند کا
دونوں میں سند کے علاوہ متن کا کھلا ہوا فرق ہے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمام رو
رو سے ــ البتہ والی روایات ہوں یا طلاق ثلاث والی ـــ واقعہ کا تعلق رکانہ اور
سے ہے ۔ پھر اس روایت میں واقعات بالکل دوسرے ہیں جو نہ مسند احمد کی روایت میں
نہ ابو داؤد کی البتہ والی روایت میں ۔ اس طرح ابن جریج کی روایت ایک الگ روایت
کا دوسری روایت سے کوئی معارضہ نہیں ہے ۔ اصل معارضہ ابو داؤد کی طلاق البتہ اور
طلاق ثلاث والی روایت میں ہے اور دونوں میں تطبیق کی کوئی صورت نہیں ہے سوائے
ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے اور گزشتہ تصریحات کی رو سے مسند احمد کی طلاق ثلاث و
کو ابو داؤد کی طلاق البتہ والی روایت پر ترجیح حاصل ہے ۔

مجھے معلوم ہے کہ ابو داؤد کی طلاق البتہ والی روایت کی طرح مسند احمد کی طلاق ثلاث
پر بھی کلام کیا گیا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی قطعی اور آخری بات کہنا مشکل

اختلاف و اضطراب کی وجہ سے دونوں روایتوں کو ساقط قرار دیجیے۔ اس صورت میں صحیح مسلم کی مذکورہ بالا روایت رہ جائے گی اور یہ بات کہ قرآن مجید سے تین طلاق کا طلاق مغلظہ بائنہ ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ آیات کے ظاہر الفاظ اس کے خلاف جاتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسند احمد کی طلاق ثلاث والی روایت کو ترجیح دیجیے۔ اس صورت میں تنہا اس حدیث سے نہیں ــــ کہ اس کے صحیح ہونے میں کچھ لوگوں کو کلام ہے۔ بلکہ صحیح مسلم کی روایت سے مل کر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق طلاق مغلظہ بائنہ نہیں ہوتیں۔ قرآن مجید سے استدلال اس کے علاوہ ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ابوداؤد کی طلاق البتہ والی روایت کو ترجیح دیجیے مگر یہ روایت ایک طرف تو صحیح مسلم کی صحیح تر روایت سے ٹکراتی ہے۔ اگر طلاق البتہ والی روایت کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑتی ہے ــ دوسری طرف ایک ضعیف حدیث سے خواہ وہ دوسری ضعیف حدیث کے مقابلے میں راجح ہی کیوں نہ ہو، عورت کی حرمت مغلظہ جیسا حکم ثابت نہیں کیا جا سکتا، جب کہ اس میں یہ بات صراحۃً موجود بھی نہ ہو۔

اوپر کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے طلاق مغلظہ بائنہ پڑ جاتی ہے اس کے برعکس صحیح مسلم اور مسند احمد کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق طلاق مغلظہ بائنہ نہیں ہے، وہ ایک ہی طلاق شمار ہوگی۔ ائمہ اور علماء حق کی عظیم اکثریت اگرچہ یہی رائے رکھتی ہے کہ یہ طلاق طلاق مغلظہ بائنہ ہے لیکن علماء کی ایک قابل لحاظ تعداد اس رائے کی قائل ہے کہ یہ طلاق طلاق مغلظہ بائنہ نہیں ہے اور یہی ہمارے نزدیک قول راجح ہے۔

لیکن اگر اس قول کو قول مرجوح بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ کتاب و سنت کی رو سے اس قول کے اختیار کیے جانے کی گنجائش ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ حالات و ضروریات اور مصالح امت کے تحت قول مرجوح پر فتوے دیا جائے۔ علماء حق نے بارہا ایسا کیا ہے۔ آج کے حالات میں مسلمانوں کا سب سے سنگین مسئلہ ہے اور ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ بائنہ ہونے کا مسئلہ نہ اجماعی ہے، نہ کتاب و سنت ثابتہ کی رو سے صریح و منصوص، بلکہ اختلافی اور اجتہادی مسئلہ ہے۔ اس لیے اس میں قول مرجوح کو اختیار کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ میں علماء امت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ حالات

دیانت کے تحت اس مسئلے پر از سرِ نو غور فرمائیں اور ہزاروں لاکھوں خاندانوں کو تباہی سے بچائیں
میری ان معروضات سے سوال ۱ اور ۳ کا جواب تو واضح طور پر سامنے آگیا۔ اب میں
دوسرے سوال کا جواب عرض کروں گا۔

۱۔ میرے نقطہ نظر سے تو اس سوال کا جواب واضح ہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہے اور نیت ایک رکھے یا تین کی اگر قائل نے یہ الفاظ ایک ہی مجلس میں کہے ہیں تو ایک ہی طلاق واقع ہوئی۔ نیت ایک ہو یا تین کی۔ اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

حنفی نقطہ نظر سے بھی اس صورت میں جبکہ طلاق دینے والا کہے کہ میری نیت ایک طلاق کی تھی، میں نے تو صرف تاکید کے لیے تین بار طلاق کہا تھا۔ دیانۃً ایک ہی طلاق ہوگی مگر قضاءً تین طلاق ہوں گی۔ وقت آگیا ہے کہ حنفی فقہاء دیانت اور قضاء کے اس فرق کو ختم کرکے نیت کے مطابق فتویٰ دینے کا فیصلہ کریں۔

یہ بات تو عربی زبان کی ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ طلاق، طلاق، طلاق یا طلاق دی، دی، دی یا طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی۔ ان سب الفاظ کا تعداد کے لیے تاکید کے لیے استعمال ہوتا ہے جب تک کوئی واضح قرینہ تعداد کے لیے نہ ہو۔ ان الفاظ کو تاکید ہی پر محمول کرنا چاہیے اور نیت کی کھوج میں نہ پڑنا چاہیے لیکن اگر طلاق دینے والا صراحۃً کہہ رہا ہے کہ اس کی نیت ایک طلاق کی تھی تو لازماً اس کی بات مان لینی چاہیے۔ کیونکہ یہی بات ظاہر الفاظ کے بھی مطابق ہے۔

۲۔ ہندوستان میں جہالت عام ہے۔ عوام ہی نہیں بہت سے وکلاء تک یہی سمجھتے ہیں کہ طلاق کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ تین طلاق کے الفاظ بولے یا لکھے جائیں، اس صورت میں اگر کوئی شخص حلفیہ بیان دیتا ہے کہ اس کی مراد تین طلاق کے الفاظ سے فقط طلاق دینے کی تھی تعداد مراد نہ تھی تو اس کے بیان کو باور کرلینا چاہیے۔

جہاں تک میرے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، آدمی تین طلاق دے یا ہزار، اس سے طلاق مغلظہ بائنہ نہیں پڑے گی، صرف ایک طلاق پڑے گی خواہ وہ تین یا ہزار دینے کی نیت کرے یا اس کا مقصود صرف طلاق دینا ہو۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے مقصود نہ فتویٰ دینا ہے نہ بحث ومناظرے کا باب وا کرنا

یہ اہل علم کے غور وفکر کے لیے بصد ادب پیش خدمت ہے۔ شاید اس سے انہیں اس پیچیدہ مسئلے کے حل کرنے کے سلسلے میں کوئی مدد مل سکے۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔ علیہ توکلت والیہ انیب واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۶ر نومبر ۱۹۷۳ء

ایک مجلس میں "تین طلاق" کے مسئلے پر

سمینار

اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد (گجرات) کی دعوت پر احمد آباد میں ۴ر ۵ر ۶ر نومبر ۷۳ء کو "ایک مجلس میں تین طلاق" کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی۔ اس مجلس کی صدارت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے فرمائی۔ مفتی صاحب موصوف کے علاوہ درج ذیل علمائے کرام نے شرکت فرمائی

۱۔ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب (فاضل دیوبند) مدرس مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں۔

۲۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، مدیر برہان، دہلی

۳۔ مولانا مختار احمد صاحب ندوی، ناظم جمعیۃ اہلحدیث بمبئی

۴۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب ابن شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی

۵۔ مولانا سید احمد صاحب عروج قادری مدیر ماہنامہ "زندگی" رام پور۔ یوپی

۶۔ مولانا سید حامد علی صاحب سکریٹری جماعت اسلامی ہند دہلی۔

۷۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب۔ امیر جماعت اسلامی مہاراشٹر اسٹیٹ

اسلامک ریسرچ سنٹر نے ان حضرات کے علاوہ متعدد دوسرے علمائے کرام کو بھی مدعو کیا تھا مگر وہ اپنی مختلف معذوریوں کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے۔

اسلامک ریسرچ سنٹر نے ان حضرات کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھی ارسال کیا تھا جو منسلک ہذا ہے۔
یہ مجلس مذاکرہ "گجرات چیمبر آف کامرس ہال احمد آباد" میں منعقد ہوئی جس میں مذکورہ بالا سات حضرات نے اپنے تحقیقی مقالے پیش فرمائے۔ ان مقالات میں مسئلہ مذکورہ کے مختلف پہلوؤں پر کتاب و سنت کی روشنی میں مدلل بحث کرتے ہوئے اپنا اپنا نقطہ نظر واضح کیا گیا تھا۔ مقالات میں مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی تھی۔

صدر مجلس مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اپنی مصروفیات کے باعث مقالہ مرتب نہ کرسکے تھے اس لیے انھوں نے مقالات کی خواندگی کے اختتام پر تقریر کی شکل میں اپنے خیالات پیش فرمائے جس میں دوسرے قیمتی مشوروں کے علاوہ نقطۂ اتفاق تلاش کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

تقریر کے بعد مسئلہ مذکور پر بحث وتمحیص کا آغاز ہوا جس کے بعد مجلس مذاکرہ متفقہ طور پر حسب ذیل نتیجہ پر پہنچی۔

۱۔ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ بائنہ ہونے کا مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں ہے۔ اس میں سلف ہی کے زمانے سے اختلاف موجود ہے۔

۲۔ فقہی جزئیات وتفصیلات سے قطع نظر مندرجہ ذیل دو صورتوں کے بارے میں مجلس مذاکرہ کی رائے یہ ہے۔

۱۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی میں نے طلاق کا لفظ تاکید کے لیے دہرایا تھا تو اس کی اس بات کو باور کیا جائے گا اور یہ طلاق طلاق مغلظہ بائنہ شمار نہ ہوگی۔

۲۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے "تجھے تین طلاق" مگر وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ میری نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین طلاق کا لفظ کہے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی، اس لیے میں نے تین طلاق کے الفاظ استعمال کیے تھے، تو اس کی بات باور کی جائے گی اور یہ طلاق طلاق مغلظہ بائنہ شمار نہ ہوگی

۳۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو طلاق کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان پر واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ بدعت ومعصیت اور عورت کے حق میں ظلم وزیادتی ہے۔ طلاق کے اس غلط طریقے سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہیے اور طلاق دینا ضروری ہی ہو تو ایک طلاق پر بس کرنا چاہیے اور یہ طلاق بھی عورت کی پاکی کی حالت میں دینی چاہیے جس میں شوہر نے اس سے مقاربت نہ کی ہو۔

دستخط

۱۔ محفوظ الرحمٰن عثمانی۔ ۲۔ سعید احمد اکبرآبادی۔ ۳۔ مختار احمد ندوی۔ ۴۔ سید احمد قادری

۵۔ عبدالرحمٰن۔ ۶۔ حامد علی۔ ۷۔ شمس پیرزادہ۔ ۸۔ عتیق الرحمٰن عثمانی (صدر مجلس مذاکرہ)

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مدظلہ

کی تقریر کے چند اقتباسات

صدر مجلس مذاکرہ نے فرمایا کہ اس مذاکرے میں جو مقالات پیش کیے گئے ہیں وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کے مقالے ہیں۔ علماء کرام نے نہایت محققانہ انداز میں طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کچھ مزید اہل علم اس میں شریک ہوتے تو کس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے۔

طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر سمینار منعقد کرنا ایک جرأت مندانہ اقدام ہے جس کے لیے اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد کے ارکان قابل مبارک باد ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے اور حالات و زمانہ کی تبدیلی کے باعث اس کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر مختلف مسالک کے علما بیٹھ کر غور و فکر کریں اور ان مشکلات پر قابو پانے کی سبیل نکالیں۔ انھوں نے فرمایا میں تو تجویز کروں گا کہ یہاں جو کچھ طے ہو وہ اٹھا کر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سامنے رکھ دیا جائے اس طرح اتحاد و تعاون سے کوئی بڑا کام ہو سکتا ہے ورنہ انتشار پیدا کرنا تو آسان ہے۔ اتفاق و یک جہتی بہت مشکل ہے۔ اس سمینار میں مختلف مکتب فکر کے لوگ ہیں تاہم کوشش کی جائے تو ایک مشترک نقطہ نظر سامنے آ سکتا ہے۔

یہاں جو مقالات پڑھے گئے ان کی علمی حیثیت کا جہاں تک تعلق ہے تمام ہی پہلو نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ مولانا عروج قادری صاحب کے مقالے میں حنفی نقطہ نظر کی ترجمانی وضاحت سے کی گئی ہے تاہم موصوف نے حالات کے پیش نظر ایک اعتدال کی راہ بھی پیش کی ہے۔ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب، مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب، مولانا شمس پیرزادہ صاحب، مولانا مختار احمد ندوی صاحب، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب نے بہت اچھے ڈھنگ سے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا حامد علی صاحب نے بڑی کاوش کے بعد مقالہ تیار کیا ہے اور موضوع سے متعلق ایک ایک حدیث کی تنقیح اور تنقید کی ہے۔

ہمارے علما پوتے کی وراثت کے بارے میں تو کچھ توسع پیدا کرتے ہیں لیکن تطلیقات ثلاثہ کے باب میں

ہا جاتا ہے کہ اس پر اجماع ہے لہٰذا ترمیم کی گنجائش نہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ اجماع اس قسم کا نہیں ہے کہ اس کے بعد کلام کی گنجائش نہ ہو، بلکہ یہ اجماع سکوتی ہے۔

بہت سے لوگ جہالت کی وجہ سے طلاق کے الفاظ دہرا دیتے ہیں۔ نیت ہرگز نہیں ہوتی تو ایسی طلاق ہی کو اسوۂ حسنہ نہ بنایا جائے۔ آخری بات جو کہنی ہے وہ یہ کہ طلاق کا جو صحیح اور مسنون طریقہ ہے اس کی ست وسیع پیمانے پر تشہیر ہونی چاہیے۔

سوال نامے کے تین ۳ سوالات!

ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں اسلامک ریسرچ سنٹر احمد آباد نے جو سوال نامہ علماء کرام کی خدمت میں بھیجا تھا اس میں حسب ذیل تین سوال تھے۔

(۱) کیا محض طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرانے سے یعنی بیک وقت طلاق، طلاق، طلاق کہہ دینے سے ین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں جبکہ طلاق دینے والا شخص کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔

(۲) کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دیتا ہے۔ لفظ تین کی صراحت کے ساتھ، لیکن وہ کہتا ہے کہ بن سمجھ رہا تھا کہ جب تک تین کا لفظ استعمال نہ کیا جائے طلاق واقع ہوتی ہی نہیں۔ اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی یا ایک؟

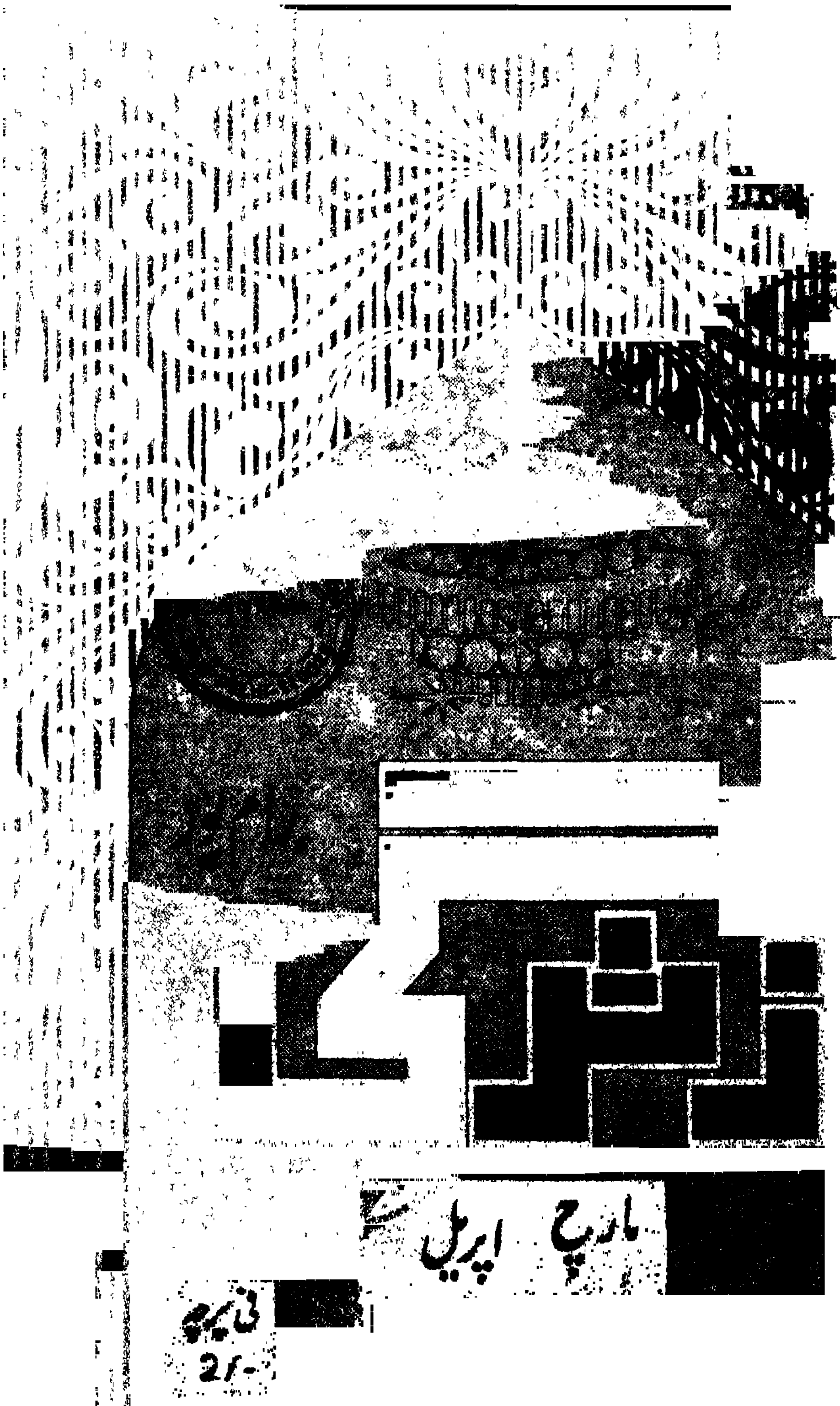
(۳) کیا ایک مجلس کی تین طلاقوں کے منعقد ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ اگر نہیں تو ان علماء اور فقہاء کے نام تحریر فرمائیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔

(بقیہ اشارات)

کہ تین یکجائی طلاقوں کو ہر حال میں ایک قرار دینے والے حضرات ان پر غور فرمائیں۔

احمد آباد سیمینار میں جو مقالات پڑھے گئے تھے ان میں جن کی نقلیں میرے پاس تھیں انہیں کتابت کے لیے کاتب صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ اندازہ تھا کہ ڈیڑھ سو صفحات میں وہ تمام مقالات آجائیں گے لیکن افسوس ہے اتنے صفحات میں تمام مقالات نہیں آسکے۔ مولانا مختار احمد ندوی اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے مقالات

بمبئی سے نقل ہو کر آئے اسی طرح مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کی تقریر کے اقتباسات بھی بعد کو مرتب ہو کر آئے۔ ان تینوں کے لیے کسی طرح گنجائش نہیں نکل سکی۔ کاغذ بھی بمشکل تھوڑا سا حاصل کیا جا سکا اس لیے صفحات میں اضافہ نہیں کیا جا سکا۔ کاغذ کی کمی تعداد اشاعت پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ ہم جتنی تعداد میں یہ نمبر شائع کرنا چاہتے تھے اس سے بھی قاصر رہے۔


مارچ اپریل
فی پرچہ
2/-

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/12
پاکستان سے -/12
ششماہی
ہندوستان سے -/6
پاکستان سے -/6
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

ماہنامہ زندگی رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
ہوائی ڈاک سے
دو ڈالر

جلد ۵۲ | صفر، ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق مارچ و اپریل ۱۹۷۴ء | شمارہ ۳ و ۴

اشارات	سید احمد قادری	۲
مقالات		
ہندو دھرم کی جدید شخصیتیں	جناب محمد فاروق خاں	۷
طلاق کا تاوان و نفقہ	سید احمد قادری	۲۷
یحییٰ علیہ السلام	مولانا سلیمان فرخ آبادی	۴۰
عصر حاضر میں تحریک اسلامی	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	۴۷
تہذیب کی تشکیل نو	ترجمہ جناب اشتیاق حسین صاحب	۶۲
اشارات کا ضمیمہ	سید احمد قادری	۶۹
تراجم و اقتباسات		
ایک گمنام ملک عمان	ماخوذ	۸۱
رسائل و مسائل	سید احمد قادری	۸۴
تنقید و تبصرہ	ع۔ ق	۸۷

اس دائرہ ○ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ امید ہے کہ آپ وی پی وصول فرمائیں گے۔

منیجر ماہنامہ زندگی رامپور یوپی

مالک جماعت اسلامی۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس با اہتمام ... رامپور

مقام اشاعت دفتر زندگی رامپور یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

۲۶ جنوری ۷۴ ۱۹ء کو جماعت اسلامی ہند رام پور کی طرف سے ایک سمپوزیم "موجودہ الیکشن کے اثرات سماج پر" کے عنوان سے منعقد ہوا تھا اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں نے اس پر اظہار خیال کیا تھا۔ جماعت اسلامی ہند کے دو ارکان نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ اختتامی تقریر کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ اس سمپوزیم کا تعلق کسی خاص صوبے کے الکشن یا کسی خاص وقت کے الکشن سے نہ تھا۔ اس میں جو تقریریں کی گئیں وہ بھی اصل موضوع سے مربوط تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ اگر موجودہ الکشن کے برے اثرات سماج پر پڑ رہے ہوں تو ان کے ازالے کی تدابیر پر غور کیا جائے۔ اختتامی تقریر میں جو کچھ کہا گیا اس کا تعلق بھی کسی خاص وقت کے الکشن سے نہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو ان صفحات میں محفوظ کر دیا جائے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد میں نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا:۔

حضرات! میں جماعت اسلامی ہند رام پور کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت پر یہاں آنے کی زحمت گوارا کی۔ ہم فاضل مقررین کے خاص طور سے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہمیں اور آپ کو اپنے خیالات سے استفادے کا موقع دیا۔

آج کے سمپوزیم کے موضوع پر فاضل مقررین نے جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب ایک بات پر متفق ہیں اور وہ یہ کہ موجودہ الیکشن کے اثرات سماج پر اچھے نہیں پڑ رہے ہیں بلکہ یہ بہت سی خرابیوں کا سبب بن گیا ہے۔ ایک مقرر نے یہ کہا کہ وہ نفس الکشن ہی کے خلاف ہو گئے ہیں کیونکہ اس سے صلاح

نہیں ہو سکتی۔ اصلاح کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے "انقلاب"۔ ایک دوسرے مقرر نے فوجی ڈکٹیٹر شپ کی بات بھی کہی ہے لیکن ان دونوں مقررین کے یہ خیالات بھی اسی پس منظر میں ہیں کہ موجودہ الکشن سماج پر بہت برے اثرات ڈال رہا ہے اور گویا وہ اس بات سے مایوس ہیں کہ موجودہ الکشن کے ذریعے کوئی صاف ستھری حکومت برسر اقتدار آسکے گی۔ اس لیے وہ بھی دراصل اس سے متفق ہیں کہ موجودہ الیکشن کے اثرات سماج پر اچھے نہیں پڑ رہے ہیں۔ ان کی بات اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ طریقۂ الیکشن لوگوں کو خود جمہوریت سے مایوس کر رہا ہے اور یہ ایک اندیشے کی بات ہے۔ اگر ہندوستان کے مفکرین نے اور ان لوگوں نے جن کے ہاتھوں میں عوام کی باگ ڈور ہے اصلاح حال کی کوشش نہیں کی تو یہ بات بعید نہیں ہے کہ جمہوریت ہی کا خاتمہ ہو جائے اور ہمارا ملک کسی خونی انقلاب یا فوجی ڈکٹیٹر شپ کی لپیٹ میں آجائے۔ ہمارے ایک فاضل مقرر نے کہا ہے کہ الیکشن کے برے اثرات سماج پر نہیں پڑ رہے ہیں بلکہ خرابیاں سماج میں ہیں اور اس کے برے اثرات موجودہ الیکشن پر پڑ رہے ہیں۔ میں ان کی اس بات سے متفق ہوں لیکن یہ صورت تو اس کی متقاضی ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ ایسے سماج کے لیے جیسا کہ اس وقت ہندوستان کا ہے، الیکشن کا کون سا طریقہ زیادہ مفید ہوگا اور جس کے ذریعے برے اثرات میں کمی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

فاضل مقررین نے برے اثرات کے ازالے کے لیے جو تدابیر بتائی ہیں، جزوی طور پر وہ سب کی سب مفید ہیں۔ مثلاً دو مقرروں نے یہ کہا ہے کہ الیکشن سے پہلے برسر اقتدار حکومت کو مستعفی ہو جانا چاہیے تاکہ حکمراں پارٹی اور دوسری پارٹیاں مساویانہ حیثیت سے الکشن میں حصہ لے سکیں۔ ورنہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ حکمراں پارٹی پبلک کے ذرائع و وسائل استعمال کر کے اپنے مخالفوں کو شکست دینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے اور مساویانہ الیکشن کے لیے ایک مفید تدبیر ہے۔ بعض مقررین نے سیاسی پارٹیوں کے لیے ضابطۂ اخلاق بنانے کی تدبیر کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے چند تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کی ضرورت یہ ہے کہ پارٹی بدلنے کی لعنت نے بھی بہت سی خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا ہے کہ ایک ضابطہ یہ بنایا جائے کہ ہر سیاسی پارٹی اپنے اسی ممبر کو ٹکٹ دے گی جو مسلسل پانچ سال سے اس کا ممبر رہا ہو۔ اسی طرح یہ ضابطہ بھی بنایا جائے کہ جس پارٹی کے ٹکٹ پر کوئی شخص اسمبلی یا لوک سبھا کا ممبر بنتا ہے اگر وہ کسی

دوسری پارٹی میں جانا چاہے تو اپنی سیٹ سے استعفا دے محض ذاتی مفاد کے لیے پارٹی بدلنے وبا آئی ہوئی ہے اسے روکنے کے لیے یقیناً یہ ضابطے مفید ہوں گے۔

فاضل مقررین کی تقریروں پر اس مختصر تبصرے کے بعد میں نے کہا:۔

حضرات! جماعت اسلامی ہند اپنے سیاسی نظریات رکھتی ہے، اپنے کچھ اصول رکھتی ہے لیکن ا وقت میں آپ کے سامنے اس کے سیاسی نظریات اور اس کے اصولوں پر گفتگو نہیں کروں گا بلکہ عمومی میں اپنے کچھ خیالات آپ کے سامنے رکھوں گا۔ آپ لوگ اس سے واقف ہیں کہ جماعت اسلامی ہ فی الحال الیکشن میں حصہ نہیں لیتی اس لیے جو کچھ عرض کیا جائے گا اس کا محرک اصلاح حال کے جذ کے سوا اور کچھ نہیں۔ مجھے اس وقت اقبال کا یہ شعر یاد آرہا ہے

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی کام، کوئی فعل، کوئی عمل کسی خیال، فکر، نظریے یا عقیدے کے ظہور میں آتا ہے اس لیے ہر معقول آدمی یہ تسلیم کرے گا کہ اعمال و افعال اور اخلاق و کردار کی خرا در اصل خیالات و جذبات اور افکار و نظریات کی خرابیوں کے نتائج ہیں۔ موجودہ الکشن کے جو بر اثرات سماج پر پڑ رہے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگ صحیح جذبات و خیالات کے ساتھ الیکشن لڑ رہے ہیں، بلکہ دل میں کچھ، زبان پر کچھ کے تحت انتخابات کی مہم سر کی جارہی ہے۔ بڑے بڑے لیڈر اپنی تقریروں میں اہر کہتے رہتے ہیں اور ابھی پونا میں تقریر کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا ہے کہ خرا کی جڑ یہ ہے کہ ہر شخص روپیہ اور اقتدار کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور یہ سب کے سامنے ہے کہ الیکشن کو بھی ا اور اقتدار کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ بنالیا گیا ہے ـــــ اس کا علاج اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ الیکشن لڑنے والوں کے خیالات و جذبات اور محرکات عمل صحیح رخ اختیار کریں۔ اصلاح فکر، اص عمل کے لیے لازمی چیز ہے۔ ذاتی مفاد، گروہی مفاد۔ ذات پات کی تفریق اور علاقائی تعصبات خرابیوں کی واضح علامتیں ہیں۔ ہمارے لیڈران سب کے خلاف بول رہے ہیں اور نصیحتیں کر ر ہیں لیکن ان کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ یہ علامتیں دھندلی ہونے کے بجائے اور واضح ہوتی چلی جا ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو لوگ ان چیزوں کے خلاف تقریریں کرتے ہیں وہ خود ان میں مبتلا جاتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خیالات و افکار صحیح رخ اختیار نہیں کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہ

ہمارے لیڈر ہمیں جو نصیحتیں کرتے ہیں ان پر خود عمل کیوں نہیں کرتے ؟ اور ہم ان کی نصیحتوں کو سنی ان سنی کیوں کر رہے ہیں ؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے بحیثیت مجموعی اسی دنیا کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا ہے ۔ اسی دنیا کا عیش و آرام اور جاہ و منصب ہمارا اصل مطمح نظر بنا ہوا ہے اور یہ چیز اس حد تک چھائی ہوئی ہے کہ مرنے کے بعد والی دنیا کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہے ۔

یاد رکھیے جب تک زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد سامنے نہ ہو اور کسی چیز کو ہم یہ حیثیت نہ دیں کہ اس پر اپنی ہر چیز قربان کر کے ہمیں مسرت حاصل ہو اس وقت تک نہ الیکشن صحیح معنے میں الیکشن ہو سکتا ہے اور نہ سماج اس کے برے اثرات سے محفوظ رہ سکتا ہے ۔ جہاں تک جماعت اسلامی ہند کا تعلق ہے وہ اس کا یقین رکھتی ہے کہ صرف خدا کی ذات اس کی مستحق ہے کہ اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہم اپنی ہر چیز قربان کر کے مسرت حاصل کریں ۔ کوئی مانے یا نہ مانے ہم سب کو ایک دن خدا کے حضور حاضر ہو کر اپنی دنیوی زندگی کا حساب دینا ہے ۔ یہی وہ عقیدہ اور یہی وہ یقین ہے جو حقیقی معنے میں تمام خرابیوں کو دور کر سکتا ہے ۔

اگر ہندوستان کے عوام و خواص ابھی یہ ماننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کو تیار نہیں ہیں تو کم سے کم انھیں پورے ملک اور پوری ہندوستانی قوم کی فلاح کو اپنا مقصود بنانا ہوگا ۔

یورپ نے اگر خدا کو اپنی اجتماعی زندگی سے ہٹایا تو قوم یا ملک کو اس کی جگہ لا بٹھایا لیکن ہندوستان میں ابھی کچھ بھی نہیں ہے ۔ نہ خدا نہ قوم نہ ملک ' بلکہ یہاں صرف ذاتی ' خاندانی اور گروہی مفاد کی پوجا ہو رہی ہے ۔ اس صورت حال میں موجودہ طریقۂ الیکشن " کریلا نیم چڑھا " بن گیا ہے ۔

میرے خیال میں اصلاح حال کے لیے فکر و عمل کی یہ پانچ باتیں انتہائی ضروری ہیں ،

۱ ۔ ریاستی اسمبلی اور لوک سبھا کی ممبری کو پورے ملک کی بے لوث خدمت کا ذریعہ سمجھنا ۔

۲ ۔ حکومت کے مناصب کو بے لوث خدمت کا ایک ایسا بوجھ سمجھنا جس کو اپنی خوشی سے اٹھانا کوئی پسند نہ کرے ۔

۳ ۔ ممبری اور منصب کے لیے ذات برادری مال و دولت اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے بجائے اچھے انسانی صفات کو معیار بنانا مثلاً علم و فہم صلاحیت و قابلیت ' اخلاق و کردار ' ایثار و قربانی کا جذبہ ۔

۴۔ امیدوار بننے کے سسٹم کو ختم کر دینا۔

۵۔ کسی شخص کو ووٹ دینے کے بجائے با اصول پارٹیوں کو ووٹ دینا، دوسرے لفظوں میں متناسب نمائندگی کا سسٹم رائج کرنا۔

موجودہ طریقہ الکشن کے نتیجے میں ہمارے ملک کی جمہوریت کا حال یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ووٹ استعمال کرنے والوں کی اقلیت کے نمائندے برسر اقتدار رہیں۔

دعوت دہلی ۲۲ جنوری ۷۴ء کے شمارے میں حسب ذیل اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں۔

۱۹۵۲ء سے اب تک اپوزیشن پارٹیوں اور نمائندوں نے ووٹوں کا جو تناسب حاصل کیا ہے اور اس کے مقابلے میں انہیں جو نشستیں ملی ہیں اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے لگائیے۔

۵۲ء	۵۵ فی صد	ووٹوں پر	۲۵ر۶	فیصد
۵۷ء	۵۲ر۳ فی صد	ووٹوں پر	۲۴ر۹	فی صد
۶۲ء	۵۵ر۳ "	"	۲۷ر۰	"
۷۱ء	۵۶ر۴ "	"	۳۲ر۱	"

اس سے معلوم ہوا کہ الکشن کا موجودہ طریقہ ہندوستان کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہے لیکن اس کا بدلنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جب تک رائے عامہ اس کے حق میں نہ ہو جائے اور اس کا دباؤ نہ پڑے جو لوگ اس طریقۂ الیکشن کے ذریعے برسر اقتدار چلے آ رہے ہیں وہ اسے بدلنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔

— ۲ —

اس سال ماہنامہ زندگی کے کاغذ کا کوٹا پہلے سے بھی کم کر دیا گیا ہے اور وہ معمولی شماروں کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ بازار میں کاغذ اتنا مہنگا ہے کہ اسے خرید کر شاید علمی رسالے ہی اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم صفحات کم کر دیں۔ اس لیے فی الحال ماہنامہ زندگی ۵۶ صفحات کا شائع ہوگا۔ حالات جیسے ہی درست ہوں گے ان شاء اللہ ہم اس کے صفحات بڑھا دیں گے۔ ماہنامے کے سالانہ چندے میں مزید اضافہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔

جناب محمد فاروق خاں
(ادارہ تصنیف علی گڑھ)

ہندو دھرم کی جدید شخصیتیں

(آخری قسط)

اس مقالے کی پہلی قسط دسمبر ۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی

رویندر ناتھ ٹیگور

رویندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش بنگال کے ایک باعزت گھرانے میں ۷ مئی ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔ ان کے والد دیویندر ناتھ برہمو سماج کے مشہور لیڈر تھے۔ اپنے بلند کردار کی وجہ سے وہ مہرشی کہلاتے تھے۔ رویندر ناتھ ٹیگور پر بچپن میں ان کے والد کا بڑا کنٹرول تھا۔ یہ مکان سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ البتہ گھر کے باغیچے میں گھومنے پھرنے کی انہیں پوری آزادی تھی۔ باغ کے پرسکون اور حسین ماحول کی وجہ سے بچپن ہی میں انہیں فطرت سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا

ٹیگور میں بچپن ہی سے عبقریت کی شان نمایاں تھی۔ اسکول میں عام طلبہ کے ساتھ ان کی تعلیم کا سلسلہ نہ چل سکا۔ گھر پر ہی انھوں نے مہابھارت اور ویشنو شاعروں کی تخلیقات کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں وہ قانون کی تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجے گئے لیکن قانون سے انہیں رغبت نہ تھی۔ انگلینڈ کے قیام میں کالج میں انھوں نے انگریزی شعراء پر لکچر سننے اور موسیقی کا بھی کچھ تجربہ حاصل کیا۔ ایک سال کے بعد ہی وہ وطن واپس آ گئے۔

۱۸۸۳ء میں رویندر ناتھ کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد والد نے سیالدہ کی زمینداری ان کے سپرد کی۔ اس کے انتظام میں انھوں نے بڑی قابلیت کا ثبوت دیا۔ ان دنوں وہ اکثر پدما ندی میں کشتی میں رہتے تھے۔ اس دور میں انھوں نے کئی اہم نظمیں، کہانیاں اور مقالے لکھے۔ ۱۹۰۱ء میں سیالدہ سے وہ شانتی نکیتن آ گئے۔ یہاں انھوں نے ایک اسکول کھولا۔ یہاں بچوں کو

فطرت کی رفاقت میں رکھ کر تعلیم دی جاتی تھی۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے سوال پر تحریک چلی تو رویندر ناتھ نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کیا لیکن آگے چل کر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کا میدان اصلاً سیاست نہیں بلکہ ادب اور سماج کی خدمت ہے وہ تحریک سے الگ ہو گئے۔

۱۹۱۰ء میں ان کی مشہور تخلیق گیتانجلی شائع ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں انہیں اس پر نوبل پرائز ملا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انگریزی حکومت نے انہیں سر کا خطاب بھی عطا کیا۔ جلیان باغ والے دردناک واقعہ پر انھوں نے اس خطاب کو واپس کر دیا۔ گیتانجلی کے گیتوں میں آتما اور پرماتما میں جدائی اور ملن کا ذکر ہے۔ ان گیتوں میں خدا کو رام، کرشن، بشنو وغیرہ ناموں سے خطاب نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی گیتانجلی ہر طبقہ اور ہر قوم میں مقبول ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں ٹیگور کی مشہور کتاب سادھنا شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل ٹیگور کے مختلف فکری مقالات کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ یہ مقالات انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں پیش کیے تھے۔

زندگی کے آخری ۲۵ سال کے دوران میں رویندر ناتھ ٹیگور نے کئی بار بیرون ملک کا سفر کیا اور دوسرے ملکوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے بین الاقوامی یونیورسٹی، وشو بھارتی قائم کی۔ ان کے پیش نظر یہ مقصد رہا کہ مغربی اور مشرقی تہذیبوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی جائے۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے آکسفورڈ میں ایک اہم تقریر کی جو Religion of man کے نام سے شائع ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔

رویندر ناتھ فرقہ پرستی کے سخت مخالف تھے۔ ان کے فکر کی اصل بنیاد کثرت میں وحدت کا معاینہ ہے۔ ٹیگور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں خدا کے لیے کسی فرقے میں رائج نام کو استعمال کرنے سے گریز کیا بلکہ وہ آسے پریتم، سوامی، پربھو، وہ، تو وغیرہ کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ رویندر ناتھ کو اس سے اختلاف نہیں ہے کہ اپنشدوں میں برہم کے بارے میں دو قسم کے تصور پائے جاتے ہیں۔ ایک تصور

…ردیے … کا اُپدیش ہے اور ہندوستان کے دوسرے مفکرین اسے اپنشد کا واحد نظریہ
…ر دیتے … ٹیگور اس خیال کی تردید تو نہیں کرتے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس سے انہیں تسلی نہیں ہوتی
…پنشد … آخر ایک دوسرا تصور بھی تو ملتا ہے وہ یہ کہ ایشور پرش ہے یعنی وہ شخصیت (Purusha
…نا … حامل ہے چنانچہ لکھا ہے :- یعنی میں نے اس
… پرش کو جانا ہے۔

ٹیگور سنیاس اور رہبانیت کی بھی تائید نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں۔ "اگر میں اپنا گھر چھوڑ دوں تیرے گھر نہیں پہنچ سکتا۔ اگر میں اپنا کام ترک کردوں تو عمل میں تیرا ہم مسلک نہیں بن سکوں گا۔ میں اپنا گھر کو تیرا گھر بنا کر ہی تجھ سے مل سکتا ہوں اس کاروبار کو تیرے کاروبار میں تبدیل کرکے ہی میں یوگ سادھ سکتا ہوں۔

ٹیگور کے نزدیک آدمی سماج کا ایک رکن ہے اس لیے وہ ذہنی صحت اور آنند سب کی سیوا سب سے پریم کرکے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی بعد موت کے بارے میں ٹیگور کے خیالات بہت زیادہ واضح نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مکتی اپنی ذات کا ارتقا ہے یعنی اپنے کو خدا کے حوالے کر دینا اور اپنی فطرت میں جو چیزیں ودیعت ہیں انہیں کمال کی طرف لے جانا ہی مکتی کا اصل ذریعہ ہے۔

ٹیگور اپنشدوں اور بھگتی ادب کے علاوہ بودھ دھرم کے اخلاقی پہلو سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ مغرب سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ ٹیگور نے مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا۔ ان پر جرمن مفکر یوکن (EUKEN) کا کافی اثر پڑا ہے۔ برگساں، کروچے، آئن اسٹائن، شواتیزر، …بی، رسل وغیرہ سے بھی ٹیگور کا تعلق رہا ہے۔ ان سے بھی انھوں نے حسب ضرورت استفادہ کیا ہے۔ قرآن اور بائیبل کے اثرات بھی پڑے ہیں۔

ہندو فکر اور ادب پر ٹیگور نے بہت گہرے اثرات ڈالے ہیں شاعری ہی نہیں ڈرامہ، ناول افسانہ وغیرہ ادب کے تمام اصناف کے ذریعے سے انھوں نے اپنے خیالات کی اشاعت کی ہے

اروبندو

اروبندو کی پیدائش ۱۸۷۲ء میں کون نگر میں ہوئی۔ ان کے دادا اور نانا دونوں ہی برہمو سماج کے خاص رکن تھے۔ ان کے والد کو ہندوستانی اسکولوں کی تعلیم پر اعتماد نہ تھا وہ مغربی تہذیب

کے دل دادہ تھے۔ انھوں نے خود ڈاکٹری کی تعلیم انگلینڈ میں حاصل کی تھی۔ انھوں
بچوں کو کانونٹوں میں تعلیم دلائی اور اونچی تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجا۔ اروند بھی سات
عمر میں انگلستان گئے۔ مینچسٹر میں ایک پادری کے خاندان والوں کے ساتھ ان کے
ہوا۔ یہاں وہ بائبل کے علاوہ شیکسپیر، شیلی، کیٹس کی شاعری سے بھی متعارف ہوئے۔ ا
لیٹن میں اچھی مہارت حاصل کی۔ ۱۸۸۴ء میں سینٹ پال اسکول میں یونانی زبان کا
کیا۔ ۱۸۹۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے کنگس کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں انھیں یورپ
ادب کے مطالعہ کا موقع ملا۔

لندن سے واپس ہوئے تو بڑودہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں
سال تک رہے۔ اس مدت میں انھوں نے ہندوستان کے قدیم لٹریچر، فلسفہ اور دھ
مطالعہ کیا۔ تقسیم بنگال کی تحریک کے موقع پر وہ نوکری چھوڑ کر کلکتہ پہنچے۔ وہاں انھوں
تحریک کی قیادت میں حصہ لیا۔ اس زمانے میں وہ یگانتر اور بندے ماترم دو اخبار
رہے۔ ۱۹۰۸ء میں انگریزی سرکار نے ان پر سازش کا مقدمہ چلایا اور انھیں علی پور ج
ایک سال کے بعد یہ رہا کر دیے گئے۔ یہی گرفتاری ان کی زندگی میں ایک انقلابی تب
بنی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کی زندگی کا مقصد سیاسی سرگرمیاں نہیں بلکہ یوگ سا
۱۹۱۰ء میں وہ پانڈیچری چلے گئے۔ زندگی کے باقی ۴۰ سال انھوں نے یہیں گزار
سے ۱۹۱۸ء تک ماہنامہ آریہ نکالتے رہے ـــــ ys on The Gita
Internel Yoga The Divine وغیرہ اروند کی خاص تصنیفات ہیں۔
کی بڑی شہرت ہوئی۔ اس آشرم سے ہندوستان کے کتنے ہی لیڈروں، مفکروں، شا
ادیبوں نے اثرات قبول کیے۔ اروند کا انتقال ۵ دسمبر ۱۹۵۰ء میں ہوا۔

اروند کے نزدیک زندگی کا اصل مسئلہ کامل علم، کامل مسرت اور دائمی حیات
ہے۔ یہی ان کے فلسفہ کی اصل بنیاد ہے۔ اروند خدا کی ہستی کو تصورات سے ماو
ان کے نزدیک خدا کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مادی بھی ہے، روحانی
لیکن اس کے باوجود انسانی فطرت کو ایک قریب ترین ہستی کا احساس ہوتا ہے ج

ر آنند ہے۔ وہی پرماتما کائنات کا خالق ہے۔ دنیا کی تخلیق اسی کے آنند سے ہوئی ہے ...
اروند برہم کے نزول کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ نزول ان کے نزدیک ست، چت، شکتی اور آنند ان
سطحوں پر ہوتا ہوا اتی مانس' (Supper - mind) کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ اتی مانس
ا اور انسان کے درمیان کی وہ سطح ہے جس کے واسطے سے خدا انسان تک پہنچتا ہے۔ پھر یہاں
سے وہ بالترتیب آتما، من اور پران کی سطح پر ہوتا ہوا جڑ (جماد) کی سطح پر ہوتا ہے۔ اروند کے
زدیک من سے بلند حیثیت انترآتما کو حاصل ہے۔ من سطحی طور پر ظاہری چیزوں کی طرف راغب
تا اور انہیں اختیار کرتا ہے لیکن انترآتما کو اشیاء کے باہمی گہرے روابط کی تلاش ہوتی ہے
سے ہمیشہ ایک رس آنند' کا تجربہ ہوتا ہے۔ انترآتما سے اتی مانس over mind) تک پہنچنے
لیے کئی مراحل اچیہ استری مانس (Higher mind) پربدھ مانس (Illumind
min) اور پرگیاتمک مانس (Intuitive mind) کے مراحل پیش آتے ہیں۔ یہ راستہ
ل کے ذریعے سے طے ہوتا ہے۔ اروند کے نزدیک زندگی کا مقصد دنیا ترک کر کے جنگل کی طرف
خ کرنا نہیں ہے' بلکہ اصل مقصد زندگی میں اتی مانس کو اتارنا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے زندگی
ی باگ ڈور اتی مانس کے ہاتھ میں دی جائے۔ پھر مسئلہ صرف فرد کا نہیں بلکہ پورے سماج کو اونچا
ٹھانے کا ہے۔ اتی مانس کے مقام پر پہنچ کر آدمی کی شخصیت میں نقص نہیں رہتا ورنہ اس کی نظر میں
کوئی قصور رہ پایا جاتا ہے۔ یہاں کبر و غرور کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن شخصیت باقی رہتی ہے۔ عام لوگوں
کو یوگ سدھیوں کے لیے کوشاں نہیں ہونا چاہیے۔ گیانی کو یہ سدھیاں خود بخود حاصل ہو جاتی
ہیں۔ گیانی کا مقصد زمین پر پرمیشر کا راج قائم کرنا ہے۔

اروند کا اتی مانو (Super man) نٹشے کے اس اتی مانو سے جو صرف اپنی اور اپنی
قوم کی برتری کی فکر میں رہتا اور اس کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کرتا ہے بالکل مختلف ہے۔

اروند نے ویدوں کی شرح کے انداز میں چار مقالے لکھے۔ گیتا پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا۔ اس
کے علاوہ ان کی اپنشدوں کی شرح بھی شائع ہوئی ہے۔ سیاست اور سماج سے متعلق ان کے
افکار ان کی اہم تصنیف Human cycle میں پائے جاتے ہیں۔

اروند کے ناقص آدرشوں پر سخت تنقید۔ ... بیراگ، بھگتی وغیرہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت

دینا انہیں پسند نہیں ۔ اسی طرح مغرب کی مادہ پرستی کے بھی وہ خلاف ہیں ۔ انھوں نے مغرب اور
مشرق کے فلسفہ کو ہم آہنگ و متحد کرنے کی کوشش کی ۔ اس سلسلے میں Internal yoga ان کی
اہم تصنیف ہے ۔

اروند یوگ میں جسمانی ریاض پر زور نہیں دیتے ۔ ان کا ریاض بالکل روحانی ہے ۔ خدا کے حضور
کامل حوالگی اس سادھنا کا پہلا قدم ہے ۔ اس کا دوسرا قدم یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پالے کہ خدا
رحمت ہی عمل کراتی ہے اور انانیت کو بالکل ترک کر دے ۔ تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ بندہ خدا کی موجود
کو وجدانی طور پر محسوس کرنے لگے اور اس سلسلے میں اسے کوئی شبہ دامنگیر نہ ہو ۔

مہاتما گاندھی

گاندھی جی کی شہرت ملک اور بیرون ملک میں کئی حیثیتوں سے ہوئی لیکن یہاں ہندو
اور ہندو دھرم کے پس منظر میں ہی ان کے خیالات اور کاموں کا جائزہ لینا ہمارے پیش نظر ہے ۔

گاندھی جی ۲ راکتوبر ۱۸۶۹ء میں گجرات کے ایک بیشنو ویش خاندان میں پیدا ہوئے ۔
بچپن سے ہی ایک مذہبی ماحول ملا جس میں اہنسا اور حسن اخلاق کو خاص اہمیت حاصل تھی ۔
جی نے بچپن میں ماں سے رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں سنیں ۔ بڑے ہونے پر پرہلاد اور
چندر ناٹک دیکھے ۔ گجراتی کے ویشنو شاعری کا مطالعہ کیا ۔ وہ ویشنو اور جین مندروں میں پوجا
کے لیے بھی حاضر ہوتے تھے ۔ ماں سے انہیں ایشور بھگتی کا اور باپ سے راست بازی کا سبق

گاندھی جی ۱۸۸۹ء میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ گئے ۔ شروع ہی میں ان
تھا کہ وکیل کا فرض ہے کہ دو فریقوں کے جھگڑے میں پہلے صلح کرانے کی کوشش کرے ۔ اس میں
کے بعد عدالت کا رخ کرنا چاہیے ۔ لندن سے گاندھی جی کی واپسی ۱۸۹۱ء میں ہوئی ۔ کچھ عرصے
لیے وہ افریقہ گئے ۔ وہاں رنگ و نسل کی بنیاد پر ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت برا سلوک ہو
گاندھی جی افریقہ میں ٹھہرے اور اصلاحی تحریک چلائی ۔ وہاں انھوں نے خدمت کے تمام کام
حصہ لیا ۔ افریقہ میں وہ ۲۰ سال تک رہے ۔ ہندوستان کی آزادی، گاؤں کی ترقی اور ہریجن
خدمت وغیرہ کے سلسلے میں گاندھی جی نے جو کام کیے ان سے سب ہی لوگ واقف ہیں ۔

گاندھی جی نے سابرمتی میں اپنا آشرم قائم کیا ۔ اس کے بعد وردھا میں ان کا آشرم قائم

نے اپنی زندگی میں سنتوں کا سا انداز اختیار کیا۔ آزادی کے بعد ملک میں فرقہ واریت کی جو آگ بھڑکی اسے بجھانے کی انھوں نے ہر تدبیر اختیار کی۔ آزادی کی لڑائی کے وقت ٹیگور کے الفاظ میں انھیں یہ مقام حاصل تھا کہ جب وہ چلتے تو گویا سارا ملک ان کے پیچھے چل پڑتا۔ لیکن بعد میں یہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ لوگوں نے اپنے اس لیڈر کو اس درجہ فراموش کر دیا کہ ان کے پیچھے چلنے والے گنے چنے لوگ باقی نہ رہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ان پر ایک شخص نے گولی چلادی جس سے ان کی موت واقع ہو گئی

رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کا اثر گاندھی جی بچپن میں ہی قبول کر چکے تھے۔ انگلینڈ میں انھوں نے نرملا شنکر کا "دھرم بچار" اپنشدوں کے انگریزی ترجمے، اروِن کی کتاب Life of Mohammed، سیل کا ترجمۂ قرآن، میکسمولر کی تصنیف India - what can it teach us کا مطالعہ کیا۔ ان کے علاوہ جن چیزوں کا انھوں نے مطالعہ کیا۔ ان میں ایڈون ارنالڈ کی تصنیف Light of Asia رسکن کی کتاب Unto the last اور کارلائل کی تصنیف اور زردشت کے اپدیش خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ٹالسٹائی کی تصنیف King dom of gods with in us کا بھی ان پر اثر پڑا ہے انھوں نے بائبل کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ پولس اور کلیسا نے مسیح کے اپدیشوں کو بگاڑ دیا ہے گیتا گاندھی جی کی محبوب کتاب تھی۔

گاندھی جی کوئی فلسفی نہ تھے۔ ان کے نزدیک خدا کی ہستی فلسفہ و منطق کا موضوع نہیں البتہ اسے وجدان کے ذریعے جانا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ناقابلِ بیان ہستی ہر جگہ موجود ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا لیکن اسے محسوس کرتا ہوں۔ اس ہستی کو وہ ست کے نام سے پکارتے ہیں ست کہتے ہیں وجود کو۔ اصلاً ایک خدا کا ہی وجود قائم ہے باقی چیزیں فانی ہیں۔

گاندھی جی اہنسا (عدم تشدد) کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ صرف قتل کرنا ہی نہیں کسی کو ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچانی بھی ان کے نزدیک ہنسا (ظلم و تشدد) اسی طرح سخت کلامی، غصہ، بغض و نفرت سب ہنسا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اہنسا ان کے نزدیک ست کو پانے کا اہم ذریعہ ہے۔ اہنسا ان کے یہاں ایک مثبت عمل ہے، یہ کوئی منفی چیز نہیں ہے۔ گاندھی جی اہنسا کو پریم کے ہم معنے قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اہنسا کے اصولوں کو سیاست میں بھی داخل کیا۔ ستیہ گرہ اہنسا کے استعمال کا ایک طریقہ

ہے۔ سلیگر ہی وہی شخص بن سکتا ہے جو بلند اوصاف کا مالک ہو۔

اہنسا کے علاوہ گاندھی جی برھمچریہ (تجرد) کو اپنے اصولوں میں اہم مقام دیتے ہیں لیکن اپنی زندگی کے اواخر میں گاندھی جی نے اس سلسلے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہے :۔

شادی ایک فطری چیز ہے۔ آدرش یہ ہے کہ ہم شادی کو پوتر سنسکار مانیں اور ضبط نفس کے ساتھ رہیں۔

گاندھی جی نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ آدمی لذت کوشی سے دور رہے اسے وہ اسواد برت سے تعبیر کرتے ہیں۔ آدمی کو وہی اور اتنا ہی کھانا چاہیے جس چیز کی اسے جس مقدار میں ضرورت ہو۔ لذت کے لیے کھانا درست نہیں۔

گاندھی جی اس پر بھی زور دیتے تھے کہ آدمی کو چوری سے بچنا چاہیے۔ چور نہ ست کا گیان حاصل کر سکتا ہے اور نہ اس کے لئے پریم دھرم کی پیروی ممکن ہے۔ ان کے نزدیک چوری صرف یہی نہیں ہے کہ ہم بلا اجازت کسی کی کوئی چیز لے لیں۔ یہ بھی چوری ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ کسی چیز کو استعمال کریں خواہ وہ چیز اپنی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے کی چیز کو للچائی نظروں سے دیکھنا بھی ایک طرح کی ذہنی چوری ہے۔

گاندھی جی تکنیز (اپرگرہ) کے بھی خلاف تھے۔ آدمی کا اصل بھروسہ خدا پر ہونا چاہیے۔ آج کل کے لیے چیزوں کا اسٹاک کرنے کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہم اپنے کو اس کا مالک نہیں، صرف امین و محافظ خیال کریں۔ جس چیز کے استعمال کی ضرورت ہو اسے روکے رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ گیان بھی ہمیں صرف وہ حاصل کرنا چاہیے جو ہمیں خدا کی طرف متوجہ کر سکے۔ اور خدمت کے کاموں میں ہمارا معاون ثابت ہو۔ مال کی طرح خواہ مخواہ ایسے افکار و خیالات جمع کرنے میں بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے جن کی ہمیں فی الواقع ضرورت نہیں ہے۔

خارجی اندیشوں اور خوف سے بھی اپنے کو آزاد رکھنا چاہیے۔ دولت چھن جانے کا خوف، بیماری کا خوف، موت کا خوف، عزت و ناموری کی فکر وغیرہ سے اپنے کو بلند رکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ ہمارے اندر جو غلط رجحانات پلے جا سکتے ہیں ان کی طرف سے ہم کبھی بے پروا نہ ہوں بلکہ انہیں دور کرنے کی پوری کوشش کریں۔ اس سے خارجی قسم کے خوف و اندیشے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

گاندھی جی کا خیال ہے کہ چھوا چھوت ہندو دھرم کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ بیماری باہر سے ہندو دھرم میں گھس آئی ہے۔

جسمانی محنت کو بھی گاندھی جی کے اصولوں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

ان کے نزدیک دیش بھگتی یا وطن سے محبت ضروری ہے۔ سارے عالم کو رشتۂ اخوت میں جوڑنے کے لیے یہ پہلا قدم ہے۔ اپنے جن پڑوسیوں کے ساتھ ہم رہتے سہتے ہیں سب سے پہلے برادرانہ سلوک انہیں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

گاندھی جی سبھی مذاہب کو حق قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ اسی کا مذہب افضل ہے اور دنیا کو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ جس طرح خدا کی ذات کامل ہے اس طرح مذہب بھی اپنے صحیح مفہوم میں کامل ہے۔ لیکن جس طرح ہم خدا کو نہیں دیکھ پاتے اسی طرح اس کامل مذہب کو دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ذریعے سے جو مذہب بھی متصور ہوگا وہ پورے طور سے کامل نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی نہ کوئی نقص لازماً رہے گا۔ اس حقیقت کو جس نے سمجھ لیا وہ اپنے مذہب کے نقائص کو بھی تسلیم کرے گا۔ گاندھی جی کے اصول کے لحاظ سے آدمی کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے دھرم کو سب دھرموں پر فوقیت بھی نہ دے لیکن اسے ترک بھی نہ کرے اور اپنے مذہب کے نقائص کی طرف سے بالکل آنکھیں بند بھی نہ کرے۔

گاندھی جی کی شخصیت کا ہندو ذہن پر قابلِ لحاظ حد تک اثر پڑا ہے۔ نئے عہد میں کتنے ہی ہندوستانی گاندھی وادکو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن

ڈاکٹر رادھا کرشنن ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء میں مدراس کے چتور ضلع میں ترتنی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں مدراس سے تقریباً ۴۰ میل شمال کی جانب ہے۔ ترتنی اور ترپتی ان دو مقاموں کو مذہبی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذہبی لحاظ سے ان مقامات کی حیثیت میں آج بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ رادھا کرشنن کا بچپن انہیں دونوں گاؤں میں گذرا ہے۔ ۱۲ سال کی عمر تک وہ یہاں رہے۔ ترپتی میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۸ سال کی عمر میں لوتھرن مشن ہائی اسکول میں داخل

[illegible]

Voorhes College Vellore میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی وہ تقریباً ۴ سال تک تحصیل علم میں لگے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے مدراس کے کرسچین کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔ یہاں انھیں اپنے لیے مضامین کا انتخاب کرنا تھا۔ اس میں انہیں سخت مشکل پیش آئی۔ یہاں تک کہ ان کا کافی وقت ذہنی کش مکش میں گذر گیا۔ انہیں دنوں ان کے ایک چچیرے بھائی نے فلاسفی کی کچھ کتابیں ان کے مطالعہ کے لیے بھیجیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے انھوں نے سمجھ لیا کہ انہیں اصلاً جس چیز سے مناسبت ہے وہ فلسفہ ہے۔

۱۹۰۸ء میں ایم اے کی ڈگری کے لیے انھوں نے جو مقالہ (Thesis) لکھا وہ ویدانت سے تعلق رکھتا تھا۔ پروفیسر ہیگل جو اس وقت کالج کے پرنسپل تھے۔ اس مقالے سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹر صاحب کے دو مضمون شائع ہوئے جن کی طرف اہل علم کی خاص توجہ ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں مدراس پریسیڈنسی کالج میں فلسفہ کے لیکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۸ء تک وہ تعلیم کے میدان ہی میں کام کرتے رہے۔ مدراس کے علاوہ میسور اور کلکتہ یونیورسٹی میں وہ فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ آندھرا اور ہندو یونیورسٹی میں انھوں نے وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کیا۔

ڈاکٹر صاحب ۹ سال تک بنارس یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اس دوران میں وہ اپنی اورسل اسکیم کے تحت "مذاہب کا تقابلی مطالعہ" کے موضوع پر تقریریں بھی کرتے رہے۔

۱۹۳۶ء میں وہ انڈین فلاسفکل کانگریس کے صدر اور بھارتی مذہب و اخلاق کے اسپولڈنگ پروفیسر رہے۔ تہذیبی احیاء کا مسئلہ اور اخلاقی تعلیم وغیرہ ان کے محبوب ترین موضوع رہے ہیں۔ ان میدانوں میں ڈاکٹر صاحب ذمہ دارانہ منصب پر رہے۔

۱۹۳۱ء میں وہ انٹرنیشنل کوآپریشن کے ممبر ہوئے۔ اسی دوران میں ہندوستان کی طرف سے اقوام متحدہ کے تعلیمی، سماجی اور تہذیبی امور سے متعلق مجلس میں ایک ڈیلیگیشن گیا جس کے سربراہ ڈاکٹر رادھاکرشنن ہی مقرر کیے گئے۔ انگلینڈ کی تعلیمی دنیا نے انہیں دوبار مدعو کیا۔ ۱۹۲۶ء میں مینچسٹر کالج آکسفورڈ یونیورسٹی کی دعوت پر انگلینڈ گئے۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں ہبرٹ لیکچرر Hibbert Lecturer کی حیثیت سے انہیں دعوت دی گئی۔ ۱۹۴۶ء میں وہ اقوام متحدہ کی مجلس عاملہ میں منتخب ہوئے۔ اسی زمانے میں بھارت سرکار نے انہیں یونیورسٹی کمیشن کا صدر بنایا۔ یہ کمیشن اس

غرض سے مقرر ہوا تھا کہ وہ یونیورسٹیوں کی حالت اور ان کے کاموں کا جائزہ لے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اس کمیٹی کے بھی ممبر رہے جس کے ذمے ملک کی دستور سازی کی اہم ذمہ داری کا کام سپرد ہوا تھا۔ وہ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بھی رکن رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے وہ روس گئے۔ انہیں وہاں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اسٹالن نے خود دو بار ان کا استقبال کیا۔ یہ شرف وہاں کسی دوسرے سفیر کو حاصل نہیں ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر صاحب ہندوستان کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں امریکہ کے صدر کی خصوصی دعوت پر مغربی ممالک کے دورے پر گئے اور چھ ہفتے تک وہ امریکیوں کو اپنا سندیش سناتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نائب صدر سے مملکت ہند کی صدارت کے منصب تک پہنچے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنے علمی و فکری وقار کی بنا پر سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان پر مختلف مفکروں اور فلسفیوں کا اثر پڑا ہے۔ انھوں نے مختلف کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان سے پورا استفادہ کیا۔ انھوں نے خود لکھا ہے :۔ "میں اگرچہ بھارت کے آریہ رشیوں اور مغرب کے عہد حاضر کے مفکروں کا ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں کسی کا پیرو ہوں یا ان میں سے کسی شخص کے افکار کو میں نے من وعن قبول کیا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں نے دوسرے لوگوں کے خیالات سے استفادہ نہیں کیا ہے یا میں ان سے متاثر نہیں ہوا ہوں۔ میں نے اکثر ہر کتاب کے مصنف سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ میں نے جتنی بھی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے اکثر ہر ایک سے مجھے تحریک ملی ہے لیکن میرے فکر کا رخ اکثر ایک مختلف سمت میں رہا ہے۔ میرے وجدانی تجربات و احساسات اس کی اصل بنیاد رہے ہیں۔ آپ تائید کریں گے کہ وجدانی احساس و تجربہ مطالعہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس اندرونی احساس کا سرچشمہ میرے روحانی تجربات رہے ہیں فلسفہ 'ست انوبھو' (صحیح وجدانی تجربہ واحساس) کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے نہ کہ تلاش حقیقت کے مطالعہ کے نتیجے میں' میں نے زندگی کو جیسا کچھ پایا ہے اسی کو میں نے اپنی تحریروں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سلسلے میں مجھے کس حد تک اور کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے......

غالباً میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ میں دنیا کے لوگوں کو روحانیت کی اہمیت سمجھاتا رہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بہت دنوں تک باہر رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ ان کا

قیام انگلینڈ میں رہا ہے۔ انگلینڈ کے باشندوں کی عدل پسندی، کمزوروں کے لیے ہمدردی اور کھلا ذ
ان کی نفرت سے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ وہاں کے (All souls College) کے ذریعہ
سے وہ انگریزوں کے خیالات و افکار سے متعارف ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کا بھی اعتراف ہے
کہ انگلستان کے انگریزوں سے انہیں صبر و تحمل اور خود اعتمادی کی دولت اور حوصلہ ملا اور ان سے
انھوں نے متنبہ رہنا سیکھا۔

غالباً ڈاکٹر صاحب پر دیویکانندا اور رویندر ناتھ ٹیگور کا اثر سب سے زیادہ پڑا ہے۔ ڈاکٹر
صاحب کے اندر ہندو دھرم کی خدمت کا جذبہ کیسے پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑی تفصیل سے
بتایا ہے کہ ان کی تعلیم کرسچین کالج میں ہوئی جہاں وہ بائبل (New Testament) سے
واقف ہوئے۔ ساتھ ہی ہندو دھرم کے عقائد اور کرم کانڈ کے خلاف پادریوں کی سخت تنقیدیں سنیں۔ اس
کے نتیجے میں ان کے خیالات میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ لیکن دیویکانند کی زوردار تقریروں نے ان کے اندر
خفتہ احساسات کو جگا دیا۔ انھوں نے ہندو دھرم اور ہندو فلسفہ کے مطالعہ کا عزم کیا۔ ایم اے کے لیے
ویدانت کی اخلاقیات (Ethics of Vedanta) کے موضوع پر (Thesis) پیش کی
یہ دراصل عیسائیوں کی اس بات کا جواب تھا کہ ویدانت فلسفہ میں اخلاق اور عام زندگی کے لیے
کوئی مقام نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ بھارت کے رشی منی سچے مذہبی نہ
تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ہندو دھرم کی اخلاقیات اور مایا واد کے بارے میں ٹیگور کی
تحریروں میں انہیں بہت سا مواد ملا اور یہ چیز ان کے لیے بڑا سہارا ثابت ہوئی۔

فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق کی نوعیت کو جاننے کے لیے انھوں نے بھارتی گرنتھوں کے علاوہ
مغرب کے تقریباً سبھی قابل ذکر مصنفوں اور مفکروں کا مطالعہ کیا۔ مثال کے طور پر انھوں نے لیبنیز،
جیمس وارڈ، ولیم جیمس، برٹرینڈ رسل، لارڈ ولفر وغیرہ کا خاص طور سے مطالعہ کیا۔ اسی مطالعہ کے نتیجے
میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب The Reign of Religion in Contem-
porary Philosophy وجود میں آئی جسے ملک اور بیرون ملک میں ہر جگہ پسندیدگی کی نظر سے
دیکھا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے آکسفورڈ کے مینچسٹر کالج میں تقریر کرتے ہوئے واضح طور پر کہا تھا کہ صدیوں کی لمبی

نینند کے بعد آج ہم ہندو دھرم کے فیصلہ کن عہد میں ہیں۔ ہم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے مذہبی خیابان کے بہت سے درخت رچکے ہیں اور کچھ کو روگ لگ چکا ہے جنھیں صاف کرنا ہی ہوگا۔ یہ ہندو دھرم کے بنیادی اصولوں کو ترک کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ ہمیں از سر نو اُن کی تشریح کرنی ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے فلسفہ اور مذہب کے تقابلی مطالعہ کے سلسلے میں بہت سی تقریریں کیں۔ ہندوستان کے علاوہ انگلینڈ، امریکہ اور چین میں بھی ان کی کتنی ہی اہم تقاریر ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے بعض اہم کتابیں یہ ہیں:۔

۱- Ethics of Vedanta (1911)

۲- Philosophy of Rabindra Nath Tagore (1918)

۳- Raign of Rehigion in Contemporary Thought (1920)

اس کتاب میں سائنس، مذہب اور فلسفہ کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ برگساں، جیمس اور برٹرینڈ رسل کے خیالات پر تنقید کی گئی ہے اور آخر میں اپنشدوں کی روشنی میں آدرش واد اور وحدت الوجود کو سب سے بہتر نظریہ قرار دیا گیا ہے۔

۴- Indian Philosophy (1923) دوسری جلد ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔
اس میں بھارت کے فلسفہ کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ قدیم فلسفوں کی تشریح، ان پر مصنف کی تنقید، مشرق و مغرب کا تقابلی مطالعہ وغیرہ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ مصنف نے ہندوستانی فلسفہ کو آج کے قارئین کے لیے قابلِ فہم بنایا ہے۔ دقیق اور مشکل بات کو بھی نہایت خوبصورت اور آسان اسلوب میں سمجھایا ہے۔

۵- Hindu View of Life (1927)
اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات اختصار کے ساتھ آگئے ہیں۔ دھارمک انوبھو (مذہبی وجدانی احساس و تجربہ) کی اہمیت و عظمت اور دیگر مذاہب سے ہندو دھرم کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ ہندو دھرم پر الگ سے بھی دو تقریریں شامل ہیں۔

۶- An Idealist View of Life (1929)

۷- East and West in Religion (1933)

اس میں مذہب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے

۸- Eastern Religion and Western Thought (1939)

سوامی نیز نے کہا تھا کہ ہندو دھرم میں ترک کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے۔ اس میں رہسیہ واد (Mysticism) چار پرشارتھ، آشرم دھرم اور مذہبی رواداری پر تفصیل شامل ہیں

۹- RELIGION AND SOCIETY

اس کتاب میں دھرم اور سماج، دھرم کی ضرورت، ہندو سماج میں عورت کا مقام، اہنسا اور جنگ وغیرہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے

۱۰- بھگوت گیتا (۱۹۴۹ء)

یہ گیتا کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں انسان اور اوتار واد کے سلسلے میں گفتگو کی گئی ہے

۱۱- Principal Upanishad (1953)

۱۲- Recovery of Faith (1955)

اس میں نئے عہد میں مذہب کی ضرورت، حقیقت اور مظاہر کا تعلق، موجودہ دور میں مختلف مذاہب میں اتحاد کی ضرورت وغیرہ پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں۔

۱۳- برہم سوتر (۱۹۶۰ء)

یہ برہم سوتر کی انگریزی میں شرح ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ان کی یہ کتابیں بھی قابل مطالعہ ہیں۔

۱- Kalki or the Future Civilisation

۲- The Religion we need

۳- Goutam the Budha

۴- India and Chine

۵- Education.

۶- Politics and War

ڈاکٹر رادھا کرشنن درشن شاستر (فلسفہ) کو ایک تعمیری علم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسفہ زندگی کی صرف تشریح ہی نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی اصلاح و تعمیر کا فرض بھی انجام دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو خدا پر کامل یقین حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:- "جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اسی وقت سے مجھے ایک غیبی ہستی پر یقین حاصل ہے۔ وہی طاقت کائنات کے کارخانے کو چلانے والی ہے۔ وہ حواس سے ماوراء ہے۔ اس سلسلے میں شنکر درشن کے تمام خاص نظریات سے انہیں اتفاق ہے لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رامانج وغیرہ آچاریوں کے دلائل بھی لایعنی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نظریے کے مطابق کائنات کی اصل بنیاد برہم کی ہستی ہے۔ صرف خدا ہی حقیقی اور غنی ذات ہے باقی سب کے وجود کا انحصار اسی پر ہے۔ سنسار کو مایا یا متھیا کہنے کا مطلب ان کے نزدیک یہی ہے۔ جو لوگ مایا واد کا سہارا لیکر کائنات کو محض بھرم اور فریب بتلاتے ہیں ان کے بارے میں انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ شاید سمجھتے ہی نہیں کہ مایا واد ہے کیا چیز؟ مایا واد اور مذہب کی پیروی کو دو متضاد چیز بتانا اپنی بے خبری کا ثبوت دینا ہے۔ ایسے لوگوں کو بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ اخلاق و عمل اور مایا واد میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ جگت کو مایا بتلانے والوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ جگت کی سرشٹی (دنیا کی تخلیق) کسی برتر ہستی کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ جگت اس برتر ہستی کے مقابلہ میں حقیر اور پست درجہ کی چیز ہے۔

سچی مذہبیت کیا چیز ہے؟ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ مذہبی وصف نہ کتابوں کا علم ہے اور نہ اچھا عمل بلکہ وہ اندرونی علم اور اندر کی روشنی ہے جو تفکر سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ مذہبی نظر آتما کی انوبھوتی (روح کا تجربہ) ہے اور تعلیم اسی انوبھوتی کی تیاری ہے۔ مذہبی نظریات کی اصل اہمیت اسی پہلو سے ہے کہ وہ روحانی انوبھوتی میں ذریعہ و وسیلہ ہیں۔ نادان لوگ ہی ان کے بارے میں جھگڑا کھڑا کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں۔ دھرم نہ تو گوشۂ تنہائی کے ریاض کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا محض شخصی سرمایہ ہے اور نہ سرکار کے ذریعے سے لادا جانے والا قانون ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کا حصول مدلل علم اور اندرونی تجربہ و احساس کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے۔

فلسفہ سے عقل کو وہ خارج کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا کہنا صرف یہ ہے کہ عقل ہی سب کچھ نہیں بنا سکتی حقیقت عقل کی سطح سے بلند اور گہری ہے محض عقلیت پسندی ایک طرح کی بت پرستی ہے۔ برہم اگرچہ من،

بدھی اور ربانی کے لیے قیر محسوس ہے لیکن وہ انوبھو (وجدانی تجربہ) میں آنے والی چیز ہے۔ دھرم اور روحانیت کے ایسے اونچے مقام پر جہاں عقل و منطق کا گذر نہیں۔ انوبھوتی (Intuition) ہی رسائی کا ذریعہ ہوتی ہے۔

آتما پرماتما اور دھرم کے مقاصد پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے زور دار انداز میں لکھا ہے:۔

"ہندو دھرم کا انسانی زندگی کے ساتھ جسم اور اس کے سایہ جیسا تعلق ہے۔ ہندو دھرم اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے فلسفیانہ علم کو سماجی امور کی شکل میں ڈھالنا بھارتی تہذیب کا ہمیشہ سے مقصد رہا ہے"

انھوں نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ "تہذیب کا تعلق نہ جسم سے ہے اور نہ دماغ سے۔ اس کا اصل تعلق آتما سے ہے۔ طاقت اور رقابلیت کا حصول کافی نہیں۔ اخلاق و روحانیت لازمی چیز ہے۔"

دنیا کی سیاست اور نظام حکومت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی ملک کی تہذیب کی خاص بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اس ملک کے مفکر انسانی زندگی کو کس شکل میں دیکھتے ہیں اور انسانی زندگی کا کیا مقصد متعین کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مذہبی جذبے کے فقدان کی وجہ سے دنیا کے ممالک ایک دوسرے کے لیے کید و مکر کی ٹیڑھی اور پرپیچ روش اپنا رہے ہیں۔ نظام حکومت اگر مذہبی جذبے قائم ہو تو ہمارے دور کی مخاصمت لعنتیں اور برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ ان کی نگاہ میں سیکولرزم ہمارے زمانے کی خاص کمزوری ہے۔

Secularism is the chief weekness of age.

لیکن بھارت نے جس طرح کا سیکولرزم اختیار کیا ہے اس کی وہ تائید کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۶ء کی اپنی ایک تقریر میں جو انھوں نے نئی دہلی میں کی تھی کہا کہ سیکولرزم دنیا میں دھرم اور فلسفہ کا سب سے بلند جزو ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بنیادی نظریے کے تحت مارکسزم، ڈارونزم، نظریہ فرائڈ وغیرہ پر تنقید کی ہیں وہ ہر ایسے تصور اور نظریے کے خلاف ہیں جس سے انسان کی روحانی اور اخلاقی حیثیت نفی ہوتی ہے۔

عورت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بہت واضح طور پر لکھا ہے: "ہم مرد اور عورت کو بالترتیب پرش اور پرکرتی کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں — انسانیت کے دو جنسوں میں منقسم ہونے میں تقسیم کار کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ان کے نزدیک شوہر اور بیوی پکے اور سچے ساتھی ہیں۔ وہ دونوں دھرم، ارتھ، کام اور موکش (مذہب، معاش، خواہش اور نجات) — ان چاروں پرشارتھوں (اعلیٰ مقاصد) کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔"

رادھا کرشنن نے ہندو دھرم کی کچھ خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہندو دھرم موجودہ زندگی کی اصلاح پر زور دیتا ہے۔ ورن دھرم اور آشرم دھرم کا تعلق اسی موجودہ زندگی سے ہے۔ اسی طرح پنر جنم کا نظریہ اچھے اخلاق کو تقویت پہنچاتا ہے کیونکہ اس کی رو سے اچھے اور برے اعمال کا نتیجہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ زندگی میں انفرادی آزادی کے ساتھ ساتھ قانون کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ہندوؤں کے کرم سدھانت (Theory of Karama) میں ان دونوں پہلوؤں کی بخوبی رعایت پائی جاتی ہے وہ اسے ایک مثال کے ذریعے سے واضح کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ زندگی تاش کے کھیل کی طرح ہے جس میں گویا تاش کے پتے بانٹ دیے گئے ہیں۔ یہ پتے ہم نے نہیں منتخب کیے ہیں۔ ہمارے پچھلے جنم کے اعمال کے نتیجے میں یہ ہمیں ملے ہیں۔ اب ان پتوں سے ہم جیسے چاہیں کھیلیں۔ البتہ ہم کھیل کے اصول و قواعد کے پابند ہیں اور جیسے جیسے کھیل بڑھتا جاتا ہے ہماری آزادی کم ہوتی جاتی ہے لیکن آخر وقت تک کھیلنے والے کے لیے پتوں کے استعمال میں آزادی باقی رہتی ہے۔

تبصرہ

جدید دور میں ہندو دھرم میں جو بیداری آئی اور اس کے مصلحین نے جو کارنامے انجام دیے اس کا ایک مختصر جائزہ آپ کے سامنے گزر چکا۔ ضرورت تھی کہ اس پر مفصل تبصرہ کیا جاتا لیکن اس سلسلے میں یہاں صرف چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

اس جائزے میں سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس کے مصلحین اور ہندو دھرم کی بیداری اور اس سلسلے میں تجدید و احیاء کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں ان کے پیچھے ایک خاص احساس یہ کارفرما رہا ہے کہ ہندو دھرم میں مختلف نظری و عملی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔ سامنے کے

بغیر وہ لوگوں کے لیے بالخصوص ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ برامھو سماج کو خاص اسی احساس نے وجود بخشا۔ ایک یہی احساس آریہ سماج کے قیام کے پیچھے کارفرما نظر آتا ہے ڈاکٹر رادھاکرشنن کا احساس آپ کے سامنے آچکا ہے انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ صدیوں کی طویل نیند کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے مذہبی باغیچے کے کتنے ہی درخت سوکھ چکے ہیں اور کتنے ہی درختوں کو روگ لگ چکا ہے اور انہیں صاف کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں جو تدبیریں اختیار کی گئیں اور جو کام کیے گئے ان کے ذریعے سے ان لوگوں کو جو ہندو دھرم سے مایوس اور غیر مطمئن تھے۔ ہندوازم سے وابستہ رکھنے کی نئی شکل نکالی گئی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس معنے میں یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی کہ ہندو قوم کے دل میں اپنے قدیم مذاہب و فلسفہ کی قدر و قیمت کا شعور و احساس پیدا ہوا اور وہ کسی دوسری جگہ سے ہدایت حاصل کرنے کی ضرورت سے اپنے کو بے نیاز سمجھنے لگی۔

ہندو مذہب کے بعض وہ مصلح جنھوں نے ہندوؤں کے غلط عقائد و رسوم سے کوئی خاص تعارض نہیں کیا انہیں بھی شہرت و عزت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو یہ باور کراتے تھے کہ وہ ایک ایسی باطنی نعمت سے بہرہ مند ہوئے ہیں جسے پاکر آدمی دنیا کی ساری ہی لذتوں کو بھول جاتا ہے اور سارے کرم کانڈ اور ظاہری چیزیں اس نعمت کے مقابلے میں بے وقعت معلوم ہوتی ہیں ان کے اس دعوے سے لوگ متاثر ہوئے اور ان کی عظمت اس درجہ دلوں میں قائم ہوئی کہ ان کی کمزوریوں سے صرف نظر کیا گیا اس کے علاوہ غلط خیالات و رسوم کی کوئی نہ کوئی تاویل بھی کی گئی اور خواہش نے ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت و حکمت بھی دریافت کرلی۔

یہاں جو مذہبی تحریکیں اٹھیں ان میں سے کچھ کے یہاں فکر و نظر کو اصل اہمیت دی گئی اور کچھ کے یہاں انوبھوتی (وجدانی یافت) اور بھگتی کے جذبے کو اصل اہمیت حاصل رہی۔ بعض نے روحانی تجربے اور انوبھوتی کے ساتھ عقل و نقل کو نباہنے کی پوری سعی کی۔ اس کی بہترین مثال ہمیں ڈاکٹر رادھاکرشنن کے یہاں ملتی ہے۔

پھر اس جائزے میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کوئی مصلح یا دھرم گرو دائمی صداقتوں اور انسانی و اخلاقی اقدار کی نفی نہیں کرسکا۔ توحید، انسانی مساوات، اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کو سبھی نے بنیادی اہمیت دی، ترکِ دنیا اور ویراگ کے غلط نظریے کو تقریباً سبھی نے غیر فطری اور مذہب کے منشا کے خلاف سمجھا؛

یا پھر اس کی نئی تشریح کی گئی۔ ہندو مذہب کی نئی تشریح کی ضرورت کا اظہار ڈاکٹر رادھا کرشنن نے صاف الفاظ میں کیا ہے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ہندو مصلحین کو جو چیزیں قابل اصلاح نظر آئیں وہ اسلام میں پہلے سے ممنوع ہیں اور مثبت طور پر جو چیزیں انھوں نے اختیار کیں اور جن پر انھوں نے اپنا زور صرف کیا وہ وہی چیزیں ہیں جو اسلام کی خصوصیات میں شامل و داخل ہیں۔ اگر اسلام کو پورے طور پر معیار قرار دے کر مذاہب کا جائزہ لیا جاتا تو بآسانی حق و باطل میں امتیاز پیدا ہو سکتا تھا اور اس صورت میں کسی طرف سے بھی باطل کے گھسنے کی گنجائش باقی نہ رہتی

لیکن بدقسمتی سے یہ طریقہ نہیں اپنایا جا سکا جس کی وجہ سے خرابیوں کا استیصال ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مصلحین وحدتِ ادیان کی تائید و تصدیق کرتے نظر آتے ہیں جسے نفسیاتی مرعوبیت یا مذہب کی حقیقت سے بے خبری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے انکار نہیں کہ ہر مذہب میں کچھ اچھی باتیں پائی جا سکتی ہیں اور پائی بھی جاتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ تمام مذاہب یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور یکساں درجے میں نجات و فلاح کا ذریعہ ہیں۔ اس بات کو کوئی بھی صاحبِ عقل اور منصف شخص تسلیم نہیں کر سکتا۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا کے مذاہب میں بنیادی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں پھر سب کے سب یکساں درجے کے کیونکر قرار پا سکتے ہیں۔ مذاہب بچوں کے کھلونے نہیں ہیں کہ تمام بچوں کو خوش دیکھنے کے لیے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ سبھی بچوں کے کھلونے اچھے ہیں، کسی کھلونے کو ناقص یا کم قیمتی نہ کہے۔ خوبی کی بات یہ تھی کہ وحدت ادیان کے بجائے وحدت دین کے اعلیٰ تصور تک ان کی رسائی ہو سکتی اور خاص دینِ حق کی یافت کے لیے کوشاں ہوتے جس کی پیروی سارے انسانوں پر لازم ہے۔ جب سارے انسان حقیقت کے لحاظ سے ایک ہیں تو ان کے لیے مختلف مذاہب تجویز کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

ہندو مصلحین کی کوششوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو دھرم کی نہ نظریاتی الجھنیں رفع ہو سکیں اور نہ عملی دشواریاں دور کی جا سکیں۔ ہندو دھرم کے پیروؤں میں فکری اتحاد پیدا ہو سکا اور نہ ان کے اعمال یا عادات میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کی جا سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ دینِ حق سے صرفِ نظر کر کے نہ صحیح معنوں میں کوئی مذہبی کردار وجود میں آ سکتا ہے

اور نہ اس طرزِ عمل کو اختیار کر کے کوئی اپنے اور اپنی قوم کے دین و مذہب کے مسئلہ کو حل کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کو لیجیے۔ وہ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ کھانا اور پانی کے بغیر تو وہ زندہ رہ سکتے ہیں لیکن خدا کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں آخر وقت تک خدا کی آواز ان کے لیے نامانوس ہی رہی اور وہ وحدت ادیان کا راگ ہی الاپتے رہے۔ عارضی مصلحت سے کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے کہ حق کی حمایت کی جائے کسی باطل چیز کی حمایت کر کے زندگی میں مذہب کا مسئلہ ہم کبھی بھی حل نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ غلط طور پر اپنی جگہ ہم یہ خیال کر لیں کہ اس مسئلے کو ہم نے حل کر لیا ہے غلطی بہر حال غلطی ہے اس کے اثرات ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔

یہ عبرت ناک داستانیں ایسی ہیں کہ ان سے سبق حاصل کیا جائے۔ اگر اس کے بعد بھی دین حق کے داعیوں کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس نہیں ہوتا تو پھر وہ کون سا وقت ہوگا جب وہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں گے۔

طلاقن کا نان ونفقہ

(مسٹر دانیال لطیفی کے ایک مضمون کا جائزہ)

ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۴۸۸ میں ایک ترمیم لوک سبھا میں زیر غور ہے۔ اس ترمیم کی حمایت میں مسٹر دانیال لطیفی سینیر ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا کا ایک مضمون "مطلقہ کا نان ونفقہ" کے عنوان سے ریڈینس دہلی کے عید الفطر نمبر میں شائع ہوا ہے۔ دفعہ ۴۸۸ میں جو ترمیم زیر غور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ طلاق دینے والے شوہر کو اپنی مطلقہ بیوی کے نان ونفقہ یا اس کے اخراجات زندگی کا اس وقت تک انتظام کرنا ہوگا جب تک وہ دوسری شادی نہ کرلے۔ ہر مجسٹریٹ کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ ۵۰۰ روپے ماہانہ کی حد تک کسی مطلقہ کے حق میں فیصلہ دے سکے گا۔ یہ ترمیم شدہ ضابطہ تمام باشندگانِ ملک پر نافذ ہوگا جس سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہ ہوں گے۔ چونکہ یہ ترمیم اسلام کے نظام طلاق میں تبدیلی اور کھلم کھلا مداخلت فی الدین ہے اس لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلمانوں کی دوسری جماعتوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ مسٹر دانیال نے اپنے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ترمیم تو حکم قرآن کے عین مطابق ہے۔ اس کی مخالفت محض اس لیے کی جا رہی ہے کہ مخالفت کرنے والوں نے مناسب طور پر قرآن کے حکم پر غور ہی نہیں کیا ہے۔ ہم اس مختصر جائزے میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مخالفت کرنے والوں نے غور نہیں کیا ہے یا حمایت کرنے والے ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے آج تک قرآن کے کسی مفسر، مذاہب فقہ کے کسی فقیہ اور اسلامی قوانین کے کسی ماہر مسلمان عالم نے نہیں کہی ہے۔

مسٹر دانیال نے قرآن سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"اسلام نے مطلقہ کو سب سے پہلا حق یہ دیا ہے کہ عدت کے زمانے میں جس کی مدت [illegible]

سے تین ماہ ہوتی ہے اسے معتدہ (وہ عورت جو عدت میں ہو) کی مخصوص حیثیت حاصل ہوتی ہے کسی معتدہ کو گھر سے باہر نہیں نکالا جا سکتا، الا یہ کہ وہ کسی بداخلاقی کی مرتکب ہو۔ (قرآن، سورہ ۶۵ آیت ۱) اس کی ضروریات اسی طرح پوری کی جائیں گی اور اس کے ساتھ اسی طرح برتاؤ کیا جائے گا جیسا طلاق سے پہلے کیا جاتا تھا (قرآن، سورہ ۶۵ آیت ۶) اس کے ساتھ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کیا جائے گا (قرآن، سورہ ۶۵ آیت ۲) جب عدت کی مدت ختم ہو جائے تو عورت کو امید ہیم کی حالت میں چھوڑنا چاہیے۔ جیسے ہی عدت کی مدت ختم ہو قرآن شوہر کو حکم دیتا ہے کہ منصفانہ اور باعزت طور پر اس کو پھر بیوی بنا لے یا منصفانہ اور باعزت طور پر اس کو رخصت کر دے (قرآن سورہ ۲ آیت ۲۳۱) منصفانہ طور پر رخصت کرنے سے مراد کیا ہے؟ قرآن نے اس کو آگے آیت ۲۴۱ میں واضح کیا ہے۔

قرآن کی سورہ ۲ کی آیت ۲۴۱ مطلقہ عورت کا دوسرا اہم حق ہے جو زمانہ عدت تک محدود نہیں ہے۔ اس آیت کا ترجمہ علامہ یوسف علی نے یہ کیا ہے۔ "مطلقہ عورت کے لیے ایک معقول سکیل کے مطابق نان و نفقہ مہیا کرنا چاہیے۔ یہ متقی لوگوں کی ڈیوٹی ہے۔" مولانا محمد احمد رضا خاں بریلوی نے اردو میں اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ "اور طلاق والیوں کے لیے بھی مناسب طور پر نان و نفقہ ہے۔ یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر" اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی فقرہ "متاع بالمعروف" آیت ۲۴۱ سورہ ۲ میں ایک ایسے اہتمام و انتظام پر دلالت کرتا ہے جو عدل و انصاف اور اچھے اخلاق کے مطابق ہو اور ساتھ ہی شریفانہ بھی ہو۔

بدقسمتی سے برطانوی عدالتوں نے قرآن کی اس واضح اور صاف ہدایت کو نافذ نہیں کیا

(ریڈینس عید الفطر نمبر ۸۵ء)

مسٹر دانیال لطیفی نے آیت ۲۳۱ اور آیت ۲۴۱ سے جو استدلال کیا ہے اس کی غلطیاں واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آیت ۲۳۱ کے الفاظ اور ان کا صحیح ترجمہ یہاں نقل کیا جائے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (البقرۃ، آیۃ ۲۳۱)

ترجمہ:۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

اور جب عورتوں کو (رجعی) طلاق دی ہو پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں مگر عدت ختم نہ ہوئی ہو تو (یا تو) تم قاعدہ کے موافق (رجعت کرکے) نکاح میں رہنے دو یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو اس ارادے سے کہ ان پر ظلم کیا کروگے اور جو شخص ایسا (برتاؤ) کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

ترجمہ:۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ

اور جب ایسا ہو کہ تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی (عدت کی) مدت پوری ہونے کو آئے تو پھر (تمہارے لیے دو ہی راستے ہیں) یا تو (طلاق سے رجوع کرکے) انہیں ٹھیک طریقہ پر روک لو یا (آخری طلاق دے کر) ٹھیک طریقے پر جانے دو۔ ایسا نہ کرو کہ انہیں نقصان پہنچانے کے لیے روکے رکھو تاکہ ان پر جور و ستم کرو (یعنی نہ تو رجوع کرو نہ جانے دو، بیچ میں لٹکائے رکھو تاکہ تمہارا جور و ستم سہتی رہیں اور بے بسی کی وجہ سے کچھ نہ کرسکیں) اور یاد رکھو جو کوئی ایسا کرے گا تو (اگرچہ وہ اپنے نزدیک ایک دوسری جان پر ظلم کر رہا ہو لیکن فی الحقیقت) اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کرے گا (کیونکہ ازدواجی زندگی کی سعادت سے محروم ہو جائے گا۔ اور اللہ کے حضور گنہگار ہوگا۔

(ترجمان القرآن جلد ۱)

مسٹر دانیال نے سب سے پہلی غلطی آیت کا مفہوم بیان کرنے میں کی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ جب عدت کا زمانہ ختم ہو جائے تب اپنی بیوی کو روک لو یا اس کو رخصت کر دو کیونکہ عدت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد امساک بمعروف یعنی قاعدے کے مطابق روک لینے کا حق باقی نہیں رہتا اور تجدید نکاح کے بعد دوبارہ بیوی بنانے کے لیے امساک بمعروف کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی۔ آیت ۲۳۱ طلاق رجعی کے اس حکم کی تکمیل اور اس کا تتمہ ہے جو آیت ۲۲۹ کے فقرہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ میں دیا گیا ہے۔ آیت ۲۳۱ کا غلط مفہوم سمجھنے کی وجہ سے انھوں نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس کو آیت ۲۳۰ کے ساتھ جوڑ دیا ہے

حالانکہ آیت ۲۴۱، آیت ۲۳۱ کی توضیح ہرگز نہیں ہے۔ آیت ۲۴۱ کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ط اور مطلقہ عورتوں کے لیے متاع ہو

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ دستور کے موافق یہ حق ہے پرہیزگاروں پر

مسٹر دانیال نے اس آیت کے دو ترجمے نقل کیے ہیں۔ ایک علامہ یوسف علی کا انگریزی زبان میں اور دوسرا مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کا اردو زبان میں۔

جناب یوسف علی نے لفظ "متاع" کے ترجمہ میں انگریزی کا لفظ (MAINTENANCE) استعمال کیا ہے اور مولانا احمد رضا نے اس لفظ کا ترجمہ "نان اور نفقہ" سے کیا ہے۔ مسٹر دانیال یہ دونوں ترجمے پڑھ کر خوش ہو گئے ہوں گے کہ یہ ان کے مطلب کے موافق ہیں حالانکہ یہ بھی ان کی غلط فہمی ہے۔ یہ ترجمے ان کے موافق نہیں بلکہ بالکل مخالف ہیں۔ ہم آگے اس کی توضیح کر رہے ہیں۔

آیت ۲۴۱ میں "متاع بالمعروف" کے بارے میں عہد قدیم سے آج تک مفسرین قرآن کے تین قول منقول ہیں:۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زمانہ عدت کا نان و نفقہ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد متعۃ الطلاق ہے یعنی مطلقہ عورت کو شوہر جب اپنے گھر سے رخصت کرے تو بطور تحفہ کچھ دے کر رخصت کرے تاکہ مطلقہ کے ساتھ اچھا برتاؤ ہوا ور رخصتی خوش گوار فضا میں انجام پائے —— ان دو اقوال کے لحاظ سے آیت میں مطلقات (جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو) سے مراد وہ عورتیں بھی ہیں جن کو طلاق بائن مغلظہ دی گئی ہو۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت ۲۴۱ میں وہی حکم بطور تاکید دہرایا گیا ہے جو آیت ۲۳۶ میں دیا گیا تھا اور "متاع" سے مراد متعۃ الطلاق ہے (یعنی مطلقہ عورت کو رخصت کرتے وقت جوڑا یا اسی طرح کا کوئی اور تحفہ دینا)

تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:۔

> اس آیت میں "متاع بالمعروف" کا جو فقرہ ہے اس کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مدتِ عدت کا نفقہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد متعہ ہے اور وہ تین کپڑے ہیں۔ (قمیص، چادر، سربند) جیسا کہ اس مطلقہ عورت کے لیے حکم دیا گیا ہے جس کو مہر مقرر کرنے اور مباشرت کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دی گئی ہو۔

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے :۔

"متاع سے مراد مطلق متعہ ہے جو واجب متعہ اور مستحب متعہ دونوں کو شامل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عدت کا نفقہ ہے ۔"

فقہ حنفی کے جلیل القدر امام ابوالبرکات نسفی نے اپنی مشہور کتاب مدارک التنزیل میں پہلے قول کو اختیار کیا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"وَلِلۡمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ" ای نفقۃ العدۃ یعنی اس آیت میں متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے ۔ اردو میں جن مستند علماء نے قرآن کریم کے ترجمے کیے ہیں ان میں متعدد مترجمین نے اسی قول کے لحاظ سے اس آیت میں "متاع" کا ترجمہ "نان ونفقہ" کیا ہے ۔ چنانچہ مولانا فتح محمد جالندھری نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے :۔

"اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان ونفقہ دینا چاہیے پرہیز گاروں پر (یہ بھی) حق ہے ۔"

مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا فتح محمد جالندھری حنفی تھے اور ان کے بارے میں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ مطلقہ کے لیے عدت کے بعد کسی نان ونفقہ کے قائل نہ تھے ۔ اس پہلے قول اور ان ترجموں کے لحاظ سے تو اس آیت میں مدت عدت کے خرچ کے علاوہ مطلقہ عورتوں کے لیے کسی دوسرے خرچ کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے ۔ اس لیے "نان ونفقہ" کا ترجمہ مسٹر دانیال کے ترجمے کے موافق نہیں بلکہ مخالف ہے ۔ بعض مترجمین نے "متاع" کا ترجمہ "نفع پہنچانا" کیا ہے ۔ اور انہوں نے آیت کی تفسیر میں واضح کر دیا ہے کہ اس سے مراد زمانۂ عدت کا نان ونفقہ ہے ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس آیت میں "متاع بالمعروف" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے، یہ نہ ہو کہ اسے ننگا بوچا کے بھوکا پیاسا اسی وقت گھر سے نکال دیا جائے، بلکہ ایک مدت تک اس کی آسائش، خیال اور اس کی ضرورتوں کی کفالت شوہر کے ذمے ہے ۔ فقہاء نے حدیث و سنت کی روشنی میں ایک سہ ماہی کی مدت مقرر کی ہے کہ اتنی مدت تک کھانے پہننے اور رہنے سہنے کا انتظام شوہر پر واجب ہے ۔ مطلقہ پر اگر تینوں طلاقیں ابھی نہیں پڑی ہیں جب تو یہ حکم متفق علیہ ہے اور

پڑ چکی ہیں تو حنفیہ کے یہاں جب بھی یہی حکم ہے

دوسرے قول کو جن علما ر نے اختیار کیا ہے ان میں سے بعض نے "متاع" کا ترجمہ خرچ دینے کیا ہے۔ مثلاً شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ یہ ہے :۔

"اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے۔ قاعدے کے موافق"

انھوں نے اپنے حاشیہ موضح القرآن میں واضح کر دیا ہے کہ اس خرچ سے مراد متعۃ الطلاق ہو یعنی کم سے کم ایک جوڑا کپڑا۔ قمیص، چادر اور دوپٹہ۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں

پہلے خرچ فرمایا تھا یعنی جوڑا اس طلاق پر کہ مہر نہ ٹھہرا ہوا اور ہاتھ نہ لگایا ہو۔ یہاں سب پر حکم فرمایا سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا بہتر ہے اور اس پہلی کو ضرور ہے۔

(موضح القرآن)

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے آیت ۲۳۶ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح اس خاص مطلقہ کو جوڑا دینے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح اس آیت ۲۴۱ میں تمام مطلقہ عورتوں کو جوڑا دینے کی بات کہی گئی ہے فرق یہ ہے کہ آیت ۲۳۶ میں جس مطلقہ کا ذکر ہے اس کو جوڑا دینا ضروری ہے اور دوسری مطلقہ عورتوں کو جن کا ذکر آیت ۲۴۱ میں ہو جوڑا دینا بہتر ہو۔ آیت ۲۳۶ کا ترجمہ یہ ہے :

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لیے کچھ مہر اور ان کو خرچ دو، مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق جو خرچ کہ قاعدے کے موافق ہے، لازم ہے نیکی کرنے والوں پر"

البقرہ آیت ۲۳۶

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے آیت ۲۴۱ کا جو ترجمہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی "متاع" سے مراد متعۃ الطلاق ہے۔

"اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے"

(تفہیم القرآن جلد ا)

آیت ۲۴۱ میں متاع بالمعروف کی تفسیر میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ وہی حکم ہے جو آیت ۳۶ میں دیا گیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس آیت میں بھی صرف اس مطلقہ عورت کو کچھ دے کر رخصت

کرنے کا حکم ہے جن کو ہاتھ لگانے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دی گئی ہو۔ تمام مطلقہ عورتوں کے بارے میں یہاں کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔ تفسیر مظہری اور تفسیر روح المعانی کی عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور علامہ آلوسی نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ نے "متاع بالمعروف" کی تفسیر میں دوسرے قول کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"اور اس دوسری تفسیر کی بنا پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک "وَلِلْمُطَلَّقَاتِ" میں لام عہد خارجی کا ہوگا اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابن جریر نے ابن زید سے کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب آیت وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ نازل ہوئی تو ایک شخص نے کہا کہ اگر میں احسان کروں گا تو ایسی مطلقہ کو رخصت کرتے وقت کچھ دوں گا اور اگر میرا ارادہ احسان کرنے کا نہ ہوگا تو ایسی مطلقہ کو رخصت کرتے وقت کچھ نہ دوں گا تو اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ لہٰذا متعۃ الطلاق صرف انہیں مطلقہ عورتوں کے لیے ثابت ہے جن کو ہاتھ لگانے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دی گئی ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب اس آیت کی تفسیر یہ ہے تو پھر امام ابوحنیفہ کے اس قول کی دلیل کیا ہے کہ متعۃ الطلاق ان مطلقہ عورتوں کے لیے بھی مستحب ہے جن کو ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی گئی ہو خواہ ان کا مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ ان مطلقہ عورتوں کے لیے متعہ کا استحباب اس آیت سے ثابت نہیں ہے بلکہ سورۂ احزاب کی اس آیت سے ثابت ہے کہ فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۔ واللہ اعلم (تفسیر مظہری جلد ا ص۳۱۲)

علامہ آلوسی نے بھی ابن جریر کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے وہی بات لکھی ہے جو قاضی ثناء اللہ صاحب نے لکھی ہے یعنی یہ کہ آیت ۲۴۱ میں وہی حکم دہرایا گیا ہے جو آیت ۲۳۶ میں دیا گیا ہے۔ اسی قول کی تائید مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن جلد ا میں کی ہے۔ انھوں نے آیت ۲۴۱ کا ترجمہ یہ کیا ہے:۔

"اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے۔ یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔"

وہ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں :-

اوپر آیت ۲۳۶ میں مطلقہ عورتوں کو دے دلا کر رخصت کرنے کی جو ہدایت فرمائی تھی آخر میں یہاں اس کی یاد دہانی کر دی اور اس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا " (تدبر قرآن جلد اول)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسٹر دانیال لطیفی نے آیت ۲۴۱ کی جو تشریح کی ہے اور اس سے جو حکم نکالا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ کیا وہ باور کرتے ہیں کہ پونے چودہ سو سال تک تمام علماء، مفسرین اور فقہاء اس آیت کا غلط مطلب سمجھتے رہے اور اب قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ پڑھ کر انھوں نے اس کا صحیح مطلب سمجھ لیا ہے۔ کیا خدا سے ڈرنے کی یہی علامت ہے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آیت ۲۴۱ کا جو مفہوم انھوں نے بیان کیا ہے وہ اتنا اضح ہے کہ اس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ ادّعا بالکل ایسا ہے جیسے میں ملک میں رائج قانون کی کسی کتاب کا اردو ترجمہ پڑھ کر اس کی کسی دفعہ کی ایسی تشریح کروں جو تمام وکیلوں، بیرسٹروں اور سپریم کورٹ کے ججوں کی تشریحات کے خلاف ہو اور دعویٰ یہ کروں کہ میری تشریحات اتنی اضح ہیں کہ اس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میرے اس دعوے پر جس طرح مسٹر دانیال ہنس دیں گے اسی طرح ان کے دعوے پر اسلامی قانون کے ماہرین ہنس دیں گے۔

ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں جو ترمیم زیر غور ہے وہ بلا شبہہ مسلمانوں کے دین میں مداخلت اور مسلم پرسنل لا میں بالواسطہ تبدیلی کی ایک کوشش ہے۔ مسلمانوں نے بجا طور پر اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

یہ بھی دیکھتے چلیے کہ مسٹر دانیال نے آیت ۲۴۱ کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ خود اس پر قائم نہیں رہتے ہیں پہلے تو انھوں نے یہ کہا کہ آیت ۲۴۱ میں مطلقہ عورتوں کے لیے نان و نفقہ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ زمانۂ عدت میں محدود نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نان و نفقہ کو مطلقہ عورت کے نکاح ثانی تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔ یہاں انھوں نے مطلقہ عورتوں اور اس حکم میں کوئی قید نہیں لگائی ہے لیکن آگے چل کر انھوں نے یہ کہا ہے کہ اگر کسی عورت کا مہر کافی اور معقول مقرر کیا گیا ہو اور شوہر طلاق دینے کے بعد مہر ادا کرے تو آیت میں متاع بالمعروف کا منشا پورا ہو جائے گا۔ البتہ جہاں عورت کا مہر کم مقرر کیا گیا ہو یا معاف کرا لیا گیا ہو یا پہلے ہی ادا کیا جا چکا ہو تو طلاق کے بعد نان و نفقہ کے حکم کو نافذ کرنا چاہیے

گویا آیت قرآنی نے یہ ہدایت کی ہے کہ اگر مطلقہ کا مہر بہت ہوا ور شوہر نے طلاق دینے کے بعد ادا کیا ہو تو عدت کے بعد نان ونفقہ دینے کی ضرورت نہیں ہے وہ مہر تنہا اس عورت کے لیے کافی ہے اور اگر مہر کم ہو یا پہلے ادا کیا جا چکا ہو تو عدت کے بعد بھی شوہر پر مطلقہ عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری ڈالنی چاہیے۔

مسٹر دانیال سے یہ سوال کرنا بے کار ہے کہ آیت میں یہ سب باتیں کہاں ہیں اور شوہر کو کس جرم کی یہ سزا دی جائے گی کہ ایک ایسی عورت کا نان ونفقہ اس پر لازم کیا جائے جس سے رشتۂ ازدواج منقطع ہو چکا ہو۔ پھر یہ کہ اسلامی شریعت نے شوہر پر عورت کا مہر اور اس کا نان ونفقہ کس چیز کے عوض میں لازم قرار دیا ہے؟

ہم یہ باتیں مسٹر دانیال سے نہیں پوچھیں گے لیکن یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ نے عدت کے بعد نان ونفقہ کی جو تفصیل پیش کی ہے، کیا لوک سبھا میں زیر تجویز ترمیم میں یہ تفصیل موجود ہے اور کیا راجیہ سبھا میں اسی تفصیل سے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۴۸۸ میں ترمیم منظور ہوئی ہے؟ آپ نے اپنے اسی مضمون میں ترمیم کا جو ذکر کیا ہے اس میں یہ تفصیل موجود نہیں ہے۔ پھر کس بنا پر آپ زیر تجویز ترمیم کی مطلق حمایت کر رہے ہیں اور خدا کا خوف رکھنے والوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ وہ اس کی مخالفت نہ کریں۔

مسٹر دانیال نے اپنے مضمون میں ایک اور عجیب وغریب انکشاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> مسئلہ زیر بحث سے متعلق یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ خود مہر اگرچہ پیغمبرؐ کے زمانے میں قانوناً تسلیم شدہ تھا لیکن قرآن میں واضح طور پر اس کا ذکر کہیں بھی نہیں کیا گیا ہے۔ ریڈینس ۱۲ عید الفطر نمبر ۷۳ء ص ۲۶

شاید مسٹر دانیال نے قرآن کے کسی انڈکس میں لفظ "مہر" تلاش کیا ہوگا اور جب وہ نہیں ملا تو انھوں نے اپنی اس "تحقیق" کو دوسروں کے سامنے ایک انکشاف کے طور پر پیش کرنا ضروری سمجھا۔ مسٹر دانیال کا مضمون پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کا ایک مسلمان سینیر ایڈوکیٹ قرآن سے اس قدر ناواقف ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر مہر کا وضاحت اور خصوصیت کے ساتھ ذکر موجود ہے لیکن "مہر" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے لیے دوسرے

الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۱ سے ۲۴۱ تک ہی کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو مہر کا ذکر بڑی وضاحت اور خصوصیت کے ساتھ مل جاتا۔ آیت ۲۳۶ اور ۲۳۷ میں مہر کے لیے فریضہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آیت ۲۳۶ کا ترجمہ ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ آیت ۲۳۷ کا ترجمہ یہ ہے:-

> اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم ان کے لیے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا جو تم مقرر کر چکے تھے مگر یہ کہ درگذر کریں عورتیں یا درگذر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی اور تم مرد درگذر کرو تو قریب ہے پرہیز گاری سے اور نہ بھلا دو احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔
>
> (ترجمہ شاہ عبدالقادر و شیخ الہند)

اس آیت میں کتنی وضاحت خصوصیت اور تفصیل سے مہر کا ذکر ہے۔ قرآن نے دوسری جگہ 'صدقات' کی اصطلاح مہر کے لیے استعمال کی ہے:-

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ	اور دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے
نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ	خوشی سے پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں
مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــٴًـا مَّرِیْٓــٴًـا	تم کو اپنی خوشی سے، تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا
(قرآن مجید سورہ ۴ آیت ۴)	ترجمہ شاہ عبدالقادر

یہ پوری آیت صرف مہر کے بارے میں ہے اس میں کسی دوسری چیز کا ذکر نہیں ہے اور مسٹر دانیال لکھ رہے ہیں کہ قرآن میں مخصوص اور واضح طور پر مہر کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ قرآن کا علم حاصل کرنے کے لیے اپنا تھوڑا سا وقت فارغ کر سکیں اور قرآن کے صرف انگریزی ترجمہ پر اکتفا نہ کریں۔

اب میں وہ آیت پیش کرتا ہوں جس سے مہر کی فرضیت بھی ثابت ہوتی ہے اور اس کی دوسری تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ جو عورتیں حرام قرار دی گئی ہیں ان کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:-

> اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعے سے (نکاح میں لانا) چاہو اس طرح سے کہ تم ان کو بیوی بناؤ، صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو پھر جس طریق سے تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو سو ان کو ان کے مہر دو

جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں اور مقرر ہوئے بعد بھی جس (مقدار) پر تم (میاں بی بی) باہم رضامند ہو جاؤ اس سے تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں۔

(قرآن سورہ ۴ آیت ۲۴ ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس آیت میں مہر کے بارے میں کئی احکام ہیں۔ منجملہ ان میں کا ایک یہ ہے کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے مہر ضروری ہے (خواہ نکاح کے وقت اس کا ذکر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو) دوسرا حکم یہ کہ اگر شوہر اپنی بیوی سے متمتع ہو چکا ہو تو مقرر شدہ پورا مہر ادا کرنا فرض ہے اور تیسری بات یہ کہ مہر عورت سے فائدہ اٹھانے کا معاوضہ ہے۔

اس آیت میں مہر کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک ابتغاء بالمال یعنی مال کے بدلے میں کسی عورت کو بیوی بنانا اور دوسرا لفظ "اجور" یہ اجر کی جمع ہے اور اس آیت میں مہر کے معنے میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب تک جو آیتیں پیش کی گئی ان میں مہر کے لیے چار الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ فریضۃ۔ صدقات، ابتغاء بالمال۔ اجور۔

مسٹر دانیال خوب جانتے ہیں کہ قانون کی کسی کتاب کا صرف ترجمہ پڑھ لینا اس کو سمجھنے اور جاننے کے لیے کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، اس کے استاذوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس کی شرحیں پڑھنی پڑتی ہیں اور اس قانون کے مطابق حاکموں کے فیصلوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے آخر وہ اور ان جیسے لوگ صرف قرآن ہی کو ایسی کتاب کیوں سمجھتے ہیں جس کا صرف ترجمہ پڑھ لینا اس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کافی ہے بلکہ ترجمہ پڑھ کر اس سے احکام مستنبط کرنے کا حق بھی مل جاتا ہے۔ یہ قرآن پر بہت بڑا ظلم ہے جو ایسے لوگ شعور کے ساتھ یا لاشعوری کی حالت میں کر رہے ہیں۔

ان لوگوں کی اصل مجبوری یہ ہے کہ ان کے ذہن کا سانچہ رومن لا اور مغرب میں رائج قوانین نے اپنے ڈھب پر ڈھال دیا ہے۔ جب تک اس میں تبدیلی نہ ہو، اسلامی قوانین ان کے ذہنی سانچے میں فٹ نہیں ہو سکتے۔ چند غلط فہمیاں جو اجنبی تہذیبوں نے پیدا کی ہیں سب سے پہلے انہیں دور ہونا چاہیے۔

ایک غلط فہمی یہ ہے کہ یہ لوگ طلاق کو ہر حال میں ایک جرم اور ایک ظلم ہی سمجھتے ہیں اور یہ غلط فہمی

ان مذاہب کے اثر سے پیدا ہوئی ہے جن میں نکاح کو ایک ناقابل انقطاع رشتہ تصور کر لیا گیا ہے۔
اب ان مذاہب کے ماننے والوں نے اس میں ڈھیل ضرور پیدا کی ہے لیکن جدید قوانین میں اس تصور کے اثرات اب بھی موجود ہیں۔ اسلامی شریعت کے ماہرین کی اکثریت کے نزدیک طلاق یقیناً ایک بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہے لیکن ہر حال میں یہ جرم اور ظلم نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں عین انصاف ہے۔

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ وہ شوہر ہی کو کسی عورت کا آخری سہارا جانتے ہیں اس لیے سمجھتے ہیں کہ جب کوئی عورت کسی کی بیوی بن گئی تو اب اس پر تا زندگی اس عورت کی کفالت واجب ہو گئی یا طلاق کی صورت میں اس وقت تک واجب ہو گئی جب تک وہ کسی دوسرے شوہر کے گھر نہ پہنچ جائے یہ تصور بھی مغربی تہذیب نے پیدا کیا ہے جس میں بیوی کے حقوق تو بہت ہیں لیکن بیٹی اور بہن کے کچھ بھی نہیں ہیں۔

اسلام نے ان میں سے ہر ایک کے حقوق پوری وضاحت سے متعین کیے ہیں۔ اس نے بے سہارا ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے مطلقہ عورت کے خاندان پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ خرابیوں کے باوجود آج بھی مسلمان معاشرے میں باپ اپنی بیٹی کو، بھائی اپنی بہن کو طلاق کے بعد پناہ دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ مسز وانیال لطیفی کو معلوم ہو یا نہ ہو مجھے ایسے واقعات معلوم ہیں کہ باپ نے اپنی بیٹی کو شوہر کے گھر تکلیف میں دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے شوہر سے طلاق دلوائی ہے اور اپنی بیٹی کی نہ صرف یہ کہ کفالت کی ہے بلکہ اس کی دوسری شادی کے انتظامات بھی کیے ہیں اور یہ نادر واقعہ نہیں ہے بلکہ ایسے واقعات مسلسل ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں ایسے واقعات بھی ہیں اور ہو سکتے ہیں کہ کسی باپ نے اپنی مطلقہ بیٹی یا کسی بھائی نے اپنی مطلقہ بہن کی کفالت سے انکار کیا ہو لیکن عام طور پر اس کے تین اسباب سامنے آئے ہیں۔

۱۔ اسلامی قوانین سے ناواقف ہونا یا ان پر عمل نہ کرنا۔

۲۔ مطلقہ بیٹی یا بہن کی بدمزاجی اور شوہر سے نباہ نہ کر سکنے کی وجہ سے اس سے ناراض ہونا

۳۔ خود فقر و افلاس میں مبتلا ہونا۔

لیکن اس کا علاج اسلامی نظام طلاق میں تبدیلی کرنا ہرگز نہیں ہے اس لیے کہ وہ اتنا منصفانہ اور متوازن ہے کہ دنیا میں کوئی بھی دوسرا نظام طلاق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مسٹر دانیال لطیفی کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا سے ڈرنے والے وہ لوگ نہیں ہو سکتے جو خدا کے دیے ہوئے قانون کو نامنصفانہ سمجھ کر اس میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہوں یا آیات قرآنی کی ایسی تفسیر و تشریح کرتے ہوں جو اسلام کے عائلی نظام کو منتشر کرنے والی ہو اور جس کا کوئی ثبوت عہد رسالت سے آج تک کی مستند تفاسیر میں موجود نہ ہو۔ آج تک کسی فقیہ کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ وہ شوہر پر عدت ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کی مطلقہ بیوی کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ڈالے، کیونکہ یہ بات نہ قرآن کی کسی آیت سے مستنبط ہوتی ہے اور نہ کسی حدیث سے۔

نوٹ:۔ یہ مضمون دسمبر ۷۲ء میں لکھا گیا تھا اور طلاق نمبر کے لیے اس کی کتابت ہو چکی تھی لیکن گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے طلاق نمبر میں شائع نہیں کیا گیا تھا۔

یحییٰ علیہ السلام

مولانا محمد سلیمان قاسمی، فرخ آبادی

یحییٰ علیہ السلام، زکریا علیہ السلام کے وارث اور فرزند تھے جو ان کی پیغمبرانہ التجا کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ زکریا علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ	اے میرے پروردگار مجھ کو اپنے پاس
ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً	سے پاکیزہ اولاد عطا فرما!

اور جس اعلیٰ مقصد سے اولاد طلب کی تھی وہ یہ تھا:۔

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا	تو عطا فرما مجھے اپنے پاس سے ایک ولی
يَّرِثُنِیْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ	وارث (ولی) جو میرا اور آل یعقوب کا وارث
وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ○	ہو اور اے میرے پروردگار اسے (اپنا اور
	اپنے بندوں کا) پسندیدہ بنا دے۔

زکریا علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور اس قبولیت کی خوش خبری انہیں اس وقت ملی جبکہ وہ نماز میں کھڑے اپنے رب کی بندگی میں مصروف تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى	اللہ تجھے خوش خبری سناتا ہے یحییٰ کی جو
مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ	اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا
سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ	سید حصور اور نبی ہوگا صالحین میں سے
يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ	اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری
نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ	دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا اس سے پہلے

لَمْ نَجْعَلْ لَّهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا — ہم نے اس کا سمی نہیں بنایا

زکریا علیہ السلام نے اپنی دعا میں ذریت طیبہ (پاکیزہ اولاد) اور ولی (وارث) کی التجا کی تھی اور عرض کیا تھا کہ اے اللہ اسے رضیا (محبوب اور پسندیدہ) بنا دے اور اللہ تعالیٰ نے جب دعا کو شرف قبولیت بخشا اور اس کا مژدہ سنایا تو یحییٰ علیہ السلام کو مصدق، سیدا و حصورا قرار دیا اور فرمایا:۔

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا	اور ہم نے اس کو بچپن میں حکم عطا کیا
مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيًّا	اور اپنے پاس سے حنان اور تزکیہ عطا کیا
وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن	اور وہ متقی تھا اور اپنے والدین کا فرمانبردار
جَبَّارًا عَصِيًّا	تھا جبار اور عصی نہیں تھا۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کے والدین کے ساتھ ان کی کچھ اور خوبیوں کی طرف رہنمائی فرمائی

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ	یہ لوگ بھلائیوں میں سرگرم رہتے تھے
فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا	اور ہمیں شوق اور خوف کے ساتھ پکارتے
وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ	تھے اور ہمارے لئے خشوع کرنے والے تھے۔

اوصاف یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف پر روشنی انہیں الفاظ سے پڑتی ہے جو زکریا علیہ السلام نے اپنی دعا میں شامل کیے یا اللہ تعالیٰ نے خوش خبری سناتے ہوئے استعمال فرمائے ہیں۔

ذریۃ طیبہ پاکیزہ اولاد۔ یہ لفظ بہت ہی جامع لفظ ہے ایک عام انسان بھی اپنی اولاد کو نیک صالح اور ہر حیثیت سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے اور ایک مومن باپ اور ماں کی آرزوئیں اور تمنائیں تو اپنی اولاد کے سلسلے میں اور زیادہ بلند اور اعلیٰ ہوتی ہیں وہ صرف دنیا ہی کے لیے نہیں آخرت کے لیے بھی اپنی اولاد کو بہترین دیکھنا چاہتا ہے جسمانی پہلو ہی سے ہر طرح اچھا نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ روحانی اور باطنی پہلو سے بھی ہر طرح اچھا اور بہتر دیکھنا چاہتا ہے اور ایک پیغمبر تو اپنے وارث اور اپنی اولاد کو پیغمبرانہ عظمتوں کا حامل دیکھنا چاہتا ہے۔

غرضکہ زکریا علیہ السلام نے جو دعا میں پاکیزہ اولاد مانگی تو آپ کے پیش نظر یہ تھا کہ فکر و نظر اور عقیدہ و خیال سے لیکر اخلاق و کردار اور سیرت تک اور ظاہر سے لیکر باطن تک خوبصورت انفرادی اور

اجتماعی زندگی میں علم و عمل ہر اعتبار سے پاکیزہ اولاد عطا فرما جو پیغمبرانہ اوصاف کی حامل ہو، پیغمبرانہ ذمہ داریاں اٹھا سکے۔ پیغمبرانہ مشن کو اپنا کر اسے چلا سکے۔ پیغمبرانہ تحریک کی وہ صرف ممبر اور ورکر ہی نہ ہو بلکہ اس کی علمبردار اور لیڈر بھی ہو

ولی ولی کا لفظ وارث کا مفہوم ادا کرتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی وراثت کیا ہے؟ انسان اور کائنات کے بارے میں ان کا نظریہ، کائنات کی پیدائش اور اس کے انجام کے متعلق ان کا فکر و نظر، انسان کا مقصد تخلیق اور مقصد زندگی، کائنات میں اس کی حیثیت، کائنات اور انسان کے مآل اور معاد کے بارے میں ان کی تعلیم، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے واسطے ان کا نظریہ اور نظام غرض کہ ان کی وراثت درہم اور دینار نہیں ہوتے علم اور عمل ہوتا ہے وہ اللہ کی زمین پر اللہ کا راج انسان کی اختیاری زندگی میں بھی رائج کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی زمین پر اس کا کلمہ بلند کرنا اور اس کے کلمے کے علاوہ تمام کلموں کو پامال کرنا چاہتے ہیں وہ تمام بھلائیوں کو فروغ دینا اور تمام برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں وہ اللہ کے دین کو غالب اور دوسرے تمام دینوں، مذہبوں اور ازموں کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ بس انہیں باتوں اور کاموں کے لیے حضرت زکریا علیہ السلام نے وارث طلب کیا تھا جو ان کو یحییٰ علیہ السلام کی صورت میں عطا کر دیا گیا۔

رضی اللہ کی تمام آسمانی کتابوں کو پڑھ جائیے اور خصوصاً اس کی آخری کتاب کا ذرا اچھی طرح مطالعہ کیجیے جو ہر قسم کی دخل اندازی، لفظی اور معنوی تحریف سے محفوظ ہے اور ان اوصاف کی ایک فہرست تیار کیجیے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ انہیں اوصاف کا حامل اللہ کا پسندیدہ اور محبوب ہوتا ہے اور اسی کو رضی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

حضرت زکریا علیہ السلام اپنی ذریت اور اپنے ولی کو انہیں اوصاف کا حامل دیکھنا چاہتے تھے اور یحییٰ علیہ السلام انہیں اوصاف کے حامل تھے۔

مصدق اللہ کا ہر نبی ان تمام عقائد اور اعمال کی تصدیق کرنے والا ہوتا تھا جو اس سے پہلے آنے والے نبیوں نے پیش کیے ہوتے تھے۔ یحییٰ علیہ السلام ان عام معنی میں تو پہلے نبیوں اور پہلی کتابوں اور پیغمبرانہ تعلیم و ہدایت، ان کے نظریہ کائنات اور نظام زندگی کے مصدق تھے ہی خصوصیت سے اپنے ہم عصر، اپنے کچھ ہی بعد معجزانہ طریقے پر پیدا ہونے والے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے مصدق بھی تھے۔ یعنی وہ سچے تھے سچائی کے علمبردار تھے حق پرست تھے اور حق کے داعی تھے اور ہر قسم کی تنگ دلی، تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھے۔ اپنے پہلے اور اپنے بعد کے تمام علمبرداران حق اور داعیان حق کی تصدیق اور تائید کرنے والے تھے۔ نسلی وطنی، گروہی، لسانی اور لونی ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے۔

سیّد

سید کے معنے یوں تو سردار کے آتے ہیں لیکن آپ کو جو سرداری حاصل تھی وہ اس کے عام مفہوم سے بہت بلند، زیادہ جامع اور ہمہ گیر تھی۔ آپ دین و دنیا کے سردار تھے سیرت و اخلاق کے بادشاہ تھے۔ علم و عمل ہر پہلو سے سید تھے چنانچہ مفسرین نے اس موقع پر سید کے جو معنے بیان کیے ہیں ان میں پسندیدہ اور برگزیدہ، شریف اور پرہیزگار، عالم اور فقیہ حلیم اور دین و دنیا کا سردار وغیرہ معنے شامل ہیں۔

حصُور

یہ لفظ حصر سے بنا ہے مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنے ہیں ہر طرف اور ہر حیثیت سے ہر مقام اور ہر حالت میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کے حصار میں گھرا ہوا اور ہر قسم کے گناہوں اور معصیتوں سے محفوظ، نفسانی خواہشات اور بری صفات سے پاک جس کے دل میں بھی گناہ کا وسوسہ پیدا نہ ہوتا ہو، جس کے دماغ میں بھی کبھی گناہ کا خیال نہ آتا ہو اور جس نے اپنے کو اللہ ہی کے لیے وقف کر دیا ہو، جس کی تمنائیں اور آرزوئیں جس کا ظاہر اور باطن، جس کی صلاحیتیں اور قوتیں سب خدا کے لیے ہوں، جو پوری طرح اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو — غرضیکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام تمام اوصاف حمیدہ سے متصف تھے جن کے لیے قرآن نے لفظ سید استعمال کیا ہے اور ہر قسم کی صفات رذیلہ سے پاک تھے جن کے لیے قرآن نے لفظ حصور استعمال کیا ہے۔

نبی

آپ اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے اور اسی نظریہ اور نظام کے حامل تھے جو تمام انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے آپ کا بھی نصب العین اور طریقہ کار وہی تھا جو تمام انبیاء علیہم السلام کا تھا آپ بھی اسی علم اور عمل کے حامل تھے جس کے حامل دوسرے نبی اور رسول تھے آپ بھی اسی مشن اور تحریک کے علمبردار تھے جس کے علمبردار اللہ کے سارے پیغمبر رہے ہیں۔

آپ سے پہلے آپ کا کوئی سمی نہیں تھا اس لفظ "سمی" کے معنے اگر صرف ہم نام کے ہیں تو آخر سمی کا اس میں وہ کیا خوبی؟ ندرت اور اہمیت یا عظمت ہے جس کی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ آپ کا

نام یحییٰ ہوگا اور اس سے پہلے کسی کا نام یحییٰ نہیں تھا؟ دراصل سمی کے معنے ہمنام کے بھی آتے ہیں اور نظیر کے بھی آتے ہیں ممکن ہے آپ سے پہلے کسی کا نام یحییٰ نہ رکھا گیا ہو لیکن اصل مطلب یہ ہے کہ اے زکریا ہم تجھے صرف بیٹا نہیں بلکہ بے نظیر بیٹا اور بے مثال وارث دیں گے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ تاریخ میں حضرت یحییٰ سے پہلے تو بہت سے نبی اور رسول گذر چکے ہیں۔ پھر یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ آپ بے مثال اور بے نظیر تھے تو درحقیقت بات یہ ہے کہ فقہی اور قانونی زبان میں نہیں ادبی زبان میں بات کہی گئی ہے۔

حنان آپ کو اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں نبوت سے نواز دیا تھا اور پیدائشی طور پر دل میں گداز، طبیعت میں نرمی، فطرت میں رحم اور ہمدردی، قلب میں دل سوزی پیدا فرما دی تھی۔ آپ کو تزکیہ قلب حاصل تھا۔ غرضکہ آپ دل و دماغ اور طبیعت و مزاج ہر پہلو سے آراستہ تھے۔

تقویٰ آپ سراپا تقویٰ تھے۔ اللہ کے احکام بجا لاتے اللہ کی نافرمانی سے بچتے اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں گذارتے اور ہر وقت اس کے خوف سے کانپتے رہتے۔ پوری زندگی اللہ کو حاضر و ناظر جان کر گذارتے ہر حال میں شکر و صبر، ہر کام میں تقویٰ اور پرہیزگاری اور ہر بات میں خوشنودی رب کی طلب آپ کے پیش نظر رہتی۔ غرضکہ آپ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں میں متقی اور پرہیزگار تھے۔

بر آپ اپنے ماں باپ کے فرماں بردار تھے۔ والدین کا ادب و احترام، خدمت اور محبت اور دعا وغیرہ جو کچھ بھی ان کے حقوق تھے سب ادا فرماتے تھے آپ صرف اللہ ہی کے نہیں بندوں کے حقوق بھی ادا فرماتے تھے اور دونوں قسم کے حقوق ادا کرنے کی ہدایت فرماتے تھے جو شخص والدین کے حقوق ادا نہیں کر سکتا وہ آخر کس کے حقوق ادا کرے گا اور جو شخص بچپن سے ماں باپ کا احسان مند اور حق شناس ہوگا اور ان کے حقوق ادا کرنے کا عادی ہوگا اس کے اندر احسان مندی اور حق شناسی کی صفت پیدا ہو جائے گی اور پھر وہ ہر ایک کا حق پہچاننے اور ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔

اور جس شخص میں دل کا گداز نہ ہوگا جو قلب کے تزکیہ سے محروم ہوگا وہ جبار اور سخت دل بن جائے گا حق ناشناس اور احسان فراموش بنکر عصی یعنی سراپا نافرمانی بن جائے گا نہ اللہ کا حق پہچانے اور نہ بندوں کا۔ آپ جبار اور عصی نہیں تھے۔ آپ کو اللہ کی جانب سے حنان حاصل تھا اور آ

بڑے ہی اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ حق شناس، احسان شناس اور حامی مخلوق دونوں کے حقوق ادا کرنے والے تھے۔

سرگرمی آپ اللہ کے دین کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ بے دلی، سستی اور ٹال مٹول سے آپ کوسوں دور رہتے۔ بھلائیوں میں سرگرمی سے لگا رہنا آپ کا نمایاں وصف تھا اور یہ وصف آپ کو اپنے والدین سے ورثے میں ملا تھا۔

دعا یحییٰ علیہ السلام اللہ کی عبادت اس کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے دین کی دعوت و تبلیغ میں سرگرم رہنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا بھی کیا کرتے تھے اور یہ صفت بھی آپ کو اپنے والدین سے ورثے میں ملا تھا اور دعا امید و خوف اور بیم و رجا کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ہر حالت اور ہر غرض کے لیے اللہ سے اور صرف اللہ ہی سے مانگتے تھے جو کچھ بھی مانگتے تھے۔

خشوع حضرت یحییٰ علیہ السلام اور ان کے والدین بھی اللہ کے آگے جھکنے والے اور خشوع و خضوع اختیار کرنے والے تھے اور یہی وہ صفت تھی جو آپ کو مجبور کرتی تھی کہ آپ اللہ سے دعا کریں اس کی عبادت اور دین کی علمبرداری میں سرگرمی اختیار کریں۔ اللہ اور بندوں کا حق ادا کریں تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی گذاریں ــــ کیونکہ عرفانِ نفس اور عرفان رب جسے حاصل ہو وہی اللہ کے سامنے خشوع و خضوع اختیار کرتا ہے اور وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اندر جمع تھیں۔

خشیت آپ کے اندر اس قدر تھی کہ آپ اکثر روتے رہتے تھے حتیٰ کہ آپ کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان بن گئے تھے چنانچہ ایک بار حضرت زکریا علیہ السلام آپ کو تلاش کرتے ہوئے صحرا میں پہنچے تو وہاں آپ کو گریہ و زاری میں مصروف اور آہ و بکا میں مشغول پایا۔ زکریا علیہ السلام نے وجہ دریافت کی تو فرمایا:۔ ابا جان! آپ ہی نے تو مجھے بتایا تھا کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک لق و دق میدان ہے جو خدا کے خوف سے روئے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا اور جنت تک رسائی اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ سنکر حضرت زکریا علیہ السلام بھی رونے لگے۔

پانچ حکم یحییٰ علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور دین انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ

آپ کا فریضہ او پیغمبرانہ ذمہ داری تھی لیکن خصوصیت سے آپ نے جن پانچ باتوں کا حکم دیا ہو وہ یہ ہیں :-

۱۔ اللہ کے سوا کسی کی پوجا، پرستش اور بندگی نہ کرنا، کسی کو اس کا شریک و سہیم نہ ٹھیرانا اس کی ذات و صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کسی میں کسی کو شریک نہ کرنا۔

۲۔ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنا، جب تک نماز میں صرف اللہ کی طرف توجہ کرتے رہوگے اللہ تمہاری طرف اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ رہے گا۔

۳۔ روزہ رکھتے رہنا، روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہے۔

۴۔ صدقہ خیرات کیا کرو۔

۵۔ دن رات میں کثرت سے اللہ کو یاد کیا کرو۔

شہادت یحییٰ علیہ السلام نے خاص عبادت الٰہی اور سچے دین کی طرف بلایا اور اپنے بعد آنے والے پیغمبر کی خوشخبری سنائی تو یہودی اپنی بے دینی اور دنیا پرستی کی وجہ سے آپ کے دشمن ہو گئے۔ ایک روز اکٹھا ہو کر آئے اور آپ کو گھیر لیا اور پوچھا کیا تم مسیح ہو؟ فرمایا۔ نہیں تو کیا تم "وہ نبی" ہو؟ فرمایا نہیں، تو کیا ایلیا نبی تم ہی ہو؟ فرمایا نہیں، تو ان لوگوں نے کہا تو پھر تم کون ہو؟

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کہا۔ میں حق کے لیے بلند کی گئی آواز ہوں اس پر یہودیوں نے مجبور کر کر آپ کو شہید کر ڈالا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

عصرِ حاضر میں تحریکِ اسلامی[1]

——— موجودہ صورتِ حال

عزیز طلبہ اور نوجوانو! اور محترم بزرگو!

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک ایسے موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی جس سے میں دوسرے تمام موضوعات فکر و تحقیق سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں اور جو متعدد وجوہ سے آج ہمارے لیے پہلے سے زیادہ غور و بحث کا محتاج ہے۔ میرا ہی نہیں تحریکِ اسلامی کے بہت سے دیرینہ خادموں کا احساس ہے کہ کچھ عرصہ سے تحریک فسردگی کا شکار ہے اور اس کے مطالب و مقاصد کے فہم و تفہیم، منہاج کی تعیین اور لائحہ عمل کی تفصیلات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا ادا کیا جا سکے۔

تحریکِ اسلامی سے ہماری مراد

سب سے پہلا سوال جس کا جواب ہمیں متعین کر لینا ہے یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی سے ہماری مراد کیا ہے؟

بہت سی اسلامی خدمات ایسی ہیں جو مختلف انجمنیں اور ادارے کے ہاتھوں مسلم معاشرے میں ہمیشہ سے انجام پاتی رہی ہیں اور اس کی روایات میں داخل ہو چکی ہیں۔ مثلاً دینی تعلیم کے لیے درس گاہوں کا قیام، عوام کو اسلامی عقائد اور عبادات سکھانے کے لیے دینی مجالس کا انعقاد، اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی کوشش وغیرہ۔ لیکن ہم ان کوششوں کو تحریکِ اسلامی کا نام نہیں دیتے۔ ایسا کرنے سے

---

[1] یہ مقالہ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ اجتماع میں ۲۵ر نومبر [illegible] کو پڑھا گیا تھا۔

ان کوششوں کی ناقدری لازم نہیں آتی۔ یہ کوششیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ملت اسلامیہ میں اسلام کے بچے کھچے اثرات بیشتر انہی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ مگر اقدام کو بقا سے تحریک کو تحفظ سے اور جدید کو قدیم سے ممتاز کیے بغیر ہم عصر حاضر میں تحریک اسلامی کے مطالعہ کا حق نہیں ادا کر سکتے۔ یہ وہ تحریک ہے جس نے مروجہ دین داری کو (زمانی اور اضافی اعتبار سے نہ کہ فی الاصل) کچھ نئے معیار پر پرکھ کر اسے ایک نیا رخ دینا چاہا ہے جو ملت اسلامیہ کو محض باقی رکھنے کی بجائے اسے آگے بڑھا سکے اور اسلام کو صرف محفوظ رکھنے کے بجائے اس کے دائرے کو مزید وسعت عطا کر سکے۔

اس مطالعہ میں تحریک اسلامی سے ہماری مراد ان منظم کوششوں سے ہے جنھوں نے اسلام کو پوری زندگی میں اختیار کیے جانے کے لائق قرار دیتے ہوئے عام انسانوں، بالخصوص مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم میں اسلام ہی کو رہنما بنائیں تاکہ فرد کی تربیت، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل، سب اسلامی ہدایات کے مطابق عمل میں آ سکیں۔ یہ تحریک جو بیسویں صدی کے ربع ثانی کے آغاز میں ظہور پذیر ہوئی اسلام کو ایک جامع نظام زندگی کے طور پر متعارف کرانے اور اسے ایک سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کے طور پر نافذ کرنے کے عزم میں ان تمام اسلامی کوششوں سے ممتاز ہے جو اس سے پہلے کی جاتی رہی تھیں۔

زیادہ متعین طور پر تحریک اسلامی سے ہماری مراد الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی اور ماشومی نیز وہ دوسرے مقامی حلقے اور اصحاب فکر و قلم ہیں جو اپنے فکر اور سرگرمیوں کے اعتبار سے اول الذکر تنظیموں سے ہم آہنگ تھے جن کے درمیان قدر مشترک اسلام کا ایک جامع نظام زندگی کے اعتبار سے تعارف کرانا اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ انھوں نے یہ آواز بلند کی کہ عقیدہ و مسلک، اجتماعی رویہ، قانون و دستور سب کی بنیاد دین کو ہونا چاہیے۔ انھوں نے اسلام کو اس صلاحیت کا حامل قرار دیا کہ وہ عصر حاضر میں ایک صالح اور ترقی پذیر معاشرے کی بنیاد بن سکے۔ انھوں نے یہ بتایا کہ اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کا عزم ایمان کا بنیادی تقاضا ہے جس سے روگردانی اسلام سے انحراف ہے۔

جن معاشروں میں ان تحریکوں نے جنم لیا، ان میں روایتی دین داری عقائد و عبادات، اسلامی عائلی قوانین اور عام معاملات زندگی میں اخلاقی تعلیمات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بات کہ سیاست، معیشت، بین الاقوامی تعلقات اور فی الجملہ انسان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم میں بھی اسلام کو رہنما

...نی تو جاتی تھی لیکن برتی نہیں جاتی تھی۔ نہ علماء اور مصلحین اس پر زور دیتے تھے۔ روایتی مسلمان کو
...یک دعوت کا علمبردار اور دنیا کی تعمیر نو کے مشن کا حامل ہونے کا شعور نہیں رہ گیا تھا اور دین داری
...رج ایک مجموعہ احکام کی پابندی قرار پا چکی تھی۔ انفرادی دین داری کا دین کے اجتماعی مقاصد
...رشتہ منقطع ہو جانے کے سبب بنیادی اسلامی تصورات مثلاً توحید، توکل، صبر، تقویٰ وغیرہ
...رکی Dynamic پہلوے حاری اور اپنی جامعیت سے محروم ہو چکے تھے۔ ان تحریکوں
...رہ بالا موقف اختیار کر کے دینی شعور میں ایک زبردست ہلچل پیدا کر دی۔ چونکہ جلد ہی ان
...ں نے اپنے علاقوں میں سیاسی اور سماجی مسائل میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ اس لیے
...وہ دوسرے دینی حلقوں سے ممتاز ہو کر سامنے آ گئے

مصر میں الاخوان المسلمون کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ اس تاریخ سے ۱۹۴۸ء
...یہ تحریک مسلسل پھیلتی چلی گئی۔ بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوئے۔ تربیتی کیمپ لگے۔ کام مختلف
...ں میں تقسیم ہوا اور کتابچوں سے آگے بڑھ کر العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام (سید قطب ۱۹۴۹ء)
تصانیف پیش کی جانے لگیں۔ برصغیر ہند میں تحریک کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی
...فی الاسلام ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے رسالہ ترجمان القرآن کی ادارت
...مالی اور ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کے باقاعدہ قیام تک اپنی تحریروں کے ذریعے اس فکر
...میں کرتے رہے جو جماعت کی اساس بنی۔ انڈونیشیا میں اسلامی حلقوں کا ارتکاز ۱۹۲۲ء میں
...ی خلافت کمیٹی کے قیام ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلامی مکہ کی شاخ کے قیام اور ۱۹۳۷ء میں المجلس
...الاسلامی الاندونیسی کے قیام کے مراحل سے گذرتا رہا مگر ماشومی یعنی مجلس شورائے مسلمین انڈونیشیا
...عدہ تنظیم ۱۹۴۵ء میں ملک کی آزادی کے بعد عمل میں آئی۔

یہ تحریک نہ تو دفعتاً نمودار ہوئی۔ نہ ان کے آغاز سے حسن البنا، ابوالاعلیٰ مودودی اور
...ہ کے نام وابستہ کر دینا ان کی تاریخ بیان کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ بلکہ اس سے پہلے کے
...ڑھ سو برس کے عرصے میں اسلامی دنیا میں جو نئے فکری رجحانات ابھرے انھوں نے اس کی بنیاد
...ان میں سے متعدد مفکرین نے عصر حاضر میں دین کی صالحیت و موزونیت، اس کی اجتماعی
...شان کی اہمیت اور خلافت یا اسلامی ریاست کی مقصودیت پر زور دیا تھا۔ عصر حاضر میں

ابھرنے والی نئی اسلامی تحریک پران علماء و مفکرین کے کام کی گہری چھاپ پڑی ہے۔[1]

ان مفکرین نے اپنے زمانے میں رائج باطل افکار اور فاسد عقائد پر تنقید کی اور دین کو سمجھنے کے لیے اس کے اصلی ماخذ قرآن اور سنت کی طرف رجوع کی دعوت دی۔ دینی زندگی کے لیے صحابۂ کرام اور سلف صالحین کی زندگیوں کو رہنما قرار دینے کے ساتھ ہی انھوں نے تقلید جامد کی مذمت کی اور اجتہاد پر زور دیا۔ بیسویں صدی میں احیاء اسلام کی نئی تحریکوں نے ان دونوں نکتوں کو پوری قوت کے ساتھ ابھارا اور انہیں اپنی بنیادی دعوت کا جز بنالیا۔ یہ دونوں نکتے ان کی دعوت کے اس امتیازی نکتے سے گہرا ربط رکھتے ہیں کہ اجتماعی زندگی میں بھی دین کو رہنما بنایا جائے اور پوری زندگی کو اسلامی اصول و احکام کے مطابق منظم کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دور جدید کا انسان اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے مسئلے پر ان نظاموں کو سامنے رکھ کر غور و بحث کرتا تھا جن کا دنیا میں چلن تھا۔ بالخصوص اشتراکی نظام جو فکر و بحث کی دنیا سے آگے بڑھ کر پہلی بار اس صدی کے ابتدائی برسوں میں عملاً برپا کیا گیا تھا بحث کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عصر حاضر کی اسلامی تحریکوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ اسلام ایک جامع نظام زندگی ہے جو اشتراکی نظام اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے بالمقابل ایک

---

[1] یہاں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ان علماء و مفکرین کے کام کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے۔ ہم صرف چند اہم نام گنانے پر اکتفا کریں گے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (ہندوستان)	۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ / ۱۶۹۹ء - ۱۷۶۲ء	محمد بن عبدالوہاب (نجد)	۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء - ۱۸۰۳ء
محمد بن اسمٰعیل الامیر (یمن)	۱۰۹۹ھ - ۱۱۸۲ھ / ۱۶۸۸ء - ۱۷۶۸ء	محمد بن علی السنوسی (مغرب)	۱۷۸۷ء - ۱۸۶۰ء
شاہ اسمٰعیل شہید (ہندوستان)	۱۱۹۳ھ - ۱۲۴۶ھ / ۱۷۷۹ء - ۱۸۳۱ء	امیر عبدالقادر (الجزائر)	۱۸۰۷ء - ۱۸۸۳ء / ۱۲۰۱ھ - ۱۲۹۶ھ
عبدالرحمٰن کواکبی	۱۸۴۹ء - ۱۹۰۲ء	سید احمد شہید (ہندوستان)	۱۲۰۱ھ - ۱۲۴۶ھ / ۱۷۸۶ء - ۱۸۳۱ء
مفتی محمد عبدہ	۱۲۶۶ھ - ۱۳۲۰ھ / ۱۸۴۹ء - ۱۹۰۵ء	جمال الدین افغانی	۱۲۱۵ھ - ۱۲۹۴ھ / ۱۸۳۸ء - ۱۸۹۷ء
رشید رضا (مصر)	۱۲۸۲ھ - ۱۳۵۴ھ / ۱۸۶۵ء - ۱۹۳۳ء	شکیب ارسلان (شام، لبنان)	۱۸۶۹ء - ۱۹۴۶ء
ڈاکٹر سر محمد اقبال	۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء		

بہتر بدل فراہم کرتا ہے۔ دائرۂ بحث زیادہ تر سیاسی معاشی اور معاشرتی نظام پر مرکوز ہو گیا اور تحریک اسلامی کا مقصود اسلامی نظام کا قیام قرار پایا جس کی عملی تعبیر کے طور پر حکومت الٰہیہ یا ہمارا دستور قرآن، کے نعرے اختیار کیے گئے۔

عصر حاضر کی اسلامی تحریکوں کی یہ تعریف کہ یہ وہ تحریکیں ہیں جنھوں نے اپنا ہدف اسلامی ریاست کے قیام کو قرار دیا اس امر کو مستلزم نہیں کہ انھوں نے دوسرے معروف دینی کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جو بات ان تحریکوں کو دوسرے معاصر اسلامی حلقوں یا ماضی قریب کی دوسری دینی تحریکوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اسلامی ریاست کے قیام کی مرکزی اہمیت ہے۔ یہ امتیازی شان ان کے سارے اعمال میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ دین کی تفہیم و ترجمانی ہو یا عملی پروگرام میں مختلف کاموں کی باعتبار اہمیت درجہ بندی سب پر اس امتیاز کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

طریق کار اور دائرۂ اثر ان تحریکوں نے ملاقات و گفتگو، تقریروں، اجتماعات اور لٹریچر کے ذریعے اشاعت افکار کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کے مصنفین اور مقررین نے دین اور اس کی تعلیمات کے بارے میں مغربی فکر کے زیر اثر پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالے اور ایجابی طور پر دین کی صلاحیت و موزونیت واضح کر کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دین پر اعتماد اور اس سے تعلق بحال کرنے کی کوشش کی جس میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں دین و سیاست کی تفریق مذہب کو اجتماعی زندگی کے لیے امر غیر متعلق (IRRELEVANT) قرار دینے اور اسے محدود معنے میں نجی زندگی میں جگہ دے کر باقی زندگی کی تنظیم و تعمیر کو تمام تر عقل و تجربہ کی جولان گاہ قرار دینے کے سیکولر فکر کا اسلامی مشرق میں نیا نیا چلن ہوا تھا۔ مغربی تعلیم یافتہ خواص اور وہ سیاسی لیڈر جو اپنے سامراجی آقاؤں کی تہذیب و تمدن ہی کو جدید انسان کے لیے مقدر سمجھتے تھے اس فکر کو اختیار کرتے جا رہے تھے۔ علماء دین اور پیروان مذہب دین و عقیدہ کے لیے اس رجحان کے دور رس اثرات کو پوری طرح نہ سمجھ سکنے اور جدید زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں پر اسلامی تعلیمات کو منطبق کرنے سے قاصر رہ جانے کے سبب یا عارضی سیاسی مصالح کے تحت اس رجحان سے مصالحت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان

تحریکوں نے بڑی قوت کے ساتھ اس رجحان کو چیلنج کیا اور اسے صریح "ناقص" قرار دیتے ہوئے دینی مزاج کے لیے ناقابل قبول ٹھیرایا۔ انھوں نے کہا کہ جب خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پوری انسانی زندگی کے لیے ہدایات دیتی ہے تو اجتماعی زندگی سے دین کو بے دخل کرنے کا رجحان ایمان و اسلام کے ساتھ کبھی میل نہیں کھا سکتا۔ رہی یہ بات کہ قرآن و سنت کی بعض تعلیمات عصر حاضر میں ناقابل عمل یا مسائل زندگی کے حل کے لیے غیر موزوں ہیں تو انھوں نے اس بات کا ذمہ لیا کہ وہ ایسے ہر شبہہ اور اعتراض کا جائزہ لے کر یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ یہ بات غلط ہے اور دین آج بھی انسانی مسائل کے حل کے لیے موزوں ترین طریقے تجویز کر سکتا ہے۔

جو لوگ ان تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر تحریک سے وابستہ ہوئے ان سے دین کی جملہ تعلیمات پر عمل کا مطالبہ کیا گیا اور تذکیر و احتساب کے ذریعے ان کی تربیت کی کوشش کی گئی ان کو ایک نظم کے تحت دعوت کے کام کو آگے بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو اپنا ہم نوا بنانے کے کام میں لگا دیا گیا۔ چونکہ ان تحریکوں کا بنیادی طریق کار تبلیغ و اشاعت افکار تھا اور ان کے فکر کا مواد عقلی استدلال پر مبنی تھا اس لیے ان پڑھ عوام تک اپنی بات پہنچانے اور انھیں اس حد تک متاثر کر دینے میں زیادہ کامیابی نہ ہو سکی کہ ان کی روایتی نیم دیندارانہ اور نسبتہً ساکن و جامد زندگی میں کوئی گہری تبدیلی اور نمایاں حرکت نمودار ہو سکتی۔ ان عوام کے ایک گروہ نے قدرے شک و تذبذب کے ساتھ یہ نیا رخ اختیار کیا جس کی تائید ان کے دیرینہ مذہبی پیشوا نہیں کر رہے تھے بلکہ بعض استثناءات کے سوا اکثر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ چونکہ ان پڑھ مسلمان عوام کا اسلام سے تعلق زیادہ تر انہی مذہبی پیشواؤں کے توسط سے تھا لہٰذا انھیں اپنی سمجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نئے پیغام کو وصول کرنا اور اپنے پیشواؤں کی بات کو رد کرنے میں زبردست تامل تھا۔ یہ بات کہ دین کو یہی پیشوا سمجھتے اور سمجھا سکتے ہیں فہم دین کے نئے علمبرداروں کے زیر اثر اسی حد تک بھلائی جا سکتی تھی جس حد تک کہ عوام خود اپنی سمجھ پر اعتماد کر لے اور تحریک کے استدلال کا جائزہ لے کر اس کی باتوں کو رد یا قبول کرنے کا طریقہ اختیار کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن یہ رویہ انھیں خود اس دینداری کے لیے خطرہ معلوم ہوا جو خود سمجھنے پر نہیں بلکہ مذہبی پیشواؤں کی سمجھ پر اعتماد کرنے پر قائم تھی اور صدیوں سے قائم چلی آ رہی تھی۔

چنانچہ نئی تحریکوں کو ابتداءً اپنے سرگرم کارکن زیادہ تر سماج کے اس طبقے سے ملے جو شہروں اور قصبات میں رہتا تھا اور اتنی تعلیم حاصل کر چکا تھا کہ اگر اجتماعی نظام سے متعلق مباحث کو پوری طرح نہ سمجھ سکے تو بھی ان مباحث کی اہمیت محسوس کر سکے۔ ان کی دعوت کو قبول کرنا اور حمایت پر کمربستہ ہو جانا ان لوگوں کے لیے آسانی کے ساتھ ممکن ہو سکا جو جدید تعلیم کے زیر اثر آزادی فکر کے قائل اور اندھی تقلید سے بیزار تھے۔ اسی طرح ایسی دینی درسگاہوں کے فارغ علماء ان تحریکوں کی طرف جلد متوجہ ہو سکے جن کا تعلیمی نظریہ اور مزاج براہ راست یا بالواسطہ نئی روشنی سے فیضیاب ہو چکا تھا یا ماضی قریب کے تجدیدی اور اجتہادی تحریکوں کا گہرا اثر قبول کر چکا تھا۔ جو لوگ سیاسی شعور رکھتے تھے ان کے لیے یہ بات بالکل فطری تھی کہ حق خود ارادیت اور آزادی کی جدوجہد اور نئی تحریک کے پیغام میں ربط قائم کریں اور جب ان میں یہ آرزو پیدا کی گئی کہ آزاد مسلم معاشرے کی تنظیم دین کی بنیادوں پر ہونی چاہیے تو انہیں یہ بات اپنے دل کی آواز معلوم ہوئی اگرچہ انہیں ابھی اسلامی تعلیمات کو دور جدید کی اجتماعی زندگی کی بنیاد بنانے کے بارے میں تفصیلی سوچ بچار کا موقع نہیں ملا تھا مگر وہ سامراج کے ساتھ سامراجی قوموں کے طور طریق کو بھی رد کرنا چاہتے تھے اور اپنے سماج کی تعمیر نو اپنے داخلی وسائل سے کرنے کے آرزومند ہو گئے۔

جس چیز نے عوام و خواص، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ دونوں میں ان تحریکوں کے زیر اثر ایک زبردست ولولہ پیدا کر دیا وہ اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی آرزو تھی جس کی تکمیل کے لیے سیاسی آزادی جیسی اہم شرط اب پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس آرزو کو اگر ایک طرف مفکرین اور اصحاب قلم نے اپنے استدلال کے زور سے ایک نئے عزم کی بنیاد بنانا چاہا تو دوسری طرف خطیبوں اور شاعروں نے اسے زمانے کی پکار اور انسانیت کی ضرورت بنا کر پیش کیا اور ملت کو پکارا

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

شاعروں اور خطیبوں، اخبار نویسوں اور مصنفین سب نے مل کر اس یقین کو بحال کیا کہ اسلام دور جدید میں انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے جب کہ مغرب کی قیادت اپنی ناکامیاں پوری طرح سامنے لا چکی ہے۔ دنیا کو ایک نئی قیادت کی ضرورت ہے۔ یہ قیادت وہ مسلمان ہی فراہم کر سکتے ہیں جو

انسان کے لیے دین کی موزونیت پر اعتماد کامل ہو اور جو علم و بصیرت سے آراستہ نئے اجتہادات کے ذریعے انسانی مسائل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں حل کرنے پر قادر ہوں۔ اس طرح نئی تحریکوں نے علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی اور دینی علوم اور جدید علوم دونوں کے طالب علموں اور ماہرین کی ایک معتدبہ تعداد کے اندر اس بات کا حوصلہ پیدا کیا کہ وہ اجتہادی فکر کے لیے ضروری استعداد بہم پہنچائیں اور جدید مسائل پر اسلامی نقطہ نظر سے غور و بحث شروع کر دیں۔ یہ نئی علمی تحریک اگرچہ نہ اس کام کے وسیع تقاضوں کو سمجھ سکی نہ ان کو پورا کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کر سکی مگر اس نے یونیورسٹیوں اور دینی درس گاہوں میں اس ضرورت کا اتنا چرچا ضرور کر دیا کہ حوصلہ مند علماء اور اساتذہ کی ایک جماعت اس سمت میں سفر کا آغاز کر سکے۔ یہ اسی حرکت کا فیضان ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں اسلام کی اجتماعی تعلیمات، نئے مسائل میں اسلام کی رہنمائی اور اسلام اور دوسرے معاصر نظاموں کے تقابلی مطالعہ پر ایک وسیع لٹریچر سامنے آچکا ہے۔ مشرق کے تعلیمی اداروں کی تقلیدی فضا میں، خواہ یہ تقلید قدیم فقہاء اور متکلمین کی ہو یا جدید مغربی مفکرین کی، اجتہادی فکر کا یہ چرچا ایک نیا رجحان تھا جس میں ذہین لوگوں کے لیے ایک زبردست اپیل تھی۔ نئی اسلامی تحریکوں کو جو افرادی سرمایہ حاصل ہوا اور انھوں نے جس حرکی قوت کا مظاہرہ کیا وہ اگر ایک طرف تعمیر نو کے حوصلہ کا مرہون منت تھا تو دوسری طرف اس میں اسی اجتہادی رجحان کا بھی ہاتھ تھا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا وہ اس دور کی دو بڑی تنظیموں ـــــ الاخوان المسلمون، اور جماعت اسلامی دونوں پر مگر خاص طور پر جماعت اسلامی پر منطبق ہوتا ہے جو فکری اعتبار سے تینوں تنظیموں میں قوی ترین تھی۔ اس کے بالمقابل الاخوان المسلمون کے ابتدائی مراحل میں جذباتی عنصر تعقل و تفکر پر حاوی تھا۔ اس تحریک کے بانی کی شخصیت اور طریق کار میں اس بات کی صلاحیت زیادہ تھی کہ وہ خواص کے علاوہ ان پڑھ عوام کو بھی اپنے ساتھ لے سکیں۔ ایسا اس لیے بھی ممکن ہوا کہ انھوں نے ابتدائی دور میں مروجہ چیلنجوں پر نقد و تبصرہ سے ابتدائی و بیداری کے ان نئے پیمانوں کے تعارف پر زور دیا جن کو وہ مرکزی مقام دینا چاہتے تھے۔ چونکہ آبادی کے لحاظ سے بھی مصر احیائے اسلام کی تحریک کے لیے ہندوستان سے زیادہ سازگار تھا اس لیے اخوان کو لبتہ زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور

جلد ہی تحریک کو بہت مقبولیت حاصل ہو گئی۔ جہاں تک ماشومی کا سوال ہے اس کے بارے میں ہماری واقفیت محدود ہے اور اس سے زیادہ کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہ اپنے فکر او طریق کار میں مذکورہ بالا دونوں تنظیموں سے قریبی مماثلت کے باوجود فکر کی گہرائی اور ہمہ گیری میں ان کے ہم پلہ نہ تھی۔

تحریکِ اسلامی کے دو ادوار :- ۱۹۴۸ء سے پہلے اور اس کے بعد

اگر ہم زیر مطالعہ دور کے وسط میں ۱۹۴۸ء کو ایک نقطہ فاصل بنا کر گذرے ہوئے پچیس برسوں کا اس کے بعد کے پچیس برسوں سے مقابلہ کریں تو خاصا فرق نظر آتا ہے۔ پہلے دور کو ان تحریکوں کا تشکیلی دور قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا جس میں ان کا بنیادی فکر سامنے آیا اور تنظیم مستحکم ہوئی۔ ماحول پر ان کے اثرات اس حد تک مرتب ہونے لگے کہ کوئی انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور رفتہ رفتہ یہ تنظیمیں ان ملکوں کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی متعارف ہونے لگیں۔ اخوان اور جماعت اسلامی کا لٹریچر ترجمہ ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگا اور دونوں کا لٹریچر انڈونیشیا پہنچنے لگا جس سے تینوں تحریکوں کے درمیان مقاصد کی یکسانیت کے ساتھ فکری ہم آہنگی کا احساس نمودار ہوا۔

اگرچہ ان تحریکوں کی اٹھان زبردست سیاسی ہل چل کے زمانے میں ہوئی تھی اور سیاست ان کے خمیر میں داخل تھی۔ چنانچہ تینوں جماعتیں اپنے ملکوں میں سیاسی امور میں بعض رائیں قوت کے ساتھ سامنے لاچکی تھیں مگر ان کے عملی طور پر سیاست میں حصہ لینے کا عمل اس تاریخ کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے جسے ہم نے تحریک کے دوسرے دور کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے ضمن میں جو زبردست جنگ ہوئی اس میں اخوان نے عملاً حصہ لیا۔ اس اقدام کا تحریک کے آئندہ لائحہ عمل پر اور اس رویے پر بھی گہرا اثر مرتب ہوا جو دوسروں نے تحریک کی جانب اختیار کیا۔ اخوان کی مقبولیت اور قوت کے اس مظاہرے سے اقتدار میں کھلبلی مچ گئی۔ ۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو الاخوان المسلمون غیر قانونی قرار دی گئی اور ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کو حسن البنا شہید کر دیے گئے۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں اسلامی دستور کے مطالبہ کی مہم شروع کرنا اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں قرارداد مقاصد کا منظور ہونا جماعت اسلامی پاکستان کے آئندہ لائحہ عمل اور اس کے سیاسی مستقبل کے

لیے فیصلہ کن اقدام ثابت ہوا۔ ماشومی کے رہنما محمد ناصر صدر سوکارنو کے دور میں کئی برسوں تک وزارت علمی کے منصب پر فائز رہے لیکن آگے چل کر ماشومی حکومت کی نظر میں معتوب ہوگئی اور اس کی سیاسی سرگرمیاں محدود کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔

اس دور کے ابتدائی برسوں میں ان تینوں جماعتوں کی سیاسی سرگرمیاں دن بدن بڑھتی گئیں۔ اس کا سبب اگر ایک طرف ان کے ملکوں کے حالات تھے جن میں یہ کام کر رہی تھیں تو دوسری طرف ان کی یہ رائے تھی کہ جب ان کا مقصود اسلامی ریاست کا قیام ہے تو وہ اس فیصلہ کن مرحلے میں سیاست میں بھرپور حصہ لیے بغیر نہیں رہ سکتے جس میں دور رس نتائج کے حامل دستوری اور سیاسی فیصلے کیے جا رہے تھے اور ملک کا نیا قانون زیر ترتیب آنے والا تھا۔ جب ان کے درمیان یہ بحث اٹھی کہ مسلم معاشرے کی تعلیم و تربیت اور تحریک اسلامی کے علمی اور اجتہادی تقاضوں کی تکمیل کے سلسلے میں ان کا کام ابھی اس حد تک نہیں انجام پا سکا تھا جو اسلامی ریاست کے قیام و بقا کے لیے پائیدار بنیادیں فراہم ہوسکیں تو ان کا فیصلہ یہی ہوا کہ جس فیصلہ کن مرحلے میں وہ اپنے ملک کو پا رہے تھے اس میں کوئی دوسرا طریق کار اختیار کرنا ممکن نہیں، اور یہ کہ مذکورہ کاموں کو حکومت کے زیر اہتمام انجام دینا زیادہ سہل اور نتیجہ خیز ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ملک میں اسلامی دستور، اسلامی قانون، اسلامی نظام تعلیم وغیرہ سے متعلق تفصیلی مطالبات سامنے لانے اور اس ضمن میں ارباب حکومت کے فیصلوں اور ارادوں پر کڑی تنقید کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ان کے پریس اور پلیٹ فارم سے سنائی دینے والی باتوں میں یہی بات دوسری باتوں پر چھاتی چلی گئی۔ انھوں نے عوام کو تنبیہ کی کہ ان کے مغرب زدہ حکمران اسلامی دستور و قانون کے نفاذ اور اسلام پر عمل کے باب میں یکسو اور مخلص نہیں ہیں اور ملک کو اسلام کے مطابق چلانے کے لیے قیادت میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اس طرح ان تحریکوں کے زیر اثر عوام میں اپنے حکمرانوں کی جانب سے بے اعتمادی اور بیزاری کی لہر دوڑ گئی اور حکمران ان جماعتوں کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھنے لگے۔

جیسے جیسے یہ لے تیز ہوتی گئی مفادات محفوظہ (vested interest) اور سیاسی طاقت کے اجارہ دار ملک کے اندر اور باہر اسلامی تحریکوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ان تحریکوں کے

بالمقابل اپنے عوام کے لیے حکمرانوں کے پاس کوئی جذباتی اپیل نہ تھی۔ اقتدار اور مفادات محفوظ رکھنے کے لیے وہ استدلال کی زبان سے نا آشنا ہوتے ہیں اور انھوں نے ان جماعتوں کے خلاف وہی حربے استعمال کیے جو تاریخ میں وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ انہیں جبر و قوت کے ذریعے کچل دینے کی کوشش کی گئی۔ روایات اور مزاج کے اختلاف کے سبب سب سے زیادہ شدت مصر اور دوسرے عرب ممالک میں تھی۔ ۱۹۴۸ء میں فاروق کے دور میں غیر قانونی قرار دیے جانے کے بعد ۱۹۵۲ء میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کے تحت اخوان کی تنظیم بحال ہو گئی تھی اور ابتداءً ۱۹۵۳ء کا انقلاب انہیں دوست رکھتا تھا مگر جلد ہی اس نے اسے اپنی راہ کا روڑا سمجھ کر ۱۹۵۴ء میں خلاف قانون قرار دے دیا۔ ۴ افراد کو پھانسی دے دی گئی اور ہزاروں افراد کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں بہت سے دوسرے لوگوں کے علاوہ سید قطبؒ کو بھی رہا کیا گیا مگر جلد ہی انہیں پھر گرفتار کر کے ۱۹۶۶ء میں دار پر چڑھا دیا گیا اور جبر و تشدد کا یہ سلسلہ ناصر کے پورے دور میں جاری رہا۔ دوسرے عرب ممالک میں اخوان کے ساتھ طرز عمل کم و بیش مصری طرز عمل کے تابع اور مطابق رہا۔ پاکستان میں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مولانا مودودی کو گرفتار کر کے بیس ماہ تک جیل میں رکھا گیا۔ پھر ایک دوسرا بہانہ تلاش کر کے مارچ ۱۹۵۳ء میں انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی جو بعد میں عمر قید میں تبدیل کر دی گئی مگر ۱۹۵۵ء میں ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کی بنا پر آپ رہا ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں دوسری جماعتوں کے ساتھ اس جماعت کو بھی سرگرمیاں بند کرنے پر مجبور کیا گیا۔ سیاسی جماعتوں کے بعد بھی ایک بار مخصوص طور پر جماعت اسلامی پاکستان پہ پابندی عائد کی گئی جو بعد میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت دور ہوئی۔ انڈونیشیا میں ماشومی نے کمیونسٹ جارحیت کے رد عمل میں اشتراکی سازش کا قلع قمع کرنے کی اس مہم میں قائدانہ حصہ لیا تھا جو بالآخر سوئیکارنو کے زوال پر منتج ہوئی تھی۔ مگر جنرل سوہارتو کی نئی حکومت نے ماشومی کی تنظیم کو بحال نہیں ہونے دیا۔ اب ان لوگوں کو ایک دوسرے نام سے کچھ سرگرمیوں کی اجازت ہے مگر حکومت کی مسلسل مداخلت کے سبب یہ سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں اور آج کل ماشومی تنظیم معطل ہے۔

تحریک اسلامی نے سیاسی امور میں اپنا مرکز توجہ تین امور کو بنایا تھا۔ اولاً ملک کے دستور

میں اس امر کی صراحت کہ حاکمیت اللہ کی ہے ریاست اسلام کی پابند ہوگی اور قانون سازی قرآن وسنت کے مطابق ہوگی۔ نیز نظام تعلیم اور دوسرے وسائل تربیت کو اسلامی معاشرہ برپا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ ثانیاً جمہوریت کی بحالی اور بقا تاکہ مسلمان عوام کی اسلام سے وابستگی کو مجالس قانون ساز میں اسلامی عناصر کے غلبہ کی بنیاد بنایا جا سکے۔ ثالثاً انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ انتخابات میں حصہ لیکر ان مجالس میں اپنے افراد کو بھیجیں اور ہم خیال افراد کی تائید کرکے ان کی معاونت حاصل کریں۔ مصر، سوڈان، شام، پاکستان اور انڈونیشیا میں ایک زمانے میں ان تینوں امور میں محدود پیمانے پر کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر جلد ہی مخالف طاقتیں ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئیں کہ کامیابی کے نتائج تادیر قائم نہ رہ سکے۔ دستور میں لکھوائی ہوئی دفعات خود اپنے مخلصانہ نفاذ کا اہتمام نہ کرسکتی تھیں۔ مزید برآں جب اور جہاں اس بات کا موقع ملا ایسے دستور کو کالعدم کرنے یا بدل دینے میں بھی تامل نہ کیا گیا جمہوریت اکثر ملکوں میں عارضی ثابت ہوئی اور جہاں پارلیمانی جمہوریت پائی گئی وہاں بھی اسلام سے عوام کی جذباتی وابستگی سے فائدہ اٹھانے میں یہ جماعتیں دوسری جماعتوں پر بازی نہ لے جاسکیں مزید برآں عراق وشام اور بعض دوسرے علاقوں میں بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں ایسے حکمرانوں کو برسر اقتدار لائیں جو اسلام اور تحریک اسلامی دونوں کے مخالف تھے۔ اس امر کے حق میں بھی قوی شہادتیں موجود ہیں کہ مختلف ممالک میں اسلامی تحریکوں کو کچلنے کی پالیسی بیرونی طاقتوں کے ایما پر اختیار کی گئی۔

اخوان اور جماعت اسلامی کا لٹریچر پوری اسلامی دنیا میں پھیل چکا ہے اور اب مغربی ممالک میں بھی پھیل رہا ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں افریقہ کے نوآزاد مسلم ممالک میں بھی اسلامی لٹریچر تیزی سے پھیلا ہے۔ اسلامی افکار کی اشاعت اور ان تحریکوں کے بنیادی نکات کو قبول عام تک پہنچانے میں بڑی تعداد میں مصنفین اور مقررین نے بھی حصہ لیا ہے۔ جو ان تنظیموں سے وابستہ نہیں بلکہ کسی خاص مرحلے میں ان کے مخالف بھی رہے ہیں۔ اس عام اثر کے باوجود آج اخوان کو کسی ملک میں بھی ایک تنظیم کی حیثیت سے اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد کی آزادی نہیں حاصل ہے۔ مصر، شام، عراق اور سوڈان جہاں تحریک ایک زمانے میں کافی زور پکڑ چکی تھی۔ وہاں آج اس کے معروف افراد

کے لیے عام شہریوں کی حیثیت سے زندگی گذارنا بھی ممکن نہیں رہا ہے۔ زیادہ تر نمایاں افراد ہجرت کر کے پڑوس کے ان ملکوں میں سکونت اختیار کر چکے ہیں جو اگرچہ انہیں اپنے مخصوص مصالح کے تحت عام شہری زندگی کا حق دیتے ہیں مگر تنظیم اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ ماشومی بھی اپنے وطن میں سرگرمیوں سے معذور ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان کے لیے سردست بنگلہ دیش میں کسی سرگرمی کا موقع نہیں باقی رہ گیا ہے اور پاکستان میں بھی سیاسی آتار چڑھاؤ کے سبب کسی خوش آئند مستقبل کی امید دشوار ہے۔ گذشتہ انتخابات میں ناکامی اور آئندہ عرصے تک انتخابات کی توقع نہ ہونے کے سبب اس کے لیے ایک اپوزیشن پارٹی سے آگے بڑھ کر ملکی سیاست میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی اس طرح سیاست میں جن امور کو ان جماعتوں نے مرکز توجہ بنایا تھا ان کی نسبت سے موجودہ صورت حال زیادہ امید افزا نظر نہیں آتی۔

ظاہر ہے کہ یہ جماعتیں سیاست کے غلبہ کے باوجود صرف سیاسی جماعتیں نہیں تھیں کہ ان کی کارکردگی کا جائزہ صرف سیاسی سطح پر لیا جانا درست ہو۔ سیاسی آتار چڑھاؤ کے باوجود اسلام کی تفہیم و ترجمانی، دور جدید میں اسلامی زندگی کے مسائل پر غور و بحث اور مسلمان معاشرے کی اسلامی تربیت کا جو کام انھوں نے شروع کیا تھا وہ برابر جاری رہا۔ اگرچہ اپنی بیشتر قوتوں کو سیاست میں لگا دینے اور حکمرانوں کے جبر و تشدد کا نشانہ بن جانے کے سبب وہ گذشتہ پچیس برسوں میں زیادہ قوت کے ساتھ نہ انجام دے سکیں۔ خاص طور پر گذشتہ دس پندرہ برس سے ان کاموں میں بھی نمایاں اضمحلال نظر آتا ہے اور فکری محاذ پر بھی پہلا سا جوش و خروش اور ابتدائی دور جیسی تازگی اور اچھوتا پن نہیں باقی رہا۔ اس حالیہ منظر کے بعض اسباب کی ہم آئندہ نشان دہی کریں گے۔

تحریک اسلامی کے دوسرے دور کے بارے میں مذکورہ بالا گفتگو تمام تر دنیا کے ان ممالک سے متعلق تھی جہاں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں۔ مگر اس دور میں ہندوستان، سری لنکا، مشرق بعید کے بعض ممالک اور یورپ، امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ میں بھی تحریک کا کام آگے بڑھا۔ ان علاقوں میں تحریک کے مسائل کے ذکر سے پہلے اس اہم بات کا ذکر ضروری ہے کہ برصغیر میں ابھرنے والی تحریک

علاوہ دوسری تحریکوں نے اپنا مخاطب تمام تر مسلمانوں ہی کو بنایا تھا۔ ان کا لٹریچر اور ان کی تقریریں سب مسلمانوں کے لیے تھیں۔ جس کا اثر ان کے موضوعات اور طرز استدلال دونوں پر گہرا پڑا ہے انھوں نے غیر مسلم انسانیت کو براہ راست مخاطب نہیں کیا۔ ان کے یہاں اسلامی دنیا سے باہر کا ذکر اگر آتا ہے تو اعتراضات کا جواب دینے یا دوسری تہذیبوں کی تہی مائیگی واضح کرنے کے لیے — جماعت اسلامی نے اپنے ابتدائی دور میں سارے انسانوں کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ شان تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ پاکستان بننے کے بعد وہاں کی جماعت وہاں کے مسلمانوں کی طرف یکسو ہو گئی اور جماعت اسلامی ہند بھی اپنے نیک ارادوں کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے گمبھیر مسائل کے حل میں لگ گئی۔ چند برسوں سے اس صورت حال کی اصلاح کی کوشش شروع کی گئی ہے مگر کارکنوں اور مسلمانوں کی راسخ عادات غور و فکر کے نئے نتائج کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں اور کہا نہیں جا سکتا کہ یہ جماعت غیر مسلموں کو مخاطب بنانے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے گی۔

یہ بات کہ عصر حاضر کی اسلامی تحریک نے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ انہی کو سمجھانے کے لیے اسلام کی تفہیم و ترجمانی کی اور انہی کے سماج میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے سیاست، معیشت اور معاشرت میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت اور جدید مسائل کے اسلامی حل کو موضوع بحث بنایا۔ یورپ، امریکہ اور دنیا کے ان دوسرے علاقوں میں اسلامی کام کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی جہاں مسلمانوں کا عددی تناسب برائے نام ہے۔ ابتدائی مرحلے میں جو شاید اب ختم ہو رہا ہے۔ یہ کام زیادہ تر انہی جماعتوں کے لٹریچر کے ذریعے انجام پایا۔ پہلی توجہ ان ملکوں میں مقیم مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت اجنبی ماحول میں اسلامی زندگی کے ابتدائی تقاضوں کی تکمیل کے اہتمام اور اسلامی ملکوں میں ان جماعتوں کی امداد تک محدود رہی۔ اب ماحول کے تقاضے اور ان تحریکوں کا بنیادی مزاج دونوں کارکنوں کی توجہ دائرۂ اسلام سے باہر کے انسانوں تک دین کی دعوت پہنچانے کی طرف مبذول کرا رہے ہیں۔ اس کام کے لیے اسلامی ممالک میں پروان چڑھنے والی تحریکوں کا لٹریچر بہت مفید اور مفید ثابت نہیں ہو رہا ہے اور اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ عام انسانوں بالخصوص مغربی ممالک کے انسانوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے

دین کو از سر نو سمجھا اور سمجھایا جائے۔ ان انسانوں کی ذہنی سطح مخصوص نفسیات، تمدنی حالات اور ان مخصوص مسائل زندگی کو جن کو وہ اہمیت دیتے ہیں۔ کار دعوت میں سامنے رکھنا ضروری ہے۔ مزید برآں دعوت کے لیے ان کی مذہبی روایات اور سماجی آداب سے قریبی واقفیت بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی ان گتھیوں کو بھی سلجھانا ہے جو ان کے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں سے ان کے سابقہ ربط و تعلق کے نتیجے میں پڑ چکی ہیں۔ مشرقی اسلامی خطاب ان نکتوں کی رعایت سے قاصر رہا ہے اس لیے ایک نئے تخاطب کی ضرورت ہے۔

افریقہ کے نو آزاد مسلم ممالک اور مسلمان آبادیوں کے لیے تحریک اسلامی کے کارکن ابھی نو وارد ہیں اور یہی حال مشرق بعید کے ممالک کا بھی ہے۔ ان میں سے بعض ممالک میں دینی روایات کا تسلسل کارفرما رہا ہے جس کی خصوصی رعایت ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ افریقہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا جو کام عرصے سے ہوتا رہا ہے اس کے بالمقابل تحریک اسلامی کا کام اپنے امتیازات قائم رکھے۔ فی الحال ان نئے علاقوں میں تحریک ابھی اس خود شناسی اور حرکیت Dynamism کی حامل نہیں بن سکی ہے جو یورپ اور امریکہ کے تحریکی حلقوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ حالات کا رخ یہ بتاتا ہے کہ آئندہ کے لیے تحریک میں تازگی، نشاط و انبساط اور حرکیت کا ایک اہم منبع مغربی ممالک میں مقیم اعلیٰ تعلیم یافتہ کارکنان تحریک کی وہ کوششیں ہیں جو وہ عالمی اسلامی تحریک میں فکری ہم آہنگی اور ایک مربوط لائحۂ عمل سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ مختلف اسلامی ملکوں میں تعلیم کے شعبہ اور انتظامیہ کے عملے سے ان کے روابط بڑھ رہے ہیں اور آئندہ زیادہ قریبی تعاون کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

مناسب ہوگا کہ دنیا میں تحریک اسلامی کے موجودہ صورت حال کے بعض خارجی پہلوؤں پر اس طائرانہ نگاہ کے بعد اب ہم اپنی بحث کو سمیٹنے کی کوشش کریں اور ملکوں اور جماعتوں کے فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے مجموعی طور پر تحریک کے موجودہ مسائل کا اس طرح جائزہ لیں کہ اس سے مستقبل میں کرنے کے کاموں کی نشان دہی ابھر سکے۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے اس دنیا کے حالات پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے جس میں یہ تحریک کام کر رہی ہے۔ (باقی)

ترجمہ و تبصرہ: اشتیاق حسین ایم اے
ادارہ تصنیف جماعت اسلامی ہند
علی گڑھ

تہذیب کی تشکیل نو

ایک تعلیمی فلسفے کی روشنی میں

مقالہ نگار تھیوڈور بریملڈ ہیں۔ یہ مقالہ سلکٹڈ ریڈنگس ان دی فلاسفی آف ایڈوکیشن، تھرڈ ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اسی کتاب سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے اور آخر میں مقالہ نگار کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے

تعمیر نو کا فلسفہ RECONSTRUC TIONISM درحقیقت ایک فلسفۂ بحران ہے جس کا تعلق تعلیم ہی سے نہیں بلکہ ثقافت سے بھی ہے۔ چونکہ تعلیم ثقافت ہی کا ایک حصہ بلکہ دراصل اسی کی پیداوار ہے اس لیے تعلیم کے فلسفۂ بحران میں ثقافت کا فلسفۂ بحران بھی مضمر ہے

عصر حاضر زبردست بحرانی دَور سے گذر رہا ہے ہم ایسے دَور سے وابستہ ہیں جو ایک طرف تو ایک ہی رات میں عالم انسانیت کو تباہی اور ہولناکی کے غار پر لے جاکر کھڑا کر سکتا ہے اور دوسری طرف اس بات کا بھی امکان ہے کہ عالمی سطح پر اعلیٰ درجے کی ایسی تہذیب وجود میں آجائے جس سے انسان اب تک محروم رہا ہے۔ لہذا ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں لیکن ہم میں سے اکثر کو یقین نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے آیا ہم تباہی کے گڈھے سے قریب تر ہو جائیں گے یا تعمیر نو کے راستے پر گامزن ہو جائیں گے۔

فلسفہ تعمیر نو پر یقین رکھنے والا جانتا ہے کہ کون سی راہ مفید ہوگی اگر چہ اسے بھی اس کا علم نہیں کہ کون سا راستہ انسانیت اپنائے گی اور نہ اسے اس بات ہی کا یقین ہے کہ تخریب کے بجائے تعمیر کی راہ اختیار کرنے کے لیے انسان مطلوبہ عقل رکھتا ہے۔ لیکن اس بات میں اسے شبہ نہیں کہ انسان کے سامنے واضح شکل میں انتخاب کا اختیار موجود ہے۔ اب اس سلسلے میں

تعلیم جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے تمام ذرائع، قوتیں اور ذمہ داریاں اس مقصد کے لیے وقف کر دے کہ تعمیر نو کی راہ کا انتخاب یقینی ہو جائے۔

اس فلسفے کی دوسری خصوصیت جو پہلی سے الگ نہیں بلکہ اس سے اور خود نفس بحران سے بھی متعلق ہے، یہ ہے کہ بحران کے تجزیے اور تعبیر میں اقدار کا عمل بہت اہم ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر بحران ان اقدار ہی ڈھانچے کے انتشار ہی سے پیدا ہوتا ہے جن سے کہ تمام ثقافتوں کو رہنمائی ملتی ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ خود اسی ثقافت سے متعلق بہت سے لوگ اپنے معتقدات اپنی بھلائیوں، اپنے معیاروں اور مقاصد سے ناآشنا ہونے لگتے ہیں ان کے سامنے متضاد راہیں آتی ہیں اور وہ اس کے اہل نہیں ہوتے کہ کسی ایک راہ کا انتخاب کر سکیں۔ لہٰذا فلسفۂ تعمیر نو کا ماننے والا تسلیم کرتا ہے کہ انسان کے موجودہ مصائب کا سبب محض سیاسی یا عالمی انتشار ہی نہیں ہے بلکہ اخلاقی انتشار اور عدم تیقن بھی ہے۔

لیکن وہ اس بات میں بھی یقین رکھتا ہے کہ فی الواقع کچھ ایسی منضبط اور بہترین اقدار بھی ہیں جن کا انکشاف ہونا باقی ہے اور جن سے انسان کو وابستہ ہو جانا چاہیے۔ ان اقدار کی تلاش اور ان کا ایک خاکہ پیش کرنا تعلیم کے اعلیٰ مقاصد میں سے ایک ہے۔

لہٰذا ان سب سے بڑھ کر فلسفۂ تعمیر نو ایک فلسفۂ اقدار، ایک فلسفۂ مقاصد اور ایک فلسفۂ غایات ہے۔ یہ فلسفہ اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت اساتذہ اور شہری کے ہمارا اور آپ کا یہ فرض ہے کہ جن اقدار سے ہم چپٹے ہوئے ہیں بصیرانہ اور ناقدانہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ ان میں کیا غلطی ہے اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کون سی اقدار اپنائی جا سکتی ہیں۔ ان اقدار، اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی قیود وغیرہ کو بہت اہمیت دینی چاہیے جنھیں ہم اپنا سکتے ہیں کیونکہ یہی چیزیں اس خطرناک اخلاقی پراگندگی اور کش مکش سے جو کہ ایک وبائی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں نجات دلا کر تباہی سے بچا سکتی ہیں۔

اس فلسفے کی تیسری صفت یہ ہے کہ یہ فلسفہ پوری طرح نیا نہیں ہے اگر ہم ثقافت کی ان کوششوں کو فلسفہ کا نام دیتے ہیں جو وہ اپنے کو اور اپنے نظام اجتماعی کی خصوصیات کو بامقصد بنانے کے لیے انجام دیتی ہے تو تعمیر نو کا فلسفہ زندگی اور تعلیم کے دوسرے فلسفوں کے تجربات اور

بہترین خیالات پر مبنی قرار پاتا ہے۔ فلسفۂ تعمیر نو دوسرے فلسفوں سے بہت سی باتیں اخذ کرتا ہے۔
نظریۂ قطعیت (ESSENTIALISM) سے وہ یہ اصول لیتا ہے کہ تمام تعلیمات ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کی جا سکتی ہیں۔ تعلیم و تعلم کا ایک بنیادی غرض یہ ہے کہ ثقافتی تجربات کے تسلسل (CONTINUITY) کو برقرار رکھا جائے۔ ترقی پسندیت (PROGRESSIVISM) سے وہ یہ بات اخذ کرتا ہے کہ ثقافتی تبدیلی کے مراحل ذہنی عمل سے طے ہوتے ہیں۔ تاریخ فلسفہ ایسی ہستیوں سے خالی ہے جنھوں نے ذہنی عمل کی معنویت کو اتنا زیادہ ابھارا ہے جتنا کہ فلسفہ تعلیم کی عظیم شخصیت جان ڈیوی نے، اس کے خیال میں ذہنی عمل کو تعلیمی عمل کا ایک اہم حصہ ہونا چاہیے اور پھر ان دونوں یعنی ذہنی عمل اور تعلیم کو ثقافتی تبدیلی کے عمل کا جزو لاینفک بن جانا چاہیے۔
نظریہ دوامیت (PERENNIALISM) سے جو چیز یہاں حاصل کی گئی ہے وہ زندگی کی مقصدیت (PURPOSIVENESS) کا اصول ہے یعنی انسان کے سامنے اس کی زندگی کے واضح مقاصد ہونے چاہئیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مقصد حیات کے سلسلے میں نظریہ دوامیت اور فلسفہ تعمیر نو میں اختلاف ہے لیکن اس نکتے پر دونوں ایک آواز ہو جاتے ہیں کہ زندگی میں مقصد اور مطمح نظر کا تعین ضروری ہے۔

فلسفہ تعمیر نو کے کچھ لوازمات

چونکہ فلسفہ تعمیر نو ایک بحرانی فلسفہ (CRISIS PHILOSOPHY) ہے اور اس حیثیت سے وہ واضح اور غیر مبہم مقاصد پر بہت زور دیتا ہے چنانچہ اس کے نزدیک نظام تعلیم کا بنیادی غرض یہ ہے کہ ایسے مقاصد کی تشکیل کر کے ان کی تعمیل و توثیق میں لگ جائے۔ یہ خیال اقدار کی اہمیت کے متعلق اوپر کہی گئی بات سے مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ تمام مقاصد اقدار ہی سے وابستہ ہیں۔
لہٰذا فلسفہ تعمیر نو اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ کسی طرح اقدار کا تعین (VALUE RIENTATION) کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اقدار کا ایسا تعین ممکن ہو سکے گا جو ہمیں صحیح اور بہتر طریقے سے وہ مقاصد دے سکے جن کی ہمیں ضرورت ہے یعنی ہماری کارگزاریاں اور کارروائیوں کے واسطے مرکز بنکر انہیں حرکت دے سکے اور ایک ڈھرّے پر لگا سکے۔
لیکن ایسے مقاصد کا حصول محض فلسفیانہ تجزیے سے ممکن نہ ہو سکے گا بلکہ ان کی امید اس

ی جا سکتی ہے جبکہ ہم اپنے دور کی غیر معتدل فطرت کو سمجھیں اور اس کی ضروریات اور مطالبات
ازہ لگائیں۔

آج کی ضروریات میں سے ایک اہم ضروریات جس کا بار بار ذکر آئے گا وہ عالمی تہذیب
(WORLD CIVILIZAT) ہے اور یہ عالمی تہذیب ایک رنگ، طاقتور اور کچھ مخصوص
کے ساتھ کے ساتھ وابستہ ہو تاکہ ان تمام طاقتوں کے ساتھ ایک کش مکش برپا کر دے جو انسانیت
ابھی کے درپے ہیں اور آخر کار انہیں نیست و نابود کر دے۔ عالمی تہذیب ایک متقاضی
ہے جس کی آج تعلیم کو ضرورت ہے۔

اب ہمیں عالمی تہذیب کے اس اصول کو سمجھنا ہے۔ عالمی تہذیب کے اصول پر جب بھی
بدگی سے غور کیا جائے گا تو وسیع مسائل سے سامنا کرنا پڑے گا۔ اب یہ کام تعلیم کا ہے کہ
ں تہذیب کے حصول کے لیے ان دیو قامت مشکلات کا سامنا کرکے انہیں دور کرے۔ کیونکہ
ت مشکلات کا تجزیہ کیا جائے گا۔ عالمی تہذیب کے راستے خود بخود ہموار اور کشادہ ہوتے
ئیں گے۔

عالمی تہذیب کا مقصد ایک انتہائی اور بنیادی (RADICAL) مقصد ہے۔ یہ بنیادی
فنے میں ہے کہ یہ انسانیت کو ایک مکمل اور مستقبل پر نگاہ رکھنے والا مقصد دیتا ہے۔ تاریخ میں
کم اب تک انسان عالمی تہذیب حاصل نہیں کر سکا ہے اور نہ مستقبل قریب ہی میں اس کا
مکان نظر آتا ہے۔

دنیا اس وقت جنگی چھاؤنیوں میں بٹ چکی ہے اور یہ چھاؤنیاں ایک دوسرے سے نفرت
ور انہیں برباد کرنے میں اپنی قوتیں اور وسائل صرف کر رہی ہیں۔ نفرت اور تباہی وہ منفی
ہا جنھوں نے نمایاں طور پر انسانی زندگی میں محبت و تعاون و تعمیر جیسی مثبت اقدار کی جگہ لے لی
لا ایک ایسی عالمی تہذیب کی تجویز جیسی ہر ذات، قوم، نسل اور رنگ کے لوگ پرامن عالم
ہ کے مشترک مقصد کے تحت متحد ہو کر بین الاقوامی نظم کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہو جائیں۔
یک اساسی تبدیلی کی طرف غمازی کرتی ہے۔ اپنے رفیق اساتذہ کو میرا مشورہ ہے کہ
م مقصد کے لیے وہ اپنے آپ کو وقف کر دیں اور نوجوانوں کی مدد کریں تاکہ وہ امن کے

... کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں سنبھال سکیں۔

ظاہر ہے کہ عالمی تہذیب کے مقصد پر متفق ہونے کے لیے بہت سے لوگ پہلے سے تیار ہیں۔ اگر چہ ان کی مجوزہ عالمی تہذیبوں کی نوعیتوں میں فرق ہے۔ عالمی تہذیب کا خیال ایک کمیونسٹ کے طرزِ فکر سے مکمل طور پر موافقت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ عالمی تہذیب کی تشکیل اشتراکی اصولوں پر ہوئی ہو۔

پوپ جان 23 نے بھی عالمی تہذیب کی ضرورت کا اظہار کیا ہے لیکن ان کی نظر میں عالمی تہذیب کا فلسفہ رومیت کے تصورِ انسان و کائنات سے مطابق ہونا ضروری ہے۔

لہذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی نکتے کے مختلف تصورات کا واضح مفہوم تلاش کیا جائے۔ نظام تعلیم کو بہت غور و خوض سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اشتراکی نظام کس نظریے کی حمایت کرتا ہے۔ کوئی بھی نظامِ تعلیم جو طلبا کو اشتراکی نظام کے صحیح، گہرے اور معروضی مطالعے سے باز رکھتا ہے۔ ایک ذمہ دار ادارہ نہیں کہلایا جا سکتا اور بالکل یہی رویہ رومن کیتھولک چرچ کے بارے میں ہونا چاہیے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی تعلیمات کا بھی تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اسی طرح فلسفۂ تعمیرِ نو کے حامیوں اور ان سے قریبی نظریات رکھنے والے لوگوں کو بھی جو کہ عالمی تہذیب کے حامی ہیں زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

اس اصول یعنی عالمی تہذیب کا مرکزی نکتہ تصورِ جمہوریت سے جا ملتا ہے۔ لہذا ہمیں خوب اچھی طرح جمہوریت کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اگر اچھی تعداد میں لوگ جمہوریت کے خوشنما اور مصنوعی لیبل سے چپٹے رہنے کے بجائے اس کے اصل معنے سے واقف ہو گئے تو امید ہے کہ وہ اس بات پر متفق ہو جائیں گے کہ وہ عالمی تہذیب جس کے وہ خواہاں ہیں، ایک جمہوری عالمی تہذیب ہے یہاں پہنچ کر ہم پھر اس نکتے پر آجاتے ہیں جہاں اقدار کے تعین کا سوال اٹھتا ہے۔ کیونکہ جمہوریت بذاتِ خود اقدار کے تعین کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

فلسفۂ تعمیرِ نو اور جمہوریت

اب جمہوری اقدار کے تعین کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں جرأت کہی جانے کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرے یعنی وہ اس بات پر یقین کر لے کہ وہ خود ...

کا مالک ہے لہذا وہ اپنی راہ بھی متعین کر سکتا ہے اور سماجی رشتوں میں اپنے اوپر کنٹرول بھی کر سکتا ہے۔ سیاسی طور پر اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ تعمیر نو کا فلسفہ جب عالمی تہذیب کو پیش کرتا ہے اس میں بنیادی پالیسیوں کا تعین اکثریتی رائے کی بنا پر ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اقلیتوں کو بھی ان پالیسیوں سے اختلاف کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

اس اختلاف رائے کا مطلب حکم عدولی، بے توجہی اور ان پالیسیوں سے انحراف نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ اقلیتیں اپنے فطری حق تنقید کا استعمال کریں اور آزادی کے ساتھ اکثریت کو اس کی کوتاہیوں پر متنبہ کرتی رہیں۔

سیاسی نظریے کے اعتبار سے جمہوریت دو طرفہ ہے۔ جب تک یہ دونوں پہلو مستقل طور سے عملی شکل نہ اختیار کیے ہوئے ہوں جمہوریت کا قائم رہنا مشکل ہے۔ یعنی اکثریت پالیسی بنائے اور اقلیتیں تنقید کا فرض انجام دیں۔ ان میں سے دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ جمہوریت کی اسی دو طرفہ خصوصیت کے اندر یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اپنی حتمی اور آخری بھلائی کے لیے بہتر عام فہم اور صحیح قوت فیصلہ آخر کار عوام الناس ہی رکھتے ہیں۔ کوئی سربراہ یا سربراہوں کا گروہ خواہ کتنا ہی ہمدرد اور عقلمند شمار کیا جاتا ہو اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا جب تک ہم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس نکتے پر یقین نہ کرلیں گے اور پالیسیوں کے سلسلے میں بہترین بنیادی فیصلوں کے لیے عوام کی اکثریت کی صلاحیت پر پختہ اعتماد نہ کرلیں گے ہم جمہوریت نہیں قبول کر سکتے۔

فلسفۂ تعمیر نو میں ذرائع و وسائل

اب تک ہم نے مقاصد و غایت کے بارے میں بات کی ہے۔ لیکن اور دوسرے قابل ذکر تعلیمی فلسفوں کی طرح فلسفۂ تعمیر نو بھی مقصد و مطمح نظر کے ساتھ ساتھ اس کے حصول کے ذرائع و وسائل سے بھی بحث کرتا ہے۔

ایک ایسا ادارہ ہونے کی حیثیت سے کہ جس کے ذریعے ثقافتیں ایک دوسرے میں منتقل ہوتی اور بدلتی ہیں۔ خود تعلیم بھی ناگزیر طور پر ایک عمل ہے لیکن ذریعہ ہونے کی حیثیت سے بھی تعلیم اسی وقت مضبوط اور بہتر ہو سکتی ہے۔ جبکہ مقصد ہونے کی اعتبار سے بھی اپنے اندر مضبوطی رکھتی ہو۔ پہلے ہمیں اپنی غایت، اپنی منزل اور اپنے مقاصد جاننے کی ضرورت ہے تب ہم ان راستوں کی تلاش

میں لگ سکتے ہیں جن سے ہو کر ہمیں منزل تک پہنچنا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں پر فلسفہ تعمیر نو ترقی پسندی سے اختلاف کرتا ہے۔ فلسفہ ترقی پسندی کے مطابق مقاصد خود ذرائع سے وجود میں آتے ہیں اگر ہم موثر تدابیر اختیار کر لیں تو مقاصد لازمی طور پر ہمارے سامنے آجائیں گے لیکن فلسفہ تعمیر نو اس بات پر زور دیتا ہے کہ وسائل و ذرائع ان مقاصد سے تشکیل پاتے ہیں جن کو متعین کرکے ہم اپنے اپنے کو وابستہ کر لیتے ہیں۔ منزل معلوم ہو جانے کے بعد صحیح راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ مقاصد اور تدابیر بہر حال ایک دوسرے کے لیے لازمی ہیں۔

لہذا اب پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ تعلیم کو براہ راست عالمی تہذیب کے مقاصد سے وابستہ ہو جانا چاہیے۔ ذرائع و تدابیر کے بارے میں فلسفہ تعمیر نو کی ایک اہم بلکہ امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی عقل کی نارسائی اور اس کی کمزوریوں پر بہت زور دیتا ہے۔ انسان اپنے اندر اور سماجی رشتوں میں بہت ہی طاقتور غیر عقلی قوت عمل رکھتا ہے۔ اگر ہمیں تعلیم کی قوتوں کو جمہوری عالمی تہذیب جیسے عظیم مقصد کے حصول کے لیے وقف کرنا ہے تو انسان کی ان غیر عقلی قوتوں مثلاً جذبات نفرت و تصادم اور ساتھ ہی ساتھ محبت و موافقت وغیرہ جیسی قوتوں کا علم اور ان سے استفادہ ضروری ہے۔

تعمیر نو کا فلسفہ فطرت انسانی پر انفرادی اور اجتماعی طور سے بصیرت رکھنے کا خواہاں ہے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ کس طرح ان لازمی نئی غایتوں کے حصول میں اپنی قوتوں کو صرف کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک فطرت انسانی پر نظر رکھنے کا سوال ہے۔ گذشتہ سو سال میں دو علوم خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ پہلا نو عمر طب دماغی (PSYCHIATRY) اس سلسلے میں سگمنڈ فرائڈ کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ اگرچہ کارل یونگ اور ہیری سٹیک سلیوان (CARL JUNG HARRY STACK SULLIVAN) کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ فلسفہ تعمیر نو تعلیم کے اور دوسرے اہم نظریات کے ماننے والوں سے زیادہ زور کے ساتھ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا باقاعدہ علم بہت ضروری ہے۔ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی اس سائنس کے خاص خاص اصولوں کے علم کے بغیر کوئی استاد اپنا فرض صحیح طریقے سے انجام دے ہی نہیں سکتا۔

فطرت انسانی کے غیر عقلی پہلو کو سمجھنے کا دوسرا اہم ماخذ وہ سماجی علوم ہیں جو انسان کے گروہی

رویہ بالخصوص طبقاتی رویے اور عمل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہاں جس سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے وہ کارل مارکس ہے جو سماج کا ایک عمیق طالب علم ہے جس نے عوام کے غیر عقلی رویے کو افراد کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ان کے منظم سماجی اور معاشی رشتوں میں پیش کیا۔

عصر جدید کے استاد کے لیے لازمی ہے کہ مارکس اور اس کے بعد کے محققین کے کارناموں سے جنھوں نے اس کی تعبیر و تشریح میں ترمیمیں کی ہیں باخبر رہے لہذا تعمیر نو کا تعلیمی فلسفہ انفرادی اور سماجی دونوں پہلوؤں سے زندگی کے غیر عقلی پہلوؤں کے تجزیے پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک ذریعے کی حیثیت سے تعلیم کا کام صرف اس بات کی ہمت افزائی کر دینا ہے کہ ان غیر عقلی عوامل سے محفوظ رہا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ثقافتی تعمیر نو کی امین ہونے کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ عقلی طور پر وہ اپنا فرض انجام دے ہی نہیں سکتی۔ جب تک اس غیر عقلی پہلو کی طاقت کا اندازہ اچھی طرح نہ لگالے۔ یہاں بظاہر ایک تضاد معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مارکس کے یہاں عقلیت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ کیونکہ وہ طبقاتی کش مکش کی منتصادمانہ اور شدت پسندانہ فطرت پر زور دیتا ہے لیکن اس میں فی الحقیقت مارکسی فلسفے کے ایک اہم مفروضہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان جب تک غیر عقلی سماجی رویے کو چھپاتا رہے گا وہ عقلیت پسند نہیں ہو سکتا۔

فلسفہ تعمیر نو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ عالمی تہذیب کی طرف رہنمائی کرنے والی سماجی تبدیلیوں کے حصول کے لیے تعلیم کو ایک طاقتور ذریعہ بنایا جائے۔ لیکن اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لیے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ ذاتی اور ثقافتی سطحوں پر کس طرح اپنی طاقتوں کا اندازہ لگا کر ان کو صرف کریں لیکن فی الواقع ذرائع اسی وقت عقلی ہو سکتے ہیں جبکہ ہم غیر عقلی پہلوؤں کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ فلسفہ تعمیر نو اور ترقی پسندیت دونوں تعلیم کو ثقافتی تبدیلی کے ذریعے کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ وہ ہمیں اور آپ کو اساتذہ اور اگر اساتذہ نہیں تو تعلیم کی مخفی قوتوں کا مالک ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم ان تعلیمی اداروں کو تبدیلی اور استحکام کا ایک آلۂ کار سمجھیں۔

دو حقیقتوں میں بڑا فرق ہے آیا ہم اپنا فرض اس عقیدے کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ تعلیم تجدید

تہذیب کے لیے ایک بہت بڑی قوت ہے یا سماجی میراث کی حفاظت اور نئی نسل تک اس کو منتقل کرنا ہی ہمارا کام ہے۔ یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک نظریے سے پھیکی طرح چمٹ کر دوسرے سے کلی طور پر آزاد ہو جائیں۔ لیکن فلسفہ تعمیر نو کا رجحان یہی ہے کہ موجودہ بحرانی دور میں ان دو افکار میں پہلا فکر قابل ترجیح ہے۔

اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس حقیقت کو عملی شکل کس طرح دی جائے جب کہ روزمرہ کے فرائض، پروگراموں کے تعین، محدود وسائل اور دیرینہ اشتعالات کے ہجوم ہم اساتذہ کو گھیرے ہوئے ہیں اور یہ مسائل بھی فوری حل طلب ہیں؟ ایسی صورت میں تبدیلی لانے اور بنیادی مسائل کے حل کے لیے فراغت کس کے پاس ہے؟ لیکن بہرحال ساتھ ہی ساتھ ان سب کو لیکر گاڑی آگے بڑھانا ہے۔

آخر میں کہنے دیا جائے کہ نظریہ تعمیر کا مقصد کنڈرگارٹن (بستان طفلاں) سے لیکر ہائی اسکول، کالج اور تعلیم بالغان تک مدارس کی درسیات اور اس طرح تعلیم و تعلم میں بنیادی تبدیلی لانا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ انتظامیہ اور موقف سازی کے نظام کے ساتھ تعلیم کے اختیارات میں بھی رد و بدل کا خواہاں ہے۔ اس طرح درسیات، نظام تعلیم و تعلم، اور تعلیم پر کنٹرول سب میں تبدیلی آسکے گی۔ درحقیقت کسی بھی جمہوریت پسند بنیادی فلسفہ میں یہی بات پوشیدہ ہے۔ وہ فلسفہ جو چھوٹی اور قلیل تبدیلیوں پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ مطلوبہ مقاصد نہیں حاصل کر سکتا۔ دور تک دیکھنے والا اور تعمیر نو کی صفات کا حامل نظام تعلیم ہی بحیثیت مقصد اور ذریعہ کے ہمارے دور کو کچھ دے سکتا ہے۔

تبصرہ

اس مقالے میں جو خاص خاص مضامین وارد ہوئے ہیں ان کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلی بات جو مقالہ نگار موصوف نے پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ عصر حاضر ایک بحرانی دور سے گذر رہا ہے۔ اس کے بعد فلسفہ تعمیر نو کی چند خصوصیات مختصراً ذکر کی ہیں۔ موجودہ بحران کے تجزیے اور تعمیر میں اقدار کے عمل پر زور دیتے ہوئے موصوف نے بتایا ہے کہ اقدار کا تعین اس بحران سے ہمیں نکال سکتا ہے۔ عالمی تہذیب موجودہ دور کی اہم ضروریات میں سے ایک ہے جس کی تکمیل اقدار کے جمہوری تعین ہی سے ممکن ہے۔

ان مقاصد کے حصول کے سلسلے میں موصوف نے تعلیم کو ایک مضبوط اور بہترین ذریعہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر فطرت انسانی کے غیر معقلی پہلوؤں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ آخر میں یہ واضح کر دیا ہے کہ تعلیم میں بھی بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ ان مقاصد تک پہنچنے میں مدد مل سکے۔

دورِ حاضر کے متعلق فاضل مصنف نے یہ واضح کرتے ہوئے کہ ہمارا دور ایک بحرانی دور ہے بتایا ہے کہ ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں یعنی منفی یا مثبت طور پر یہ دور ہمارے لیے فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

لیکن واقعات کا تھوڑا سا عمیق مطالعہ بتاتا ہے کہ حالات کا یہ انتہا پسندانہ (ALL OR NONE FASHION) تجزیہ تاریخ انسانی، موجودہ حالات کے مزاج اور سماج انسانی کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ تاریخ کے اوراق وسیع پیمانے کی تباہ کاریوں اور ہنگامہ آرائیوں سے پُر ہیں لیکن یہ حالات نہ صرف یہ کہ تہذیبِ انسانی کا نام مٹانے میں ناکام رہے بلکہ اس کی ترقی اور تدریجی عمل کو بھی نہ روک سکے۔ یہ صحیح ہے کہ عالمگیر جنگوں سے سابقہ اسی صدی میں پڑا ہے لیکن جہاں اس کی تباہ کاریوں اور ستم آرائیوں نے مزید ہولناک عالمگیر جنگوں کا اندیشہ پیدا کر دیا ہے وہیں انہوں نے خود یورپی ممالک میں (جو کہ عالمی جنگ کا سبب بن سکتے ہیں) جنگ کے خلاف ایک شدید ردِ عمل پیدا کر دیا ہے۔ ہر چند کہ بڑی طاقتیں سیاسی طور پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں اور چھوٹے ممالک بھی سیاسی بلاکوں میں بٹ گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خود بڑی طاقتیں تک اپنے کو جنگ میں ملوث کرنے سے روک رہی ہیں۔ اس لیے کہ جنگ کے نتیجہ میں خود اندرونِ ملک جو سیاسی اور غیر سیاسی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان سے نمٹنا آسان نہیں ہے۔ اور یہ شکر کا مقام ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان مسائل اور حالات کا تجربہ کر چکی ہیں۔ لہٰذا مستقبل قریب میں اب اس کے امکانات بہت کم پائے جاتے ہیں کہ یہ طاقتیں خود سے پھر اس تاریخ کا اعادہ کریں جس کا مشاہدہ یہ صدی اس سے قبل کر چکی ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پیچیدگیاں اور مسائل کم ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں بلکہ زندگی کا مزاج ہی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی کے ساتھ ساتھ مسائل اور پیچیدگیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن زندگی کے ہر پہلو سے متعلق

اخذ کرنا کہ دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، غلط ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ معاشی، ثقافتی، سیاسی اور دیگر اغراض کی خاطر بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کو باہم متصادم کراتی رہتی ہیں۔

جہاں تک مثبت امکان یعنی عالمی سطح پر ایک اعلیٰ تہذیب کے ظہور کا سوال ہے یہ پہلے سے کہیں زیادہ بعید از قیاس ہے۔ خواہ جنگوں کے خلاف ردعمل ہو، یا سماجی اور انسانی علوم کا ارتقا مختلف اجتماعی نظریات کا عروج ہو یا سائنس کے جدید ترین انکشافات — یہ سب مل کر بھی انسان کے لیے ایک ایسے مشترک راستے کا تعین کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہے ہیں جو اس کے مختلف مسائل کا حل پیش کر سکے۔ چہ جائیکہ عالمی تہذیب جیسے مقصد کے امکانات کو قریب کر دے۔ جہاں تک ترقی کی راہوں پر آگے بڑھنے کا سوال ہے اس سے زمانہ کبھی باز نہیں رہا ہے اور نظر بھی یہی آتا ہے کہ یہ عمل بہرحال جاری رہے گا۔

ایک اور حقیقت جس کی طرف مقالہ نگار موصوف نے نشان دہی کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر بحران اقداری ڈھانچہ میں انتشار کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ توضیح ہے کہ اقداری ڈھانچہ میں انتشار کا نتیجہ بحران ہوتا ہے لیکن ہر بحران اقداری ڈھانچے کے انتشار ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اقدار کا غلط تعین بھی بحران کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام میں جس میں نیچے سے لیکر اوپر تک سرمایہ دار مزدور کا، زمیندار کسان کا امیر غریب کا اور بڑا چھوٹے کا خون چوستا ہے۔ بحران اقدار کے غلط تعین کے نتیجے میں واقع ہوتا ہے نہ کہ اس کے انتشار کے نتیجے میں۔ جہاں تک اقدار کے صحیح تعین کا سوال ہے۔ اس سلسلہ میں اشد ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ فطرتِ انسانی کا لحاظ رکھا جائے یعنی اقدار کا تعین نفسیاتِ انسانی کے عین مطابق ہو اور ساتھ ہی ساتھ کچھ طاقتور محرکات بھی ان سے قطعی طور سے وابستہ کر دیے جائیں تاکہ یہ محرکات سماج کو ان اقدار سے چمٹے رہنے اور ان پر مضبوطی سے جمے رہنے میں مدد دے سکیں۔

جہاں تک ان مفروضات کا تعلق ہے کہ ہر طرح کی تعلیمات قابلِ انتقال ہیں۔ ذہنی عمل، ثقافتی تبدیلی کا سبب بنتا ہے اور زندگی میں مقصدیت ضروری ہے۔ فی الواقع اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے بڑھ کر جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ارتقا اور مقاصد کا

یعنی محض فلسفیانہ تجزیے سے ممکن نہ ہو سکے گا۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے زمانے کا مطالعہ کرکے اس کے غیر معتدل مزاج کا اندازہ لگائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ایک ہے اور اس کے ذریعے ہم حالات کا واقعاتی تجزیہ بخوبی کر سکتے ہیں لیکن اس نکتے پر فاضل مقالہ نگار نے جو نقطہ نظر اپنایا ہے' بہت زیادہ محدود اور غیر حقیقی ہے۔ مقاصد اور اقدار کے تعین کے لیے صرف دورِ حاضر کے غیر معتدل مزاج کو سمجھنے کی تجویز پیش کی گئی ہے جو اگرچہ اپنی جگہ بہت اہم لیکن سطحی ہے

اس لیے کہ سیاسی یا غیر سیاسی بحران' غیر معمولی اور ہنگامی حالات اور پیچیدہ مسائل فوری طور پر اچانک معرض وجود میں نہیں آجاتے بلکہ یہ سب کچھ اہم بنیادوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مسائل سطحی اور وقتی نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کا تعلق بہت نیچے کی گہرائیوں سے دور تک ہوتا ہے ان کی ابتداء کچھ بنیادی یا ابتدائی غلطیوں کے سبب ہوتی ہے اور یہ رفتہ رفتہ جڑ پکڑ کر ایک انتہائی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں۔ بظاہر پھول اور پتیوں میں نقص نظر آتا ہے لیکن فی الواقع یا تو اس درخت کی جڑ میں کچھ نقص ہوتا ہے یا وہاں کی مٹی عیب دار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی شکل میں محض پھول پتیوں کی کانٹ چھانٹ نہ صرف یہ کہ محض تضیع اوقات ہوگی بلکہ اس درخت کے غیر مفید یا صالح عناصر پر یہ ظلم بھی ہوگا۔ اس طرح اس ظلم کا ردعمل ایک بھیانک شکل اختیار کرکے مزید بد تری کا باعث بن سکتا ہے۔ بالفرض تھوڑی دیر کے لیے اگر بات بھی لیا جائے کہ ان حالات کا بنیاد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ سب اپنی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ تجزیہ اور اس تجزیے کے بعد ان مسائل کے حل بہت زیادہ وقتی اور عارضی ثابت ہوں گے ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق ہمارے بعد کے زمانے یا دور سے نہیں ہو سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ اسی زمانے کا کچھ علاج کر سکتے ہیں۔

اور جیسا کہ ہمارا علم اور مشاہدہ ہے زمانہ بہر حال بدلتا رہتا ہے اس کے مزاج' اس کی ضروریات اور اس کے تقاضے بھی انقلاب پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے جہاں موجودہ زمانے نے کروٹ لی ہمارے تجزیے' ہمارے حل' ہماری اقدار اور ہمارے مقاصد ایک داستان پارینہ یا جزو تاریخ بن کر رہ جائیں گے اور اس کے بعد کے زمانے کو کچھ نہ دے سکیں گے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے تجربے اوران کے نتیجے میں سامنے آنے والی اقدار ایک مخصوص زمانہ تک ہی وابستہ نہ ہوں بلکہ زمانی ومکانی کی قید سے آزاد ہو کر ایک دوامی اور آفاقی نقطہ نظر کے حامل ہوں تاکہ وہ ہر خطہ اور ہر دور کے انسان کو اپیل کر سکیں اور مزید یہ کہ اس کے تجزیے نفسیات انسانی اور حقائق کائنات سے میل کھاتے ہوں تاکہ وہ مسائل کا حل بھی بخوبی پیش کر سکیں۔

ایسا ہی نقطہ نظر اسلام کا ہے۔ غیر معمولی حالات اور پیچیدہ مسائل کے سلسلے میں ان کے اسباب پر وہ ان الفاظ میں روشنی ڈالتا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ اللہ تعالیٰ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔

یعنی ان حالات کے لیے قسمت، فطرت اور زمانے کو لعن طعن کرنے کے بجائے وہ خود انسانوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ان میں مقصدیت کو بھی کارفرما بتلاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ شاید ان حالات سے سبق حاصل کر کے انسان اپنے رویوں میں تبدیلی کے لیے تیار ہو جائے لیکن وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش نہیں ہو جاتا کہ اب انسانیت پریشان ہوتی پھرے کہ آخر اپنے رویے میں کس طرح کی تبدیلی مقصود ہے اور کس طرح کے اعمال کو زندگی میں داخل کرنا ہے بلکہ اس کے بعد وہ علاج بھی تجویز کرتا ہے یعنی وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ کون سے رجحانات، رویے اور اعمال ہیں جو انسانی زندگی کو ان پریشانیوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں اسلام اپنے کو نکتۂ بحران پر مرکوز رکھنے یا محض غیر معمولی حالات پر متوجہ ہونے کے بجائے زندگی اور کائنات کے حقائق پر روشنی ڈالتا ہے اور پھر بتاتا ہے کہ زندگی اور کائنات کے یہ بنیادی حقائق ہی انسان کی صحیح راہ کا تعین کر سکتے ہیں اور ایسے رجحانات، رویوں اور اعمال کو جنم دے سکتے ہیں جو اسے تباہی کے راستوں سے بچا کر نجات اور امن کی راہیں فراہم کر دیں اس طرح ان مسائل کو اسلام ان بنیادی حقیقتوں سے جوڑ دیتا ہے تاکہ ان میں باہم یکسانیت پیدا ہو جائے جو کہ بذات خود ایک بہت صحیح بلکہ واحد حل طلب ہے۔

اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوگئی، بلکہ ایک طاقتور مدبر، منتظم، علیم اور حکیم ہستی نے اسے وجود بخشا ہے اور اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد کام کر رہا ہے۔ انسان اور اس کی نفسیات کو اسی صاحب علم ہستی نے بنایا ہے۔ زمانہ اور زندگی بھی اسی کی ملکیت ہے۔ مادی یا معنوی ہر موجود شے کا خالق وہی ہے لہٰذا وہ اور صرف وہی اشیاء کی حقیقت، اصلیت فطرت، مزاج اور نفسیات سے واقف ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس طریقے میں کس چیز کے لیے صلاح اور کس کے لیے فساد ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کے لیے بھی وہی تصور، وہی ڈھانچہ اور وہی راہ مناسب ہوگی جو اس ذات وحدہٗ لاشریک کی تجویز کردہ ہو اور اسی پر چل کر انسان امن سکون اور فلاح حاصل کر سکتا ہے۔

اور چونکہ وہ ماضی، حال اور مستقبل سب سے باخبر ہے لہٰذا وہ ہر زمانے کے معتدل اور غیر معتدل مزاج سے بھی بخوبی واقف ہے اور اسی طرح اس کی نظر میں ساری کائنات ہے۔ ہر جگہ کے حالات اس کے مزاج، اس کے تقاضے سب اس کے علم میں ہیں۔ لہٰذا اس کی بتائی ہوئی راہ زمان و مکان کی قید سے پاک ہوگی۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز جو اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وہ حیات بعد موت کا واضح، غیر مبہم اور صحیح تر تصور ہے جسے وہ محرک کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہ دنیا انتہا نہیں ہے بلکہ دار العمل ہے۔ موجودہ زندگی کی غایت آخرت کی زندگی ہے۔ موجودہ زندگی کا نتیجہ ایک دوسری زندگی میں برآمد ہوگا جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ انسانوں کے اچھے یا برے اعمال کا پورا پورا بدلہ اس دن اسے دیا جائے گا۔ اگر اعمال اچھے ہوں گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے عیش و آرام اور راحت و مسرت والی زندگی سے نوازا جائے گا جس کا دوسرا نام جنت ہے

لیکن اعمال اگر اس راہ کے مطابق نہ ہوئے تو ہمیشہ ہمیشہ کی تکلیف عذاب اور مصائب و شدائد والی زندگی سے اسے دوچار ہونا پڑے گا جسے ایک لفظ میں ہم جہنم کہتے ہیں۔

اب یہ جنت اور جہنم کا تصور غایت (GOAL) ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محرک عامل (MOTIVATING FACTOR) کی حیثیت سے بھی کام کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا رشتہ انسان کی طبعی ضروریات (PHYSIOLOGICAL NEEDS) سے جوڑ دیا گیا ہے اور یہ تصور انسان

کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ راہ راست پہ چلے اور برے راستے سے باز آجائے۔
اس کے نتیجے میں ایسا سماج وجود میں آتا ہے جس میں لوگوں کا مطمح نظر دنیا نہیں آخرت ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ کے بندے اور انسانوں کے خیر خواہ ہوتے ہیں، ان کا سماج استحصال سے پاک ہوتا ہے۔ ان کے ترقی کے سامان انسان کی تباہی کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔ ان کا معاشرہ فساد، فواحش، بے حیائی اور گندے افعال سے پاک ہوتا ہے۔ ان کے بین الاقوامی تعلقات میں کشیدگی کی بنیاد قومی افتخار، دولت کا زعم، ہوسِ توسیع پسندی، حرص اقتدار اور کمزوروں کو دبانا نہیں ہوتا۔ اور یہ سب اس لیے کہ ان کو اللہ کا خوف ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ انہیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور انہیں جہنم کا ڈر رہتا ہے۔
اس کے برعکس وہ دوسروں کے ہمدرد ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ظلم کرنے سے روکتے ہیں غریبوں اور کمزوروں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے سائنسی آلات تعمیر کے واسطے استعمال ہوتے ہیں ان کا معاشرہ امن، آشتی، صلاح، بھلائی، نیکی، حیا، پاک دامنی اور نصیحت و خیر خواہی کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بلکہ دوسری ملتوں کے جان و مال کا تحفظ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حسب نسب اور عہدے کے لحاظ سے فرق مراتب نہیں کیا جاتا۔ ان کا سربراہ سر کے نیچے اینٹ کا تکیہ رکھ کر چٹائی پر سو سکتا ہے اور ان کا ایک عام شہری بھرے مجمع میں امیر سے سوال کر کے جواب طلب کر سکتا ہے۔ ان کے بین الاقوامی تعلقات میں کشیدگی کی بنا صرف ایک ہوتی ہے اور وہ ہے باطل کے خلاف بغاوت۔ اور یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ جنت کا تصور ان کے سامنے ہے اور آخرت کی زندگی ان کا مقصد ہوتا ہے۔
لہٰذا اب سے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل کی تاریخ ایک ایسا سماج دیکھ چکی ہے جس کی تعمیر ان خطوط پر ہوئی تھی اور جہاں بحران، اخلاقی انتشار اور پراگندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگ امن و سکون سے رہتے تھے اور معاشی، سیاسی اور ثقافتی تناؤ کم از کم اس خطے سے ختم ہو چکا تھا۔
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف نظری اعتبار سے بلکہ عملاً اسلام، تاریخ میں اس حقیقت کو منکشف کر چکا ہے کہ بحران کا خاتمہ، امن کا حصول اور تناؤ سے نجات الٰہی میں ممکن ہے۔ وجہ یہی ہے کہ :۔

۱۔ وہ حالات کا سطحی جائزہ نہ لیکر ان کو بنیادی حقیقتوں سے جوڑ دیتا ہے۔

۲۔ اس کی بتائی ہوئی راہ نفسیاتِ انسانی کے مطابق ہے۔

۳۔ جنت، اور دوزخ کی شکل میں وہ زبردست محرکات انسان کو دیتا ہے جو اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں باہم مدد پہنچاتے ہیں

اب جہاں تک مجوزہ عالمی تہذیب کا سوال ہے اس میں

۱۔ اول تو حالات کا سطحی جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۔ عالمی تہذیب کا اصول نفسیات انسانی کے قطعی طور پر منافی ہے اس سلسلے میں اتنی بات عرض کر دینا کافی ہوگی کہ کمیونزم جو عالمی تہذیب کا داعی اور حامی ہے اور جس کا تذکرہ خود مقالہ نگار موصوف نے کیا ہے عالمی تہذیب کے امکان کو قریب کرنے میں پوری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ بلکہ کلمہ کمیونزم پر متفق ہونے کے باوجود روس اور چین کی کشیدگی دنیا کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہے۔

۳۔ اور تیسرے یہ کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کوئی مؤثر محرک نہیں تجویز کیا گیا ہے۔ مجوزہ عالمی تہذیب میں محرک کے طور پر جو چیز سامنے آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف نسلیں، تہذیبیں، قومیں اور ملتیں امن وسکون کے حصول کے مشترک مفاد کے لیے ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر متحد ہو جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک زبردست محرک کا کام انجام دے سکتا ہے لیکن یہ زندگی کے صرف ایک پہلو سے بحث کرتا ہے اور وہ ہے عقلی، منطقی یا تصوراتی، غیر عقلی پہلو کو جس میں جذبات اور طبیعی ضرورتیں سب ہی شامل ہیں، یہ قطعی نظر انداز کر دیتا ہے جبکہ خود مقالہ نگار موصوف واضح کر چکے ہیں کہ یہ پہلو بھی زندگی کا جزو لاینفک ہے اور اس سے بے خبر رہ کر ہم صحیح نتیجہ پر پہنچ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا انسانی زندگی کو متاثر کرنے والے غیر عقلی محرکات اس اصول پر اس درجہ غالب ہیں کہ اس کے اثر کو زائل کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ذریعے کی حیثیت سے تعلیم کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طرز فکر بہت بنیادی ہے کیونکہ داخلی اور بنیادی تبدیلی بغیر ذہنی تبدیلی کے ممکن نہیں ہے جس کے لیے تعلیم ہی بہترین اور واحد ذریعہ ہے بشرطیکہ ہم تعلیم کو محدود معنے میں استعمال نہ کر کے مہد سے لیکر لحد تک پیش آنے والے زندگی کے ہر اس مرحلے پر اس کا انطباق کریں جہاں انسان کچھ سیکھ سکتا ہو یا حاصل کر سکتا

ہو۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مطلوبہ مقصد کے تجزیے میں خود تعلیم بھی عقلی بنیادوں تک محدود رہنے کے بجائے انسان کی غیر عقلی یعنی طبیعی اور نفسیاتی بنیادوں کو بھی سامنے رکھے۔

لیکن تعلیم بھی محض تبدیلی اور استحکام کا آلہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک تربیت گاہ بھی ہے یعنی جہاں پر انسان کی شخصیت کا ارتقا ہوتا ہے۔ اب اگر تعلیم کو صرف ایسے اشخاص کی تیاری کے لیے استعمال کیا جاتا رہا جو کچھ مخصوص نظریات کی تبلیغ واشاعت کر سکیں تو شخصیت کا ارتقا آزادانہ اور خلاقانہ (CREATIVELY) طور پر نہ ہو سکے گا بلکہ شخصیت محض ایک آلہ کار بن کر رہ جائے گی اور یہ بات دنیا کو آگے بڑھانے میں مزاحمت کا کام کرے گی۔

اشارات کا ضمیمہ

سیّد احمد قادری

کاغذ کے انتظام میں تاخیر، الیکشن میں پریس کی مصروفیت اور بعض دوسرے وجوہ سے طلاق نمبر کی طباعت اور اس کی ترسیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اس کی وجہ سے آئندہ شمارے کی اشاعت بھی متاثر ہوئی۔ طلاق نمبر کو پوسٹ کرنے سے پہلے ہی مارچ کے شمارے کی کتابت مکمل ہوگئی تھی۔ لیکن وہ چھپ نہیں سکا۔ پرچے کو وقت پر لانے کے لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ مارچ اور اپریل کا مشترکہ شمارہ مارچ کے آخری ہفتے میں شائع کیا جائے۔ تاکہ مئی کے شمارے سے پرچے اپنے وقت پر شائع ہونے لگے۔ خدا کرے ہمیں اس میں کامیابی ہو۔

دنیائے اسلام سے متعلق تین ایسے واقعات ظہور میں آئے ہیں جن پر ہم بھی اپنے جذبات وخیالات تفصیل سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا موقع نہ مل سکا، اب بہت اجمال واختصار کے ساتھ یہ چند باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ مہینوں کی بھاگ دوڑ اور مسلسل کوششوں کے بعد اسرائیل کی فوجیں نہر سوئز کے مغربی کنارے اور شہر سوئز سے واپس ہوگئی ہیں۔ ان کی واپسی عرب ممالک کے اتحاد اور تیل کے ہتھیار کا ثمرہ ہے۔ مصر کی فوجی کمان نے مغربی کنارے سے جو غفلت برتی تھی اس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا اور مصر پہلے سے زیادہ نازک صورت حال سے دوچار ہوگیا تھا۔ اگر عرب ممالک متحد ہوکر تیل کا ہتھیار استعمال نہ کرتے تو مصر کو شدید خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ یہ تیل کا ہتھیار تھا جس نے امریکہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے پالتو اسرائیل کو مغربی کنارے سے ہٹائے۔

دوسرا اہم واقعہ لاہور میں اسلامی ممالک کی چوٹی کانفرنس کا انعقاد ہے۔ بلاشبہ یہ نہایت خوش آئند واقعہ ہے اور ہم اس کو مسلمانوں کے روشن مستقبل کا ایک دلکش نشان قرار دے سکتے ہیں۔

خدا کرے اسلامی ممالک کا یہ اتحاد مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے اور ان کا یہ اتحاد دنیا بھر کے لئے رحمت ثابت ہو۔ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی جیسی کچھ بھی رہی ہو اور جیسی کچھ بھی ہو، ان کا یہ کارنامہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اچھا کارنامہ سمجھا جائے گا اور وہ اس کوشش کے لئے قابل مبارک باد سمجھے جائیں گے۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے۔ مسٹر بھٹو کی ہوشیاری کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے اس کے لئے بہت مناسب وقت تجویز کیا اور اپنی پشت پر تمام اسلامی ممالک کو کھڑا کر لیا۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے بنگلہ دیش بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اس لئے وہ پہلے دن سے اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھے لیکن پاکستان کے عوام و خواص کا ایک مؤثر طبقہ اس کے لئے تیار نہ تھا اور وہ اس کو ٹالتے جا رہے تھے۔ جو لوگ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان کی رائے صحیح نہ تھی اگر پہلے ہی اس کو تسلیم کر لیا جاتا تو اب تک بہت سے مسائل طے ہو چکے ہوتے۔ ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کئے جانے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں اتحاد و اتفاق کی تازہ اور خوش گوار فضا تیار ہو اور ان تینوں ملکوں کے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں۔

ایک گمنام ملک عُمانْ

تلخیص :- محمد حسان خان تاجکی بی اے لیبیا یونیورسٹی

عَمان (عین کے زبر کے ساتھ) جو اردن کی راجدھانی ہے۔ بہت معروف و مشہور لیکن عُمان (عین کے پیش کے ساتھ) بہت ہی گمنام ملک ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سعودی عرب عمان کے شمال میں واقع ہے اور جنوب میں بحیرۂ عرب ہے۔ مغرب میں جنوبی یمن ہے اور مشرق میں خلیج فارس واقع ہے۔

عمان کی مساحت ایک اندازہ کے مطابق ۸۲ ہزار مربع میل ہے۔ دوسرے اندازے کے مطابق ایک لاکھ ۱۲ ہزار مربع میل ہے۔

پہلے اس سلطنت کا نام سلطنت عمان و مسقط تھا لیکن نئے بادشاہ قابوس بن سعید نے اس کا پرانا نام (عمان) لوٹا دیا۔ اس لمبی چوڑی سرزمین میں صرف دس لاکھ کی آبادی ہے۔ ۹۵ فی صدی آبادی ناخواندہ ہے۔ عام آبادی کا پیشہ زراعت ہے کھجور، نیبو اور کیلے کی کثرت سے زراعت ہوتی ہے لیکن زراعت بہت ہی پرانے طریقوں سے ہوتی ہے اور صنعت تو بالکل معدوم ہے۔ تمام چیزیں بیرونی ممالک سے آتی ہیں اور ملک میں کچھ بھی نہیں بنتا۔

عمان کی راجدھانی ۱۷۸۴ء سے مسقط کا شہر ساحل پر واقع ہے اس کے شمال جنوب اور مغرب میں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ ہے اور یہی پہاڑوں کا سلسلہ سمندر کے اندر تک چلا گیا ہے۔

مسقط اور خلیج مسقط کا منظر بلا شبہ بہت ہی عجیب و غریب اور مسحور کن ہے۔ مسقط میں مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں۔ وہاں عمانی رہتے ہیں۔ جو وہاں کے اصلی باشندے ہیں اور دوسرے ہندوستانی ہیں وہ سب بنیے ہیں۔ بمبئی سے عمان تجارت کی غرض سے آئے ہیں۔ وہ سب عمانی شہروں میں تجارت کرتے ہیں اور دوسرے حیدرآباد کے لوگ ہیں جو آغا خان کے پیرو ہیں۔ وہ بنیوں سے مختلف ہیں۔

کیونکہ وہ عربوں سے گھل مل گئے ہیں۔ عربی بولتے عربی لباس پہنتے ہیں۔ مسقط والوں کی زبان عجیب و غریب ہے اس لیے کہ عربی زبان میں اردو، بلوچی، انگریزی کے الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ یہ زبان اتنی عجیب ہے کہ اس کا نام ہم مسقطی ہی رکھ سکتے ہیں۔

حکومت کا سرکاری مذہب اباضی ہے۔ اباضی مذہب بہت پرانا مذہب ہے۔ امام علیؓ اور معاویہ کے اختلاف کے بعد پیدا ہوا۔ اباضی مذہب کے لوگ قرآن اور حدیث کی نصوص کے پابند ہیں۔ قیاس اور اجماع کو حرام سمجھتے ہیں۔

اباضی مذہب چھوٹی عمر میں شادی کو جائز قرار دیتا ہے لیکن ان دونوں کو اختیار ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح کو باقی رکھیں یا توڑ دیں۔ عمانی لوگ داڑھی کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں۔ کہتے ہیں کہ آدمی داڑھی کے بغیر آدمی نہیں۔ لیکن داڑھی مونڈنا یہ جدید تہذیب کا تحفہ ہے اس لیے عمان کے وزیر عدل نے فرمایا۔ داڑھی بڑھانا بہت پرانی عربی عادت ہے جس کو اسلام نے بھی پسند فرمایا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ داڑھی کو نہ چھوا جائے نہ برابر کیا جائے۔ لیکن اب یہاں بعض لوگ داڑھی کو بنانے سنوارنے لگے ہیں۔ عمان کا سکہ ۱۹۶۶ء تک ہندوستان کا روپیہ تھا۔ لیکن وہاں نیا سکہ بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ۱۹۶۶ء سے سعیدی ریال چلنے لگا ہے۔ اس کی قیمت اسٹرلنگ پونڈ کے برابر ہے۔ ۱۸ روپے ایک ریال میں ایک ہزار پیسے ہوتے ہیں۔

عمان کی تعلیمی حالت

تعلیم کی حالت عمان میں بہت گری ہوئی تھی۔ پرانے بادشاہ کے زمانے میں صرف دو پرائمری اسکول تھے۔ ایک مسقط میں دوسرا مطرح میں۔ ان میں کل ۶۰۰ لڑکے زیر تعلیم تھے لیکن نئے بادشاہ کے تخت نشینی کے کل سات ماہ بعد طلبہ کی تعداد بڑھ کر ۵۰۰۰ ہو گئی۔ ہر طرف مدرسے کھل رہے ہیں اور پرانی مسجدوں میں بھی مدرسے کھولے جا رہے ہیں۔

ملک کا سیاسی نظام

پرانی تاریخ کے بارے میں کم معلومات ہیں اس لیے کہ عمان کی کوئی مرتب تاریخ نہیں ہے ... ۴۰۰ سال قبل پرتگالیوں نے بہت سخت جنگ کے بعد عمان پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن عمانیوں نے آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی بالآخر ڈیڑھ سو سال بعد عمان مستعمرین کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔

وہاں کے بادشاہ کا نام سعید بن تیمور تھا۔ اس بادشاہ نے ۳۸ سال حکومت کی لیکن یہ بادشاہ

بڑا ہی غریب الخیال اور مستقل مزاجی سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اس کو ہر وقت یہ خوف مسلط تھا کہ اس کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس نے پورے ملک کو ایک جیل خانے میں تبدیل کر دیا تھا اور بہت زبردست ڈکٹیٹر شپ قائم کر لی اور اہل وقت کو جاہل باقی رکھنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی آپ سنکر حیرت نہ کیجیے کہ دس لاکھ کی آبادی کے ملک میں صرف دو پرائمری اسکول تھے۔

لوگوں کے علاج کی کوئی فکر دامنگیر نہ تھی۔ عوام کے بے حد اصرار پر بہت ہی مشکل سے ایک ہندوستانی طبیب عمان بلایا گیا۔ اور وہ ایسا طبیب باتدبیر نکلا کہ لاکھوں اشخاص کو موت کے گھاٹ اتارنے کے باوجود بھی طب نہ سیکھ سکا ان ہی وجوہ کی بنا پر ملک میں دو بغاوتیں بھی ہو چکی تھیں۔ اہل وطن بادشاہ سے سخت نفرت کرتے تھے لیکن اس کا دبدبہ ان پر مسلط تھا۔

اس نے ۳۸ سال صرف ٹیلیفون کے ذریعے حکومت کی۔ جی ہاں صرف ٹیلیفون کے ذریعہ۔ وہ اس طرح کہ وہ شہر کے قلعہ میں رہتا تھا جو دارالحکومت مسقط سے ۹۰۰ کلومیٹر دور ہے اور بغیر کسی سے ملے وہ ٹیلیفون کے ذریعے احکام صادر کرتا۔ وزارتیں بنواتا اور توڑتا اور اس نے جاسوسی کا اس قدر اچھا نظام قائم کر رکھا تھا کہ کوئی سازش کارگر نہ ہوتی تھی وہ بہت عقلمند اور پڑھا لکھا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شخص جب اس کے پاس جاتا تو وہ سمجھتا کہ سب کچھ پالیا ہے اور جب وہ محل سے نکلتا تو لگتا کہ اس کے ہاتھ خالی ہیں۔

جب سلطان اپنے ظلم و جور میں حد سے گذر گیا تو عوام نے بیزار ہو کر بغاوت کر دی اور یہ بغاوت کامیاب رہی اور یہ بھی حسن اتفاق کہ اس بغاوت کا ہیرو اس کا بڑا بیٹا تھا۔

وہ اس طرح کہ ۲۳ جولائی ۱۹۷۰ء کی صبح کو سلطان کے بیٹے قابوس بن سعید دس آدمیوں کو لیکر شہر صلالہ کے محل پہنچا اور تھوڑی مڈبھیڑ کے بعد سلطان نے معزولیت کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ وہ خوف و اندیشہ میں مبتلا ہو کر انگلینڈ چلا گیا اور اس طرح ایک بہت بڑے خونی عہد کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد سے اس ملک کا نیا اور شاندار عہد شروع ہو چکا ہے اور یہ ملک کامیابی و کامرانی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس نئے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ قابوس بن سعید نے بادشاہ کے تین انگریزی ایڈوائزر کو ملک بدر کر دیا۔ کیونکہ حقیقۃً وہی تمام برائیوں کا سرچشمہ — اور خونی عہد کا نشان تھے۔

رسائل و مسائل

کسی کی جائداد پر قبضہ غاصبانہ گناہ کبیرہ ہے

خط

زید نے سائیکل کی ایک دکان کھولی اور اس دکان پر اپنی بہن کے ایک پوتا عمرو کو تنخواہ دار معاون کی حیثیت سے رکھا اپنی زندگی میں وہ اس سے دکان کا حساب کتاب لیتے رہے۔ زید کے ایک لڑکے بکر تھے۔ اچانک زید کا انتقال ہو گیا اس کے بعد بکر اپنے والد کی دکان کا حساب کتاب لیتے رہے لیکن اتفاق یہ کہ چھ ماہ کے بعد بکر کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ اپنے پیچھے تین نابالغ اولاد چھوڑ گئے۔ کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا کہ عمرو سے دکان کا حساب کتاب لیتا جب بکر کی اولاد بالغ ہوئی تو اس نے حساب کتاب لینا چاہا لیکن عمرو نے صاف انکار کیا اور اس دکان کا خود مالک بن بیٹھا۔ چونکہ بکر کی اولاد کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہے اس لیے وہ عمرو کو دکان سے ہٹا نہیں سکتے۔ عمرو نے اسی ناجائز کمائی سے اس سال حج بھی کیا ہے۔ از روئے شرع جواب مرحمت فرمایئے کہ:۔

۱۔ جائداد کے وارث بکر کے لڑکے ہیں یا عمرو ہے؟
۲۔ یتیم اور بیوہ کی جائداد ہڑپ کرنے کے عوض قیامت میں عمرو کو کس قسم کی سزا ملیگی؟
۳۔ عمرو کا حج صحیح ہوا یا نہیں؟

جواب

۱۔ از روئے شرع اس دکان کے وارث بکر کے لڑکے ہیں۔ زید کے ترکے میں از روئے شرع عمرو کا

کوئی حصہ نہیں ہے۔

۲۔ غاصبانہ قبضے کی سزا بہت سخت ہوگی۔ دوزخ میں کس قسم کا عذاب دیا جائے گا لیکن وہ سزا بہت سخت ہوگی۔

۳۔ اگر عمرو نے غاصبانہ کمائی سے حج کیا ہے تو وہ حج مقبول نہ ہوگا۔

وہاں کے ذی اثر لوگوں سے مدد لیجیے اور عمرو کو سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ اللہ کا واسطہ دیجیے اور عذاب آخرت سے ڈرائیے شاید اس پر اثر ہو اور وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائے ورنہ صرف فتویٰ لینے سے کام نہیں چلے گا۔

غائبانہ نماز جنازہ

خط

گزارش ہے کہ یہاں نماز جنازہ غائبانہ پڑھنے کے لیے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا بعض لوگ کہتے تھے کہ غائبانہ نماز جنازہ مسنون ہے اور بعض کہتے تھے کہ جائز نہیں ہے۔ مہربانی کرکے اس کا مفصل جواب دیجیے۔

جواب

غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز جنازہ غائبانہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ امام شافعی اور دوسرے ائمہ کے نزدیک نماز جنازہ غائبانہ پڑھی جا سکتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی (جو مسلمان ہو گئے تھے) کا جب انتقال ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے غائبانہ ان کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ امام شافعی اور دوسرے لوگ اسی حدیث کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ حنفی فقہاء اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حضورؐ کی خصوصیت تھی اور بادشاہ حبشہ کی بھی خصوصیت تھی۔ حضورؐ نے غائبانہ نماز جنازہ کا نہ کوئی حکم دیا ہے اور نہ تو بادشاہ نجاشی کے علاوہ کسی اور کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی ہے حالانکہ متعدد صحابہ کرام نے دوسرے مقام پر وفات پائی تھی لیکن حضورؐ نے ان کی نماز جنازہ غائبانہ

نہیں پڑھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی عام حکم نہیں ہے۔ ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس وقت بادشاہ حبشہ کا انتقال ہوا تھا اس وقت وہاں اسلامی طریقے پر نماز جنازہ ادا کرنے والے لوگ موجود نہ تھے اس لیے حضورؐ نے غائبانہ ان کی نماز جنازہ پڑھی ہوگی لیکن یہ کوئی لڑنے جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔ اگر کچھ لوگ کسی کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھنی چاہتے ہوں تو ان کا ہاتھ پکڑ لینا صحیح نہیں ہے۔ البتہ جس شخص کا یہ خیال ہو کہ غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے وہ اس میں شریک نہ ہو۔

کیا مسجد کے اندر نماز جنازہ جائز ہے؟

سوال

بعض لوگ مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے کو ناجائز کہتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ آپ کی تحقیق کیا ہے؟ مہربانی کر کے مطلع کیجیے۔

جواب

جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے۔ نماز جنازہ ادا ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفی مسلک یہ ہے کہ مسجد کے اندر جنازہ رکھ کر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ امام ترمذی نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام مالک کا مسلک بھی یہی تھا کہ میت پر مسجد کے اندر نماز نہ پڑھی جائے لیکن خود امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ مسجد کے اندر نماز جنازہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس مسئلے میں چونکہ حدیثیں مختلف ہیں اس لیے فقہاء کے مسلکوں میں بھی اختلاف ہے۔ بعض ائمہ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں جس میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھی ہے اور فقہ حنفی میں ان حدیثوں کو ترجیح دی گئی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر نماز جنازہ پڑھنے سے اس کا ثواب کم ہو جاتا ہے۔ لیکن فقہاء کے درمیان یہ اختلاف جواز و عدم جواز کا نہیں ہے۔ بلکہ کراہت و عدم کراہت کا ہے۔ یعنی بعض ائمہ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے اور بعض کے نزدیک کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

تنقید و تبصرہ

جادۂ اعتدال عبدالمغنی شعبۂ انگریزی بی این کالج پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ۔ ناشر:۔ کتاب منزل۔ سبزی باغ پٹنہ ۴ (بہار) صفحات ۴۴۰ قیمت دس روپے

پروفیسر عبدالمغنی کو اللہ تعالیٰ نے شش جہت علمی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ بہت اچھے محرر ہی نہیں کامیاب مقرر بھی ہیں۔ انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون سے پہلے انھوں نے فارسی بھی پڑھی ہے اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے عربی زبان اور علوم دینیہ کی سند بھی حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اردو ادب پر جو دسترس حاصل ہے وہ ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی جنھوں نے فارسی اور عربی زبانیں باضابطہ نہیں پڑھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی تنقیدوں میں وہ اجنبیت، ابہام اور اغلاق نہیں ہے جو ان لوگوں کی تنقیدوں میں پایا جاتا ہے جنھوں نے صرف انگریزی زبان و ادب کی خوشہ چینی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حیات و کائنات کے بارے میں وہ صحیح اور سچا نقطہ نظر رکھتے ہیں اور اسی نقطہ نظر نے ان کو جادۂ اعتدال تک پہنچا دیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ان کے ۱۲ تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ سات سال پہلے ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "نقطہ نظر" شائع ہوا تھا اور ماہنامہ زندگی اکتوبر ۶۵ء کے شمارے میں اس پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ جیسے جیسے ان کی عمر، مطالعہ اور تجربہ بڑھتا جا رہا ہے ویسے ویسے ان کی تنقیدوں میں گہرائی، بصیرت اور ان کی عبارتوں میں روانی اور حسن بڑھتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے حسن رقم زور قلم اور زیادہ۔

زیر تبصرہ کتاب کے تنقیدی مقالات نے ایک طرف شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ اور تنقید

طنز نگاری اور تنقید نگاری کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے اور دوسری طرف فاضل تنقید نگار نے جدید ادبی مسائل اور "اسلامی ادب" پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ادب کے بارے میں ان کا جو نقطہ نظر ہے اس کا یہ منطقی تقاضا ہے کہ مختلف اصناف ادب پر تنقید کے لیے ان کے سامنے کوئی اصول ہو انھوں نے دیباچے میں خود اس پر روشنی ڈالی ہے۔

"میرا تصور تنقید یہ ہے کہ زندگی اور ادب دونوں کو اپنی جگہ ایک کل اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سمجھ کر پارۂ فن کا تجزیہ و تبصرہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ فن کے تمام عناصر و لوازم کی پوری تصویر ابھرے اور ساتھ ہی ادب و زندگی کی اصلیت و عظمت کی قدریں نکھریں اور سنوریں۔ اس اسلوب تنقید کو میں "اخلاقی" کہتا ہوں اور اس کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ زندگی اور ادب دونوں کی سالمیت اور ہم آہنگی کا ضامن ہے۔ یہ دونوں کا پورا تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں جسم و روح اور فکر و فن دونوں کا کامل توازن پایا جاتا ہے۔ یہ ایک جادۂ اعتدال ہے اور اس معیار کامل پر دوسرے تمام اسالیب کی نیم صداقتوں کو بھی خام مواد اور وسائل کار کے طور پر جمع کر لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہ محور و مرکز اخلاقی تصور ہو اور باقی تمام تصورات اس کے ماتحت نقطے اور زاویے ہوں۔ اگر اس ترتیب سے کام لیا جائے تو اخلاقی تنقید کی جامعیت، اقتصادیات، نفسیات، جمالیات، تاثرات وغیرہ سبھی کو ان کی متعینہ حدود میں رکھ کر ان کا صحیح استعمال کر سکتی ہے۔ اس طرح ادب کے مطالعے کے لیے ہمیں ایک ایسا ترکیبی انداز میسر آ سکتا ہے جو زندگی اور فن کی تمام کڑیوں کو سمیٹ اور سمو کر مسرت و بصیرت کا ایک آفتاب تازہ تخلیق کر سکتا ہے۔"

اس اصول اور تنقیدی نقطۂ نظر کو وہ اپنی تنقیدوں میں پوری طرح برت سکے ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ پڑھنے والے کریں گے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی حد تک اس کو ملحوظ رکھا ہے۔

"اسلامی ادب کی حقیقت" کے عنوان سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ "اسلامی ادیب" اس پر غور کریں یہاں اتنا اشارہ نامناسب نہیں ہے کہ "اسلامی ادب" کا عنوان اختیار کرنے اور "ادارۂ ادب اسلامی" کی تنظیم کرنے کا پس منظر اگر فاضل مقالہ نگار کے سامنے ہوتا تو اس پر اتنی تیز تنقید نہ کرتے۔

پروفیسر عبدالمغنی بھی بجا طور پر اقبال کی شاعری کو عالمی ادب کا اعلیٰ نمونہ اور اسلامی ادب
لیے ایک آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ موجودہ دور کے ممتاز اردو شعراء کی شاعری کو وہ "شعر اقبال" کی کسوٹی
تے اور اسی نسبت سے اس کی قدر و قیمت مقرر کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اقبال
ترسیل خیال کا کون سا نہج اختیار کیا ہے؟ اشاروں کنایوں میں بات کہنے کا یا راست انداز
ن کا؟ وہ فیض کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فیض کے اظہار کی یہ ربودگی اور نزاکت اس تغزل کی آئینہ دار ہے جو ان کے کلام کی
بنیادی خصوصیت ہے۔ غزل ہو یا نظم دونوں ہیئتوں میں فیض ایک عاشق کی حیا و حجاب
کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ اظہار مدعا میں وا شگاف نہیں ہوتے۔ بڑی رازداری سے بولتے
ہیں، اشاروں کنایوں سے اپنا مطلب واضح کرتے ہیں۔ ترسیل خیال کے اس نہج نے فیض
کو اقبال کے بعد دوسرا اہم ترین شاعر بنا دیا ہے۔" (ص ۱۰۶-۱۰۷)

میرا کلام اقبال کا جو حقیر مطالعہ ہے اس کی بنا پر یہ کہنا محل نظر ہے کہ انھوں نے ترسیل خیال
پیغام رسانی کے لیے جو نہج اختیار کیا ہے وہ اشاروں کنایوں کا نہج ہے۔ اشاروں کنایوں میں
کرنا ایک الگ چیز ہے اور کسی واضح بات کے لیے استعارہ کنایہ استعمال کرنا بالکل دوسری چیز ہے
ال نے اپنے کلام کے اس حصے میں جس کو ہم 'اسلامی' تحریکی اور پیمبرانہ کہتے ہیں۔ بات اشاروں
ایوں میں نہیں کہی ہے بلکہ پوری راست بیانی سے کام لیا ہے البتہ اپنی واضح بات کے لیے بکثرت
تعارے کنایے اور تلمیحات استعمال کی ہیں۔ مثلاً وطن پرستی پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بات "صاف شفاف" ہے لیکن اس کے لیے انھوں نے "پیرہن" اور "کفن" کا استعارہ استعمال
ا ہے۔ فاضل نعت نے "کلام اقبال کی اشاریت" میں لکھا ہے:۔

اقبال کی فکر بلاشبہہ راست انداز ہے مگر ان کا فن سراسر ایمائی ہے جس کے وسائل اظہار
بیشتر رمز و کنایہ پر مشتمل ہیں۔ (ص ۲۹۳)

یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ راست انداز بیان اور ایمائیت و اشاریت
اور ترسیل خیال کے نہج کی قسمیں ہیں، فکر اور نظریے کی نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے فن کو "سراسر ایمائی"

کہنا سراسر مبالغہ آرائی ہے۔ تبصرہ طویل ہوجائے گا ورنہ میں اقبال کے بیسیوں اشعار پیش کرتا جن پر "ایمائیت" کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے۔ خود فاضل نقاد نے "اقبال کی انسان دوستی" کے مقالہ میں جو اشعار پیش کیے ہیں ان میں کتنے ہی ایسے ہیں جنہیں "ایمائیت" چھو بھی نہیں گئی ہے۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود   اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی   اخوت کی جہاں گیری محبت کی فراوانی

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو   اخوت کا بیاں ہوجا محبت کی زباں ہوجا

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی   کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام   وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

کیا ان اشعار میں کوئی "ایمائیت" پائی جاتی ہے؟ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں ایمائیت بھی پائی جاتی ہے اور راست انداز بھی اور جہاں تک کلام اقبال کے اس حصے کا تعلق ہے جس میں انھوں نے مغربی تہذیب اور تباہ کن نظریات پر تنقید کی ہے اور اسلام کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ بیشتر راست انداز بیان ہی میں ہے۔ اقبال نے جب یہ کہا تھا کہ:-

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں   اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

تو اس سے مراد ان کے کلام کا اسلامی تحریکی اور تنقیدی حصہ ہے اور جب انھوں نے کہا تھا

حدیث خلوتیاں جز برمز و ایما نیست

تو اس سے مراد یا تو ان کے کلام کا فلسفیانہ و متصوفانہ حصہ ہے یا "خلوتی" انھوں نے ان لوگوں کو کہا ہے جن کے کلام میں کوئی پیغام عام نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنے مخصوص حلقے کے لیے کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان کی شاعری تو سب کے سامنے موجود ہے اور وہی اس بات پر شاہد عدل ہے کہ ان کے کلام کا کون سا اور کتنا حصہ

من بگفتا یہ گفتہ ام

کا مصداق ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کلام اقبال ہی نہیں، کوئی بھی تحریکی اور پیغمبرانہ کلام "سراسر ایمائی" نہیں ہوسکتا اور جو کلام "سراسر ایمائی" ہے وہ تحریکی اور پیغمبرانہ ہرگز نہیں ہے۔

میں پروفیسر عبد المغنی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنا یہ قیمتی مجموعہ مقالات مجھے بھیجا جو میرے لیے مسرت و بصیرت کا تحفہ ثابت ہوا۔ میرا مشورہ ہے کہ ادب اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے اسلامی شاعروں اور دوسرے اہل فکر و نظر لوگوں کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اس کتاب سے ترقی پسند اور جدیدیت کے مریض ادیبوں اور شاعروں کا بوکھلا جانا خلاف توقع نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں کو اسے ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے۔

اخیر میں اس طرف بھی اشارہ کرنا مناسب ہو کہ اس کی کتابت و طباعت ان مقالات کے شایانِ شان نہیں ہے۔ کیا پٹنہ میں اچھی کتابت و طباعت کا اب تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا ہے۔

مدیر محمد جاوید اختر صفحات ۸۰ کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

میزان ملنے کا پتہ:۔ حلقۂ طلبا اسلامی۔ رمنہ روڈ۔ پٹنہ ۴۰۰۰ ۸۰ (بہار)

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب امیر جماعت اسلامی ہند حلقہ بہار کی سرپرستی میں حلقہ طلبۂ اسلامی بہار کا یہ تیسرا سالانہ آرگن میزان ہے جو شائع ہوا ہے اور جناب جاوید اختر نے اس کو مرتب کیا ہے۔ جاوید صاحب اور حلقہ طلبۂ اسلامی بہار کے دوسرے کارکن مبارک باد کے لائق ہیں کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے نظم و نثر کا ایک ایسا گلدستہ پیش کرنے کی کوشش میں کامیابی حاصل کی جو خوش رنگ بھی ہے اور خوشبو بھی۔ میں نے اس کا بڑا حصہ پڑھا ہے اور مسرت حاصل کی ہے۔ حلقہ طلبۂ اسلامی کے سکریٹری جنرل نے اس حلقے کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ صاحب کو ان کی کوششوں کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ ان کے انداز تربیت ان کی جاذب شخصیت اور مسلسل محنت نے طلبہ کا ایک ایسا گروپ تیار کر دیا ہے جو تربیتی اور تنظیمی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے ما شاء اللہ تعالیٰ۔ ان جوانوں کو حوادث روزگار کی زد سے بچائے اور یہ قافلہ اسلام کی سیدھی راہ پر آگے ہی بڑھتا چلا جائے۔

اس رسالے میں پیغامات بھی ہیں، انٹرویو بھی ہے۔ ٹھوس مضامین بھی ہیں، طنز و مزاح بھی ہے۔ افسانے بھی ہیں اور شعر و نغمہ بھی ہے اور جو کچھ ہے پڑھنے کے لائق ہے۔ سب سے آخر میں ناظم حلقہ طلبہ اسلامی ایمانی فراست سے اپنے رفقاء کے لیے جو اہم ہدایتیں ہیں امید ہے کہ ان کے رفقاء اس پر ضرور دھیان دیں گے۔ بحیثیت مجموعی میزان کا یہ تازہ شمارہ اس لائق ہے کہ طلبہ کے حلقے میں اسے پھیلایا جائے۔

تبصرہ ختم کرتے ہوئے اپنے تجربے کی بنا پر حقیر مشورہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ فی الحال ماہنامے اور ہفت روزہ کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور پوری کوشش اپنی تنظیم کو ہر لحاظ سے مستحکم بنانے پر صرف کرنی چاہیے۔ ابھی سالانہ میزان بھی کافی نہ

حیات سلیمان

شاہ معین الدین احمد ندوی۔ صفحات ۷۴۰۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ — قیمت ۲۰ روپے۔ ناشر:۔ دار المصنفین اعظم گڑھ یوپی۔

بڑے انتظار کے بعد یہ کتاب پریس سے باہر آئی اور دیر آید درست آید کی مصداق بن گئی۔ جن لوگوں نے "حیات شبلی" پڑھی ہے وہ محسوس کریں گے کہ اس کتاب میں وہی طرز و نہج اختیار کیا گیا ہے۔ دار المصنفین سے "معارف" کے اجراء کے بعد علامہ سید سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے تمام علمی و عملی کارناموں کا تذکرہ اس کے "شذرات" میں پھیلا ہوا ہے۔ "نقوش سلیمانی" سید صاحب کی صرف ایک کتاب ہی کا نام نہیں، بلکہ معارف کے تمام "شذرات" نقوش سلیمانی ہیں۔ ان پھیلے ہوئے نقوش کو ترتیب و تشریح کے ساتھ سمیٹ دیجیے، سید صاحب کے علمی و عملی خد و خال سامنے آجائیں گے۔ لیکن یہ ہر شخص کا کام نہ تھا اس کے لیے شاہ معین الدین احمد ندوی کی ضرورت تھی اور محترم شاہ صاحب نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دے دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

علامہ سید سلیمان ندوی جیسے اشخاص و افراد کے سوانح حیات کسی فرد واحد کے سوانح حیات نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک عہد کی تاریخ ہوتے ہیں۔ "حیات سلیمان" پڑھیے۔ اس آئینے میں ماضی قریب کے نصف صدی کا عکس آپ دیکھیں گے اور قدرتی طور پر مسلمانان ہند کی تصویر اس آئینے میں زیادہ نمایاں اور واضح نظر آئے گی

فہرست مضامین کو ملا کر تقریباً ساڑھے سات سو صفحات کی یہ کتاب ایک مقدمہ، نو ابواب، مرتب کی گئی ہے۔ آخر میں نظمیں اور تاریخی قطعات اور ایک ضمیمہ ہے۔ اس ضمیمے میں معارف کے چند شذرات الگ سے نقل کیے گئے ہیں۔ مقدمہ میں فاضل مرتب نے اپنے مآخذ کی نشان دہی کی ہے اور کتاب کی ترتیب کے بارے میں لکھا ہے:۔

> کتاب کی ترتیب کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ مذہبی علمی تعلیمی، قومی و ملی اور سیاسی کاموں کو الگ الگ ابواب میں لکھا جاتا اس میں دشواری یہ تھی کہ ان میں بیشتر کام ایک دوسرے سے اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ ان کو جدا کرنا مشکل تھا اس صورت میں الگ الگ

لکھنے میں واقعات کی تکرار کا اندیشہ تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ سنین کی ترتیب کے ساتھ لکھا جائے اس میں سارے حالات آجاتے تھے اور کوئی دشواری بھی پیدا نہیں ہوتی تھی اس لیے یہی شکل اختیار کی گئی۔ (مقدمہ ص ۶)

اس کتاب کے ابواب یہ ہیں :۔

باب اول۔ وطن، خاندان اور تعلیم ۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۷ء — باب دوم۔ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۴ء باب سوم۔ دارالمصنفین کا قیام اور اس کے کاموں کا آغاز ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء — باب چہارم ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۶ء قومی و سیاسی خدمات — باب پنجم۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۴ء۔ باب ششم ۱۹۳۴ تا ۱۹۴۷ء۔ باب ہفتم۔ قیام بھوپال ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۰ء۔ باب ہشتم۔ ہجرت اور قیام پاکستان ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۳ء باب نہم۔ ذاتی حالات — ان ابواب کے بعد سید صاحب کی وفات پر ہند و پاک میں جو مرثیے لکھے گئے تھے ان کی کچھ منتخب نظمیں اور تاریخی قطعات ہیں۔ اس کے بعد ضمیمہ ہے۔

تبصرہ نگار کے نزدیک یہ کتاب مسلمانان ہند کے لیے بالخصوص اور تمام مسلمانوں کے لیے بالعموم نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ اس وقت مسلمانان ہند کے سامنے کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں ہے جو سید صاحب کے زمانے میں نہ رہا ہو اور جس کا حل سید صاحب نے نہ بتایا ہو۔ ضمنی اور فرعی مسئلے تو اور بھی ہیں لیکن مسلمانوں کے بنیادی مسائل ان کے ایمان، انفرادیت، تشخص، تاریخ، معاشرتی احکام و اقدار اور اردو زبان کی حفاظت کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل سید صاحب کے زمانے میں بھی موجود تھے اور وہ برابر اپنے ترو تازہ اور پُرزور قلم سے ان کا صحیح حل بتاتے رہتے تھے۔ معارف کے شذرات میں ان کی جو ہدایتیں اور تعلیمات پھیلی ہوئی ہیں اور جن کا بڑا حصہ اس کتاب میں سمٹ آیا ہے وہ مسلمانوں کے لیے بہت قیمتی اور اس لائق ہیں کہ وہ ان پر دھیان دیں اور عمل کریں۔

سید صاحب اپنے علم و فضل اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے ہندوستان کی چند گنی چنی شخصیتوں میں ایک ایسی شخصیت تھے جن کے علم سے علامہ اقبال بھی استفادہ کرنا ضروری سمجھتے تھے اور جن کے اخلاق و کردار کا احترام ہر حلقے میں کیا جاتا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی بعض شاخوں میں مہارت رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لیکن ایسے اشخاص جو علوم و فنون کا مخزن بن جائیں بہت کم ہوتے ہیں۔ سید صاحب ایسے ہی اعاظم رجال میں ایک رجل عظیم تھے۔ ان کی تصانیف ان کی جامعیت پر شاہد ہیں

ہیں۔ سیرت النبی ان کے دینی علوم کا شاہکار ہے اور اس کی حیثیت تعلیمات نبوی کے دائرۃ المعارف کی ہے۔ عربی زبان بیان کو اتنی قدرت حاصل تھی جو کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ فارسی زبان پر بھی انہیں ماہرانہ قدرت تھی۔ عرب ملک اور افغانستان و ایران بھی ان سے واقف اور ان کے قدرداں ہیں

انھوں نے جن حالات میں (جن کا ذکر اس کتاب میں ہے) پاکستان کا سفر کیا اور پھر وہیں رہ گئے اسے ہجرت کہنا تو صحیح نہیں ہے' البتہ یہ واقعہ ہے کہ وہ پاکستان کے شہری ہو گئے تھے۔ آخیر عمر کے چند سال انھوں نے پاکستان میں گزارے اور کراچی کو ان کے آخری آرام گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اور باغ و لینہ کی زمین ان کی آخری خواب گاہ بننے سے محروم ہو گئی۔ (وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ)

'حیات سلیمان' کا مطالعہ ان لوگوں کو بھی کرنا چاہیے جو تحریک اقامت دین کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو ان کی زندگی کا جو مقصد بتایا ہے اور حقیقی ترقی کے لیے جو تعلیم انہیں دی ہے مختصر طور پر اس کو رجوع الی الاسلام اور اقامت دین ہی کہا جا سکتا ہے اور ایک جگہ تو صراحۃً "اقامت دین" کی اصطلاح استعمال کر کے اپنی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> جب تک ہمارا مقصود اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین نہ ہو گا اور اسی کے لیے اٹھنا اور بیٹھنا اور مرنا اور جینا نہ ہو گا۔ ہم اسی طرح ممبریوں اور وزارتوں اور لیڈری کے لیے آپس میں لڑتے رہتے اور کٹتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم نے اپنا مقصد انہی شخصی اعزازات اور اسی جاہ و منصب کے حصول کو بنا رکھا ہے اور اسی کا نام ہم نے اسلامی ترقی رکھ چھوڑا ہے۔
>
> ضرورت ہے کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلام کی سیاسیات' اسلامی اقتصادیات اسلامی طریق تجارت اور اسلامی اصول مضاربت (یعنی سرمایہ و محنت کے تعاون) اسلامی طریق کارخانہ داری' کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق' اسلامی لین دین اور معاملات کے مسائل اور دیگر ضروری امور زندگی کے متعلق خالص اسلامی حل کو لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو اور مسلمان بنکر دنیا میں ظاہر ہوں۔

اگر کسی شخص کو معلوم نہ ہو کہ یہ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریر ہے تو اس کو جماعت اسلامی کے کسی شخص کی تحریر قرار دے گا۔ اسلام کے بارے میں سید صاحب کا جو تصور تھا اس کی ایک جھ

یل کی تحریر میں دیکھیے :-

اسلام وہ مذہب ہے کہ جس دن وہ دین بنا اسی دن وہ سیاست بھی تھا اس کا منبر اس کا تخت، اس کی مسجد اس کی عدالت، اس کی توحید نمرودوں، فرعونوں، قیصروں اور کسراؤں کی شہنشاہیوں کو مٹانے کا پیغام تھی۔ صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کی پوری زندگیاں ان مرقعوں سے بھری ہوئی ہیں وہی اسلام کی سچی تصویریں ہیں اور جب تک علماء، علماء رہے وہی ان کا اسوہ تھا آج جب ہم پھر نئے سرے سے اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں اور پچھلی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم اس نقش قدم پر چلیں جو ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

سید صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک دینی مرکز پر جمع کرنا چاہتے تھے اور ۱۹۲۶ء میں اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے جمعیۃ علمائے ہند کو یہ مشورہ دیا تھا:-

حضرات! دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کریں۔ ہمارے خیالات و اعمال میں جو ایک طوائف الملوکی پیدا ہے وہ دور ہو۔ حالت یہ ہے کہ ہم کو مذہبی، تعلیمی، سیاسی، اقتصادی، اصلاحی، تبلیغی، ہر قسم کی ضرورتیں ہیں اور ان ضرورتوں کے لیے ہم نے الگ الگ انجمنیں قائم کر لی ہیں جن میں روزانہ تصادم رہتا ہے اور ہر ایک کی ایک سے نالاں ہے اور ہر ایک اپنی مرکزیت کے لیے کوشاں ہے ...... ہم کو ضرورت ہے کہ ہم پھر اپنی ملت و قومیت اور تنظیم کی اپنی سیزدہ صد سالہ بنیاد پر قائم کریں اور اصلی جماعت اسلامیہ بنیں تاکہ دشمنوں کے مقابلہ میں قوت کا ثبوت دے سکیں۔ (ص ۴۰۔ ۲۴۱)

آج سے ۴۸ سال پہلے جمعیۃ علمائے ہند کو جو مشورہ دیا گیا تھا اگر وہ قبول کر لیتی اور اپنے آپ کو سیزدہ صد سالہ بنیاد پر منظم کر کے اصلی جماعت اسلامیہ بنا لیتی تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ یقیناً اس سے مختلف ہوتی جو آج ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی دین و دنیا اور دینی و دنیوی تعلیم کی تفریق کو سب سے بڑا فتنہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے [illegible] میں کہا تھا۔

برادران من! آج مسلمانوں میں سب سے بڑا فتنہ دین و دنیا کی تفریق کا پیدا ہے۔ اسلام نے اس تفرقہ کو مٹا دیا تھا لیکن اب وہ تفرقہ خود اسی کے اندر آ کے پڑ گیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ علوم و مدارس کی بھی دو قسمیں ہو گئی ہیں۔ دینی اور دنیاوی۔ حالانکہ ان کی ایک ہی قسم ہے اور وہ دینی ہے۔ بہر حال اب ہم

مشکل میں گرفتار ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اس سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سید صاحب نے اس سے نکلنے کی کچھ تدبیریں بھی بتائی ہیں۔ افسوس ہو کہ مسلمانوں نے اس سب سے بڑے فتنے کو ختم کرنے کے لیے جد و جہد نہیں کی۔ بہر حال یہ ہیں حیات سلیمان کے وہ اسباق جن سے ہندوستان کے مسلمان کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب میں بعض جزوی باتیں اصلاح طلب نظر آئیں۔ باب اول ص پر پٹنہ سے دلینہ کا فاصلہ ۹ میل لکھا ہے حالانکہ دونوں کے درمیان فاصلہ ۹ میل سے بہت زیادہ ہے۔ ص کے حاشیہ میں مولانا شاہ محی الدین کو امیر شریعت اول بہار لکھا گیا ہے حالانکہ امیر شریعت اول بہار ان کے والد ماجد حضرت مولانا بدرالدین رح تھے ص کے حاشیہ میں ایک جملہ یہ ہے "ان کے دامن سے بہت سے علماء تعلیم پاکر نکلے"۔ میرا خیال ہے کہ دامن کے بجائے کوئی اور لفظ ہو گا۔ تبصرہ نگار کو اس کتاب میں ایک کمی بھی محسوس ہوئی۔ فاضل مرتب نے جو ترتیب اختیار کی ہے اس کے ساتھ بھی اس میں کوئی دشواری نہ تھی کہ سید صاحب کی تصانیف پر الگ سے ایک (خواہ مختصر ہی سہی) اس کتاب میں جگہ پاتا۔ اس وقت عدیت حال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ سید صاحب کی کتنی تصانیف کن کن موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں تو اس کو پوری کتاب پڑھنی پڑے گی۔ پھر بھی تمام تصانیف کا علم نہیں ہو سکے گا۔ آئندہ اڈیشن میں اگر یہ کمی پوری کر دی جائے تو اچھا ہے۔ فہرست مضامین میں انڈکس کا ذکر موجود ہے لیکن انڈکس نہیں ہے۔

حیات سلیمان اس لائق ہے کہ ہر اردو لائبریری میں موجود رہے اور عوام و خواص سبھی اس سے استفادہ کریں۔

اعلان ملکیت ماہنامہ زندگی

دیگر تفصیلات فارم IV رول نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت دفتر زندگی رام پور ۲۔ مدت اشاعت ماہانہ

۳۔۴ طابع و ناشر احمد حسن وطنیت ہندوستانی: بازار کلاں رام پور

۵۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ وطنیت ہندوستانی۔ پتہ گھیر سیف الدین خاں رام پور

۶۔ مالک دعوت ٹرسٹ دہلی ۶

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں۔

احمد حسن

اقامتِ دین کا داعی

ماہنامہ

زندگی

رامپور

فی پرچہ
ایک روپیہ بیس پیسے

سالانہ
روپے

ماہنامہ

زندگی

(مدیر:- سید احمد قادری)

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	-/12
پاکستان سے	-/12
ششماہی	
ہندوستان سے	-/6
پاکستان سے	-/6
قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ	

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

جلد:- ۵۲ | ربیع الآخر ۱۳۹۴ھ مطابق مئی ۱۹۷۴ء | شمارہ:- ۵

اشارات	سید احمد قادری	۲
مقالات		
انسان ہدایت الٰہی کا محتاج ہے	جناب سلطان احمد صاحب	۹
وسطی کیرلا کے اجتماع میں قیم جماعت کی افتتاحی تقریر	جناب افضل حسین صاحب	۲۱
عصر حاضر میں تحریک اسلامی	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب	۲۹
رسائل و مسائل		
غیر مسلم میت کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں اور عمل صالح کے لیے ایمان شرط لازم ہے	سید احمد قادری	۴۳
اخبار و افکار		
زندگی عذاب اور شہر قتل گاہ	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۴۸
مسلم تنظیموں کی عالمی کانفرنس	سید احمد قادری	۴۹
تنقید و تبصرہ	ع - ق	۵۱

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر زندگی، رام پور - یوپی

مالک: دعوت ٹرسٹ دہلی ۶ ایڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس رام پور یوپی۔ مقام اشاعت دفتر زندگی رام پور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب نے ابھی حال میں اہل ملک سے عموماً اور مسلمانان ہند اور رفقائے جماعت اسلامی ہند سے خصوصاً ایک اپیل کیا تھا جو ۲۵ر مارچ ۷۴ء کے سہ روزہ دعوت دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ ہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اخبارات کے صفحات میں بھی شائع کر رہے ہیں اور آخر میں مختصراً اپنے کچھ خیالات بھی پیش کریں گے۔

"گجرات سے جو طوفان اٹھا تھا وہ اب بہار کو بھی اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور نہیں کہا جا سکتا ابھی اس کی یہ تباہ کاریاں کیا رنگ اختیار کرنے والی ہیں۔ اس دلگیر صورت حال نے ہر حساس اور دردمند دل کو مضطرب کر رکھا ہے، ہر طرف ایک بے چارگی کا سا عالم طاری ہے اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس طوفان بلا کا منہ موڑ دے۔

ہمارے اہل ملک کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کا ثمرہ ہے۔ یہ اسباب و نتائج کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی حادثہ بلا وجہ ظہور میں نہیں آتا۔ اس عالم کے پیدا کرنے والے کی یہی سنت رہی ہے کہ جو بویا جائے گا وہی کاٹنے کو ملے گا۔ اس وقت ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پچھلے ۲۶ برسوں میں یہاں جس زہریلی فصل کی تخم ریزی اور آبیاری کی گئی تھی وہ اب پک کر تیار ہو چکی ہے۔ ہمارے ملک اور سماج کے معماروں نے اپنی اس نوخیز مملکت کی تعمیر کا جو نقشہ بنایا تھا وہ سرتاسر مادیت، خدا فراموشی اور دینی و اخلاقی اقدار سے بے نیازی پر مبنی تھا۔ اس نقشے کے مطابق وہ یہاں تیزی کے ساتھ ایک ایسا خود غرض اور فرض ناشناس سماج تشکیل دیتے رہے جس کے ارباب اقتدار بدعنوان جس کی انتظامیہ بد دیانت، جس کے سیاسی لیڈر خلوص اور بلند نگاہی سے محروم، جس کے تاجر ملاوٹ، چوربازاری،

۔خیر، انتہا پسندی اور گراں فروشی کے ماہر جن کے صحافی اغراض کے پجاری اور جن کے نوجوان اخلاقی تربیت اور ضبط و تحمل سے ناآشنا ہیں جو ایسے ایسے حکمرانوں، سیاست دانوں، صحافیوں، تاجروں اور نوجوانوں کا مجموعہ بن گیا ہو، نہیں بلکہ بنا دیا گیا ہو، اس کا حشر اگر وہ ہو رہا ہے جو آج دیکھنے میں آ رہا ہے تو یہ نہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ توقع کے خلاف۔

اس تاریکی کو دیکھ کر جو ہر طرف چھاتی چلی جا رہی ہے قدرتی طور پر مایوسی ہونے لگتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ مایوسی بجائے خود ایک خطرناک بیماری ہے اس لیے حالات کی شدت کے باوجود مایوس نہیں بلکہ ان سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر حالات کا مقابلہ کرنے اور انہیں درست کرنے کے لیے فکر و عمل کا صحیح رخ اختیار کر لیا جائے تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خدا کی رحمت سے پورا یقین ہے کہ اگر ہم نے اپنے طرز عمل سے اپنے کو اس کی توجہ کا مستحق بنا لیا تو موجودہ حالات بدل کر رہیں گے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مرض کی صحیح تشخیص کر لی جائے اور پھر اس کے علاج کی صحیح کوشش شروع کر دی جائے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی کہ ہماری آنکھیں اب بھی نہ کھلیں۔ ملک میں جن لوگوں کا بھی ضمیر زندہ ہو اور جو اس کا درد رکھتے ہوں انہیں اس تشخیص اور علاج کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں پر ہونے کے اپنے منصب و مقام کی بنا پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کا انہیں لازماً احساس ہونا چاہیے تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ خود شناسی کی دولت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ چنانچہ وہ یا تو خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں یا خود بھی حالات کے موجودہ دھارے میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے دین و ایمان کا یہ اولین تقاضا تھا کہ وہ ہر قسم کے شر کے ازالے اور خیر کے قیام کے لیے کوشاں رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا ملک جس طرح آج اس نوبت کو نہ پہنچ گیا ہوتا۔ کیونکہ اس وقت ملک جن محرومیوں، ناانصافیوں اور مصیبتوں سے دوچار ہے ان کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہماری اجتماعی زندگی میں برائیاں سیلاب کی طرح امنڈی اور خیر کی قدریں سمٹتی اور مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ اس صورت حال کو مسلمانوں کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھنا چاہیے تھا لیکن ان کی اور پورے ملک کی یہ بدنصیبی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بلند تر اور وسیع تر نصب العین فراموش کر کے اپنے کو چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا لیا ہے اور ان کی جو بھی تگ و دو ہوتی ہے وہ عموماً انہیں خطوط پر ہوتی ہے جن پر انسانیت کے راہ بھٹکے قافلے چلے جا رہے ہیں

جماعت اسلامی کی آواز

جماعت اسلامی ہند کی آواز کمزور رہی مگر اس کی پہلے دن سے یہ کوشش رہی ہے کہ اہل ملک صالح افکار و اعمال کی طرف آئیں۔ بالخصوص مسلمان اپنا منصبی فریضہ یاد کریں اور اس ملک میں روشنی کا ایک مینار بن کر آئیں جس کی روشنی تمام بھٹکے ہوئے مسافروں کو صحیح منزل کا صحیح پتہ بتا سکے۔ اپنی اس دعوت کے لیے لوگوں کے سامنے عام

انداز ہی نہیں رکھے بلکہ صحیح کاموں کا ایک نقشہ بھی پیش کیا اور خیر پسند حضرات کے تعاون سے اپنے مقدور بھر ان میں رنگ بھرنے کی کوشش بھی کی۔ افسوس ہے کہ اس کی باتوں کے لیے بہت کم کان کھل سکے اور اس کے پیش کیے ہوئے نقشۂ کار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نہ اب تک اس کام میں انہیں کوئی خاص تعاون مل سکا۔

اس سلسلے میں مجھے اپنے ساتھیوں کی بھی کوتاہی کا احساس اور افسوس ہے کیونکہ اس کے لیے جس لگن اور جوش عمل کی ضرورت تھی اس کی ہم میں کمی رہی۔ بہرحال ہم سب کو اپنے ادائے فرض کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور جو جہاں بھی ہے اسے اپنے دائرہ کار میں صورت حال کی اصلاح کے لیے فرض شناسی کا ثبوت دینا چاہیے۔ ہمارے تاجروں، کاشتکاروں، کاریگروں، ملازموں، اخبار نویسوں، دانشوروں اور لیڈروں غرض عوام و خواص سبھی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اس طرح ڈھال لیں کہ لوگوں کے لیے حق و صلاح کا نمونہ بن سکیں۔ چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، کرپشن، خود غرضی، فرض ناشناسی، انتقام، نفرت اور جھنجلاہٹ کی اس فضا میں انہیں دیانت، امانت، فرض شناسی اور انسانیت دوستی کا نشان بننا چاہیے۔

جماعت اسلامی کے رفقاء کو خاص طور پر محسوس کرنا چاہیے کہ موجودہ صورت حال ان سے خصوصی جدوجہد کا مطالبہ کر رہی ہے۔ بلاشبہ اس وقت ملکی حالات بڑی پیچیدگی اختیار کر گئے ہیں۔ ایک طرف ناکارہ و بددیانت سرکار ہے دوسری طرف طالع آزما سیاست داں، تیسری طرف مصیبتوں میں گرفتار عوام۔ ایک طرف جبر و استبداد ہے، دوسری طرف صورت حال سے فائدہ اٹھانے والے غرض مند لیڈر، تیسری طرف مظلوموں کی مایوسی اور ان کا اشتعال۔ لیکن اگر حکمت محبت اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے ہمارے رفقاء ان مسائل کو حل کرنے کے لیے منضبط رائے عامہ تیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ کسی نہ کسی حد تک موجودہ کشمکش کو صحیح رخ ضرور دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں جو فوری طور پر تدابیر اختیار کرنی چاہیے وہ درج ذیل ہیں۔

کرنے کے کام

۱۔ اپنے مقام کے مسلم و غیر مسلم خیر پسندوں اور تعمیری ذہن رکھنے والوں کو جمع کریں اور ان کے مشورے سے کوئی ایسا منصوبہ بنائیں جس سے عوام کی شکایات بھی دور ہوں اور تشدد کی روپر بھی روک لگ سکے۔

۲۔ وہ اپنی بستی کے سنجیدہ اور بااثر لوگوں کو لیکر مقامی تاجروں سے ملیں اور ان کو اس پر آمادہ کریں کہ ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی کے قریب نہ جائیں اور اگر ان کے پاس ذخیرے موجود ہوں تو اسے باہر لائیں۔ اس سے عوام کی مصیبتیں کم ہوں گی اور خود ان تاجروں کا مفاد بھی اسی شکل میں محفوظ رہ سکے گا۔ ورنہ قوی اندیشہ ہے کہ وہ عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جائیں گے۔

۳۔ پبلک جلسے کر کے عوام کو بتایا جائے کہ یہ سب کچھ بے خدا، بدکردار، خود غرض اور مادی سیاست کے کرشمے

پھیلی ہیں۔ اس کا علاج نہ تو یہ ہے کہ املاک کو نذرِ آتش کیا جائے اور نہ یہ کہ حکومت کرنے والے ہاتھ بدل دیے جائیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ ذہن بدلے جائیں اور اپنی اور سماج دونوں کی اصلاح کی جائے۔

۴۔ جہاں کہیں بھی موقع مل جائے اربابِ اقتدار سے بھی ملاقاتیں کی جائیں اور اس بات کی طرف انہیں متوجہ کیا جائے کہ وہ اب تک کی روش کو بدل دیں اور اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کریں اور باشندگانِ ملک کے جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے کے لیے پوری فرض شناسی اخلاص اور محنت کا ثبوت دیں۔

۵۔ جہاں تک جماعت کے متوسلین کا خود اپنا تعلق ہے انہیں عمل کے ہر میدان میں ایک مثالی نمونہ بننا چاہیے اور ان کے رویے میں ان غلط کاریوں کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیے جنھوں نے آج ملک کی یہ حالت بنا رکھی ہے۔

اقتدار کے خواہشمندوں اور جاہ و دولت کے طلب گاروں نے ہمارے ملک کو جس جہنم میں ڈھکیل دیا ہے اس سے اس کو نکالنے کی بنیادی تدبیر یہی ہے کہ خدا کے وہ بندے جو دولت و اقتدار کی خواہشوں سے بلند ہیں اور محض خدا کی رضا کے لیے خدا کے بندوں کی اصلاح اور خدمت کا عزم رکھتے ہیں وہ اٹھیں اور ملک کا رخ تخریب و تشدد کی طرف سے تعمیر و ترقی کی طرف پھیر دیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمارے ملک کو مشکلات مصائب سے نجات بخشے۔ آمین!

محترم قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند نے اپنی اپیل کی تمہید میں یہ جو کہا ہے کہ "ہر طرف بے چارگی کا سا عالم طاری ہے اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس طوفانِ بلا کا منہ موڑ دے" تو اس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب لوگ بچشم سر اس کو دیکھ رہے ہیں۔ حکومت ہر طرح کے جتن کر رہی ہے لیکن تشدد اور لاقانونیت کا جو سیلاب امنڈ رہا ہے اس کا منہ موڑ دینے پر وہ قادر نہیں رہی ہے۔ نہ پولس کی فائرنگ کام آرہی ہے اور نہ فوج ہی تشدد کی اس رو کو بند کر دینے پر قدرت پا رہی ہے۔ حکومت کے سربراہوں اور حکمراں پارٹی کے لیڈروں کی اپیلیں اور بیانات بھی فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی اچھا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ۳۰ مارچ ۸۴ء کو صدر کانگریس ڈاکٹر شرما نے ایک سمینار میں جو کچھ کہا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے:۔

نئی دہلی ۳۰ مارچ ۸۴ء صدر کانگریس ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے آج انتباہ دیا کہ آج ملک میں خونیں انقلاب کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ اگر سماج کا معاشی ڈھانچہ نہ بدلا گیا۔ یوتھ کانسٹیٹوشن گروپ کی طرف سے "تشدد کا بدلتے موضوع" پر ایک سمینار میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر شرما نے کہا کہ ایک ریاست کے بعد دوسری ریاست میں تشدد کے پھوٹ پڑنے کے پس پشت کوئی سازش

کارفرما ضرور ہے بالخصوص لوٹ، مار اور آتش زنی کے واقعات میں جس مہارت کا ثبوت دیا گیا ہے وہ معنی خیز ہے۔

(قومی آواز، لکھنؤ، یکم اپریل ۱۹۷۸ء)

ہم اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ لوٹ مار اور آتش زنی میں جس "مہارت" کی شکایت کی جارہی ہے وہ حاصل کس طرح ہوئی؟ کسی چیز میں مہارت مشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس مہارت کا ثبوت دے رہے ہیں انھوں نے یہ مہارت کہاں اور کس پر مشق کرکے حاصل کی؟ ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ یہ مہارت انھوں نے اپنے اسی ملک ہندوستان میں مسلمانوں پر مشق کرکے حاصل کی ہے۔ آج حکمراں پارٹی کے لیڈر علانیہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس تشدد، مار دھاڑ اور لوٹ پھونک میں آر ایس ایس اور جن سنگھ کا ہاتھ ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو پھر ہم نے جو بات یاد دلائی ہے اس میں کیا شبہہ باقی رہتا ہے؟ اب گجرات اس مہارت کا پہلا نشانہ بنا ہے اور پھر بہار کا نمبر آیا ہے۔ یہ دونوں وہ ریاستیں ہیں جن میں مسلمانوں پر اس کی اچھی خاصی مشق کی جاچکی ہے۔ جس زمانے میں یہ مشق کی جارہی تھی اس زمانے کے مسلمان اخبارات و رسائل نکال کر دیکھے جاسکتے ہیں کہ مسلمان اہل علم حکومت کو یہ توجہ دلاتے رہے ہیں کہ اس مشق کی چھوٹ نہیں دینی چاہیے ورنہ آگے چل کر اس مشق کے دائرے میں وہ لوگ بھی آسکتے ہیں جو آج اس کو نظر انداز کر رہے ہیں لیکن اس انتباہ کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا اور اب اس مہارت کا شکار پٹنہ کا قدیم اور مشہور اخبار سرچ لائٹ بھی بنا ہے۔ بہار کے مسلمان بھولے نہ ہوں گے کہ ۱۹۴۶ء میں نواکھالی میں ہندوؤں پر مظالم کا بہانہ بنا کر سرچ لائٹ نے کیا رول ادا کیا تھا اور اس کے نتیجے میں وہاں کے مسلمانوں پر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔ علیہ کو آلۂ کار بنانے کی بات بھی نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔

مولانا صدرالدین صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہمارے اہل ملک کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے "اس وقت ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پچھلے ۲۶ برسوں میں یہاں جس زہریلی فصل کی تخم ریزی اور آبیاری کی گئی تھی وہ اب پک کر تیار ہو چکی ہے" ــــ لیکن حکمراں پارٹی کے کرتا دھرتا لیڈروں کے جو بیانات آرہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی غلطیوں کا کوئی احساس نہیں ہے وہ اس ہمہ گیر تشدد کا سارا الزام مخالف پارٹیوں اور بعض بیرونی طاقتوں پر ڈال کر اپنی معصومیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ صدر کانگریس نے تو اپنے اس بیان میں جس کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس ملک میں خونی انقلاب آجانے کی دھمکی بھی دی ہے حالانکہ ان جیسے ذمہ دار شخص کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ مخالف پارٹیوں کے رویے پر اتنی جھنجلاہٹ مناسب نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مخالف پارٹیوں کے پاس کوئی بہتر تعمیری پروگرام نہیں ہے اور ان کے سامنے

بسے بڑا ہدف یہ ہے کہ حکمراں پارٹی کو شکست دے
جلئے۔ ظاہر ہے کہ "گاؤ آمد و خر رفت" کے چکر سے
ملک کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

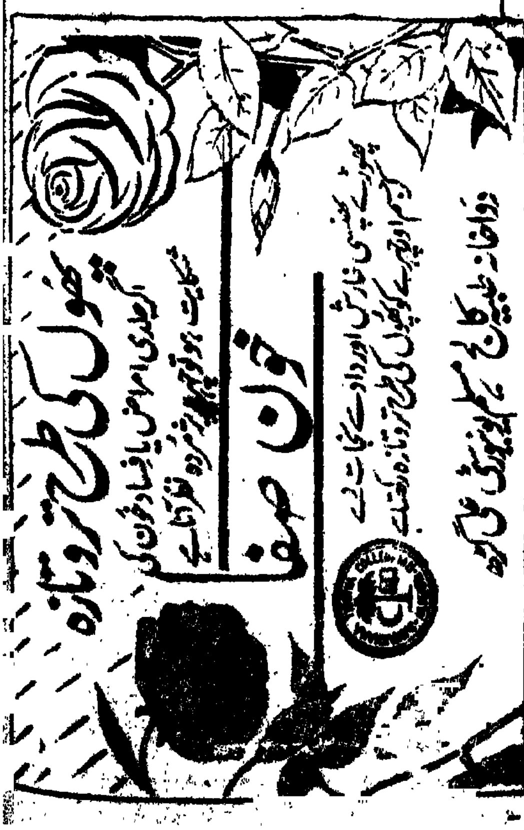
تشدد، لوٹ مار قتل، آتش زنی اور لاقانونیت کو
ت اسلامی ہند محض کسی دنیوی مصلحت کی بنا پر نہیں
اپنے عقیدے کی بنا پر سخت ناپسند کرتی ہے اور اس کو
ائی قابل مذمت اور قابل نفرت شئے سمجھتی ہے اس
اپنے قیام کے پہلے دن سے مقاصد کے حصول کے لیے
ن ذرائع اور آئینی جد وجہد کو اپنی پالیسی کی شرط لازم
ر دے رکھا ہے۔ اس لیے تشدد کے موجودہ طوفان
سے جس درجے میں اس جماعت کو اضطراب ہو سکتا ہے
شاید حکمراں پارٹی کو بھی نہ ہوگا۔ جماعت اسلامی کے
م کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ اس ملک کی تعمیر صالح اوکار
ال کی بنیاد پر کی جائے۔ وہ اہل ملک کو بالعموم اور
لمانوں کو بالخصوص اسی کی دعوت دیتی آرہی ہے
لن افسوس کہ اس کی کمزور آواز پر بہت کم لوگوں نے
یان دیا اور جنھوں نے کچھ توجہ کی وہ اپنے آپ کو
ں کے مطابق ڈھالنے میں ناکام رہے۔

قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند نے رفقائے جماعت
یہ جو خصوصی اپیل کی ہے اور جو پانچ نکاتی پروگرام ان کے
امنے پیش کیا ہے ان پر ہم سب کو عمل کرنا چاہیے خصوصًا
لتہ ۳ میں جو بات انھوں نے کہی ہے وہ ہمارے لیے
سب سے زیادہ اہم ہے۔ اپنا کڑا احتساب کرکے ہمیں اس
کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان غلط کاریوں کا کوئی شائبہ ہمارے
اندر تو نہیں پایا جاتا جنھوں نے آج ملک کی یہ حالت بنا رکھی
ہے۔ جن غلط کاریوں نے ملک کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ان میں
سب سے بڑی غلط کاری یہ ہے کہ اس دنیا کا عیش و
آرام جس طریقے سے بھی ممکن ہو حاصل کیا جائے خواہ وہ
طریقہ مذہبی، قانونی اور اخلاقی طور پر صحیح ہو یا غلط —
اس غلط کاری کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا دھبہ بھی ہمارے
دامن پر پڑ گیا ہو تو اس کو توبہ و استغفار کے پانی سے دھوکر
صاف کر دینا چاہیے اور ہمیں عملًا یہ ثابت کرنا چاہیے کہ ہم محض
خدا کی رضا کے لیے خدا کے بندوں کی اصلاح اور خدمت کا
عزم رکھتے ہیں۔ یہ بڑا کام اسی وقت ٹھیک انجام پا سکتا ہے
جب خود ہمارے اعمال، ہمارے برتاؤ اور ہمارے کاروبار
میں اخلاقی طور پر بھی کوئی غلط نظریہ شامل نہ ہو۔

نکتہ ۳ میں جو بات کہی گئی ہے وہ دراصل اشارہ ہے اس
کام کی طرف جس کے لیے جماعت اسلامی عالم وجود میں آئی تھی
اس وقت ہمارے ملک اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں
تشدد اور جارحیت کی جو وبا آئی ہوئی ہے وہ بلاشبہ نتیجہ
بد کردار، خود غرض اور مادی سیاست کا وبال ہے۔ یہی
گندی سیاست ہے جس کے ابال نے ہر اس شخص کو پریشان
کر رکھا ہے جس میں انسانیت کی کوئی رمق باقی ہے ظاہر
ہے کہ جب تک باخدا، باکردار، ایثار پسند اور اخلاقی ستھرے

اس کی جگہ نہ لے لے۔ جزوی اور سطحی تدبیریں سطحی اور جزوی فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ بیماری کی جڑ ان سے نہیں کٹ سکتی۔ ذہن و قلب کی حقیقی تبدیلی کے بغیر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کے اعمال و افعال درست ہو جائیں۔ اللہ کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب یہ بات کہی تھی کہ انسان کے جسم میں ایک ایسی چیز ہے کہ جب وہ درست ہو جاتی ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور وہ چیز انسان کا ذہن و قلب ہے تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار فرمایا تھا جس پر انسان کی عقل بھی گواہ ہے اور پوری انسانی تاریخ بھی اس کی شاہد ہے۔ جماعت اسلامی اصلاً اسی کام کے لیے بنائی گئی ہے کہ وہ انسانوں کے بگڑے ہوئے ذہن و قلب کو درست کرنے کی جد و جہد کرے۔ کیونکہ اس کے بغیر اللہ کا بھیجا ہوا نظام عدل و قسط نہ ہندوستان میں قائم ہو سکتا ہے اور نہ دنیا کے کسی اور ملک میں، اور جب تک یہ نظام قائم نہ ہو امن چین، سکون، خوش حالی، فارغ البالی اور انسانیت و اخلاق کی بحالی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان، غذا، لباس، مکان، علاج اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کیلئے حد ضرورت مند ہے اور ان ضرورتوں کی تکمیل میں انسانوں اور انسانوں کے درمیان عظیم تفاوت پایا جا رہا ہے اور اس تفاوت نے ایک بحران کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن سوال تو یہی ہے کہ یہ عظیم تفاوت اور اس پر مبنی یہ ہولناک بحران ختم کیسے ہو۔ مادی سیاست اسے ختم کرنے کی جو تدبیر اختیار کرتی ہے وہ الٹی پڑتی ہے۔ اس صورت حال میں کیا یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی علت کیا ہے؟ اور کیا یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس مادی سیاست کے بجائے کوئی ایسی اخلاقی و روحانی سیاست موجود ہے یا نہیں، جو ہر انسان کو دوسرے انسانوں کا حقیقی ہمدرد اور سچا بہی خواہ بنا دے۔ جماعت اسلامی لوگوں میں یہی "سوچ" پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ لوگوں کے سامنے ایک ایسی سیاست بھی پیش کرتی ہے جو موجود ہے، جو موجود تھی اور جو موجود رہے گی۔ جس نے ماضی میں اپنا شاندار اور کامیاب رول ادا کیا ہے اور آج بھی ادا کر سکتی ہے۔



انسان ہدایتِ الٰہی کا محتاج ہے

(آخری قسط)

جناب سلطان احمد صاحب (ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند علی گڑھ)

(اس مقالے کی پہلی قسط دسمبر ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔)

۳۔ تجربہ

اخذ ہدایت کے تعلق سے تیسری چیز جس پر ہمیں غور کرنا ہے وہ انسانی تجربہ ہے جس کے مجموعے یا جس کے وسیع تر دائرے کا دوسرا نام تاریخ ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں نت نئے پیش آنے والے حالات و واقعات سے تجربہ حاصل کرنا سوا اسباب و عوامل اس کے لیے خسارے اور ناکامی کا باعث بنے ہوں ان سے پرہیز کرنا اور جن کے اختیار کرنے سے اسے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونا نصیب ہوا ہو، انہیں نہ صرف اختیار کرنا بلکہ ان سے چمٹ جانا، یہ انسان کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں وہ اور دوسری خصوصیات کی طرح دوسری تمام جاندار مخلوقات سے ایک نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل رہا ہے۔ انسان نے ہر اس شخص کے متعلق ناعاقبت اندیشی اور بے بصیرتی کا فیصلہ کیا ہے جو اپنی زندگی کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ انفرادی تجربے کا یہ دائرہ بھی افادیت سے خالی نہیں لیکن اس سلسلے میں بنیادی اہمیت انسان کے اس اجتماعی تجربے کی ہے جسے ہم 'تاریخ' کا نام دیتے ہیں۔ فطری طور پر اخذِ ہدایت کے امکانی ذرائع کی تلاش میں ہماری مراد انسانی تجربے کے اس دائرے سے ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے اپنے تجربے کے اس وسیع دائرے سے عبرت حاصل کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ ہر قوم اپنے اور دوسری قوموں کے ماضی اور حال کا گہرا مطالعہ کرتی ہے ان کے عروج وزوال کے اسباب کو جاننے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ انھوں نے کون سے راستے اپنائے اور کن قدروں کو فروغ دیا جو ان کی تہذیب و تمدن کے ارتقا اور ان کی ہمہ جہتی ترقی میں معاون ثابت ہوئیں اور اس طرح انہیں اقبال مندی کے بام عروج تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں اور اس کے برعکس انھوں نے کن راستوں کو چھوڑ دیا اور کن قدروں سے محروم ہو گئے جنھوں نے ان کے ارتقا کو مجروح کیا اور ان کے زوال کا سبب بنیں۔

قرآن وحدیث نے بھی انسانی تجربے کے اس وسیع دائرے — تاریخ — کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ قرآن انسان کو خطاب کرتے وقت اسے جن دلائل سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے پچھلی قوموں کی تاریخ سے عبرت پذیری بھی اس کی اہم ترین کڑی ہوتی ہے۔ وہ جہاں بھی اس سے آفاق و انفس کے دلائل پر غور کرنے کی اپیل کرتا ہے وہیں اس سے یہ بھی کہتا ہے کہ پچھلی قوموں کی تاریخ میں غور کرنے کے لیے کافی مواد موجود ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے اپنا پیغام بھیجا لیکن ان کی ساری کوششوں اور ان تھک جاں فشانیوں کے باوجود جب اس قوم نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا تو ان کا انجام کتنا دردناک ہوا۔ اس لیے مخاطب کو چاہیے کہ اپنی پچھلی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی روش اختیار نہ کرے کہ خدانخواستہ وہ بھی اسی انجام کا مستحق قرار پائے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ کیا ان کی آنکھ کھولنے کے لیے یہ تاریخی حقیقت کافی نہیں کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی بستیوں کو ہلاک کر دیا، جن کی اجڑی ہوئی بستیوں سے ان کا برابر گزر بھی ہوتا ہے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ
مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ط

(السجدۃ: ۲۶)

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ

(طٰہٰ - ۱۲۸)

قرآن نے اس سلسلے میں اتنی تفصیل سے کام لیا ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتی۔ وہ ان قوموں کا نام لے لے کر بتاتا ہے جن کے سامنے خدا کے رسولوں نے اپنی دعوت پیش کی لیکن انھوں نے اسے مان کے نہیں دیا اور بالآخر ہلاکت و تباہی سے دوچار ہوئیں۔

حدیث کے اندر بھی تاریخ سے عبرت پذیری کی واضح مثالیں موجود ہیں۔ مکے میں جب مسلمان کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آگئے تو کچھ لوگ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم پر یہ مظالم توڑے جا رہے ہیں آخر کار آپ ان کفار پر بددعا کیوں نہیں کر دیتے کہ زمین ان کے ناپاک وجود سے پاک ہو جائے اور ظلم و ستم کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ تم اس ظلم و ستم سے گھبرائے جا رہے ہو۔ تمہیں تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ماضی میں ایسے مومنین صادقین بھی رہے ہیں جن پر مظالم توڑنے میں وقت کے جابروں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی یہاں تک کہ انہیں کھڑا کرکے آروں سے چیر دیا جاتا تھا اور ان کے سروں پر لوہے کے کنگھے کیے جاتے تھے جن سے ان کے پٹھے اور گوشت باہر نکل آتے تھے۔ لیکن یہ تھے وہ مومنین برحق جنھوں نے بہ خوشی اپنی جانیں تو دے دیں لیکن ایمان کی دولت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ تمہیں چاہیے کہ ان کی سبق آموز زندگی سے نصیحت حاصل کرو۔

عن خباب بن الارت قال شکونا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو متوسد بردۃ لہ فی ظل الکعبۃ وقد لقینا من المشرکین شدۃ فقلنا الا تدعو لنا فقعد وھو محمر وجھہ وقال کان الرجل فیمن کان قبلکم یحفر لہ فی الارض فیجعل فیہ فیجاء بمنشار فیوضع فوق راسہ فیشق باثنین فما یصدہ ذالک عن دینہ۔ واللہ لیتمن ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الا اللہ والذئب علی غنمہ۔ ولکنکم تستعجلون۔

(مشکوٰۃ، باب علامات النبوۃ ص ۵۲۵)

خباب بن الارت کہتے ہیں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے اوپر مصائب وآلام کی شکایت لیکر گئے دریں حالیکہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر سے ٹیک لگائے ہوئے لیٹے ہوئے تھے۔ اور ان دنوں مشرکین کی طرف سے ہمارے اوپر ظلم وستم بہت سخت ہوگیا تھا۔ آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا پھر آپ نے فرمایا (تم ابھی ظلم وستم سے گھبرائے جاتے ہو،) تم سے پہلے لوگوں میں مرد مومن کا حال یہ تھا کہ اس کے لیے زمین میں گڈھا کھودا جاتا تھا اور پھر اس میں اسے ڈال دیا جاتا تھا۔ پھر ایک آرا لاکر اس کے سر پہ رکھ دیا جاتا تھا اور اس طرح اسے دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے لیکن پھر بھی یہ چیز اسے اپنے دین سے نہیں روکتی تھی۔ خدا کی قسم یہ معاملہ (اسلام) پورا ہوکر رہے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک بے خوف وخطر سفر کرے گا۔ دراں حالیکہ اسے صرف اللہ کا ڈر ہوگا یا وہ بھیڑیے سے ڈر رہا ہوگا کہ کہیں اس کی بھیڑ بکریوں کو نہ کھا جائے لیکن تم چاہتے ہو کہ یہ کام وقت سے پہلے ہو جائے

قرآن وحدیث کی یہ تصریحات بھی تاریخ کی اہمیت و افادیت کو واضح کر دیتی ہیں لیکن ہلکے سے غور وفکر کے بعد ہمیں اس کی بھی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اپنی تمامتر افادیت واہمیت کے باوجود یہ بھی انسان کو ہدایت فراہم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم تک دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ پہنچی بھی نہیں ہے۔ ماضی کی کتنی ہی قومیں ہیں جن کے متعلق ہماری معلومات بہت سرسری ہیں جن کے ہمیں نام تک نہیں معلوم۔ چنانچہ اس تعلق سے تاریخ کے اندر تاریکی کے ادوار کا ایک مستقل باب قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سلسلے میں ہم تک جو معلومات پہنچی بھی ہیں ان سے فائدہ ہم عقل ووجدان کے ذریعے ہی اٹھا سکتے ہیں اور ان کی نارسائی کا ذکر ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت حال میں ہم تاریخ سے کسی حد تک بھی قابل اطمینان ہدایت کی توقع نہیں کر سکتے چہ جائیکہ ہمیں اس سے ایسی ہدایت مل سکے جو پوری طرح متوازن اور

ہم آہنگ ہو۔ ایسی ہمہ گیر ہو کہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے دائرے میں لے سکے اور اس کی نت نئی بدلتی ضروریات کا ساتھ بھی دے سکے۔ ساتھ ہی وہ اپنی اس خصوصیت سے محروم نہ ہو جس کے بغیر وہ ایک لاشئہ بے جان بنکر رہ جاتی ہے۔ یعنی وہ انسانی فطرت کے اندر اپنی تعمیل کے لیے گہری بنیادیں بھی رکھتی ہو۔

لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے عقل و وجدان کی طرح اسے بھی ہدایت سازی کا مجاز مان لیں تو پھر وہی سوالات اٹھتے ہیں جو اس سے پہلے ان کے سلسلے میں اٹھ چکے ہیں یعنی یہ کہ یہ تاریخ کن لوگوں کی ہوگی۔ اس سے نتائج اخذ کرنے کے مستحق کون لوگ ہوں گے؟ اور اگر ان لوگوں کو اس کا اہل مان بھی لیا جائے تو اس پر عمل درآمد کسی خاص زمانے کے لیے ہوگا یا ہمیشہ کے لیے۔ زمین پر بسنے والے لوگ سبھی اس کی تعمیل کے مکلف ہوں گے یا کچھ لوگ؟ اور اگر کچھ لوگ مان بھی لیے جائیں تو اس کا دائرۂ کار کیا ہوگا؟ الغرض یہ کہ اس صورت میں بھی یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے سوالات حل نہیں ہو پاتے۔ اور جن کی زبان حال شاہد ہے کہ تاریخ بھی انسان کو کوئی ایسی ہدایت عطا نہیں کر سکتی جو صحیح معنوں میں اس کی تشنگی کو بجھا سکے اور اس طرح اسے اطمینان و سکون سے ہمکنار کر سکے[1]

ذرائع ہدایت کی تلاش میں آخری

۴۔ وحیِ الٰہی

چیز جس پر ہماری نگاہیں آکر تھم جاتی ہیں وہ وحی الٰہی ہے۔ انسان اگر اپنی ذات اور اپنے ماحول پر غیر جانبداری کے ساتھ ایک تدبر کی نگاہ ڈالے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے وجود اور اس کے خارج کی نعمتوں کے لیے بجائے خود کوئی استحقاق نہیں رکھتا تھا اور نہ وہ اس بات کی ہی قدرت رکھتا ہے کہ ان میں سے کسی چیز کو اپنی طاقت و قوت کے سہارے حاصل کر سکے۔ عقل کہتی ہے اور زبان وحی بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ یقیناً کوئی مافوق الفطرت ہستی (Supernatural) ہے جس نے اسے ان داخلی اور خارجی نعمتوں سے نوازا ہے۔ تاکہ وہ انہیں اس دنیا کی

---

[1] اخذ ہدایت کے امکانی ذرائع کی تلاش میں عموماً سائنس کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم نے قصداً اس سے تعرض نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ سائنس کسی بھی درجے میں اس دائرے میں نہیں آتی۔ اس کا حقیقی دائرۂ کار انسان کی مادی زندگی ہے۔ اس کا واحد فریضہ یہ ہے کہ وہ انسان کی اس زندگی سے تعلق رکھنے والی ضروریات کو بہتر سے بہتر طریقے پر پورا کرے۔ مادی زندگی کے تعلق سے اس سے جس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکے اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ہدایت کی دریافت یا مقصد زندگی کی تعیین میں اس سے اصول و کلیات اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ سائنس کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی ہے کہ اسے اس کے حقیقی دائرۂ کار سے نکال کر ایک مصنوعی دائرے میں داخل کر دیا جائے اور پھر اس سے اس چیز کا مطالبہ کیا جائے جو اس کے بس سے بالکل باہر ہے۔

اس زندگی میں عمدہ طریقے سے برتے اور ان بے شمار عطیوں پر اس کا شکر بجا لائے۔ یقیناً یہ ہستی خدا کی ہستی ہے۔ جس نے انسان کو ان بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کا وجود اسی کا رہین منت ہے۔ اسی نے اسے پیدا کیا ہے۔

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء ۱)

انسان کے اعضاء و جوارح اسی کا عطیہ ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (النحل ۷۸)

اسی لیے وہ بجا طور پر آخرت میں انسان سے ان کے متعلق سوال کر سکتا ہے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ○ (الاسراء ۳۶)

زندگی کی وہ بنیادی ضروریات جن کے بغیر انسان اپنے کو بہت دیر تک زندہ برقرار نہیں رکھ سکتا اسی کی عطا کردہ ہیں۔ پانی جو ہمارے لیے مادۂ حیات ہے خدا ہی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ

(الواقعہ ۶۸-۶۹)

اگر وہ اپنی تہوں میں جا کر جم جائے تو کوئی دوسرا اسے نکال نہیں سکتا۔

اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ (الملک ۳۰)

ہوا، جس کے ذریعے انسان سانس لیتا ہے اور جس پر اس کی زندگی کا دار و مدار ہے نیز وہی پانی برساتی ہے جس سے انسان اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی خدا ہی کی طرف سے ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ (الاعراف ۵۷)

وہی ہے جس نے انسان کی سہولت کی خاطر دن اور رات کا پیہم سلسلہ قائم رکھا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔

(الفرقان ۶۲)

حالانکہ وہ اگر چاہتا تو دن اور رات کو ہمیشہ کے لیے کر دیتا اور کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتا۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِیْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (القصص ۷۱-۷۲)

اس نے انسانوں کے لیے مختلف قسم کے جانور پیدا کیے

ہیں جن سے وہ طرح طرح کے فائدے حاصل کرتا ہے اور جو اس کے لیے زینت و آرائش کا سامان بنتے ہیں:۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (النحل ۵،۶)

انھیں اسی نے ان کے تابع فرمان بنا رکھا ہے ورنہ ان کے بس میں نہ تھا کہ خود انہیں اپنے قابو میں کر لیتے۔

سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ (الزخرف:۔ ۱۳)

یہی نہیں بلکہ کائنات کی عظیم تر حقیقتیں بھی اسی کی قدرت کا کرشمہ ہیں۔ زمین و آسمان، چاند، سورج اور ستارے ان سب کو اسی نے پیدا کیا ہے اور انہیں انسانوں کے مفاد کے تابع بنا دیا ہے۔ زمین کو اسی نے گہوارہ بنایا ہے

وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ (الذاریت: ۴۸)

اسی کی قدرت سے آسمان ہمارے لیے چھت کا کام دیتا ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَّهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ (الانبیاء ۳۲)

سورج، چاند اور ستارے اسی کے حکم سے مسخر ہیں ـــ

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ (الاعراف ۔ ۵۴)

غرض یہ کہ پوری کائنات اسی کے حکم سے قائم ہے اگر وہ قائم رکھنا نہ چاہتا تو پورا کارخانہ ہستی زیر و زبر ہو جاتا۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ (الروم ۲۵)

زندگی کی وہ بنیادی ضروریات جن کے بغیر ہم اپنے کو چند گھنٹوں سے زیادہ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا سامان اتنے بہتر طریقے پر کیا گیا ہے کہ اس پر کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر ہم کائنات کی ان عظیم حقیقتوں یعنی زمین و آسمان، سورج و چاند اور ستاروں کی موزونیت پر غور کریں کہ وہ کس توازن کے ساتھ انسانی وجود کی بقا کے لیے مسلسل کام کر رہے ہیں تو ہماری عقل حیران رہ جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ سے جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں پالے کی نذر ہو جاتیں۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ "دائمی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دوگنے فاصلے پر چلا جائے

تو زمین پر اتنی سخت سردی پیدا ہوگی کہ ہم سب لوگ منجمد برف ہو جائیں گے اور اگر آدھے فاصلے پر آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہوگی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے بلکہ ۲۳ درجے کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ یہ جھکاؤ اگر نہ ہوتا تو سمندروں سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے اس کے بجائے اگر وہ صرف ایک لاکھ میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دوبار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے۔ [1]

غور کیجیے وہ ذات جس نے کائنات کے اندر یہ توافق (Harmony) اور توازن (Balance) پیدا کیا ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی پیدا ہو جائے تو یہ سارا کارخانۂ ہستی بالکل درہم برہم ہو جائے اور اس کے اندر بسنے والی مخلوقات اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ کیا اس نے یونہی بے مقصد پیدا کر دیا ہے جس ذات نے اپنی سب سے اشرف مخلوق کی بقائے حیات کے لیے ہر طرح کے انتظامات کیے ہوں کیا وہ اسے اس ہدایت سے محروم کر سکتا ہے جس کے بغیر اس کا وجود اپنی معنویت کھو بیٹھتا ہے۔

یہ بات کہ کائنات کی ان عظیم حقیقتوں کا توازن و توافق خود بخود کام کر رہا ہے اور انسان کی ان بنیادی ضروریات کی تکمیل خود بخود انجام پا رہی ہے۔ یہ بجائے خود ایک دعویٰ ہے اور اس کے حق میں جو دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں وہ دراصل اس دعوے پر چند مزید دعووں کا اضافہ ہیں جنھیں غلطی سے دلیل کا نام دے دیا گیا ہے' ذہن انسانی کے انتہائی عجز کی دلیل ہے کہ اپنے معروضیت (Objectivity) اور غیر جانبداری کے تمام تر دعووں کے باوجود اس نے محض چند مفروضات کو حقائق (Facts) کا نام دے رکھا ہے۔ اور ان سے اس طرح چمٹا ہوا ہے گویا واقعۃً اس نے حقیقت دریافت کر لی ہے۔ حقائق کائنات کی تحقیق و تفتیش کے تعلق سے انسان نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ محض ایک واقعہ (Phenomenon) کی توجیہ ہے۔ بالکل غیر منطقی ہے۔ یہ طریق استدلال کہ توجیہ واقعہ کو وجود واقعہ کے مقصد کی تعیین میں فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ ورنہ عقل سلیم کا تو فیصلہ ہے کہ جس ہستی نے انسان کی مادی زندگی کی بقا اور اس کی نشو و نما کے لیے سارے انتظامات کیے ہیں۔ یقیناً اسے اس کی روحانی زندگی کی بقا اور نشو و نما کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ اس کی رحمت اصرار کرتی ہے کہ انسان کو ایک ایسی جامع ہدایت دی جائے جس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کے اس اہم ترین گوشے ۔ مادی زندگی سے زیادہ اہم تر گوشے کے تقاضوں کی تکمیل کر سکے اور اس طرح حقیقی معنوں میں پاکیزہ صالح زندگی گذارنے کے قابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن

[1] اسلام کا تعارف ص [illegible]

وحیِ الٰہی کو آسمانی بارش سے تشبیہ دیتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مردہ زمینوں کو اس مادی بارش سے سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی روحانی بارش — وحی — سے دلوں کی مردہ بستیوں کو بھی زندہ کر دیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح مردہ زمین اپنی عدمِ صلاحیت کے باعث اس بارش سے فائدہ نہیں اٹھا پاتی اسی طرح وہ دل بھی جو اپنی ہدایت یابی کی صلاحیت کو بالکل مردہ کر چکے ہوتے ہیں اس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

اس بنیادی حقیقت کے ادراک کے ساتھ جب ہم اس صورتِ واقعہ پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ یہ ذات ان تمام امکانی نقائص سے پاک ہے جو ایک مکمل ہدایت دینے کے سلسلے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں اور ان تمام مطلوبہ صفات سے متصف ہے جو ایک جامع اور صحت مند ہدایت فراہم کرنے کے لیے ناگزیر ہیں تو ہماری عقل کا یہ فیصلہ مزید تقویت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ علیم ہے، ہر چیز کے متعلق تفصیلی معلومات رکھتا ہے۔ انسانی فطرت اور اس کے تقاضے اسے اچھی طرح معلوم ہیں۔ اس کا علم ہمہ گیر ہے۔ اس لیے وہ اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے کہ کس طرح کی ہدایت انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہوگی۔ چونکہ اس کی معلومات حواس یا کسی اور ذریعے سے حاصل کردہ نہیں ہیں اور نہ ان پر کسی دوسری قوت کا تسلط ہی ہے وہ براہِ راست ہیں اور ہر طرح کی امکانی مغلوبیت سے آزاد ہیں اس لیے ان کے اندر کسی غلطی کا بھی امکان نہیں ہے۔ پھر چونکہ وہ حکیم ہے اس لیے اس کی دی ہوئی ہدایت انسانی مصالح کے بالکل موافق ہوگی۔ وہ ہر طرح کے نقائص سے پاک ہے۔ اس لیے جذبات و احساسات اسے مغلوب نہیں کر سکتے وہ عادل ہے اس سے کسی بھی درجے میں بے انصافی کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لیے اس کی دی ہوئی ہدایت سراپا عدل پر مبنی ہوگی۔ وہ اکیلا ہے، نہ کوئی اس کا باپ ہے، نہ بیٹا، اس لیے اس کا بھی امکان نہیں ہے کہ نسبی حمیت کے نتیجے میں اس کا میلان کسی کی طرف بڑھ جائے۔ وہ آقا ہے اور سارے انسان اس کے غلام ہیں۔ اس لیے سارے ہی انسانوں کے ساتھ اس کا برتاؤ یکساں ہوگا۔ وہ مجازی (بدلہ دینے والا) ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق عمل کریں گے انہیں آخرت میں اس کا اچھا بدلہ دیگا۔ اور اس کے برعکس جو لوگ اس کی خلاف ورزی کریں گے انہیں لازماً اس کا عذاب بھگتنا ہوگا اور جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اس لیے اس معاملے میں کوئی اسے دھوکہ بھی نہیں دے سکتا اور نہ ہی کوئی اسے غلط فہمی میں مبتلا کر کے کسی کو بخشوا ہی سکتا ہے۔ نیز وہ عادل ہے اس لیے اس مجازات میں بے لاگ انصاف ہوگا۔ اس ہستی کی ان صفاتِ حسنہ اور خاص طور پر جزا کے اس تصور کے تحت انسان کے ساتھ اس ہدایت کے تعلق سے خارجی دباؤ سے بالاتر ایک ایسی قوتِ نافذہ (Sanction) لگ جاتی ہے جو برابر اسے اس کی پابندی کے لیے اکساتی رہتی ہے اور ان مقامات پر بھی اسے اس پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرتی ہے جہاں بظاہر وہ قانون کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے

اس طرح ہدایت انسانی کے اس ذریعے کی نہ صرف یہ کہ عقل شہادت دیتی ہے بلکہ وہ اپنے ساتھ اتنی ضمانتیں بھی رکھتا ہے کہ بجا طور پر ہم اس سے اپنی توقعات وابستہ کرسکتے ہیں یقیناً اس ذریعے سے ملنے والی ہدایت ایک مکمل ہدایت ہوگی۔ ہر طرح کی خوبیوں سے آراستہ اور تمام خامیوں سے پاک ہوگی۔

اب جب ہم قرآن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں یہ کہتا نظر آتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے روز اول سے انسان کی مادی زندگی کے لیے انتظام کیا تھا اسی طرح وہ اس کی روحانی زندگی کی ضروریات سے بھی غافل نہ تھا۔ چنانچہ دنیا کے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہدایت الٰہی کے پیغامبر بھی تھے۔ پھر اس کے بعد ہمیں آدمؑ سے لیکر نبی آخر الزماں محمد صلے اللہ علیہ وسلم تک انبیاء کرام کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جو ہر زمانے میں انسانوں کے پاس آتے اور انھیں ہدایت الٰہی سے آگاہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔ وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر: ۲۴) اس نے کسی بستی کو ہلاک کیا ہی نہیں تا آنکہ اس میں اپنے رسول نہ بھیجے ہوں ۔ ہلاکت کا مرحلہ اسی وقت آیا جب کہ اس کے رسولوں نے اس کا پیغام ان کے سامنے بہت واضح طریقے پر پیش کر دیا۔ ہدایت الٰہی کو بالکل کھول کر بیان کر دیا۔ اس کے سارے مطالبات بتا دیے اور ان کے سارے اشکالات اور ذہنی الجھنوں کو دور کر دیا وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا (القصص ۵۹) لیکن انھوں نے اسے ما نہ دیا اور ان سے ہدایت پانے کی ساری توقعات ختم ہو گئیں جب انھوں نے اپنے ظالم ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا تو عذاب الٰہی بھی آدھمکا۔ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰىٓ اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (القصص ۵۹)

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا وہ خدا کی دی ہوئی ہدایت کو لوگوں کے سامنے واضح طو پیش کر دیں تاکہ ان کا صالح عنصر جسے بجا طور پر انسانیت جوہر کہنا چاہیے۔ اسے قبول کر کے ہدایت حاصل کرلے اور بیمار عنصر پر حجت تمام ہو جائے۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ عَلَى ا حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء ۱۶۵) اسے یہ کہنے کا نہ رہے کہ ہمارے پاس ہدایت آئی کہاں تھی کہ ہم ا اتباع کر لیتے۔ اگر ہم تک رسول پہنچے ہوتے تو ہم یقیناً ایمان سے بہرہ اندوز ہوتے۔ لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَ رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (القصص ۴۷) یہی نہیں بلکہ اگر ہمیں ہدایت ملتی تو دوسروں سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہوتے۔ لَئِنْ جَآ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ (فاطر: ۴۲) بجا طور پر ان انبیاء کی مثال آقا کے غلاموں کی سی ہے جنھیں وہ حکم دیتا ہے کہ بیمار کو یہ دوا پلادو۔ خواہ انہیں بظاہر یہ تلخ ہی کیوں نہ لگ اب جو لوگ اسے پی لیتے ہیں وہ بیماری سے شفا بھی حا کرتے ہیں۔ نیز انہیں خدا کی خوشنودی بھی نصیب ہوتی

لیکن جو لوگ اسے پینے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ایک طرف تو اپنے کو اس مہلک مرض میں گرفتار رکھتے ہیں اور دوسری طرف آقا کی ناراضگی بھی مول لیتے ہیں۔

اب جہاں تک اس ہدایت کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے وہ فطری طور پر ساری انبیائی تاریخ میں ہمیشہ ایک ہی رہے۔ ہر نبی نے بلا استثناء خدا کی وحدانیت، رسالت پر ایمان اور آخرت پر یقین ہی کی دعوت دی ہے۔ یہ بنیادی عناصر ہر نبی کی لائی ہوئی ہدایت کا لازمی جزء رہے ہیں لیکن جہاں اس بنیادی حقیقت میں ان کے درمیان اتفاق رہا ہے وہیں عبادت کے طریقوں اور معاملات زندگی سے متعلق تفصیلی احکامات میں اختلاف بھی رہا ہے۔ ایسا ہونا فطری بھی تھا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کی نوعیت کے عین مطابق بھی۔ اس لیے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے بھی انبیاء آئے ان کی لائی ہوئی ہدایت ایک خاص قوم اور ایک خاص زمانے ہی کے لیے تھی۔ فطری طور پر ان کی شریعتوں میں عبادات کے طریقے اور زندگی سے متعلق انفرادی اور اجتماعی احکام اس زمانے کے حالات اور اس قوم کے مزاج کے موافق تھے۔ ظاہر ہے کہ ہر قوم کی افتادِ طبع مختلف ہوتی ہے نیز زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ معاشرت و تمدن کے ڈھانچے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے اگر ان انبیاء کی لائی ہوئی ہدایتوں میں عبادات و معاملات زندگی کے تعلق سے اختلاف تھا تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ - ۴۸) لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ (الحج - ۶۸)

آپؐ سے پہلے آئے ہوئے تمام انبیاء کے تعلق سے یہ بات بھی جاننے کی ہے کہ ان میں سے کسی کی بھی لائی ہوئی ہدایت اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں ہے۔ ان میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو اب روئے زمین پر اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں اور اگر موجود بھی ہیں تو ان میں انسانی ہاتھوں نے کافی تبدیلیاں کر دی ہیں اور وہ اس حد تک مسخ ہو چکی ہیں کہ اصل اور نقل کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان میں سے بیشتر انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت اس دنیا میں مکمل عملی روپ دھار نہ سکی تھی اور اگر کسی درجے میں ایسا ہوا بھی تو تاریخی طور پر اس کا ریکارڈ محفوظ نہیں ہے۔

لیکن اس کے برعکس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں آئی ہوئی ہدایت بعض امتیازات کی حامل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کسی خاص قوم یا کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا روئے خطاب پوری انسانیت کی طرف ہے۔ قرآن نے کہیں بھی صرف اہل عرب یا ان کے کسی خاص قبیلے کو مخاطب نہیں کیا ہے۔ اسی لیے وہ اے اہل عرب! یا اے کسی خاص قبیلے کے لوگو! کے بجائے اے مومنو! اور اے لوگو! کے ذریعے خطاب کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (آل عمران ۱۰۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا (آل عمران ۱۵۶) يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ (البقرة - ۲۱)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (البقرۃ: ۱۶۸)

دوسرے یہ کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت صرف کسی خاص زمانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ آپ آخری نبی (خاتم النبیین) ہیں۔ اب قیامت تک کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب-۴۰) اس لیے کہ دین کو آپ کے ہاتھوں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نعمت ایزدی کا اتمام ہو چکا۔ اب اسلام ساری انسانیت کا دین ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ-۳)

تیسرے یہ کہ ہدایت جوں کی توں محفوظ ہے۔ کسی انسانی ہاتھ نے اس کے اندر ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں کی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تئیں خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۹) اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (القیٰمۃ-۱۷-۱۸) یہی نہیں بلکہ اس نے پچھلی ساری ہدایتوں کی مفید اور کارآمد چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ نیز جہاں بھی ان کے اندر انسانی ہاتھوں نے تحریفات کی ہیں یہ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لیے اب ان کی تعلیمات کو جاننے کا بھی محفوظ راستہ صرف یہی ایک رہ گیا ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (المائدہ-۴۸)

چوتھے یہ کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کو صرف ایسا نہیں کہ چند افراد یا کچھ قبیلوں نے قبول کر لیا ہو اور اس طرح محض چند افراد کی زندگیاں سدھ گئی ہوں، بلکہ اسے ایک منظم ریاست کی شکل میں مکمل طور پر عملی روپ بھی ڈھلنے کا موقع ملا۔ اور یہ ریاست بھی نہ صرف یہ کہ سال دو سال قائم رہی بلکہ مسلسل تیس سال تک اپنے مثالی اور معیاری انداز میں اور اس کے بعد سیکڑوں برس تک بحیثیت مجموعی قائم رہی جس کے زیر سایہ انسانیت کو وہ امن وسکون نصیب ہوا جو نہ اس سے پہلے کبھی اسے میسر ہوا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی نصیب ہو سکا جس نے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل اخلاق و عادات، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، حکومت و سیاست قانون و عدالت نیز دوسرے تمام شعبہائے زندگی میں وہ تابناک مثالیں چھوڑی ہیں جن کی پوری انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

پانچویں یہ کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کے تدریجی ارتقاء اور اس کے عملی روپ کی تاریخ کا مکمل ریکارڈ پوری طرح محفوظ ہے۔ اور نہ صرف محفوظ ہے بلکہ علمائے امت اور مصلحین ملت نے اس کے اندر وہ بیش بہا اضافے کیے ہیں کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی دوسرے نبی کی امت کے پاس اس کا دسواں اور ملیواں بھی نہیں ہے۔

دیگر انبیاء اور نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی

ہدایتوں کے درمیان نوعیت کے اس اختلاف سے ان کے تقاضوں کا مختلف ہونا بالکل فطری بات ہے۔ پہلی کے لیے اگر یہ صرف یہ کافی تھا کہ مخاطب قوم یا اس زمانے کے لوگ اس کی پیروی کریں ورنہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں ناکامی سے دوچار ہوں گے، تو دوسری کے ساتھ پوری انسانیت کی تقدیر وابستہ ہو جاتی ہے۔ اب قیامت تک ساری انسانیت کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں فلاح یاب ہونے کا صرف یہی ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ دین و دنیا دونوں کی کامیابی کے لیے ضروری ہو کہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کو تسلیم کیا جائے۔ نیز اب اس کے ہوتے پچھلے انبیاء کی لائی ہوئی ہدایتوں پر اصرار بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ کسی کتاب کے مکمل اور تازہ ترین اڈیشن کو پا لینے کے بعد اس کے نامکمل اور قدیم اڈیشن پر اصرار کسی بھی درجے میں ہوشمندانہ فعل نہیں قرار دیا جا سکتا اسی لیے قرآن بجا طور پر یہ کہتا ہے کہ

اب قیامت تک کے لیے خدا کے نزدیک قابل قبول طریقۂ زندگی (دین) صرف اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَامُ (آل عمران ۱۹) اس کے علاوہ جو طریقۂ زندگی بھی اختیار کیا جائے گا قابل قبول نہ ہو گا۔ وَمَن یَّبتَغِ غَیرَ الاِسلَامِ دِینًا فَلَن یُّقبَلَ مِنہ۔ (آل عمران۔ ۸۵) جو فیصلہ بھی اس آخری ہدایت کے خلاف ہو گا وہ کفر کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ وَمَن لَّم یَحکُم بِمَا اَنزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الکَافِرُونَ (المائدہ ۴۴)

بجا طور پر جس ہدایت سے پوری انسانیت کی تقدیر اور تعمیر وابستہ ہو وہ اس بات کی مستحق ہے کہ زندگیاں اس کے لیے وقف کر دی جائیں اور اسے قائم کرنے کی مہم اور لگاتار جد و جہد کی جاتی رہے تا آنکہ وہ قائم ہو جائے۔ آمین!

وسطی کیرلا کے اجتماع میں

قیمِ جماعت کی افتتاحی تقریر

اوّلیں توجّہ کی مستحق ہماری اپنی اور اپنے اہل و عیال کی اصلاح و تربیت ہے

۲،۳ فروری کو وسطی کیرلا کا ایک بہت بڑا اجتماع بمقام ترور ضلع مالاپورم میں منعقد ہوا تھا جس میں چھ ہزار سے زیادہ مرد متوسلین جماعت اور چھ سو متفقین خواتین نے بطور ڈیلی گیٹ شرکت کی تھی۔ ان کے علاوہ ہزاروں دوسرے مسلم و غیر مسلم حضرات بھی شریک اجلاس ہوئے۔ اسی اجلاس میں کارکنان جماعت اور دوسرے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے جناب افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی ہند نے جو افتتاحی تقریر فرمائی تھی وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہے

الحمد للہ رب العلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

معزز بھائیو! محترم بہنو! عزیز بیٹے، بیٹیو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آج ہم سب کو ایک جگہ ل بیٹھنے اور اپنی اصلاح و تربیت، دین کی خدمت اور ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے مسائل پر ایک دوسرے کے خیالات، معلومات اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں اپنی طرف سے امیر حلقہ، ناظم اجتماع، نیز مقامی میزبانوں کی طرف سے آپ حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

عزیزو! آپ کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی اور آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ کیرلا آنے، آپ حضرات سے ملنے اور اس سرزمین کو دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔ اول تو اس لیے کہ اسلام کے رشتے، مشترک نصب العین اور ایک ہی مقصد زندگی نے ہم سب پیروان اسلام کے مابین الفت و محبت اور اخوت کے جو جذبات

پروان چڑھاتے ہیں، ہماری بولیوں، رہن سہن اور غذا و لباس کے فرق کے باوجود اس نے ہمارے اندر وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ جہاں بھی جائیے ایسا محسوس ہوتا ہے اپنے گھر، اپنے بھائیوں اور عزیزوں میں آگئے۔ ظاہر ہے اپنوں سے ملنے کا اشتیاق کسے نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں کیرلا کی سرزمین دیکھنے کا شوق مجھے صرف اس لیے نہیں تھا کہ یہاں بہت خوبصورت مناظر ہیں اور یہاں کے لوگ ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں زیادہ امن پسند، روادار، خوش اخلاق اور مخلص ہیں۔ یہ چیزیں بھی اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہیں، مگر میرے لیے تو وجہِ کشش یہ بات تھی کہ ہمارے ملک کا یہ وہ خطہ ہے جہاں اسلام کی روشنی سب سے پہلے اور براہ راست عربوں کے ذریعے پہنچی۔ اور بعض روایات کے مطابق تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضؓ کے دور میں یہ حصّہ اسلام کے نور سے منور ہوا۔ اور یہاں کے جن بزرگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ اسلامی تعلیمات نے ان کی زندگیوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے اخلاق سنور گئے، ان کی عادتیں سدھر گئیں، ان کے معاملات میں نکھار آ گیا۔ ان کی سیرت و کردار کی پاکیزگی، ان کے حسن سلوک، ان کی خوش خلقی اور خوش معاملگی نے دیکھتے دیکھتے یہاں کی کثیر آبادی کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا۔ ان بزرگوں کی کوششوں کے اثرات اس سرزمین پر اب بھی بہت نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان بزرگوں کی قبروں کو نور سے بھر دے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین!

مجھے یہ دیکھنے کی بہت خواہش تھی کہ ہمارے ان بزرگوں کے موجودہ وارث و جانشین اپنے اسلاف جیسا مؤثر رول ادا کرنے کے لیے آج کل کیا کچھ کر رہے ہیں؟

عزیزو! ان بزرگوں کے اخلاف میں جماعت اسلامی کے متوسلین بھی ہیں۔ تبلیغی جماعت، ندوۃ المجاہدین، سمیت کیرلا جمعیۃ العلماء اور دیگر مذہبی جماعتوں سے متعلق حضرات بھی، مسلم لیگ اور ایم ای ایس وغیرہ سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں اور وہ بھی جو کسی تنظیم میں شامل نہیں ہیں۔ ان سب کے دلوں میں دین و ملت کا درد بھی ہے اور ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کا جذبہ بھی۔ جی چاہتا تھا کہ ذرا قریب سے دیکھوں کہ وہ انفرادی طور سے اور مل جل کر باہمی تعاون سے دین و ملت کی خدمت اپنی اور مسلمان بھائیوں کی اصلاح و تربیت، ان کو ہر پہلو سے اونچا اٹھانے اور ملک کی تعمیر و ترقی اور اس کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں کیا خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بھائیو! اس موقع پر مجھے چند عزیز بھائیوں اور بزرگوں کی ملاقات سے محرومی کا شدید احساس ہے۔ ہمارے مرحوم بھائی جناب کے پی کے احمد صاحب کا زخم ابھی تازہ ہے۔ اس سے پہلے جناب ایس ایم حنیف مرحوم پالگھاٹ اور جناب کے ٹی ایم عبداللہ مولوی مرحوم اور ملت کے چند اور نہایت اہم بزرگوں کی اچانک رحلت کے حادثات رونما ہو چکے ہیں جن کا بھی قلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے، جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان

اکو پُر کرے جو ان کی غفلت سے پیدا ہو گیا ہے۔ آمین!

عزیزو! جماعت اسلامی ہند کا پیغام وہی ہے جو ہم سب مسلمانوں کے محبوب دین اسلام کا پیغام ہے۔ نہ اس سے ائی بھر کم نہ اس سے رتی بھر زیادہ۔ جماعت اسلامی بے کم و کاست پورے دین اسلام کو قائم کرنے اور باطن سے لے کر ظاہر تک پوری انسانی زندگی کو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اس ملک میں کام کر رہی ہے۔ ہم سب مسلمانوں کا ایمان اور اس پر پختہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا اور مستند دین صرف اسلام ہے۔ سارے انسانوں کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات اسی دین کی مخلصانہ پیروی پر موقوف ہے۔

عزیزو! ہماری اس تحریک کا محرک اور ہماری ساری تگ و دو کا مقصود ہماری صرف یہ تمنا ہے کہ ہمارا رب ہم سے راضی ہو جائے ہم اس کی پکڑ سے جو نہایت شدید ہے بچ جائیں اور ہم کو اس کی رضا و خوشنودی حاصل ہو جائے۔

اس کا محرک نہ تو ہمارا کوئی ذاتی و گروہی مفاد ہے اور اللہ کے سوا کسی اور سے کسی اجر کی طلب۔ یہ کام خالصتاً لوجہ اللہ ہے۔

عزیزو! یہ نہایت اعلیٰ، ارفع اور پاکیزہ نصب العین ہے انبیائی مشن ہے۔ جن لوگوں نے اخلاص و للہیت کے ساتھ حسن و خوبی سے اس کا حق ادا کرنے کی جد و جہد کی اللہ رب العزت نے جو قادر مطلق، غنی و حمید اور سب سے بے نیاز ہے اپنے ایسے بندوں کو از راہ عنایت اپنا انصار و مددگار قرار دیا ہے اور ان سے راضی ہو جانے اور انہیں صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ہماری بھی یہی دعا اور دلی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دنیا میں صالح سوسائٹی نصیب کرے اور مرنے کے بعد صالحین کے ساتھ ہمارا حشر ہو۔ آمین!

ہم بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ اور حضرت ابراہیمؑ کی دعا رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ دہراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری یہ دعا قبول فرمائے آمین! ——— مگر عزیزو! اس حقیقت سے تو آپ سب لوگ واقف ہیں کہ جتنا اونچا نصب العین ہوتا ہے اس کے حصول کے لیے اتنی ہی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔

یغوص البحر من طلب اللآلی

ومن طلب العُلیٰ سهر اللیالی

موتی کے طلب گار کو سمندر میں غوطے لگانے پڑتے ہیں اور رتبہ عالی چاہنے والوں کو دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کرنا پڑتی ہے۔

اس نصب العین کا حق ادا کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اپنے اندر وہ انفرادی اور اجتماعی اوصاف پیدا کرنا ہوں گے جو اس کے شایان شان جد و جہد کے لیے ضروری ہیں اور چن چن کر ان تمام عیوب کو اپنے اندر سے نکالنا ہوگا جو اس راہ میں مزاحم ہو سکتے ہیں۔ اور اللہ کی نصرت و تائید حاصل کرنے کے لیے اخلاص و للہیت، صبر و استقامت، ایثار و

قربانی اور کامل حوالگی وسپردگی کے ساتھ اس جدوجہد میں سب کچھ داؤں پر لگانا ہوگا۔

عزیزو! ہم میں سے ہر ایک کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے اوپر اس دین کو قائم کرنا ہے جو فرد اس دین کی مخلصانہ پیروی میں کوتاہی کرے گا وہ دوسروں کو اس کی طرف راغب کرنے کی جدوجہد کا حق کیسے ادا کر سکے گا۔ اور بفرض محال دوسرے اس کی اصلاحی کوششوں کا اثر قبول کر بھی لیں تو اس کی اپنی کوتاہیوں کی اس سے تلافی کیا ہو سکے گی۔ جو خود سدھرے گا اس کی اپنی عاقبت درست ہوگی۔

کل نفس ذائقة الموت، آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور حشر کے دن اپنی قبر سے اٹھ کر جواب دہی کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت، جیسی کرنی ویسی بھرنی ہوگی۔ لا تزر وازرة وزر اخری، کوئی دوسرا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہمیں اپنی اصلاح وتربیت اور اپنی فلاح و نجات کی فکر ہونی چاہیے اور اپنی پوری زندگی کو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اپنی اصلاح وتربیت

اس ضمن میں جو کچھ کرنا ہے وہ مختصراً عرض کرتا ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک کو سب سے پہلے:۔

۱۔ دین کا ضروری علم اور اس کا صحیح فہم پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہم خود اس کے تقاضے پورے کر سکیں، اپنے اہل وعیال کو اس کے مطابق چلا سکیں اور جن سطح کے لوگوں سے ہمارا سابقہ پیش آتا ہے ان کو اس دین سے روشناس کرا سکیں۔

۲۔ اسلام کے دین حق ہونے پر پختہ ایمان ہونا چاہیے تاکہ پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس پر چل سکیں اور ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے زندگی کے جملہ امور ومسائل میں کتاب وسنت کو معیار اور کسوٹی بنائیں۔

۳۔ اپنی سیرت وکردار میں وہ حسن پیدا کریں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ ہمارے قول وعمل میں تضاد نہ ہو۔ دوسروں کے لیے وہی پسند کریں جو اپنے لیے پسند کریں۔ حق و انصاف کے پشت پناہ، ہمدرد خلائق اور دوست دشمن سب کے لیے قابل اعتماد ہیں سب کے کام آئیں اور سب کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

۴۔ نصب العین کو ایک ضمیمہ نہیں، بلکہ مقصد زندگی بنانا چاہیے اور اپنی ساری توانائیاں، قوتیں، صلاحیتیں، وسائل و ذرائع اور دولت عمر اسی کے لیے وقف کر دیں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ وقت ملا، جی چاہا، حالات نے اجازت دی تو اس کے لیے بھی کچھ کر دیا۔

۵۔ اپنے اندر اخلاص وللہیت پیدا کرنے اور اپنی نیت کو کھوٹ سے پاک رکھنے کی پوری پوری فکر کرنی چاہیے۔ انما الاعمال بالنیات۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے ساری تگ ودو صرف خدا کی رضا و خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے۔ کوئی دنیوی غرض یا ذاتی مفاد

یا کسی اور سے کسی اجر کی طلب ہرگز پیش نظر نہ ہونا چاہیے۔

ان کے علاوہ اپنے اندر بھی اور اپنے معاشرے میں بھی کچھ ضروری اجتماعی اوصاف کو پروان چڑھانا ہوگا خصوصًا

۱۔ باہمی اخوت ومحبت، ہمدردی وغمخواری کو، کیونکہ اسی طرح ہم مسلمان بنیان مرصوص بن سکیں گے۔

۲۔ صبر واستقامت، مرحمت ومواسات، حق پر جمنے دیانت داری سے حقوق ادا کرنے، حق کی حمایت وپشت پناہی کرنے نیز معروفات سے محبت، منکرات سے نفرت اور سماج میں تواصی بالحق، تواصی بالصبر، تواصی بالمرحمۃ کی عام فضا پیدا کرنے کی کوشش۔

۳۔ تمام اجتماعی امور باہمی مشورے سے انجام دینے کی کوشش، مشاورت میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اسلام نے اس کی بڑی تاکید کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول تک کو حکم تھا کہ شاوِرْھُم فی الامر اہم امور میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیا کرو۔ اس نے مسلمانوں کی اجتماعیت کا یہ وصف بتایا ہے کہ ان کے امور باہمی مشورے سے انجام پاتے ہیں۔" وامرھم شوریٰ بینھم مشورہ کرنے سے فیصلے مناسب ومتوازن ہوتے ہیں۔ اور فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے سب کا قلبی تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ نظم واجتماعیت کا شعور، سمع وطاعت کا پاس ولحاظ اصول وضوابط اور فیصلوں کی پابندی اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری مستعدی، مشترکہ امور ومسائل مل جل کر تندہی سے انجام دینے کی فکر تاکہ ٹیم بنکر کام ہوسکے۔

(۵) نصح وخیر خواہی، ہمدردی ودل سوزی کے ساتھ کرتے ہوئے ساتھیوں کی اصلاح کی کوشش۔ مگر یاد رکھیے یہ باتیں ہمارے اندر اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب :-

۱۔ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق مضبوط ہو۔ ہم قدم قدم پر اس کو راضی کرنے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی فکر کریں۔

۲۔ ہمیں اللہ کے رسول سے بے پایاں محبت ہو۔ ہم آپ کی سنت کا اتباع کریں۔ آپؐ کے اسوۂ مبارک کو مشعل راہ بنائیں۔

۳۔ نیک بندوں، حضور کے سچے پیرووں کی صحبت اختیار کریں۔ ان مجلسوں میں شرکت کریں جہاں اللہ ورسول کا ذکر ہوتا ہے یا قرآن وحدیث کا درس دیا جاتا یا آں حضرت اور صلحائے امت کی سیر بیان کی جاتی ہے یا صالح لٹریچر پڑھکر سنایا جاتا ہے اور اپنے طور سے بھی سمجھ کر قرآن کی تلاوت اور احادیث اور سیرت نبوی اور صالح لٹریچر کا بغور مطالعہ کرنے کا اہتمام کریں۔

۴۔ دنیوی مفادات پر اخروی نجات کو ترجیح دیں اپنے اعمال وافکار پر نظر رکھیں سختی سے اپنا احتساب کرنے کی عادت ڈالیں۔ توبہ واستغفار کا اہتمام کریں اور سچے عزم کے ساتھ اپنی کوتاہیوں خصوصًا ان عیوب کو جو منبع شر اور نیکیوں کو ختم کرنے والے ہیں۔ ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً فخر وغرور نمود ونمائش، نفسانیت وخود پرستی، مزاج کی بے اعتدالی اور ضعف ارادہ کو اپنے اور اپنے ساتھیوں کے اندر ہرگز راہ نہ پانے دیں۔

د۔ نماز روزے اور دیگر عبادات کی پوری پابندی کی جائے۔ فرائض کے ساتھ نوافل اور ذکر و تسبیح کا بھی التزام کیا جائے۔ بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی دین کی سربلندی اور اپنے نفس کے تزکیہ کے لیے اپنی بساط کے مطابق دل کھول کر خرچ کیا جائے۔

اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح و تربیت

برادرانِ محترم! اپنی اصلاح و تربیت پر اولین توجہ صرف کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح و تربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ یہ ہماری فطرت کا تقاضا بھی ہے اور ہماری معاشرتی ضرورت بھی ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور ہماری اصلاحی و دعوتی کوششوں کے مؤثر ہونے کی شرط اور ضرورت بھی۔

عزیزو! ذرا غور کرو جو فرد بھی یومِ آخرت اور جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہے، اس کی فطرت یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ اس کے لاڈلے اور محبوب متعلقین بے راہ روی اختیار کر کے جہنم کی آگ کا ایندھن بنیں، یا گھر کا سکھ چین اور خاندان کا قلبی و ذہنی سکون غارت کریں یا اپنی حرکات سے گھر کو جہنم بنا دیں اور آنکھوں کی ٹھنڈک بننے کی بجائے ہر دم خار کی طرح کھٹکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

اے ایمان والو! اپنے کو بھی جہنم کی آگ سے بچاؤ اور اپنے اہل و عیال کو بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ

تم میں سے ہر آدمی ذمہ دار اور نگراں ہے۔ ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی۔

عزیزو! یہ بھی ہم سب کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اپنی اور اپنے خاندان کی اصلاح و تربیت کی طرف سے غفلت برت کر جو بھی دوسروں کی اصلاح و تربیت کو جاتا ہے اس کی باتوں کو کوئی وزن نہیں دیا جاتا۔ مخاطب یہی سوچتا ہے کہ یہ کہنے کی باتیں ہیں کرنے کی نہیں۔ اپنے اور اپنے گھر کے داغ دھبوں پر تو حضرت کی نظر جاتی نہیں اور دوسروں کی اصلاح و تربیت کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ہم اس طرح دوسروں کی اصلاح و تربیت یا غیروں تک دعوت پہنچانے کا کوئی کام مؤثر طور سے نہیں کر سکتے۔

معزز ساتھیو! ان باتوں کے پیشِ نظر اس شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمان جان بوجھ کر اس فریضے کی طرف سے غفلت اور کوتاہی برتتے ہوں گے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی بساط کے مطابق ہر ایک اپنے گھر والوں کی اصلاح و تربیت کی کوشش کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مطلوبہ نتائج بہت کم برآمد ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس پیچیدہ کام کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں اور پتّہ ماری کا یہ کام جتنا صبر و استقلال چاہتا ہے اس میں عموماً کمی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں چند باتوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ خدا کرے اس کام میں وہ آپ کی معاون ثابت ہوں۔

ا۔ یہ حقیقت ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے کہ اپنی تربیت د

اصلاح اصلاً اپنے آپ ہی کی جاتی ہے کوئی فرد زبردستی کسی دوسرے کی تربیت نہیں کر سکتا۔ ایک مربی صرف توجہ دلا سکتا ہے، آمادہ کر سکتا ہے، تقلید کے لیے اچھا نمونہ پیش کر سکتا ہے، اصلاح کی طرف سے مایوس ہونے سے بچا کر خود اعتمادی پیدا کر سکتا ہے۔ مناسب ماحول، سازگار فضا اور ممکنہ آسانیاں بہم پہنچا سکتا ہے جو بہرحال مربی کو کرنا ہی چاہیے لیکن زور اس پر دینا چاہیے کہ جس کی تربیت مقصود ہے وہ خود اپنی اصلاح و تربیت پر تیار ہو اور اس کے لیے خود کوشش کرے۔

۲۔ کسی کی اصلاح میں معاون و مددگار صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے وہ اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھتا ہو جس کے ایثار اور حسن سلوک کا اسے ذاتی تجربہ ہو جس کے ایثار اور حسن سلوک کا اسے ذاتی تجربہ ہو جو اس کی صفات سے نہیں ذات سے محبت کرتا ہو جس کے ہاتھ میں وہ اپنی جان و مال و عزت و آبرو محفوظ سمجھتا ہو۔ جو اس کے محاسن کو سراہتا ہو، اور عیوب سے چشم پوشی کرتا ہو، جو اس کی اصلاح کی طرف سے پرامید ہو جس کے کردار سے وہ متاثر ہو اور جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔

۳۔ کردار کے معاملے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ انسان اپنی کمزوریوں کو دوسروں سے چھپا اور ان کے سامنے مصنوعی تقوے کا لبادہ اوڑھ سکتا ہے۔ مگر اپنی بیوی بچوں اور والدین سے نہیں چھپا سکتا۔ گھر والوں کے سامنے وہ ایک کھلی کتاب ہوتا ہے۔ اس کے بچے احترام کی وجہ سے اور والدین شفقت کی وجہ سے پردہ پوشی کرتے ہیں۔ مگر بیوی اس معاملے میں زیادہ محتاط بھی نہیں رہتی۔ گھر میں وہ آخری ہستی ہے جو شوہر کے حسن کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ خیارکم خیارکم لنسائہم۔ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔ پس گویا بیویاں آپ کے لیے کسوٹی ہیں۔ وہ جب آپ کے کردار سے متاثر ہوں، تب سمجھیے کہ آپ کچھ سدھرے ہیں اور اب آپ کی اصلاحی کوششیں ان شاء اللہ کامیاب ہو سکیں گی۔

۴۔ متعلقین کے سلسلے میں اپنے رویے میں خوش گوار تبدیلی پیدا کیجیے۔ محبت، ہمدردی، دل سوزی اور شفقت سے پیش آئیے۔ اپنے وجود کو گھر میں رحمت بنانے کی کوشش کیجیے حضرت عمرؓ کے بقول، اہل و عیال کے ساتھ بچوں کی طرح رہیے۔ البتہ جب ان کی ضروریات سامنے آئیں تو ان کی تکمیل کے لیے مردانہ وار کوشش کیجیے۔ مسکراتے اور سلام کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوجیے۔ اہلیہ اور بچے مسرت کے ساتھ آپ کا استقبال کریں گے۔

۵۔ اہل و عیال سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لینے کی وجہ سے معمولی کوتاہیوں پر اشتعال اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس، چہرے اور زبان کے ساتھ اظہار بھی ہو جاتا ہے اور جس کے بہت خراب اثرات رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کیجیے۔ کیونکہ نادانی، ناتجربہ کاری، عمر اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے اہل و عیال سے تاپروائی کوتاہی بعید نہیں۔ اس لیے

ان کی اصلاح کی طرف سے نہ تو خود مایوس ہوں اور گھر والوں کو مایوس کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)

غلطیوں پر عفو و درگذر سے کام لیں جج کی طرح کسی غلطی پر سزا دینے کے بجائے مصلح اخلاق کی طرح ندامت کا جذبہ بیدار کر کے ایسی حرکت سے آئندہ باز رہنے کے لیے محبت سے سمجھائیں۔ سختی کرنے سے اہل وعیال میں پہلے جھوٹ بولنے اور جھوٹی تاویل کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ نفرت اور آخر کار بغاوت کا جذبہ ابھر آتا ہے جس کا نتیجہ فرد کے ساتھ خود گھر کی تباہی ہے۔

۶۔ گھر والوں کی عزت نفس، غیرت وحمیت اور شرم وحیا کی حفاظت کیجیے۔ دوسروں کے سامنے ڈانٹنے پھٹکارنے، مارنے پیٹنے اور شکایت کرنے سے پرہیز کیجیے۔ خوبیوں کو سراہتے ہوئے ہمیشہ تنہائی میں محبت سے سمجھائیے۔ اور آمر و ڈکٹیٹر کی طرح حکم دینے کی بجائے مشیر کی طرح مشورہ دیجیے۔

۷۔ گھر کی فضا کو خوشگوار بنائیے۔ بچوں کے سامنے آپس میں جھگڑا تکرار سے بچیے۔ باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے لیے ایثار کا جذبہ ابھاریے۔ گھر کی ذمہ داریوں میں ہر ایک کو اس کی بساط کے مطابق شریک کرکے ہر ایک کے اندر اپنائیت کا احساس بیدار کیجیے۔ بچوں کے مابین عدل و مساوات برتیے گھر کا بجٹ حتی الامکان سب کے مشورے سے بنائیے۔ ان کے معاملات میں ان سے مشورہ ضرور کر لیا کیجیے۔

۸۔ نماز کا خود بھی غیر معمولی اہتمام کیجیے اور محبت و پیار سے جملہ افراد خاندان کو بھی اس کا پابند بنائیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو)

جب اہل وعیال اپنے شوق سے نماز کی پابندی کرنے لگیں تو سمجھیے کہ اصلاح کی راہ پر چل پڑے ہیں کیونکہ یہ نماز آدمی کو اپنی اصلاح کے لیے لازماً فکر مند بنا دیتی ہے۔ اِنَّ الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

۹۔ اپنے اہل وعیال کی اصلاح کے لیے برابر دعا کرتے رہیے ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین و اجعلنا للمتقین اماما۔ (اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا سربراہ بنا۔

یاد رہے دعاؤں میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اللہ کے فضل سے بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں۔

۱۰۔ والدین اور بڑوں کے معاملے میں یہ بات یاد رکھیے کہ آپ ان کے ہمسر اور مربی نہیں، خورد اور پروردہ ہیں ان کے سامنے ہمیشہ معذرت خواہانہ انداز میں آئیے۔ ان کا احترام ان سے محبت، ان کی خدمت کیجیے اور خوش دلی سے ان کے حقوق ادا کرتے ہوئے حسن سلوک کیجیے اور ان کی دعائیں لینے کی فکر کیجیے اگر وہ آپ کے اپنائے ہوئے راستے سے مطمئن ہو گئے کہ اس میں آپ کا دنیوی یا اخروی نقصان نہیں ہے بلکہ دین و دنیا کی فلاح کا یہی راستہ ہے تو سب سے زیادہ وہ خوش ہوں گے (باقی صفحہ ۵۰)

عصر حاضر میں تحریک اسلامی

موجودہ صورت حال

(آخری قسط)

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

عاصر تحریک اسلامی کا میدان کار

آزادی کے بعد سے عرب دنیا میں صدر ناصر نے انڈونیشیا
ں صدر سوئیکارنو نے، پاکستان میں وہاں کے حکمرانوں نے
ندوستان میں پنڈت نہرو نے اور اس طرح ان دوسرے
م ترقی یافتہ ممالک میں جہاں اسلامی تحریکیں کام کر رہی تھیں
ہاں کی لیڈرشپ نے بظاہر بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا
ن سے یہ امیدیں وابستہ کی جانے لگی تھیں کہ وہ ان ملکوں
ں ناخواندگی، جہالت، کاہلی، پس ماندگی اور اقتصادی
رحالی کو دور کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کر کے ایک ایسے
ل کا آغاز کر دیں گے جس کے نتیجے میں مشرق، بالخصوص اسلامی
شرق کے یہ پس ماندہ ممالک اس قعر مذلت سے نکل سکیں
گے جن میں وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت سے آج
ائے جاتے ہیں۔ مگر ۲۵ برس کے بعد اب یہ نظر آتا ہے تقریریں
ریادہ کی گئیں اور ٹھوس کام کم ہوا۔ تعمیر و ترقی کا جو کام ان
علاقوں میں انجام پا سکا وہ اس سے بہت کم ہے جو کیا جا سکتا تھا اور جو ترقی یافتہ ممالک پر انحصار کامل کی اس کیفیت میں نمایاں کمی کے لیے ناگزیر ہے جو آج پائی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی آزادی کے باوجود اقتصادی احتیاج نے ان ممالک کو عظیم طاقتوں کا دست نگر بنا رکھا ہے اور وہ اپنی داخلی تہذیبی زندگی یا خارجی بین الاقوامی سیاست دونوں میں کوئی آزادانہ موقف اختیار کرنے سے قاصر ہیں ان کی اقتصادی بدحالی ان کے عوام کے لیے زندگی دشوار بناتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر حالیہ افراط زر اور بڑھتی ہوئی قیمتوں کے دباؤ نے عوام میں اضطراب کی لہر دوڑا دی ہے۔ ایسی صورت حال میں کوئی ایسی تحریک جو اقتصادی بدحالی دور کرنے اور سماجی عدل قائم کرنے کو اپنے پروگرام میں اہم ترین مقام نہ دیتی ہو یا جس کا فکر اس مسئلے کو ثانوی قرار دیتا ہو ان عوام میں قبول عام حاصل کرنے کی امید نہیں

نہیں کرسکتی۔ یہی نہیں بلکہ پسماندہ مسلمان ممالک کے عوام اب اس بات سے مایوس ہوتے جارہے ہیں کہ ان کی مفلوک الحالی کو دور کرنے اور ان کے سماج میں دولت و آمدنی کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی نابرابری کو کم کرنے کا کوئی بھی تدریجی اور آہستہ خرام پروگرام نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔ وہ اب اس مسئلے میں اس سے بنیادی طور پر مختلف Radical ایپروچ کے خواہاں ہیں۔ یہ بات کہ اسلامی تحریکیں ان کی توقعات پوری نہیں کرسکتیں ان میں یہ رجحان پیدا کرتی ہے کہ ذہنی طور پر ان تحریکوں سے متاثر ہونے کے باوجود اقتصادی مسئلے کے حل اور عدل کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے دوسری انتہا پسند تحریکوں کی طرف رجوع کریں۔

یہاں اس بات کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ جس زمانے میں نئی اسلامی تحریکیں ابھر رہی تھیں اس زمانے میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اشتراکیت کا سیلاب فکری طور پر اسلامی ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ چونکہ اس زمانے میں اشتراکی تحریک کا دین و مذہب کے خلاف جارحانہ رجحان زیادہ نمایاں تھا۔ اس لیے ان تحریکوں نے اور زیادہ ضروری سمجھا کہ اشتراکیت کے رد و ابطال پر زور صرف کریں اور اقتصادی امور میں بھی اسلام کے ایپروچ کا اس سے بہت زیادہ مختلف ہونا واضح کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتصادی تنظیم اور ایک بگڑے ہوئے سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ سماج کی اصلاح کرکے عدل و انصاف کے قیام کے طریقوں کے باب میں بہت سی ان شکلوں کے خلاف بھی اسلامی حلقوں میں بیزاری ظاہر کی گئی جن کی اسلام میں پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔ بعد میں اس مزاج میں قدرے اعتدال آجانے کے باوجود عوام کا یہ تاثر برقرار رہا کہ اسلامی تحریک تدریجی اصلاح سے آگے بڑھنے اور عدل کے قیام کے لیے سماج کے بنیادی ڈھانچے میں زبردست تبدیلیاں کرنے کی قائل نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی ان تحریکوں کی عوام کے سامنے جو تصویر ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ان کا بنیادی مشن دنیا سے ظلم و استحصال کا خاتمہ کرکے عدل و انصاف قائم کر دکھانا ہے۔ چنانچہ کمزور و مجبور، مظلوم و مقہور اور وہ طبقات جن کو عرصہ دراز سے ترقی اور خوش حالی کے ثمرات سے بالکلیہ محروم رکھا گیا ہے۔ تحریک اسلامی کی اپیل میں ذہنی طور پر جاذبیت محسوس کرنے کے باوجود اپنے دکھ درد کا کوئی مداوا نہیں پاتے۔

اسلامی دنیا کا ایک نیا قابل ذکر مظہر یہ ہے کہ جو نعرے ابتداءً نئی اسلامی تحریکوں نے بلند کیے تھے وہی اب بعض حکمرانوں نے بھی اختیار کرلیے ہیں۔ اگرچہ ان حکمرانوں نے اپنے نظام تعلیم، قوانین مملکت، عدالتی نظام اور عام نظم و انصرام میں وہ تبدیلیاں نہیں کی ہیں جن کا مطالبہ ان تحریکوں کی جانب سے کیا جاتا رہا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معروف معنے میں انھوں نے اس جانب کچھ پیش قدمی کر دکھائی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں لیبیا اور سعودی عرب کے حکمران مسلمان عوام کے اندر یہ حسن ظن پیدا کرتے ہیں کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قائم

کرنا چاہتے ہیں۔ تحریک اسلامی کے حلقوں میں یہ دعویٰ تسلیم کرنے سے اس لیے گریز کیا جاتا ہے کہ دونوں ریاستوں میں آزادی، جمہوریت شورائی نظام حکمرانی کا فقدان نظر آتا ہے اور سماجی عدل کے باب میں بھی یہ حلقے ابھی ان حکمرانوں کے طرز عمل سے مطمئن نہیں ہیں۔ جہاں تک شرعی حدود اور اسلام کے قانون فوجداری کے نفاذ کا تعلق ہے تحریک اسلامی کے حلقوں میں اہمیتوں کے اعتبار سے کاموں کی درجہ بندی وہ نہیں ہے جو ان حکمرانوں نے اختیار کی ہے مگر ابھی تک عام مسلمانوں پر یہ واضح نہیں ہو سکا ہے کہ ان مملکتوں کی نسبت سے اسلامی تحریک کیا موقف اختیار کرتی ہے اور کیوں؟ غیر مسلم دنیا کی نسبت سے یہ وضاحت اور بھی زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ عدم وضاحت کی صورت میں وہ ان مملکتوں کے طرز عمل کو عصر حاضر میں اسلام کی ترجمانی سمجھے گی جس کا اثر قدرتی طور پر تحریک اسلامی کے بارے میں اس کے رویّے پر مرتب ہوگا۔ مختلف اسباب وعوامل کی بنا پر ابھی تک نہ موقف کی یہ وضاحت عمل میں آسکی ہے، نہ اس کے عملی تقاضوں کی نشان دہی کی جاسکی ہے جس سے فکر و عمل دونوں میں انتشار کا اندیشہ ہو۔

تحریکِ اسلامی کی موجودہ صورتِ حال

ماضی قریب میں اہمیت اختیار کرجانے والے مذکورہ بالا دو اہم مظاہر کی نشان دہی کے بعد اب ضروری ہے کہ ہم مجموعی طور پر تحریک اسلامی کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں۔ ظاہری حرکت اور بعض اوقات ہلچل کے باوجود دنیا میں تحریک اسلامی کو ایک لمحہ فکر میں ٹھٹکے ہوئے ہونے سے تعبیر کرنا درست ہوگا۔ یہ ٹھٹک جانا نہ بلا سبب ہے نہ نامناسب اور بے موقع۔ میرے نزدیک اب آگے بڑھنے سے پہلے ایسا ہونا ناگزیر تھا اور یہ امر خوش آئند ہے کہ اس کا شعور عام ہو چلا ہے۔ جن اہم سوالات نے اس کارواں کو جو ابتدا بڑے ذوق و شوق سے مگر کچھ عرصے سے جھجکتا ہوا ایک راہ پر چلا جا رہا تھا اب رک کر پیچھے دیکھنے اور آگے بڑھنے سے پہلے راہ متعین کرنے پر مجبور کر دیا ہو وہ یہ ہیں:

۱۔ وہ تحریک جو تبلیغ و اشاعت افکار، پھر تنظیم اور سیاسی جدوجہد کا طریقہ اختیار کرکے آگے بڑھی تھی ان حالات میں کیا کرے جب حکمراں قوتیں ان میں سے کسی بات کی اجازت نہ دیتی ہوں۔

۲۔ مذکورہ بالا صورت حال کے علاج کے لیے جمہوریت کی بحالی کو اپنا مقصود بنا کر اس پر توجہ صرف کرنا ایسی صورت میں کس حد تک مفید ہو سکتا ہے جب کہ عوام کی غالب اکثریت ناخواندگی اور جہالت، اندھی تقلید اور جذباتیت نیز معاشی مفلوک الحالی اور مفادات محفوظہ (Vested interests) کی کاسہ لیسی کے سبب اپنے حق رائے دہی کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے سے بھی قاصر رہ سکتی ہو۔

۳۔ ان ممالک کی نسبت سے تحریک عملاً کیا موقف اختیار کرے جو اسلامی نظام قائم کرنے کے دعوے میں اس سے

پیچھے نہیں مگر خود اسے آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتے۔

ان تینوں سوالات کا تعلق تو تحریک کی حکمت عملی STRATEGY سے فوری قسم کا ہے جن کا کوئی واضح جواب دیے بغیر آگے بڑھنا محال ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے امور و مسائل بھی ہیں جن میں یکسوئی ضروری ہو گئی ہے۔ ان امور و مسائل کے ذکر سے پہلے ان کی تمہید کے طور پر یہ کہنا ضروری ہے کہ چالیس سالہ فکری کوششوں کے باوجود سماجی علوم اور انسانی زندگی کی تعمیر نو سے متعلق جو مواد پیش کیا جا چکا ہے۔ اس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک گروہ اب بھی مطمئن نہیں ہو سکا ہے اور بہت سے ایسے سوالات اٹھائے جا چکے ہیں جن پر غور و بحث کی ضرورت باقی ہے۔ بہت سے امور میں ابھی کوئی ایسی رائے نہیں بن سکی ہے جس پر تحریک اسلامی کے حلقے متفق ہوں یا عصر حاضر کے تعلیم یافتہ مسلمان مطمئن ہوں۔ خاص طور پر معاشی اور معاشرتی زندگی کے باب میں یہ امر اب بھی وضاحت طلب ہے کہ اسلام کی امتیازی دین (CONTRIBUTION) کیا ہے اور اسے قبول کرتے ہوئے دور جدید کے مسلمان انسانی عقل و تجربہ اور معاصر نظاموں سے اخذ و ترک کا طریقہ کس حد تک اختیار کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل امور و مسائل کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ابھی تک یہ تحریکیں عام انسانوں کو مخاطب کر کے ان کے کسی معتدبہ گروہ کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ حالانکہ وہ اس دعوے کے ساتھ آگے بڑھی تھیں کہ اسلام دین انسانیت ہے، انسان کو اسلام کی ضرورت ہے اور اسلام ہی جدید انسان کے دکھ درد کا مداوا فراہم کر سکتا ہے۔ آج مسلمانوں اور عام انسانی دنیا کے درمیان ذہنی سطح پر عمل اور رد عمل کا جو کھلا عمل مسلسل جاری ہے اس کے پیش نظر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم دنیا پر کسی نمایاں فکری اثر (Impact) کے بغیر مسلم دنیا کو اسلام کے حق میں اس حد تک یکسو کر لینا دشوار ہو گا کہ وہ اسے اپنی اجتماعی زندگی کی اساس بنا لیں اگر عام انسانی فکر، بالخصوص ان امور کی بابت افکار پر جو سماجی علوم کا میدان بحث ہیں۔ اسلامی اثرات مرتب ہو جائیں تو مسلم دنیا پر بھی اس کے دور رس اثرات پڑیں گے

ذیل میں جن امور و مسائل کا ذکر کیا جا رہا ہے؛ سماج کے لیے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی نسبت سے تحریک اسلامی کا موقف مخاطب کے قبول یا عدم قبول کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے تحریک کا ان امور و مسائل کی طرف پوری توجہ دینا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین تحریکی لٹریچر اور اخبارات و جرائد میں بھی ان کی طرف توجہ کی علامتیں ملتی ہیں اور نجی تبادلۂ خیال میں بھی اب ان کو بہت اہمیت دی جانے لگی ہے۔

۱۔ تحریک اسلامی کے طریق کار میں اشاعت افکار سے زیادہ زور اسلامی قدروں کے عملی رواج پر دینا۔

افکار و تصورات کو ذہنوں میں جاگزیں کر دینے اور عملی رویہ تبدیل کر کے انسانوں کو اسلامی قدروں کی تحصیل میں لگا دینے میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر کو

ثانی الذکر کا ذریعہ بنانا ناگزیر ہے لیکن مطلوبہ نتائج کا ظہور تمام تر صرف تبلیغ و اشاعت افکار سے نہیں عمل میں آسکتا دوسری طرف داعی گروہ اگر معاشرہ میں اعلیٰ اقدار حیات کو رواج دینے کی عملی کوشش میں کسی حد تک کامیابی حاصل کرے تو اس سے اسلامی افکار و تصورات کے قبول عام کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ اس گروہ کو معاشرے میں یہ شہرت حاصل ہونی چاہیے کہ یہ سارے انسانوں کو یکساں طور پر آزاد سمجھتا ہے اور کسی فرد یا گروہ کو دوسروں پر حکومت جتانے کا حق دار نہیں سمجھتا بلکہ اجتماعی امور کے باہمی مشورہ سے طے پانے کے اصول پر کاربند ہے۔ وہ دولت کو خدا کی امانت سمجھ کر اعتدال کے ساتھ اپنے صرف میں لانے کے ساتھ اس میں سماج کا ایک حق تسلیم کرتا اور زندگی کو باہمی تعاون سے گذارنے کا قائل ہے جس میں خداداد وسائل سے سب فیضیاب ہوسکیں۔ اس کا عمل اور سماجی امور میں موقف اس بات پر گواہ ہونا چاہیے کہ وہ انسانی معاشرے کو مساوات، عفت و پاکبازی، رحمت و شفقت اور کمزوروں کی حمایت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس گروہ سے توقع کی جاتی ہے کہ معاشرے میں اچھائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کی روک تھام کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے گا اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے میں کبھی کوتاہی نہ کرے گا۔ ایک ایسے ہی گروہ کی عملی کوشش انسانوں کے عملی رویے کو ان قدروں کے مطابق ڈھالنے اور ان مقاصد کا خادم بنانے میں کامیاب ہوسکتی ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ یہی طریق کار تحریک اسلامی کو عصر جدید کی ان سیکولر تحریکوں سے ممتاز کرسکتا ہے جو ابتدا ہی سے اپنا مرکز توجہ سماج کے تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلی کو بناتی ہیں اور افراد کو بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتیں۔ نیز یہی طریقہ اختیار کرکے ان ملکوں میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے جن کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمان نہیں ہے۔ اپنی طویل تاریخ میں مسلمان اسلام کے نام پر مختلف قوموں سے ٹکرائے بھی ہیں اور اس ٹکراؤ کی اور اس کے نتیجے میں مغلوبیت کی تلخ یادیں آج بھی ان قوموں کے ساتھ ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو نفرت اور بیزاری کے زہر سے پاک کرکے ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے حسن ظن پیدا کرنے میں، تاکہ وہ دعوت اسلامی پر کھلے دل و دماغ سے غور کرسکیں، مذکورہ بالا طریق کار سے بڑی مدد مل سکتی ہے لیکن یہ طریق کار اختیار کرنے کے لیے ہمہ گیرانہ وسیع النظری اور عالی حوصلگی کی ضرورت ہے جس سے دور حاضر کی سیاسی مزاج کی تحریکیں بالخصوص اشتراکی تحریک بالکل عاری رہی ہے اور اس مزاج عصر کے اثرات سے اسلامی حلقے بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔

۲۔ مسلمان عوام کی ناخواندگی اور جہالت اور مسلم ممالک کی معاشی پس ماندگی دور کرنے کی اسلامی اہمیت ۔ یہ سوال اس لیے اہمیت حاصل کرگیا ہے کہ ایک طرف تو موجودہ صورت حال خود ان تحریکوں کے پیغام کو سمجھنے اور قبول کرنے میں مانع ثابت ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر ان کی دعوت قبول بھی کرلی جائے تو اس صورت حال

کو بدلے بغیر مسلمان ملکوں میں اسلامی نظام قائم ہونا دشوار ہے۔ آج کی دنیا میں محتاج بڑی طاقتوں پر انحصار کرنے والی اور ناطاقتی کا شکار قومیں تہذیبی خود ارادیت سے بھی محروم ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ان کے ان اجتماعی فیصلوں کے نفاذ میں مانع ہوگی جو بڑی طاقتوں کی پسند اور مزاج کے خلاف ہوں۔ مزید برآں عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کے زبردست استیلاء اور اسلامی دنیا میں ان کے جارحانہ عزائم رکھنے والے ایجنٹوں کا وجود ایک ایسا چیلنج ہے جس کے مقابلے کے لیے پوری طاقت بھی ناگزیر ہے۔ اس طاقت کی فراہمی کے لیے تعلیم، بالخصوص سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست پیش رفت اور بڑے پیمانے پر صنعتی عمل (Industrialisation) ضروری ہے۔ تحریک اسلامی کو اس سوال کا جواب دینا ہے کہ ان کاموں کی اسلامی اہمیت کیا ہے اور وہ ان کو اپنی دعوت اور نظام اصلاح و تربیت میں کیا مقام دیتی ہے۔ اس سوال کے جواب پر ان جماعتوں اور ان کے وطن کے حکمرانوں نیز سماج کی بعض دوسرے طبقات سے ان کے ربط تعلق کی نوعیت کا بھی انحصار ہے۔ مغربی ایشیا کی تازہ ترین جنگ جس طرح شروع ہوئی، جس طرح رکی اور جس طرح بڑی طاقتیں ان میں شریک رہیں۔ اس نے اس سوال کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ نیز اسی سے یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ اسلامی ممالک میں حکمرانوں اور اسلامی تحریکوں کا باہمی ٹکراؤ کس حد تک ضروری یا مفید ہے۔ اس امر پر بھی غور و فکر ضروری ہے کہ جس حد تک یہ ٹکراؤ عالمی سطح پر اسلام دشمن استعماری قوتوں کی ریشہ دوانیوں اور ذہنی استیلاء کا نتیجہ ہے۔ اس حد تک اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صحیح حکمت عملی کیا ہے کیا یہ زیادہ مفید نہ ہوگا کہ یہ لڑائی اپنے اصل محاذ پر لڑی جائے اور دشمن کو اس سازش میں ناکام بنایا جائے کہ یہ لڑائی ہمارے ہی گھروں کے اندر لڑی جاتی رہے۔

۳۔ اسلامی نظام کے قیام میں تدریج کا ناگزیر ہونا۔

ماضی کے تجربات اور حال کی سنگین صورت حال نے اس بات کو زیادہ اہم بنا دیا ہے کہ تحریک کے کارکن سمجھ کر آگے بڑھیں کہ ان کا مقصود رفتہ رفتہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ عرصہ تک تعلیم و تربیت اور تعمیری کاموں کی ضرورت ہے، بلکہ تجربات کے مراحل سے بھی گذرنا ہوگا اور خارجی مواقع پر عارضی مسائل کے سبب بھی حصول مقصد کا عمل سست رفتار ہو سکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ حکومتوں سے بہت سی قانونی تبدیلیوں کے مطالبے کو اولیت حاصل ہونی چاہیے یا کچھ اور کاموں کو، کیونکہ عصر حاضر میں اصل مسئلہ متعین اور معلوم اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہے۔ یہ کام خود ایک بڑے کام کا جزء ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عصر حاضر کی پیچیدہ زندگی میں عدل و انصاف آزادی مساوات، عفت و پاکبازی سکون خاطر اور طمانیت قلب کے وہ مقاصد کس طرح حاصل کیے جائیں جن کے لیے یہ قوانین دیے گئے ہیں اور دوسرے قوانین بھی بنانے ہوں گے مگر جو صرف قانون سے نہیں حاصل ہو سکتے بلکہ ان کے حصول کے لیے پہلے انسانوں کے خیالات و افکار، مزاج و رجحان

اور حوصلوں میں تبدیلیاں درکار ہوں گی۔

۴۔ اسلامی نظام کے قیام تک، اسی مقصد کے لیے ملک کے موجودہ نظام میں اشتراک و تعاون کا مسئلہ اس مسئلے کی نوعیت مذکورہ بالا تینوں نکات کی روشنی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ اگر اسلامی تحریکیں دستوری اور قانونی مطالبات پر اسلامی قدروں کے عملی رواج تعلیم و تربیت، مادی تعمیر و استحکام وغیرہ کاموں کو ترجیح دینا طے کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے ملک کی انتظامی مشینری سے کنارہ کش رہیں۔ اس طرح ہندوستان جیسے ممالک میں نظام وقت سے اجتناب اور کنارہ کشی کا طریقہ جس ناطاقتی اور سماجی بے اثری پر منتج ہو سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل شرکت اور استفادہ کا طریقہ مقصد برآری کے لیے زیادہ مفید نظر آتا ہے۔

۵۔ معاصر انسانیت اور اسلام کے درمیان نقاط اتفاق و اختلاف کی تعیین۔

۶۔ معیشت و سیاست کی تنظیم اور معاشرتی زندگی میں اسلام کے دائرے میں انسانی آزادی کی وسعتیں۔

۷۔ اسلام کے سیاسی نظام میں غیر مسلم کا مقام۔

۸۔ اسلامی سماج میں عورت کا مقام۔

ان امور پر ہم آئندہ صفحات میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔

۹۔ اسلامی زندگی کی تنظیم نو میں فقہ مرتب کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور سنت کا صحیح مفہوم۔

اصولی طور پر تحریک نے اس باب میں جو موقف ابتداءً اختیار کیا تھا وہ بدلتی ہوئی دنیا میں اللہ کی دائمی ہدایت پر عمل کے دشوار مسئلے میں صحیح رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے یہ موقف یہ تھا کہ قرآن و سنت کے منشاء کی تعیین میں جملہ انسانی اجتہادات وآراء قابل ترمیم ہو سکتی ہیں اور انسان صرف ان ہدایات کا پابند ہے جن کا اسے قرآن و سنت کی نصوص پابند بناتی ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایات میں سے جن ہدایات کا تعلق خالصتہً دنیوی معاملات سے ہو، مثلاً زراعت یا علاج معالجے کے طریقے وغیرہ یا اخلاقی مقاصد کے تحت دی گئی جن ہدایات کا تعلق ایسے حالات سے ہو جو اب نہیں پائے جاتے یا جن کا تعلق ان خالصتہً انتظامی اور وقتی امور سے رہا ہو جن سے آپ کو اسلامی ریاست کے صدر کی حیثیت سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ ان کے فہم و تعبیر میں ان کے اس پس منظر کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔ لیکن جب عملی مسائل پر غور و بحث کا مرحلہ آتا ہے، کسی جدید مسئلے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے، یا مسلمان معاشروں میں رائج ایسے طور طریق کی اصلاح کا سوال پیدا ہوتا ہے جو اجتہادی احکام پر مبنی تھے مگر اب اجتماعی مفاد و مصالح کے خادم نہیں نظر آتے تو تحریک سے وابستہ اصحاب علم بسا اوقات مذکورہ بالا اصولی موقف کا حق ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ان کا طرز استدلال اور ان کی آخری رائے کلیات دین پر مبنی اجتہاد کی بجائے جزئیات فقہ کی تابع نظر آتی ہے وہ سنت سے مقاصد و مصالح اخذ کرنے پر قانع نہیں ہوتے بلکہ شکلوں اور تفصیلات میں وہی طریقے قائم رکھنا ضروری

سمجھتے ہیں جو پہلے اختیار کیے جا چکے ہیں ۔ اس طرح مختلف جدید مسائل یا اہل اصلاح قدیم رواجوں کے ضمن میں ان کا موقف مزاج عصر کی رعایت سے قاصر اور عدل و انصاف، انسانی شرف اور اجتماعی مفادات و مصالح کے ان جدید ترین فہم سے متغائر ہوتا ہے جو انسان نے اپنے حالیہ تجربات سے اخذ کیا ہے ۔ اس مغایرت کا مظاہرہ مختلف علاقوں میں مختلف عملی مسائل پر غور و بحث کے ضمن میں ہوا جن میں سے مثال کے طور پر چند کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ عائلی قوانین میں اصلاح ۔ اسلام کے قانون فوجداری کی بعض دفعات انشورنس، پردہ، تصویر، خاندانی منصوبہ بندی اور مشینی ذبیحہ ۔

اب ہم اختصار کے ساتھ مذکورہ بالا چار نکات پر روشنی ڈالیں گے ۔

عصر حاضر کے انسانوں کے عام ذہن و مزاج کا جائزہ لیا جائے تو جہاں بعض ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو اسلام سے اس کی دوری بڑھا رہی ہیں وہاں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جنھوں نے اسے اسلام سے قریب کر دیا ہے ۔ ان انسانوں کو دعوت اسلامی کا مخاطب بناتے وقت دونوں ہی طرح کی باتوں کو سامنے رکھنا اور ان کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔

مذہب اور ہدایت الٰہی سے جدید انسان کا رشتہ بہت کمزور ہو چکا ہے، بلکہ اجتماعی امور حیات میں یہ رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا ہے ۔ آخرت کا کوئی ایسا شعور جو ایک مثبت ضابطۂ اخلاق کی بنیاد بن سکے، مفقود ہے ۔ خواہ یہ فقدان انکار آخرت کے سبب ہو یا شفاعت کے تصور پر مبنی ہو ۔ جملہ امور زندگی کے بابت فیصلوں کے لیے عقل انسانی کے خود کفیل ہونے کا احساس اور آزادی کا غیر معتدل تصور نہ تو عقل انسانی کی محدودیتوں کا نوٹس لیتا ہے، نہ اجتماعی مصالح کے تحت انفرادی آزادی پر ضروری قید و بند گوارا کرتا ہے ۔ اس رجحان کا سب سے بھیانک نتیجہ بڑھتی ہوئی اباحیت (Permissiveness) اور صنفی زندگی میں حیا اور عفت اور نظم و ضبط کے تمام پیمانوں کا ٹوٹ جانا ہے ۔ مادی سامان زندگی کی فراہمی عیش کوشی اور قومی سطح پر طاقت اور دوسری قوموں پر سیاسی اور معاشی استیلاء کے مقاصد اب بھی محبوب ہیں اگرچہ بعض انسانی گروہوں میں ان کے خلاف شدید رد عمل بھی پیدا ہو چلا ہے ۔

دوسری طرف زندگی کے چند ایسے اصول و مقاصد کو جن کی اسلام نے ایسے حالات میں تعلیم دی تھی جب دنیا ان سے روگرداں تھی آج ساری انسانیت قبول کر چکی ہے آزادی، مساوات، جمہوریت، سماجی عدل اور انسانی عزت و شرف کے تصورات کی عملی تعبیروں میں اختلاف کے باوجود یہ بات بہت اہم ہے کہ اب دنیا ان پر متفق ہو چکی ہے اس طرح عملی خلاف ورزیوں کے باوجود امن کی مقصودیت اور جنگ کے سد باب پر سب کا اتفاق ہے ۔ سو ڈیڑھ سو برس پہلے کی دنیا اس سے بہت مختلف تھی اور انسانوں

فکر و مزاج میں یہ تبدیلی تحریک اسلامی کے لیے یقیناً خوش آئند ہے۔

اگر تحریک اسلامی مسلمانوں کو خصوصی خطاب اور ان کی اصلاح و تربیت کے اہتمام کے ساتھ سارے انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا چاہتی ہے تو اسے مذکورہ بالا دونوں باتوں کی رعایت ملحوظ رکھنی پڑے گی اور ان کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ اوپر ہم نے اشارہ کیا تھا کہ یہ تحریکیں زیادہ تر مسلمانوں ہی میں کام کرتی رہی ہیں جس کا اثر دین کی ترجمانی اور اس کے مطالبات کی تعیین دونوں پر پڑا ہے۔ اب اسے اس سوال کا جواب کہ انسان اسلام کو اپنا طریقۂ زندگی کیوں بنائے۔ ان لوگوں کے لیے بھی دینا ہے جن کا نہ تو وہ آبائی مذہب ہے نہ عظمت رفتہ کی یادوں کا خزانہ، جس کی طرف نہ مقامی روایات کا تسلسل کھینچتا ہے، نہ جس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا جذبہ سامراجی طاقتوں کے مسلسل ظلم و استحصال کے ردعمل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سوال کے جواب اور نئے انداز دعوت کو عصبیتوں آرزوؤں اور تاریخی یادوں کے معیاروں سے آزاد ہو کر فطرت سلیم، عقل عام، انسانی وجدان، مشترک انسانی تجربات اور انسانوں کے عام مشکلات و مسائل کے حل پر مبنی ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے نقشے پر مبنی ہونا چاہیے عصر حاضر میں اسلامی معاشرت، معیشت اور سیاست کا ایسا نکھرا ہوا تصور درکار ہے جو مسلم دنیا کے رسم و رواج اور ان کی روایات سے آزاد صرف اللہ کی دائمی ہدایات پر مبنی ہو جس میں مختلف صالح مقامی روایات کو جذب کرنے کی صلاحیت ہو۔

چونکہ دور جدید کے عام انسان سے ہماری مراد بیشتر مغرب کا انسان یا وہ انسان ہیں جن کے ذہن و مزاج کی تشکیل میں مغرب کے اثرات نے غالب حصہ لیا ہے لہٰذا اس موقع پر اس مخصوص رویے کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو مغرب کی نسبت سے تحریک اسلامی کے حلقوں میں پایا جاتا ہے جس تاریخی مرحلے میں یہ تحریک ابھری اس میں فطری طور پر اس نے مسلمانوں میں اسلام پر اعتماد کے ساتھ اس کے ایک قابل فخر میراث ہونے کا طاقتور احساس پیدا کیا ہے اعتزاز بالاسلام کا یہ جائز جذبہ اپنی جلو میں یہ خیال بھی لایا کہ اسلام ہر اعتبار سے خود کفیل ہے اور دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں کسی اور ماخذ سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی ہے اس جذبے کا ہدف خاص طور پر مغرب اور مغربی تہذیب تھی جس سے کاٹ کر اسلام کی طرف واپس لانا ان تحریکوں نے اپنا اصل کام سمجھا۔ یہ جذبہ تقلید اور روایت پسندی کے اس مزاج کے ساتھ وابستہ ہو گیا جو صدیوں سے ملت نے اختیار کر رکھا تھا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ فرد کی تربیت معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کے باب میں مغرب کا ہر طریقہ مردود ہے اور ہم اپنا طریق کار تمام تر اپنے ماضی کی روشنی میں خود مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی اس انتہائی شکل میں کہیں لکھی ہوئی نہیں ملے گی مگر اسلامی حلقوں کے عملی رویے اور ان کی تقریروں اور تحریروں میں اس کا

گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

اس جذباتی روش کا اثر اگر صرف معاشی زندگی، اجتماعی تنظیم کے طریقوں اور قابلِ اجتہاد مسائلِ جدیدہ پر خود رو بحث پر پڑتا تو بھی اس کے نقصانات اس قابل تھے کہ اس پر کھل کر بحث کی جائے۔ مگر اس سے زیادہ اہم یہ اندیشہ ہے کہ یہ روش تحریک اور عام انسانوں کے درمیان غیر ضروری حجابات قائم کرنے کا سبب بن جائے گی۔

صورت حال یہ ہے کہ اسلامی مشرق میں کئی سو سال سے اجتہادی فکر، سماجی علوم کا ارتقا اور مسائل انسانی کے حل کے ضمن میں تجربات کا سلسلہ تقریباً بند رہا ہے جبکہ یہ کام غیر مسلم مغرب میں پوری قوت کے ساتھ انجام پایا ہے بیشتر اوقات ان علوم و تجربات کا تعلق زندگی کے ایسے امور سے ہے جن میں اسلام نے مقاصد کی نشان دہی کی ہے ذرائع کی تعیین نہیں کی ہے۔ اوپر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کچھ مذاہبِ عالم کے تاریخی عمل کے نتیجے میں کچھ اسلام کے براہ راست فیضان سے اور کچھ اپنے تجربات سے سیکھ کر متعدد بنیادی مقاصد حیات اور کلیدی اہمیت رکھنے والی قدروں پر انسانیت فی الجملہ متفق ہو چکی ہے۔ مغرب کے آزاد، متحرک اور وسائل سے مالا مال معاشرے میں ان قدروں کی تحصیل کے لیے مختلف النوع تجربات ہوتے رہے۔ ہم ان تجربات سے نہ صرف یہ کہ بے نیاز نہیں رہ سکتے بلکہ قرآن و سنت کی بنیادی ہدایات کی روشنی میں ان سے پورا فائدہ اٹھا کر ہی مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں شورائیت، مساوات بنی آدم اور عدل اجتماعی کے قیام کے لیے خود ہمارا ماضی ہماری تفصیلی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زندگی کے بنیادی حالات بدل گئے ہیں۔ انسانی آبادی کی کثرت، حمل و نقل اور رسل و رسائل کے ذرائع کی سرعت و سہولت، علم حاصل کرنے اور سکھانے نیز معلومات کے منظم استعمال کے طریقوں کا ارتقاء اور وسائل قدرت سے استفادے میں غیر معمولی ترقی نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں اسلامی مقاصد و اقدار کی تحصیل کے لیے جہاں خود اجتہاد و اختراع ضروری ہے وہاں اب تک کے انسانی اجتہادات و اختراعات سے استفادہ بھی ناگزیر ہے۔ یہ عمل اگر شعوری طور پر اور قوت کے ساتھ انجام پانے لگے تو تحریک کو قوت کا ایک نیا منبع حاصل ہو سکے گا اور اس کے اور عام انسانوں کے درمیان ربط زیادہ پائدار بنیادوں پر قائم ہو سکے گا۔ مغرب کے خلاف ایسی عصبیت جو خوب و ناخوب میں امتیاز نہ کر سکے مشرقی سماج کی ان تقلیدی روایات کے بقا و تسلسل کا ذریعہ بن سکتی ہے جن کو اسلام کی دائمی ہدایات کی کوئی سند حاصل نہیں ہے اور تجربے سے مفید پائے گئے ان نئے طور طریقوں کے اختیار کرنے میں رکاوٹ بن سکتی ہے جن کو اختیار کرنے کی اسلامی تعلیمات کے مطابق پوری گنجائش موجود ہے۔ تحریک اسلامی کو مسئلے کے اس پہلو سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اسلامی سماج کو مغرب زدگی (WESTERANISATION) سے

نے کی کوشش اس سماج کو جدید بنانے MODER- NIZATI کی راہ میں رکاوٹ بن جائے کیونکہ یہ عمل ج کی اسلامی تعمیر و ترقی کے لیے بھی ناگزیر ہے اور تاریخی میں اسے رو بکار لانے پر مصر بھی ہیں ۔

اب قوموں کے درمیان ربط و اختلاط اتنا بڑھ چکا ، اور سیاسی اور اقتصادی سطح پر اشتراک و تعاون اتنا زیر ہو چکا ہے کہ کسی علاقے میں بھی انسانوں کا دوسروں ، کٹ کر اپنی زندگی کو منظم کرنا ممکن نہیں رہ گیا ہے ۔ ا صورت میں اسلامی سماج کی تعمیر کا نقشہ بناتے وقت ،ں کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کی کیفیت پر از سر نو نم ورکا ہے ۔ یہ مسئلہ اسلامی ریاست اور دوسری ستوں یا عالمی سطح پر قائم نمائندہ اداروں کے باہمی ا و تعلق تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم پہلو امی سماج میں غیر مسلم شہریوں کے سیاسی حقوق بھی ہیں ت میں جو بنیادی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں ان کے نظر اب ماضی میں اسلامی تاریخ کا کوئی ماڈل من و دہرایا نہیں جا سکتا۔ بلکہ ہمیں تاریخ سے آگے بڑھ کر ،اریخ ساز قوت یعنی قرآن کریم کی روشنی میں اپنا ت کا متعین کرنا ہوگا۔ اسلامی اصول اس بات کے ضی ہیں کہ مستحکم امن کے قیام اور مشترکہ انسانی مقاصد نصول کے لیے عالمی سطح پر مسلمان ملکوں اور غیر مسلم ںکے درمیان اشتراک عمل اور تعاون پایا جائے ۔ طرح یہ مناسب ہوگا کہ اندرون ملک بھی غیر مسلم شہریوں کو مسلمان شہریوں کے پہلو بہ پہلو برابر کے شہری حقوق حاصل ہوں اور انہیں اجتماعی مقاصد کے لیے کی جانے والی تمام کوشش میں حصہ لینے کا پورا موقع ملے قرآن سنت کے مطابق طے شدہ دستوری ڈھانچے میں بھی معیشت کی تنظیم اور عام امور مملکت کی انجام دہی میں انہیں پوری طرح شریک رکھا جا سکتا ہے۔ تحریک اسلامی کی جانب سے اس نکتہ کی مزید وضاحت ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے ضروری ہے جو مسلمان ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں میں پائی جاتی ہیں اور جن کی بنیاد پر وہ اسلامی ریاست کے قیام کی مخالفت کر سکتے ہیں ۔

اسلامی سماج میں عورت کے مقام بالخصوص سیاست اور معیشت میں اس کے حقوق پر اسلامی تحریکوں نے جو رائیں ظاہر کی ہیں وہ مختلف پہلوؤں سے غیر اطمینان بخش ہیں۔ ایک طرف تو ان رایوں کے درمیان خاصا اختلاف ہے اور دوسری طرف اکثر رایوں پر مقامی روایات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اس طرح اس بات کا اہتمام بھی پوری طرح نہیں کیا جا سکا ہے کہ قرآن و سنت کی بنیادی ہدایات کی روشنی میں جدید عورت کے حوصلوں اور توقعات کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی معتدل راہ تجویز کی جائے، بلکہ اکثر اوقات ایسے فقہی جزئیات اور سابقہ نظیروں کو بھی فیصلہ کن اہمیت دے دی جاتی ہے جو ایک خاص زمانے اور کسی خاص مقام کے لیے ہی موزوں ہو سکتی تھیں۔ یہ رائے ان لوگوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جو مغرب کی بے اعتدالیوں سے بیزار ہیں۔

اور عورت کے امتیازی وظیفہ حیات کا پورا وزن محسوس کرتے ہیں۔ تحریکی حلقوں کی موجودہ صورت حال دیکھ کر یہ شبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ عورت کے ساتھ مشرق کے مسلمان معاشرے کے موجودہ طرز عمل پر راضی ہے کیونکہ اس نے اس کو بدلنے اور عورت کو انسانی زندگی کی تعمیر کے اس عمل میں پوری طرح شریک کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی ہے جس کا نام تحریک اسلامی ہے۔

جن امور مسائل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تحریک اسلامی کے حلقوں میں ان کا شعور پایا جاتا ہے اور یہ احساس بھی کہ آگے بڑھنے کے لیے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ ناگزیر ہے۔ تحریک کا نیا عالمی مرحلہ اور اس کو آگے بڑھانے میں مغربی ممالک میں مقیم اعلیٰ تعلیم یافتہ ابنائے تحریک کا سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اب ان مباحث میں بھی حصہ لیا جائے اور ان کوششوں میں عملاً شریک اور دخیل بنایا جائے۔ جو سیاست معیشت اور معاشرت کی تنظیم نو بین الاقوامی تعلقات کی استواری عالمی امن کے قیام اور عالمی سطح پر اقتصادی اور سماجی عدل کے قیام کے سلسلے میں جاری ہیں۔ اسی طریقے سے یہ ممکن ہے کہ ان امور کی بابت جو اسلام جو ہدایت و رہنمائی دیتا ہے انہیں متعلقہ انسانی مصالح اور عقل عام کے لیے قابل قبول استدلال کی بنیاد پر سب کے سامنے پیش کر کے انسانوں کو اسلام سے مانوس کیا جا سکے۔ اسلامی تصور حیات کا تعارف اور اسلامی عقائد کی تلقین کی جو براہ راست کوششیں کی جائیں گی ان کے لیے یہ طریقہ زمین ہموار کرنے کا سبب بنے گا۔ کیونکہ اسلام میں انسانی مسائل کے حل براہ راست اس کے تصور حیات و کائنات اور عقائد سے مربوط ہیں۔ مثال کے طور پر خدائے واحد سے ہر فرد کا براہ راست تعلق اور اس تعلق کی بنا پر دوسرے انسانوں سے مفادات و مقاصد کے اشتراک کا احساس، نیز غیر اللہ سے بے نیازی اور توحید پر مبنی آزادی فکر و ضمیر یہی سماجی عدل، مساوات اور آزادی کی متفق علیہ قدروں کی تحصیل کے لیے پائدار بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔ وہ گروہ جو اپنے فکر و عمل میں ان تصورات اور قدروں کے حق میں مخلص ہو کر تمام انسانوں کے ساتھ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے اشتراک عمل کرے گا عام انسانوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب اور جس حد تک اس عمل میں افراد اور جماعتوں کے ساتھ حکومتیں بھی شریک ہو سکیں اسے مزید تقویت حاصل ہوگی۔ اس عمل کی رہنمائی اور اسے تقویت فکری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے اسلامی سماجی فکر کا مسلسل ارتقاء ضروری ہے۔ فلسفہ اور علوم عمرانی میں اسلامی طرز فکر کی موثر نمائندگی اور ان کے اندر ان کی صحیح تبدیلیوں کے لیے بنیادیں فراہم کرنا جو انسانی زندگی میں اسلام کو مطلوب ہیں عالمی سطح پر کوئی نمایاں اثر (IMPACT) ڈالنے کے لیے شرط لازم ہے۔ ہمارے یونیورسٹیوں اور علمی مجالس اور دوسرے تعلیمی اداروں کو اس کام کی طرف متوجہ کیا جانا چاہیے اور اس بات کا جائزہ لیا جانا چاہیے کہ ہماری دینی درس گاہیں کس طرح اس مقصد کے لیے

مفید بنائی جا سکتی ہیں۔ سر دست ہمارے جدید تعلیمی ادارے خود شناسی سے اور قدیم درس گاہیں اس احساس سے عاری ہیں کہ انہیں دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں بھی کوئی کردار ادا کرنا ہے جس کے سبب اسلامی تحریک کو خاطر خواہ ذہنی قوت نہیں میسر آسکی ہے۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آئند قرار نہیں دی جا سکتی۔ اگر یہ رائے درست ہے کہ سیاسی اور سماجی انقلاب کی راہ علمی او رفکری انقلاب ہی ہموار کر سکتا ہے تو ابھی راہ ہموار کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مطبوعات کی کثرت اور نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ابھی مختلف علوم بالخصوص انسانی علوم (HUMANSCIENCES) میں مغربی اساتذہ کے لائق شاگردوں سے اونچا معیار نہیں پیش کیا جا سکا ہے اور تحریکی حلقوں میں مختلف کاموں کی اہمیتوں کے اعتبار سے درجہ بندی میں بھی علم و ادب اور تحقیق و تفتیش کو وہ مقام حاصل نہیں جو آئندہ کسی زبردست پیش رفت کی بنیاد بن سکے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل

تحریک اسلامی نے اپنا جو دور پورا کر لیا ہے اس نے عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ دین کی جامعیت کا شعور اور اجتماعی زندگی میں دین کی تعلیمات سے روگردانی کا ابطال، اسلام کی موزونیت اور صحت پر اعتماد، اس کی طرف رجوع اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت کا عزم آج کسی مخصوص جماعت یا حلقہ تک محدود نہیں بلکہ پورے مسلمان معاشرے میں عام ہو چکا ہے۔ سیاسی نظم و اتحاد اور اقتصادی صلاحیت کے اعتبار سے بھی آج اسلامی دنیا وہاں نہیں جہاں اس صدی کے آغاز میں تھی۔ ان روشن پہلوؤں کے ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ اسلام کی تفہیم و ترجمانی کا کام اس حد تک انجام پا چکا ہے کہ اب بجز ضد اور ہٹ دھرمی، تعصب اور مفاد پرستی اور جبر و تشدد کے اسلام کے قبول اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں کوئی اور رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یا یہ کہ ہمارے عوام اسلام چاہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ابھی فکری اور علمی سطح پر بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دور جدید کے عام انسان کو دعوت کا مخاطب بنانے کا عمل اور اس کے تقاضوں کی طرف توجہ، ابھی پوری طرح شروع بھی نہیں کی جا سکی ہے۔ اور مسلمانوں کی اسی فی صد ناخواندہ اکثریت میں مذہب کے نام پر خرافات اور مذہبیت کے سہارے نیم جاہل مذہبی پیشواؤں کا وہ تسلط آج بھی قائم ہے جسے ختم کیے بغیر نہ اسلامی انقلاب لایا جا سکتا ہے نہ معاشی پس ماندگی دور ہو سکتی ہے۔

تحریک اسلامی کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور عصر حاضر میں اسلامی تعمیر نو کے تقاضوں کو پہچان کر انہیں پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی

ہے۔ اس طرح یہ بات بھی فیصلہ کن ہوگی کہ گذشتہ ربع صدی کی تاریخ نے تحریک کے فکر اور لائحہ عمل میں جن نقائص اور کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے ان کو پہچاننے اور دور کرنے میں تحریک کی نئی قیادت کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہ نئی قیادت بانیان تحریک کی مقلد محض ثابت ہوتی ہے یا انہی کی طرح اجتہادی فکر سے کام لیتی ہے مستقبل کی تعمیر میں اس کی نگاہیں اپنی ماضی ہی کی طرف رہتی ہیں اور وہ اس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے یا معاصر حالات کے تجزیے اور مستقبل کے بارے میں مبنی بر بصیرت اندازوں کی روشنی میں لائحہ عمل اختیار کرتی ہے ایک راہ تحریک کے لیے جمود اور بالآخر موت کی راہ ہے اور دوسری راہ پر اقدام کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

تحریک اسلامی کے لیے ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں جان دار حصہ وہی باحوصلہ نوجوان لے سکتے ہیں جو ہدایت الٰہی کو اس کے اولین مآخذ سے سمجھ کر صدق دل سے قبول کر لیتے ہوں اور سارے انسانی افکار و آراء کو عقل و تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے مزاج میں پختہ ہو چکے ہوں جن کا محرک کوئی محدود عصبیت نہ ہو بلکہ جو مرضیات الٰہی کے تتبع پر انسان دوستی اور تعمیر عالم کے جذبے سے سرشار ہوں جن کو اس بات کا شعور ہو کہ یہ دنیا اس کے لامتناہی وسائل اور قوت کے وہ خزانے جن پر سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت کے ذریعے ہی قبضہ حاصل کیا جا سکتا ہے سب اللہ نے اس لیے بنائے ہیں کہ وہ انھیں دنیا کو اللہ کی مرضی کے مطابق سنوارنے کے لیے استعمال کر سکیں۔ جن کا ذکر عبادت اور احتساب نفس انہیں اکتساب علم، اجتہاد فکر اور جہاد عمل کے ساتھ انسانی زندگی کے بیچ دھارے میں اتر کر اس تاریخ ساز مشن کی انجام دہی میں یکسوئی اور جرأت کے ساتھ لگا دے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ایسے نوجوان بنائے اور آپ کے فکر و عمل کے نور سے دنیا کو منور کر دے۔

رسائل و مسائل

غیر مسلم میت کے لیے دُعائے مغفرت جائز نہیں

اور

"عملِ صالح" کے لیے ایمان شرطِ لازم ہے

خط

میں نے آپ کے پاس دو سوال بھیجے تھے۔ ایک یہ کہ کسی غیر مسلم کے لیے جو مر چکا ہو دعائے مغفرت کی جا سکتی ہے یا نہیں ۔

اور دوسرا یہ کہ کافر و مشرک کو اس کے نیک عمل پر آخرت میں ثواب ملے گا یا نہیں؟

آپ نے ڈاک سے پہلے سوال کا جواب یہ بھیجا تھا کہ غیر مسلم میت کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں ہے اور اس کی ممانعت خود قرآن میں موجود ہے ۔ اور دوسرے سوال کا آپ نے یہ جواب دیا تھا کہ کافر و مشرک کے بظاہر اچھے عمل پر "عمل صالح" یعنی نیک عمل کا اطلاق صحیح نہیں ہے اور ان کو ایسے اعمال پر قیامت میں ثواب نہیں ملے گا ۔ مہربانی کر کے یہ بتائیے کہ یہ دونوں باتیں قرآن مجید کی کس سورہ اور کس آیت میں ہیں تاکہ میں ان کا مطالعہ کروں اور آپ اگر یہ دونوں باتیں زندگی میں شائع کر دیں تو اچھا ہے اور بھی ایسے مسلمان ہیں جو ان باتوں کی واقفیت نہیں رکھتے۔

جواب

پہلی بات سورہ توبہ پارہ ۱۱ رکوع ۱۴ آیت ۱۱۳ میں ہے :۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ

پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں۔ اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں۔ اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس آیت کے تحت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حاشیے میں لکھا ہے :۔

مؤمنین جب جان و مال سے خدا کے ہاتھ بیع ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہو کر رہیں اعداء اللہ سے جن کا دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو، محبت و مہربانی کا واسطہ نہ رکھیں، خواہ یہ دشمنانِ خدا، ان کے ماں، باپ، چچا، تایا اور خاص بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں، جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے۔ پس جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ بالیقین دوزخی ہے خواہ وحی الٰہی کے ذریعے سے یا اس طرح کہ علانیہ کفر و شرک پر اس کی موت آچکی ہو، اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے .... بہرحال شانِ نزول کچھ ہو حکم یہ ہے کہ کفار و مشرکین کے حق میں جن کا خاتمہ کفر و شرک پر معلوم ہو جائے استغفار جائز نہیں ۔"

اسی آیت کے تحت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن ج ۲ میں لکھتے ہیں:۔

کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنے رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت رکھتے ہیں دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملے میں درست ہیں جو وفاداری کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گنہگار ہو لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے

اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ کہ اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ رکھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے خواہ جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں۔ اخلاص اور وفا کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو" بلکہ یوں فرمایا کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ یعنی اگر ہمارے منع کرنے سے تم باز رہے تو کچھ بات نہیں۔ تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی۔

جو دین کے معاملے میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلہ رحمی، مواساۃ اور رحمت و شفقت کا برتاؤ تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے رشتہ دار خواہ مومن ہو یا کافر، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال مدد کی جائے گی۔ حاجتمند آدمی کو بہرحال سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔" (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۴۱)

(۲) وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا
وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ
(توبہ، رکوع ۱۱، آیت ۸۴)

اور ان میں کوئی مر جائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجیے۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر ہی میں مرے ہیں
(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس آیت کے تحت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بیان القرآن میں دو مسئلے لکھے ہیں:۔

مسئلہ۔ کافر کے جنازے پر نماز اور اس کے لیے استغفار جائز نہیں۔

مسئلہ قیام علی القبر (قبر پر کھڑا ہونا) سے مراد وہ ہے جو بطور اکرام کے ہو خواہ بغرض زیارت ہو یا بغرض دفن اور اگر عبرت اور تذکر موت کے لیے ہو یا ضرورت کے لیے ہو جیسے ہدایہ میں ہے کہ جس کا کوئی کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا انتظام اس کے متعلق آ پڑے تو اس کو بدون رعایت طریقہ مسنونہ کے غسل و کفن دے کر دفن کر دے تو اس طرح قیام علی القبر درست ہے لیکن اگر زیارت بغرض عبرت میں کوئی مفسدہ وغیرہ ہو تو جائز نہیں فقط۔"

اس آیت میں بھی کفر ہی کو منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کی علت قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے مولانا تھانوی نے یہ مسئلہ لکھا کہ کافر کی نماز جنازہ اور اس کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں ہے۔ تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد دعا اور استغفار ہے۔ نماز جنازہ بھی دعا اور استغفار ہی کی شکل ہے اس لیے منافق کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔

شرک و کفر دو ایسے جرم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ بغاوت قرار دیا ہے اور ان کے بارے میں قرآن مجید میں صاف اعلان کر دیا ہے کہ وہ ان کو معاف نہیں کرے گا اور یہ کہ شرک و کفر کی سزا دوزخ کا ابدی عذاب ہے اور دوزخ اصلاً کافروں ہی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ ان باتوں کے لیے مطالعہ کیجیے۔ سورۂ النساء رکوع ۷، آیت ۴۸، ایضاً رکوع ۱۸ آیت ۱۱۶۔ سورۂ الاعراف رکوع

آیت ۴۹۔ الم الیضاً رکوع ۶ آیت ۵۰ - ۵۱۔ سورۂ البقرۃ رکوع ۱۳ آیت ۴۲ ' سورۂ الکہف آخری رکوع آیۃ ۱۰۲

اب آپ غور کریں کہ جب شرک و کفر ناقابل معافی جرم ہیں جنت کا فروں پر حرام ہے اور دوزخ اصلاً کافروں ہی کے لیے بنائی گئی ہے تو اس صورت حال میں ان لوگوں کے لیے جو شرک و کفر کی حالت میں مرچکے ہوں دعائے مغفرت کس طرح درست ہوسکتی ہے اور اس سے کیا فائدہ ان لوگوں کو پہنچ سکتا ہے ؟ اگر قرآن میں صراحۃً اس کی ممانعت نہ آتی جب بھی ان لوگوں کے لیے مغفرت کی دعا ایک بے فائدہ عمل ہوتا لیکن اب جبکہ اللہ نے صراحۃً اس سے روک دیا ہے کسی غیر مسلم میت کے لیے مغفرت کی دعا کرنا نہ صرف یہ کہ ناجائز ہے بلکہ مومن و مسلم کا یہ عمل ایک نازیبا عمل ہوگا۔ اس سے غیر مسلم میت کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ البتہ دعا کرنے والے کو یہ نقصان ضرور پہنچ جائے گا کہ وہ اپنے لیے آخرت کی باز پرس کا ایک اور سامان مہیا کرے گا۔ کیونکہ ایسی دعا فرمان الٰہی کی خلاف ورزی کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔

دوسری بات

جو میں نے آپ کو لکھ بھیجی تھی اس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیتوں میں ہے۔ میں یہاں چند آیتوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں

> جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے' ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پاسکیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے۔ (ابراہیم ع ۳ آیت ۱۸)

کفار و مشرکین کے بظاہر اچھے اعمال کے اکارت اور ضائع ہوجانے کی یہ ایک بہترین تمثیل ہے جس نے اس بات کو پوری طرح واضح کردیا جو اس تمثیل کے بعد کہی گئی ہے یعنی یہ کہ ان لوگوں کو آخرت میں ان کے بظاہر اچھے اعمال کا ذرہ برابر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ علامہ ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس آیت میں اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جنہیں کفار نیک عمل سمجھ کر کرتے تھے جیسے صدقہ، صلہ رحمی، مظلوم کی اعانت، غلام آزاد کرنا اور اس طرح کے دوسرے اعمال۔ سورہ کہف میں اللہ نے خود فرمایا ہے:

> اے محمد! ان سے کہو' کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون لوگ ہیں ؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا۔ اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔ قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کی سزا جہنم ہے اس کفر کے بدلے جو انھوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔ (سورۂ کہف آیات ۱۰۳ تا ۱۰۶)

یہ جو کافروں اور مشرکوں کے تمام اعمال اکارت ہوں گے اس کی وجہ یہی ہے کہ نیکی اور عمل صالح کے لیے ایمان شرط لازم ہے، اس ایمان کے بغیر جس کی دعوت قرآن دیتا ہے کسی عمل پر عمل نیک کا اطلاق ہی صحیح نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کفار کو اپنے جن اعمال پر ثواب کی امید ہوتی ہے ان پر انہیں کوئی ثواب ان کے کفر کی وجہ سے نہیں ملے گا، کیونکہ:۔

فان الایمان شرط لقبول الحسنات کلها

اس لیے کہ ایمان تمام نیکیوں کے قبول ہونے کی شرط ہے

یہ شرط اللہ نے اپنے کلام میں متعدد مقامات پر خود لگائی ہے۔ مثلاً سورۂ طٰہٰ رکوع ۶ آیت ۱۱۲ میں فرمایا:

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا

اور جو شخص کرے کوئی عمل صالح اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو اس کو ڈر نہیں بے انصافی کا اور نہ نقصان پہنچنے کا۔

اس آیت میں ومن یعمل من الصلحت وھو مومن جملہ شرطیہ ہے اور فلا یخاف ظلما ولا ھضما اس شرط کی جزا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یعنی ان الایمان شرط لصحة الطاعات
وقبول الخیرات

شربت روح افزا اسی وقت تک روح افزا ہے جب تک اس میں زہر ملا ہوا نہ ہو۔ اگر زہر کی ایک بوند بھی ملا دی جائے تو پھر وہ مہلکات اور روح فرسا بن جائے گا۔ حالانکہ دیکھنے میں روح افزا ہی رہے گا یہی حال کفار و مشرکین کے ان اعمال کا ہے جو بظاہر اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں شرک و کفر کا زہر مخلوط ہوتا ہے اور خدا کی بارگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ بادشاہت کوئی بھی ہو اس میں باغی سلطنت کے اچھے اعمال بادشاہ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے اور باغی بغاوت سے باز نہ آئے تو وہ سزا ہی کا مستحق قرار پاتا ہے آجکل چونکہ خدا کی بادشاہت اور آخرت ذہن و دماغ سے غائب ہے اس لیے بہت سے ناواقف مسلمان بھی کفار و مشرکین کے صدقات خیرات اور ان کے رفاہ عامہ کے کاموں کو "اعمال صالحہ" قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن نے نوع بہ نوع انداز میں پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ ان باغیوں کے یہ اعمال خدا کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے اور آخرت میں ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے

زندگی عذاب اور شہر قتل گاہ

ملک کے حالیہ واقعات سے متاثر ہوکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک اہم اپیل

ہمارے ملک میں اس وقت تشدد اور لاقانونیت اور قتل و غارت گری کی جو تند اور تیز لہر چل گئی ہے۔ اس پر ملک کے ہر بہی خواہ کو جلتی تشویش اور فکر ہو چکا ہے ملک کے مختلف حصوں اور خود ہمارے اس شہر لکھنؤ میں ہونے والے ہنگامے جن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہ انسانی جان کی کوئی قیمت باقی رہ گئی ہے نہ مال و املاک کی۔ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ یہ ملک کس رخ پر جا رہا ہے۔ اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو شاید علمی گوشے میں بیٹھ کر مطالعہ اور تصنیف کا کام اور عبادت گاہوں میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ جو مشتعل فضا اس وقت پائی جاتی ہے اور جس آسانی کے ساتھ طبیعتوں میں اشتعال اور اپنے مخالفین کے ساتھ انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور متاعِ انسانیت کو اپنے سیاسی مفادات اور ذاتی و جماعتی اغراض کے لیے تاراج کر دیا جاتا ہے اس نے ملک کے تمام بہی خواہوں اور دوستوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

انسان سب سے پہلے انسان ہے جس کو سلامتی اور عزت کے ساتھ دنیا میں رہنے کا حق ہے۔ زبان، رسم الخط اور کلچر و تہذیب اور خود عقیدہ و مسلک میں جو بھی کشش اور معنویت ہے وہ انسان ہی کی نسبت سے ہے۔ لیکن ایک لہر اٹھتی ہے اور انسانوں کی متاعِ جان و مال کو بہا لے جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک مذہب کے ماننے کا دعویٰ کرنے والوں کے اندر بھی نفرت و انتقام، بلکہ درندگی و حیوانیت کا ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ معقولیت، سنجیدگی اور عام انسانی ہمدردی کے الفاظ بھی ان کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں اور ہر ظلم و زیادتی روا سمجھی جاتی ہے۔ ایک گروہ اٹھتا ہے اور اپنی حقیر اغراض کے لیے سینکڑوں گھروں کے بے چراغ، نہ جانے کتنے بچوں کو یتیم اور کتنی ماؤں کی گود خالی کر دیتا ہے اور درندگی و بہیمیت کے ایسے المناک مناظر سامنے آ جاتے ہیں کہ ان کو سن کر اور دیکھ کر انسان کو اپنے وجود اور اپنی نوع سے شرم آنے لگتی ہے۔ یہ واقعات دراصل ہر مذہب کے لیے دھبہ اور (باقی صفحہ ۵۶ پر)

مسلم تنظیموں کی عالمی کانفرنس

(سید احمد قادری)

رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام ۶ اپریل سے ۱۰ اپریل ۴ء تک مکہ مکرمہ میں مسلم تنظیموں کی جو عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ وہ بھی لاہور کانفرنس کی طرح، مسلمانوں کی تاریخ حاضر کا ایک اہم واقعہ ہے اب تک دنیا میں جو اسلامی کانفرنسیں ہوئی ہیں ان سب میں وفدوں کی کثرت تعداد کے لحاظ سے مکہ معظمہ کی یہ حالیہ کانفرنس سب سے بڑی تھی۔ تمام دنیا کی مسلم تنظیموں کے ۱۴۰ وفدوں نے اس میں شرکت کی پانچ دنوں کی اس کانفرنس میں مسائل پر جو غور و خوض ہوا اور اس کے نتیجے میں جو قراردادیں پاس ہوئیں ان کی ایک سائیکلو اسٹائل کاپی ادارہ زندگی کو بھی موصول ہوئی ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ اس کی بعض قراردادیں ہم پیش بھی کریں گے۔ کچھ قراردادوں کے ترجمے اردو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں

اس وقت دنیا بھر میں مسلمان جن بڑے اور اہم مسائل سے دوچار ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر مسائل پر غور کیا گیا ہے اور تجویزیں پاس کی گئی ہیں۔ یہ کل ۱۸ تجویزیں ہیں۔

اس وقت دنیا میں بہت سی عقلی اور نظریاتی تحریکیں اور تنظیمیں خاص طور پر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سرگرم عمل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ہی وہ عقلی و فطری دین اور پوری انسانی زندگی سے بحث کرنے والا وہ نظام ہے جو لادینیت کی راہ روکے ہوئے ہے اور اس سے مقابلہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کانفرنس نے اپنا خاصا وقت ان تدبیروں پر غور کرنے میں صرف کیا ہے جن سے غیر اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے سے متعلق کانفرنس کی قراردادیں میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ ان تدبیروں پر پوری طرح عمل کیا جائے گا اور دنیا:۔

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

کا وہ منظر پھر دیکھے گی جس کے لیے صدیوں سے اس کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔

یہ اللہ رب العالمین کا فضل و کرم ہی ہے کہ عرب حکومتیں جو خواب غفلت میں خراٹے لے رہی تھیں، بیدار ہو گئی ہیں۔

یہ اللہ رب العالمین کا فضل وکرم ہی ہے کہ عرب حکومتیں جو خواب غفلت میں خراٹے لے رہی تھیں، بیدار ہو گئی ہیں کس کو توقع تھی کہ وہ اس قدر جلد اٹھ کھڑی ہوں گی اور اسلام کی حمایت اور اسلامی اخوت کا جذبہ اتنی تیزی سے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھے گا۔ واقعہ یہی ہے کہ حالات کی باگ ڈور اس علیم و خبیر کے دست قدرت میں ہے جس کی مشیت آن کی آن میں حالات کو پلٹ دیتی ہے۔

أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (تم ہی سربلند ہو اگر تم مومن ہو) کا وعدہ قیامت تک کے لیے ہے۔ دنیا بھر کی مسلم تنظیموں اور مسلم حکومتوں نے ابھی جزوی طور پر یہ شرط پوری کی ہے اور ساتھ ہی اس وعدے کی کرنیں افق پر نمودار ہونے لگی ہیں۔ جس دن ان سب نے ملکر یہ ثابت کر دیا کہ وہ سچے اور پکے مومن ہو چکے ہیں وہی دن ان کی سربلندی کا ہوگا۔

عرب حکومتوں کو اس کا احساس ہو چکا ہے کہ "عرب قومیت" اسی طرح راسمالیت و اشتراکیت اور دوسرے غیر اسلامی نظریات نے ان کو ایک دوسرے سے پھاڑنے کے سوا کوئی دوسرا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ دنیوی ترقی کی غیر اسلامی تدبیروں اور طریقوں نے بھی انہیں عزت کا مقام عطا نہیں کیا۔ اس لیے اب وہ اپنے اس دین کی طرف متوجہ ہوئی ہیں جس کے بارے میں انہیں سمجھایا گیا تھا کہ وہی ان کی ترقی کی راہ روکے ہوئے ہے۔

رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہم ہندوستانی مسلمانوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس دین کا خادم بنائے جو دنیوی و اخروی فلاح و کامرانی کی واحد ضمانت ہے اور ساتھ ہماری یہ بھی دعا ہے کہ اے دلوں کے بدلنے والے! ان تمام انسانوں کے دلوں کو اسلام کے لیے کھول دے جنھوں نے نادانی و غلط فہمی کی وجہ سے اپنے دلوں کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ آمین!

بقیہ قیم جماعت کی تقریر ص ۲

دعائیں دیں گے، تعاون کریں گے اور توقع ہے کہ خود بھی ساتھ دیں گے۔

محترم عزیزو! اگر ہم سب مسلمان مرد و عورتیں اپنی اور اپنے خاندان کی اصلاح کر کے اپنے وجود کو گھر کے لیے اور خاندان کے وجود کو محلے اور بستی کے لیے رحمت بنانے کی کوشش کریں تو آخرت سے پہلے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے گی اور تمام بندگان خدا کو فیض پہنچے گا۔ غیر مسلموں کو اسلام کے چلتے پھرتے نمونے نظر آئیں گے اور اگر نظم و اجتماعیت کے ساتھ یہ کام ہو تو خیر امت بنکر شاہد حق اور داعی الی الخیر کا فریضہ بڑی سہولت اور کامیابی سے انجام پانے لگے گا۔

اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے اور ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

تنقید و تبصرہ

مغربی تہذیب، آغاز و انجام

محمد زکی

صفحات ۳

اغذ، کتابت، طباعت مجلد، گرد پوش کے ساتھ ——
یمت سات روپے ملنے کا پتہ :- شیخ عبداللطیف
عبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یو پی

جناب محمد زکی صاحب (شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی
لی گڈھ) سے قارئین زندگی واقف ہوں گے۔ ان کے
ئی مضامین زندگی میں شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف کی
یر تبصرہ کتاب، پُر معلومات اور دلچسپ ہے۔ اس
ے علاوہ ان کے صحیح خیالات کی آئینہ دار ہے۔

فاضل مرتب نے اس کتاب کے دیباچے "موضوع
ن" میں کتاب کا جو تعارف کرایا ہے اور آخر میں تاثرات
ے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس نے کتاب کی اہمیت
ں اضافہ کیا ہے۔ دنیا کے مہذب خطوں پر چھائی ہوئی
غربی تہذیب سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ کتاب
ہت مفید ہے۔ موصوف نے خود مغربی مورخین کی کتابوں
ے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاں تک عقائد و افکار، فلسفہ
نظریات، اخلاق و کردار اور سماجی معاشرتی اقدار کا تعلق
ہے، مغربی تہذیب کوئی جدید تہذیب
نہیں بلکہ یونانی اور رومی تہذیب کی صدائے بازگشت
ہے۔ مغربی مورخین نے جن انسانوں کو "وحشی" اور "غیر مہذب"
قرار دیا ہے۔ دراصل انہیں وحشیوں نے اس تہذیب کی
داغ بیل ڈالی۔ پھر وہ تاریخ کے مختلف ادوار سے گذرتی
ہوئی یونان و روم تک پہنچی اور یونانی و
رومی تہذیب کی بنیاد پر موجودہ مغربی تہذیب کی عمارت
تیار ہوئی ہے۔ اس کا راستہ بھی وہی ہے اور منزل بھی وہی۔
مثال کے طور پر جزیرہ کریٹ اور یونان و روم کی "ترقی یافتہ"
عورتیں اپنے وقت کے تراشیدہ لباس میں سینہ کھول کر محفلوں
میں جلوہ گر ہوا کرتی تھیں اور آج کی ترقی یافتہ عورتیں آج کے
وقت کے تراشیدہ لباس میں عریانی کا مظاہرہ کر رہی ہیں
تو کیا محض لباس کی تراش خراش کی وجہ سے اس تہذیب
کو تہذیب جدید کہا جائے گا۔

مغربی مورخین ۲۰۰۰ ق م کے جزیرہ کریٹ کی عورت
کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"رنگین بھڑکیلے، چست، جاذب نظر کپڑوں میں ملبوس سینہ کو بالکل عریاں کیے ہوئے، لبوں پر سرخی لگائے اور ہیٹ اوڑھے، محفلوں اور معاشرہ کے دیگر شعبوں میں "رنگ پاشی" کرتی نظر آتی ہے (ص۷۵)"

فاضل مرتب نے دکھایا ہے کہ اس وقت مغربی ممالک میں جنسی انارکی، بدکرداری، بے حیائی و بے غیرتی کی کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو یونانی اور رومی تہذیبوں میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح جن اصول و نظریات پر دنیوی زندگی کا عیش و آرام حاصل کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے وہ بھی وہی ہیں جو پہلے تھے اس لیے "قدیم یونانی و رومی تہذیب اور "جدید" مغربی تہذیب میں کوئی بنیادی وجوہری فرق نہیں ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ قدیم اور جدید محض اضافی الفاظ ہیں جو تاریخ کے مختلف ادوار کے لحاظ سے بولے جاتے ہیں۔ کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کے سلسلے میں "قدیم و جدید" کے الفاظ بالکل بے معنے ہیں۔ کوئی چیز محض اس لیے غلط نہیں ہو سکتی کہ وہ قدیم ہے اور کوئی چیز محض اس لیے صحیح نہیں ہو جاتی کہ وہ جدید ہے۔ جو لوگ مغربی تہذیب کو "تہذیب جدید" کہہ کر اسے قبول کر لینے کی دعوت دیتے ہیں وہ اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی۔

فاضل مرتب نے اخیر میں ان مسلمانوں کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے ہیں جو اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا ایک "مرکب" تیار کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ تبصرہ نگار کے نزدیک یہی آخری حصہ اس کتاب کا حاصل ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ یورپ میں "نشاۃ ثانیہ" کے بعد عیسائیت اور "تہذیب جدید" کا مرکب تیار کرنے کی کوشش ہو چکی ہے۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کوشش میں آخر کار مسیحیت کا صرف اتنا حصہ باقی رہ گیا ہے جس سے دنیا کے عیش و آرام اور خواہش نفس کی پیروی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ مسلمانوں میں جو لوگ "اصلاح" اور "اجتہاد" کی باتیں کر رہے ہیں ان کو متنبہ کرتے ہوئے مصنف نے یہ کتنی مومنانہ اور واضح بات لکھی ہے:۔

"اس سلسلے میں نہایت اہم بات جس پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہو وہ یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ قرآن کریم کس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مقدسہ کون سے راستہ اور کون سی منزل کی نشان دہی کرتی ہے اور پھر یہ جائزہ لینا چاہیے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ زاد راہ کیا لیں کسے رہبر بنائیں اور کس طرح سفر طے کریں۔ بنیادی چیز مقصد ہے راستہ خواہ کتنا ہی آرام اور خوب صورت کیوں نہ ہو اور سفر خواہ کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو لیکن اگر منزل تک کارواں نہ پہنچا تو ساری چیزیں بے کار ہیں۔" (ص ۲۶۹)

امید ہے اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے طالب علم بھی

بھی کریں گے اور وہ لوگ بھی جو مسلم معاشرے کی اصلاح کا جذبہ رکھتے ہیں۔

کلام غلام — صوفی غلام محمد غلام۔ صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ: حسامیہ لباس گھر۔ اندرون نیاپل۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

جناب غلام محمد غلام نے "حالات غلام" کے عنوان سے اپنے مختصر سوانح حیات میں خود لکھے ہیں۔ آپ صوفی اور واعظ اور مبلغ ہیں جن کے مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ اچھا خاصہ وسیع ہے۔ ان کا یہ مجموعہ کلام پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ حمد و نعت۔ دعوت و تبلیغ۔ تعلیم و تربیت۔ عشق و عرفان۔ اخلاق و مروت۔

مولانا حمید الدین صاحب حسامی عاقل نے "تعارف" میں لکھا ہے:-

"اصل چیز شعر کا خیال ہے جو دوسروں کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ رہا وزن اور عروض و قوافی کی پابندی یہ اشعار کی زیب و زینت تو ہو سکتے ہیں لیکن اصل شعر نہیں ـــ حکماء نے تو شعر کے لیے وزن کی بھی شرط نہیں رکھی ہے۔

ـــ مولانا ایک بہترین مقرر اور واعظ بھی ہیں۔"

یہ مجموعہ کلام نہ منثور ہے اور نہ منظوم بلکہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔ اس میں زبان کی صحت کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ صوفی صاحب کے مریدین و معتقدین اس مجموعے سے استفادہ کریں گے۔

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلے میں — صفحات ۱۶ طباعت کتابت کاغذ عمدہ قیمت ۵۰ پیسے۔ شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حسن منزل دھوبی گلی یوسف مہر علی روڈ بمبئی ـــ

یہ پمفلٹ مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے لکھا ہے۔ مسلم پرسنل لا کنونشن بمبئی کے رد عمل میں جو باتیں کہی جا رہی ہیں اس پمفلٹ میں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس ذیل میں تین حسب ذیل نکات کی توضیح کی گئی ہے:-

۱۔ حکومت کے بیانات مسلمانوں کے لیے بالکل ناکافی ہیں۔

۲۔ مسلم پرسنل لا کے لیے جد و جہد "فرقہ پرستی" نہیں ہے۔

۳۔ مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلمانوں کی اس مسئلے کے متعلق عام بے داری "حکومت کے خلاف محاذ آرائی" نہیں۔

ان تین نکات کی توضیح کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقاصد اور اس کی جد و جہد کے رخ کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ پمفلٹ بہت سی غلط فہمیوں کو بھی دور کرے گا اور لوگوں کے سامنے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مثبت رول کو بھی واضح کرے گا۔

الصالحات — مرتبہ: ساجدہ خاتون صاحبہ پرنسپل جامعۃ الصالحات

صفحات ۴۰ - قیمت: - ایک روپیہ - شائع کردہ: -
مجلس انتظامیہ جامعۃ الصالحات رام پور - یوپی

یہ جامعۃ الصالحات کا پہلا سالانہ میگزین ہے اور اس کا بڑا حصہ جامعۃ الصالحات کے تعارف پر مشتمل ہے محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور لائق مطالعہ ہے۔

لڑکیوں کے لیے براہ راست عربی زبان میں قرآن - حدیث، فقہ اور ادب کی تعلیم کا انتظام اور انہیں عالم فاضل بنانے کا کام ایک نیا تجربہ ہے جو رام پور میں کیا جا رہا ہے خدا کرے یہ تجربہ کامیاب ہو اور وہ اعلیٰ مقاصد حاصل ہوں جن کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ جامعۃ الصالحات کے اعلیٰ مقاصد بھی زیر تبصرہ میگزین میں شائع کیے گئے ہیں۔ جس کنونشن میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی تجویز منظور کی گئی تھی اس کی بھی پوری روداد اس میگزین میں موجود ہے جامعۃ الصالحات کے ناظم جناب عبدالحی صاحب مدیر الحسنات نے "اپنی بات" میں لکھا ہے:-

"جامعۃ الصالحات کا پہلا میگزین "الصالحات" آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک ہی مقصد سے شائع کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے آپ یہ جان لیں کہ اس ادارہ کے ذریعے ملت کی کون سی اہم ضرورت کو پورا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔"

جامعۃ الصالحات کے تعارف کے لیے ڈاکٹر رفیع الدین عثمانی مرحوم نے ایک مؤثر فیچر بھی لکھا ہے۔ اس میں جامعۃ الصالحات کی معلمات اور طالبات کے مضامین بھی ہیں سالانہ تعلیمی جلسے کی رپورٹ بھی ہے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ جامعۃ الصالحات ترقی کرے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور اس کا میگزین بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔

شہزادہ مُراد وصی اقبال۔ صفحات ۸۰ کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت۔ ایک روپیہ پچیس پیسے۔ ناشر:- مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی۔

جناب وصی اقبال صاحب نے بچوں کے لیے یہ ایک لمبی کہانی لکھی ہے۔ یہ کہانی بہت دلچسپ ہے اور ساتھ ہی مفید بھی۔ امید ہے کہ بچے اسے پسند کریں گے۔ بچوں کے ذہنی استعداد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور کوئی ایسی بات نہیں آنے دی گئی ہے جو ان کی سمجھ سے اونچی ہو۔ کہانی پڑھ کر بڑوں کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو تو اسے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے کہ یہ کہانی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

ایک جگہ لفظ "مبتلا" کا استعمال شاید صحیح نہیں ہوا ہے ص۱۲ پر ہے:-

..... اور بہت سے لوگ خوشی اور حیرت کی ایک عجیب حالت میں مبتلا تھے۔

یہ لفظ مصیبت اور کسی الجھن کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود وصی اقبال صاحب نے ایک جگہ استعمال کیا ہے۔ اگر یہ جملہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔

..... اور بہت سے لوگوں پر خوشی اور حیرت کی

ایک عجیب حالت طاری تھی۔"

بحیثیت مجموعی کہانی بچوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔ اخیر ...ایک چھوٹی سی کہانی ناصر میاں کے نام سے اس میں ...امل کر دی گئی ہے وہ بھی مفید ہے۔

...ملم پرسنل لا خواتین کانفرنس

شائع کردہ :- مسلم پرسنل لا بورڈ خواتین ...مہاراشٹر ۳۲۶ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ - بمبئی ۳ ...تابت، طباعت، کاغذ - بہتر صفحات ۹۶ قیمت ۱/۵۰ محترمہ راشدہ مدعو - صدر مسلم پرسنل لا بورڈ خواتین ...مہاراشٹر، پیش لفظ میں لکھتی ہیں۔

آل مہاراشٹر مسلم پرسنل خواتین کانفرنس جو ۳۰ راپریل و یکم مئی ۷۲ء کو صابو صدیق گراؤنڈ بمبئی میں منعقد ہوئی تھی اور جو اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی مہتم بالشان طریقے پر انجام پائی اور توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر میں اس کے حضور نذرانہ شکر پیش کرتی ہوں۔ کانفرنس کی کارروائی کتابی شکل میں پیش خدمت ہے۔ یہ روداد شعبہ نشر و اشاعت نے مرتب کی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ کانفرنس کی تقریریں مکمل طور سے پیش کی جاسکیں۔"

یہ روداد اس لائق ہے کہ ہر پڑھی لکھی مسلم خاتون کے ہاتھوں میں جائے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ مسلم پرسنل لا کی حقیقت و اہمیت کیا ہے اور ہر مسلمان عورت کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اسلامی شریعت نے جو حقوق اس کو دیے ہیں وہ انتہائی معتدل و متوازن ہیں اور دنیا کا کوئی قانون عورتوں کے شرف و مجد اور ان کی عصمت و عفت کی اس طرح حفاظت نہیں کر سکتا جس طرح اسلامی قانون کرتا ہے۔ جو لوگ اس میں بنیادی تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ عورتوں کے ہمدرد نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ امید ہے کہ ہندوستان بھر میں اردو جاننے والی خواتین اس روداد سے استفادہ کریں گی۔

نغمات حرم — عبدالرزاق سعید۔ کتابت، طباعت، کاغذ بہتر صفحات ۱۰۰ قیمت درج نہیں ہے۔ ناشر مختار احمد ندوی۔ ملنے کا پتہ :-

مکتبہ دینیہ مومن پورہ۔ بمبئی ۱۱

جناب عبدالرزاق سعید صاحب کے اس مجموعہ کلام میں زیادہ تر نظمیں اور غزلیں وہ ہیں جو ان کے سفر حج کی یادگار ہیں لیکن اس مجموعے میں میونسپل الیکشن ۱۹۶۸ء جیسی نظم بھی داخل کر دی گئی ہے جو بالکل اٹل بے جوڑ ہے۔ محترم مختار احمد ندوی صاحب نے اپنے آدھے صفحہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "عبدالرزاق سعید صاحب اکثر فی البدیہہ کہتے ہیں" لیکن شاید عبدالرزاق سعید صاحب کہنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے یا فرصت نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے

کلام میں کئی طرح کی غلطیاں موجود ہیں۔ اچھی شاعری کے لیے صرف شاعری کا ذوق کافی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مجموعے کے اشعار سے وہی لوگ لطف لے سکیں گے جو خود شاعر نہیں ہیں۔

اوقاف سہ ماہی مدیر: حکیم اجمل خاں۔ پتہ: مجلہ اوقاف سہ ماہی۔ ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ۔ پنجاب۔

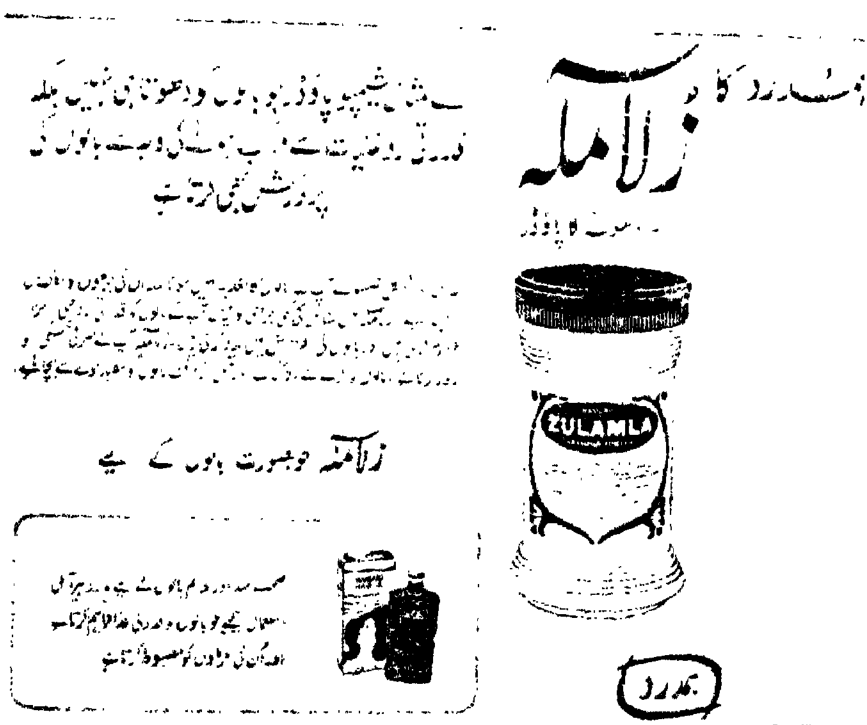
بڑے سائز کے ۸۰ صفحات کا یہ ایک باتصویر مجلہ ہے جو پنجاب وقف بورڈ کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کے دو شمارے ہمارے پاس آچکے ہیں۔ بہت اچھے کاغذ پر عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ نظم و نثر کی معیاری چیزیں اس کی زینت ہیں۔ پورے رسالے سے اس کے مدیر کا حسن ذوق نمایاں ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے صرف ایک چیز ایسی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو اچھا تھا اور وہ ہے تصویروں کی اشاعت۔ ہم اپنے اس معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس وقت اس کا دوسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے اس میں اس کا بدل اشتراک کہیں نظر نہ آیا۔ صرف ترسیل زر کا پتہ درج ہے۔ سکریٹری وقف بورڈ (میگزین) ۵۰ سردار پٹیل مارگ انبالہ کینٹ۔

(بقیہ صفحہ ۴۸) ہر ملک و تہذیب کے لیے بدنامی و رسوائی کا باعث ہیں۔ اور ان سے مذہبی پیشواؤں کی تذلیل اور ان کی تعلیمات کا خون ہوتا ہے۔

جس انسان کے دم سے زندگی کی چہل پہل ہے جو خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے اور جس کے ساتھ ہم رہتے بستے ہیں جو کبھی ہمارا پڑوسی ہوتا ہے۔ کبھی ہمارے اسکول کا دوست یا دفتر کارخانے اور دکان کا ساتھی، وہ انسان کو بے اعتبا اور شک کا شکار ہونے لگے اور اس کو اپنی جان عزت ا اپنا کاروبار غیر محفوظ نظر آنے لگے، تو زندگی عذاب اور شہر قتل گاہ اور میدان جنگ معلوم ہونے لگیں۔

یہ ہمارے ملک کے بہی خواہوں اور مذہب و اخلا کے ماننے والوں کے لیے یکساں اس وقت سب سے بڑا چیلنج ہے اور مجھے امید ہے کہ ملک کے تمام فرقے، حکومت اور مذہبی گروہوں کو بعض اوقات اپنے سیاسی اغراض کے حصول، یا انتقامی جذبے کے ماتحت آلۂ کار بنا لیتے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں گی اور اس کو ہر مسئلے مقدم رکھ کر اس خطرے کو دور کرنے کے لیے جو سر پر تلوار کی طرح لٹک رہا ہے۔ اپنی پوری کوشش خرچ کر دیں گی اور اقتدار کے حصول یا اقتدار کی حفاظت سے زیادہ ملک اور اس سے زیادہ انسان اور انسانیت کی حفاظت کی فکر کریں گی۔ اس لیے کہ اگر اس ملک کا سفینہ خدانخواستہ ڈوبا تو اہل حکومت، سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کوئی تفریق نہیں کرے گا، بلکہ سب کو لے کر ڈوبے گا اور ابھرے گا تو سب کو لے کر ابھرے گا۔

Monthly ZINDGI Rampur May 1974 Regd. No. L-088



Only Tittle Printed at Shanker Press, Rampur (U.P.)

اقامتِ دین کا داعی

جون ۱۹۷۱ء

ماہنامہ

زندگی

جون

رامپور

فی پرچہ
ایک روپیہ بیس پیسے

سالانہ
بارہ روپے

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

ماہنامہ
زندگی
رامپور
(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/12
پاکستان سے -/12
ششماہی
ہندوستان سے -/6
پاکستان سے -/6
قیمت:- ایک روپیہ

جلد: ۵۲ | جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ مطابق جون ۱۹۷۴ء | شمارہ: ۶

اشارات	سید احمد قادری	۲
مقالات		
نفقۂ اولاد فقہی نقطۂ نظر سے	مولانا جلال الدین عمری	۹
علمی کام کے مقاصد اسلامی نقطۂ نظر سے	جناب اشتیاق حسین صاحب	۱۸
اقبال کی شاعری میں ایمائیت	پروفیسر عبدالمغنی	۳۱
تراجم و اقتباسات		
پیغمبر اسلام اور اسلام	ترجمہ محمد اقبال صاحب	۳۸
اخبار و افکار		
بہائیت، ماسونیت، علمانیت	-------	۴۷
تنقید و تبصرہ		۵۲

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیجدیا جائے گا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر زندگی رام پور۔ یوپی

مالک دعوت ٹرسٹ دہلی ۶ اڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی مقام اشاعت۔ دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسانی مساوات کا اسلامی اور غیر اسلامی تصوّر

سید احمد قادری

تقریباً چودہ سو سال پہلے انسانوں نے خود اپنی نوع کو مختلف طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ صرف مال و دولت اور جاہ و منصب ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ نسل اور نسب کے اعتبار سے بھی۔ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اونچی نسل اور برتر نسب کا قرار دے رکھا تھا اور کچھ لوگوں کو انھوں نے نیچی نسل اور فروتر نسب کے گڈھے میں ڈال رکھا تھا۔ بہت سے ملکوں میں یہ تقسیم صرف طاقت ہی کے بل پر نہ تھی بلکہ مذہبی بنیاد پر بھی تھی۔ طاقتور لوگوں نے صحیح مذہب میں تحریف کر کے یا خود ایک مذہب وضع کر کے پیدائشی طور پر انسانوں کو ذات پات اور اونچ نیچ کے چکر میں پھنسا دیا تھا۔ مذہب میں تحریف انھوں نے اس لیے کی تھی کہ جن لوگوں کو انھوں نے نسلی اور پیدائشی طور پر پیچ قرار دیا تھا وہ اپنی پستی اور ذلت پر قانع رہیں اور یہ جان کر صبر کریں کہ جب خود بھگوان ہی نے ان کو نیچ بنایا ہے اور ادنیٰ نسل میں پیدا کیا ہے تو اس میں کسی دوسرے کا کیا قصور؟ بادشاہوں نے کہیں اپنے آپ کو خدا کا اوتار بنا رکھا تھا، کہیں وہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور کہیں چاند کی اولاد قرار دیے بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ رنگ اور زبان کے لحاظ سے بھی انسانوں اور انسانوں کے درمیان تفریق و تقسیم جاری تھی۔ خود جزیرۃ العرب میں نسل و نسب اور زبان کا گھمنڈ اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

زمین کے مختلف خطوں کو بھی انھوں نے یہ حیثیت دے دی تھی کہ ایک خطے کا رہنے والا اپنے آپ کو دوسرے خطۂ زمین میں رہنے والوں سے اعلیٰ اور برتر سمجھتا تھا۔ ایرانی اور تورانی، عربی اور عجمی کی تفریق اعلیٰ اور ادنیٰ کے تصور کے ساتھ رائج تھی۔ ان تقسیموں اور تفریقوں نے انسانیت کو پامال اور ذلیل کر رکھا تھا۔ تمام حقوق و امتیازات انھیں تقسیموں کی بنیاد پر متعین کیے جاتے تھے۔ اسی کا نتیجہ

یہ تھا کہ کمزور و محتاج افراد اور وہ لوگ جنہیں نیچ اور کمین بنا کر رکھا گیا تھا، شدید ترین عذاب میں گرفتار تھے۔ طاقتور اور اپنے اپنے ملک کے ذرائع و وسائل پر قابض خاندان خدائی کے تخت پر براجمان تھے اور کمزور و بے وسیلہ افراد اور جماعتیں ان کی "عبادت" پر مجبور تھیں۔ انسانیت کے فضل و شرف کو خود انسانوں نے اپنے پاؤں تلے دبا رکھا تھا۔ دنیا بھر میں کروروں انسان غلام بنا لیے گئے تھے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

عرب میں بھی اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی مردوں نے اپنی ہی نوع کی کمزور صنف عورتوں کو ذلیل سمجھ رکھا تھا۔ میراث میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا بلکہ وہ خود جائداد منقولہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مردوں نے ان کو نسل کشی اور اپنی تفریح طبع کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ عربوں کے بعض قبیلے بیٹی کی پیدائش کو اپنے خاندان کے لیے ننگ و عار سمجھنے لگے تھے اور ان کی سنگدلی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے۔ یہ صورت حال تھی کہ قرآن عظیم کی یہ صدائے سرمدی بلند ہوئی۔

۱۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔
(النساء رکوع ۱، آیت ۱)

۲۔ اور وہی تو ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (الانعام ر ۱۲ - ۹۹)

۳۔ اور وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے سکون و راحت حاصل کرے۔ (الاعراف ر ۲۴ - ۱۸۹)

۴۔ اسی نے تم کو ایک فرد سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا (الزمر ر ۱ - ۶)

۵۔ لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ (الحجرات ر ۲ - ۱۳)

قرآن نے دوسری جگہ تشریح کر کے خود بتا دیا ہے کہ اس ایک شخص کا نام آدم ہے (علیہ السلام) اس اعلان حقیقت سے نسل و نسب کے وہ تمام مینار زمین بوس ہو گئے جو انسانوں نے خود ساختہ تصور کی بنیاد پر کھڑے کر لیے تھے۔ انسانیت جو شدید عذاب میں گرفتار تھی، نجات پا گئی اور جو سر ذلت کے احساس سے جھکے ہوئے تھے، بلند ہو گئے اور جب قرآن نے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی: بنی اسرائیل ر ۷ - ۷۰) کا مژدہ سنایا تو وہ تمام آدمی خوشی سے جھوم اٹھے جنہیں پیدائشی طور پر ذلیل و خوار بنا دیا گیا تھا۔ کالے بھی آدمی تھے اور گورے بھی آدمی۔ اس حیثیت سے ان کے درمیان نابرابری ختم ہو گئی۔ ایک ماں باپ کے دو بیٹے جن میں ایک گورا اور ایک کالا ہو تو کیا ان دونوں کے حقوق و امتیاز میں کوئی فرق کیا جاتا ہے؟ مرد بھی آدمی ہیں اور عورتیں بھی آدمی اور اللہ نے تاج کرامت پوری بنی نوع انسان کے سر پر رکھا ہے تو پھر اس حیثیت سے کوئی عورت مرد کے

مقابلے میں ذلیل کیوں ہو؟ اوپر جن آیات کے ترجمے نقل کیے گئے ان کے علاوہ بھی کئی جگہ قرآن نے صراحۃً عورتوں کو مردوں کا ہم جنس کہا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران کے اخیر رکوع میں ہے:۔

اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن جلد ۱ میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:۔

بعضکم من بعض، اثنائے کلام میں بالکل ضمنی طور پر اس بات کی دلیل بیان ہو گئی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ کی میزان میں مرد اور عورت دونوں کا عمل بالکل یکساں وزن رکھتا ہے فرمایا۔ اس لیے کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی جنس سے ہیں دونوں ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ دونوں ایک ہی قسم کے گوشت پوست سے بنے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں سے قرآن نے تمام جاہلی نظریات اور غلط مذہبی تصورات کی تردید کر دی جو عورت کو مرد کے مقابل میں۔ ایک فروتر مخلوق قرار دیتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے تفسیر ماجدی ج ا میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:۔

ذرا اسے بھی یاد کر لیجیے کہ دونوں جنسوں کے درمیان

اشتراک انسانیت کی یہ تعلیم بیسویں صدی عیسوی میں نہیں بلکہ صدی عیسوی کی ابتدا میں مل رہی ہے جبکہ فرنگستان او ہندوستان دونوں میں عورت ہونا خود ایک جرم تھا او عورت کا وجود مرادف تھا گندگی اور ناپاکی کے۔ اس تعلیم کی پوری قدر تاریخ کے اس استحضار کے بعد ہی ہو گ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن جلد ۱ میں لک

یعنی تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد آقا اور غلام، کالے اور گورے، اونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہیں

نسل ونسب اور پیدائش کے اعتبار سے قرآن نے ا مساوات کا جو اسلامی تصور پیش کیا تھا اس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے اتنا واضح مستحکم کر دیا کہ اس تصور پر ایک ایسے مسلم معاشرے کی تعمیر مکمل ہوئی جس میں نسل ونسب اور رنگ وروغن کے ا سے اونچ نیچ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ حبش کے بلال، روم کے اور فارس کے سلمان رضی اللہ عنہم کا وہی درجہ تھا جو قبیلہ قری کے سرداروں کا۔

عورت کی ذلت ختم ہوئی وہ مردوں ہی کی طرح لائ قرار پائی۔ میراث میں اسے حصہ ملا۔ اس کی گود، اولاد کے مدرسہ بنی اور اولاد کی خدمت وحسن سلوک کے لحاظ سے "ما کا درجہ" باپ" سے بھی بڑھا دیا گیا

نسلی غرور اور رنگ روپ کے گھمنڈ کو حضورؐ نے ا

ارشادات سے توڑا۔ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:۔

تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

(بزار بحوالہ تفہیم القرآن ج ۵ تفسیر سورۃ الحجرات)

دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:۔

اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ (ابن جریر)

ایک اور حدیث میں ہے۔

اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے

(مسلم۔ ابن ماجہ)

فتح مکہ کے موقع پر سرداران قریش کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا۔ لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباء و اجداد پر گھمنڈ کو دور کر دیا۔ تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے۔ دوسرا بدکار اور بدبخت جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ (ترمذی ج ۲ تفسیر سورۃ الحجرات)

حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں آپؐ نے فرمایا:۔

عداء بن خالد سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے تقریر کی۔ اللہ فرماتا ہے:۔ لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنا دیے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو
جو سب سے زیادہ پرہیزگار
ہو لہٰذا کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر تقوے کے اعتبار سے
اے گروہ قریش! ایسا نہ ہو کہ قیامت میں تم اپنے کندھوں پر دنیا کا بوجھ اٹھائے ہوئے آؤ اور دوسرے لوگ آخرت یعنی آخرت کی کامیابی کا سامان لے کر آئیں۔ میں اللہ کے مقابلے میں تمہیں کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا

(معجم طبرانی کبیر بحوالہ مجمع الفوائد)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

لوگو! خبردار رہو۔ تم سب کا خدا ایک ہے کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقوے کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے

زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا۔ ہاں، یارسول اللہ۔ فرمایا اچھا تو جو موجود ہے وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔ (بیہقی بحوالہ تفہیم القرآن ج ۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک طرف نسل و نسب کے غرور کو پامال کیا اور دوسری طرف آپ وقت کی مظلوم عورت کے حقوق کی پاسداری کا تاکیدی حکم دیا:۔

حضورؐ نے فرمایا: اپنی بیویوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو اس لیے کہ تم نے انہیں اللہ سے عہد کر کے حاصل کیا ہے اور اللہ ہی کے حکم کے مطابق تم نے ان کی شرمگاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے جس طرح تمہارے حقوق ان پر ہیں اسی طرح ان کے حقوق تم پر ہیں۔
(مسلم شریف بحوالہ مشکوٰۃ)

یہ ہے انسانی مساوات کا اسلامی تصور۔

ہم یہاں یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ آج دنیا کے مدعیانِ علم و تحقیق نظری طور پر انسانی مساوات کے جس تصور کے قائل ہیں کیا وہ اور اسلام کا عطا کردہ تصور دونوں ایک ہیں یا دونوں میں کوئی ایسا بنیادی اور جوہری فرق ہے جس نے دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا ہے۔

اوپر یہ تفصیل گذر چکی کہ اسلام دنیا بھر کے انسانوں کو ایک آدم و حوا کی اولاد تسلیم کرتا ہے اس لیے بحیثیت انسان ان کے درمیان کسی تقسیم و تفریق کا وہ قائل نہیں ہے اور اولادِ آدم ہونے کے اعتبار سے تمام انسانوں کے درمیان مساوات کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی یہ اشارہ بھی گذر چکا ہے کہ عقیدہ و عمل کے اعتبار سے وہ تمام انسانوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور ان میں سے ایک قسم کو خدا کے نزدیک عزت والا اور دوسری قسم کو ذلیل قرار دیتا ہے۔

قرآن جس قوت کے ساتھ بحیثیت نسل، انسانوں کے درمیان مساوات کا اعلان کرتا ہے۔ اسی قوت، بلکہ اس سے زیادہ زور کے ساتھ خدا کے وفاداروں اور باغیوں کے درمیان نابرابری اور عدم مساوات کا اعلان بھی کرتا ہے۔ ہم اس پہلو کی بھی تھوڑی تفصیل یہاں پیش کرتے ہیں۔

خدا کے وفاداروں اور اس کے باغیوں کے درمیان مساوات نہیں ہے

اس حقیقت کے اظہار سے کہ دنیا کے تمام انسان ایک آدم و حوا کی اولاد ہیں یہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ سب آدمی ہیں اور ان کے درمیان نسل کی تفریق و تقسیم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بالفاظ صریح یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ "دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان بحیثیت نسل مساوات ہے" قرآن میں اس طرح کی صراحت کہیں نہیں ہے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ خدا کے وفاداروں اور باغیوں کے درمیان عقیدہ و عمل کی حیثیت سے بھی مساوات سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں یا خدا سے بغاوت کے باوجود محض مال و دولت اور جاہ و منصب کی وجہ سے یہ سمجھنے لگیں کہ وہ خدا کے محبوب ہیں ورنہ خدا انہیں مال و دولت اور جاہ و منصب نہ دیتا ان غلط فہمیوں کو دور

اس آیت میں صراحت کے ساتھ اللہ کی خوشنودی کو جنت اور اس کی نعمتوں سے بڑی چیز قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آخرت کی تمام کامیابیوں اور نعمتوں کی اصل اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی ہی ہے اور بندہ مومن کو جنت اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی رضامندی کا گھر ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے) اس ٹکڑے کی تشریح بخاری و مسلم کی حدیث میں موجود ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کو پکارے گا اے اہل جنت! وہ کہیں گے ہم حاضر ہیں اور خیر کی تمام کائنات تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اللہ کہے گا کیا تم راضی خوش ہو گئے۔ وہ کہیں گے، پروردگار! بھلا ہم کیوں راضی نہ ہوں جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا کر دیا جو اپنی کسی مخلوق کو عطا نہیں کیا۔ اللہ فرمائے گا کیا میں تم کو اس سے بہتر شے عطا نہ کروں۔ وہ کہیں گے۔ پروردگار! اس سے بہتر چیز اور کیا ہوگی؟ تو اللہ فرمائے گا میں تمہیں اپنی دائمی خوشنودی عطا کرتا ہوں اب اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔"

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب صفۃ الجنۃ واہلہا)

انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس پر اللہ کی پرستش اور اطاعت واجب ہے۔ وہ زندگی کے تمام مطالبات و معاملات میں اس کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا مکلف ہے۔ دنیا میں اس کی زندگی کا یہی مقصد اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے تاکہ وہ آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کر سکے۔ کار خلافت کی انجام دہی اور اقامت دین کی جدوجہد کا بھی آخری مقصود یہی ہے کہ آخرت میں وہ اپنے مالک کے سامنے سرخ رو ہو، مالک اپنے بندے سے خوش ہو اور اس کو اپنے فضل و کرم سے نوازے۔

اس مسئلے پر ابھی قرآن و احادیث کی مزید نصوص اور پیش کی جا سکتی ہیں لیکن جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے بھی پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی کو محض ذریعہ اور وسیلہ قرار دے کر اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو گھٹانا ایک غلط نقطہ نظر ہے جو قرآن و حدیث کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

اس تفصیل کے بعد آپ کے سوالات کا الگ سے جواب دینے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن آپ کے مزید اطمینان خاطر کے لیے مختصر جوابات دے رہا ہوں۔

۱۔ رضائے الٰہی حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کی نظر میں وفادار، فرماں بردار اور اس کے فضل و کرم کا مستحق ثابت ہو جائے۔

۲۔ قیامت میں مومن صالح کی سرخ روئی، اس کے چہرے کی تر و تازگی، اطمینان قلب، اپنے رب کے سامنے سجدہ ریزی اور فرشتوں کی طرف سے سلام اور جنت کی خوش خبری قیامت میں رضائے الٰہی حاصل ہونے کے حسی مظاہر ہیں اور جنت بھی دراصل رضائے الٰہی کا حسی مظہر ہی ہے اور سب سے بڑھ کر دیدار الٰہی اسی کا حسی مظہر ہوگا۔ اس سب سے

(باقی [illegible] پر)

یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ (جاثیہ: ۲۱)

۸۔ کہو کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں۔ (رعد: ۱۶)

۹۔ ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے ــــ؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ (الانعام: ۵۰)

۱۰۔ ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں (الزمر: ۹)

۱۱۔ اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے۔ (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟) تباہی ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ (الزمر: ۲۲)

۱۲۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں۔ (ص: ۲۸)

اگر ہم ان آیتوں سے پہلے کی چند آیتوں اور ان کے بعد کی چند آیتیں کو ملا کر ان کی تفسیر و تشریح کریں تو ایک طویل مقالہ تیار ہو جائے لیکن ہمارا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن نے پوری قوت سے مومنوں اور کافروں کے درمیان عدم مساوات کا اعلان کیا ہے۔ اب ہم ان چند آیتوں کے ترجمے نقل کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے باغی اور نافرمان بندوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ اس کی نگاہ میں ان کی حیثیت کیا ہے؟ آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ تیار ہے ہی۔ اس دنیا میں بھی ان کا مقام جانوروں سے بدتر ہے۔

بہرے، گونگے، اندھے

۱۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ یہ اب [illegible] گے۔ (البقرۃ: ۱۸)

۲۔ جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ (الانعام: ۹[illegible])

اللہ تعالیٰ نے ان کو سننے، بولنے اور دیکھنے کی جو قوتیں دی ہیں ان کو ان سرکش بندوں نے حق و صداقت کے لیے معطل کر رکھا ہے۔ انھوں نے حق و صداقت کی آواز سے اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔ حق گوئی سے اپنی زبانیں روک رکھی ہیں اور حق بینی سے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ اس لیے کان، زبان اور آنکھیں رکھتے ہوئے بھی درحقیقت یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں۔

خبیث مرد اور خبیث عورتیں

۱۔ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں [illegible]

۲۔ اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے

(باقی ص[illegible] پر)

نفقۂ اولاد — فقہی نقطہ نظر سے

(مولانا سید جلال الدین عمری)

باپ پر اولاد کا نفقہ واجب ہے اسلام کے نزدیک باپ کی یہ قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کا معاشی بوجھ اٹھائے۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے :۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

اور اس شخص پر جس کا کہ بچہ ہے ان کا (مطلقہ ماؤں کا) دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا واجب ہے

آیت میں 'والد' کے لفظ کی جگہ 'مولودلہ' (وہ شخص جس کا کہ بچہ ہے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ باپ کا ہے۔ وہ اسی کی طرف منسوب ہوگا اور اسی کا کہلائے گا۔ چنانچہ زمخشری نے تعبیر کی اس تبدیلی کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

فان قلت لم قيل المولود له دون الوالد قلت ليعلم ان الوالدات انما ولدن لهم لان الاولاد للاباء ولذا الات ينسبون اليهم لا الى الامهات[1]

اگر یہ سوال کیا جائے کہ 'والد' کی جگہ 'مولودلہ' کے الفاظ کیوں استعمال کیے گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ اس لیے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ مائیں کے بچوں کو جننے کی وجہ سے وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ درحقیقت انھوں نے ان کے باپوں کے لیے جنم دیا ہے۔ اس لیے کہ اولاد باپ کی ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ ان کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ ماؤں کی طرف منسوب نہیں ہوتی۔

پہلی دلیل

نفقۂ اولاد کے وجوب پر کئی ایک دلیلیں دی گئی ہیں ان میں سے ایک دلیل یہی ہے کہ بچہ جب باپ کا ہے تو فطری طور پر باپ ہی کو اس کی معاشی ذمہ داری بھی اٹھانی ہوگی۔ چنانچہ 'مولودلہ' کی مذکورہ بالا تعبیر سے بحث کرتے ہوئے ابوالسعود نے لکھا ہے :۔

الولد يولد له وينسب اليه وتغيير

[1] زمخشری : الکشاف عن حقائق التنزیل

العبارة للاشارة الى المعنى المقتضى لوجوب الارضاع ومؤنة المرضعة عليه[1]

بچہ باپ کے لیے جنم دیا جاتا ہے اور وہ اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ 'والد' کی جگہ 'مولود لہ' کے الفاظ اختیار کر کے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ باپ پر رضاعت اور رضاعت کی خدمت انجام دینے والی کے اخراجات کیوں واجب ہیں؟

دوسری دلیل

نفقہ اولاد کے وجوب کی دوسری دلیل یہ ہے کہ آیت میں کہا گیا ہے کہ جن ماؤں کو طلاق ہو چکی ہے وہ اگر بچہ کو دودھ پلائیں تو باپ ان کو کھانا اور کپڑا فراہم کرے۔ بالفاظ دیگر ان کو اس کی اجرت دے۔ جب بچہ کو دودھ پلانے کی وجہ سے مطلقہ ماؤں کو اجرت رضاعت دینے کا حکم ہے تو ظاہر ہے خود بچے کے اخراجات باپ پر بدرجہ اولیٰ لازم ہوں گے۔ اسی بات کو ابن ہمام نے ان الفاظ میں کہا ہے

فاذا وجب نفقة غيره بسبب نفقة نفسه اولى[2]

جب بچہ کی وجہ سے دوسرے کا نفقہ باپ پر واجب ہو جاتا ہے تو خود بچہ کا نفقہ اس پر بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔

آیت میں باپ کو گو کہ اصلاً اجرت رضاعت دینے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اسی سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ رضاعت کے بعد کے اخراجات برداشت کرنا بھی باپ ہی کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ مبسوط میں ہے

والنفقة بعد الفطام بمنزلة مؤنة الرضاع[3]

دودھ چھڑانے کے بعد کا نفقہ ان اخراجات کے قائم مقام ہے جو دودھ پلانے کی مدت میں واجب تھے۔

بچہ کے اخراجات رضاعت اسی لیے برداشت کیے جاتے ہیں کہ وہ خود ان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس دلیل کی بناء پر جب تک وہ معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہو جائے اس کے اخراجات کا برداشت کرنا بھی ضروری ہے۔

تیسری دلیل

اولاد کے نفقہ کے واجب ہونے کی تیسری دلیل فقہاء نے یہ دی ہے کہ اولاد باپ کی شخصیت کا ایک جزء ہے۔ اس کے ساتھ اس کو وہی معاملہ کرنا چاہیے جو وہ اپنی ذات کے ساتھ کرتا ہے جس طرح باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی حفاظت کرے اور اسے تباہ ہونے سے بچائے۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی اولاد کو بھی ضائع نہ ہونے دے اور اس کو زندہ اور صحیح سالم رکھنے کی کوشش کرے۔ مبسوط میں ہے:۔

الولد جزء من الاب فتكون نفقته

---

[1] ابوالسعود: ارشاد العقل السلیم

[2] اس دلیل پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ابن الہمام: فتح القدیر بابرتی: العنایۃ علی الہدایۃ ۳/۳۴۴

[3] سرخسی: المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۲

علیہ کنفقتہ علی نفسہ [1]

بچہ باپ ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے بچہ کا نفقہ اس پر اسی طرح واجب ہے جیسے خود اس کا اپنا نفقہ اس پر واجب ہے۔

اسی کو کاشانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

الانفاق عند الحاجۃ من باب احیاء المنفق علیہ والولد جزء الوالد و احیاء نفسہ واجب کذا احیاء جزئہ [2]

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ باپ پر اپنی اولاد کا نفقہ واجب ہے۔ اس اجماع کے لیے سب نے اس دلیل کو استعمال کیا ہے۔ ابن قدامہ ابن منذر کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

اجمع کل من نحفظ عنہ من اھل العلم علی ان علی المرء نفقۃ اولادہ الاطفال الذین لا مال لھم ولان ولد الانسان بعضہ وھو بعض والدہ فکما یجب علیہ ان ینفق علی نفسہ واھلہ کذالک یجب علی بعضہ واصلہ [3]

جن اہل علم کی رائیں محفوظ ہیں ان سب کا اجماع ہے کہ آدمی پر اپنے ان چھوٹے بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کا اپنا کوئی مال نہ ہو۔ چونکہ انسان کی اولاد اسی کا ایک حصہ ہے اور وہ اپنے باپ کا حصہ ہے اس لیے جس طرح اس پر اپنی ذات کا اور اپنی بیوی کا نفقہ واجب ہے اسی طرح اپنے بچہ اور اپنے باپ کا نفقہ بھی۔

چوتھی دلیل

نفقہ اولاد کے واجب ہونے کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی رو سے صلہ رحمی کی بڑی اہمیت ہے اتنی اہمیت کہ بعض اوقات یہ وجوب کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ باپ اور بچہ کا رشتہ اتنا قریبی ہے کہ ان کے درمیان تو صلہ رحمی فرض ہے۔ بچہ کے ساتھ صلہ رحمی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کی ضروریات پوری کی جائیں اور اس پر اپنا پیسہ خرچ کیا جائے۔

بچہ کھانے پینے کا محتاج ہو اور باپ اس کی حاجت کو پوری کرنے کی حیثیت میں ہونے کے باوجود پوری نہ کرے تو یہ نہ صرف یہ کہ صلہ رحمی کے خلاف ہے بلکہ اس مقدس رشتے کو کاٹ دینا ہے جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ علامہ کاشانی لکھتے ہیں:۔

ولان ھذہ القرابۃ مفترضۃ الوصل ومحرمۃ القطع بالاجماع والانفاق من باب الصلۃ فکان واجبا وترکہ مع القدرۃ للمنفق وتحقق حاجۃ المنفق علیہ یودی الی القطع

[1] سرخسی: المبسوط ۵/ ۲۲۲
[2] کاشانی: بدائع الصنائع ۴/ ۳۱
[3] ابن قدامہ: المغنی ۹/ ۲۵۶

ذکان حراماً ؎۱

اس پر اجماع ہے کہ باپ اور بچہ کا رشتہ ایسا ہے کہ اس کو جوڑے رکھنا فرض اور اس کو کاٹ دینا حرام ہے۔ انفاق کا تعلق چونکہ اسی صلہ رحمی سے ہے اس لیے وہ بھی واجب ہے اور قدرت کے باوجود انفاق نہ کرنا جب کہ بچہ کی ضرورت اس کا تقاضا کر رہی ہو ایک ایسی حرکت ہے جو قطع رحم تک پہنچاتی ہے۔ اس لیے وہ حرام ہے۔

کل اولاد کا نفقہ واجب ہے

اولاد ایک ہو یا ایک سے زیادہ، لڑکے ہوں یا لڑکیاں اس سے نفقہ کے وجوب میں کوئی فرق نہیں پڑتا سب کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔ چنانچہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

(وتجب) النفقة بأنواعها على الحر (لطفله) يعم الأنثى والجمع ؎۲

بچہ کا نفقہ اپنی تمام قسموں کے ساتھ آزاد آدمی پر واجب ہے۔ 'بچہ' کے لفظ کا اطلاق لڑکے اور لڑکی دونوں پر ہوتا ہے اور اس میں ایک اور ایک سے زائد بچے بھی آجاتے ہیں۔

نفقہ کا مفہوم

فقہ حنفی کی رو سے نفقہ کے مفہوم میں کھانا، کپڑا، اخراجات رضاعت اور مکان شامل ہے۔ خادم اور آیا کی اس میں صراحت نہیں کی گئی ہے۔ لیکن بعض حضرات نے لکھا ہے کہ باپ بیمار یا معذور ہو اور خادم کی ضرورت محسوس کر رہا ہو تو اولاد کے لیے خادم کا فراہم کرنا بھی چونکہ ضروری ہے اس بنیاد پر یہ استدلال صحیح ہوگا کہ بچہ کی ضروریات خادم کا تقاضا کر رہی ہوں اور باپ اس تقاضے کو پورا کرنے کی حیثیت میں ہو تو اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ خادم مہیا کرے ؎۳

علامہ کاشانی نے نفقے کے بارے میں اصولی بات یہ کہی ہے کہ نفقہ کا مقصد یہ ہے کہ اس سے انسان کی ضرورت پوری ہو۔ اس لئے نفقہ کا تعین ضرورت کے لحاظ سے ہوگا جس شخص پر کسی کا نفقہ واجب ہے اس پر اس کی غذا، لباس، مکان اور بچہ شیرخوار ہو تو اجرت رضاعت واجب ہے۔ اس لیے کہ متعلقہ فرد کی ضرورت کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ جس شخص کو نفقہ دیا جا رہا ہے اس کا خادم بھی ہے اور فی الواقع اس کو اس کی حاجت ہے تو اس کا نفقہ بھی واجب ہے ؎۴

اسی پر دوا علاج اور دوسری ضروریات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نفقہ حنفی کی رو سے ہمارے خیال میں یہ سب چیزیں نفقہ کے مفہوم میں شامل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ابن ہمام نے نفقہ کی لغوی تعریف کے بعد اس کی شرعی

؎۱ کاشانی: بدائع الصنائع ۴/۳۱

؎۲ ابن عابدین: ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۹۲۳

؎۳ ابن عابدین: ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۹۲۳

؎۴ کاشانی: بدائع الصنائع ۴/۳۸

تعریف ان الفاظ میں کی ہے :۔

وفی الشرع الادرار علی الشیٔ بمالہ بقاءہ [1]

شریعت میں اس کے معنے یہ ہیں کہ آدمی کا وجود اور بقا جن چیزوں پر منحصر ہے وہ اسے خوب فراہم کیے جائیں۔

اس تعریف کی رو سے نفقہ میں وہ تمام چیزیں شامل ہوں گی جن کا فی الواقع ایک انسان محتاج ہے۔ اس لحاظ سے باپ کے لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ بچہ کی کسی بھی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے سے انکار کر دے۔ جہاں تک دوا علاج وغیرہ کا تعلق ہے فقہ شافعی میں تو اس کو صراحت کے ساتھ نفقہ میں شامل سمجھا گیا ہے [2] ابن حزم کی بھی یہی رائے ہے۔[3]

اس معاملے میں اصولی ہدایت ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ملتی ہے جس میں آپ نے حضرت ابوسفیان کی بیوی سے فرمایا تھا:۔

خذی ما یکفیک وولدک بالمعروف

تم ابوسفیان کے مال سے دستور کے مطابق اتنا لے لو جتنا کہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔

اس میں صاف کہا گیا ہے کہ باپ کے مال میں بچہ کا اتنا حق ہے کہ اس سے اس کی ضروریات پوری ہو جائیں اس میں ضروریات کی تعیین نہیں کی گئی ہے اس لیے کہ اس کا تعلق والدین کی حیثیت، بچہ کی عمر، اس کی صحت اس کی ضروریات اور زمانے کے تقاضوں سے ہے۔ ظاہر ہے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نفقہ حاصل کرنے میں شرط یہ ہے کہ وہ دستور کے مطابق ہو۔ اس میں فضول خرچی اور باپ کو نقصان پہنچانے کا جذبہ نہ پایا جائے۔

نفقہ کب تک واجب ہے

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اولاد کا نفقہ کب تک واجب ہے اور کب اس کا وجوب ختم ہوجاتا ہے؟ اس کا کوئی ایک ایسا متعین جواب ممکن نہیں ہے جو ہر طرح کی اولاد پر یکساں منطبق ہو سکے۔ کیونکہ اس کا تعلق اولاد کی نوعیت، اس کی ضرورت اس کے احتیاج اور تقاضوں سے ہے ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہی اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فقہا نے اس معاملے میں لڑکے اور لڑکی، بالغ اور نابالغ، صحت مند اور معذور، صاحب حیثیت اور محتاج اولاد کے درمیان فرق کیا ہے اور ان کے بارے میں الگ الگ جواب دیا ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ "اس پر اتفاق ہے کہ نابالغ اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔ اسی طرح بالغ اولاد کا نفقہ بھی اس وقت واجب ہے جب کہ وہ معذور اور

---

[1] ابن الہمام: فتح القدیر ۳/۳۴۱

[2] ابوسلیمان الجمل۔ حاشیۃ الجمل علی شرح المنہج ۴/۵۱۱

[3] المحلی ۱۰/۱۰۱

اپاہج ہو۔ لیکن نفقہ اولاد کے لیے شرط یہ ہے کہ اولاد کا اپنا کوئی مال نہ ہو۔ اگر اس کا مال ہو تو اسی سے اس کے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔ باپ پر اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔ فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ کیا بالغ اولاد کا نفقہ اس وقت بھی واجب ہے جب کہ اس کا نہ تو کوئی ذریعہ معاش ہو اور نہ وہ مالی لحاظ سے اس حیثیت میں ہو کہ اپنی ضروریات پوری کر سکے؟ ایک گروہ نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اس کے نزدیک اس صورت میں باپ پر بالغ اولاد کا بھی نفقہ واجب ہوگا لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ باپ پر لڑکے کا نفقہ تو صرف اسی وقت تک واجب ہے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔ بالغ ہونے کے بعد اس کو معاشی بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا۔ البتہ لڑکی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا نفقہ اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے[1]

فقہ حنفی میں نابالغ لڑکوں کا نفقہ

اب ہم نفقہ اولاد سے متعلق بعض مسائل پر مختلف مکاتب فقہ کی روشنی میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں گے

فقہ حنفی کی رو سے لڑکے کی معاشی ذمہ داری باپ پر اسی وقت تک ہے کہ جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔ بالغ ہونے کے بعد یہ ذمہ داری اس سے ختم ہو جاتی ہے۔ ابن نجیم لکھتے ہیں:۔

ان البالغ لا تجب نفقته علی ابیه[1]

بالغ اولاد کا نفقہ اس کے باپ پر واجب نہیں ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بالغ آدمی خود کما سکتا ہے اس لیے باپ کو اس کا خرچ برداشت کرنے کے لیے مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ مبسوط میں ہے

ان کانوا ذکورا بالغین لم یجبر الاب علی الانفاق علیهم لقدرتهم علی الکسب[2]

اولاد نرینہ ہو اور بالغ ہو تو باپ کو ان کا خرچ دینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ خود کمانے کی طاقت رکھتی ہے۔

قابل کسب لڑکوں کا نفقہ

لڑکے کے بالغ ہونے سے پہلے بھی اگر وہ محنت اور کمانے کے قابل ہو گیا ہے تو باپ کو حق ہے کہ اس کو کسی کام پر لگا دے اور اس کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے کرے۔ ابن ہمام کہتے ہیں:۔

علیه نفقتهم الی ان یبلغ الذکر حد الکسب وان لم یبلغ الحلم فاذا کان هذا کان للاب ان یواجره وینفق علیه من اجرته ولیس له فی الانثی ذالک[3]

---

[1] ابن حجر:۔ فتح الباری ۹/۴۰۳

[1] ابن نجیم: البحر الرائق ۴/۲۰۱

[2] سرخسی:۔ المبسوط ۵/۲۲۳

[3] ابن الہمام:۔ فتح القدیر

معذور لڑکوں کا نفقہ

ہاں لڑکا اگر کسی جسمانی یا دماغی کمزوری کی بنا پر اس قابل نہ ہو کہ کوئی ذریعہ معاش اختیار کر سکے تو اس کے بالغ ہونے کے بعد بھی باپ کو اس کا نفقہ برداشت کرنا ہوگا۔ مبسوط میں اس صورت حال سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

.... من کان منہم زمنا او اعمی او اشل الیدین لا ینتفع بہما او مفلوجا او معتوہا فحینئذ تجب النفقۃ علی الوالد[1]

لڑکوں میں سے جو اپاہج یا اندھا ہو جس کے ہاتھ بے کار ہو چکے ہوں وہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکتا ہو، جو فالج زدہ ہو یا جو کم عقل اور ناسمجھ ہو تو اس کے بالغ ہونے کے باوجود باپ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا۔

ابن ہمام کہتے ہیں:-

والذکور اما عاجزون عن الکسب لزمانۃ او عمی او شلل او ذہاب عقل فعلیہ نفقتہم[2]

(بالغ) لڑکے اگر اپاہج یا اندھے یا لولے یا دماغی لحاظ سے معذور ہونے کی وجہ سے کمانے کے قابل نہ ہوں تو باپ پر ان کا نفقہ واجب ہے۔

فقہ شافعی

فقہ شافعی میں بھی اولاد کے بالغ ہونے تک باپ پر اس کا نفقہ واجب ہے۔ بالغ ہونے کے بعد اس کا وجوب باقی نہیں رہتا۔ معذور اور اپاہج اولاد اس سے مستثنیٰ ہے۔ بالغ ہونے کے بعد بھی اس کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی کے نزدیک اولاد کے نفقہ کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ یا تو کم سن ہو یا معذور[1]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:-

اذا وجب علی الاب نفقۃ ولدہ فی الحال التی لا یغنی نفسہ فیہا وکان ذالک عندنا لانہ منہ لا یجوز ان یضیع شیئا منہ وکذالک ان کبر الولد زمنا لا یغنی نفسہ ولا عیالہ ولا حرفۃ انفق علیہ الوالد[2]

باپ پر اس کے بچے کا نفقہ اس حالت میں واجب ہے جس میں کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز نہ کر سکے۔ (اپنا معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہو) یہ ہمارے نزدیک اس وجہ سے ہے کہ بچے کا وجود اسی سے ہے۔ اس کو ضائع کرنا اس کے لیے جائز نہیں

[1] سرخسی: المبسوط ۵/۲۲۳
[2] ابن الہمام: فتح القدیر ۳/۳۴۴

[1] ابن قدامہ: المغنی ۹/۲۶۱
[2] شافعی۔ کتاب الام ۵/۹۰

ہے۔ اسی طرح بچہ بڑا ہے لیکن وہ اپاہج ہے۔ اپنی اور اپنے عیال کی ضروریات پوری نہیں کر پا رہا ہے اور اس کے پاس کوئی پیشہ بھی نہیں ہے تو اس پر باپ خرچ کرے گا۔

امام مزنی نے امام شافعی کا مسلک زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ینفق الرجل علی ولدہ حتی یبلغوا
الحلم والمحیض ثم لا نفقۃ لہم الا
ان یکونوا زمنی فینفق علیہم اذا کانوا
لا یغنون انفسہم [1]

آدمی اپنے بچہ پر خرچ کرے گا یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ جائے اور لڑکی ہو تو اسے حیض آجائے۔[2] پھر ان کا نفقہ واجب نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ اپاہج ہوں تو باپ ان پر خرچ کرے گا بشرطیکہ وہ (مالی لحاظ سے) بے نیاز نہ ہوں۔

[1] مختصر المزنی علی ہامش کتاب الام ۵/۲۰۸۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ باپ ہو یا بیٹا اس کا نفقہ اس وقت واجب ہے جبکہ وہ محتاج ہو اور کمانے کے قابل نہ ہو جیسے کہ وہ اپاہج، کمسن اور پاگل ہو اس لیے کہ وہ اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ بغوی نے مریض اور اندھے کو بھی اپاہج ہی کے حکم میں شمار کیا ہے۔ منہاج الطالبین ۴/۸۴-۸۵

[2] لڑکی کے مسئلے پر بحث آگے آرہی ہے۔

فقہ حنفی کی طرح فقہ شافعی میں بھی بلوغ سے پہلے بچہ اگر کمانے کے قابل ہو جائے جیسا کہ بالعموم محنت پیشہ طبقہ میں ہوتا ہے تو باپ کو حق ہے کہ اسے کسی کام میں لگائے اور اس کے اخراجات اس کی آمدنی سے پورے کرے۔ چنانچہ شرح المنہج کے حاشیہ میں ہے۔

وللولی حمل الصغیر علی الاکتساب
اذا قدر علیہ وینفق علیہ من کسبہ
ولہ ایجارہ لذلک ولو لاخذ نفقتہ
الواجبۃ لہ [1]

چھوٹا بچہ اگر کمانے کی طاقت رکھتا ہو تو سرپرست کو اس کا حق ہے کہ اسے کمانے پر لگا دے۔ اور اس کی آمدنی سے اس کا خرچ پورا کرے۔ اسے اس بات کی بھی اجازت ہے کہ اسے اجرت پر رکھ دے۔ اس نفقہ کے حاصل کرنے ہی کے لیے سہی جو اس پر واجب ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ کوئی جائز اور مناسب ذریعہ معاش مل جائے تو باپ بچہ کو اس کے اختیار کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے

ولا تجب لفرع مکتسب لہا فان قدر
علی کسب ولم یکتسب کلفہ ان کان
حلالا لائقا بہ [2]

[1] شیخ سلیمان الجمل حاشیۃ الجمل علی شرح المنہج ۴/۵۱۲

[2] حوالۂ سابق

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بچہ کسی کام کے قابل ہونے کے باوجود کام نہ کرے تو وہ نفقہ کا استحقاق کھو نہیں دے گا بلکہ اس کے بالغ ہونے تک اس کا نفقہ واجب رہے گا۔ حاشیہ عمیرہ میں ہے :-

لوبلغ مبلغا یحسن فیہ الاکتساب کالاولاد المحترفۃ فحکمہ کالکبیر نعم لوھرب وترک الحرفۃ لزمہ الولی

النفقۃ لہ

بچہ اگر اس عمر کو پہنچ جائے جس میں وہ اچھی طرح کما سکتا ہے جیسا کہ پیشہ ور بچوں میں ہوتا ہے تو اس کا حکم بڑی اولاد کا ہے۔ ہاں اگر وہ بھاگ کھڑا ہو اور پیشہ اختیار نہ کرے تو سرپرست پر نفقہ واجب ہوگا۔

لہ قلیوبی و عمیرہ ۴/۸۵



علمی کام کے مقاصد اسلامی نقطۂ نظر سے

جناب اشتیاق حسین ایم اے۔ ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند، علی گڈھ

اسلامی نقطہ نظر سے علمی کام کے مقاصد کا تجزیہ کرنے سے قبل خود علمی کام کے متعلق کچھ جان لینا ضروری ہے۔ جہاں تک علمی کام کا تعلق ہے، موٹے طور پر ہم اس کو انسان کے کائنات اور زندگی میں موجود شدہ حقائق تک سمع، بصر اور فؤاد کے ذریعے پہنچنے، انہیں جاننے سمجھنے، ان کا تجزیہ …نے اور ساتھ ہی ساتھ ان معلوم شدہ حقائق سے استفاد… …تعبیر کرسکتے ہیں

…مع سے مراد دوسروں کی حاصل کردہ معلومات کا …ل ہے خواہ وہ سماعت کے ذریعے ہو یا مطالعہ کے ذریعے …ہم کچھ دوسرے سہاروں کے ذریعے حقائق تک پہنچنے …شش کریں۔ بصر کے معنے یہ ہیں کہ حقیقتوں کا حصول …کیا جائے۔ یعنی کسی دوسرے واسطے کے بغیر خداداد …حیتوں کی بنیاد پر اسرار زندگی تک پہنچنے کی کوشش خود ہو …ب یہ کوشش مشاہداتی یا تجربی بھی ہوسکتی ہے اور قیاسی یا …الی بھی ——— فؤاد کا مطلب یہ ہوگا کہ ان دو ذرائع …ے حاصل شدہ معلومات کو تعقل، تفکر اور تدبر کی میزان پر پرکھ لینے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔

لیکن بعض اوقات کچھ غیر علمی قسم کے کام علمی کاموں کے اس قدر مشابہ ہوتے ہیں کہ علمی کاموں کو ممتاز کرنا ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ لہذا اس تشابہ سے بچنے کے لیے علمی کام کے واسطے ہم کو ایک معیار مقرر کرنا پڑے گا تاکہ ہم علمی کام کو غیر علمی کام سے بآسانی میز کرسکیں اور وہ معیار یہ ہو سکتا ہے

ہر وہ کوشش جو حقائق کی پہلے سے موجود شدہ معلومات میں اضافہ کرنے، اپنے انداز سے یا نئے زاویہ سے اس کی تشریح و تعبیر کرنے اور زندگی کے مسائل پر ان کو منطبق کرنے کے لیے کی جائے علمی کام کے اندر داخل ہے۔ چنانچہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تحقیق، تفکر، مذاکرات و مباحثے، علمی اور تعلیمی منصوبے اور ان کے لیے آلات کا استعمال وغیرہ جو کام بھی مندرجہ بالا اغراض کے تحت انجام دیا جائے علمی کام ہی ہوگا۔ اب خود ان کوششوں کے بھی بہت سے مقاصد ہو سکتے

اور ان ہی کو ہم علمی کام کے مقاصد کے نام سے یاد کرینگے۔

جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر سے علمی کام کے مقاصد کا سوال ہے ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوسکتی ہے لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے میری مراد ہر وہ مقصد نہیں ہے جو اسلامی اعتبار سے صحیح ہو بلکہ میرا ارادہ صرف ان مثبت مقاصد سے ہے جن کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلام ہم کو تعلیم دیتا ہے یا جو اسلام کی نظر میں پسندیدہ یا ضروری قرار پاسکتے ہیں۔ چنانچہ کسب معاش بھی علمی کام کے مقاصد میں شامل ہے جو اسلامی اعتبار سے بھی صحیح ہے لیکن ظاہر ہے اسلامی مآخذ میں نہ تو اس کو پسندیدہ یا ضروری بتایا گیا ہے اور نہ ہی ان کے لیے ہم کو ادھر سے کوئی محرک ملتا ہے لیکن خود ان مثبت مقاصد کی تعیین و تشکیل بھی زمان و مکان کی قیود سے آزاد نہیں ہے۔ اگرچہ پسندیدہ تو وہ سب ہی مقاصد ہیں تاہم ان کی ضرورت اور اہمیت کا صحیح فیصلہ وقت کے حالات اور معاشرے کے مزاج وغیرہ کو سامنے رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے لیکن اس وقت حالات کے تقاضوں اور وقت کی ضروریات سے قطع نظر ہو کر اصولی طور پر ان بنیادی مقاصد ہی کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اب یہ بنیادی مقاصد وقتی ضروریات اور تعیین کے لیے عام بنیادی اصول کا بھی کام کرسکتے ہیں لہٰذا مقاصد کے انتخاب میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ ان بنیادی مقاصد یا ان بنیادی اصولوں کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا اور وہ عام بنیادی اصول یا مقاصد یہ ہیں

سب سے پہلا مقصد اسلامی نقطۂ نظر سے علمی کام جو ہوسکتا ہے یعنی ہم اپنے مفروضات اور تعصبات سے با　لاتر ہو کر انسان، کائنات اور زندگی کا مطالعہ اس غرض سے کر　یں کہ ہمیں حقیقت کا علم پہنچتا ہے اور ان سوالوں کے جوابات　معلوم کرنا ہیں کہ ان تمام مظاہر کائنات میں کیا چیز اصل ہے او　ر کیا صرف نمائش، کیا حق ہے اور کیا باطل کس میں کامیا　بی ہے اور کس میں ناکامی یا اور یہ کہ آ　حقائق کی دنیا صر　ف ان نظر آنے والے مظاہر ہی تک محدود ہے یا ان کے پ　یچھے بھی کچھ حقیقتیں ہیں جو ان کی حد　اور جن تک پہنچنا ناگزیر　ہے؟ اس لیے کہ حق تک پہنچنا وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر　ساری زندگی کی تعمیر ہوتی　یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جسے لے　کے بڑھا کر ہم زندگی کی　راہیں متعین کرتے ہیں۔ چناں چہ جب ق　رآن اپنے پیغام کی　ہم کو دعوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ　آفاق و انفس　نشانیاں یا تعقل، تفکر اور تبصر کے الفاظ　اس طرح　ہے کہ گویا تعقل و تفکر کا یہ حق تلاش حق یا مطا　لعہ کائنات　ہے اور اس پیغام پر عمل اس تلاش اور اس مطالعہ　کا　نتیجہ۔ چنانچہ اہل دانش کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ　(آل عمران ۱۹۱)

جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے

ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں ۔"
اور جب یہ کام کرتے ہیں تو گویا نتیجتاً وہ حق تک
پہنچ جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں :-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران ۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول
اور بے مقصد نہیں بنایا ہے ۔

یعنی وہ گواہی دینے لگتے ہیں کہ اس تخلیق کے پیچھے کوئی
عظیم مقصد کار فرما ہے۔ اس طرح سے یہی صفات زندگی
کو مقصدیت بھی عطا کرتی ہیں اور جیسا کہ خود قرآن کا ارشاد ہے :

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ
اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المومنون ۱۱۵)

کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا
کر دیا ہے اور یہ کہ کیا تم ہماری طرف نہ لوٹائے جاؤ گے

یعنی زندگی ایک بے لگام اور بے مہار اونٹ کی طرح
نہیں بلکہ اس کا ایک خاص مقصد ہے جس پر اپنی مساعی اور
جد و جہد کو مرکوز کرنا ہے ۔ اب ظاہر ہے زندگی کو مقصدیت
عطا کرنے کا یہ عمل بغیر علمی کام کے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی
انجام نہیں پا سکتا ۔

اسلامی نقطہ نظر سے دوسرا مقصد علمی کام کا زندگی کی
اصلاح ہے جس کو دین کے تقاضوں کی تکمیل اور سیرت کی تعمیر
جیسے دوسرے ناموں سے بھی یاد کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ
زندگی کی اصلاح کے لیے بنیادی چیز اصلاح قلب ہے اور
اصلاح قلب کا انحصار جس چیز پر ہے وہ خشیۃ اللہ ہے۔ خدا
کے خوف ہی میں وہ طاقت ہے جو دلوں کو سدھار کر پوری
عملی زندگی میں حسن اور نکھار لے آتی ہے اور اللہ کا ڈر ہی
اسلام کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے میں مدد دیتا ہے
اور اسی پر انسانی سیرت اور اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے
لیکن یہاں تک خود خشیۃ اللہ کا تعلق ہے اس کے متعلق
اللہ تعالیٰ تبارک و تعالیٰ نے فرما دیا ہے ۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم
رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں ۔

اس طرح سے زندگی میں سدھار، دینی تقاضوں کی
تکمیل اور اسلامی سیرت کی تعمیر کے لیے بھی علم بنیادی اہمیت
کا حامل ہوا۔ لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے حصول علم کے مقاصد
میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے ۔

العلماء کے معنے میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ عالمین
مطلق مراد ہیں یا ان کا کوئی خاص طبقہ مقصود ہے۔ حقائق،
سیاق اور خود اس آیت کے مواد کے اعتبار سے جو بات میل
کھاتی ہوئی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد علماء کا
ایک خاص طبقہ ہے اور یہ وہ طبقہ ہے جو خدا کی صفات
کا صحیح علم رکھتا ہے۔ جس نے بحیثیت انسان کے اپنی حقیقت
کو سمجھا ہے۔ خدا کی قدرت اور طاقت کا اسے احساس ہے
اور خدا کی قدرت و طاقت کے احساس کے ساتھ جب وہ
اپنی بے بسی اور بے چارگی کا تصور کرتا ہے تو اس کے دل

ہیں خدا کی قدرت و عظمت کا احساس اور اس کا خوف جاگزیں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جتنا زیادہ وہ اپنے خدا کے تعلق سے سوچتا ہے اتنا ہی اس کا دل خشیۃ اللہ سے لبریز ہوتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی عملی زندگی میں تغیر اور تبدیلی واقع ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسلام کا تعلق زندگی کے کسی ایک خاص شعبے سے نہیں ہے بلکہ ساری زندگی میں خدا کی بندگی کرنے کا نام اسلام ہے۔ چنانچہ وہ اس کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہماری پوری کی پوری زندگی اسلام کی آئینہ دار ہو جیسا کہ قرآن میں خدائے تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ص (البقرۃ ۲۰۸)

اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔

لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ماخذ اسلام یعنی قرآن و حدیث میں زندگی کی جزئیات پر بہت زیادہ ہدایات نہیں ملتیں۔ بلکہ بہت سے مسائل ایسے رہ جاتے ہیں جن کے متعلق ہم کو کتاب و سنت سے براہ راست رہنمائی نہیں مل پاتی۔ اب ان مسائل میں رہنمائی حاصل کرنا مستقل ایک مسئلہ ہے

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اصول کے اعتبار سے اکمال دین آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی ہو چکا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا لیکن زندگی کو نہ تو ٹھہراؤ ہوا ہے اور نہ ہوگا بلکہ وہ ترقی پذیر راہوں پر مسلسل گام زن رہی ہے اور برابر ارتقائی مدارج کرتی جا رہی ہے۔ تہذیبیں بدلتی ہیں۔ اقدار و معیارات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور سطحوں میں فرق ہوتا رہتا ہے۔ لہذا اخلاقی اور اصولی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلامی قوانین کو ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق کرتے رہنے کا عمل بھی ایک ناگزیر عمل ہے اس کے بغیر یا تو ہم اسلام کی اصولی اور اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہوئے زندگی کے تیز دھارے میں بہہ جائیں گے یا پھر ان اصولوں کی حفاظت کا فرض انجام دیتے ہوئے ہم زندگی سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اور وہ اپنی تیز خرامی کے سبب بہت آگے بڑھ جائے گی جب کہ اسلام میں یہ دونوں ہی حالتیں ناپسندیدہ ہیں۔ لہذا ان دونوں حالتوں سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ عمل ہے جسے قیاس اور اجتہاد کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ قرون اولےٰ کے مسلمانوں نے اس کی ضرورت کا احساس کیا تھا جس کے پیش نظر فقہ وغیرہ کا عظیم الشان فن مدون کیا گیا جس نے نہ صرف یہ کہ قانونی طور پر زمانے کا ساتھ دیا بلکہ مسلمانوں کو اپنے زمانے کا فکری امام بھی بنایا۔ لیکن اب وہ زمانہ بھی گزر چکا ہے آج کے مسائل اور آج کے حالات ان حالات سے بہت مختلف ہیں۔ لہذا آج پھر شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں مسائل کے حل کے لیے علمی کام کیا جائے

اسلامی تعلیمات میں بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی

تاکید بہت زیادہ کی گئی ہے۔ اخروی سرخ روئی کے لیے
یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ فرد کے تعلقات
دوسرے انسانوں کے ساتھ کس طرح کے ہیں؟ اسی تعلق
کا ایک رخ خلق خدا کے ساتھ رحم اور ہمدردی کا جذبہ
ہے۔ حاجت مندوں اور مسکینوں کی حاجت روائی ہے
مریضوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی امداد ہے یتیموں
اور بیواؤں کی کفالت ہے۔ انسانوں کی مدد اور پریشانیو
کا حل ہے چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ
(الذاریات ۱۹)

اور ان کے (متقین کے) مالوں میں حق تھا
سائل اور محروم کے لیے)

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ (البقرہ ۱۷۷)

(من جملہ اور کاموں کے نیکی یہ ہے کہ آدمی)
اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتے داروں اور یتیموں
پر مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے
اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ
يَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝
اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (البلد ۱۱تا۱۶)

(مگر اس نے (انسان نے) دشوار گذار گھاٹی سے گذرنے
کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گذا
گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن
کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى
اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ (البیہقی)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک
محبوب ترین مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبے والوں کے
ساتھ بہتر سلوک کرے

لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ
(متفق علیہ)

اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا

مندرجہ بالا آیات میں 'مال' یا 'اطعام' وغیرہ ا
استعمال ہوتے ہیں لیکن آج غریبی اور بیماری کے دو
اور مسائل کے حل کرنے کا ذریعہ صرف مال ہی نہیں ر
بلکہ انسان اپنی ہر اس ملکیت اور صلاحیت کو استعم
کر کے یہ مقاصد حاصل کر سکتا ہے جو خدا نے اسے
کی ہے۔ وہ ملکیت خواہ مال کی شکل میں ہو یا ز
شکل میں۔ وہ صلاحیت اعلیٰ ذہنی بھی ہو سکتا ہے
کسی قسم کی عملی مہارت بھی۔ لیکن چونکہ زندگی کے ا
کے ساتھ ہی ساتھ ان مسائل کی پیچیدگیوں میں اض
ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے لیے ہم علمی اور ذہنی

ے نیاز نہیں رہ سکتے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو م کو مسائل کا جائزہ لینا ہو گا اور ان کی پے چیدگیوں کو مجھنا پڑے گا ۔ اس کے بعد ہی ان کا حل تجویز کر کے کوئی ی شکل اختیار کی جا سکے گی ۔ اب اس پورے عمل میں تجزیہ ی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے اور تحقیق و تفکر کی بھی اور ان کے ند عملی میدان میں پڑنے کے لیے مشنری یا آلات کے استعمال ی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے ۔ اس طرح بالخصوص فلسفہ نسیات معاشیات، علم طب، علم کیمیا اور تعلیم وغیرہ ر بالعموم تمام طبیعی اور سماجی علوم سے ہمیں مدد لینا پڑے گی

اس سلسلے میں ایک اشکال یہ پیدا ہو سکتا ہے ہ مذکورہ بالا علوم کی ابتدا رفاہ عامہ کی غرض سے ہوئی اور ان کا محرک یہ رہا ہے کہ عوام الناس کی بھلائی کے اسطے ان علوم سے خدمت لی جائے ۔ اس طرح گویا ن علوم کا مقصد عام انسانوں کی خیر خواہی ہے ۔ اس کے لمقابل جو ایک نظریہ پیش کیا جا سکتا ہے وہ علم برائے لم کا نظریہ ہے یعنی یہ علوم اس لیے مروج نہیں ہوئے کہ ن کے ذریعے عوام الناس کی بھلائی مقصود ہے بلکہ ان ی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ذہنی آسودگی عطا کرتے اور بذبہ تلاش حق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ۔ اب ہاں تک اور دوسرے مقاصد کا سوال ہے وہ ذیلی یا انوی ہیں ۔ الغرض اس قسم کی اشکالات پیدا ہو سکتے ہیں یکن فی الحقیقت ہمارا موضوع بحث یہ نہیں ہے اور نہ ا ہم اس پر کوئی رائے زنی کرنا چاہتے ہیں ۔ ان دونوں میں سے کون سا نظریہ کتنا صحیح ہے اور کون سا کتنا غلط یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر الگ سے گفتگو کی جا سکتی ہے ۔ ہم نے اوپر جو بات کہی ہے وہ علمی کام کی ابتدا یا موجودہ محرکات کے بارے میں نہیں کہی ہے بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے عوام الناس کی بھلائی اور مسائل زندگی کا حل بھی علمی کام کا ایک مقصد ہو سکتا ہے جس کے حصول کے لیے ان علوم سے استفادہ ممکن ہے ۔ اس بات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان علوم کے دوسرے مقاصد نہیں رہے ہیں ۔

سورہ توبہ کی ایک آیت ہے :۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبہ ۱۲۲)

مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی (اہل ایمان کی) آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش) سے پرہیز کرتے ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا علم اور اس میں تفقہ حاصل کر کے لوگوں کو جہنم کے عذاب سے ڈرانا، جنت کی خوش خبری دینا، دین کے اوامر و نواہی لوگوں کو بتانا، اللہ اور رسول کے احکام لوگوں کو سنانا، ان کو دین

کی پیروی پر ابھارنا اور ان کو مسائل شرعیہ کی تعلیم دینا مختصر طور پر یہ کہ تعلیمات اسلام کو عام کرنا بھی ایک فریضہ اور ایک ضروری کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے کوشش کرنا ہے اور ظاہر ہے یہ بھی ایک علمی کام ہے چنانچہ اسلام کے نقطہ نظر سے علمی کام کا ایک مقصد یہ بھی ہوا کہ تشریح و تعبیر کے ذریعے لوگوں کو دینی امور سے روشناس کرایا جائے۔

تلاوت کتاب، تزکیہ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت کا بھی قریب قریب یہی مطلب ہے۔ تزکیہ نفس کو ہم جدید اصطلاح میں اسلامی طرز پر شخصیت کے ارتقاء سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے علمی اعتبار سے یہ بہت اہم کام ہے۔

تبلیغ اسلام اور دعوت الی اللہ امت مسلمہ کا ایک اہم فریضہ ہے جیسا کہ قرآن کی آیت ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ
وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران ۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

بظاہر تو یہ کوئی بہت بڑا علمی کام نہیں ہے کیونکہ جو شخص مبادی اسلام سے واقف ہے اور بحیثیت ایک دین کے اسے قبول کرچکا ہے۔ اس کام کو انجام دے سکتا ہے لیکن فی الحقیقت علمی اعتبار سے اس کی اہمیت کا اندازہ کئی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انبیاء کرام ؑ کا طریقہ کار اس سلسلے میں کچھ ممتاز صفات کا حامل رہا ہے جو مختلف انبیاء کے طریقہ کار میں مشترک رہی ہیں۔ لیکن ان ممتاز مشترک صفات کے باوجود مختلف پیغمبر کے یہاں طرز دعوت، انداز تخاطب یا اپنے موضوع اور مواد کی تاکید کے اعتبار سے فرق ملتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک پیغمبر کی دعوت میں مختلف انداز اور مختلف نوعیتوں کے دلائل ملتے ہیں لیکن درحقیقت انداز تخاطب، مواد اور موضوع کی تاکید کے اعتبار سے مختلف نوعیتوں کے یہ اختلافات فطرت انسانی کی گوناگوں صفات، حالات کی تلون مزاجی اور زمان و مکان کے تغیرات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انبیائے کرام ہر زمانے میں تشریف لاتے رہے ہیں۔ انھوں نے خطاب انسانوں سے کیا ہے۔ ان کا پیغام زندگی کے لیے تھا۔ اور انسانوں کی زندگی باوجود اپنی بہت ساری آفاقی اور ہمہ گیر خصوصیات کے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ مختلف گروہوں، مختلف زمانوں اور مختلف مکانوں کی خصوصیات، مزاج اور مسائل ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ لہذا انبیائے کرام کے واسطے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے زمانے سے بےگانہ رہ کر اجنبیت کے انداز میں باتیں نہ کریں۔ بلکہ ان کو سمجھیں ان کے حالات کا اندازہ لگائیں۔ وقت کی ضروریات اور مقتضیات کا پتہ چلائیں۔ اس زمانے کے محاسن و معائب کو جاننے کی کوشش کریں اور پھر اس کے بعد ان ہی سے متعلق باتیں

کریں۔ چنانچہ انبیائے کرام نے ایسا ہی کیا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے بنیادی پیغام کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیا بلکہ انھوں نے اس پیغام کو جو خدا کی طرف سے ان کو ملا تھا جوں کا توں انسانوں کے سامنے پہنچایا خواہ وہ بظاہر زمانے سے کتنا ہی غیر متعلق نظر آرہا ہو۔ چناں چہ انھوں نے اصول اور اخلاق کی قربانی دیے بغیر زمانے کے سوالوں کے جواب دیے اس زمانے کی زبان میں بات کی اور اس سے متعلق رہے۔

چنانچہ باوجودیکہ سب نے انسانوں کو ایک اللہ کی طرف بلایا۔ اپنے اپنے زمانے کی سماجی برائیوں پر بھی کڑی تنقید کی۔ حضرت شعیب فرماتے ہیں:۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ

پورا ناپ کر دو اور مت ہو نقصان دینے والے۔

حضرت لوط اپنی قوم سے یوں کہتے ہیں" کیا تم دوڑتے ہو جہاں کے مردوں پر اور چھوڑتے ہو جو تمہارے واسطے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں بنا دی ہیں۔ بلکہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو" حضرت نوح علیہ السلام ایک مرتبہ تو یہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ
يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَى
أَجَلٍ مُّسَمًّى (نوح ۳،۴)

کہ بندگی کرو اللہ کی اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو تاکہ بخشے وہ تم کو، کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقررہ وعدہ تک

اور دوسرے وقت یہ کہتے ہیں:۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ
غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا
وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ
جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ۝ (نوح ۱۰ تا ۱۲)

قرآن مجید کے مطالعہ سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ کہیں تو مخاطبین سے سوالیہ انداز میں بات کی جارہی ہے تو کہیں سادے طریقے سے دعوت دی جارہی ہے اور کہیں استدلال ہے تو کہیں زجر و توبیخ۔

ایک اور خصوصیت نمایاں طور پر قرآن حکیم اور انبیاء کرام کی دعوت میں جو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے دعوت اسلام یا خدا کی بندگی کی دعوت کے ساتھ ساتھ دعوت تفکر و تعقل بھی دی ہے۔ یعنی قرآن اپنے پیغام کو جبراً لاگو نہیں کرنا چاہتا کہ خواہ سمجھ میں آئے یا نہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اسے قبول کرے۔ بلکہ وہ سوچنے اور سمجھنے کے لیے بھی دعوت دیتا ہے۔ غور و فکر کے لیے بھی آمادہ کرتا ہے۔ کہیں تو صراحۃً الفاظ میں اس بات کو ادا کیا جاتا ہے اور کہیں آفاق و انفس کی واضح اور بین نشانیاں سامنے رکھ دی جاتی ہیں اور پوچھا جاتا ہے کہ کیا ان کے باوجود تم انکار کروگے کیا یہ حقائق اس بات کے لیے کافی دلیل نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک معبود وحدہٗ لاشریک ہے اور صرف اسی کے آگے سر تسلیم خم کرنا صحیح ہے؟ اور یہ دعوت ایسے انداز میں

اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ (کیا تم تفکر نہیں کرتے۔ اَفَلَا تعقلون (کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟) دی جاتی ہے کہ گویا قرآن پہلے دعوتِ فکر دے رہا ہے اور اس کے بعد دعوتِ اسلام یعنی ہمیں چاہیے کہ عقل و فہم اور فکر و نظر سے کام لیں جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت ہم پر واضح ہو جائے لہٰذا اس دعوت کو قبول کرنا ایک فطری تقاضا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مقصود دعوتِ فکر نہیں ہے بلکہ اصل دعوتِ اسلام کی ہے لیکن چونکہ اس تک پہنچنے کا واحد راستہ فکر و نظر اور عقل و فہم ہی ہے اس لیے اس سے استفادہ ناگزیر ہے لہٰذا مدعا تو اسلام تک پہنچانا ہے لیکن یہ کام حکم کے ذریعے نہیں ہوگا بلکہ دعوت کے ساتھ ساتھ انسانی عقل کو بھی اپیل کی جائے گی تاکہ اگر اس سے کام لیا جائے تو وہ لازمی طور پر انسان کو اسلام تک پہنچا دے۔ دعوتِ اسلام دیتے وقت ہم کو ان امور کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اور ہمارے لیے ضروری ہے کہ دعوت اسلام دیتے وقت ہم کو ان امور کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اور ہمارے لیے ضروری ہے کہ دعوت اسلام کے لیے ایک ایسے طریقے کو سامنے لائیں جو ایک طرف تو بنیادی طور پر بے کم و کاست اپنے اندر اسلام کا پیغام رکھتا ہو حتی الامکان نہ تو اس میں انفرادی مفروضات کو کوئی دخل ہو اور نہ ہی زمانے اور معاشرے کے مزاج اور تقاضوں کو۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ طریقہ کار زمانے اور متعلقہ سماج سے اس قدر ہم آہنگ بھی ہو کہ اس کے لیے یہ پیغام ایک اجنبی پیغام نہ ہو بلکہ یہ اسی کے دل کی ایک آواز بن کر سامنے آئے اب ظاہر ہے یہ دقیقہ رس اور دشوار گذار کام ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک طرف تو الراسخون فی العلم درکار ہیں جو اسلامی علم میں پختہ ہوں دوسری طرف وہ لوگ جو معاشرۂ انسانی، زندگی اور خود متعلقہ زمانے کے عمیق طالب علم ہوں۔ اس کے بغیر یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔

لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے علمی کام کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ بہتر سے بہتر طریقے پر دعوتِ اسلام کا فریضہ ادا کرنے کے لیے یہ خدمت انجام دی جائے بالخصوص آج جبکہ ایک عرصے سے اسلام پر فکری حملے (خواہ وہ دانستہ ہوں یا نادانستہ) شدت کے ساتھ ہو رہے ہیں اور یہ کام اعلیٰ سطح پر ہو رہا ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسی سطح پر کام کر کے مثبت انداز میں اسلامی فکر کو پروان چڑھانے اور اسے عام کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسی نکتے سے متعلق ایک اور مقصد جو اسلامی نقطہ نظر سے علمی کام کا سمجھ میں آتا ہے وہ منفی نوعیت کا ہے یعنی یہ کہ ان فکری حملوں کا جواب دینے کی بھی کوشش کی جائے جو اسلام پر عرصے سے ہوتے چلے آئے ہیں تاکہ ان کے ذریعے دفاع ہو سکے اور اپنی موجودہ پوزیشن کو مستحکم بنایا

جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بقا کے لیے اقدام قطعی اور ضروری ہے۔ آگے بڑھ کر کچھ پیش کرنا یا حاصل کرنا ہی مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہے اور صرف حال پر ہی نظر رکھ کر ہم حصول مستقبل میں کامیاب نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے لیے مستقبل پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حال سے غفلت بھی نادانی ہے۔ اقدام دفاع کے بغیر ناممکن ہے۔ آگے بڑھ کر کچھ دینا یا لینا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ ہم اپنے موجودہ مقام پر محفوظ ہوں۔ اپنی موجودہ پونجی کی حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ اس کو تجارت وغیرہ میں لگا کر ہم مزید سرمایہ کما سکتے ہیں اور مستقبل میں کامیابی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ ہمارا حال کسی مصیبت کا شکار نہ ہو لیکن پھر وہی بات کہنا پڑے گی کہ اقدام اس دفاع سے نہیں ہو سکتا جو دفاع برائے دفاع ہو۔ لہٰذا دفاع اس لیے ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعے ہم اپنی پوزیشن مضبوط کر کے آگے بڑھ سکیں گے بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک لشکر دفاعی مورچے مضبوط کرتا ہے تاکہ پھر وہاں سے اطمینان کے ساتھ دشمن پر حملے کر سکے لیکن اس احتیاط کی بہرحال ضرورت ہے کہ ہمارا دفاعی عمل مذکورہ بالا مثبت مقاصد کو اثر انداز نہ کر سکے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے علمی کام کا ایک مقصد کائنات کی قوتوں سے استفادہ ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا

(البقرۃ: ۲۹)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

لیکن جو کچھ زمین یا کائنات میں ہے یا تخلیق آدمؑ کے وقت موجود تھا اسے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ موجود شدہ ظاہری حقائق

۲۔ مخفی قوتیں

ظاہری حقائق کا تو ہم مشاہدہ کرتے چلے آئے ہیں۔ ان میں سورج، چاند، تارے، ہوائیں، بادل، پہاڑ، پانی، آگ، ہوا اور مٹی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے لیے ضروری ہیں اور ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ لیکن ان ہی کے ساتھ ساتھ کچھ زمین کی مخفی قوتیں اور پوشیدہ امکانات بھی ہیں۔ جو اگرچہ تخلیق آدمؑ کے وقت ظہور پذیر نہیں ہوئی تھیں لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ جوں جوں انسان نے ترقی کی یہ بھی ارتقائی شکل میں ہمارے سامنے آتی گئیں۔ چنانچہ ہم کو معلوم ہے کہ ہماری غذا کسی متعین مقام پر موجود شکل میں نہیں ملتی رہی ہے۔ بلکہ زمین کے اردگرد ہونے والا ایک عمل ہے جس کے نتیجے میں زمین کی مخفی قوت نے اپنا کرشمہ ظاہر کیا اور نتیجہ کے طور پر یہ نعمت ہمارے سامنے آئی۔ قرآن حکیم نے اس کو اس انداز میں پیش کیا ہے:۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَّ

قَضْبًا ۙ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا۔ پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر

اب یہ پیڑ پودے ہوں یا چمن و باغات۔ دریاؤں میں چلنے والی کشتیاں ہوں یا سمندروں کو پھاڑنے والے جہاز، فضاؤں میں اڑنے والے طیارے ہوں یا دخانی اور برقی قوتوں سے چلنے والی ریل گاڑیاں، طرح طرح کے میوے، سبزیاں، پھل اور خوشبودار پھول ہوں یا گوبر اور خون کے درمیان سے نکلنے والا اسفید اور شفاف دودھ یا پہاڑوں اور درختوں پر گھر بنانے والی مکھیوں کا شیریں شہد۔ اور اسی طرح انسانی آبادیوں میں پائے جانے والے مختلف سماجی ادارے ہوں (کہ جن میں اجتماعیت اور سلیقہ مندی کی برکت سے وہ مقاصد حل ہوجاتے ہیں یا جن کا تصور بھی شروع میں انسان کو نہ تھا) یا وہ جمالیاتی حس کو تسکین بہم پہنچانے والے مختلف فنون لطیفہ جن سے کہ انسان اپنی ابتدا میں ایک طفل مکتب کی طرح بھی آشنا نہیں تھا۔ یہ سب کی سب مادی یا معنوی قوتیں ہم کو اس شکل میں میسر نہیں آگئیں بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا بالکل ابتدا میں ان کا تصور بھی نہ تھا لیکن یہ سب کچھ کائنات، زمین اور اس سے متعلق اشیاء کی مخفی صلاحیتیں تھیں جو ایک علیم و حکیم، لطیف و خبیر اور قادر مطلق ہستی نے اپنی حسن تدبیر اور حسن انتظام سے ان میں ودیعت کر دی تھیں تاکہ انسان ان سے متمتع ہوسکے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کو موجودہ شکل دینے والی ذات انسان کی ہی ہے۔ تحقیق کی جستجو انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے اور پھر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا چنانچہ ان دونوں چیزوں نے مل کر انسان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اسرار فطرت اور خزائن ارض و سما کا پتہ لگا کر ایک طرف تو تلاش حق کی تسکین بہم پہنچائے۔ اور دوسری طرف ان قوتوں سے استفادہ کرے۔ لہذا تاریخ گواہ ہے کہ یہ عمل ہوتا رہا ہے اور اب بھی جاری ہے۔ اس طرح بہت حد تک "خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا" کی عملی تعبیر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ہم اس آیت سے بالواسطہ طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان نعمتوں سے استفادہ بھی ایک ضروری کام ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں :۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔

لوہا ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکا ہے اس کی باس شدید اور دیگر منافع خدا کی ایک عظیم نعمت ہیں جن کی انسان نے کھوج کی ہے اور اس کے نت نئے استعمال کے ذریعے انسان نے اس سے بھرپور استفادہ کی کوشش بھی کی ہے

لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ زمین کی ان مخفی قوتوں کے انکشافات کا یہ عمل اب تک تکمیلی حالت کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ بلکہ اندازا ایسا ہوتا ہے کہ تکمیلی حالت تک پہنچنا تو درکنار ان قوتوں کے عشر عشیر تک بھی ابھی انسان کی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ چناں چہ یہ عمل جاری ہے اور جاری رکھنا ہے

الغرض ان تمام مباحث کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ کائنات کی ان ظاہری اور مخفی طاقتوں سے استفادہ بھی ایک اسلامی کام ہے اور اسلام میں اس کی قدر ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ ان تمام کاموں کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا ہو وہ ایک اسلامی ذہن ہو وہ ایک اسلامی ذہن ہو۔ یعنی ان تمام سرگرمیوں کا محرک، حصول شہرت، دوسروں کا استحصال، ان کو غلام بنانا اور فساد فی الارض نہ ہو اور نہ ان کے نتیجے میں انسان غفلت تکبر اور غرور کا شکار ہو جائے بلکہ خود اوپر والی آیت میں ومنافع للناس کے بعد خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے یعنی ان ذرائع کو اللہ کے دین کی نصرت کے واسطے استعمال کیا جائے ان کے ذریعے شان خداوندی کا مظاہرہ بہترین طریقے پر ہو اور ان کے نتیجے میں انسان اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرے اور وہ خدا سے بغاوت کرنے کے بجائے اس کا شاکر اور مطیع بندہ بنے چنانچہ اسی آیت کا آخری ٹکڑا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ

یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔

یعنی اگر کسی کو ان انکشافات اور ان کامیابیوں کے بعد یہ غرہ ہے کہ اب وہ مختار کل اور مطلق العنان ہو گیا تو اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس کے اوپر بھی ایک ایسی ہستی موجود ہے جو طاقت والی اور زبردست ہے کہ اگر ایک طرف اس نے یہ نعمتیں پیدا فرمائی ہیں تو وہ دوسری طرف باغیوں اور سرکشوں کو تہس نہس کر دینے پر بھی پوری طرح قادر ہے۔ اب ظاہر ہے یہ سارا کام علمی کام کے نتیجے میں ہوا۔ یہ سب کچھ مطالعہ فطرت اور خدا کے دیے ہوئے تعقل و تفکر کی ہی برکات کا ظہور ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے علمی کام کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کائنات کی مخفی صلاحیتوں اور پوشیدہ امکانات کا پتہ چلایا جائے اور ان کو بروئے کار لا کر ان سے استفادہ کے لیے کوشش کی جائے۔

اس موقع پر ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے

اور وہ یہ کہ مذکورہ بالا مقصد یا کائنات کی قوتوں سے استفادے کا عمل ایک ہی مقصد یا اسلامی زندگی کا ایک ہی پہلو ہے یہ چیز کل اسلام یا ساری اسلامی زندگی نہیں ہے۔ اس بات کو بہت اہمیت دینی ہے کیونکہ بہر حال مسلم دانشوروں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اسی کام کو اسلام کی روح اور اسلامی زندگی کا ماحصل قرار دیتا ہے جو کہ سراسر تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔ یہ طرز فکر درحقیقت اسلامی تعلیمات کا استحصال ہے۔ اس طرز فکر کی تائید نہ تو کتاب اللہ کرتی ہے اور نہ سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور نہ ہی جمہور علمائے اسلام کے کارنامے۔ الا یہ کہ نہایت ہی مکروہ طریقے پر کتاب اللہ کی غلط تشریح و تعبیر کی جائے سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو غیر ضروری قرار دیا جائے اور علمائے امت کے عظیم الشان اور بے مثال کارناموں کو دریا برد کر دیا جائے۔

الغرض یہ ہیں علمی کام کے وہ مقاصد جن کو اسلامی نقطۂ نظر سے پسندیدہ یا ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات مسلم علمی حلقوں میں حقائق کے پیش کرنے کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مقاصد میں سے کوئی ایک مقصد لیکر صرف اسی کے استدلال پر اپنی توجہ صرف کی جاتی ہے اور صراحۃً یا اشارۃً اس میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ اس کے علاوہ اور دوسرے مقاصد جو بیان کیے جاتے ہیں فضول اور لغو محض ہیں۔ یہ انداز سراسر غلطی پر مبنی ہے اور یہ ایک انتہا پسندانہ رویہ ہے۔ یہ رویہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ نہ تو اسلام کو ٹھیک سے سمجھا گیا ہے اور نہ ہی زندگی کے حقائق سے اچھی طرح واقفیت ہے۔ اسلام کا تعلق زندگی سے ہے اور زندگی ایک متحرک قوت ہے۔ اس میں اگر ایک طرف بہت سی یکسانیتیں ہیں تو دوسری طرف بہت سے اختلافات۔ ایک طرف ہمواریاں ہیں تو دوسری طرف نشیب و فراز۔ ایک طرف زندگانی جوئے شیریں ہے تو وہ دوسری طرف تیشہ و سنگِ گراں۔ یہ مختلف مقاصد بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بیان کرنے میں کچھ کمی یا بیشی ہو گئی ہو۔ اپنے درجہ اہمیت کے اعتبار سے بھی یہ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہ روش اعتدال اور توازن کی راہ سے ہٹی ہوئی ہوگی کہ کسی ایک مقصد کو لیکر باقی کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔

اب آخر میں جو ایک اہم مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے اور جس کا ذکر درمیان میں بھی آیا تھا وہ یہ ہے کہ موجودہ حالات اور موجودہ عالمی سماج کی ضروریات کیا ہیں؟ اور اس وقت علمی کام کے مقاصد کیا ہونا چاہییں؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لیے کہ یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ مسلم محققین اور مفکرین کو سب سے پہلے اس سوال کا جواب دینا ہے۔ اس سوال کا جواب طے کرے گا کہ آیا ہماری علمی کوششیں غیر منظم، غیر مرتب، غیر مربوط اور متفرق رہیں گی یا ان کو مجتمع، منظم، مرتب اور باہم مربوط ہونا چاہیے۔

اقبال کی شاعری میں ایمائیت

پروفیسر عبد المغنی پٹنہ

استاذ مکرم مولانا سید احمد عروج قادری صاحب مدظلہ نے ازراہ کرم میری کتاب 'جادۂ اعتدال' پر جو تبصرہ 'زندگی' بابت مارچ و اپریل ۱۹۸۲ء میں فرمایا ہے وہ میرے لیے بہت حوصلہ افزا ہے اور امید ہے کہ ان شاء اللہ مفید ہوگا — واقعی یہ موصوف کی بڑی عنایت اور ذرہ نوازی ہے کہ انھوں نے پوری کتاب کا مطالعہ فرمایا اور بعض مضامین پر کافی غور و فکر کے چند ایسے نکات کی نشان دہی کی جو علم و ادب کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ہی میں ایک نکتہ اقبال کی شاعری میں ایمائیت سے متعلق ہے چونکہ اقبال میری ادبی تنقید نگاری کا مخصوص اور محبوب ترین موضوع ہے اور دنیائے ادب میں عام طور پر بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لہٰذا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں مولانا سید احمد عروج قادری صاحب مدظلہ کی اٹھائی ہوئی بحث پر بطور وضاحت کے کچھ اظہار خیال کروں — تاکہ اہل علم کے سامنے اس بحث کے تمام ضروری اور اہم گوشے آجائیں۔

'جادۂ اعتدال' کے ایک مضمون "کلام اقبال کی اشاریت" کے مذکورہ ذیل اقتباس :-

"اقبال کی فکر بلا شبہ راست انداز ہے مگر ان کا فن سراسر ایمائی ہے جس کے وسائل اظہار بیشتر رمز و کنایہ ہیں۔"

پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :-

"یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ راست انداز بیان اور ایمائیت یا اشاریت فن اور ترسیل خیال کے نہج کی قسمیں ہیں۔ فکر اور نظریے کی نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے فن کو "سراسر ایمائی" کہنا سراسر مبالغہ آرائی ہے۔"

اس کے بعد میرے ایک دوسرے مضمون "اقبال کی انسان دوستی" سے اقبال کے پانچ اشعار بطور نمونہ پیش کر کے سوال کیا ہے :-

"کیا ان اشعار میں کوئی ایمائیت پائی جاتی ہے؟"
پھر مولانا نے اقبال کے کلام کو دو حصوں میں منقسم کرکے بتایا ہے کہ اس کا صرف "فلسفیانہ و متصوفانہ حصہ ایمائی ہے، جب کہ "تحریکی اور پیغمبرانہ" حصہ راست انداز ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے اقبال کے ایک مصرعے "حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست" کا مفہوم بھی اس طرح بتایا ہے کہ

"اس سے مراد یا تو ان کے کلام کا فلسفیانہ و متصوفانہ حصہ ہے، یا خلوتی انھوں نے ان لوگوں کو کہا ہے جن کے کلام میں کوئی پیغام عام نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنے مخصوص حلقے کے لیے کہتے ہیں۔"

مولانا نے اقبال کی شاعری میں ایمائیت کی یہ بحث فیض کی شاعری پر میرے مضمون کے ایک اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے شروع کی ہے اور اس کے ذیل میں انھوں نے ایک فکر انگیز نکتہ یہ پیش کیا ہے

"اشاروں کنایوں میں بات کرنا ایک الگ چیز ہے اور کسی واضح بات کے لیے استعارہ، کنایہ، تمثیل کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اقبال نے اپنے کلام کے اس حصہ میں جس کو ہم 'اسلامی' 'تحریکی' اور 'پیغمبرانہ' کہتے ہیں بات اشاروں کنایوں میں نہیں کہی ہے بلکہ پوری راست بیانی سے کام لیا ہے، البتہ اپنی واضح بات کے لیے بکثرت استعارے کنایے اور تلمیحات استعمال کی ہیں۔"

میرا خیال ہے کہ مولانا اقبال کی شاعری میں ایمائیت کے مسئلے پر تنقیدی انداز سے غور و فکر نہیں کرسکے ہیں ورنہ انھوں نے اس سلسلے میں میرے محولہ بیان کا وہ مطلب نہیں لیا ہوتا جو مذکورہ بحث میں ان کے پیش نظر رہا ہے واقعہ یہ ہے کہ زیر نظر موضوع پر میرے پورے مضمون اور مولانا کے تبصرے کے تمام اجزا کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ شاید اس معاملے میں میرے اور مولانا کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں۔ میں کہتا ہوں۔

"اقبال کی فکر بلا شبہ راست انداز ہے مگر ان کا فن سراسر ایمائی ہے جس کے وسائل اظہار بیشتر رمز و کنایہ پر مشتمل ہیں۔"

مولانا فرماتے ہیں:۔

اقبال نے اپنے کلام کے اس حصے میں جس کو ہم اسلامی، تحریکی اور پیغمبرانہ کہتے ہیں۔ بات اشاروں کنایوں میں نہیں کہی ہے بلکہ پوری راست بیانی سے کام لیا ہے البتہ اپنی واضح بات کے لیے بکثرت استعارے کنایے اور تلمیحات استعمال کی ہیں۔"

ان بیانات کا علمی موازنہ کرتے ہوئے مولانا کے اس مفروضے کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کردیا جائے جس کی بنیاد پر انھوں نے راست اندازی اور ایمائیت کے سلسلے میں فکر و فن کے درمیان میری کی ہوئی تفریق کو عجیب بتایا ہے تو معلوم ہوگا کہ میں اور مولانا، اقبال کی شاعری

میں ایمائیت کے متعلق درحقیقت ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں جس کے اہم ترین اجزا یہ ہیں:۔

۱۔ اقبال کے افکار و تصورات بالکل واضح اور صاف و صریح ہیں، جب کہ

۲۔ ان کے فنی وسائلِ اظہار 'بیشتر' یا 'بکثرت' (دونوں الفاظ ہم معنیٰ ہیں) رمز و کنایہ اور استعارہ و تلمیح پر مشتمل ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ مولانا اس تجزیے کے بعد میرے اور اپنے درمیان زیرِ بحث موضوع کے بنیادی مسئلے پر ایک نقطۂ مشترک کا اقرار کرنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کریں گے۔

رہی یہ بات کہ میں نے آخر فکر اور فن کے درمیان وہ تقسیم کی ہی کیوں جس کے سبب مولانا اقبال کی شاعری میں ایمائیت کے موضوع پر میرے نقطۂ نظر کے متعلق خواہ مخواہ غلط فہمی میں پڑ گئے اور یہ کہ کیا یہ تقسیم صحیح ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقسیم صحیح ہی نہیں، ضروری ہے۔ یہ ایک واضح بات ہے کہ ادب اور شاعری کے کسی بھی نمونے کے دو اجزا ہوتے ہیں۔ ایک فکر اور دوسرا فن اور یہ عین ممکن ہے کہ ایک ادیب اور شاعر اپنے ذہن میں مسائلِ حیات کے متعلق ایک قطعی فکر رکھتے ہوئے بھی فنی ہیئت اور اسلوب میں اس فکر کو اشارہ و کنایہ اور استعارہ و تلمیح کے ذریعے ظاہر کرے۔ خواہ راست انداز فکر کے ساتھ فن کی ایمائیت فن کار کے شخصی مزاج کے سبب ہو یا ہیئتِ فن کا لازمی تقاضا ہو یا بہ یک وقت دونوں ہی باتیں ہوں، اور واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے یہاں دونوں باتیں حسنِ اتفاق سے جمع ہو گئی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ فطری طور سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ اقبال کا ذہن بلاشبہ فلسفیانہ و مفکرانہ تھا، اور وہ مطالعہ و مشاہدہ اور غور و فکر کے ذریعے ایک اسلامی تحریکی اور 'پیغمبرانہ' نصب العین اختیار کر چکے تھے۔ مگر ایک طرف ان کے خاص وسیلۂ اظہار 'شاعری' کے فن کے کچھ تقاضے اور آداب تھے اور دوسری طرف ان کا مزاج خود ہی ان تقاضوں اور آداب کی طرف
ان کا مزاج خود ہی ان تقاضوں اور آداب کی طرف مائل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پورے شعور کے ساتھ یہ بیان دیا۔

دقت برہنہ گفتن ست   من بہ کنایہ گفتہ ام

اس لیے کہ ان ہی کے بقول:۔

حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اقبال نے یہاں 'خلوتی' دوسرے اور اپنے سے مختلف لوگوں کو نہیں کہا ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی خلوتیوں کے زمرے میں شامل کیا ہے، جیسا کہ شعر کے پہلے مصرعے سے واضح ہوتا ہے۔ اسی طرح اقبال نے ہرگز اپنے کلام کی کوئی ایسی تقسیم نہیں کی ہے جس کے مطابق صرف ایک حصہ تو متصوفانہ و فلسفیانہ اور نتیجۃً خلوتی ہو، جب کہ دوسرا اسلامی و تحریکی و پیغمبرانہ اور نتیجۃً راست انداز بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کلامِ اقبال فلسفیانہ اور تحریکی اجزا کا ایک ایسا ہم آہنگ مرکب ہے جس کے عناصر ترکیبی کی تفریق و تقسیم ناممکن ہے۔ فکرِ اقبال میں متصوفانہ اور اسلامی کا کوئی تضاد و قطعاً نہیں پایا جاتا۔ ورنہ اقبال

نے اس زور و شور سے خانقاہیت پر تنقید نہیں کی ہوتی اصولاً اقبال کا معیار فکر واحد ہے۔ یعنی اسلام، سچا اور پورا اسلام۔ چنانچہ اس کلام میں تصوف اور فلسفہ وغیرہ کے جو کچھ اجزا نظر آتے ہیں ان کی الگ سے کوئی حیثیت کلام اقبال میں نہیں، بلکہ وہ محض کلیہ اسلام کے پہلو اور عناصر ہیں۔ اصل اور مستقل جوہر اسلام ہے جس کے اجزاء و عناصر کے طور پر ہی ان پہلوؤں کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم تنقیدی نکتہ یہ ہے کہ نہ تو اقبال کے نزدیک "خلوتی" کا اور نہ میرے نزدیک ایمائی کا وہ مفہوم ہے جو مولانا عروج قادری صاحب نے فرض کر لیا ہے۔ میرے اور اقبال کے نزدیک خلوتی اور ایمائی دونوں کا مطلب صرف یہ ہے کہ شاعری کوئی راست انداز فن نہیں، یہ ایک فن لطیف ہے اور اس میں ترسیل خیال کے ذرائع رمز و کنایہ اور تلمیح و استعارہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر اچھی اور بڑی شاعری عمومی طور پر ایمائی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہر سچا شاعر اصلاً خلوتی ہوتا ہے۔ یہاں خلوتی کا مطلب دروں بیں ہے۔ جس کے لیے دوسرے زیادہ معروف مترادفات عشق، دل، خون جگر معرفت وغیرہ سے مشتق ہیں اور اسی خلوتی کی زبان وہ ہے جس کو ایمائی، علامتی، اشاراتی، استعاراتی و کنایاتی وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یعنی نہ تو خلوتی میں کوئی ایسی سریت ہے جو بالکل غیر واضح اور مبہم ہوا ور نہ ایمائی میں کوئی ایسی رمزیت ہے جو اغلاق و اشکال پیدا کرنے والی ہو، اور

مولانا کی بحث سریت و رمزیت کے ان ہی مفروضوں پر مبنی ہے۔ چنانچہ اگر ان مفروضوں کو واپس لے لیا جائے تو میرے اور مولانا کے درمیان بنیادی طور پر پھر اتفاق رائے کی صورت نکل آتی ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ میں نے اقبال کی فکر کو راست انداز کہا ہے۔ جبکہ مولانا فن کے لیے راست انداز بیان کی بات کہتے ہیں، چنانچہ "راست انداز" اور "راست انداز بیان" کے درمیان فرق واضح ہے کیونکہ راست انداز ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ قطعی اور واضح ہو اور اقبال کی فکر کی قطعیت و وضاحت کے بارے میں میرے اور مولانا کے درمیان کامل اتفاق رائے ہے۔ میں سمجھتا ہوں، یہاں بھی مولانا کو لفظ "راست انداز" کے مفہوم کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ایک مرکب لفظ ہے جس میں راست اور انداز الگ الگ کوئی معنے نہیں رکھتے، بلکہ دونوں مل کر ایک مفہوم واضح اور قطعی کا دیتے ہیں۔ لہٰذا راست انداز کا راست انداز بیان سے کوئی لغوی و معنوی تعلق نہیں۔ شاید اس سلسلے میں مولانا کی غلط فہمی کا باعث یہ ہو کہ راست انداز کی ترکیب ذرا نئی ہے اور اس کا استعمال اردو ادب بالخصوص تنقید میں پچھلے پندرہ بیس سال ہی کے اندر مروج ہوا ہے۔

جہاں تک کلام اقبال کی بنیادی و عمومی ایمائیت کا تعلق ہے یہ ایک کھلی ہوئی اور معلوم و معروف حقیقت ہے جس کا علم و احساس خود مولانا کو بھی کسی حد تک ہے اس کا ذکر قبل کی سطور میں آچکا ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں بعض

وقت بعض ذہنوں میں جو کچھ - - - - - - - - - -

الجھن پیدا ہوتی ہے اس کی ایک وجہ ہے، گرچہ وہ غیر ادبی اور غیر تنقیدی ہے۔ یعنی یہ کہ اقبال محض شاعر اور فن کار نہیں تھے، بلکہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قائد و مصلح کا نصب العین، ایک داعی کا پیام اور ایک مجتہد کا نقطہ نظر بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ محض ان کی فکری حیثیت پر زور دیتے ہیں وہ ان کی شاعرانہ حیثیت کے بارے میں حقیقت پسندی سے کام نہیں لیتے۔ ایسے لوگوں کے زمرے میں اقبال کے مداح بھی ہیں اور نکتہ چیں بھی لیکن دونوں ہی کا رویہ یکسر غیر علمی اور غیر حکیمانہ ہے اور وہ اقبال کی شاعری کا ایک متعصبانہ مطالعہ کرتے ہیں جو ادبی تنقید کے بجائے صرف ایک شخصی تاثر بن کر رہ جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اقبال کے افکار و تصورات اور مقاصد و عزائم جو بھی ہوں۔ ان کا ذریعہ اظہار اور وسیلۂ بیان تو فن شاعری ہی ہے۔ لہذا وہ اس فن لطیف کی ہیئت کے مستند و مؤثر اسالیب ہی سے کام لیتے ہیں اور اس فن کاری میں وہ دنیا کی تمام جدید و قدیم زبانوں کے دوسرے تمام شعراء سے آگے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ جتنے بڑے مفکر ہیں اتنے ہی بڑے (بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ) شاعر ہیں۔ اس طرح اقبال کی فکر اور فن کے درمیان کامل توازن اور مکمل امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسی امتزاج و توازن سے اقبال کی شاعرانہ عظمت متعین ہوتی ہے اور اسی عظمت پر ان کی مفکرانہ و پیمبرانہ اہمیت بھی مبنی ہے۔ چنانچہ اگر کلام اقبال کی شاعرانہ ایمائیت میں ذرا بھی کمی واقع ہوگی تو اتنی ہی کمی اس کی راست انداز فکر کی معنویت میں بھی واقع ہو جائے گی۔ جہاں تک دنیائے شعر کا تعلق ہے، جس میں ہی اقبال کی پوری شخصیت، جیسی اور جتنی کچھ بھی وہ ہے سانس لیتی ہے۔

اقبال کی راست انداز فکر کے ساتھ فنی ایمائیت کے نمونے شاعری کی تمام بڑی نظموں اور اچھی غزلوں میں بغیر کسی استثناء کے پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں طلوع اسلام، خضر راہ، ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ اور بال جبریل کی غزلیں تو بہت مشہور ہیں، لیکن ضرب کلیم کی منظومات و غزلیات بھی اس کیفیت سے مملو ہیں۔ ضرب کلیم کی ایک نظم 'مدنیت اسلام' موضوع کی ثقاہت کے باوجود کس درجہ فنی ایمائیت سے پُر ہے۔ اس کا تنقیدی تجزیہ میں نے اپنے پہلے مجموعے 'نقطہ نظر' کے ایک مقالے 'اقبال کا فن' میں کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مجموعے 'جادۂ اعتدال' کے زیر بحث مقالے 'کلام اقبال کی اشاریت' میں بھی میں نے اسی نقطہ نظر سے طلوع اسلام کے ایک بند کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ مولانا نے میرے ایک مقالے 'اقبال کی انسان دوستی' سے جو چند اشعار راست انداز بیان کے ثبوت کے طور پر پیش کیے ہیں وہ اصل مسئلے پر کوئی اثر نہیں ڈالتے، اس لیے کہ کسی موضوع پر بحث میں فیصلہ کن اور لائق اعتبار محض چند مثالیں نہیں ہوتیں، بلکہ معاملے کی عمومی نوعیت ہوتی ہے۔ لہذا خواہ اقبال نے راست انداز بیان پر مشتمل کتنی ہی تخلیق پیش کی ہوں وہ ان کی شاعری کا اصل سرمایہ نہیں اور نہ ان پر اقبال کی عظمت مبنی ہے۔ چونکہ

ایسی تخلیقات اقبال کے فن کے غالب انداز اور حقیقی کردار کی نمائندگی نہیں کرتیں۔

اب ایک بات یہ رہ جاتی ہے کہ بعض اشعار میں خود اقبال نے اپنے اسلوبِ سخن پر تبصرہ کیا ہے جس سے ایمائیت کی نفی ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن ایک تو دوسرے اشعار ایسے بھی ہیں جو ایمائیت کا اثبات کرتے ہیں۔ چناں چہ اثبات و نفی کے اس تضاد کے باعث حضرت مولانا نے اقبال کی شاعری ہی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ دوسرے یہ کہ صرف شاعر کے بیانات سے اس کے اسلوبِ سخن کا تعین کرنا صحیح نہیں بلکہ اس معاملے میں لائقِ اعتبار اور فیصلہ کن عنصر براہِ راست فنی عمل یعنی شعری تخلیق ہے۔ جہاں تک شاعر کے بیانات کا تعلق ہے، اقبال نے تو اسلوبِ سخن کیا، شاعری ہی سے کئی بار انکار کیا ہے۔

۱۔ مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

۲۔ نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست

۳۔ نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں

ظاہر ہے کہ اس قسم کے بیانات کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ اقبال شاعر نہیں۔ حقیقتِ حال صرف یہ ہے کہ خواہ شاعری کی نفی ہو یا ایمائیت کی، اس سے اقبال کی مراد بس یہ ہے کہ وہ نرے شاعر نہیں اور یہ کہ ان کا مقصود بالذات فن کاری نہیں بلکہ جیسا کہ محولہ بالا تینوں مصرعوں کے دوسرے مصرعوں سے آشکار ہوتا ہے ان کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ وہ زندگی کی بلند تر حقیقتوں سے آگاہ ہیں۔ انسانی سماج کو اس کی منزل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور لوگوں میں صحیح جذبہ پیدا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۱۔ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

۲۔ سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

۳۔ کوئی دل کشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

اس سلسلے میں اہم ترین فنی نکتہ یہ ہے کہ شاعری کو اقبال کاری گری کے طور پر اختیار نہیں کرتے، وہ فن کارانہ آورد اور تصنع کو پسند نہیں کرتے، بلکہ ان کے نزدیک ملکۂ شعری ایک خداداد صلاحیت ہے جس کا استعمال فطری طور سے انسان کے بلند مقاصد کے لیے ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں اقبال کا تصور یہ ہے کہ جس شاعر کا جذبۂ فن سچا اور پکا ہوتا ہے اس کے اسلوبِ سخن میں جمال و رعنائی کا عنصر بغیر کسی تکلف کے پیدا ہو جاتا ہے

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

لیکن اس کے ساتھ ہی اقبال کا تنقیدی شعور اتنا بالیدہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ دورِ حاضر کے شور و غل اور بے حسی کی کیفیت ایک سخت واشگاف اور راست اندازِ بیان کی متقاضی ہے مگر شاعری کا فن لطیف ایمائیت کا طالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ :۔

لمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں

اور ــــــ

"وقت برہنہ گفتن است" کا اقرار کرنے کے باوجود

اقبال نے اپنے لیے اسلوب سخن یوں تجویز کیا۔

من بہ کنایہ گفتہ ام

اور ـــــــ

حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اس طرح اقبال نے بڑی بالغ نظری کے ساتھ اپنی شاعری میں ایک راست انداز فکر کو رمز و کنایہ اور کنایہ و استعارہ کے فنی لوازم کے ذریعے پیش کیا۔ مواد و ہیئت اور موضوع و اسلوب کو اسی ہم آہنگی کے سبب اقبال کے کلام میں یہ کیفیت پیدا ہوئی کہ مذکورہ ذیل عربی مقولے کا مصداق و مستحق پوری دنیا کے شاعری میں کسی دوسرے کا کلام اس سے بڑھ کر نہ ہوا۔

إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً وَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا

نوٹ :۔ میں اقبال کے فن کو سراسر ایمائی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری میں ایمائیت و اشاریت کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر اپنے اصلی خیالات واضح طور پر پیش نہ کرے بلکہ بات رمز و اشارے میں کہے۔ اگر اس نے اپنی بات واضح انداز میں کہی ہو تو اس پر اشاریت و ایمائیت کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ اسے راست انداز بیان کہا جائے گا۔ اقبال کے کلام کا وہ حصہ جس میں انھوں نے مغربی تہذیب اور تباہ کن نظریات پر تنقید کی ہے اور اسلام کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا ہے، بیشتر راست انداز بیان ہی میں ہے اس لیے ان کا فن سراسر ایمائی نہیں ہے

پروفیسر عبدالمغنی صاحب کا اپنا مخصوص خیال یہ ہے کہ ایمائیت و اشاریت صرف رمز و اشارہ میں بات کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ شاعر نے اگر اپنا خیال واضح طور پر تشبیہ، استعارہ اور تمثیل استعمال کر کے پیش کیا ہو تو وہ بھی ایمائیت و اشاریت کے دائرے میں ہے اور اس پر بھی "ایمائی" کا اطلاق صحیح ہے۔ اگر اردو ادب کے تنقید نگار اور شعراء و ادبا عزیز مکرم عبدالمغنی کے خیال سے متفق ہو جائیں تو بیشک اس مسئلے میں میرے اور آں عزیز کے نقطہ نظر کا اختلاف کم ہو جائے گا۔ البتہ یہ بات اب بھی توضیح طلب رہے گی کہ پھر راست انداز بیان کس چیز کا نام ہوگا جبکہ ایمائیت و اشاریت اور راست انداز بیان، ترسیل و ابلاغ خیال کے دو الگ الگ نہج تسلیم کیے جاتے ہیں اور خود آں عزیز نے اپنے اس مضمون میں اقبال کی راست انداز بیان پر مشتمل تخلیقات کے بارے میں لکھا ہے کہ اقبال کی عظمت اس پر مبنی نہیں ہے۔

یہ نوٹ صرف اس توجیہ کی توضیح ہے جو آں عزیز نے میرے اور اپنے خیال کے درمیان تطبیق کے لیے پیش کی ہے ان کے اس پورے توضیحی مضمون کا کوئی جواب دینا مقصود نہیں ہے۔ سید احمد قادری

مقالہ نگار :- ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا

ترجمہ وتبصرہ : جناب محمد اقبال صاحب

پیغمبر اسلام اور اسلام کے بارے میں

ایک غیر مسلم کے خیالات

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و تمدن کے استاذ ہیں۔ ان کا ایک مضمون السریڈ ویکلی ۱۵ اپریل ۷۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے پیغمبر اسلام اور اسلام کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ جناب محمد اقبال لکچرار قادر محی الدین کالج اودیام پٹنم ضلع تنجور، تامل ناڈو نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور آخر میں اس مضمون پر مختصر نوٹس لکھے ہیں جن کی تعداد ۲۶ تک پہنچی ہے اور یہ تعداد بھی کم ہے۔ انھوں نے اچھی خاصی محنت کی ہے اور اپنی یہ محنت ماہنامہ زندگی میں اشاعت کے لیے بھیجی ہے۔ جناب محمد اقبال کے بعض مضامین پہلے بھی زندگی میں شائع کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ ترجمہ و تبصرہ کئی ماہ پہلے آیا تھا اور اب اس کی اشاعت کی نوبت آئی ہے۔ مقالہ نگار نے بہت سی اچھی باتیں لکھی ہیں لیکن اس مضمون سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ غیر مسلم بھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام سے ہمدردی رکھتے اور ان دونوں کے بارے میں انھوں نے کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ کتنی کم ہیں اور اسلام کے بارے میں ان کے خیالات کتنے غیر واضح بلکہ الجھے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں تک صحیح معلومات اور واضح خیالات پہنچائے جائیں۔ اسی جذبے کے تحت یہ ترجمہ و تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

اے محمدؐ! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں

کے حق میں ہماری رحمت ہے۔) سورہ الانبیاء آیت ۱۰۷

خدا کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عنایت

صریح ہوتا ہے۔ اسلام، جس کی اشاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ ایک ایسا مذہب ہے جو کسی فرد یا بانی کی طرف منسوب نہیں۔ یہ وہ نام ہے جس کے ذریعے سے اس مذہب کے مقصد تبلیغ اور حصول مقصد دونوں کو واضح کیا گیا ہے عربی زبان کی رو سے اسلام کے دو مفہوم ہیں۔ اطاعت اور سپردگی۔ اطاعت سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو رضائے الٰہی کا مطیع بنالے اور سپردگی یہ ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے احکام کی بجا آوری اور توکل علی اللہ کو انسان اپنا نصب العین بنالے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے ان کی ولادت سے پہلے ان کے والد ماجد عبداللہ جو ذی شرافت تھے، انتقال کر چکے تھے۔ ابھی آنحضورؐ چھ سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کی والدہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ اس کے بعد وہ دو سال تک اپنے دادا جان کی سرپرستی میں رہے۔ جب دادا نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو آں حضورؐ اپنے چچا ابوطالب کی نگرانی میں آگئے۔ ابوطالب کے بیٹے حضرت علی رضؓ تھے جنھیں آگے چل کر آں حضورؐ کی دامادی کا شرف نصیب ہوا۔

تجارتی سفروں میں ابوطالب حضرت محمدؐ کو ساتھ لے جاتے تھے۔ امانت داری اور لین دین میں راست بازی کی وجہ سے آں حضورؐ کو لوگ الامین کے لقب سے پکارتے تھے مکہ کی ایک بیوہ متمول خاتون خدیجہ نے جن کا ایک بڑا تجارتی کاروبار تھا، محمدؐ کی خدمات اپنے تجارتی کاروبار کے لیے حاصل کیں۔ آں حضورؐ نے ان کا کام اس قابلیت کے ساتھ سر انجام دیا کہ وہ آں حضورؐ کی دیانت سے بہت متاثر ہوئیں اور ان سے اس وقت رشتۂ ازدواج استوار کیا جب کہ آنحضورؐ صرف ۲۵ سال کے تھے۔ وہ انہیں سے صاحب اولاد ہوئے مگر سوائے فاطمۃ زہرا کے دوسرے تمام بچے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی میں وفات پاگئے۔ فاطمہ کی شادی حضرت علی سے ہوئی جو رسول اکرمؐ کے چچا زاد بھائی تھے اور بعد میں اسلام کے چوتھے خلیفہ راشد بنے۔

ذکر و فکر کے لیے آں حضورؐ غار حرا میں تنہائی کے لمحات اکثر و بیشتر گذارا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر حاضر ہوئے پہلی آیات جو آپ پر نازل ہوئی تھیں، یہ ہیں:۔

اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ ۝ خَلَقَ
الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس
نے جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان
کی تخلیق کی۔

وقتاً فوقتاً بذریعہ وحی قرآن کی آیات نازل ہوتی رہیں اس طرح جب آں حضورؐ کی بعثت ہوئی تو ان کی رسالت پر ایمان لانے والوں میں خدیجہ رضؓ، علی رضؓ اور ایک غلام سبقت لے گئے [۱]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک فلسفے کے موجد[۱۵] نہ تھے بلکہ خود

انھوں نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ قوانین انھوں نے وضع کیے۔[۳] جنگ و امن کے تمام حالات سے انہیں گذرنا پڑا۔ اور زندگی کا کوئی ایسا واحد اہم رخ نہیں جس کی زیبائش انھوں نے نہیں کی۔ ان کی حیات طیبہ میں عقل و دانش اور سعی و جہد کا خوش آگیں امتزاج ملتا ہے۔ حکمت بذات خود قدرت اور طاقت سے تہی دامن ہے اور صرف عمل بغیر علم و ہدایت کے کچھ نہیں۔[۴] آں حضورؐ نے اقتدار زندگی کے لیے نیا نقد و نظر پیش فرمایا۔

انھوں نے واضح کیا کہ اسلام کی دو بنیادیں قرآن اور سنت ہیں۔ بعد میں اجماع اور قیاس بھی شامل کیے گئے۔[۵] اس طرح سے اسلام کے لیے چار بنیادیں فراہم ہوگئیں۔ ہر مسلمان پر پانچ فرائض لازم ہیں جنھیں ارکان اسلام کہا جاتا ہے۔ کلمہ۔ نماز یا صلوٰۃ۔ [illegible] یا روزہ۔ زکوٰۃ جو غریبوں کو ادا کرنے کے لیے ایک ٹیکس[۶] ... [illegible] حج۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کو قدامت پسند مذہبی اجارہ دار یعنی پادریوں کے دستبرد سے آزاد کیا اور مذہب کو ضابطۂ حیات بنایا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب وہ یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے تو ان سے دریافت کیا کہ وہ کس طرح مقدمات کا فیصلہ سناتے رہیں گے۔ معاذ نے فوراً ہی کہا کہ قرآن کی روشنی میں وہ فیصلہ سنایا کریں گے۔ رسول اکرمؐ نے پوچھا کہ اگر قرآن کسی خاص معاملے میں خاموش ہو تو وہ کیا کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ سنت نبوی سے ہدایت حاصل کریں گے۔ پھر آں حضورؐ نے پوچھا کہ اگر کسی عدیم المثال مقدمے کے بارے میں قرآن اور سنت خاموش ہوں تو وہ کیا کریں گے۔ معاذ نے جواب دیا کہ ایسے موقع پر وہ اپنے ذاتی فکر و تدبر و تفقہ کو بروئے کار لائیں گے۔ اس جواب سے آں حضورؐ بے حد خوش ہوئے۔

دین کے معاملات میں آں حضورؐ جبر و اکراہ کے سخت مخالف تھے۔ لا اکراہ فی الدین (البقرہ آیت ۲۵۶) انھوں نے کبھی کسی کو بھی اسلام قبول کرنے اور اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا۔ وہ خود اپنے سے قبل انبیاء کی حقانیت پر ایمان رکھتے تھے۔

قرآن مجید کی شہادت اس بارے میں یوں ہے۔ لکل قوم ھاد (الرعد: آیت ۷) ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔ دو قوموں کے انبیاء کے درمیان کوئی فرق ضروری نہیں۔ قرآن کہتا ہے:۔ لا نفرق بین احد من رسلہ (البقرہ آیت ۲۸۵) ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔

آں حضورؐ دنیا کو آرام پہنچانے اور گناہ سے نجات دلانے کے لیے آئے۔ ابو موسیٰ اور معاذ کو یمن کے گورنر مقرر کرتے وقت انہیں نصیحت کی کہ عوام کو تسلی دو، آسانیاں بہم پہنچاؤ ان کے سکھ چین کا خیال رکھو، خوش خبری سناؤ۔ عداوت نفرت سے چھٹکارا دلاؤ اور معاملات کو باہمی مشورے سے خوش سلیقگی سے سلجھاؤ۔ (مشکوٰۃ)

آں حضورؐ نے اپنے پیروؤں کو جتلایا۔ میرے بعد قرآن اور میری سنت تمہارے لیے سرمایۂ جاوداں ہیں۔ ان کی اتباع اپنے اوپر لازم کر لو۔ گمراہی کا امکان باقی نہ رہے گا۔ (مشکوٰۃ)

قرآن بھی یہی کہتا ہے۔ "یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

(البقرہ)

آں حضورؐ نے فرمایا:- الخلق عیال اللہ (مشکوٰۃ)

اور یہ بھی فرمایا۔ "جو زمین والوں پر رحم نہیں کھاتا اس پر فرشتے جو آسمان پر ہیں رحم نہیں کھاتے" (مشکوٰۃ)

اسلام سچے ایمان اور نیک اعمال پر کافی زور ڈالتا ہے اور وحدت الٰہی نہیں، وحدت ادیان[8] اور وحدت انسانیت کو اہم قرار دیتا ہے۔ اسلام انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کے امتیاز کو مٹاتا ہے[9]

تاریخ جدید یہ کہتی ہے کہ حریت، مساوات اور اخوت انقلاب فرانس کے تحائف ہیں حالانکہ ان اصولوں کا اعلان چودہ صدیوں پہلے ہی ہو چکا تھا اور ان کے پہلے معلن بانیٔ اسلام[10] ہی تھے۔ انھوں نے عشق کو دین کے مضبوط اساس کی حیثیت سے پیش کیا۔ ہر ہفتے کے لیے جمعہ کی نماز، اور سال بھر کے لیے عیدین کی نماز ایک عملی اقدام کے طور پر ہی قائم کیے گئے۔ عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے عقیدۂ توحید کا اقرار، مساوات انسانی، محبت اور اخوت کی مسیحائی اور زکوٰۃ و صدقہ ضروری قرار دیے گئے۔

حج دنیا کی مختلف تہذیبوں کا بہترین انضمام کرتا ہے جب اسلام کے پیرو کرۂ زمین کے تمام حصوں سے آکر مکہ میں جمع ہوتے ہیں اور اسلام کے ذریعے ساری انسانیت کے خوب صورت اتحاد کو پروان چڑھاتے ہیں۔ زبان، رسم و رواج، فیشن، لباس انسانوں کے درمیان دیواریں نہیں بنتیں۔ دوران حج سب ایک ہی قسم کا لباس احرام زیب تن کرتے ہیں۔ حقیقی اخوت اس وقت دیکھی جاسکتی ہے

صوفی ازم (تصوف) یعنی اسلام کی وسیع المشرب تشریح بحسن اتفاق ہندو مت کے فلسفہ ویدانت سے تقریباً مشابہ ہے اور اس کے سبب انسانیت کے ذہین طبقات میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہے۔ مولانا رومی کا تصوف ہو یا شنکر، رام کرشن، ویویکانند یا رام تیرتھ کا نیا ویدانت ——— دونوں تساہل، بے عملی یا دنیا فراموشی کے حق میں نہیں۔ ان کا مطمح نظر دنیا میں ایک عملی اور پھلنے پھولنے والی طرز زندگی ہے جس میں معاشرے کا فائدہ ہے۔ سکھ مت کے دس گوروں نے اس فلسفے کو عملی جامہ پہنایا اور ثابت کر دکھایا کہ دنیا میں رہ کر مگر دنیا کے ہو کر نہیں، کس طرح اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے[11]

آں حضورؐ کے چند نادر ارشادات کی بنا، جن کے متعلق اللہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ ایک چھپے ہوئے مخزن تھے اللہ ان کو مشہور کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے کائنات کی تخلیق کی۔ صوفیوں کو ہمہ اوست کا نظریہ ممد و معاون ثابت ہوا۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ذکر یا مقدس نام کی

جاپ یا سنگھ گوروؤں کے مطابق دنیوی کاروبار چلاتے ہوئے سمرن ایک آسان اور یقینی ذریعہ ہے (۱۲) ۔ اس دنیا میں اور آخرت میں خوشی حاصل کرنے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فرق کیا جائے ۔ عملی مگر بے لوث زندگی اس دنیا میں گذاری جائے (۱۳) نیک عمل کیا جائے اور ساری خلقت سے محبت کے جذبے کی آبیاری کی جائے عبادت کی جائے اور رضائے الٰہی کی خاطر اپنا سب کچھ سونپ دے ۔

منزل کی طرف جانے والی کئی راہیں لیکن سب سے سیدھا اور سب سے مختصر راستہ صراط مستقیم ہے (اس کا ذکر سورۂ فاتحہ میں آیا ہے) اور اس کے راہ گیر تمام کے تمام مسلمان ہیں خواہ ان کا زمانہ قبل از محمدؐ کیوں نہ ہو ۔ اسلام کے بموجب آدمؑ ابراہیمؑ موسےٰ، عیسےٰ اور وہ سب حضرات جو عقیدۂ توحید پر ایمان رکھتے تھے مسلمان تھے محمدؐ نے توحید کو دین حق کا واحد معیار قرار دیا اور وہ سب لوگ خواہ وہ کسی ملک و ملت سے تعلق رکھتے ہوں جنھوں نے معرفت خداوندی حاصل کی اور رضائے الٰہی کو اپنایا ۔ ان سب کو مسلمان مانا گیا ۔ شریعت ماحول اور حالات کی تبدیلی اور عوام کے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے (۱۹) ۔

انسان کو چاہیے کہ وہ فطرت کے قوانین (جو بدلے نہیں جاسکتے) کے مطابق زندگی بسر کرے اور خوف و حزن سے آزاد ہونے کے لیے خدا میں پوری طرح ضم ہو جائے ۔ اسلام زندگی اور فطرت کے قوانین کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے پر لوگوں کو ابھارتا ہے ۔ علم نافع اور عمل صالح اسی سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہیں ۔ ذات پات، عقیدہ، رنگ، زبان اور ملک انسان کی روحانی ارتقا میں روڑے اٹکاتے ہیں ۔

قرآن اچھے اہل کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے نیک اخلاق کی خوب تعریف کرتا ہے اور اس بات کو پرزور طریقے سے پیش کرتا ہے کہ نجات پر کسی ایک فرقے کی اجارہ داری (۲۰) نہیں ۔ کوئی بھی فرد راسخ عقیدۂ توحید کا حامل ہوتے ہوئے منصفانہ اور ہمدردانہ زندگی بسر کرے وہ مسلمان ہے ۔ محمدؐ نے مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے معاشرتی میل جول رکھیں اور اپنے فرقے کے علاوہ دوسرے مذہبی فرقوں سے نکاح و بیاہ کے تعلقات استوار کریں (۲۱) دین کو چھوٹے چھوٹے اور آپس میں جداگانہ حصوں میں بانٹا نہیں جاسکتا اور اس کی اشاعت و ترویج صالح اعمال اور تعمیری زندگی کے ذریعے کرنی چاہیے (۲۲) ۔

اسلام کہتا ہے ۔ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ اس نے انسانوں کو مختلف خیالات اور امنگوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ ان میں اشتراک اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرے (۲۳) اگر خدا چاہتا تو تمام انسان یکساں خیالات کے حامل ہوتے، یکساں عمل کرتے اور ایک مذہب کے ماننے والے ہوتے ۔ مگر خدا نے انہیں آزادیٔ عقیدہ اور آزادیٔ عمل سے نوازا ہے ۔ اس نے اپنے انبیاءؑ اور اولیاء (۲۴) کے ذریعے نیکی اور بدی کے راستے دکھائے

ہیں اور انسان کو آزادی دی ہے کہ کوئی ایک راستہ اختیار کرلے۔ انتخاب کی آزادی صرف ابن آدم کا طرۂ امتیاز ہے۔ ملائکہ تک اس نعمت سے محروم ہیں۔ ملائکہ اگر گناہ کے مرتکب ہونا چاہیں بھی تو اس پر قادر نہیں۔(۲۵)

علیٰ ہذا القیاس، آسمانی مخلوق، بے جان مادے اور حیوانات اپنے مخصوص اور محدود جبلتوں کے مطابق ہی چلتے پھرتے اور رہتے ہیں وہ چند قوانین میں محصور ہیں اور آزادی انتخاب کو استعمال کو کرنے کے مجاز نہیں جبکہ انسان کو یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ وہ اپنی راہ متعین کرنے کے لیے آزاد ہے۔ وہ تفکر و تدبر کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے تاکہ وہ اس کی مدد سے زندگی کو سمجھ سکے۔

محمدؐ کے اندر جو انقلابی جذبہ تھا اس نے مذہب کے خدوخال ہی کو بدل کر رکھ دیا اور اجارہ داروں کے ہاتھوں سے اس کو چھین لیا۔(۲۶) وہ خدا کو کسی نبوی واسطے کے بغیر عوام کے پاس لے آئے۔ انھوں نے اپنے پیروؤں میں راست بازی، ایمان داری، آزادی فکر اور محبت کے صفات کو اجاگر کیا، فحش و بے حیائی کی ممانعت کی۔ سنت نکاح کی ترویج کی، عورتوں کو متعین حقوق، عزت و تکریم کا مقام اور رعایتیں اور آسانیاں عطا کیں حالانکہ اس وقت تک ان کے ساتھ بے جان شئیوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ آنحضورؐ کی حیات طیبہ طہارت و پاکیزگی، عدل و انصاف، سب کے لیے رحمت و رافت، محبت و ہمدردی، عجز و انکساری، صلح و آشتی، حلم و عفو جیسی صفات عالیہ سے متصف ہونے کی وجہ سے ایک ایسا نمونہ ہے جس کی اتباع و تقلید میں ہی ساری انسانیت کی فلاح ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

تشریحی حاشیے

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا ذکر شاید سہواً رہ گیا ہے۔

۲۔ دین اسلام کو فلسفہ کہنا فلسفہ اور دین دونوں سے ناواقفیت کا مظہر ہے۔ فلسفہ کی بنیاد محض عقل و قیاس پر اور دین کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ اس کے علاوہ آں حضورؐ کو اس فلسفہ کا موجد کہنا بھی غلط ہے۔

۳۔ آں حضورؐ نے اسلام کے بنیادی قوانین خود وضع نہیں کیے ہیں۔ ڈاکٹر چوپڑا ایک طرف تو یہ لکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آئے اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ خود آپ نے تمام قوانین وضع کیے۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو اپنی باتوں میں تضاد محسوس نہیں ہوا۔

۴۔ ڈاکٹر چوپڑہ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عالم بے عمل و جاہل باعمل دونوں خطرناک ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور سنت کا تعلق تو حضورؐ کے عہد سے ہے اور دینی ماخذ کی حیثیت سے اجماع و قیاس کا اضافہ بعد کو ہوا۔

۶۔ زکوٰۃ کو ٹیکس کہنا غلط ہے۔ زکوٰۃ ایک عبادت ہے غریبوں کی مدد اور دوسرے کاموں کے لیے فرض کی گئی ہے

۷۔ ڈاکٹر چوپڑہ کی نگاہ میں فرشتہ یہاں موزوں لفظ ہے مگر خدا کا لفظ یہاں موزوں تر ہے۔

۸۔ مصنف نے یہ عجیب بات لکھی ہے۔ اسلام وحدتِ دین کو تسلیم کرتا ہے وحدتِ ادیان کا فلسفہ تو ہندستانی فکر کی اختراع ہے۔ دین ابتدا میں ایک ہی تھا۔ بعد میں لوگوں نے اس کو مسخ کر دیا تھا۔ قرآن کہتا ہے: سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں، اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ (البقرہ آیت ۲۱۳) وہ دین جو ادیان باطلہ پر چھا جانے کے لیے برپا کیا گیا ہے وحدتِ ادیان کا کیسے قائل ہو سکتا ہے۔ وحدتِ ادیان تو ایک غیر معقول نظریہ ہے۔

۹۔ اسلام، انسان اور انسان کے درمیان نسل، زبان، رنگ اور وطن کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں برتتا لیکن عقیدہ و عمل کے اعتبار سے ان دونوں کے درمیان امتیاز کرتا ہے اس کے نزدیک مومن اور کافر برابر نہیں ہیں۔ مومن اور کافر کی اصطلاحات امتیاز کو برقرار رکھنے کے لیے ہی تو مستعمل ہیں۔ کافر کو اس کے انسانی حقوق دیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی۔ اس کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جائے گا۔ اس کی دنیا و آخرت سنوارنے کے لیے اس کو اسلام کی دعوت دی جائے گی۔

۱۰۔ آں حضورؐ کو بانیِ اسلام کہنا غلط بات ہے۔ آپ پیغمبرِ اسلام ہیں اور اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے۔ ڈاکٹر چوپڑہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ذکر کر کے ان کو بھول جاتے ہیں وحی کے ذریعے جب قرآن آیا ہے تو آں حضورؐ کو بانیِ اسلام یا موجدِ فلسفہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ صوفی ازم کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اس پر اس وقت گفتگو نہیں کی جا سکتی البتہ اتنا اشارہ ضروری ہے کہ ڈاکٹر چوپڑا نے اس تصوف کی ترجمانی کی ہے جو ویدانت سے متاثر ہو گیا ہے۔ اسلامی تصوف اور ویدانت میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔

۱۲۔ ذکر۔ مسلمانوں کا طریقہ۔ جاپ۔ ہندوؤں کا طریقہ۔ سمرن، سکھوں کا طریقہ۔

۱۳۔ ڈاکٹر چوپڑہ نے اصل لفظ (DETACHED) استعمال کیا ہے۔ جس کا ترجمہ میں نے بے لوث کیا ہے مگر اصل لفظ میں ہندو فلسفے کی جھلک ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ نیک عمل اس کی نیکی کی وجہ سے کیا جائے۔ اس کے ثمرات اور ثواب کی خاطر نہیں۔ اسلام عقیدۂ آخرت کو مستحکم کرتا ہے

رضائے الٰہی یا جنت کی خاطر نیک عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

۱۴۔ اسلام کا عقیدہ تو ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر چوپڑا نے یہ بات ٹھیک لکھی ہے کہ صرف صراط مستقیم کے راہ گیر ہی مسلمان ہیں خواہ ان کا زمانہ کچھ بھی ہو مگر صراط مستقیم کے علاوہ دوسری راہیں جو بھی ہوں وہ اسلام کی نگاہ میں بے وقعت ہیں اور ان کی منزل اور صراط مستقیم ہرگز ایک نہیں۔

۱۵۔ ڈاکٹر چوپڑا نے جو لکھا ہے، ٹھیک ہی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے عقیدۂ توحید کو نامکمل طور پر سمجھا ہے دین اسلام کی بین الاقوامی اشاعت کے بعد ہر مذہب اب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس بھی خالص توحید ہے۔ عقیدہ توحید کے اجزائے ترکیبی میں یہ بات اہم ہے کہ خدا ایک ہے مگر توحید صرف خدا کو ایک مان لینے کا نام نہیں ہے۔ اس عقیدے میں دوسری صفات باری تعالیٰ بھی ہیں اور اسی میں رسالت و معاد کے عقیدے بھی داخل ہیں۔ اس عقیدے کی بنیاد پر فرد کا تزکیہ، معاشرے کی تعمیر و اصلاح اور سیاست کی تشکیل و تطہیر کی جاتی ہے۔ یہ عقیدہ دوررس نتائج اور ہمہ گیر انقلاب کا حامل ہے۔

۱۶۔ شریعت کے ماخذ چونکہ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر چوپڑا کی بات اسی وقت مناسب ہوسکتی ہے جبکہ ان کا اشارہ اجتہاد کی طرف ہو۔ ورنہ ان کا ارشاد غلط ہے، آج کل جب مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے لیے چند لوگ مصر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان مغالطہ انگیز ہوگا عوام کے خیالات میں تبدیلی کے ساتھ شریعت نہیں بدلی جاسکتی اگر مسلم عوام کی اکثریت آج شراب پینے کے حق میں ہوجائے تو شراب حلال نہیں کی جاسکتی۔ یہ حق مسلمان حکومتوں کے قانون ساز اداروں کو بھی نہیں۔ چند زوجگی ہو یا کوئی اور مسئلہ مسلم عوام قرآن اور سنت کے احکام سے بے نیاز ہوکر کوئی دوسرا حل تلاش نہیں کرسکتے۔

اگر ڈاکٹر صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دین اور شریعت میں فرق ہے۔ تمام انبیاء کا دین ایک تھا اور شریعتیں بدلتی رہیں تو اس میں وہ حق بجانب ہیں مگر وہ مافی الضمیر کو خوش اسلوبی سے پیش نہیں کرسکے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر نبی کا کام اقامت دین تھا اور اس کام میں وہ دین اور شریعت دونوں کے نفاذ کے مجاز تھے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اس امت کے لیے دین تھی اور اس کے دور نبوت میں اسی کی اقامت مطلوب تھی۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد چہارم ص ۴۹۱، ۴۹۰)

۱۷۔ ڈاکٹر چوپڑا شاید الروم، کی آیۃ نمبر ۳۰ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی (اے نبی اور نبی کے پیرو) یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر انسانوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔

۱۸۔ ڈاکٹر صاحب کا مطلب شاید یہ ہے کہ تنگ نظری فرقہ پرستی وغیرہ روحانی ارتقا کے لیے سودمند نہیں۔

۱۹۔ اس بات کا ذکر قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے مثال کے طور پر آل عمران آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ ' مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائیوں کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی۔ اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔

۲۰۔ ڈاکٹر چوپڑا کا اشارہ شاید قرآن کی اس آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

'یقین جانو کہ نبیؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔ (البقرہ آیت ۶۲)

اور اگر اس سے ان کا اشارہ وحدت ادیان کی طرف ہے تو یہ ایک بالکل غلط بات ہے

۲۱۔ صرف مسلمان مردوں کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ مشرک و کافر قوموں سے مسلمان مردوں کو بھی رشتہ مناکحت قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے

۲۲۔ ڈاکٹر چوپڑہ نے یہ بہت ہی عمدہ بات کہی ہے

۲۳۔ ڈاکٹر صاحب کا اظہار بیان مبہم ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں انسان مختلف الرائے ہوتے ہیں۔ دین کے بارے میں جبر و اکراہ جائز نہیں۔ اختلافات باقی رہیں گے کبھی کبھی اختلافات نعمت ثابت ہوتے ہیں اس لیے انہیں بالکل مٹا دینا ٹھیک نہیں۔ البتہ معاشرے اور بین الملل وادیان میں امن اور خوشگوار ماحول پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کی خاطر اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے اشتراک و اعتماد کے نکات و عوامل ڈھونڈے جائیں اور انہیں نمایاں و مؤثر کیا جائے۔ قرآن اہل کتاب کو اس طرح دعوت اشتراک دیتا ہے۔ کہو۔ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے

۲۴۔ یہ انتخاب کی آزادی اس آزمائش کے لیے ہے کہ انسان اپنی پسند سے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے وہ جو خدا نے دکھایا ہے یا وہ جس کی طرف شیطان دعوت دیتا ہے

۲۵۔ اپنی پسند سے دین اسلام قبول کرنا اور اس کے سانچے میں اپنی زندگی ڈھال دینا یہی وہ چیز ہے جو انسان کو فرشتوں سے بھی بلند درجہ عطا کر سکتی ہے۔

۲۶۔ مصنف یہی بات پہلے بھی کہہ چکے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی مذہب کو جاننے والے (باقی صفحہ ۵۰)

بہائیت، ماسونیت، علمانیت

رابطۂ عالم اسلامی کے زیر اہتمام مسلم تنظیموں کی عالمی کانفرنس ۶ اپریل تا ۱۰ اپریل ۷۴ء مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی تھی جس پر گذشتہ شمارے میں مختصر اظہار خیال کیا گیا تھا اس وقت دنیا میں متعدد ایسی فکری و نظری تحریکیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں جن کی زد براہ راست اسلام اور مسلمانوں پر پڑتی ہے۔ میں ان میں سے تین تحریکوں کے بارے میں کانفرنس کی تجویز کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں کانفرنس نے تجویز سے پہلے ان تحریکوں کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے جس سے ان تحریکوں کے اہم مقاصد اور محرکات پر روشنی پڑتی ہے۔ میں نے ترجمے میں تعارف اور تجویز کے دونوں حصوں کو الگ کر دیا ہے تاکہ تعارف کا حصہ بھی جو معلومات افزا اور اہم ہے، قارئین کے ذہن نشین ہو جائے۔

بہائیت

تعارف (۱) یہ ایک فرقہ ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے نئے نبی نے اپنی مقدس کتاب کے ذریعے تمام سابق آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

(۲) یہ ایک عالمی زبان، ایک عالمی حکومت اور مرد و عورت کے درمیان کامل مساوات کی دعوت دیتا ہے۔

(۳) اس کا سب سے بڑا مرکز (صدر مقام) اور اس کی سب سے بڑی مجلس (مجلس اکبر) کا صدر دفتر شہر عکا میں ہے۔ یہ شہر فلسطین کے اس حصے میں واقع ہے جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے۔ (اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہائیت پر صہیونیت کا کتنا اثر ہے۔ (مترجم)

(۴) اپنے فکر اور نظریے کی طرف دعوت دینے کے لیے اس نے شمالی امریکہ کے شہر شکاگو کو مرکز بنایا ہے اور یہیں اس کی سب سے بڑی عبادت گاہ بھی ہے۔ یہ فرقہ اپنے نظریے کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کثیر التعداد کانفرنسیں منعقد کرتا رہتا ہے۔

(۵) اس نے کچھ امریکیوں اور یورپ کے باشندوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے وہ اس کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں کے واسطے سے وہ عالم اسلامی کے بعض ملکوں

میں بھی داخل ہو گیا ہے ۔

(۶) یہ فرقہ بعض اسلامی ملکوں کی اقتصادیات پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس غرض کے لیے وہاں کے افراد و اشخاص کو بھاری مالی مدد دے رہا ہے ۔

(۷) یہ فرقہ سب سے بڑی مالی امداد امریکہ سے حاصل کرتا ہے جہاں اس کا دوسرا مرکز قائم ہے ۔

(۸) یہ بحر ہند اور مغربی جزائر ہند کی طرف پیش قدمی کی کوشش اور چھوٹی چھوٹی اقلیتوں والے ملکوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں اپنے قدم جمانے اور اپنا کام پھیلانے کی جد و جہد میں لگا ہوا ہے ۔

تجویز

(الف) ضروری ہے کہ مسلمانوں پر فرقہ بہائیہ کے کفر کو اچھی طرح واضح کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ یہ فرقہ قرآن کریم اور سنت نبوی پر ایمان نہیں رکھتا اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔

(ب) ضرورت اس بات کی ہے کہ بعض خطوں میں نادار مسلم نوجوانوں کی مالی امداد کر کے ان کو اس تحریک کی طرف میلان سے روکا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ یہ فرقہ کس قدر خطرناک ہے ۔

(ج) عالم اسلامی کے ملکوں میں فرقہ بہائیہ کو کام کرنے سے روک دیا جائے ۔ ان ملکوں میں اس کے مراکز بند کر دیے جائیں اور اس کے لٹریچر اور کتابوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے ۔

ماسونیت

تعارف

یہ ایک خفیہ اور تخریب پسند تنظیم ہے ۔ عالمی صہیونیت کے ساتھ اس کا مضبوط رشتہ ہے ۔ یہی اس کو متحرک کرتی اور اپنے اغراض کی خدمت کے لیے اس کو ذریعہ بناتی ہے ماسونی جماعت اپنے کو آزادی، اخوت، انسانی مساوات اور اسی طرح کی دوسری پرفریب مخصوص علامات و شعارات میں چھپائے رکھتی ہے اور انہیں پرفریب نعروں کے جال میں اس نے بہت سے مسلم زعماء ملکوں کے قائدین اور اہل فکر کو پھنسا لیا ہے ۔ ان میں کے بعض واقعی دھوکے میں پھنس گئے ہیں اور ان میں کے بعض جان بوجھ کر اس میں شریک ہیں ۔ (مترجم عرض کرتا ہے کہ آزادی، اخوت اور مساوات انسانی کے نعرے اتنے پرفریب ہیں کہ بعض دین دار مسلمان بھی اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں)

کیتھولک فرقے پر اس جماعت میں شرکت ممنوع تھی لیکن موجودہ پوپ نے اپنے فرقے کو اس جماعت میں شرکت کی اجازت دے دی ہے ۔

تجویز

۱۔ عالمی اسلامی تنظیموں پر واجب ہے کہ وہ ان خفیہ جماعتوں کے پردے فاش کریں اور ہر اس مسلمان کے لیے جو ماسونیت کے خطرے سے واقف ہو ضروری ہے کہ فوراً اس جماعت سے باہر آ جائے ۔

۲۔ جس مسلمان کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا

تعلق ماسونی جماعت سے ہے اس کو کسی بھی اسلامی کام کے لیے منتخب نہ کیا جائے۔

۳۔ تمام اسلامی حکومتوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے حدود مملکت میں اس کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کریں ان کے جلسوں کو ممنوع قرار دیں اور ان کے اڈوں کو بند کردیں۔

۴۔ اس جماعت کے کسی ممبر کو ملازمت یا کوئی وظیفہ نہ دیا جائے اور مکمل طور پر اس سے قطع تعلق کیا جائے

۵۔ صہیونیت سے اس کے تعلق اور اس کے لیے اس کی خدمت کا پردہ چاک کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اور کتابچے شائع کیے جائیں اور انہیں لاگت کے خرچ پر فروخت کیا جائے۔

۶۔ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ہر اسلامی ملک میں کہاں کہاں ان کے جلسے منعقد ہوتے ہیں اور ان کے سرگرم ممبروں پر اپنی توجہ مرکوز کی جائے۔

۷۔ ان کی تمام مطبوعات، رابطہ عالم اسلامی کو بھیجی جائیں تاکہ رابطہ اپنے ذرائع سے انہیں مسلمانوں کے درمیان پھیلائے اور اس جماعت کے مقاصد سے انہیں آگاہ کرے

۸۔ ماسونیت ہی کی طرح کچھ اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں کام کر رہی ہیں جیسے راٹری کلب اور اخوان حریت وغیرہ ان جماعتوں کے ساتھ بھی ماسونیت ہی جیسا معاملہ کیا جائے۔

علمانیت (سیکولرزم)

تعارف ۱۔ عربی زبان میں لفظ علمانیت انگریزی زبان کی ایک اصطلاح کے اصل معنی کو مخفی رکھنے کے لیے ایک گمراہ کن تعبیر ہے۔ اس لفظ کے اصل معنی 'لادینیت' کے ہیں۔

۲۔ اس تعبیر میں فریب کا پہلو یہ ہے کہ اس کو لفظ علم سے بنایا گیا ہے تاکہ یہ فریب دیا جاسکے کہ اس کا ربط و تعلق علم سے ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

۳۔ لادینیت کی دعوت یا گمراہ کرنے کے لیے جس کا نام علمانیت رکھا گیا ہے یورپ کی پیداوار ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس کش مکش اور تصادم کا جو ایک طرف حکام اور اہل کنیسہ (چرچ) اور دوسری طرف اہل علم اور اہل کنیسہ کے درمیان ہوا۔

۴۔ اس کش مکش کا حاصل وہ نظریہ ہے جو دین و سیاست کی تفریق سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس نظریے کے لحاظ سے انسانی زندگی میں دین کوئی مؤثر قوت باقی نہیں رہا ہے۔

۵۔ جن محرکات و اسباب کے تحت یورپ میں لادینیت کا ظہور ہوا۔ دین اسلام کی نسبت سے اس کے لیے کوئی وجہ جواز موجود نہیں ہے کیونکہ دین اسلام کے درمیان کوئی تناقض موجود نہیں اور نہ دین اسلام کبھی بھی علمی سرگرمی کی راہ میں حائل ہوا۔

۶۔ حیات و کائنات کے تحریکی رخ، اس میں انسان کے موقف اور انسانی معاشروں کے قیام اور ان کی ترجیح پر اس کے اثرات کی جو من گھڑت تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔ لفظ علمانیت کے پردے میں اسی کو پھیلانے کی خدمت انجام دی جارہی

ہے ۔ یہ نئی تفسیر مارکس، انجلز اور ان جیسے لوگوں کے نظریات
میں وجود پذیر ہوئی ہے ۔

۷۔ مغربی تہذیب میں تمام مادی کامیابیوں کو لادینیت کے شیطانی وسوسے کی تمکین و تقویت کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔ اس گمان کے ساتھ کہ یہی قوت و سیاست حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے ۔

۸۔ عالم اسلامی کی حکومتوں کے درمیان لادینیت کے نظریے نے جو تخریبی کارروائیاں کی ہیں اور جو مشکلات پیدا کی ہیں وہ درج ذیل ہیں ۔

(الف) ایسے دساتیر و قوانین کا وجود جن میں اسلامی فکر کو الگ کرکے اسی نظریے کو اختیار کیا جاتا ہے ۔

(ب) لادینی کالج اور یونیورسٹیاں جو بہت سے اسلامی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں اس کا نقصان مسلمانوں ہی کی نسل کو پہنچ رہا ہے ۔ کیونکہ ان میں مسلمان طلبہ ہی کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے ۔

(ج) ایک بے ہودہ نعرہ یہ ایجاد کیا گیا ہے کہ دین اللہ کے لیے ہے اور وطن سب کے لیے ہے ۔ (الدین للہ و الوطن للجمیع) اس نعرے کا ہدف یہ ہے کہ دین کو انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے سے روکا جائے

تجویز

۱۔ چونکہ اسلام، مذہب اور حکومت، عمل اور عبادت کا مجموعہ ہے اس لیے وہ علمانیت (لادینیت) کے اس نظریے کو رد کرتا ہے جس کی کوشش یہ ہے کہ اسلام کو امت مسلمہ کی زندگی سے دور کردے ۔

۲۔ یہ کانفرنس مسلم حکومتوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے دستور و قانون کے لیے شریعت اسلامیہ کو واحد ماخذ قرار دیں ۔

۳۔ عالم اسلامی میں جو لادینی (سیکولر) تعلیمی ادارے قائم ہیں ان لازم قرار دیا جائے کہ وہ اپنے تعلیمی پروگرام میں اسلامی عقائد کی تعلیم بھی داخل کریں ۔

(بقیہ صفحہ ۴۷) اور نہ جاننے والے مذہبی معاملات میں یکساں طور پر مستند مان لیے جائیں، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ صحیح مذہب کو غلط مذہب سے الگ کر دیا جائے ۔ "مذہبی اجارہ داری" کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

تنقید و تبصرہ

تخلیق انسانی کا مقصد دین و شریعت کا قیام مولانا حبیب ریحان ندوی
صفحات ۲۲۶
قیمت تین روپے پچاس پیسے
ناشر:- دار التصنیف و الترجمہ۔ ۴۲ مسجد شکور خاں روڈ۔
بھوپال (ایم۔ پی)

یہ کتاب مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری کے لائق و فائق صاحبزادے مولانا حبیب ریحان ندوی کی تصنیف ہے۔ جو لوگ ہندوستان کے علمی اخبارات و رسائل پابندی سے پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ مولانا حبیب ریحان ندوی سے ناواقف نہ ہوں گے۔ انھوں نے قدیم و جدید علوم کی اعلیٰ سندیں حاصل کی ہیں۔ قاہرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا پھر اور ازہر یونیورسٹی سے فیکلٹی آف آرٹ اینڈ فیکلٹی آف تھیالوجی سے ایم اے کی سند حاصل کی ہے۔ پہلے اسلامک یونیورسٹی لیبیا میں مدرس رہے اور آج کل اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضا ر لیبیا میں لکچرر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب عرصہ ہوا تبصرے کے لیے آئی تھی لیکن اس کے مطالعہ کی نوبت اب آئی ہے۔ فاضل مصنف کی یہ کتاب پڑھ کر مسرت حاصل ہوئی ہے۔ کتاب اپنی جگہ معلومات افزا تو ہے ہی اس کی دو باتیں تبصرہ نگار پر خالص طور سے اثر انداز ہوئی ہیں۔ ایک ان عقائد و افکار کی صحت جو اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں اور دوسری بات فاضل مصنف کا وہ بے پناہ جذبہ جو اعلائے کلمۃ اللہ اور احیائے شریعت کے لیے مضطرب اور بے چین نظر آتا ہے۔ اس کتاب کا تعارف خود مصنف کے قلم سے یہ ہے:-

کتاب ۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شریعت کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں خلافت کی فرضیت، اہمیت، ضرورت پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب قیادت کو واضح کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں عصر حاضر کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر لیبین حکومت کے اقدام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں لیبیا میں شریعت اسلامیہ کی آٹھ روزہ کانفرنس کی روداد پیش کی گئی ہے کیونکہ یہ روداد ۱۵ اہم شرعی موضوعات پر مشتمل تھی اس لیے اس کو داخل

کتاب کیا گیا ہے ۔ آخری باب میں عصر حاضر میں شریعت کی کامیابی کے چند شرائط بیان کیے گئے ہیں ۔

اس کتاب کے نام اور اس مختصر تعارف ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کیا ہوگا۔ دوسرے باب میں فاضل مصنف نے ضمناً جن مباحث پر گفتگو کی ہے وہ اس کتاب میں نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ جب وہ "خلافت" پر الگ سے کتاب لکھنے والے ہیں تو اس کتاب میں مختلف فیہ مباحث کو چھیڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ان مباحث کا زیر تبصرہ کتاب سے کوئی قریبی تعلق بھی نہیں ہے ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا یہ کتاب فاضل مصنف کے واضح عقائد و افکار اور احیائے شریعت کے لیے ان کے جذبۂ بے اختیار کی آئینہ دار ہے ۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"تکریم انسانی کے اس شرف عظیم، خلافت ربانیہ اور نیابت الٰہیہ کے اس بلند مرتبہ کا حق یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی عبادت میں مصروف رہے اور اپنی زندگی عبادت کی سب سے اعلیٰ ترین شکل یعنی دین کی اقامت اور زمین پر قانون شریعت کے نفاذ کی کوششوں میں گذارے" صـ۴۴

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ" ایک جامع اور بنیادی جملہ ہے اور انبیاء کے پورے مقصد حیات کو اس میں واضح کر دیا گیا ہے لیکن ہر زمانے کے مشرکین، منکرین اور مخالفین اقامت دین اور تنفیذ شریعت کی دعوت پر اپنی برہمی اور غصہ کا اظہار کرتے ہیں اور فکر و نظر اور نظام حکومت کی یہ تبدیلی ان پر شاق ہوتی ہے ۔ حالانکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ یہی انبیاء کی دعوت کا دائمی مقصد ہے اور ہر جگہ انبیاء کرام نے اس کی اشاعت کی ہے" (ص ۴۶)

فاضل مصنف کے مضطرب جذبے کا ایک اظہار یہ ہے :۔

"فرشتگان رحمت اس دن کے انتظار میں چشم براہ ہیں جب مسجود ملائک پھر اپنے تخلیقی مقصد پر گامزن ہوگا۔ سیارگان فلک اس پر نور لمحہ کے انتظار میں اپنی روشنی محفوظ کیے ہوئے ہیں، جب شریعت کا نور ساری کائنات کو تجلی کا طور بنا دے گا۔ صفحۂ ہستی کا ہر خشک و تر اور بحر و بر مصروف حمد و ثنا ہے اور اس تمنا میں ہے کہ کب کائنات کا دل مسرور ہوگا اور تجلی گاہ فاران کا ابدی پیغام عام ہوگا۔ راحت، سکون اور سلامتی کا دور دورہ ہوگا۔ شریعت الٰہیہ کی نگرانی ہوگی۔ قانون اسلامی کی حکمرانی ہوگی اور دنیا کی مصیبتوں کا حل، مشکلات کا علاج اور مجروحین کا مداوا نصیب ہوگا" (ص ۲۱۶)

بحیثیت مجموعی یہ کتاب لائق مطالعہ اور قابل قدر ہے

ناشر:- ہلا بکڈپو۔ مبارک پور، اعظم گڈھ۔

ابتدا میں تقریر کے بارے میں کچھ باتیں بتائی گئی ہیں اور اس کے بعد چند مختلف عنوانات پر تقریر کے نمونے مرتب کیے گئے ہیں، مثلاً توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، علم، عدل و انصاف وغیرہ۔ تقریر کی مشق کرنے والوں کو یہ سکھانا مقصود ہے کہ تقریر کی ابتدا کس طرح کی جائے پھر موضوع تقریر پر کس طرح باتیں پیش کی جائیں اور کس طرح تقریر ختم کی جائے۔ عربی مدارس کے طلبہ اس مجموعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تقریر کے جو نمونے مرتب کیے گئے ہیں، ان میں یہ بات محسوس ہوئی کہ اگر زبان کچھ آسان استعمال کی جاتی تو یہ مجموعہ زیادہ مفید ہوتا۔

(بقیہ اشارات)

جس پر تم اس وقت پلئے جاتے ہو، وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کرکے رہے گا۔ آل عمران : ۱۷۹)

۳۔ تاکہ خدا، ناپاک سے پاک کو جدا کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھ کر ایک ڈھیر بنا دے اور پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔ (الانفال : ۳۷)

۴۔ کہہ دو کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے۔ گو تمہیں ناپاک کی کثرت حیرت میں ڈالتی ہو۔ (المائدہ ۱۰۰)

ان آیتوں میں منافق عورتوں اور مردوں اور کھلے ہوئے منکرین حق (کافروں) کو خبیث یعنی ناپاک، خسیس اور ردی نیز مومن عورتوں اور مردوں کو طیب یعنی پاک، نفیس اور جید کہا گیا ہے۔ اسی طرح برے عقائد و افعال و اقوال اور حرام چیزوں کو خبیث اور اچھے عقائد و افعال و اقوال اور حلال چیزوں کو طیب قرار دیا گیا ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت میں صراحۃً خبیث و طیب کے درمیان عدم مساوات کا اعلان کیا گیا ہے

بدترین جانور

۱۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (الانفال: ۲۲)

۲۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق کا انکار کر دیا ہے تو وہ ایمان نہیں لاتے۔ (الانفال : ۵۵)

۳۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں کے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے (الفرقان: ۴۴)

۴۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذر[ے] یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔ (الاعراف ۱۷۹)

۵۔ اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی [کے] مزے لوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں ا[ور] ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔ (محمد۔ ۱۲)

ان آیتوں میں منکرین حق اور باغیوں کے لیے سلطا[ن] کائنات کی طرف سے کتنی نفرت، کراہت اور غیظ و غضب [کا] اظہار ہے۔ انہیں پڑھ کر وہ لوگ کانپ جاتے ہیں جنہیں [اس کا] یقین ہے کہ قرآن اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ بدتری[ن] جانور کے لفظ سے تحقیر و اہانت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہ[ے]

انسانی مساوات کا غیر اسلامی تصوّر

اوپر جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے یہ وضاحت [ہو گئی] ہوا کہ جس خدا نے ایک انسانی جوڑے سے تمام بنی نوع [انسان کو] وجود بخشا اور بحیثیت نسل، ان کے درمیان مساوات پیدا ک[ی] اسی خدا نے اپنے فرماں بردار اور نافرمان بندوں کے درم[یان] بنیادی تفاوت اور اساسی عدم مساوات کا اعلان بھی ک[یا] ہے۔ ان دونوں فریقوں کے درمیان نہ دنیوی زندگی [میں] مساوات ہے اور نہ اخروی انجام کے لحاظ سے مساوات

اب یہ دیکھیے کہ اس وقت دنیا کے دانشور نظری طور پر [انسانی] مساوات کے جس تصور تک پہنچے ہیں اس کا اسلامی تصو[ر]

سے کیا تعلق ہے؟ یہ دانشور انسانوں کے درمیان پیدائشی طور پر جس تصور مساوات کے قائل ہیں وہ بھی وہ نہیں ہے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے ۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور دنیا کے تمام انسان بحیثیت نسل آدم کی اولاد ہیں ۔ اسلام نے دنیا کو وحدت آدم کی تعلیم دی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کے دانشور انسانی مساوات کے اس تصور تک پہنچ گئے ہیں ؟ کیا انھوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ تمام انسان اس آدم کی اولاد ہیں ۔ جنہیں اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا ؟ دنیا کے دانشور ابھی اس تصور تک نہیں پہنچے ہیں ! ـــــ

اس کے علاوہ ان کے تصور اور اسلام کے تصور میں بہت بڑا فرق یہ ہے کہ یہ لوگ عقیدے کی بنا پر انسانوں کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں ہیں ۔ ان کے تصور مساوات میں خدا کو ماننے والے اور نہ ماننے والے ، موحد اور مشرک ، مومن اور کافر ، دین دار اور بے دین ، خدا کے وفادار اور باغی اس کے فرمانبردار اور نافرمان سب برابر ہیں ۔ ان کے نزدیک إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۱) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے ۔ ان کے نزدیک وہ شخص جس کو خدا ، بد ترین جانور قرار دیتا ہے ، بہترین انسان ہو سکتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان

(۱) اللہ کے نزدیک تم میں کا سب سے عزت والا شخص وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو ۔

کے حقیقی عز و شرف کا معیار ہی الٹ کر رہ گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ایمان ، عمل صالح ، آخرت ، جنت ، اور جہنم یہ سب ایسی چیزیں بن گئی ہیں جو قابل گفتگو تو کیا ہوتیں ، قابل غور بھی نہیں ہیں ۔ انسانی مساوات کے اسلامی و غیر اسلامی تصور میں یہی فرق ہے ۔ جس کی وجہ سے دنیا کے وہ لیڈر جو انسانی مساوات کا نعرہ لگا رہے ہیں ، اسلام کی راہ میں ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ۔ جس طرح آج سے پہلے وہ لیڈر رکاوٹ بنے ہوئے تھے ۔ جو انسانوں کے درمیان بحیثیت نسل و نسب اونچ نیچ کے قائل تھے ۔ اس لئے یہ کہنا یا سمجھنا کہ دنیا کے دانشور انسانی مساوات کے اس تصور تک پہنچ گئے ہیں جو اسلام نے پیش کیا ہے ، صحیح نہیں ہے ۔

میں نے جو کچھ عرض کیا اس کی غرض یہ نہیں ہے کہ دنیا جس حد تک انسانی مساوات کے قریب آئی ہے اس کی قدر نہ کی جائے یا اپنی جدوجہد میں اس سے صرف نظر کیا جائے ۔ بلکہ غرض یہ بتانا ہے کہ ابھی انسانی مساوات کے اسلامی و غیر اسلامی تصور میں بہت بڑا فرق موجود ہے ۔ اور دنیا کو اسلامی تصور تک پہنچانے کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ دنیا انسانی مساوات کے اسلامی تصور تک پہنچ گئی ہے تو یہ غلط فہمی خود ہمارے لئے ایک بڑا فریب ثابت ہوگی ۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

اقبال

زندگی کے سائز میں تبدیلی

کاغذ کی نایابی اور پریشانی کے ساتھ مطلوبہ سائز کے کاغذ نہ ملنے کی پریشا[نی]
بھی ہے زندگی 20×26/8 سائز پر شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ سائز اس وقت نہ
مارکیٹ میں مل رہا ہے اور نہ C.T.C سے۔ مجبوراً مئی ۱۹۷۴ء کے شمارے سے زندگی کا سائز 20×30/8 کر دیا گیا ہے
جیسے ہی 20×26 سائز کا کاغذ مہیا ہو گیا ان شاء اللہ پھر سابقہ سائز پر ہی زندگی شائع ہو گا۔

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور

ز ند گی کی

زندگی کی قیمت میں نومبر ۱۹۷۴ء سے اضافہ

کاغذ کی حد سے بڑھی ہوئی گرانی اور نایابی، نیز رسائل کے سلسلے میں دوسرے اخراجات میں ناقابلِ برداشت اضافے کی وجہ سے بہت سے اخبار و رسائل دم توڑ چکے ہیں — جو چل رہے ہیں وہ اپنی قیمتوں میں پہلے ہی کافی اضافہ کر چکے ہیں۔ ہم نے اب تک کوشش کی کہ آپ کو کم سے کم قیمت پر "زندگی" پابندی سے ملتا رہے۔ مگر اب اس کی وجہ سے "زندگی" کا خسارہ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ مجبوراً ہم زندگی کے ایک پرچے کی قیمت 1/50 اور سالانہ چندہ -/15 کر رہے ہیں۔ قیمت میں یہ اضافہ نومبر کے شمارے سے ہو گا۔ اس سے پہلے جو لوگ خریدار بنیں گے ان سے سالانہ چندہ -/12 روپیہ ہی لیا جائے گا — امید ہے حالات کو دیکھتے ہوئے خریداروں کے لیے یہ اضافہ قابلِ قبول ہو گا۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور

نئی مطبوعات

• قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں آفسٹ ۲/۳۰ • آپ کی الجھنیں (عمر فضل) آفسٹ
• تربیتی کہانیاں اول، دوم، سوم، چہارم فی ۴۰ پیسے • گڈو کے گیت ۴۰ پیسے
• گڈو کی گڑیا ۴۰ پیسے • اولیاء اللہ (سید احمد عروج قادری) ۷۵ پیسے • اسلام اور برتھ کنٹرول (ہندی جدید ایڈیشن زیر طبع) ۵۰
• تفہیم القرآن پارہ عم ہندی ترجمہ • حدیث کا تعارف • تحریک اسلامی — کامیابی کے شرائط • نقوشِ را[ہ]
• اسلام — ایک ضرورت • ثنوی — دورِ حاضر اور مسلمان • مسئلہ ملکیتِ زمین (زیر ترتیب)
• تفہیم القرآن مکمل صرف ترجمانی کا ہندی ترجمہ

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

Monthly 'ZINDGI' Rampur June74 Regd.No.L. 688

فہیم القرآن مکمل صرف ترجمہ

م[illegible] آرٹ پریس دہلی میں چھپا۔

اقامتِ دین کا داعی

جولائی ۶۷ء

ماہنامہ

زندگی

نا مطلب

کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ

ی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

جر زندگی رام پور - یوپی

سالانہ
بارہ روپے

محمد حسن۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی۔ مقام اشاعت۔ دفتر زندگی

م پور - یوپی

ماہنامہ

زندگی
رامپور

مدیر: سید احمد قادری

سالانہ چندہ	
ممالک غیر سے	
دو ڈالر	
ہوائی ڈاک سے	

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	12/-
پاکستان سے	12/-
ششماہی	
ہندوستان سے	6/-
پاکستان سے	6/-
قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ ۲۰ پیسے	

جلد: ۵۳	جمادی الاخری ۱۳۹۴ھ مطابق جولائی ۱۹۷۴ء	شمارہ: ۱

اشارات	سید احمد قادری	۲
مقالات		
ہندوستانی مسلمان اور ہندوستانی اکثریت	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	۹
نفقہ اولاد ــــــ فقہی نقطہ نظر سے	مولانا جلال الدین عمری	۲۱
حضرت ایوب علیہ السلام	مولانا سلیمان فرخ آبادی	۲۸
کس ادب کو اسلامی ادب کہیں گے؟	سید احمد قادری	۳۳
تراجم و اقتباسات		۴۴
سور کا گوشت کیوں حرام کیا گیا؟	ماخوذ	
رسائل و مسائل		
متعدد سوال و جواب	سید احمد قادری	۴۶
تنقید و تبصرہ	ع۔ ق	۵۲

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر زندگی رام پور۔ یوپی

مالک دعوت ٹرسٹ دہلی ۶ ایڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی مقام اشاعت۔ دفتر زندگی رام پور۔ یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

اگروال دھرم شالہ رام پور میں ایک مذہبی جلسہ (گوشٹی) منعقد ہوا تھا۔ یہ جلسہ ذوالفقار گورنمنٹ ہائی اسکول رامپور کے ایک ٹیچر شری پرماتما سروپ ہتیش کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے لوگوں سے خود ملاقاتیں کرکے اس جلسے میں کثرت سے شرکت اور اظہارِ خیال کے لیے آمادہ کرنے کی جو محنت کی وہ قابلِ تعریف ہے۔ ایک شخص کی لگن اور محنت سے مقالات پڑھنے والوں اور تقریریں کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہوگئی کہ چار گھنٹوں تک مسلسل جلسہ جاری رہنے کے باوجود سب کو اظہارِ خیال کا موقع نہیں مل سکا۔ انھوں نے اس جلسے کو تمام مذاہب کی مجلس مشاورت سے موسوم کیا تھا اور دعوت نامہ میں اس کا مقصد یہ بتایا تھا:۔

آپ کا دھیان روحانی اور انسان کے لگاتار تنزل کی جانب متوجہ کرکے ان کی اصلاح کے لیے اجتماعی غور و فکر اجتماعی کوششوں اور جذبات و خیالات کو ابھارنے کے لیے یہ مجلس مشاورت منعقد کی جارہی ہے۔

یہ جلسہ جس مقصد کے لیے طلب کیا گیا تھا اور جو نام اس کا تجویز کیا گیا تھا اس کے لحاظ سے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی لیکن اس کا یہ فائدہ کچھ کم نہیں ہے کہ مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگ ایک جگہ مل بیٹھے۔ ہر ایک نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور دوسروں نے اسے صبر و سکون سے سن لیا۔

ہندو بھائیوں نے جو مقالات پڑھے ان میں خدا کے وجود کی دلیلیں دی گئی تھیں اور ان میں زیادہ تر یا تو ویدانت (وحدت الوجود) کے نظریے کی ترجمانی کی گئی تھی یا پھر وحدت ادیان کی۔

مجھے چھ سات مقالات اور تقریروں کے بعد اپنا مضمون سنانے کا موقع دیا گیا تھا۔ میں نے مضمون سنانے سے پہلے کہا کہ اب تک جن لوگوں نے مقالات یا تقریروں کی شکل میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سب کے سب خدا کا اقرار کرنے والے ہیں اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اب بھی خدا کا اقرار کرنے والوں کی تعداد اس کا انکار کرنے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے باوجود مذہب اور روحانی اقدار روبزوال کیوں ہیں؟ اصل میں ہم سب کو یہ تلاش کرنا

چاہیے کہ خود خدا نے اپنے بارے میں کچھ کہا ہے یا نہیں؟ اگر کہا ہے تو وہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ اسی طرح یہ جاننے کی ضرورت بھی ہے کہ خدا نے انسانوں کو اس دنیا میں کس مقصد سے بھیجا ہے؟ اگر ہم خدا کے بارے میں خود کوئی بات یا نظریہ تجویز کریں تو درحقیقت یہ ایک ایسے خدا کو ماننا ہے جسے ہماری عقل نے خود گھڑ لیا ہو۔ خدا کے وجود تک تو ہماری عقل ہمیں پہنچا سکتی ہے لیکن وہ کیسا ہے؟ کن صفات سے متصف ہے؟ اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟ —— ان باتوں تک ہماری عقل ہمیں نہیں پہنچا سکتی۔ اس کے بعد میں نے اپنا مضمون "خدا، عبادت اور مذہب" پڑھ کر سنایا۔

مذہب اور مذہبی اقدار سے بیزاری نے انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو خود خدا ہی سے انکار پر آمادہ کر دیا ہے۔ روحانی اقدار اور انسان کا اخلاقی تنزل اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی ہے جس کی دلیل پیش کرنے یا تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہو بلکہ اصل قابل غور بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ انسان کیوں مذہب اور روحانی اقدار سے بے زار اور خدا کے انکار پر تیار ہو گیا ہے؟ میں نے جہاں تک غور کیا ہے میرے نزدیک اس کا دو ٹوک جواب یہ ہے کہ مذہب کے نمائندے خود اس کے ذمہ دار ہیں انھوں نے لوگوں کے سامنے مذہب کا جو تصور پیش کیا وہ اتنا جامد، تنگ اور فرسودہ تھا کہ اس میں زندگی کی کوئی دھڑکن باقی نہ رہی تھی اور نہ کوئی تازگی، وہ انسانی زندگی اور اس کے مسائل سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ عام طور پر انھوں نے اپنے اخلاق و کردار کے جو نمونے پیش کیے ان میں صرف یہی نہیں کہ کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی بلکہ وہ لوگوں کو مذہب سے بیزار کرنے والے تھے۔ میں یہ ایک عمومی بات کہہ رہا ہوں کوئی خاص مذہب اور اس کے نمائندے مراد نہیں ہیں۔

مذہب کا جو تصور پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ اس کا تعلق صرف مسجد، کلیسا اور مندر سے ہے۔ خدا کا جو تصور پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ صرف ایسا وجود ہے جو صرف اپنی پوجا سے خوش ہوتا ہے۔ عبادت کا جو تصور پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ صرف پرستش کی چند ہیئتوں اور چند اقوال و حرکات کا نام ہے۔ اگر لوگ خدا کی پرستش کر رہے ہوں تو پھر اس کو اس سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مذہبی نمائندوں نے خدا کو ایک اور یکتا بھی نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے ٹکڑے کر ڈالے اور ایک بڑے خدا کے ساتھ سیکڑوں چھوٹے خدا وجود میں آ گئے انسانوں کی تقدیر بنانے اور بگاڑنے کا کام ان چھوٹے خداؤں ہی کے سپرد کر دیا گیا جو مذہبی نمائندوں کے واسطے سے کسی کی تقدیر بنا دیتے تھے اور کسی کی بگاڑ دیتے تھے۔

مذہب، خدا اور عبادت کے اس تصور نے دنیا کو ظلم و ستم سے بھر دیا۔ انسانیت مذہبی طبقے اور حکمراں طبقے کے دو پاٹ کے درمیان پس کر رہ گئی۔ ان دونوں طبقوں نے مل کر تمام انسانی ذرائع و وسائل اپنے اختیار میں لے لیے اور باقی لوگ ان کے غلام بن کر رہ گئے۔ جو ہاتھ ان کے خلاف اٹھا کاٹ لیا

گیا اور جبر گردن ان کے سامنے اونچی ہوئی قلم کر دی گئی۔

آخر انسان کا ضمیر، اس کی عقل، آزادی کا جذبہ عزت و آرام کی خواہش اس ظلم کو کب تک برداشت کرتی ان دونوں طبقوں کے خلاف بغاوت کا ایک طوفان اٹھا، ایک تیز و تند سیلاب آیا اور ان دونوں طبقوں کے ساتھ مذہب اور مذہبی و روحانی اقدار بھی بہ گئے۔ دانشوروں نے کہا، ہمیں ایسے خدا کی ضرورت نہیں، ایسی عبادت کی ضرورت نہیں، ایسے مذہب کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کے ایک حصے نے مذہب کو انسان کا پرائیوٹ معاملہ قرار دے کر خدا اور اس کی ہدایت کو اجتماعی مسائل سے بالکل الگ کر دیا ہے اور دوسرے حصے نے مذہب کو افیون قرار دے کر خدا سے بھی انکار کر دیا ہے۔ اب اگر روحانی اقدار مٹتی جا رہی ہیں اور انسان اخلاقی حیثیت سے گرتا جا رہا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ان حالات میں مذہبی نمائندوں، دانشوروں، عالموں اور عارفوں کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ مذہب کا، خدا کا اور اس کی عبادت کا وہ کون سا تصور ہو سکتا ہے جس میں زندگی کی دھڑکن ہو، تازگی ہو اور وہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ آج بھی خدا کو ماننے والوں کی تعداد نہ ماننے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے لیکن ماننے والے جس تصور کے ساتھ خدا کو مان رہے ہیں عملاً اس کا ماننا اور نہ ماننا برابر ہو کر رہ گیا ہے۔

آئیے ہم سب مل کر اس پر غور کریں کہ خدا، عبادت اور مذہب کا جیتا جاگتا، تر و تازہ اور پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا تصور کیا ہے ــــ ایک ایسے تصور تک پہنچ کر ہی ہم انسان کو اخلاقی زوال سے بچا سکیں گے اور روحانی اقدار کی حفاظت کر سکیں گے۔

خدا کا تصوّر

"اللہ، وہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفتِ ادراک میں نہیں آ سکتی الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کوئی کام نہیں ہے بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔" (البقرہ: ۲۵۵)

یہ قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ اس میں خدا کی ذات و صفات کا ایک واضح تصور دیا گیا ہے اس میں ایک بات تو یہ بتائی گئی ہے کہ "نادان لوگوں نے اپنی جگہ چاہے کتنے ہی معبود اور خدا بنا رکھے ہوں مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ خدائی پوری کی پوری بلا شرکت غیرے اس غیر فانی ذات کی ہے جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں بلکہ آپ اپنی ہی حیات سے زندہ ہے اور جس کے بل بوتے ہی پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے

اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے کوئی دوسرا نہ صفات میں اس کا شریک ہے نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حقوق میں، لہذا اس کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ شریک ٹھیرا کر زمین یا آسمان میں جہاں بھی کسی اور کو معبود (الٰہ) بنایا جا رہا ہے۔ ایک جھوٹ گھڑا جا رہا ہے اور حقیقت کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔"

اس میں دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ "وہ زمین و آسمان کا اور ہر اس چیز کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہے، اس کی ملکیت میں، اس کی تدبیر میں اور اس کی بادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں۔ اس کے بعد کائنات میں جس دوسری ہستی کا بھی تم تصور کر سکتے ہو وہ بہرحال اس کائنات کی ایک فرد ہی ہوگی اور جو اس کائنات کا فرد ہے وہ اللہ کا مملوک اور غلام ہے نہ کہ اس کا شریک اور ہمسر"

تیسری بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ "جو لوگ بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری ہستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر اڑ جائیں وہ منوا کر چھوڑتے ہیں اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ ان کا گمان غلط ہے زور چلانا تو درکنار کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اس بادشاہ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔"

چوتھی بات اس میں خدا کے حقیقی اور غیر محدود علم کی بتائی گئی ہے۔" اوپر خدا کی غیر محدود حاکمیت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے اب ایک دوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جن اور فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظام عالم درہم و برہم ہو جائے نظام عالم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں ان کی مصلحتوں کو بھی خداوند عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔"

یہ خدا کا ایک ایسا تصور ہے کہ اگر کسی کو اس پر یقین حاصل ہو جائے تو وہ جہل و نادانی کی تاریکیوں سے نکل کر علم و معرفت کی روشنی میں آ جائے۔ کیونکہ خدا ہی تمام کائنات کا خالق، مالک، حاکم اور معبود ہے وہی واحد الٰہ اور تنہا رب ہے اس کی ربوبیت و الوہیت میں کوئی شے شریک نہیں۔ اسی کی فیض بخشیاں انسان کے وجود کا سبب اور اسکی کرم پاشیاں اس کی بقا کی علت ہیں۔ وہی اس کائنات کا نور اور وہی حی و قیوم ہے۔ وہ محسن ہے جس سے بڑا کوئ

ہیں، وہ منعم ہے جس سے بڑا کوئی منعم نہیں، وہی غنی و
یا نہ ہے اور تمام چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ ہر ایک کی
ی، اس کی موت، اس کا بنا ؤ اور بگاڑ صرف اسی کے
ت قدرت میں ہے۔ وہ ایک ہے، یکتا و یگانہ ہے۔ اس
ی کوئی شے نہیں وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ
ی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اس کا ہمسر کوئی نہیں، وہی
ی ور رہنما ہے اور اسی کی ہدایت حقیقی ہدایت ہے، وہ
ی ور رحیم ہے جس کی رحمت و شفقت ماں باپ سے بھی
ر ہے جس کے عدل و انصاف میں ظلم کا شائبہ بھی نہیں
۔ وہ حکیم ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں
نے یہ دنیا الل ٹپ اور عبث نہیں بنائی ہے۔ اس نے
ن کو اس دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اس
ں کو اختیارات سے نوازا ہے، بہت سی چیزیں اس کے تصرف
دی ہیں اور مقصود اس کی آزمائش ہے۔ یہ زندگی امتحان
زمائش کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے بعد ایک دوسری
ی ملنے والی ہے جو ابدی ہے۔ اس دنیا کے بعد ایک
ری دنیا آنے والی ہے جس میں اللہ کے حضور حاضر ہو کر
زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ اپنے وفاداروں اور
ماں برداروں سے وہ خوش ہوگا اور انہیں جنت دے گا
پنے باغیوں اور نافرمانوں سے ناخوش ہوگا اور انہیں
زخ میں ڈال دے گا۔ وہ علیم ہے جس کے علم سے کوئی
باہر نہیں، خبیر ہے جو دلوں کے حال سے بھی واقف ہے۔ وہ
میع و بصیر ہے جو اندھیری رات میں، سیاہ چٹان پر سیاہ

چیونٹی کی چال دیکھتا اور اس کی آواز سنتا ہے۔ اس نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں اور اپنی کتابیں نازل کی ہیں۔ اس نے وحدت آدم کی تعلیم دی ہے یعنی یہ کہ دنیا کے تمام انسان آدم کی ذریت اور ان کی اولاد ہیں۔ آدمی ہونے کے لحاظ سے دنیا کے تمام انسان مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اللہ کے نزدیک شرافت، فضیلت اور عزت کا معیار نسل و نسب نہیں بلکہ تقویٰ ہے یعنی خدا ترسی کے ساتھ اطاعت و فرماں برداری کی زندگی بسر کرنا۔

وحدت آدم کی تعلیم تمام نسلی و نسبی و خاندانی جھگڑوں کو مٹاتی ہے اور وحدت الٰہ (توحید) کا عقیدہ اقتدار و حکمرانی کے دعووں کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان صرف اس خدا کا محکوم اور غلام باقی رہتا ہے جو سب کا پیدا کرنے والا اور سب سے بڑا ہے۔ یہ ہے خدا کا وہ تصور جو ہمیشہ تر و تازہ اور پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

عبادت کا تصور

جو لوگ خدا کا وہ تصور رکھتے ہیں جس کا اجمالی اور بہت ہی مختصر ذکر اوپر کیا گیا وہ عبادت کا یہ تصور نہیں رکھ سکتے کہ اس کا تعلق صرف مسجد، مندر اور کلیسا سے ہے اور عبادت صرف پوجا پاٹ اور نماز روزے کا نام ہے خدا کے اس تصور اور عبادت کے اس تصور کے درمیان کوئی ربط اور جوڑ نہیں ہے۔ یہ دونوں بالکل انمل بے جوڑ ہیں۔ خدا کے تصور میں جب خرابی پیدا ہوتی ہے تو لوگ عبادت کا محدود اور ناقص تصور اختیار کر لیتے ہیں۔ صحیح تصور یہ ہے کہ عبادت،

خدا کی بے آمیز پرستش، والہانہ ومخلصانہ اطاعت اور بلا شرکت غیرے بندگی وغلامی کا نام ہے۔ اگر دنیا میں کوئی شخص اپنے کسی ہمہ وقتی نوکر کی صرف سلامی سے خوش نہیں ہو سکتا تو کائنات کا خالق اور بادشاہ اپنے بندے اور غلام کی صرف پرستش سے کیسے خوش ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کسی نے کسی دوسرے شخص کو اپنی کسی جائداد کے انتظام کے لیے اپنا نائب مقرر کیا ہو اور نائب مقرر کرتے وقت اس سے کہا ہو کہ تم اس جائداد کا انتظام اس طرح کر جس طرح میں کہوں، تم میری ہدایات اور احکام کے مطابق اس کی دیکھ بھال کرو۔ اس میں تمہیں تصرفات کا اختیار ہے لیکن وہ تصرفات میری مرضی کے مطابق ہونے چاہییں۔ میں تمہیں اس جائداد کا مالک ومختار نہیں بناتا بلکہ صرف اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ میں تمہیں یہ بھی حکم دیتا ہوں کہ دن رات میں پانچ بار میرے دربار میں آکر مجھے سلامی دو اب وہ نائب صاحب یا تو اس جائداد کی دیکھ بھال نہیں کرتے اس سے غفلت برتتے ہیں یا اصل مالک کے احکام کی پرواہ نہیں کرتے اور اپنی من مانی کرتے ہیں یا اس جائداد پر قبضہ جما کر اپنے مالک ومختار ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ دن رات میں پانچ بار مالک کے دربار میں حاضر ہو کر جھک جھک کر سلامی ضرور دیتے ہیں تو بتائیے کہ وہ مالک کیا اس نائب کی صرف سلامی سے خوش ہو جائے گا؟ یا اس سلامی کو اپنے ساتھ ایک مذاق تصور کریگا؟

پھر یہ بات کس طرح معقول ہو سکتی ہے کہ خدا جس نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے واضح ہدایات دی ہیں وہ صرف اپنی پرستش سے خوش ہو جاتا ہے؟ اس صحیح اور جامع تصور عبادت کے تحت جس کا ذکر اوپر گذرا، جس طرح مسجد میں نماز ادا کرنا عبادت ہے اسی طرح بازار میں خدا کے احکام کے مطابق تیل اور کم نہ بیچنا بھی عبادت ہے پرستش کے بارے میں جس طرح خدا کے احکام کی تعمیل ضروری ہے، اسی طرح معیشت، معاشرت اور سیاست کے بارے میں اس کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے۔ "عبادت کے دائرے میں خدا کے تمام احکام کی تعمیل داخل ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا بھی عبادت ہے۔"

عبادت کے اس تصور کے ساتھ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص لوگوں پر ظلم ڈھا کر، ان کا مال ہڑپ کر کے، ان کی عزت لوٹ کر اور ان کے حقوق تلف کر کے یہ سمجھ بیٹھے کہ محض اس کی پرستش اور پوجا سے خدا خوش ہو جائے گا، بلکہ ان گناہوں کے ساتھ خدا کی پرستش، پرستش ہی نہیں ہے اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے

مذہب کا تصور

مذہب نام ہے خدا پر ایمان اور اس کی عبادت کا۔ اس کے بغیر کسی مذہب کا تصور بھی نہیں آتا۔ اوپر خدا اور عبادت کا جو صحیح تصور پیش کیا گیا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کا تصور بھی محدود اور ناقص نہ ہو جیسے مراسم پرستش تک مذہب کو محدود کر دینا مذہب کے خلاف یورپ کی بغاوت کا نتیجہ ہے ورنہ در اصل مذہب، ایک ایسے طریق زندگی (way of life) کا نام ہے جو خدا کا دکھایا ہوا ہو۔ صحیح مذہب ایک مکمل دستور ہوتا ہے جس سے زندگی کا کوئی شعبہ باہر نہ رہے۔

مذہب انسان کا پرائیوٹ معاملہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے جتنا اس کی انفرادی زندگی سے۔ خدا نے انسان کو اس دنیا میں بھیج کر اس کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑا ہے۔ یہ بات اس کی رحمت اور اس کے انصاف دونوں سے بعید ہے۔ خدا کے صحیح تصور سے یہ بات میل نہیں کھاتی کہ وہ اپنے بندوں کو یہ نہ بتلائے کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے اور کن چیزوں سے ناخوش ہوتا ہے۔ یقیناً اس نے یہ بتایا ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ خدا کی خوشنودی تک پہنچانے والا راستہ، دنیا سے ہٹ کر اور کٹ کر نہیں جاتا، بلکہ بیچ دنیا سے گذرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان، خدا کی نیابت اور خلافت کا کام انجام دے ہی نہ سکے۔ مذہب کا یہ تصور صرف یہی نہیں کہ انسانی زندگی سے قریب ہے بلکہ پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔

خدا، عبادت اور مذہب کے ان تصورات کے جو اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں، ان کی تفصیل طویل ہوگی۔ میں یہاں چند اثرات کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سب سے پہلا اور اہم ترین اثر یہ پڑتا ہے کہ انسان انسان کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور صرف خدا کی بندگی و غلامی اسے انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ اس کی پیشانی صرف خدا کی چوکھٹ پر جھکتی ہے اور کسی دوسرے کے آستانے پر اپنی پیشانی جھکا کر وہ اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرتا۔ اسی بات کو اقبال نے یوں کہا ہے:-

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

۲۔ ہر طرح کے اوہام و خرافات سے اس کا ذہن اور اس کی زندگی پاک ہو جاتی ہے

۳۔ اس کی صلح و جنگ، محبت و نفرت، لین دین اور تمام معاملات و تعلقات کا دار و مدار احکام الٰہی پر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا انصاف وجود میں آتا ہے اور ایک ایسا خوش گوار فضا پیدا ہوتی ہے جس سے بہتر انصاف اور جس سے خوشتر فضا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خدا عادل ہے اور اس نے کائنات کو عدل پر قائم کیا ہے۔ اس کے کسی حکم میں کسی پر ظلم و زیادتی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا بلکہ نہیں پایا جا سکتا۔ اگر خدا کے کسی حکم میں ظلم و زیادتی پائی جائے تو وہ خدا نہیں ہے۔

۴۔ خدا کا خوف اور آخرت کی سزا کا احساس اس پر اس طرح مستولی ہو جاتا ہے کہ وہ سات پردوں میں چھپ کر بھی گناہ نہیں کرتا۔ خدا کے کسی قانون کو نہیں توڑتا اور اگر کبھی شیطان اور نفس کے اغوا سے گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً چونک جاتا اور اس کی تلافی کے لیے بے چین ہو جاتا ہے

۵۔ اس کا وجود خدا کی مخلوق کے لیے رحمت بن جاتا ہے، وہ خدمت خلق کو ڈیوٹی اور اپنی سعادت سمجھتا ہے وہ غریبوں، محتاجوں، بیماروں اور کمزوروں کے کام آتا ہے، ہر ایک کی جان، مال اور عزت اس سے محفوظ رہتی ہے۔

۶۔ وہ ایک انتہائی ذمہ دار شخصیت بن جاتا اور اپنے

(باقی ص۵۵ پر)

تحریر :- ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

ہندوستانی مسلمان اور ہندوستانی سیکولرزم[1]

مترجم: سلطان احمد اصلاحی، ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند علی گڈھ

آزادی ہم ہندوستانیوں تک اچانک آ پہنچی جبکہ ابھی ہمیں ان حالات کو سمجھنا باقی تھا جن میں اپنے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ ہمیں رہنا تھا۔ ایک عام ہندو نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ملک کی تقسیم سے "مسلمانوں کا مسئلہ" ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی سمجھ میں بھی یہ بات کافی دیر میں آئی کہ جس پاکستان کے لیے انھوں نے جنگ لڑی تھی، وہ ایک دوسرا ملک ہے جس نے ان کا کوئی مسئلہ حل تو نہیں کیا، البتہ نئے مسائل ضرور پیدا کر دیے۔

اب چوتھائی صدی گذر چکی ہے جس نے ایک طرف ہندوؤں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ وہ کسی حد تک ان تلخیوں کو بھول سکیں جو بالآخر تقسیم ملک پر منتج ہوئیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اس بات کا احساس ہو جائے کہ ہندوستان کی تقسیم سے ان کے حوصلوں کی یک گونہ تحدید لازم آتی ہے۔ ہندو دانشور طبقے کے ذہنوں کے اندر ہندوستانی سیکولرزم کا حقیقی شعور آہستہ آہستہ پیدا ہونے لگا ہے۔ اور اب ہندوستانی مسلمانوں سے بھی بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی طرف سے بھی اس کا ردعمل صحت مندانہ ہوگا۔ اس ردعمل کے ضمن میں گذشتہ چوتھائی صدی پر تبصرہ کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس مدت کے دوران ہندوستانی سیکولرزم زیادہ تر دستور ہند کے صفحات کی زینت بنا رہا اس کا اظہار جواہر لال نہرو جیسے افراد کی تقریروں میں ہوتا رہا

[1] یہ اس انگریزی مقالے کا ترجمہ ہے جسے مصنف نے امریکا اور کناڈا میں ہندوستانی مسلمانوں کی تنظیم کانسلیشن کمیٹی آف انڈین مسلم ان امریکہ اینڈ کناڈا کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ستمبر ۱۹۷۲ء میں پیش کیا تھا۔ موصوف کا یہ مقالہ پندرہ روزہ IMPACT (لندن) میں ۲۳ نومبر ۷۲ء کی اشاعت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ (مترجم)

اس لیے ہم اپنی توجہ حال پر مرکوز رکھیں گے اور صرف ضمناً ماضی کے حوالے دیں گے۔

ہندوستانی کثرتیت (PLURALISM) سے متعین طور پر ہماری مراد کیا ہے؟ اس سے ہماری مراد یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ایسی سرزمین ہے جس میں مختلف مذاہب، مختلف تہذیبیں اور مختلف زبانیں رکھنے والے لوگ بستے ہیں۔ یہ اس بارے میں ایک نقطہ نظر کا نام ہے کہ ہم ہندوستان کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے کس طرح ایک ایسے مستقبل کی تعمیر عمل میں لائیں جو ہمارے ہمہ گیر حوصلوں کی تکمیل کی ضامن ہو۔ یہ نقطہ نظر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ بہت سے وسیع مقاصد مثلاً معاشی ترقی، اجتماعی عدل، سیاسی قوت و استحکام سب کو مطلوب ہیں اور سب اس بات پر آمادہ ہیں کہ ایک دوسرے کو ان دائروں میں پوری آزادی دیں جن میں لوگ مختلف ہیں۔ مثلاً مذہب، تہذیب اور زبان۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ عوام کے تمام طبقات کی رضامندی سے قائم ہونے والی حکومت کے تحت مشترکہ کوششیں کی جائیں۔ مزید برآں یہ اس بات کی ضمانت بھی حاصل کرنا چاہتا ہے کہ نسل، مذہب، زبان اور تہذیب کے اختلافات عوام کے لیے، ہندوستان میں ایک صالح سماج کی تعمیر کی مشترکہ جدوجہد میں اپنی عقل عام تجربہ اور جملہ سائنٹفک معلومات کے استعمال کرنے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ہندوستانیوں کو اس بات پر آمادہ ہونا چاہیے کہ وہ ان دائروں میں اختلاف و تنوع کو باقی رہنے دیں جن میں سب کے مقاصد یکساں نہیں ہوتے۔ آخر میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس نقطہ نظر کو اسی صورت میں زندہ رکھا جا سکتا ہے جب کہ تبدیلی کا طریقہ کار یعنی مشترکہ مقاصد تک پہنچنے کا راستہ بھی تمام قوموں کی مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے لیے قابل قبول ہو۔

اس تشریح پر کسی کا چونکنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ ہندوستانی پلورلزم اپنی تفصیلات کے لحاظ سے بیشتر ہندوستانی واقع ہوا ہے۔ یہ نہ تو ایک فلسفہ ہے اور نہ ہی ایک سیاسی نظریہ بلکہ ہندوستان کی تعمیر نو کے بارے میں ایک اپروچ ہے۔ اگرچہ پلورلزم کی اصطلاح ایک فلسفیانہ پس منظر رکھتی ہے لیکن ہندوستانی پلورلزم، مابعد الطبیعی امور میں کسی خاص فکر یا عقیدے کو مستلزم نہیں ہے۔ تاریخی طور پر اس کا سلسلہ نسب مغربی لبرلزم سے جا ملتا ہے مگر اس کے آگے کا شجرہ ڈھونڈھنا مناسب نہیں۔ یقیناً یہ جدید پلورلزم کی تجربیت میں برابر کا شریک ہے مگر جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ہمارے لیے قدروں کا ماخذ و منبع کیا ہے۔ ہندوستانی پلورلزم اس کے کسی ایک جواب پر مشتمل یا منحصر نہیں ہے۔ اس پر مسلک انسانیت (HUMANISM) کی بھی گہری چھاپ پڑی ہے لیکن اتنی گہری نہیں کہ یہ ہندوستان میں پہلے پائے جانے والے دوسرے مذاہب کے بمقابل ایک نیا مذہب بن کھڑا ہو۔

ان منفی پہلوؤں کے باوجود اس کا کچھ اپنا جوہر بھی ہے

ر بجائے خود اپنی ایک حقیقت بھی رکھتا ہے۔ چونکہ ابھی تشکیلی مراحل سے گذر رہا ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس کی کوئی واضح تعریف نہ کی جا سکے مگر یہی اس کی خوبی بھی ہے۔

ہندوستانی پلورلزم ایک خوشحال، پرامن، طاقتور اور اچھے سماج کی تعمیر کرنے کے ہندوستانی طرز کا دوسرا نام ہے۔ اس طور پر کہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ نہ مادی طور پر اور نہ روحانی طور پر۔ اور ساتھ ہی قوت کے ان خزانوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ جن کی حامل ہندوستان کی مختلف مذہبی، تہذیبی اور لسانی روایات ہیں۔

انسانوں کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف رہا ہے کہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے کون سی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ شدت پسندی کے نتیجے میں یہ اختلافات مستقل نظریات کی شکل اختیار کر گئے اور باہمی ٹکراؤ رونما ہونے لگے۔ عارضی حالات جزئی تجربات، بعض انسانی گروہوں پر بھروسے میں کمی۔ مفادات محفوظ رکھنے والوں (VESTED INTRESTS) کے ساتھ معاملہ کرنے میں بے صبری، ان چیزوں نے ایسی وقتی حکمت عملیوں کو جنم دیا جو صدہا برس کی اس دانشمندانہ روش سے ہٹی ہوئی تھیں جن کے امین، مذاہب اور زمانہ قدیم سے قائم تہذیبی روایات رہی ہیں۔ تاریخی حوادث کے دباؤ کے تحت مخصوص انسانی گروہوں نے مخصوص طریق کار اختیار کیے ہیں مگر ان طریقوں کے اثرات خود ان گروہوں یا انسانیت عامہ پر ہمیشہ اچھے نہیں پڑے ہیں۔

آج جبکہ ہم بیسویں صدی کی آخری چوتھائی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری انسانیت سماج کے مستقبل کے ڈھانچے سے تعلق رکھنے والے اہم مقاصد کے بارے میں متفق الرائے ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حکمت عملی کے بارے میں صورت حال یہ نہیں ہے۔ آج دنیا میں ہندوستانی پلورلزم بھی اسی مخمصہ میں مبتلا ہے۔

ان چند نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئیے دیکھیں کہ متعین طور پر وہ کون سے عوامل ہیں جو ہندوستانی پلورلزم کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے ردعمل پر اثرانداز ہو رہے ہیں۔

۱۔ روحانی سطح پر شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں جو مصالحت و موافقت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔

۲۔ ہندوؤں کے ہندوستانی پلورلزم سے وابستگی کے بارے میں بے اعتمادی۔

۳۔ صورت حال کے حرکی عمل کو سمجھنے سے قاصر رہنا

۴۔ حکمت عملی کے باب میں وہ تصادم جو اب نمودار ہو رہا ہے۔

۵۔ انفعالی کیفیت جو اس میں مانع ہے کہ وہ کشمکش دور کرنے میں خود پہل کریں۔ (پلورلزم کے مشترک مقاصد کے ساتھ) عامۃ الناس کی وابستگی کو پختہ کرنے کی کوشش کریں اور اس پورے عمل میں خود پیش پیش رہیں۔

اس وقت ان پانچوں عوامل میں سے ہر ایک پر مختصر تبصرہ ہی کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس وقت کمک پہنچنے والے

یا تجزیہ کرنے جانے کے لیے صورت حال پوری طرح صاف نہیں ہو سکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر ایک تحریکی روح بیدار کرتا ہے۔ وہ انہیں دعوت پہنچانے کی غرض سے عام انسانوں سے ربط و اتصال پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ اُن کے اندر ایسے اخلاق پیدا کرتا ہے اور سماج کو ایسی قدروں کے مطابق ڈھالتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں۔ ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب ایمان حقیقی اور قوی ہو اور اس کی جڑیں خدا سے حقیقی قربت اور اس کی مرضی کے مخلصانہ اتباع میں گہری اتر چکی ہوں۔ سچائی نے کبھی بھی اس کی دعوت نہیں دی ہے کہ کوئی شخص اپنی سوسائٹی سے دوری اختیار کرے یا اس سے علیحدہ ہو کر اسے بالکل ہی رد کر دے۔ محمدؐ، عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کو وہ سچائی جو انہیں خدا کی طرف سے ملی تھی، اس بات پر آمادہ کرتی تھی کہ وہ مسلسل انسانوں سے ربط رکھیں، ان کی خدمت کرتے رہیں ان سے ان امور پر مسلسل گفت گو کرتے رہیں۔ جو ان سے بہت متعلق ہوں اور ساتھ ہی انہیں کے ساتھ عام انسانوں جیسی زندگی گذارتے رہیں۔

صدیوں کی مدت پر پھیلی ہوئی اسلامی تاریخ میں کسی مرحلے میں، اسلام کا یہ تصور کہ وہ ایک اجتماعی نظام اور جامع نظام زندگی ہے۔ اس کے ایک ایسی دعوت ہونے کے تصور پر فوقیت حاصل کر گیا جس کا تعلق سارے انسانوں سے ہو۔ ایک تاریخی فریب نظر نے دعوت کو ثانوی اور اسلامی تعلیمات کے مطابق سماج کی تنظیم کو مقدم قرار دے دیا فکر میں بھی اور میثاقی پروگرام میں بھی۔ لوگ صدیوں سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ پھیلتے ہوئے اسلام کا مرکزی نقطہ مدینہ ہے اور اس مکہ کو بھلا بیٹھے جس نے اس مدینہ کو جنم دیا تھا۔ روحِ مسلمان اب ہر آن ایک مدینہ کی تلاش میں سرگرداں ہے جسے یہ اسلامی زندگی گذارنے کے لیے ناگزیر سمجھتی ہے۔

روحِ مسلمان کا یہ اضطراب اگر اس اضطراب کی طرح ہوتا تو خوب تھا جس میں مکہ میں محمدؐ کی روح مبتلا تھی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور پھر اس کے نتیجے میں غیر مسلم انسانیت کے ایک وسیع سمندر سے گھرا ہوا مسلمان، ان انسانوں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرتا جسے آپؐ نے اختیار کیا تھا اور یہ چیز اسے اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ اسی طرح کی گفتگو پر آمادہ کرتی جیسی کہ آپؐ کی ہوتی تھی لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔ کچھ ایسا ہوا کہ ہم یہ سادہ سی حقیقت بھلا بیٹھے ہیں کہ مکی زندگی بھی اتنی ہی اسلامی تھی جتنی کہ مدنی زندگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالب آنے کی سیاست آمادہ کر لے جانے کی نفسیات پر حاوی ہو گئی۔ ہم یہ بھولتے نظر آتے ہیں کہ ایک ایسی صورت حال میں جس سے کہ ہم دوچار ہیں مدینہ کا راستہ لازماً مکہ سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے لیے کوئی دوسرا مختصر راستہ موجود نہیں ہے۔ ابھی ہم یہ بات پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں کہ ایک ایسے سماج کے قیام

کی آرزو جو ہر پہلو سے اسلامی ہو۔ اس کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم موجودہ سماج سے دوری اختیار کریں، اسے رد کر دیں یا اس سے بالکل بے نیاز ہو جائیں بلکہ یہ ہم سے ہندوستانی زندگی میں ایک مشن کے تحت سرگرم حصہ لینے کا مطالبہ کرتی ہے۔

لیکن مسلمان اس طرح کا حصہ لینے سے گھبراتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کچھ اچھوتے اور نئے آداب و شرائط کی پابندی گوارا کریں۔ سب سے کٹھن مسئلہ یہی ہے سیکولرزم کے حامی اور جدیدیت کے علمبردار طبقے کی طرف سے مصالح پر مبنی اپیلوں، اور قدامت پسند مذہبی طبقے کے منطقی اور فقہی موشگافیوں کے باوجود، روح مسلمان کو یہ تردد اب بھی لاحق ہے کہ اسلام ہندوستانی پلورلزم سے متصادم ہے۔ جبکہ ہندوستانی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لینا ہو، تو اسے قبول کیے بغیر چارہ نہیں حالات کے دباؤ کے تحت جتنا ہی وہ اس میں حصہ لینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں اتنا ہی یہ شک و تردد، ان کے روحانی اضطراب میں اضافہ کرتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں ان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں اور اسی کے نتیجے میں بسا اوقات ان کے طرز عمل اور اجتماعی پالیسیاں داخلی تضاد کا شکار نظر آتی ہیں۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد اور تصادم کا یہ خطرہ غلط اندازے پر مبنی ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم ہندوستانی پلورلزم کے بڑے بڑے مقاصد میں پوری طرح ساتھ ہیں۔ آزادی، مساوات اور عدل خصوصاً عدل اجتماعی یہ سب اسلامی مقاصد ہیں بلکہ اصلاً انسانی مقاصد ہیں قبل اس کے کہ انہیں ہندوستانی مقاصد قرار دیا جائے۔ ہم بھی اس اچھے سماج کے بنیادی عناصر ترکیبی سے متفق ہیں جسے ہندوستان کے دوسرے لوگ قائم دیکھنا چاہتے ہیں۔ حکمت عملی اور مستقبل میں ہندوستان کے سماجی نظام کی تفصیلات کے تعلق سے امکانی اختلافات کے باوجود، یہ مقاصد ہمارے لیے جدوعمل کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ جہاں تک ان اختلافات کا سوال ہے، ان کی گنجائش بجائے خود ہندوستانی پلورلزم کے تصور میں موجود ہے اور انہیں اس کے دائرے میں رہتے ہوئے بآسانی حل کیا جاسکتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ خدا پر اعتقاد رکھیں اور انسان پر بھروسہ کرنا سیکھیں ان غیر تعمیری شکوک و شبہات کو اپنے ذہنوں سے نکال پھینکیں جو ہمارے ذوق عمل کو متاثر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کلی طور پر سرگرم زندگی میں ڈال دیں۔

بھوک، غربت، بیماری، جبر و استحصال، سماجی امتیاز و نابرابری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے کٹھن کام میں شرکت، اور ان کوششوں میں شمولیت جو ایک ترقی پذیر آزاد پُرامن اور بہتر سماج کے تعمیر کرنے کے سلسلے میں کی جارہی ہیں۔ اس طرز گفتگو اور باہمی عمل (INTERACTION) کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں جسے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے ساتھ رہنے والے دوسرے ہندوستانیوں کے

ساتھ اپنانا چاہیے۔ اگر وہ اپنے عقیدے اور مشن کے ساتھ وفادار رہنا چاہتے ہیں۔

اس طرح کے سماج کو قائم کرنے کے لیے ہندوستانی عوام کے مقاصد و اقدارِ حیات کے تعلق سے ایک نئی تربیت درکار ہے، جسے انجام دینا ہندوستانی لیڈروں کی سیکولر اور عملی مصالح پر مبنی اپیلوں کی بساط سے باہر ہے۔ مساوات، عدل اور آزادی جیسی قدروں کو برپا کرنے کے لیے ایسا رویہ درکار ہے، جسے صرف وہ صالح نظریہ کائنات جنم دے سکتا ہے جو زندگی بعد موت اور سب کو پیدا کرنے والے پروردگار کے اعتراف پر مبنی ہو کہ یہ اعتراف بجائے خود عالمگیر انسانی برادری و مساوات اور تمام بندھنوں سے آزادی کو مستلزم ہے۔ ملکی معاملات و مسائل میں فعال طریقے پر حصہ لینے کے نتیجے میں جب دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی مسلمانوں کی وطن دوستی شبہہ سے بالا ہو جائے، تبھی مسلمان ان لوگوں تک سچائی کی دعوت پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانی عوام کا مذہبی مزاج، نیز وہ بیزاری جو جدیدیت کی پیراز جستجو روح میں بے حذر تہذیب کے بے منزل و مقصد افراد کی زندگی میں پائے جانے والے خلاء کے خلاف پیدا ہو چلی ہے ایمان کی طرف واپسی میں مددگار ہوگی۔ انسانی شعور سے ایمان و عقیدے کو دور کرنے کا طریقہ کوتاہ نظری پر مبنی رہا ہے۔ یہ طریقہ جو مادی ترقی کی راہ میں مسابقت کی خاطر اپنایا گیا تھا، جلد ہی ہندوستان میں اسی طرح تخریبی ثابت ہوگا جس طرح مغرب میں ثابت ہو چکا ہے۔

اس بات سے انکار مشکل ہے کہ کوتاہ نظری پر مبنی یہ طریقہ ہندوستانی کثرتیت کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے عام طور سے ظاہر کیا جانے والا یہ خیال بھی سامنے رہے کہ ہندو، ہندوستانی پلورلزم کے اس نئے مسلک کے ساتھ مخلصانہ وابستگی نہیں اختیار کر رہے ہیں۔ نیز وہ اقلیتوں کو خصوصاً مسلم اقلیت کو مذہبی اور تہذیبی آزادی دینا نہیں چاہتے۔

یہ ایک طرح غلط بھی ہے اور ساتھ ہی مایوس کن بھی۔ ہم اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ دستورِ ہند کے بنانے والوں نے کس طرح دستور کو ہندو جارحانہ وطن پرستی اور احیاء پسندی سے بلند ہو کر بنایا تھا۔ ہم یہاں اس طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح جدیدیت ہندو دانشور طبقے کو سچے پلورلزم کے حامیوں میں تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ ہندوستانی پریس عامۃً مطبوعات اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع پر سرسری نظر ڈالنے سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندو ایک مخلص پلورسٹ نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ پلورلزم کی طرف کھنچتا اور خالص ہندو احیاء پسندی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ہر ہندو کے بارے میں یہ تصور کہ وہ آر۔ ایس۔ ایس قسم کا جن سنگھی ہے، غلط ہے اور ساتھ ہی مایوس کن اور شکست خوردگی پر مبنی ہے۔

یہ بات کہ ابھی ہندوستانی پلورلزم کے ساتھ مذہب دشمن رجحانات اور ہندو احیائی تصورات وابستہ ہیں۔

مسلمانان ہند کے اس جانب سے ایک منفی رویہ اختیار کر لینے کی وجہ جواز نہیں بن سکتا۔ اس طرح تو ہندوستانی پلورلزم کو ان منفی رجحانات سے پاک کرنے کے امکانات ہی ختم ہو جائیں گے۔ ان منفی رجحانات کی موجودگی اس بات کو زیادہ ضروری بنا دیتی ہے کہ ہمارا ردعمل ثابت ہو اور ہم ہندوستانی پلورلزم کو تقویت بخشنے اور عوام میں اسے مقبول بنانے میں دلچسپی لیں اور اس کام میں ہندو دانشوروں کے اس طبقے کے ساتھ تعاون کریں جو مخلصانہ طور پر اکثریت سے وابستہ ہے۔

اگر تقسیم سے پہلے کی مسلم سیاست کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا تو اس کا کہ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جنھیں پاکستان بننے کے بعد بھی ہندوستان ہی میں رہنا تھا آزادی کے بعد کے دور میں اس سیاسی دیوالیہ پن کے بہت مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آج بھی ہندوستانی مسلمان ایک ایسے مستقبل کا تصور کرنے سے قاصر ہے جو اس کے ماضی سے بہتر مگر ساتھ ہی اس سے مختلف بھی ہو۔ زیادہ سے زیادہ اسے جس چیز کی توقع ہے وہ ان چیزوں کو بچائے رکھنا ہے جو اسے ماضی میں حاصل تھیں۔ یعنی "موجودہ حالت" Status qua کو برقرار رکھنا۔ اس کے سر پر یہ خوف ہمیشہ منڈلاتا رہتا ہے کہ زمانہ "موجودہ حالت" کے خلاف جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی واضح ذہنی تصویر نہ ہونے کے سبب کہ اسے کس طرح ایک بہتر حالت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ مریضانہ طور پر اسی سے چمٹا رہنا چاہتا ہے، اور اس کی خاطر جان تک دینے کے لیے تیار ہے۔

موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر اصرار کے ساتھ ہی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر زندگی کے ایسے مسائل کے بارے میں کوئی عام بے داری نہیں پائی جاتی جو اگرچہ صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں لیکن اپنی غیر معمولی اہمیت کے سبب فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مثال کے طور پر غریبی، بیماری اور ناخواندگی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ آزادی کے بعد کے دور میں نمایاں مسلم تنظیموں کا جائزہ لیجیے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ مسائل ان کی فہرست مسائل میں داخل ہی نہیں۔ یہ مسلمانوں کے مسائل نہیں۔

مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ جارحیت کے سب سے بڑے مسئلے کے پہلو بہ پہلو مذہبی تعلیم بالخصوص ابتدائی تعلیم، پرسنل لا، اردو، اوقاف، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ یہ ہیں خاص خاص مسلم مسائل جن پر اجتماعی سطح پر مسلمانان ہند کی تمام توانائیاں صرف ہو رہی ہیں۔ کوئی شخص بھی ان مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلمانوں کے طرز عمل کے وہ دونوں پہلو جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ان مسائل کی نوعیت بالکل بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا انداز سکھاتے ہیں جو ایک طرف تو ان مسائل کے حل کے لیے غیر موزوں ہے اور دوسری طرف ان مسائل کو اجنبیت بڑھانے کا سبب بنا کر دوسروں میں مخالفانہ جذبات پیدا کرتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا "موجودہ حالت" کو برقرار رکھنے

پر اصرار براہ راست نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ مذکورہ جائز مفادات کو تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے پس منظر میں دیکھنے سے ناکام رہے ہیں ایک ایسی ملی زندگی کا تصور بھی نہیں قائم کیا جا سکا ہے جس میں ملت کے مذہبی اور تہذیبی حوصلوں کو ہندوستان میں بسنے والی دوسری ملتوں کے حوصلوں سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے پورا کیا جا سکے اور جو جدید زندگی کے تقاضوں کو بہتر طور پر پورا کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا مفادات کو بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرنے یا بعض صورتوں میں متبادل راہیں نکالنے کا عمل بھی انجام نہیں پا سکا ہے۔ اس غیر عقلی طرز عمل کے نتیجے میں ہم بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں کھو بیٹھے ہیں کیونکہ وہ اسے ہندوستانی پلورلزم کے حرکی پہلوؤں کو نہ سمجھ سکنے کے مرادف سمجھتے ہیں۔

ہم صرف ایسے مستقبل کی تعمیر میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ایک طرف تو ہمارے ماضی کے حقیقی اسلامی عناصر کے تسلسل و بقا کا ضامن ہو اور دوسری طرف اس میں ان باتوں کا اضافہ بھی ہو جو غلامی، پس ماندگی، باہمی شک و شبہے کی فضا اور جدید زندگی کی قدروں کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ماضی میں شامل نہیں کی جا سکتی تھیں۔ ماضی کا تسلسل تمام تفصیلات کے ساتھ تو ممکن نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے ماضی میں بہت سی چیزیں اسلامی اعتبار سے فضول و زائد یا زمانے کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے از کار رفتہ ہیں۔ مسلمانوں کا ذہن اب تک اس طرح کے مستقبل کا کوئی خاکہ نہیں بنا سکا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے موجودہ مسائل کے حل تجویز کرنے اور اس مقصد کے لیے موزوں طریقہ کار سوچنے کے لیے کوئی بنیادیں نہیں میسر ہیں۔ انہیں آگے راہیں مسدود نظر آتی ہیں اور بجز خلا اور تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے نئے طرز ہائے عمل کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی مقصدی زندگی سے ہم آہنگ ہوں اور جن کی نظر مستقبل پر ہو۔ جدید ہندوستان میں اختلاف و اجتماع اور اقلیتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے ضروری ہے پہلے ہم مشترک مسائل کے حل میں شریک ہوں اور ان دائروں میں بھی سرگرم عمل ہوں جن میں باہمی اتفاق کی بنا پر تعاون ممکن ہو۔ مقاصد کے بارے میں اتفاق سے یہ لازم نہیں کہ اس بارے میں بھی سب کا اتفاق ہو کہ یہ مقاصد کس طرح حاصل کیے جائیں منطق کا تقاضا جو بھی ہو تاریخ شاہد ہے کہ مقاصد ذرائع کی تعیین نہیں کرتے۔ سماج کو بدلنے کا اسلامی طریقہ کار نیز ایک عمدہ سماج کو منظم کرنے کا اسلامی طرز، یہ چیزیں بھی اسلام کا ویسے ہی جز و لازم ہیں جس طرح وہ اسلامی مقاصد جو انسانی سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے تمام مذاہب کی طرح اسلام بھی سب سے پہلے ذہنوں کی ایسی تبدیلی چاہتا ہے جو اسلامی تصور کائنات کو سمجھ بوجھ کر اختیار کرنے کے نتیجے میں عمل میں آئی ہو۔ سماجی فلاح و بہبود کے حصول کے لیے اسلام لوگوں کے رضاکارانہ طور پر اچھا طرز عمل اختیار کرنے پر بھروسہ کرتا ہے۔ سماجی فلاح و بہبود کے

کے حصول کے لیے اسلام لوگوں کے لیے رضاکارانہ طور پر اچھا طرزِ عمل اختیار کرنے کے نتیجے میں عمل میں آئی ہو۔ سماجی فلاح کے حصول میں ریاست کی جانب سے مداخلت یا اقدام کا کام یہ ہے کہ اس کمی کو پورا کرے جو افراد کے رضاکارانہ عمل میں رہ جاتی ہے، نیز غلط کار افراد کی مضرت رساں سرگرمیوں کی بھی تلافی کرے۔ بہرصورت اجتماعی مقاصد کو حاصل کیا جانا ضروری ہے۔ اس سے ریاست کے عمل کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک اچھے سماج کو صرف ریاست کی کارروائی اور مداخلت کے ذریعے بہت دنوں زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ بہت ضروری ہے کہ اسلامی ریاست تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے افراد میں قدروں کا صحیح شعور پیدا کرے جس کے نتیجے میں صالح اجتماعی اور انفرادی کردار پیدا ہو سکتا ہے

کمیونزم اپنی تبدیلی کے طریقہ کار اور سماج کو منظم کرنے کے انداز دونوں ہی میں فرد کے اچھے کردار اور سماجی فلاح کے ضامن رضاکارانہ عمل پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ صرف اقتدار اور تنظیم پر انحصار کرتا ہے۔ ہر تنظیم افراد کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ لہذا تنظیم کے نتائج پر یہ بات بھی اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ افراد کن قدروں کے علمبردار ہیں۔ اگر اس سچائی کا اعتراف نہ کیا گیا تو اجتماعی بھلائی سے انحراف بلکہ اس سے غداری کا خطرہ برابر لاحق رہے گا جیسا کہ روس کی حالیہ تاریخ بتاتی ہے

معاشی بہتری اور سماجی عدل کو جلد سے جلد حاصل کرنے کی خواہش کے سبب اور اس بے صبری کے باعث جو مشرق میں اخلاقی ترغیب سے کام نہ چلنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی بہت سے ترقی پذیر ممالک کے لیڈر، تبدیلی کے اشتراکی طریقہ کار کو اپنانے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ کیا ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے؟ اور اگر اس ملک کی قیادت کلیت پسندی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو مسلمانوں کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

اشتراکی کلیت پسندی کو اختیار کرنا ہندوستانی پلورلزم کی کامل نفی کے مرادف ہوگا۔ آپ اسے کھلے ذہن کے خاتمہ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں متعدد علامتیں اس امکان کی نشان دہی کرتی ہیں لیکن عالمی رجحانات بیدار ہوئے ذہن اور کلیت پسندی کے خلاف ہیں۔

لہذا ایسا ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے ردِ عمل پر گفتگو قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدانخواستہ اگر حالات ابتر ہوتے ہیں تو ہم کو اسلام کے اندر اتنی لچک موجود ہے کہ وہ کچھ اچھے اثرات مرتب کرتا رہے گا تاکہ مستقبل میں کسی خوشگوار تبدیلی کے حق میں راہ ہموار ہو سکے۔

اس لیے اس وقت ہماری گفتگو صرف اس سے متعلق ہوگی کہ آنے والی کلیت پسندی کا ڈر مسلم ذہن کو کس طرح متاثر کر رہا ہے؟ اس کا اثر ان کے طرزِ عمل پر کیا پڑ رہا ہے؟ ان کے موجودہ موقف میں نہ تو اس خطرے کے ٹکنے کی صلاحیت ہے اور نہ اس بات کی کہ یہ پیش آ جائے تو اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ کلیت پسندی کے اندیشے

کا سدباب صرف اس طرح ممکن ہے کہ وہ دوسرے ہندوستانیوں سے گفتگو کریں اور ان کے ساتھ مل جل کر آنے والے خطرات کا مقابلہ کریں۔

آئیے اب اس جمود کا جائزہ لیں جو مسلمان عوام پر طاری ہے۔ یہ صرف ان دائروں تک محدود نہیں ہے جن میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا باہمی ربط یا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ بلکہ اس ملت کی داخلی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ ملت اپنے مقصد کا شعور کھو بیٹھی ہے جس کے نتیجے میں وہ سرگرمیاں بھی بے معنے ہو کر رہ گئی ہیں جن کا تعلق صرف اسی فرقے سے ہے۔ اس بات کو وہ لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو ایک ملت کی حیثیت سے فعال زندگی گذارنے اور محض جسمانی وجود کے تقاضے پورے کرنے کے درمیان فرق کر سکتے ہیں۔ غریب کمانے کے لیے کام نہیں کرتا۔ ان پڑھ اور جاہل اپنے اندر پڑھنے لکھنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا اور جو ایک بار گر پڑتا ہے وہ دوبارہ اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ ہر طرف سستی اور کاہلی، سماجی معاملات سے بے تعلقی اور بے عملی کا دور دورہ نظر آتا ہے کوئی اپیل کارگر نہیں ہوتی خواہ وہ خدا کے نام پر کی جائے یا انسان کے نام پر۔ وحی کا حوالہ دیا جائے یا عقل کا۔ یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی نقص ضرور موجود ہے۔ آج ہندوستانی مسلمان کا ایمان اس حیات بخش اور بجلی کی سی لہر دوڑا دینے والے ایمان کے ساتھ صرف نام کی مشابہت رکھتا ہے جس نے مکہ کے اندر مومنین میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور جس نے ایک مختصر سی مدت میں بظاہر نکمے عربوں کو ایک شاندار اور ساتھ ہی خدا ترس تہذیب کے نقیبوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

بہت آسانی سے ممکن تھا کہ ہم اپنی اس گفتگو میں ہندوستانی پلورلزم پر کڑی تنقید کرتے، اس کے داخلی تضاد اور منافقت کی نشاندہی کرتے اور اس کے علمبرداروں کے فکر و عمل میں پائے جانے والے انتشار کا مذاق اڑاتے۔ نیز ان میں سے بعض کے عدم اخلاص، بلکہ بددیانتی کو سامنے لاتے۔ لیکن یہ کام بہت کیا جا چکا ہے۔ اس سے ہماری 'انا' کی تشفی ہوتی ہے، ہماری بے تدبیری پر پردہ پڑ جاتا ہے لیکن ہم وہیں رہ جاتے ہیں جہاں تھے۔ ہمیں اپنے ساتھ خیر خواہی اور دیانت داری برتنی چاہیے۔ ہندوستانی پلورلزم کے تصور پر تنقید سے اس بات کی وضاحت تو ممکن ہے کہ مسلمان اس کے سلسلے میں کوئی ایجابی رویہ کیوں نہیں اختیار کر سکے لیکن اس طرح وہ خلا تو نہیں پر ہو سکے گا جو ہندوستانی مسلمان کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان ایک باعزت زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے بہتر مستقبل کے آرزومند ہیں جو ان کے روحانی تشخص سے ہم آہنگ ہو تو موجودہ صورت حال ان کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا طرز عمل سوچ سمجھ کر متعین کریں اور بے سوچے سمجھے آگے بڑھتے رہنے اور ہٹ دھرمی پر مبنی منفی رویہ اختیار کرنے سے باز رہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلے میں بعض امید افزا کوششیں ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ میں اس وقت چند منتشر مثالوں ہی پر اکتفا کروں گا۔ سب سے پہلے میں جماعت اسلامی ہند کی نئی پالیسی سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وہ سنگین مسائل جن سے ملک دوچار ہے اور ملت بھی، مثلاً فقر و فاقہ، مرض و جہالت، ظلم و ناانصافی، معاشی استحصال، اونچ نیچ، عدم رواداری، خدا ناشناسی، اخلاقی کمزوریاں اور آخرت سے غفلت وغیرہ۔ ان کے حل کے لیے عملی جدوجہد کی جائے گی۔" (دفعہ ۲ جماعت اسلامی ہند، پالیسی اور چار سالہ پروگرام اپریل ۷۵ء تا مارچ ۷۹ء)

سارے انسانوں کے درمیان مشترک مسائل کا یہ شعور اور ان مسائل میں اخلاقی امور کے پہلو بہ پہلو معاشی مسئلوں کو بھی شامل کرنا، اور وہ ایک دینی جماعت کی جانب سے اس تبدیلی کی غمازی کرتا ہے جو فکر اور انداز کار دونوں میں ہو رہی ہے۔ اس نئے شعور کا ایک ایسا ہی مظہر وہ قدم ہے جسے اسلامی تعلیم کے قدیم مرکز دارالعلوم دیوبند نے حال میں مسلم پرسنل لا میں اصلاحات کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے میں اٹھایا تھا۔[1] مسلم دانشوروں کی تقسیم ہند کے بعد پروان چڑھنے والی نوجوان نسل میں احتجاج اور رد کر دینے کی سیاست کی طرف سے جو بے اطمینانی پائی جاتی ہے وہ بھی اسی تبدیلی مزاج کا نتیجہ ہے۔ وہ 'اپنا کام خود کرو' کی نئی حکمت عملی کے علمبردار ہیں اور ساتھ ہی یہ چاہتے ہیں کہ مسلم مفادات کا جوڑ ملکی مفادات سے دکھا کر ان کی جانب توجہات مبذول کرانے اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کریں۔ اس تصویر کو مکمل کرنے کے لیے اس بے اطمینانی کو بھی نوٹ کرنا ضروری ہے جو ان مذہبی واعظین کی طرف سے پیدا ہو چلی ہے جو اس بدترین غربت اور بڑھتی ہوئی جہالت کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے جو مسلمان عوام میں پائی جاتی ہے۔ اس طرح ایک نئی فضا قائم ہو رہی ہے جو مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کی موجودہ صورت حال کے چیلنج کا سرگرم اور مثبت جواب دینے میں مددگار ثابت ہوگی۔

نتائج کا بہت کچھ انحصار اس بات پر ہے کہ ہندوستانی پلورلزم کس حد تک ایک عملی نظریے کی حیثیت سے ہندوستانی عوام کے مختلف طبقات کی مذہبی تہذیبی اور لسانی امنگوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یا یوں کہ وہ ہندوستانی ذہن میں سماجی اور معاشی تعمیر نو کے کام کی اولیت راسخ کر دے۔ نیز وہ مشترک مفادات کے اس دائرے کو بے اطمینانی کے اس الٹے چکر (BACK سے الگ کر کے محفوظ کر دے جو اوپر بیان کردہ مفادات کے دائروں میں پایا جاتا ہے۔ جو اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تو ہیں لیکن لازماً ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں

---

[1] اشارہ ہے اس مشاورتی اجتماع کی طرف جو دارالعلوم دیوبند میں مارچ ۷۶ء میں منعقد کیا گیا تھا۔ (مترجم)

حکومت کی نسبت سے اس کا تقاضا ہے کہ ایک فراخدلانہ پالیسی اختیار کی جائے، بلکہ جہاں ضرورت ہو مصالحت سے بھی کام لیا جائے، خواہ اس سے ابتداءً انتظامی مصارف میں اضافہ ہو یا معاشی کارکردگی میں کمی آئے۔

یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان میں دانشوروں کا ایک طبقہ ہندوستانی پلورلزم کے تقاضوں کو سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔ وہ اب بھی تہذیبی یکسانیت کا آرزومند نظر آتا ہے جس کے لیے وہ ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنا چاہتا ہے اور تعلیمی نظام کو مکمل قومیا لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ ایک علاقائی زبان کو اندرون ملک رابطے کی زبان کی حیثیت سے تمام لوگوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ حقائق سے ٹکرانے والے اور غلط اندازوں پر مبنی یہ ارادے ہندوستانی پلورلزم کے لیے بے حد نقصان دہ ہیں اور ہندوستانی عوام کے متعلقہ طبقوں کو ایسے طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس سے معاشی ترقی، سیاسی استحکام اور سماجی بہتری کی راہ میں رکاوٹ حائل ہوتی ہے۔ جب قوموں کی مذہبی، تہذیبی اور لسانی زندگی میں مداخلت کا سلسلہ رک جائے گا تو ان کا منفی رویہ خودبخود بدل جائے گا اور سب کے لیے مل جل کر قومی تعمیر کے کام میں بھرپور حصہ لینا ممکن ہو جائے گا۔

نوٹ:- جناب ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اپنے مضامین میں بہت سی ایسی باتیں لکھتے ہیں جو ان کے اپنے مخصوص مطالعہ اور ذاتی رائے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان باتوں سے ادارۂ زندگی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس مضمون میں بھی متعدد باتیں ایسی ہیں جن سے مدیر زندگی متفق نہیں ہے۔

سیدنا محمدؐ اور اُن کے ساتھی

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل و کرم اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت توراۃ میں اور انجیل میں۔ ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔

(الفتح: ۲۹)

نفقۂ اولاد ــــ فقہی نقطۂ نظر سے

(۲)

(مولانا جلال الدین عمری)

نقطۂ حنبلی حنابلہ کے نزدیک اولاد کے نفقہ کے وجوب کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اس میں کوئی جسمانی نقص (ناقص الخلقۃ) ہو جیسے اپاہج اور معذور وغیرہ یا یہ کہ وہ شرعاً غیر مکلف (ناقص الاحکام) ہو جیسے نابالغ بچہ اور مجنون۔ بلکہ اس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اولاد محتاج ہو اور باپ اس کے اخراجات برداشت کرنے کی حیثیت میں ہو۔ بالغ اولاد بھی کمانے کے قابل ہونے کے باوجود اگر اپنا معاشی بوجھ اٹھا نہیں پا رہی ہے تو باپ کا فرض ہے کہ وہ اس بوجھ کو اٹھائے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان رضؓ کی بیوی ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ حضرت ابوسفیان ان کا اور ان کے بچوں کا پورا خرچ نہیں دیتے، اس لیے کیا وہ ان کے مال سے اپنا اور بچوں کا خرچ ان کے علم کے بغیر لے سکتی ہیں آپ نے فرمایا:۔ خذی مایکفیك وولدك بالمعروف. دستور کے مطابق تم ان کے مال سے اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورت بھر لے لو) اس میں آپ نے بچوں کے بارے میں یہ تفصیل نہیں پوچھی کہ وہ بالغ ہیں یا نابالغ اور کمانے کے قابل ہیں یا نہیں؟ بلکہ کسی تفریق کے بغیر ایک عام اجازت دے دی کہ وہ اپنی اور بچوں کی ضروریات ان کے مال سے پوری کر سکتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ چاہے بالغ ہی کیوں نہ ہو اگر وہ حاجت مند ہے تو باپ کے مال میں اس کا حق ہے[1]

شوکانی کی رائے متاخرین میں امام شوکانی کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے نزدیک بچے کو اگر معاشی استقلال حاصل نہیں ہے تو باپ پر اس کا نفقہ واجب ہے چاہے وہ چھوٹی عمر والا ہو یا بڑی عمر والا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہند بنت عتبہ نے یہ سوال فتح مکہ کے بعد کیا تھا۔ اس وقت حضرت معاویہ کی عمر اٹھائیس ۲۸ سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے ہی بالغ ہو چکے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بالغ

[1] ابن قدامہ۔ المغنی ۹۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲

یا نابالغ ہونے کی تفصیل دریافت کیے بغیر یہ فیصلہ دیا کہ وہ اپنی اولاد کا نفقہ اپنے شوہر کے مال سے لے سکتی ہیں بلکہ گویا یہ دلیل ہے اس بات کی کہ بچے کے نفقہ کے وجوب کے لیے اس کا معذور یا نابالغ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اتنی بات کافی ہے کہ وہ حاجت مند ہو اور باپ اس کی ضرورت پوری کر سکتا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ہر وہ بچہ جو بالغ ہو جائے عملاً اس قابل نہیں ہوتا کہ اپنا معاشی بوجھ اٹھا سکے۔ اس لیے اس کے بالغ ہوتے ہی باپ اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری محسوس نہ کرے تو اس کو سخت زحمت اٹھانے پڑے گی اور بسا اوقات وہ دوسروں کا دست نگر ہو جائے گا۔ حنابلہ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے مسئلے کے اس پہلو کی تو رعایت کی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جس کو انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ بالغ ہونے کے بعد آدمی شرعی اور اخلاقی طور پر مکلف اور ذمہ دار قرار پا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنا معاشی بوجھ بھی خود ہی اٹھانا چاہیے — کسی اور شخص پر یہ بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا ورنہ اس سے بہت سی قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی

فقہ حنفی میں مسئلہ کے قانونی تقاضوں کو بھی سامنے رکھا گیا ہے اور عملی دشواریوں کی بھی رعایت کی گئی ہے چنانچہ ایک طرف واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ بچہ کے بالغ اور قابل کسب ہونے تک ہی باپ پر اس کی معاشی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بالغ اور کمانے کے قابل ہونے کے بعد اس کو خود اپنا معاشی بوجھ اٹھانا چاہیے۔ اس کے ساتھ دوسری طرف یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ بالغ اولاد کسی معذوری کی وجہ سے اپنے اخراجات اگر پورے نہ کر پائے تو باپ کو اس کی تلافی کرنی ہوگی۔ چنانچہ ابن عابدین کہتے ہیں۔

ولو قدر علی اکتساب مالا یکفیہ
فعلی ابیہ تکمیل الکفایۃ

(کسی معذوری کی بنا پر) بچہ اگر اپنی ضروریات سے کم ہی حاصل کر سکے تو باپ کے لیے اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہے۔

بالغ لڑکوں کا نفقہ کب ساقط ہوگا

فقہاء نے جہاں یہ کہا ہے کہ اولاد کے قابل کسب ہونے کے بعد باپ پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہوتا وہیں اس کی بھی تصریح کی ہے کہ اولاد کو بالغ ہونے کے بعد اپنی معاش کے لیے کوئی ناجائز اور معیار سے گرا ہوا کام اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ جب تک اسے کوئی حلال اور مناسب ذریعہ معاش نہ مل جائے۔ باپ کو اس کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ چنانچہ درمختار میں یہ بحث کرتے ہوئے کہ کس قسم کی اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہوتا ہے۔ لکھا ہے۔

ومن یلحقہ العار با لتکسب[2]

[1] ملاحظہ ہو: شوکانی: نیل الاوطار ۶/۱۳۱

[2] ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/۶۲۵

(اس اولاد کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے جس کو کمانے میں عار لاحق ہو۔

ابن ہمام کے نزدیک یہ بھی ایک حقیقی عذر ہے کہ آدمی کے اونچے گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے لوگ اس سے معمولی اور محنت مزدوری کا کام لینے کے لیے تیار نہ ہوں ایسی صورت میں بھی باپ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

اذا کان من ابناء الکرام ولا یجد
من یستاجرہ فھو عاجز[1]

اگر اس کا تعلق شرفاء کی اولاد سے ہو اور
اس کو کوئی ایسا شخص نہ ملے جو اسے اجرت پر رکھے
تو وہ بھی عاجز ہی سمجھا جائے گا۔

فقہ شافعی میں صراحت ہے کہ اولاد کا نفقہ باپ پر اس وقت بھی واجب ہے جب کہ اس کو مناسب اور معقول ذریعہ معاش نہ ملے۔

وعجز الفرع عن کسب یلیق بہ[2]

اولاد کا مناسب کمائی سے عاجز ہونا بھی باپ
پر نفقے کے وجوب کا ایک سبب ہے۔)

ہاں اگر کسی ایسے ذریعہ معاش کے ملنے کے باوجود جو اس کے معیار کے مطابق بھی ہو اور جس میں کوئی شرعی قباحت بھی نہ ہو، وہ اسے اختیار نہ کرے تو یہ غلط ہوگا اور اسے اس کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

فان قدر علی کسب ولم یکتسب کلفہ
ان کان حلالا لائقا بہ[3]

اگر وہ کمانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نہ
کمائے تو باپ اس کو مجبور کرے گا بشرطیکہ جو کام
ہو وہ حلال اور اس کے لائق ہو۔

لڑکیوں کا نفقہ

لڑکیوں کا معاملہ لڑکوں سے مختلف ہے۔ بالغ ہونے کے بعد ان کے نفقہ کے وجوب کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ معذور ہوں یا کوئی مناسب ذریعہ معاش نہ رکھتی ہوں بلکہ وہ صحیح و سالم اور تندرست ہوں تو بھی ان کا نفقہ واجب ہے۔ ان کے نفقے کے وجوب کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اس کی محتاج ہیں۔ کاشانی لکھتے ہیں۔

تجب علیہ نفقۃ اولادہ ۔۔۔ الاناث
الفقیرات وان کن صحیحات[4]

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے

مجرد الانوثۃ عجز[5]

محض عورت ہونا ایک عجز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عورت کا عورت ہونا ایک طرح کا عذر ہے جو اس کو معاشی تگ و دو سے باز رکھتا ہے۔ وہ

---

[1] ابن الہمام: فتح القدیر ۳/ ۳۴۴

[2] سلیمان الجمل: حاشیۃ الجمل علی شرح المنہج ۴/ ۵۱۲

[3] ایضاً

[4] کاشانی: بدائع الصنائع ۴/ ۳۵

[5] ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۹۲۵

اس حیثیت میں نہیں ہوتی کہ آزادانہ اپنی معاش حاصل کر سکے۔ اس لیے وہ چاہے بالغ، تندرست اور محنت مشقت کرنے کے قابل ہی کیوں نہ ہو معذور سمجھی جائے گی چنانچہ مبسوط میں ہے :۔

والذی قلنا فی الصغار من الاولاد کذالک فی الکبار اذا کن اناثا لان النساء عاجزات عن الکسب واستحقاق النفقۃ لعجز المنفق علیہ من کسبہ [1]

جو حکم ہم نے کم سن اولاد کا بیان کیا ہے وہی بڑی اولاد کا بھی ہے۔ اگر اولاد اناث (لڑکیاں) ہوں۔ اس لیے کہ عورتیں کمانے سے عاجز ہوتی ہیں اور نفقہ کا استحقاق اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ جس پر خرچ کیا جا رہا ہے وہ کمانے سے عاجز ہے

اس کا بھی امکان ہے اور آج کل یہ امکان بہت بڑھ گیا ہے کہ لڑکی معذور کے حکم میں نہ ہو اور وہ بآسانی اپنی معاش خود سے حاصل کر سکتی ہو تو سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت بھی باپ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اس کا نفقہ برداشت کرے اور اسے کسی کام پر نہ لگائے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے :۔

ولیس لہ ان یواجرھن فی عمل ولا خدمۃ وان کان لھن قدرۃ۔

[1] سرخسی: المبسوط: ۵/۲۲۳

[2] ابن الہمام: فتح القدیر ۳/

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ملازمت یا کوئی دوسرا ذریعہ معاش اختیار کرنا عورت کے لیے ناجائز ہے بلکہ اس کا تعلق ان ذرائع معاش سے ہے جن میں اس کو کسی اجنبی شخص کے ساتھ تنہا رہنا پڑے اور اس کے اخلاق کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔ چناں چہ درمختار میں اس کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے۔

لان المستاجر یخلو بہا وذالک سیئ فی الشرع [1]

اس لیے کہ اجرت پر رکھنے والا اس کے ساتھ تنہائی میں (بھی) ہوگا اور یہ شریعت کی رو سے ایک بری بات ہے

لیکن اگر لڑکی کوئی گھریلو صنعت جانتی ہے یا کوئی دوسرا ایسا ذریعہ معاش اختیار کر سکتی ہے جس میں اس کے اخلاق کو کوئی خطرہ نہ ہو تو باپ سے اس کی معاشی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی اور اس کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اس ذریعے کو اختیار کرنا ہوگا۔ ہاں اگر اس سے اس کے اخراجات پورے نہ ہوں تو یہ باپ کی ذمہ داری ہے کہ اس کمی کی تلافی کرے۔ [2]

بہر حال لڑکی تھوڑے بہت نفقہ کی حاجت مند ہو یا پورے کے پورے نفقہ کی، جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے باپ کے لیے اس کی اس حاجت کو پورا کرنا ضروری ہے۔

[1] ابن عابدین: ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۸۸۳

[2] ایضاً ص ۹۲۲

شادی کے بعد شوہر اس کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا اور باپ سے اس کا وجوب ختم ہو جائے گا، ہاں اگر شوہر طلاق دے دے تو دوبارہ اس کا نفقہ باپ پر واجب ہو جائے گا۔ ابن ہمام کہتے ہیں

فالاناث علیہ نفقتھن الی ان یتزوجن اذا لم یکن لھن مال.......
واذا طلقت وانقضت عدتھا عادت نفقتھا الی الاب [1]

لڑکیوں کے پاس اگر مال نہیں ہے تو شادی ہونے تک ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔ (شادی کے بعد شوہر پر ان کے نفقہ کی ذمہ داری ہوگی) لیکن اگر طلاق ہو جائے اور وہ عدت پوری کرلیں تو دوبارہ باپ پر ان کا نفقہ واجب ہو جائے گا۔

فقہ شافعی میں بھی یہی مسلک اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ لڑکی بالغ ہونے اور مناسب رشتے کے ملنے) کے بعد بھی شادی کے لیے آمادہ نہ ہو تو کیا اس صورت میں بھی باپ پر اس کا نفقہ واجب ہونا چاہیے یا نہیں [2] لیکن یہ سوال غیر اہم اور غیر متعلق ہے۔ اس لیے کہ لڑکی کی شادی کے بارے میں اس پہلو سے سوچنا صحیح نہیں ہے کہ وہ باپ کے سر سے بوجھ اتارنے کا ایک ذریعہ ہے۔ شادی لڑکی کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ اگر کسی وجہ سے اس کے لیے آمادہ نہ ہو تو اس کا کھانا کپڑا بند کر کے اس کے لیے اس کو مجبور کرنا کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ کہ جن اسباب کی بنا پر لڑکے اور لڑکی کے نفقے کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ وہ اس وقت بھی موجود رہیں گے جب کہ وہ شادی سے انکار کر دے سیدھی بات یہ ہے کہ معاش کا حصول اگر اس کی طاقت سے باہر ہو یا یہ کہ اس دوڑ دھوپ میں اپنی عفت و عصمت اور اخلاق کی حفاظت اس کے لیے دشوار محسوس ہو رہی ہو تو باپ پر اس کا نفقہ واجب ہونا چاہیے۔ اس طرح کا کوئی عذر اس کے پاس نہ ہو تو جیسا کہ گزر چکا۔ بالغ بیٹے کی طرح باپ پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

کافر اولاد کا نفقہ

اولاد کے نفقہ کی اس قدر اہمیت ہے کہ ان کا دین و مذہب باپ کے دین و مذہب سے جدا ہو تو بھی فقہاء کے نزدیک باپ پر ان کا نفقہ واجب ہے۔ اس مسئلے میں فقہ حنفی کا مسلک یہ ہے کہ آدمی کے محارم (وہ رشتہ دار جن سے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا) اگر حاجت مند ہوں تو ان کا نفقہ اس پر اس حد تک واجب ہے جس حد تک وہ ان کی میراث کا حق دار ہو سکتا ہے لیکن اگر ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہو تو نفقہ واجب نہیں رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختلاف دین کی وجہ سے چونکہ وراثت کا حق ختم ہو جاتا ہے اس لیے نفقہ کا وجوب بھی باقی نہیں رہتا۔

[1] ابن الہمام فتح القدیر ۳/۳۴۴

[2] ابو سلیمان الجمل: حاشیۃ الجمل علی شرح المنہج ۴/۵۱۲

اس اصول کے تحت کافر والدین کا نفقہ مسلمان اولاد پر اور مسلمان اولاد کا نفقہ کافر والدین پر واجب نہیں ہونا چاہیے لیکن دین و مذہب کے اس اختلاف کے باوجود نفقہ کا وجوب باقی رہتا ہے۔ کیونکہ والدین اور اولاد اور اسیطرح بیوی کے نفقہ کے وجوب کی بنیاد وراثت نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد وہ خاص طرح کا تعلق ہے جو آدمی کو ان سے ہوتا ہے۔ بیوی کا نفقہ 'عقد' کی وجہ سے لازم آتا ہے۔ اس لیے جب تک 'عقد' باقی ہے نفقہ کا وجوب بھی باقی رہے گا۔ چاہے شوہر مسلمان اور زوجہ کافرہ ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں تک والدین کا تعلق ہے قرآن مجید نے ان کے بارے میں صراحت کر دی ہے کہ وہ مشرک ہوں تو بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے جس سلوک کے اندر نفقہ بھی شامل ہے۔ اس لیے اختلاف دین کی وجہ سے ان کے نفقہ کا وجوب ساقط نہیں ہوگا۔[1]

باپ کے مفہوم میں دادا اور پردادا سب آجاتے ہیں اور اولاد ہی کا حکم پوتوں اور پرپوتوں وغیرہ کا ہے۔ چنانچہ قدوری میں ہے:۔

ولا تجب النفقة مع اختلاف
الدين الا الزوجة والابوين والاجداد
والجدات والولد وولد الولد

افراد کے درمیان دین کا اختلاف پایا جائے تو کسی کا نفقہ کسی پر واجب نہیں ہوتا۔ اس سے بیوی، ماں باپ، دادا، دادی، اولاد اور پوتے مستثنیٰ ہیں (کہ ان کا نفقہ اختلاف دین کے باوجود واجب ہوتا ہے

بچہ کے نفقہ کے وجوب کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شخصیت باپ کی شخصیت کا جز ہے۔ جس طرح اختلاف دین کی وجہ سے باپ کا اپنا نفقہ ختم نہیں ہو جاتا اسی طرح اس اولاد کا نفقہ بھی ساقط نہیں ہوتا۔ ہاں والدین اور اولاد محارب ہوں، یعنی ان کا تعلق ایسی قوم سے ہو جو اسلامی ریاست سے برسر جنگ ہو تو قرآن نے صراحت کر دی کہ ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا جائے گا اس۔ اس صورت میں ان کے نفقہ کا استحقاق بھی ختم ہو جائے

دوسرے فقہاء کے نزدیک بھی اولاد اور والدین نفقہ اختلاف دین کے باوجود واجب ہے۔ چنانچہ شافعی میں صراحت ہے:۔

يلزمه نفقة الوالد وان علا والولد
وان سفل وان اختلف دينهما[2]

آدمی پر باپ اور اس سے اوپر کے افراد (دادا پردادا وغیرہ) اور بچہ اور اس سے نیچے کے افراد (پوتے پرپوتے وغیرہ) کا نفقہ واجب ہے۔ چاہے ان کا دین اس کے دین سے مختلف ہو کیوں نہ ہو۔

بچوں کی ماں کو اگر یہ شکایت ہو کہ ان کا باپ ان نفقہ بالکل نہیں دے رہا ہے یا اس میں کمی کر رہا ہے تو اپنی طرف سے نفقہ کا تعین کر کے باپ کو حکم دے گا کہ

[1] ہدایہ: ۲/۴۲۶

[2] نووی، منہاج الطالبین، ۴/۴۸

اسے ماں کے حوالے کر دے تاکہ وہ بچوں پر خرچ کرے۔ اگر بچوں کا باپ اس معاملے میں ماں پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرے کہ وہ نفقہ پورا پورا خرچ کرے گی تو اس کے اس عدم اعتماد کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اس لیے کہ ماں کو بچوں کے سلسلے میں اصلاً امین ہی سمجھا جائے گا جب تک کہ دلائل سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ فی الواقع خائن ہے اگر اس کا خائن ہونا ثابت ہو جائے تو قاضی نفقہ کسی قابل اعتماد آدمی کے حوالے کر دے گا تاکہ وہ یکمشت ماں کو نہ دے بلکہ صبح و شام دیتا رہے یا یہ کہ وہ خود بچوں پر خرچ کرے۔

بالغ اولاد اپنے نفقہ کی مالک ہے

بالغ اولاد جو نفقہ کا مستحق ہو۔ اگر باپ سے اپنا نفقہ حاصل کر کے خود سے خرچ کرنا چاہے تو اسے اس کا حق ہے۔ اس لیے اس کی درخواست پر قاضی باپ سے کہے گا کہ اس کا نفقہ اس کے حوالے کر دے۔ باپ بجائے نفقہ اس کے حوالے کرنے کے خود سے اس کی ضروریات پوری کرنا چاہے اور اولاد اس کے لیے آمادہ نہ ہو تو باپ کی بات نہیں مانی جائے گی۔

ل ابن نجیم: البحر الرائق ۴/۲۰۲۔ ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/۹۲۴

نئی مطبوعات

صبر مجسّم — حضرت ایوب علیہ السلام

(مولانا محمد سلیمان قاسمی، فرخ آبادی)

حضرت ایوب علیہ السلام کا تذکرہ بار بار پڑھنا چاہیے اور ان آیات میں غور و فکر کرنا چاہیے جن میں آں حضرت کا تذکرہ ہے کیونکہ قرآن نے آپؑ کے تذکرے کو عبادت گذار خدا پرستوں اور عقل و ہوش رکھنے والے دانا بینا لوگوں کے لیے تذکیر اور نصیحت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ انہیں آیات میں ان خوبیوں اور کمالات کو بھی تلاش کرنا چاہیے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ذکریٰ اور نصیحت قرار دیا ہے:۔

وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ۝

(الانبیاء)

(اور غور کرو اس واقعہ پر) جبکہ ایوبؑ نے اپنے رب کو پکارا مجھے دکھ لگ گیا ہے اور تو سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے تو ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اس کا دکھ دور کر دیا اور اس کے اہل و عیال اسے واپس دے دیے اور ان کے ساتھ ویسے ہی اور دیے اپنی جانب سے رحمت کے طور پر (اور یہ سب کچھ) نصیحت ہے عبادت گذاروں کے لیے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ وَخُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ (ص)

اور ہمارے بندے ایوب کا تذکرہ کرو جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا، مجھے تکلیف اور دکھ کے ساتھ شیطان لگ گیا ہے (تب ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار (اس نے ایسا ہی کیا اور ایک چشمہ ابل پڑا۔ ہم نے کہا) یہ نہانے کی ٹھنڈی جگہ ہے اور مشروب (بھی ہے) اور ہم نے اس کو اس کے اہل وعیال دیے اور ان جیسے ان کے ساتھ اپنی جانب سے رحمت کے طور پر (مزید دیے) اور اس میں) ہوشمندوں کے لیے نصیحت ہے۔ اور اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے مار، اور قسم نہ توڑ۔ ہم نے اس کو صابر پایا۔ کیا ہی اچھا بندہ، یقیناً وہ بار بار رجوع کرنے والا تھا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کس قوم اور نسل سے تھے؟ کس دور اور کس زمانے میں گذرے ہیں ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ باتیں ضروری ہوتیں تو قرآن یا کم از کم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے میں صراحت سے نہ سہی اشارۃً ہی سے کچھ نہ کچھ ضرور وضاحت فرماتے۔ البتہ سورۂ نساء اور سورۂ انعام سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اللہ کے نبی تھے اور ابراہیمؑ کی نسل سے تھے نیز سورۂ انبیاء اور سورۂ صٓ کی مذکورہ آیات میں غور وفکر اور تدبر سے ذیل کی باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ اللہ والوں اور خدا رسیدہ لوگوں خصوصاً نبیوں اور رسولوں کے تذکرے، سیرتیں اور سوانح عمریاں پڑھنا اور ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ان سے اپنی زندگیوں کے لیے سبق اور نصیحتیں اور عبرتیں اخذ کرکے اپنی دنیا اور آخرت بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔

۲۔ ہر مصیبت، دکھ درد اور تکلیف میں صرف اللہ ہی کو پکارنا چاہیے کیونکہ صرف وہی پالنہار اور پروردگار ہے ساری ضرورتیں صرف وہی پوری کرتا ہے اور وہی پوری کرسکتا ہے۔ حاجت روا اور مشکل کشا صرف وہی ہے دعائیں سننے والا، نفع نقصان پہنچانے والا، حامی وناصر اور فریادرس صرف وہی ہے۔ اس لیے صرف اسی کو پکارنا چاہیے اس کے علاوہ دوسرا کوئی ان کاموں میں سے کچھ بھی کرنے کی سکت نہیں رکھتا اس لیے کسی اور کو پکارنا صرف غلط اور گمراہی نہیں ہے بلکہ بے فائدہ بھی ہے

۳۔ اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب ہے اپنے بندوں کی ہر حالت سے بخوبی واقف ہے اس لیے اس کے سامنے دکھوں کی تفصیل اور مصیبتوں کی فہرست رکھنے کی ضرورت نہیں ہے صرف یہ التجا کافی ہے کہ خدایا مجھے مصیبتوں نے گھیر لیا ہے شیطان پیچھے پڑ گیا ہے۔ میں مصیبت زدہ ہوں اور اے رب تو رحیم ہے، رحمٰن ہے اور ارحم الراحمین ہے۔

۴۔ جب اللہ کا کوئی مضطر بندہ اللہ کی صفات کو وسیلہ بنا کر اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار سنتا اور اس کی التجا کو قبول فرماتا ہے، اس کی مصیبتوں کو دور کرتا ہے نقصانات پورے کر دیتا ہے، بلکہ اپنی رحمت سے اور زیادہ نوازتا ہے۔

(۵) اللہ کے نبیوں اور ان کے سچے پیروؤں کی زندگیاں نصیحتوں اور عبرتوں کا ذریعہ ہیں لیکن ان سے فائدہ صرف خدا پرستوں، عبادت گذاروں اور عقل و ہوش سے کام لینے والوں ہی کو پہنچتا ہے جو شخص عقل و ہوش سے کام لے گا۔ وہی خدا پرست بنے گا اور عبادت گذاری کی روش اختیار کرے گا اور پیغمبروں کی زندگیوں سے اپنی زندگی کے لیے سبق اور نصیحتیں اخذ کرے گا۔

(۶) ہر اچھے کام کو اللہ کی طرف اور برے کام کو شیطان کی طرف منسوب کرنے کا ادب نبیوں کے اسوہ اور قرآن کی تعلیم سے ملتا ہے۔ شیطان مصیبتوں میں مبتلا کرنے کی طاقت اگرچہ نہیں رکھتا ہے لیکن مصائب میں مبتلا ہونے والوں کو طرح طرح کے وسوسوں میں ضرور مبتلا کر سکتا ہے اور ایک خدا پرست کے لیے وسوسے خود مصیبت سے کم نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کو کچھ زیادہ بڑی مصیبت تصور کرتا ہے۔

(۷) شیطان کے وسوسوں اور شرارتوں کا توڑ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے التجا اور دعا کی جائے اور اسی کی طرف بار بار رجوع کیا جائے اور اسی سے پناہ مانگی جائے۔

(۸) اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے لیے غیب سے ایسے اسباب فراہم کر دیتا ہے جو مصیبت اور دکھ دور ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

(۹) اللہ کے محبوب بندے اگر قسم کھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری فرما دیتا ہے یا اس کے لیے کوئی حیلہ اور ذریعہ پیدا فرما دیتا ہے۔

(۱۰) کسی گناہ سے بچنے کے لیے شرعی حیلہ کرنا درست ہے وہ بھی کسی شدید مجبوری کی بنا پر ہی ہونا چاہیے۔ لیکن کسی شرعی تقاضے، فرض، واجب یا سنت سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ کرنا انتہائی گھناؤنا فعل ہے۔ مومنانہ کردار سے اس کا کوئی تعلق نہیں البتہ منافقانہ کردار ضرور شریعت کے احکام سے بچنے کے لیے حیلے ڈھونڈھتا اور بہانے تلاش کرتا پھرتا ہے۔

اوصاف

حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اس لیے آپ کے عقائد و نظریات اور افکار پیغمبرانہ تھے آپ کا اخلاق کردار اور سیرت آپ کی معاشرت اور معیشت اور سیاست، آپ کا نصب العین اور پیغام، آپ کا طریقہ کار اور طرز تبلیغ آپ کی پرائیوٹ زندگی اور پبلک لائف۔ آپ کی انفرادی زندگی کے گوشے اور اجتماعی زندگی کے میدان، غرضکہ آپ کا سب کچھ پیغمبرانہ تھا۔ لیکن آپ کی زندگی کے ابھرے ہوئے اور نمایاں پہلو اور امتیازی اوصاف وہی ہیں جن کی طرف قرآن نے ہمیں متوجہ فرمایا ہے۔ اور وہ تین ہیں:۔

۱۔ صبر:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ انا وجدناہ صابراً۔ ہم نے اس کو صابر (صبر کرنے کا عادی) پایا۔ حضرت ایوب علیہ السلام ہمہ پہلو صابر تھے۔ طاعات پر صبر، معاصی سے صبر، مصائب پر صبر، ہر اعتبار سے آپ صابر تھے۔

طاعات پر صبر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے

ختلف پہلوؤں کے لیے جو احکام اور ہدایات دی ہوں ن کو اپناتے ان پر عمل کرتے اور اپنی زندگی کو ان کے طابق ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کرنا۔ اس سلسلے ں جو مشقتیں اور مصیبتیں آئیں انہیں جھیلنا اور برداشت کرنا اعتیں نفس پر بار اور گراں گذریں تب بھی ان کو ہنسی وشی انجام دینے کی کوشش کرنا۔

معاصی اور گناہوں سے صبر یہ ہے کہ گناہوں میں جو لذت لطف اور مسرت نفس کو محسوس ہوتی ہے اور جن خواہشات ور شہوات کی کشش انسان کو گناہوں میں مبتلا کرتی ہے ان سب سے دست کش رہنا اور نفس کی باگیں کھینچتے رہنا اپنی اگ نفس کے ہاتھ میں دینا بے صبری اور نفس کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھنا صبر ہے۔

مصائب اور شدائد پر صبر یہ ہے کہ خدا کے احکام کی برداری میں اس کی نواہی سے بچنے میں اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے سلسلے میں اس کے دین کو قائم کرنے کی راہ میں س کے دین کی قولی اور عملی شہادت دینے میں غرضیکہ اہ سبیل اللہ جو بھی مصیبتیں آئیں، شدتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے ان سب کو جھیلنا اور انگیز کرنا۔ یہ سب مصائب پر صبر ہے۔

مومن کے لیے مومنانہ زندگی میں جو کچھ بھی پیش آئے کوئی کانٹا چبھے، کوئی چھالہ یا آبلہ پڑے، پھانس لگے، نکسیر پھوٹے یا دار و رسن اور طوق و سلاسل کی نوبت آئے جسمانی مرض ہو یا روحانی تکلیف اور ذہنی اذیت سب کچھ فی سبیل اللہ ہے اور ہر ایک پر صبر اس کے لیے باعث اجر ہوتا ہے

غرضیکہ حضرت ایوب علیہ السلام کی سب سے زیادہ نمایاں صفت صبر کی صفت تھی آپ بیمار پڑتے ہیں اور بیماری بھی ایسی کہ پورا جسم آبلوں سے بھر جاتا ہے۔ پورا بدن پھوڑوں سے چھلنی ہو جاتا ہے۔ متعلقین حتیٰ کہ اولاد تک آپ سے گھن کرنے لگتی ہے اور بیوی کے علاوہ تمام اعزہ اور اقارب، دوست اور احباب آپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ مال و دولت اور جائداد وغیرہ پہلے ہی تباہ ہو جاتی ہے۔ لیکن کسی حالت میں بھی صبر کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔ ہر حالت میں صبر و شکر کا ثبوت دیتے ہیں اور اللہ سے لو لگائے رہتے ہیں، روتے ہیں تو اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں تو اس کے آگے، عرض و معروض کرتے ہیں تو اس سے، توبہ و استغفار کرتے ہیں تو اس سے پکارتے ہیں تو اسے پناہ مانگتے ہیں تو اس سے لیکن اس آہ و زاری میں بھی بے صبری کے داغ سے اپنا دامن داغدار نہیں ہونے دیتے۔ اے اللہ ہمیں بھی حضرت ایوب علیہ السلام کے صدقے میں صبر سے نواز دے۔

۲۔ عبدیت:۔ دوسری نمایاں صفت آپ کے اندر عبدیت کی صفت تھی۔ آپ اپنی زندگی کے لمحات اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں گذارتے تھے۔ صرف اللہ ہی کی پرستش کرتے تھے اور آپ نے صرف اسی کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو دے دیا تھا۔ دوسرے کسی کی ایسی اطاعت و فرماں برداری جس میں اللہ کی نافرمانی ہو آپ

جائز شمار نہیں کرتے تھے۔ رات دن اس کی بندگی میں گذارتے تھے۔ صبح و شام اسی کی عبادت میں لگے رہتے تھے سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا بولنا، کھانا پینا، رہنا سہنا، رفتار گفتار، چلت پھرت، غرضکہ آپکا اوڑھنا بچھونا، سب کچھ اللہ ہی کے لیے تھا، اسی کی اطاعت میں تھا، اسی کی خوشنودی کے لیے تھا۔ بس یوں سمجھیے اللہ ہی کو آقا سمجھ کر اس کے سامنے غلامانہ زندگی گذارتے تھے۔ آپ نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کردیا تھا۔ کوئی حرکت و سکون اس کی مرضی کے خلاف اختیار نہیں فرماتے تھے۔ یہ تھی آپ کی شان عبدیت ـــ تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو نِعْمَ الْعَبْدُ "اچھا بندہ" یا "کیا ہی اچھا بندہ" کہہ کر پکارا ہے۔

۳۔ انابت:۔ تیسری نمایاں صفت آپ کے اندر انابت تھی۔ یعنی بار بار اللہ کی طرف رجوع کرنے کی صفت ـــ آپ فکر ہی رہنمائی اللہ ہی سے حاصل فرماتے۔ اخلاقی ضرورت میں اس کی طرف رجوع فرماتے۔ معیشت و سیاست کی الجھنوں میں بھی اسی کو یاد کرتے آپ کی زبان توبہ و استغفار سے تر رہتی، ہر مصیبت اور ہر دکھ درد میں، ہر رنج و راحت میں، ہر حزن و ملال میں اس کو اور صرف اسی کو یاد کرتے۔ غرضکہ ہر حالت میں اسی سے لَو لگاتے، اسی سے امیدیں وابستہ رکھتے، اسی سے مغفرت کے طالب رہتے اور اسی سے توبہ کرتے۔ اسی لیے اللہ نے آپ کو اوّاب کے لقب سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حضرت ایوب علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العٰلمین۔



کس ادب کو اسلامی ادب کہیں گے

(سید احمد قادری)

"میرٹھ ڈویزن کے اجتماع میں ۱۴ر مارچ [illegible] کو ایک ادبی نشست بھی رکھی گئی تھی۔ یہ مختصر مضمون اسی نشست میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا لیکن عین وقت پر میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں اس نشست میں شریک نہیں ہو سکا اور یہ مضمون اس میں پڑھا نہیں جا سکا۔ اب اسی مضمون میں تھوڑا سا اضافہ کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

بہت اختصار کے ساتھ صرف چار باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

۱۔ اسلامی ادب کا مقصد اور تحریک اسلامی کے لیے اس کی اہمیت۔

۲۔ اسلامی ادب کی تعریف کیا ہے؟

۳۔ فکر اور فن کی بحث میں میرا نقطۂ نظر

۴۔ تحریک اسلامی کی جدوجہد میں ادبی محاذ کا حال کیا ہے اور کیوں ہے؟

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو زبان دی ہے اور نطق کی جو قوت عطا کی ہے وہ اظہار مافی الضمیر کا ایک ذریعہ ہے خود کوئی مقصد نہیں ہے اور یہ بات صرف ادب و شعر کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نثر اور نظم دونوں پر صادق آتی ہے۔ ہم جو تقریریں کرتے ہیں جو مقالات لکھتے ہیں، جو کتابیں مرتب کرتے ہیں اور ان میں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ خود کوئی مقصد نہیں ہوتے بلکہ کسی مقصد کسی خیال کو دوسروں تک پہنچانے کے محض وسائل ہوتے ہیں۔ اس لیے اصل سوال یہ ہے کہ اسلامی ادب کا مقصد کیا ہے؟ اسی کو سامنے رکھ کر اسلامی ادب کی صحیح تعریف کی جا سکتی ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کی دینی اہمیت بھی واضح ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ہمیں اسلامی ادب کا مقصد واضح طور پر ملتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آیت والشعراء یتبعھم الغاوون نازل ہوئی تو حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم روتے ہوئے

حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی شعر گوئی کے بارے میں فکر مند ہوکر اس آیت کا مطلب پوچھا۔ مقصد سوال یہ تھا کہ کیا وہ لوگ بھی اس آیت کے مصداق ہیں؟ حضورؐ نے اس وقت کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد اِلاَّ الذین اٰمنوا و عملوا الصلحٰت سے آخر تک کی آیت نازل ہوئی تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے ان ممتاز شعراء کو بلوا کر انہیں یہ آیت سنائی ۔ (از تفسیر مظہری و روح المعانی) اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان شعراء کو یہ جواب عطا فرمایا کہ تم لوگ الشعراء یتبعھم الغاوون کے مصداق نہیں ہو۔ اس آیت نے ان شعراء کو جو مومن صالح اور اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے ہوں نہ صرف یہ کہ مستثنیٰ قرار دیا بلکہ یہ اشارہ بھی دیا کہ اگر مشرک شعراء اللہ و رسول کی ہجو کر کے مسلمانوں پر ظلم کریں تو مومن شعراء ان کے جواب میں ان کی ہجو بھی کر سکتے ہیں۔ ان آیتوں کو پوری طرح سامنے رکھنے کے لیے ہم ان کے الفاظ اور ترجمے نقل کرتے ہیں ۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ (الشعراء، آخری رکوع)

رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں ۔

ان آیتوں کے تحت بعض مفسرین کرام نے شعر و شاعری اور اس کے حسن و قبح پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ہم اس مختصر مقالے میں ان سب کو پیش نہیں کر سکتے۔ تفسیر مظہری اور تفسیر روح المعانی وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم یہاں صرف وہ تشریحات نقل کرتے ہیں جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن ج ۳ میں کی ہیں ۔

پہلی آیت والشعراء کے تحت انھوں نے لکھا ہے

"یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اخلاق، عادات، خصائل اور افتاد مزاج میں ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمہیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے؟ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا

احساس ہے۔ برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے اور زبان جب کھلتی ہے تو خیر ہی کے لیے کھلتی ہے۔ شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا سب سے زیادہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصد عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں زبان بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوع سخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں کہیں جنسی مواصلت کی حکایات بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں کہیں کسی کی ہجو اڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت، اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگی جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ پھرتے رہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے والے اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوانی قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد و نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق و امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی شخص حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان نگل کر یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گرد جمع ہونے والے لوگ اسی قبیل کے ہیں جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

دوسری آیت الم تر کے تحت لکھتے ہیں :۔

شعر گوئی کی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوت گویائی صرف کرتے ہوں بلکہ ان کا توسن فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر تیئی رو ان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کرتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات

کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صداقت بھی ہے کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اس کی عزت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت مادہ پرستی اور روحانیت، حسن اخلاق اور بداخلاقی پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائیں گے۔ شعراء کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف ہو اس کے دماغ میں آخر یہ کیسے بات کیسے اتر سکتی ہے کہ اس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے اور جس نے حق و راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

...... جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے یا شراب نوشی کے یا قبائلی نفرت اور جنگ و جدل کے یا نسلی فخر و غرور کے، نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لان یمتلئ جوف احدکم قیحا خیر لہ من ان یمتلئ شعرا (تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے) تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپ کا ارشاد تھا کہ ان من الشعر لحکمۃ (بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں) امیۃ بن ابی الصلت کا کلام سنکر آپ نے فرمایا امن شعرہ وکفر قلبہ (اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے)

ایک مرتبہ ایک صحابی نے سو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سنائے اور آپ فرماتے گئے ھیہ اور سناؤ۔

تیسری آیت وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ کی یوں تشریح کرتے ہیں:-

یہ شاعروں کی ایک اور خصوصیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کی عین ضد تھی۔ حضور کے متعلق

آپ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ آپ کے قول اور عمل کی مطابقت ایک ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گرد و پیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے یہاں کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے کی اور۔ سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہوگا مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے بے نیازی اور قناعت و خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔"

چوتھی آیت اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں شعراء کی عام مذمت سے جو اوپر بیان ہوئی، ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں:۔

اول یہ کہ وہ مومن ہوں یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں

دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔

تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں اپنے عام حالات و اوقات میں بھی اور اپنے کلام میں بھی، یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہے مگر کلام سراسر رندی و ہوسناکی سے لبریز۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جا رہی ہوں مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یادِ خدا کے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں، بلکہ خدا شناس، خدا دوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے۔

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہجو نہ کریں گے نہ ذاتی یا نسلی و قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گھگیاتے ہی رہنا اور ظلم کے مقابلے میں نیاز مندانہ معروضات ہی پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہے۔

"ظلم کرنے والوں" سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے ترا سر ہٹ دھرمی کی راہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شاعری اور کہانت اور ساحری اور جنون کی تہمتیں لگاتے پھرتے تھے تاکہ ناواقف لوگ آپ کی دعوت سے بدگمان ہوں اور آپ کی تعلیم کی طرف توجہ دیں ۔"

ان آیتوں کی اس تشریح نے شعر و شاعری کے حسن و قبح اور اچھے اشعار اور برے اشعار کے فرق و امتیاز پر دن کی روشنی ڈال دی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ شعرار کی عام مذمت سے کس قسم کے شعرار مستثنیٰ ہیں ۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضؓ نے حضورؐ سے کہا "یا رسول اللہ شعر کے بارے میں اللہ نے جو کچھ نازل فرمانا چاہا" نازل فرما دیا ۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا اب شاعری ترک کر دی جائے ۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا :۔

ان المومن یجاهد بسیفه ولسانه
والذی نفسی بیده لکانما ترمونهم
به نضح النبل [1]

مومن اپنی تلوار اور زبان دونوں سے جہاد کرتا کرتا ہے اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے گویا تم لوگ اپنے اشعار سے ان پر تیروں کی باڑھ مارتے ہو ۔

حضور رسالت مآبؐ کا یہ ارشاد پوری وضاحت ایک طرف یہ بتا رہا ہے کہ ادب شعر خود کوئی مقصد نہیں حصول مقصد کا وسیلہ ہے اور دوسری طرف یہ بتا رہا کہ اسلامی ادب و شعر کا مقصد کیا ہے؟ یعنی مومن جہاد بالسیف کا جو مقصد ہے وہی اس کے جہاد باللسا بھی ہے ۔ جس مقصد کے حصول کا ذریعہ تلوار ہے اسی کے حصول کا ذریعہ زبان بھی ہے ۔ حضرت کعب کے اور حضورؐ کے جواب کو اس تاریخی ماحول میں دیکھنا ہے جو آپؐ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد پیدا اس وقت صورت حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ شعرائے مشر اور شعرائے یہود دونوں ہی اسلام کو شکست دینے کے نہ صرف اپنی تلواریں استعمال کر رہے تھے بلکہ ادب و شعر قوت بھی استعمال کر رہے تھے وہ اپنے اشعار میں رسول کی ہجو کرتے اور وہ پورے جزیرۃ العرب میں پھیل جاتی کیو ان شعرار کے پیچھے جو لوگ لگے رہتے تھے وہ ان اشعار کو پہنچا دیتے تھے ۔ اس سے نمٹنے کے لیے ضروری تھا کہ اشع ہی میں ان کا جواب دیا جاتا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت پوری طرح محسوس فرمائی اور شعرائے صحابہ کو ان کے اشعار کا جواب دینے کی ترغیب د اور اس کے جو اثرات مخالفین اسلام پر پڑتے اور پڑ سکتے ۔

[1] مشکوٰۃ میں یہ حدیث شرح السنہ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے اور علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر میں اس کو مسند احمدؒ امام بخاری کی تاریخ اور ابو یعلیٰ و ابن مردویہ کے حوالے سے نقل کیا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ حدیث ابن عبدالبر کی استیعاب میں بھی موجود ہے ۔

اس کو بیان فرمایا۔ آپؐ نے حضرت کعبؓ کو جواب دیتے ہوئے اللہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ تمہارے اشعار مشرکین کے دل و دماغ پر ویسا اثر کرتے ہیں جو تمہارے تیر ان کے جسموں پر کرتے ہیں۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کے اشعار کو تیروں کی باڑھ سے تشبیہ دی۔

اسلامی تاریخ نے ان مشرک شعراء کے نام محفوظ رکھے ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی مذمت اور ہجو میں لگے رہتے تھے اور اس میں انھوں نے شہرت حاصل کی تھی۔ مثلاً عبداللہ بن الزبعری سہمی۔ ہبیرہ بن وہب مخزومی۔ مسافع بن عبدمناف ابوعزہ حجمی۔ امیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ یہ لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے اور مشہور کرتے کہ محمدؐ بھی ہماری ہی طرح ایک شاعر ہیں ہم بھی ویسے ہی اشعار کہتے اور کہہ سکتے ہیں۔ پھر وہ اپنے اشعار میں آپؐ کی ہجو کرتے۔ ان کے قبیلوں کے گمراہ لوگ ان کے گرد جمع رہتے اور جگہ جگہ ان کے اشعار پھیلا دیتے۔ ہم جانتے ہیں کہ عرب میں شعر و شاعری کا بڑا زور تھا اور لوگوں پر اشعار کا زبردست اثر پڑتا تھا۔ اس صورت حال میں ایک طرف نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ حکم دیا۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جہاد کرو مشرکین کے ساتھ اپنے مالوں سے اپنی جانوں سے اور زبانوں سے۔

(ابوداؤد، نسائی، دارمی)

جہاد باللسان (زبان سے جہاد) دراصل جہاد بالنفس (جسم و جان سے جہاد) ہی کی ایک شکل ہے۔ دوسری طرف خصوصیت کے ساتھ آپ نے حضرت حسان بن ثابتؓ حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو حکم دیا کہ وہ معاندین اسلام کے اشعار کا جواب دیں اور جو شعراء اللہ رسول کی ہجو کر رہے ہیں جواباً وہ بھی ان کی ہجو کریں۔ حضرت حسانؓ کو آپ نے جو حکم دیا تھا اس کی روایت بخاری و مسلم میں بھی موجود ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسانؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ میری طرف سے جواب دو اور پھر یہ دعا فرماتے تھے کہ اے اللہ روح القدس سے حسان کی تائید فرما! ایک دفعہ حضورؐ نے ان سے فرمایا مشرکین کی مذمت کرو اور جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے جہاد کرنے والے شعراء کی جو حوصلہ افزائی کی اور ان کو جو اعزاز عطا فرمایا وہ قیامت تک تمام اسلامی شعراء کے لیے سرمایۂ فخر ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت حسانؓ کے لیے مسجد نبوی میں منبر رکھواتے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر رسول خدا کی طرف سے مدافعت کرتے اور آپ فرماتے کہ جب تک حسان رسول اللہ کی طرف سے مدافعت کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ جبریل کے ذریعے ان کی مدد فرماتا رہتا ہے۔

بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ بعض اوقات اپنی ناپسندیدگی ظاہر فرما کر شعراء کو اشعار میں اصلاح

کی طرف بھی متوجہ فرماتے تھے۔ جمع الفوائد میں معجم طبرانی کبیر کی ایک روایت ہے کہ ایک بار حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ سے دریافت فرمایا کہ جب تم شعر کہنا چاہتے ہو تو کس طرح کہتے ہو انھوں نے جواب دیا کہ پہلے غور و فکر کرتا ہوں اس کے بعد شعر کہتا ہوں۔ یہ سنکر آپ نے فرمایا تو پھر مشرکین کو ان کی شرارتوں کا جواب دو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے پہلے سے تیاری کیے بغیر فی البدیہہ کچھ اشعار کہے میں نے آپؐ کے چہرے پر ناگواری کا اثر دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے شعر کا فلاں لفظ ناپسند ہوا ہوگا چنانچہ میں نے غور کرکے وہ لفظ بدل دیا۔ اس کے بعد آپ کو سنایا حضورؐ نے پسند فرمایا اور مجھے دعا دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اور اچھے اشعار سے جس طرح دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان سب کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا اس سے ایک طرف یہ معلوم ہوا کہ اسلامی ادب و شعر کا مقصد وہی ہے جو میدان جنگ میں جہاد بالسیف کا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی جہاد بالسیف کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ (اللہ کے دین کی سربلندی) کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دوسری طرف اس سے تحریک اقامت دین کے لیے ادب و شعر کی اہمیت بھی واضح ہوئی۔ اب ہمارے لیے آسان ہے کہ اسلامی ادب کی تعریف متعین کریں اور یہ معلوم کریں کہ کس ادب کو اسلامی ادب کہیں گے؟

۲۔ اسلامی ادب کی مجمل تعریف یہ ہوگی۔

جو ادب اعلاء کلمۃ اللہ اور تعلیمات اسلامی کی ترویج کا ذریعہ ہو وہ اسلامی ادب ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہوگی۔ اسلامی ادب وہ ادب ہے:۔

(الف) جس میں آداب فن کا لحاظ کرتے ہوئے مخالفین اسلام کے پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا اور اللہ و رسول کی جانب سے مدافعت کی گئی ہو۔

(ب) جس میں اسلام کو سربلند کرنے اور سربلند دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا گیا ہو

(ج) جس میں مسلمانوں کو اقامت دین کی جدوجہد پر ابھارا گیا ہو۔

(د) جس میں حمد و نعت اور اللہ سے دعا ہو۔

(ہ) جس میں اسلام سے متعلق کوئی بات پیش کی گئی ہو خواہ اس کا تعلق اسلامی عقائد سے ہو یا اسلامی اقدار حیات سے ہو یا اسلامی شعائر سے۔

ایک سوال کا جواب تم نے اسلامی ادب کی جو تعریف کی ہے وہ اتنی عام ہے کہ اس میں فقہ کی کوئی کتاب بھی داخل ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہہ لفظ ادب کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ علوم و فنون کی فہرست میں 'ادب' ایک مستقل فن اور علم کا نام ہے۔ میں نے اسلامی ادب کی تعریف کی ہے نہ کہ مثلاً کسی اسلامی تحریر و تقریر کی ــــ پہلے کسی چیز کا ادب ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ

اسلامی ہے یا غیر اسلامی یا وہ کوئی ایسی نگارش ہو جسے جائز و گوارا کہا جاسکتا ہے۔ اصل چیز سمجھنے کی یہ ہے کہ خود ادب کی تعریف کیا ہے اور کون سی چیز کسی ادب کو ادب بناتی ہے۔ کسی نگارش کو ادب بنانے والی چیز کوئی خاص موضوع نہیں ہے بلکہ کسی نگارش کو ادب بنانے والے عناصر کا تعلق زبان، طرز ادا، اسلوب بیان الفاظ کے دروبست اور حسن کلام سے ہے۔

میں ادب اور دوسرے علوم و فنون میں جو فرق واقعتاً ہے اسے مانتا ہوں اور نثر و نظم کے مسلمہ اصناف ادب کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کو میں اسلامی ادب کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں لیکن جب علوم و فنون کی تقسیم کرنی ہوگی تو یہ کتابیں تفسیر قرآن کے خانے میں لکھی جائیں گی، ادب کے خانے میں نہیں۔ اسی طرح مثال کے طور پر توحید کو ذہنوں میں اتارنے کے لیے کوئی کامیاب افسانہ لکھا جائے تو وہ ادب کے خانے میں درج ہوگا، علم کلام کے خانے میں نہیں۔

۳۔ فکر اور فن کی بحث میں میرا نقطہ نظر ایک معتدل نقطہ نظر ہے۔ میں نہ راست انداز بیان کو ناپسند کرتا ہوں ورنہ ایمائیت و اشاریت سے مجھے کوئی نفرت ہے نہ کلام کی سادگی مجھے ناپسند ہے اور نہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور تلمیح سے کلام کی آراستگی مجھے بری لگتی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے ترسیل خیال کا ہر نہج اختیار کیا جاسکتا ہے — راست انداز بیان بھی، ایمائیت و اشاریت بھی، سادگی بھی اور آراستگی بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام پسند ادبا و شعرا کے حلقے میں فکر اور فن پر جو بحث ہوتی ہے میں اسے اپنے ذوق کی بحث قرار دیتا ہوں۔ فکر پر اتفاق کے بعد فن کے جس نقطے سے اختلاف شروع ہوتا ہے اس کا تعلق ترسیل خیال کے نہج ہی سے ہے۔ کچھ لوگ راست انداز بیان کو پسند نہیں کرتے ان کے خیال میں ترسیل خیال کا نہج ایمائی ہونا چاہیے یعنی اپنی بات اشاروں کنایوں میں کہنی چاہیے صاف صاف کھول کر بیان نہیں کرنی چاہیے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تحریکی ادب کے لیے راست انداز بیان بھی ایک لازمی چیز ہے اور محض راست انداز بیان کی وجہ سے کوئی پارۂ ادب گھٹیا اور غیر موثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض لوگوں کے نزدیک اشعار میں جب تک تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تلمیح اور اسی طرح کی دوسری چیزیں نہ ہوں "شعریت" پیدا نہیں ہوتی بلکہ اشعار سپاٹ ہوجاتے ہیں۔ میں ایک کلیہ کے طور پر اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے نزدیک بہت سے سادہ اشعار بھی "شعریت" سے معمور اور بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ اصل چیز کہنے کا انداز ہے۔ اگر انداز بیان حسین ہو تو سادگی سے کہی ہوئی بات بھی بہت موثر ہوتی ہے۔

۴۔ آخری بات یہ ہے کہ اقامت دین کی جد و جہد میں ادبی محاذ کا حال اچھا نہیں ہے۔ پہلے یہ محاذ جماعت اسلامی کے ایک ضمنی شعبے کے طور پر کام کرتا تھا۔ پھر اسلامی ادیبوں نے سوچا کہ اس طرح کام نہیں ہو رہا ہے اس لیے

ایک مستقل تنظیم کے تحت کام کرنا چاہیے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک کے وہ ادبا اور شعرا جن کے سامنے غلط مقاصد تھے منظم ہوکر کام کر رہے تھے اور ادب اسلامی کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کے خلاف غلط پروپیگنڈا کر رہے تھے انھوں نے مخرب اخلاق اور زہریلے ادب کے لٹریچر سے بازار کو پاٹ دیا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان کی تنظیم کا جواب تنظیم سے دیا جائے۔ اس طرح ادارۂ ادب اسلامی کی تنظیم کی گئی۔ الگ سے اس کا ایک دستور مرتب ہوا اور منظم طور پر کام شروع کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس ادارے نے رام پور یوپی سے ایک ادبی ماہنامہ "دانش" کے نام سے نکالا لیکن ایک سال کے بعد ہی اس کو بند کرنا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد ... اور ... ماہنامہ "دوام" کے نام سے جاری کیا گیا اور آخر کار وہ بھی بند ہوگیا۔ جماعت اسلامی نے اجتماعات کے موقع پر کہیں کہیں اور کبھی کبھی ایک ادبی نشست بھی ہوجاتی ہے اور بس۔

ادبی محاذ کی اس زبوں حالی کے دو سبب ہیں۔ ... جماعت اسلامی ہند کے جن ارکان کو ادب سے دلچسپی ہے ... جو شاعر یا افسانہ نگار یا طنز نگار ہیں اور جن کی ... اس محاذ کو مضبوط اور موثر بنا سکتی ہیں ان کے پاس اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ حصول معاش میں وقت لگانے کے بعد ان کو جو وقت ملتا ہے وہ جماعت اسلامی کے دوسرے کاموں میں صرف ہو جاتا ہے — دوسرا سبب یہ ہے کہ خود جماعت اسلامی کے ارکان متفقین متاثرین ہوں یا ملک کے دوسرے ایسے لوگ جو تعمیری اور اسلامی ادب کو ... کرتے ہیں ان کی پسندیدگی صرف داد و تحسین تک محدود ہو جاتی ہے۔ رسالے شائع کیے جاتے ہیں وہ کچھ ہی دنوں میں مالی وسائل کے فقدان کی وجہ سے دم توڑ دیتے ہیں اور جو ادبی کتابیں ... کے مجموعے شائع کیے جاتے ہیں وہ مکتبوں میں پڑے بوسیدہ ... رہتے ہیں۔ گویا تعمیری اور اسلامی ادب لوگوں کی تفریح طبع کا ایسا سامان ہے جو انہیں مفت مہیا کیا جانا چاہیے۔

نوٹ: یہ مضمون ایک خاکہ ہے جس میں تگ و تحریر کے لیے وقت ...

سؤر کا گوشت کیوں حرام کیا گیا

ایک مرتبہ فرانس میں مجھے ایک واقعے سے سابقہ پڑا ن دنوں فرانس میں میرے ایک دوست رہا کرتے تھے جو نیات کے ریسرچ اسکالر تھے ۔ انھوں نے ایک قریب ے ریستوران میں ہمیں مدعو کیا ۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ نھوں نے فرانسیسی انداز میں معذرت کرتے ہوئے کہا اگر پ معاف فرمائیں تو میں خنزیر (سؤر) کا گوشت منگا لوں۔

میں نے بھی جواب دیتے ہوئے کہا بھئی ہم عربوں ے یہاں ایک مثل ہے کہ کھانے میں اپنے ذوق کا خیال ھو اور لباس میں دوسروں کے ذوق کا ۔

انھوں نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا ۔ معاف یجیے گا میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ خنزیر کا گوشت سب سے یادہ لذیذ اور عمدہ ہوتا ہے ۔ میں نے تقریباً تمام مذاہب ا مطالعہ کیا ۔ اس موضوع پر میں نے بعض کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ اب تک میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ سلام نے بغیر کسی سبب کے خنزیر کے گوشت کو کیوں حرام رار دیا ۔ حالانکہ اس کے تمام اصول وقوانین میں انسانی طبیعت کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ دوسرے مذاہب جیسے ہندو وغیرہ تو اس کی مذہبی وجہیں بھی بتاتے ہیں ۔ اس موضوع پر میں نے کئی لوگوں سے گفتگو کی ۔ لیکن ان میں سے کوئی مجھے مطمئن نہ کرسکا کیا آپ طبی حیثیت سے اس موضوع پر روشنی کچھ ڈالیں گے ۔

میں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے کہا ٹھیک ہے میں ضرور روشنی ڈالوں گا لیکن اس وقت ذرا اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ کھانے میں بدمزگی پیدا ہو جائے اور آپ کی اشتہا جاتی رہے ۔

انھوں نے جواب دیا نہیں نہیں ۔ میں تو پیدائشی طور پر اس کا عادی ہوں ۔ میرے متعلق تو اس کا اندیشہ بالکل نہ رکھیے ۔

پھر میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا طبی و علمی طور پر اب تک میں ایسے تین اسباب تک پہنچا ہوں جن کی بنا پر خنزیر کو صرف مسلمانوں ہی پر نہیں بلکہ سارے انسانوں پر حرام ہونا چاہیے

پہلی وجہ تو یہ ہے جس سے آپ خود بھی واقف ہوں گے کہ حیوانات کے گوشت کھانے سے ایک طرح کے جراثیم جن کو (TEANIA) کہتے ہیں۔ انسان کے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں۔

انھوں نے بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا لیکن یہ بات خنزیر کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ دوسرے جانوروں میں بھی یہی بات ہے۔

پھر میں نے کہا اتنی جلدی کیوں کرتے ہیں۔ پہلے میری بات تو سنیے..... ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ حیوانات کے گوشت میں ایک طرح کے جراثیم ہوتے ہیں لیکن گائے، بکری وغیرہ کے جراثیم اور خنزیر کے جراثیم میں باہم ایک بڑا فرق ہوتا ہے۔ خنزیر کے ٹینیا کا علمی نام TEANIA SOLIUM ہے اور دوسرے حیوانات کے ٹینیا کو SAginata کہتے ہیں۔ یہ فرق اصلاً ہیئت و حجم وغیرہ میں مختلف ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ مضر و مفید ہونے کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ خنزیر کے علاوہ دوسرے جانوروں کا ٹینیا پیٹ میں پہنچ کر بہت کم نقصان پہنچاتا ہے اور معمولی دواؤں سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اس کے خلاف خنزیر کا ٹینیا صرف آنتوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ دل و دماغ اور بصارت وغیرہ پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور وہاں بعض اوقات ایک بڑے دانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اگر یہ دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے تو ذہنی توازن باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح جب آنکھ پر اثر انداز ہوتا ہے تو بصارت جاتی رہتی ہے اور انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جن ممالک میں یہ گوشت بکثرت استعمال ہوتا ہے کہ اگر کوئی دماغی توازن کھو بیٹھے، بصارت جاتی رہے، یا ہارٹ فیل ہو جائے تو عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایسا شخص خنزیر کے جراثیم سے متاثر ہو گیا۔ جن ممالک میں اس کا عمومی رواج نہیں ہے تو مرض کی تشخیص بھی جلدی نہیں ہو پاتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو علاج عموماً بے فائدہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خنزیر کے ٹینیا پر دوائیں عموماً بے اثر ہو جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات تو اسے تقویت پہنچتی ہے۔

وہ میری بات کو بڑے غور سے سنتے رہے اور کہنے لگے میرے اطمینان کے لیے تو ایک سبب ہی کافی ہے۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا لیکن دوسرا سبب اس سے بھی زیادہ قوی ہے اور اس سے تحریم خنزیر کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں میں آپ سے دریافت کروں گا کہ انسان بلی کتے اور لومڑی وغیرہ کا گوشت کیوں نہیں کھاتا؟ حالانکہ ممکن ہے کہ ان جانوروں کا گوشت زیادہ لذیذ ہو۔ فرض کیجیے کہ اس وقت آپ کے سامنے گوشت رکھا جائے اور کوئی آکر کہے کہ بکرے کا نہیں بلکہ بلی یا کتے کا گوشت ہے تو آپ پر اس کا کیا ردعمل ہوگا۔

انھوں نے کہا ظاہر ہے قے ہو جائے گی۔

پھر میں نے کہا۔ کیا آپ اس کی کوئی عقلی وجہ بتا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ انسانی فطرت اسے قبول نہیں کرتی؛

انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی گفتگو دوبارہ شروع کر دی۔ میں نے کہا: "علمی طور پر حیوانات کی دو قسمیں ہیں:۔

ایک وہ جانور جو گوشت خور Carnivores ہوتے ہیں مثلاً شیر، بھیڑیا، کتا اور بلی وغیرہ۔ اور دوسری قسم سبزی خور جانوروں Herbivorous کی ہے۔ مثلاً اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ۔

اب دوسری طرف تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو ہر دور میں یہ بات مشترک نظر آئے گی کہ انسان نے ہمیشہ سبزی خور جانوروں کو اپنی غذا بنایا ہے۔ سوائے بعض مستثنیات کے اس کی مختلف وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہی ہے کہ گوشت خور جانوروں کو غذا بنانے سے عموماً مزاج میں سختی و درشتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خوں ریزی اور جنگ و جدال کی طرف میلان ہو جاتا ہے اور جنسی شہوت عقل پر غالب آجاتی ہے حتیٰ کہ عزت و شرم کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی اور انسان، انسان نما حیوان بن جاتا ہے۔ آج یورپ کا معاشرہ ان کمزوریوں کی سچی تصویر ہے۔

فرانسیسی دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اچھا اب تیسرا استدلال۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ اطباء عموماً حیوانات کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کا گوشت ثقیل اور دیر ہضم ہوتا ہے ایسے جانوروں میں دہنی مادہ زیادہ ہوتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو زود ہضم اور غیر ثقیل ہوتا ہے۔ اس میں عموماً دہنی مادہ FAT زیادہ نہیں ہوتا ہے اور یہ بھی ایک معروف حقیقت ہے کہ خنزیر میں دہنی مادے سب سے زیادہ ہوتے ہیں یہ تھا تیسرا سبب، ممکن ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہوں۔ اس کے متعلق تو باقاعدہ مطالعہ کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ آج کی گفتگو سے آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔

انھوں نے سامنے سے پلیٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ واقعی مجھے مطمئن کرنے میں آپ کامیاب رہے میرے لیے معجزہ سے کم نہیں تھا میں نے کہا: "معجزہ تو یہ اللہ کا ہے جس نے سائنس کی اور تحقیقات سے چودہ سو سال پہلے خنزیر کا گوشت کھانے سے منع کر دیا۔ واقعی اللہ کی ذات بڑی ہی عظیم ہے۔

(ماخوذ)

ماہنامہ زندگی کی قیمت میں نومبر ۱۹۷۴ء سے اضافہ

گذشتہ ماہ کے شمارے میں یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ انتہائی مجبور کن حالات میں ماہنامہ زندگی کے سالانہ چندے میں ماہ نومبر ۱۹۷۴ء سے اضافہ کیا جا رہا ہے۔ زندگی کے ایک شمارے کی قیمت ۵۰/۱ اور سالانہ چندہ -/۱۵ روپے ہوگا۔ اس سے پہلے جو لوگ خریدار بنیں گے ان سے سالانہ چندہ -/۱۲ روپے ہی لیا جائے گا۔

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور۔ یوپی

Mr. Babuddin

Babuddin

رسائل و مسائل

مُردہ جانور کی کھال دھوپ میں سکھا دینے سے بھی پاک ہوجاتی ہے

سوال

کچھ لوگ مُردہ جانوروں (بیل بھینس بکری وغیرہ) کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ ان کھالوں کو پہلے خشک کرتے ہیں اس کے بعد فروخت کرتے ہیں اور خشک کر دینا بھی دباغت ہے کیا ان لوگوں کی یہ بات صحیح ہے؟ دباغت تو ایک صنعت ہے صرف خشک کر دینے سے دباغت کیسے ہوجائے گی؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مردہ بیل بھینس کی کھالوں کی خرید و فروخت جائز ہے۔

جواب

دباغت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی دباغت جو دواؤں کے ذریعے کی جاتی ہے یہی دباغت ایک صنعت ہے۔ دوسری قسم حکمی دباغت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم بھی وہی ہے جو حقیقی دباغت کا ہے یعنی اس سے بھی کھال پاک ہوجاتی ہے۔ دھوپ میں یا ہوا میں کھال کو خشک کر دینا حکمی دباغت ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:۔

کل اھاب دبغ دباغة حقیقیة بالادویة اوحکمیة بالتتریب والتشمیس والالقاء فی الریح فقد طھر وجازت الصلوٰة فیه والوضوء منه الا جلد الآدمی والخنزیر (جلد ا ص ۲۵ مطبوعہ مصر کتاب الطہارۃ)

ہر کچا (بے دباغت) چمڑا جس کو حقیقی دباغت دواؤں کے ذریعے دی گئی ہو یا اس میں مٹی ڈال کر یا اس کو دھوپ اور ہوا میں ڈال کر حکمی دباغت دی گئی ہو تو وہ پاک ہوجاتا ہے اس پر نماز ادا کرنا بھی جائز ہوجاتا ہے اور اس سے بنے ہوئے کسی ظرف سے وضو کرنا بھی جائز ہوجاتا ہے سوائے آدمی اور سور کی کھال کے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حقیقی دباغت میں دوائیں وغیرہ استعمال کی جاتی ہیں اور حکمی دباغت کے تین طریقے ہیں کھال کو مٹی سے یا دھوپ یا ہوا میں ڈال کر خشک کر دینا۔

اس طرح اس کھال پر نماز بھی جائز ہو جاتی ہے اور اگر اس سے مشک یا کوئی اور ظرف بنا کر اس میں پانی رکھا جائے تو اس پانی سے وضو بھی جائز ہو جاتا ہے۔ دوسری بات اس عبارت سے یہ معلوم ہوئی کہ آدمی یا سور کی کھال نہ حقیقی دباغت سے پاک ہوتی ہے اور نہ حکمی دباغت سے۔ فقہ کی دوسری عبارتوں میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ آدمی کی کھال تو اس لیے مستثنیٰ قرار دی گئی ہے کہ آدمی ایک محترم ہستی ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اس لیے اس کی کھال کھینچ کر اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اور سور کی کھال اس لیے مستثنیٰ کی گئی ہے کہ وہ نجس العین ہے اس کی کھال کسی دباغت سے پاک نہیں ہوتی۔ حلال جانور جیسے بکری اگر مر جائے تو اس کی کھال کو دباغت دے کر اس سے فائدہ حاصل کرنے کی ترغیب خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہے بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب مردہ جانور کی کھال کو دباغت دے دی جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ (المشکوٰۃ، بحوالہ مالک و ابوداؤد) اور آپ نے خود اس سے فائدہ اٹھایا بھی ہے (مشکوٰۃ بحوالہ احمد و ابوداؤد)

اس زمانے میں کچی کھالوں کا کاروبار کیا جا رہا ہے اور اب ان سے عام طور پر فائدہ اٹھانے کی یہی صورت ہے کہ ان کو خریدا جائے ایسی صورت میں ان کو دباغت دے کر بیچنے کی نیت سے خریدنا میرے خیال میں جائز ہے اور جب خریدنا جائز ہوگا تو پھر دباغت دے کر ان کو فروخت کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

جھوٹا الزام

خط

میرے ایک بزرگ جن سے میرا رشتہ دوستانہ ہے شیعہ ہیں۔ ان سے ایک دن باتیں ہو رہی تھیں تو انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو ایک باغ جہیز میں دیا تھا (جس کا نام شاید 'باغ فدا تھا') اس باغ کو بعد میں ابوبکر صدیق رضؓ نے ان سے لے لیا تھا' یا یوں کہیے کہ چھین لیا تھا۔ میرے وہ بزرگ کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے سنی مورخین نے بھی انکار نہیں کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی مدد چاہوں گا۔ کیا ان بزرگ کی یہ بات صحیح ہے

جواب

جی نہیں بلکہ سو فی صد غلط ہے۔ جس وقت حضرت فاطمہ رضؓ کی شادی ہوئی تھی اس وقت حضورؐ کے پاس سرے سے کوئی باغ تھا ہی نہیں کہ آپ انہیں جہیز میں دیتے۔ آپ کے شیعہ دوست نے ایک بالکل غلط بات آپ کو بتائی اور حضرت صدیق رضؓ پر ایک جھوٹا الزام لگایا۔ کسی بھی سنی مورخ نے یہ بات نہیں لکھی ہے۔ آپ اپنے شیعہ دوست سے پوچھیے کہ کس سنی مورخ نے کس کتاب میں یہ بات لکھی ہے۔ شیعہ بزرگ نے اس باغ کا نام باغ فدک بتایا ہوگا۔ وہ باغ غزوۂ خیبر کے بعد حضور کی ملکیت میں آیا تھا اور خیبر ۷ھ میں فتح

ہوا تھا اور حضرت فاطمہؓ کی شادی ۲ ھ میں ہوئی تھی۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ خود اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو بہتر ہے۔ اردو زبان میں بھی اسلامی تاریخ پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اسی طرح کے جھوٹے الزامات ہیں جو شیعوں اور سنیوں کے درمیان اختلافات پیدا کرتے ہیں۔

بعد نماز فاتحہ خوانی اور سلام و قیام

خط

۱۔ کچھ لوگ بعد نماز ہاتھ اٹھا کر مسجد میں فاتحہ خوانی کرتے ہیں کیا یہ عمل مسنون ہے؟

۲۔ بعد نماز سلام پڑھا جاتا ہے اس تصور کے ساتھ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں ان کے ادب میں قیام کرنا چاہیے۔ کیا یہ سلام و قیام درست ہے؟

جواب

۱۔ بعد نماز ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی کو اگر کوئی شخص مسنون سمجھتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ یہ جانتا ہی نہیں کہ مسنون کس فعل و عمل کو کہتے ہیں۔ اسے بتایئے کہ مسنون اس فعل کو کہتے ہیں جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ بعد نماز فاتحہ خوانی تو بہت دور کی بات ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کسی وقت بھی "فاتحہ خوانی" ثابت نہیں ہے۔

جو لوگ بعد نماز فاتحہ خوانی کرتے ہیں انھوں نے ایک بدعت سیئہ ایجاد کی ہے ہر مسلمان کو اس سے بچنا چاہیے۔

۲۔ اس تصور کے ساتھ جس کا ذکر سوال میں ہے سلام و قیام ناجائز اور قریب بہ شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسے خیال و عمل سے محفوظ رکھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ معمولی سے معمولی بدعت بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ مجاہد سے روایت ہے کہ:۔

> میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ایک مسجد میں داخل ہوا وہاں اذان دی جا چکی تھی ہمارا ارادہ تھا کہ وہاں جماعت سے نماز ادا کریں اتنے میں اس مسجد کے موذن نے اذان اور اقامت کے درمیان تثویب کی (یعنی اس نے قد قامت الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جملے زور سے پکار کر کہے) یہ سنکر حضرت عبداللہ بن عمر مسجد سے باہر نکل گئے اور انھوں نے فرمایا۔ مجھے اس بدعتی کے پاس سے ہٹاؤ (اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر نابینا ہو چکے تھے) انھوں نے اس مسجد میں نماز نہیں پڑھی۔"
>
> (ترمذی مطبوعہ ہند ص ۴۲)

بعض روایتوں میں ہے کہ ایک بار حضرت علیؓ کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ پیش آیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس بدعتی کو مسجد سے نکالو۔ بعض لوگوں کے ذہن و دماغ میں بدعت اس طرح رچ بس گئی ہے کہ انھوں نے نماز کو بھی نہیں بخشا ہے نماز کے اندر حذف و اضافہ تو شاید ان کے بس سے باہر ہے لیکن نماز سے پہلے اور اس کے بعد انھوں نے طرح طرح کی بدعتیں

رائج کرنے کی کوششیں کی ہیں اور جو مسجدیں ان کے قبضے میں ہیں وہاں بدعتیں رائج بھی کر دی ہیں۔

میراث کا ایک مسئلہ

خط

محمد طالب مرحوم کا انتقال عرصہ ہوا ہو چکا ہے۔ ان کے نام ایک مکان اور دو پاور لوم ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کچھ رقم دے کر اپنے بڑے لڑکے عبدالحمید کو الگ کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی محنت سے کاروبار بڑھا کر کئی پاور لوم کی ملکیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے چھوٹے لڑکے محمد امین اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے۔ ان دو لڑکوں کے علاوہ محمد طالب مرحوم کی چار لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک کا انتقال ان کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ محمد طالب مرحوم پر کئی سو روپے قرض ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی۔

جواب

محمد طالب مرحوم کے نام جو مکان اور پاور لوم ہیں اس کے وارث ان کے دونوں لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ایک لڑکی جو ان کی زندگی میں وفات پا گئیں وہ وارث نہیں ہیں۔ قرض ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ ان کے دو لڑکوں اور تین لڑکیوں میں تقسیم ہوگا۔ لڑکوں کے دو دو حصے ہوں گے اور لڑکیوں کا ایک ایک حصہ ہوگا۔

دو بیویوں کا حصہ کتنا ہوگا؟

سوال

زید اپنی دو بیویوں کلیمہ اور سلیمہ کو چھوڑ کر وفات پا گئے۔ سلیمہ کے بطن سے صرف ایک لڑکا ہے اور کلیمہ کے بطن سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ زید کے ترکے میں دو بیویوں کا حصہ کتنا ہوگا کیا ہر ایک کو آٹھواں حصہ ملے گا؟ مہربانی کر کے بتائیے کہ پورے ترکے کی ان میں کس طرح تقسیم ہوگی۔

جواب

دونوں بیویوں کو الگ الگ آٹھواں حصہ نہیں ملے گا بلکہ دونوں بیویاں آٹھویں حصے میں برابر کی حصہ دار ہوں گی۔ اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہ دونوں لڑکوں کو دو دو حصے کے حساب سے اور لڑکیوں کو ایک ایک حصے کے حساب سے ملے گا۔ سمجھنے کے لیے فرض کیجیے کہ زید کا ترکہ آٹھ ہزار روپے ہے تو ان آٹھ ہزار روپوں میں ایک ہزار روپے دونوں بیویوں کو ملیں گے۔ پانچ سو ایک بیوی کا اور پانچ سو دوسری کا۔ اب جو سات ہزار روپے بچے وہ دو دو حصے اور ایک ایک حصے کے حساب سے لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم ہوں گے

نجاست کا اثر نہ ہو تو زمین پاک ہے

سوال

ایک فلش اسٹائل بیت الخلاء بن رہا ہے اس سے

تقریباً تین گز کے فاصلے پر ایک کھنتی کھد رہی ہے جس میں غلاظت دفن رہے گی اور کھنتی بند رہے گی کھنتی جس جگہ ہے وہ ایک میدان ہے جہاں نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے کھنتی عین اس مقام پر اندر دفن ہوگی جہاں ایک صف کھڑی ہو جاتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہاں کھڑے ہو کر نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہوگا۔

جواب

نجاست جب زمین کے اندر دفن ہوگی اور سطح زمین پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا تو سطح زمین پاک ہوگی۔ اس پر صرف نماز جنازہ نہیں بلکہ رکوع اور سجدے والی نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے سمجھنے کے لیے یہ صورت سامنے رکھیے کہ اگر کوئی شخص کسی چھت والے کمرے کو بیت الخلاء بنا دے تو اس کمرے کی چھت پر نماز جائز ہوگی کیونکہ نیچے کی نجاست کا اثر چھت پر نہ ہوگا چھت پاک ہوگی

نماز قصر کا حکم قرآن میں موجود ہے

خط

کچھ لوگوں کے درمیان یہاں یہ بحث ہو کہ نماز قصر کا حکم قرآن میں ہے یا نہیں بعض کہتے ہیں کہ اس کا حکم قرآن میں ہے لیکن وہ نہیں بتا سکتے کہ کس سورہ میں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ قرآن میں حکم نہیں ہے۔ حدیث میں اس کا ذکر ہے۔

جواب یہ بحث اس لیے پیدا ہوئی کہ اردو جاننے والے مسلمان بھی ترجمے کے ساتھ سمجھ کر قرآن کی تلاوت نہیں کرتے ہیں نماز قصر کا حکم سورۂ النساء، پارہ ۵، رکوع ۱۵ آیت میں ہے۔ ترجمہ یہ ہے:۔

جب تم سفر میں جاؤ تو تم پر کچھ حرج نہیں ہے کہ نماز قصر کرو

آپ لوگ سورۂ النساء کی آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳ کے ترجمے ا اس کی تفسیر تفہیم القرآن میں یا تفسیر کی کسی اور کتاب میں پڑھیں

الکوحل آمیز دوائیں

سوال

۱۔ شراب کی جزوی آمیزش سے تیار کردہ دوائیں کا استعمال مریضوں کے لیے از روئے فتویٰ جائز ہے تو کیا اسی طرح آرویدک دوائیں جو گئو متر (گائے کا پیشاب) ملا کر بنائی جاتی ہیں۔ امراض کے دفعیے کے لیے مستعمل ہو سکتی ہیں؟

۲۔ کیا ایسی تبادل اشیاء کی موجودگی میں جن میں نہ تو شراب ہوتا ہے اور نہ گئو متر کی آمیزش ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا ادویات سے اجتناب ناگزیر نہیں ہے

جواب

"شراب کی جزوی آمیزش سے تیار کردہ دواؤں" سے غالباً آپ کی مراد الکوحل آمیز دوائیں ہیں۔ موجودہ دور کے سب سے ترقی یافتہ طریقہ علاج میں دوائیں الکوحل میں حل کی جاتی ہیں اب اگر ان کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا جاتا تو لوگوں کی صحت اور زندگی کی حفاظت خطرے میں پڑ جاتی۔ اس مجبوری کی بنا پر

ائوں کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے یہی مجبوری اگر ان
ائوں کے معاملے میں بھی پیش آ رہی ہو جو گائے کا پیشاب ملا کر
ائی جاتی ہیں تو میرے خیال میں انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے
ملاً آریو ویدک کی کوئی دوا جو گائے کا پیشاب ملا کر بنائی
ئی ہو کسی خاص مرض میں بہت مؤثر ثابت ہو چکی ہو اور
ثرت مریض اس سے صحت یاب ہو رہے ہوں تو اس کے
ستعمال کو ناجائز قرار دے کر اس سے اجتناب کو ضروری
ار دینا میرے خیال میں صحیح نہ ہوگا۔

۲۔ ایسی دواؤں کا استعمال قابل ترجیح ضرور ہے
ن میں الکوہل یا گائے کا پیشاب ملا ہوا نہ ہو لیکن موجودہ
الات میں کسی مریض کے لیے ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک اور آریو وید
دواؤں سے اجتناب کو ضروری قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ البتہ
گر کوئی مسلمان بر بنائے تقویٰ ایسی دواؤں کے استعمال سے
جتناب کرتا ہے تو اس کو اس کا اختیار حاصل ہے۔

قسمت کا لکھا

خط

ناچیز اپنی عمر کے ۲۶ سال گذار چکا ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ اب تک جو گناہ میں نے کیے ہیں یا جو نیکیاں میں نے کی ہیں وہ سب قسمت کا لکھا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا یہ خیال صحیح ہے یا نہیں؟

جواب

آپ کا سوال واضح نہیں ہے اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ جو گناہ آپ نے کیے ہیں وہ قسمت میں لکھے ہوئے تھے اس لیے ان کے بارے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ اسلام نے جو عقیدہ سکھایا ہے اور جو تعلیم دی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ایک ذمہ دار اور با اختیار مخلوق ہے وہ جو نیکی کرتا ہے اپنے ارادہ واختیار سے کرتا ہے اور جو برائی کرتا ہے اپنے ارادہ واختیار سے کرتا ہے اسی لیے نیکی پر اس کو ثواب ملے گا اور بدی پر اس کو عذاب ہوگا۔ قسمت میں لکھے ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان نیکی کرنے یا گناہ کرنے پر مجبور ہے کیونکہ مجبور ہونے کے بعد پھر تو نہ کسی کام پر ثواب ملنا چاہیے اور نہ کسی برے کام پر عذاب ہونا چاہیے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بات اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ اب تک آپ سے جو گناہ ہوئے ہیں ان سے توبہ کیجیے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہی آپ کا فرض ہے۔ اب تک آپ سے جو نیکیاں ہوئی ہیں ان پر اللہ کا شکر بجا لائیے اور آئندہ کے لیے عزم کیجیے کہ آپ نیک عملی کی زندگی بسر کریں گے اور گناہوں سے بچیں گے۔

جو حق نہیں ہے وہ باطل ہے

اچاریہ ونوبا بھاوے نے جس طرح سروَدے تحریک کو ٹوٹنے سے بچایا ہے، اسے بچانا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کے لیے انہیں سروَدے اصولوں کی قربانی دینا پڑی ہے مصلحت کی چوکھٹ پر اپنے عقائد کی بھینٹ چڑھانا پڑی ہے...... حق حق ہے اور جو حق نہیں ہے وہ باطل ہے۔
(قومی آواز لکھنؤ ۱۸ جولائی ۱۹۷۹ کے اداریہ سے)

تنقید و تبصرہ

محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ تالیف علامہ شیخ احمد ابن حجر۔ ترجمہ مختار احمد سلفی ندوی صفحات ۱۶۸۔ ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ دینیہ، مومن پورہ۔ بمبئی ۱۱

یہ کتاب علامہ شیخ ابن حجر قاضی محکمہ شرعیہ قطر نے عربی میں لکھی تھی اور اس کا ترجمہ مولانا مختار احمد ندوی خطیب جامع مسجد مومن پورہ بمبئی ۱۱ نے کیا ہے۔ اب دنیا میں نہ کوئی نئی کتاب نازل ہونے والی ہے اور نہ کوئی نیا نبی آنے والا ہے۔ قرآن کریم اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ہے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بھیجے ہوئے آخری نبی و رسول ہیں جس طرح اللہ تعالےٰ نے کتاب و سنت کی حفاظت اپنے ذمے لی ہے اسی طرح اس نے یہ انتظام بھی کیا ہے کہ کتاب و سنت میں محفوظ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا رہے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اسلام کو اس طرح نکھار کر پیش کیا ہے جس طرح وہ قرآن و حدیث اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ہے۔ امت مسلمہ کے مصلحین کی جماعت میں محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کو بھی ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ بدعات کو فروغ دینے والوں کے دلوں میں مصلحین امت ہمیشہ کانٹوں کی طرح کھٹکتے رہے ہیں اور انھوں نے ان کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ پروپیگنڈے کا زور اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ متقی و پرہیزگار علماء تک متاثر ہو جاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر بدعتیوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ محمد بن عبدالوہابؒ کی شخصیت بھی اس طرح کے پروپیگنڈے کا شکار رہی ہے۔ یہ کتاب اس مظلوم شخصیت کے عقائد و اعمال جاننے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے اس کے باوجود محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے جگہ جگہ عبارت کی روانی غائب ہو گئی ہے اور بعض مقامات پر عبارت الجھ گئی ہے مثلاً ص ۴۲ کی یہ عبارت:۔

"درحقیقت شیخ کا موقف بڑا نازک اور دقیق تھا جو مستقل شجاعت اور ایسے ایمان کا محتاج تھا جو رضائے الٰہی اور حق کے ساتھ راضی رہنے اور مظلوم زنیت کی راہ میں کود پڑنے کی پروا نہ کرے"

کو دیکھنے کی پروا نہ کرے" کے جملے کو اوپر سے ملایئے تو عبارت کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ یا مثلاً ص ۲۶ پر ہے :-

"جس سے کمزور ناحق پا لیتا اور کمینے محروم رہتے"

معلوم نہیں یہ عربی کے کس جملے کا ترجمہ ہے۔ بعض الفاظ بھی نامانوس استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً "آلائشات" ص ۹ پر۔

ایک بات اصل کتاب کی بھی نامناسب محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کے کارناموں کا مقابلہ جناب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے کارناموں سے کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ جن مشکل حالات میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کار رسالت انجام دیا تھا اسی طرح کے حالات مشکلات میں محمد بن عبدالوہاب نے بھی کار اصلاح انجام دیا۔ فاضل مؤلف نے اس کی توجیہ کی ہے لیکن سرے سے اس طرح کا مقابلہ ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی لائق مطالعہ ہے۔

مسلم پرسنل لا کی حمایت میں خواتین کی آواز

مرتبہ محسن مستقیمی صفحات ۵۶ قیمت ایک روپیہ

پتہ:- اسلامی کتاب گھر چھتہ ڈولی والا۔ خیر نگر گیٹ۔ میرٹھ یوپی

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے اصل آواز دراصل خواتین ہی کی آواز ہے اس لیے کہ انہیں کی مصنوعی ہمدردی میں مسلم پرسنل لا کو بدل دینے کی آواز اٹھائی جاتی ہے اسی ضرورت کے پیش نظر ہندوستان کے مختلف حصوں میں خواتین کے بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی خواتین کے ایسے ہی اجتماعات کی دل چسپ اور مفید روداد ہے۔

مرتب کتاب جناب محسن مستقیمی ناظم جماعت اسلامی میرٹھ ڈویژن نے پیش لفظ میں لکھا ہے :-

جماعت اسلامی میرٹھ ڈویژن کی تحریک پر مسلم پرسنل لا کی حمایت میں ضلعی سطح پر مسلم خواتین کے سات اجلاس سات مختلف اضلاع کے اندر ہوئے۔ یہ اجتماعات ۱۴ نومبر تا ۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء کی تاریخوں میں منعقد ہوئے .... مجھے توقع ہے کہ اس پمفلٹ کے مطالعہ سے جہاں آپ مسلم پرسنل لا کی اہمیت افادیت اور نزاکت کو محسوس کریں گے وہیں آپ کے اندر اس کے تحفظ کا عزم اور حوصلہ بھی بیدار ہوگا۔

خطبہ صدارت اور مقالات نیز اجلاس کی تقریروں کے اہم اقتباسات کے علاوہ "مشاہد" کے قلم سے ان اجلاسوں کی دل چسپ روداد بھی ضمناً کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس مفید پمفلٹ سے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔

قرآن مجید کا چیلنج

مولانا داؤد اکبر اصلاحی صفحات ۱۲۸ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت ۵/۵۰

پتہ:- ہلال بکڈپو۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ یوپی

مولانا نجم الدین اصلاحی ناظم دائرۃ المصنفین مبارکپور نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں

بلاشبہ قرآن نے جو شاندار زبان استعمال کی ہے وہ اتنی فصیح و بلیغ ہے کہ دنیا آج تک اس کا مثل نہ پیش کر سکی۔ بجا طور پر احادیث میں سے معجزہ کہا گیا ہے لیکن کیا قرآن کا چیلنج فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ہے یا معنے کے اعتبار سے؟

یہ ایک اہم سوال ہے مصنف کے نزدیک قرآن کا

چیلنج اصالۃً معنوی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن ساری دنیا سے یہ کہتا ہے کہ میں جن نظریات کا علمبردار ہوں اور ان نظریات پر میں نے جو دلائل قائم کیے ہیں ۔ تم اگر انہیں تسلیم نہیں کرتے تو کوئی اور نظریہ پیش کرو اور ان پر اسی طرح دلائل پیش کرو جس طرح قرآنی نظریات پر دلائل پیش کیے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ زمان و مکان کی قید کے بغیر چیلنج دینے کی واحد شکل یہ ہے کہ اسے معنوی چیلنج مانا جائے کیونکہ نظریات دائمی ہوتے ہیں اور انہیں ہر زبان میں رد کیا جا سکتا ہے ۔"

فاضل مصنف نے اس کتاب میں قدیم و جدید مفسرین کے اقتباسات جمع کر کے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا چیلنج اصالۃً معنوی ہے لفظی نہیں ہے ۔ اس سلسلے کی بہت سی مفید باتیں اور مفید معلومات بھی انھوں نے اس کتاب میں جمع کر دی ہیں ۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر لحاظ سے مفید ہوگا ۔

الصالحات

مرتبہ احمدی خاتون (بی اے) پرنسپل جامعۃ الصالحات ۔ صفحات ۸۸ قیمت دو روپے

شائع کردہ :- مجلس منتظمہ جامعۃ الصالحات رام پور ۔ یوپی

یہ جامعۃ الصالحات رام پور کا دوسرا سالانہ میگزین ہے ۔ ۱۹۷۳ء کے پہلے سالانہ میگزین پر تبصرہ ماہنامہ زندگی میں شائع ہو چکا ہے ۔ حسب معمول یہ تازہ میگزین بھی جامعۃ الصالحات کے سالانہ جلسے کے بعد مرتب کیا گیا ہے اس میں مدرسے کی رپورٹ، کارگذاری اور طالبات کی تحریریں اور تقریریں، سالانہ جلسے کی مختصر روداد ۔ استانیوں کے مضامین اور خود پرنسپل صاحبہ کی متعدد نگارشات شائع کی گئی ہیں — عالمیہ اول اور دوسرے درجات کے نتائج امتحانات بھی اس میں موجود ہیں ۔ دعا ہے کہ یہ جامعہ سال بسال ترقی کرے اور اس کی ترقی میں اس کے اعلیٰ مقاصد بھی شامل رہیں ۔ جامعۃ الصالحات کی عمارت کی تین تصویریں بھی میگزین کی زینت ہیں ۔ ایک فوٹو میں ایک بچی اور ایک بڑی لڑکی کی تصویر بھی آ گئی ہے ۔ اگر بڑی لڑکی کا فوٹو نہ ہوتا تو اچھا تھا ۔ ممکن ہے عمارت کا فوٹو جب کھینچا جا رہا ہو تو وہ لڑکی بالاخانے پر آ کھڑی ہوئی ہو

اس میگزین میں متعدد چھوٹے بڑے ڈرامے بھی ہیں ایک ڈرامے کا عنوان ہے "سطحی عقیدے" ڈرامہ تو اچھا ہے لیکن اگر عنوان "وہمی عقیدے" ہوتا تو اچھا تھا ۔ ایک طویل ڈرامہ "مکافات عمل" کے عنوان سے ہے ۔ اس میں زبان کی کئی غلطیاں نظر آئیں ۔ ص ۵۴ پر ہے ۔ "منجانب کے حضور تمہارے حاضر ہونے کی غرض کیا ہے ؟ منجانب کا لفظ یہاں صحیح نہیں ہے ۔ مابدولت یا اسی طرح کا کوئی دوسرا لفظ ہونا چاہیے ۔ اسی صفحہ پر ہے ۔ "ہمارے حضور اس کا نام گوش گذار کرو" یہ کیا زبان ہے ؟ ہمارے حضور اس کا نام پیش کرو یا اس کا نام ہمارے گوش گذار کرو" ہونا چاہیے ۔ ص ۴۶ پر ہے :- پڑ انچے اڑ گئے" صحیح لفظ 'پرخچے' ہے پڑانچے بالکل غلط ہے ۔ ص ۴۷ پر ہے ۔ "بے نیل و مرام واپس جائے" نیل اور مرام کے درمیان واو غلط ہے "بے نیل مرام" ہونا چاہیے ۔ زبان

کی غلطی کے علاوہ ایک جگہ کی عبارت یہ ہے :۔

"اس کی نظر پھاٹک پر پڑی، اپنے اقتدار کا زمانہ
یاد آگیا کہ کبھی وہ اس محل کے اندر داد عیش دیتی
تھی"

خیزران کا محل بغداد میں تھا اور مزنہ کا محل دمشق میں۔ اس کو دیکھ کر وہ یہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ وہ اس محل کے اندر داد عیش دیتی تھی" کسی درس گاہ سے نکلنے والے میگزین میں اس طرح کی غلطیاں نہ ہونی چاہیں۔ صفحہ ۵۹ پر ہے۔ کیا مزہ اس ملاپ کا ہے۔ جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اصل میں یہ ایک مصرع ہے

"بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

جس طرح یہ نقل ہوا ہے وہ ناموزوں بھی ہو گیا ہے اور صحیح نقل بھی نہیں ہوا

یہ چند باتیں محض اس جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں کہ آئندہ اس طرح کی غلطیاں نہ ہوں تو اچھا ہے۔ پڑھنے والوں کے ذہن پر اس طرح کی غلطیوں کا خراب اثر پڑتا ہے۔ صفحہ ۳۰ پر ایک مضمون ہے جس کا عنوان عالم اسلامی خواتین کانفرنس ہے۔ سب سے پہلے یہ عنوان ہی قابل اصلاح ہے۔ "مسلم خواتین کی عالمی کانفرنس" عنوان ہونا چاہیے

صفحہ ۳۶ پر جو عربی تقریر ہے اس میں ایک آیت کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے "یعنی خدا کے عالیم تربیت اور پسندیدہ راستے کی طرف"۔ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اسی تقریر میں ایک ٹکڑا ہے فلیس فی وسعہ جس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے "اس کے لیے ممکن نہ تھا کسی کو کسی حال میں چھوڑ دینا ترک فعل ہے اور کوئی کام نہ کرنا تو ہر انسان کی قدرت میں ہے

اس کی نفی خدا سے کیسے درست ہوگی؟ کہنا یوں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ لوگوں کو اس حال میں چھوڑ دے کہ وہ وحی کی روشنی سے دور رہ کر زندگی گذاریں۔ بحیثیت مجموعی یہ سالانہ میگزین قابل مطالعہ ہے۔

کرنیں صفحات ۱۰۶ قیمت تین روپے۔ پتہ مرکزی درس گاہ جماعت اسلامی ہند رامپور یوپی

درس گاہ جماعت اسلامی ہند رامپور کے سالانہ میگزین کا یہ پانچواں شمارہ ہے اور رنگارنگ متنوع مضامین نثر و نظم کا ایک خوش رنگ اور خوشبودار گلدستہ ہے۔ ناظم درس گاہ اور اساتذہ کرام کی مشترکہ جدوجہد ہر سال ایک ایسا مجموعہ پیش کرتی ہے جو دلچسپ بھی ہوتا ہے اور مفید بھی امید ہے کہ طلبہ کے سرپرست خود طلبہ اور دوسرے لوگ دلچسپی سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

(بقیہ اشارات) فرائض کی ادائیگی میں سرگرم ہوتا ہے، حق پرستی اور حق گوئی اس کی زندگی کی عام روش ہو جاتی ہے۔

ان تصورات اساسی اور ان کے اثرات کے بارے میں اختصار کے ساتھ جو کچھ عرض کیا گیا یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہیں اور خدا کی بھیجی ہوئی آخری کتاب میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ نیز یہ کہ اللہ کی آخری کتاب اور تاریخ دونوں گواہ ہیں کہ ایک ایسی جماعت ایک ایسی سوسائٹی اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آچکا ہے جو ان

تصورات کا حال تھا اوران پر یقین رکھنے والوں کی زندگیاں ان کی آئینہ دار تھیں

ان تصورات اوران پر عمل نے ایک ملک کی کایا پلٹ دی تھی اورجہاں قتل وغارت، بدامنی، نسل پرستی، قبیلہ پرستی کی نحوست چھائی ہوئی تھی وہاں دیکھتے دیکھتے قلیل مدت میں انسانی جان ومال وآبروکے احترام، امن وسکون اورانسانی اخوت کی بہار آگئی تھی، جو لوگ ایک دوسرے کے لیے خونخوار تھے وہ ایک دوسرے کے غمخوار ہوگئے تھے۔ جن لوگوں کا دنیا کے حالات اورعالمی سیاست پر کوئی اثر نہ تھا وہ دنیا کے قائد اورامام بن گئے تھے۔

یہ تصورات کسی خاص قوم اورکسی خاص ملک کی جاگیر نہیں ہیں بلکہ سورج کی روشنی کی طرح عام ہیں، جو ملک بھی ان کو اختیار کرلے اس کی کایا پلٹ سکتی ہے اوروہ دنیا کا قائد اورامام بن سکتا ہے۔

اگر مذہب اورروحانی اقدار کو کمیونزم کی یلغار سے بچانا ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ مذہب کے وسیع اورجامع تصور کو اختیار کیا جائے، اسی کو پھیلایا جائے، اسی کے مطابق عمل کیا جائے اوراس کو ایک زبردست تحریک بنا کر میدان میں لایا جائے،

اقامت دین کا داعی

زندگی

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

ماہنامہ
زندگی
رامپور

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 12/-
پاکستان سے 12/-
ششماہی
ہندوستان سے 6/-
پاکستان سے 6/-
قیمت: [illegible]

مدیر: سید احمد قادری

جلد ۵۳ | جمادی الاخریٰ و رجب [illegible] مطابق اگست و ستمبر [illegible] | شمارہ ۲، ۳

اشارات — سید احمد قادری

مقالات

تحریک اسلامی اور تحریک جمہوریت — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
کچھ قابل غور باتیں — مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی
قرآن اور مسلمان — جناب الطاف گوہر
جماعت اسلامی ہند — جناب افضل حسین قیم جماعت
نائیجیریا کے مسلمان — جناب عبدالحق
رسالت کا انکار اور توحید کا اقرار! — جناب محمد ذکی
طلاق بندوق کی گولی نہیں ہے — سید احمد قادری
اقبال کی شاعری میں راست انداز بیان — "

تراجم و اقتباسات

تھائی لینڈ کے مسلمان — عربی سے ترجمہ

رسائل و مسائل

متعدد خطوط اور ان کے جوابات — سید احمد قادری
روداد اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ — جناب قیم جماعت اسلامی ہند

تنقید و تبصرہ — ع۔ق

اعلان و اشتہار — [illegible] سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے [illegible] خریداری کا ارادہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا [illegible]

منیجر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

قبرص میں یونان کی فوجی حکومت کی مداخلت کے جواب میں ترکی نے جس سیاسی شعور اور جرارت و ہمت کا ثبوت دیا ہے وہ ایک بڑا مسرت انگیز واقعہ ہے۔ قبرص میں جب سے برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے اسی وقت سے اس جزیرے کو یونان سے ملحق کر دینے کی مسلسل جدوجہد جاری ہے۔ قبرص میں یونانی نسل کے باشندوں کی اکثریت ہے اور ترکی نسل کے باشندوں کی تعداد کم ہے ترک اقلیت پر طرح طرح کے مظالم ہوتے رہے ہیں۔ آرک بشپ میکاریوس بھی اس ظلم وستم کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ اگر ترکی حکومت اپنی ہم مذہب وہم نسل اقلیت سے غفلت برتتی تو اب تک اس اقلیت کا بڑا حصہ یا تو ختم کر دیا جاتا یا اس کو جلا وطنی پر مجبور کر دیا جاتا یہ ترکی حکومت کا احساس فرض ہے جو یونانی حکومت اور قبرصی یونانیوں کے ہاتھ باندھے ہوئے ہے۔ ۱۵ جولائی کو وہاں ایک سازشی ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ قبرص کے نیشنل گارڈ نے آرک بشپ میکاریوس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور صدر صاحب اطمینان کے ساتھ لندن پہنچ گئے۔ اب تک اخبارات میں جو خبریں آئی ہیں ان کے مطالعہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ صدر میکاریوس خود اس سازش میں شریک تھے اور اگر ترکی حکومت فوجی مداخلت کر کے اس سازش کو ناکام نہ بنا دیتی تو قبرص پوری طرح یونان کی گود میں جا چکا ہوتا اور اس کے واسطے سے یہ جزیرہ مکمل طور پر امریکہ کے زیر اثر آجاتا۔

ترکی نے یونانی مداخلت کے جواب میں صدر میکاریوس کے خلاف بغاوت کو دبانے کے لئے فوجی مداخلت کی۔ ان کو خود اس کا اعتراف ہے اور انہوں نے اعلان بھی کیا ہے کہ یہ بغاوت یونان کی حمایت سے کی گئی ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ انہوں نے ترکی مداخلت کی مذمت کیوں کی؟ ان کو تو ترکی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیئے تھا کہ اس کی مدد سے بغاوت ختم ہوگئی اور وہ پھر برسر اقتدار آجائیں گے لیکن اس کے بجائے انہوں نے اس کی مذمت کی اور ترکی پر ایک نامعقول الزام لگایا۔ دوسری بات جو اس شبہ کو تقویت پہنچاتی ہے، یہ ہے کہ بقول وزیر اعظم ترکی، بغاوت سے بہت پہلے اندازے سے بہت زیادہ اسلحے جمع کر لئے گئے تھے اور یونانی فوجوں کی تعداد بھی اندازے سے بہت زیادہ

تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا صدر اس سے بے خبر تھے؟ بغاوت سے چند دن پہلے انہوں نے اعلان کیا کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی جارہی ہے اور دکھاوے کے لئے انہوں نے یونانی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اپنے ساڑھے چھ سو افسروں کو واپس بلالے اور اس کے چند دن بعد وہ واقعہ رونما ہوگیا جس کا انہوں نے اعلان کیا تھا اور صدر صاحب سلامتی کے ساتھ قبرص سے نکل گئے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس سازش کے ناکام ہوجانے کے بعد یونان کی فوجی حکومت بھی ختم ہوگئی اور اب وہ شخص یونان کا وزیر اعظم ہے جس کو یونان کی فوج نے جلاوطن کردیا تھا اور یہ آرک بشپ کے حامی ہیں اور عہدہ سنبھالتے ہی انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ میکاریوس ہی کو قبرص کا صدر تسلیم کرتے ہیں۔

واقعہ جو کچھ بھی ہو ترکی حکومت مبارکباد کے لائق ہے کہ اس نے حق وانصاف کی حمایت کے لئے ہر خطرے سے بے نیاز ہوکر قبرص میں اپنی فوج اتار دی ہے۔ اگرچہ اس کو اندازے سے زیادہ شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کو اتنی کامیابی ضرور حاصل ہوگئی کہ امریکہ مجبور ہوگیا کہ وہاں جنگ بندی کرادے۔ اگر ترکی فوج کا پلہ بھاری نہ ہوتا تو اس قدر جلد جنگ بندی نہ ہوتی۔ ترکی نے جنگ بندی اس لئے قبول کرلی کہ اس کا مقصد حاصل ہوچکا تھا وہ قبرص پر قبضہ جمانا نہیں چاہتا بلکہ وہ جزیرے کی سلامتی، قبرص میں ترک اقلیت کے تحفظ اور [illegible] کا خواہش مند ہے۔ کاریشیا بندرگاہ پر اس کا قبضہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ آئندہ کیا ہوگا یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اتنا یقینی ہے کہ جب تک قبرص کی آزادی اور ترک اقلیت کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاتی وہ اپنا قبضہ آسانی کے ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روس اس معاملے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اگر امریکہ نے ترکی کو آنکھ دکھائی تو روس اس کی حمایت کرے گا اور پھر امریکہ کے لئے قبرص سے ترکی فوج کو باہر کرنا آسان نہیں رہے گا۔ بحر روم میں قبرص کو ایک بڑی فوجی اہمیت حاصل ہے اور روس کبھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ امریکہ اس جزیرے کو اپنے لئے خاص کرلے۔

ترکی کے وزیر اعظم نے لندن جاکر امریکہ اور برطانیہ پر اتمام حجت کے بعد قبرص میں جو فوجی کارروائی کی وہ ترک [illegible] کی بیداری، ہمت اور جنگی مہارت کا ثبوت ہے۔ ترکی کو [illegible] کے معاہدہ کے تحت فوجی مداخلت کا قانونی حق بھی حاصل تھا۔ ترکی کے وزیر اعظم نے پہلے ہی آگاہ کیا تھا کہ اس معاملے میں وقت کی بڑی قیمت ہے۔ اگر فیصلے میں تاخیر کی گئی تو معاملہ [illegible] جائے گا جب انہوں نے لندن میں گفتگو کے بعد اندازہ کرلیا کہ امریکہ تاخیر کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے تو انہوں نے برطانیہ اور امریکہ کے چشم و ابرو کے اشارے کا انتظار نہیں کیا اور وقت ضائع کئے بغیر جرأت مندانہ اقدام کر ڈالا۔

قبرص کی ترک اقلیت خوش قسمت ہے کہ اس کو ایک [illegible] فرض شناس حکومت کی حمایت حاصل ہے۔

دعوت دین

تحریک اسلامی اور تحریک جمہوریت

سید ابوالاعلیٰ مودودی

نومبر ۱۹۶۷ء میں، مولانا ابوالاعلیٰ نے کارکنان جماعت اسلامی کے سامنے یہ تقریر لاہور میں کی تھی ہم اس کی افادیت کے پیش نظر معاصر ایشیا لاہور کے شکریئے کے ساتھ یہاں نقل کر رہے ہیں۔ (ادارۂ زندگی)

دوستو اور رفیقو! آپ کو معلوم ہے کہ جماعت اسلامی کا پروگرام چار اجزاء پر مشتمل ہے۔

ہمارا اوّلین کام جو سب سے زیادہ اہم اور مقدّم ہے۔ وہ دعوتِ الی اللہ ہے، یعنی لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف بلانا، انہیں خدا کی بندگی کی طرف دعوت دینا اور انہیں یہ سمجھانا کہ خدا کی بندگی کا حقیقی مفہوم اور اس کے لازمی تقاضے کیا ہیں۔ ہمارے پروگرام کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں انہیں صحیح اسلامی طریقے سے منظم کیا جائے۔ ان کے اندر ڈسپلن اور نظم قائم کیا جائے۔ جو اسلام کے مزاج کے مطابق ہے۔ ہمارے پروگرام کا تیسرا حصہ خلق خدا کی اصلاح کیلئے اس تنظیم کو استعمال کرنا ہے جو اس دعوت کو قبول کرنے والوں پر مشتمل ہو۔ گویا ہمارے نزدیک تنظیم بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی دعوت اور اصلاح کے کام کے لئے مقصود ہے۔ چنانچہ اس تنظیم کے وجود میں آجانے کے بعد پھر اس کا اوّلین کام یہ ہو جاتا ہے کہ وہ خلق خدا کی اصلاح کے لیے کوشش کرے۔ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ سچے مسلمان کی سی زندگی بسر کریں اور ان محرمات اور مکروہات کو چھوڑ دیں جن میں ایک کافرانہ تہذیب سے مغلوب و متاثر رہنے کی بدولت وہ مبتلا ہوئے ہیں۔ ان کے برعکس جو لوگ خدا تعالےٰ کے دین پر سچے دل سے ایمان نہیں رکھتے ان کے دلوں میں پختہ ایمان اتارنے کی کوشش کی جائے۔ آگے ایمان کی توفیق عطا کرنا یا نہ کرنا اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے پروگرام کا چوتھا اور آخری کام یہ ہے کہ ہم نظام حکومت کی اصلاح کے لئے کام کریں۔ اس نصب العین اور مقصد کے مطابق جو جماعت اسلامی کے سامنے ہے یعنی ہمارا کام نظام حکومت کی

اصلاح کسی امریکن یا انگریزی یا فرانسیسی یا جرمن نظام کو سامنے رکھ کر کرنا نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نظام کی اصلاح خلافت علیٰ منہاج النبوت کے نظام کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ کیوں کہ یہی نظام دراصل مسلمانوں کے لیے ایک حقیقی معیاری نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔

دعوت الی اللہ کے مراحل

ان چار اجزاء میں سے صرف آخری جز ایسا ہے۔ جس میں دوسری جماعتیں ہمارا ساتھ دے سکتی ہیں۔ جہاں تک پہلے تین اجزاء کا تعلق ہے چوں کہ ان میں ہمارا اپنا ایک طریق کار ہے اس لیے اگر دوسری جماعتیں ہمارے ساتھ ان امور میں بھی اتفاق رکھتی ہوں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس طریق کار کو بھی اختیار کریں جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اس لئے پہلے تین کام ہمارے اپنے ہیں جنہیں ہم آج تک اپنے طریقوں پر کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے چلے جائیں گے (انشاء اللہ)۔ البتہ چوتھا اجزا ایسا ہے کہ جس میں خدا کے فضل سے ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی ہم سے اتفاق کیا ہے اور ہمارے اور ان کے درمیان یہ بات طے ہو گئی ہے کہ نظام حکومت کی اصلاح کا کام صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق باہمی تعاون سے کیا جائے اور اس کے لئے مل جل کر کوشش کی جائے۔

گالی یا اصلاح

اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھئے کہ ہمیں نظام حکومت کی اصلاح کے لئے کام کرتے ہوئے موجودہ حکومت پر تنقید بھی کرنا ہے۔ اس کی خرابیوں کو بیان بھی کرنا ہے لیکن تنقید کے معنی گالی دینے کے نہیں ہوتے۔ تنقید کے معنی یہ ہیں کہ ایمانداری کے ساتھ جو خرابی آپ محسوس کریں اسے واضح طور پر بیان کریں۔ مسلمان خواہ کسی معاملے میں کام کرے وہ اخلاق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق اور انصاف کی بات کہتا ہے اور شریفانہ اور مہذب طریقے سے کہتا ہے۔ کسی شخص کی ذات سے ہمیں قطعاً کوئی عداوت نہیں ہے خواہ وہ موجودہ حکمران ہوں یا اور کوئی ہو، اگر ہمیں کسی چیز سے عداوت ہے تو وہ غلط کام سے ہے اور غلط کام سے عداوت بھی اس لیے ہے کہ اس کو صحیح سے بدلا جائے۔

چنانچہ آپ لوگ خود بھی اس بات کا لحاظ رکھیں اور دوسری جماعتوں کے لوگوں کو بھی اس بات کی تلقین کریں۔ اور اگر وہ یہاں موجود ہوں تو میں بھی انہیں تلقین کرتا ہوں کہ تنقید کرتے ہوئے نہایت مہذب اور شریفانہ طریقہ اختیار کیجیے۔ کسی کی ذات پر کوئی حملہ اور چوٹ نہ کیجیے، کسی کی تضحیک نہ کیجیے۔ لیکن جن کا جو کام غلط ہے اسے بیان کرنے میں اور اس کی غلطی واضح کرنے میں قطعاً کوئی کسر نہ اٹھا رکھیے کیوں کہ غلط کام تو غلط ہی ہے خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔ اس لئے غلط کام کو تو غلط ہی کہا جائے گا۔ اس کی غلطی کو آپ کھل کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں البتہ ساتھ ہی یہ بھی بتائیے کہ آپ مثبت طریقے سے کیا چاہتے ہیں۔ یعنی محض کسی شخص کی مذمت کر کے ہی نہ رہ جائیے جس سے یہ تاثر پیدا

کہ آپ کے پیشِ نظر فقط دوسرے کی مذمت ہی کرنا ہے بلکہ واضح طور پر لوگوں کو بتایئے کہ ہمارے نزدیک جو چیز غلط ہے وہ کس دلیل سے غلط ہے اور جو چیز صحیح ہے وہ کس دلیل سے صحیح ہے اور یہ کہ وہ کون سے حقائق، دلائل اور نکات ہیں جن کی بنیاد پر ہم اس غلط کو صحیح میں بدلنا چاہتے ہیں۔ ہماری اصل دشمنی غلط کاموں اور باطل سے ہے، ہمیں کسی سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے۔ اگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اس وقت اقتدار ہے، غلط طریقے کو چھوڑ کر صحیح طریقے کو اختیار کر لیں تو "چشم ما روشن دل ما شاد" اس سے زیادہ ہمارا مقصود کچھ نہیں وہ لوگ برسرِ اقتدار رہیں اور کرسیاں ان کے پاس رہیں۔ ہمیں کسی کرسی کی حاجت نہیں ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اقتدار صحیح کام کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔

معقول روش کے نتائج

تنقید کا یہ مہذب انداز اختیار کرنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر آپ یہ طریقہ اختیار کریں گے تو دوسروں کو اس بات کا بہانہ ملے گا کہ وہ آپ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اگر پھر بھی وہ رکاوٹیں ڈالیں گے تو پورا ملک اس بات کو محسوس کرے گا کہ ان لوگوں کو درحقیقت دیانتدارانہ اختلاف کبھی گوارا نہیں ہے کہ اگر اس طرح کے طرزِ عمل پر فریق مخالف چڑھ گیا تو یہ ایک فطری بات ہے۔ اسے چڑنا ہی چاہیئے تھا۔ اس صورت میں آپ کی اپنی پوزیشن بھی خراب ہوتی ہے اور مخالف کو بھی آپ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے یا آپ پر حملہ آور ہونے کا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ اپنے طور پر تنقید کا نہایت مہذب، معقول اور شریفانہ طریقہ اختیار کریں اور محض دلیل سے بات کریں، کسی کی ذات پر کوئی چوٹ اور حملہ نہ کریں تو عوام خود یہ محسوس کریں گے کہ یہ معقول لوگ ہیں۔ اگر کوئی ان کی معقول روش کو بھی برداشت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ناقابلِ برداشت ہے۔

ہماری دعوت ہمہ گیر ہے

یہ حقیقت آپ کے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ آپ جس مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں اور جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ حاصل بھی اسی صورت میں ہوگا جب کہ یہ پہلے تین امور ساتھ ساتھ جاری رکھے جائیں۔ اگر آپ یہ تینوں کام ساتھ ساتھ نہ رکھیں گے اور پوری قوت کے ساتھ انہیں عمل میں لانے کی کوشش نہ کریں گے تو آپ کے سیاسی پروگرام کا میاب ہو جانا بھی اس مقصد کیلئے مفید نہیں ہوگا جس کیلئے آپ کام کر رہے ہیں۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ آپ عین لڑائی کی حالت میں بھی اپنی دعوت اور تبلیغ کو جاری رکھیں۔ تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدانِ جنگ میں بھی دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمان کسی حالت میں بھی اپنے اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ خلقِ خدا کو اللہ تعالےٰ کی بندگی کی طرف بلائے۔ یہ دعوت الی اللہ کا کام مسلمان اور اس کی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ دعوت الی اللہ کا مقصود حاصل اسی صورت میں ہوتا ہے جب ہم عملی زندگی کی رزمگاہ میں اس دعوت کو جاری رکھیں۔ ہم میں اور عیسائی مشنریوں میں فرق

یہی ہے کہ وہ کچھ پیشہ ور مشنری ہوتے ہیں جو تبلیغ کا کام کرتے ہیں. لیکن مسلمان کی تبلیغ رزمگاہ حیات میں ہوتی ہے، یہ تبلیغ کہیں الگ بیٹھ کر محض واعظ کی حیثیت سے نہیں ہوتی بلکہ مسلمان اگر کسی منڈی میں کام کرتا ہے تو ایک طرف تو وہ اپنا کام کرتا ہے اور دوسری طرف وہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتا ہے. مسلمان جہاں کہیں بھی ہے اور جو کام بھی کر رہا ہے وہ ہر حالت میں داعی الی اللہ پہلے ہے اور باقی اور کچھ بعد میں۔ اسی طرح اگر میدان جنگ میں وہ دشمن سے لڑتا ہے تو عین لڑائی کی حالت میں جو لوگ فدایان اسلام کے مقابلے میں لڑنے کے لئے نکلتے ہیں وہ ان کی خدا ترسی اور انسان دوستی سے جان لیتے ہیں کہ یہ ہماری جان کے دشمن نہیں اگر ہم اس وقت اللہ کا کلمہ پڑھ لیں تو یہ اسی وقت ہمیں گلے سے لگانے کو تیار ہیں. اگر ہم نے انہیں زخمی بھی کر دیا ہو تو ہم سے زخم کھانے کے باوجود ہمارے کلمہ پڑھ لینے پر ان میں سے کوئی شخص کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا. پس دعوت الی اللہ کی یہ وہ نشانی ہے جو آپ کے مقصد کے حصول کے لئے درکار ہے. اس لئے فرض کیجئے اگر یہاں اسلامی نظام بن جائے اور وہ دعوت الی اللہ کے بغیر بنے تو وہ اسلامی نظام نہ بن سکے گا چاہے اس کی شکل دستوری طور پر اسلامی ہی کیوں نہ ہو۔ محض دستوری طور پر اگر کوئی اسلامی نظام بنا بھی دیا جائے تو وہ درحقیقت اسلامی نظام نہیں ہو سکے گا کیونکہ وہ روح سے خالی ہوگا۔ روح اس میں دعوت الی اللہ سے آتی ہے. جب تک آپ لوگ اپنے اندر خدا کی بندگی کا گہرا جذبہ پیدا نہیں کریں گے، یہاں اسلامی نظام حکومت قایم نہیں ہو سکے گا. اگر محض اسلامی دستور بنا کر رکھ دیا جائے اور لوگوں کے اندر خدا تعالےٰ کی بندگی اور فرماں برداری کا حقیقی جذبہ اور دین کے ساتھ گہری وابستگی کا ذوق پیدا نہ ہو تو وہ دستور کاغذ سے اٹھ کر خود بخود زمین پر نافذ نہ ہو جائے گا

خلق خدا کی اصلاح اور اسلامی نظام

خلق خدا کی اصلاح کا جو کام ہمارے پروگرام کا ایک حصہ ہے وہ بھی اس مقصد کے لئے ضروری ہے جس مقصد کے لئے ہم سیاسی طور پر کوشش کر رہے ہیں اگر ملک کے اندر سیاسی طور پر اسلامی نظام قایم ہو جائے لیکن ملک کے لوگوں کے اخلاق اس کی بالکل ضد ہوں تو وہ نظام کبھی نہیں چل سکتا. اسلامی نظام حکومت اسی طرح کی رعیت چاہتا ہے جو اس کے مزاج کے مطابق ہو. ایسے عوام کو جو جھوٹی گواہیاں دینے کے عادی ہوں ظاہر بات ہے کہ وہ اسلامی عدالت کے لئے مفید نہیں ہو سکتے اسلامی عدالت ایسے لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتی جو یہ سمجھتے ہوں کہ عدالت تو سچ بولنے کی جگہ ہی نہیں چنانچہ اگر سچی شہادتیں فراہم نہ ہوں تو اسلامی نظام عدالت کیسے کام کرے گا. اسی طرح اگر لوگ حرام خوری کے عادی بنا دیئے جائیں اور اسلامی نظام بھی قائم کر دیا جائے تو اس کی دفعات قانون کی کتابوں میں لکھی رہ جائیں گی. حرام ذرائع سے دولت سمیٹنے والوں کے اندر اس کا چلنا ممکن نہ ہوگا ایسا

معاملہ دوسرے امور کا ہے۔ اگر لوگوں کے اخلاق تباہ کردیئے جائیں تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے اندر اسلامی نظام حکومت کامیابی کیساتھ چل سکے۔ نظام حکومت کاغذ پر لکھا ہوا نہیں چلتا بلکہ اسے انسان چلاتے ہیں۔ اگر انسان بگڑے ہوئے ہوں تو ان کے ہاتھ میں بہتر سے بہتر نظام حکومت کاغذ پر لکھا ہوا دیدیجئے وہ اسے صحیح طریقے سے نہیں چلاسکیں گے اسے چلانے کیلئے تو اسی طرح کے آدمی درکار ہوں گے اور وہ اسکے بغیر تیار نہیں ہوسکتے کہ آپ ملک کے سیاسی نظام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ خلق خدا کی اصلاح کا کام بھی کرتے جائیں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ آپ اس بگاڑ کو جو اسوقت ملک میں پھیل رہا ہے روکنے کا کام نہ صرف جاری رکھیں بلکہ اسے تیز تر کردیں۔ یہ خود اسلامی نظام کی بنیادی ضرورت ہے جو ہمارا نصب العین ہے۔

یاد رکھئے خلق خدا کی اصلاح ہمارے کام کا اہم حصہ ہے تاکہ جب کبھی یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کے لئے کارکن فراہم ہوسکیں بلکہ اس کیلئے ایسے ایماندار عوام موجود ہوں جو اس نظام کو خود اپنے اوپر نافذ کریں اور ان پابندیوں کو اپنی آزاد اور خوش دلانہ مرضی سے قبول کریں جو یہ نظام ان پر عائد کرنا چاہتا ہے جو اللہ کے حرام کو حرام مانیں اور اس کے حلال کو حلال تسلیم کریں۔ اصلاح معاشرہ کا یہ کام اگر آپ جاری رکھیں گے تو انشاء اللہ اس مقصد کے لئے بھی مفید ہوگا۔ جس کیلئے آپ سیاسی اصلاح کی کوشش کررہے ہیں اور یہ بجائے خود امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دینی تقاضے کو بھی پورا کرنیکا سبب بنے گا آپ جماعت اسلامی کی رکنیت اور اس کے کارکن ہونیکا حق ادا نہیں کرسکتے جب تک کہ آپ پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ یہ کام نہ کریں۔

تحریک اسلامی — ہمہ گیر تنظیم

ایسا ہی معاملہ آپ کی تنظیم اور تربیت کا ہے اس کی طرف سے بھی آپ اس دوران میں ہرگز غافل نہ ہوں۔ آپ کی صفوں میں تنظیم اور ڈسپلن موجود رہے۔ آپ کے درمیان اچھے تربیت یافتہ کارکن مصروف کار رہیں اور آپ برابر اپنی تربیت گاہوں کا اہتمام کرکے کارکن تیار کرتے جائیں۔ آپ کے اندر جتنے تربیت یافتہ کارکن موجود ہوں گے اور جتنی اچھی تنظیم اور ڈسپلن ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ آپ نصب العین کا حق بھی ادا کرسکیں گے اور اسی قدر آپ اس تعاون میں بھی مفید اور کارگر ثابت ہوں گے جس میں دوسری جماعتوں کے ساتھ شریک ہیں اور دوسری جماعتیں بھی یہ محسوس کریں گی کہ یہ ایک اچھی ٹیم ہے جو ہماری مدد کے لئے آئی ہے ورنہ اگر آپ نے اس دوران میں اپنے نظم کو ڈھیلا کردیا اور اپنی تربیت کو ناقص کردیا تو اس مقصد کے لئے بھی آپ مفید نہیں ہوسکیں گے اس لئے دوسری جماعتوں کو بھی یہ سمجھا دیجئے کہ اگر ہم اپنے تربیتی اجتماعات کرتے ہیں تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم آپ سے جدا کوئی اپنی الگ ڈفلی بجانا چاہتے ہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ خود آپ کیساتھ جس مقصد کیلئے تعاون کیا ہے وہ مقصد اس کے بغیر ٹھیک پورا نہیں ہوسکتا کہ ہم ساتھ ساتھ اپنے ہمہ گیر کام کو جاری رکھیں یہ کام اس ملک کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے اور اسی لئے یہ آپ کے لئے بھی مفید ہے۔

کچھ قابلِ غور باتیں

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

کائنات کی ساری مخلوق کے کچھ نہ کچھ خواص ولوازم ہوتے ہیں جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے، جب وہ چیز پائی جائے گی تو اس کے خواص ونتائج بھی پائے جائیں گے۔ مثلاً آفتاب کے طلوع سے روشنی پھیلے گی اور غروب سے تاریکی، بخاراتِ ارضی کے صعود سے بارش اور بارش سے روئیدگی پیدا ہوگی، آگ جلائے گی، پانی ٹھنڈک پہنچائے گا۔ زہر ہلاک کرے گا، گندگی سے وبائیں پھیلیں گی۔ اسی طریقے سے انسانی اعمال کے بھی خواص ولوازم اور اس کے نتائج ہوتے ہیں نیک اعمال سے دل میں انشراح اور بداعمالی سے انقباض پیدا ہوتا ہے۔ اعلیٰ سیرت وکردار، علم وفضل، اخلاص وصداقت، خدمتِ خلق، بے کسوں کی دستگیری اور فیاضی وغیرہ اچھے اعمال سے خود اپنے قلب کو راحت ملتی ہے اور سوسائٹی کی نگاہ میں عزت ووقعت پیدا ہوتی ہے اور بدکردار نگاہوں سے گر جاتا ہے [illegible] جب تک اس کا اعتبار نہیں ہوتا، بخیل ذلیل ہو جاتا ہے، یہی حال دوسرے برے اعمال کا ہے۔

اس لیے انسان کو دنیا وآخرت دونوں میں جو جزا ملتی ہے وہ بحقیقت اس کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہے۔ تجربہ ومشاہدہ بھی یہی کہتا ہے اور مذہب کی تعلیم ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ
وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا

اگر تم نیکی کرو گے تو اپنی ذات کے لیے کرو گے اور برائی کرو گے تو اس کے لیے کرو گے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ
فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ

جس نے نیک کام کیا اس نے اپنے نفس کے لیے کیا اور جس نے برا کام کیا تو اس کا وبال اسی پر ہے خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

یعنی خدا کی طرف سے کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوتی [illegible]

فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ [illegible]

يَضِلُّ عليها

جس نے ہدایت پائی تو اپنی ذات کے (فائدہ) کے لیے اور جو گمراہ ہوا تو اس کے (نقصان) کے لیے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی نیک عمل کرے گا تو وہ قیامت کے دن اس کو دیکھے گا اور جو ذرہ برابر برا کام کرے گا تو وہ بھی قیامت میں اس کے سامنے آئے گا

یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء

جس دن ہر شخص نے جو اچھے کام کیے ہیں ان کو موجود پائے گا اور جو برے کام کیے ہیں ان کو بھی موجود پائیگا یعنی آخرت میں جو اعمال کی جزا و سزا ملے گی وہ انسان کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہوگی۔

انسان میں خیر و شر اور نیکی و بدی دونوں کی صلاحیتیں ہیں حسن عمل میں وہ فرشتوں سے بھی بڑھ سکتا ہے اور بداعمالی میں شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اس کی اصلاح کی دو ہی شکلیں ہیں۔ اخلاقی تعلیم و تربیت اور وحی الٰہی کی ہدایت و رہنمائی۔ تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ ایک قادر مطلق ہستی پر ایمان و یقین اور اس کے خوف و خشیت کے بغیر محض اخلاقی تعلیم انسانی اصلاح کے لیے کافی نہیں ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے اخلاقی مصلح پیدا ہوئے۔ فلسفہ اخلاق پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کا کوئی دیرپا اثر نہ ہوا۔ ان کی کامیابی محض عارضی تھی، ان کی تعلیمات ان کے بعد فراموش کر دی گئیں اور انھوں نے اپنے بعد اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ کوئی جماعت نہیں چھوڑی جس سے آنے والی نسلوں میں اصلاح کا سلسلہ قائم رہتا اور آج ان کا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے اور ان کا فلسفہ اخلاق صرف کتب خانوں کی زینت ہے، اور دنیا میں اخلاق و روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت و رہنمائی اس کے تزکیہ و تطہیر، نیکی و بدی کی وضاحت، اس کی تعلیم و تربیت اور ترغیب و ترہیب کے لیے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ
وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

اے پیغمبر! ہم نے تم کو شہادت دینے والا، خوش خبری سنانے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

وہی اللہ ہے جو اپنے بندہ پر اپنی کھلی آیتیں اتارتا ہے، تاکہ تم کو تاریکیوں میں سے روشنی میں لائے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

پیغمبر لوگوں کو خدا کی آیتیں سناتا، ان کو پاک کرتا اور حکمت سکھاتا ہے۔

خدا نے اُن کے ذریعے نیکی اور بدی کی راہیں بھی بتا دیں

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ

اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے دکھا دیے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا

اور انسان اور اس ذات کی قسم جس نے اس کو درست بنایا۔ پھر اس کو بدکاری اور پرہیزگاری دونوں چیزیں سمجھا دیں جس نے اس (نفس) کو پاک کیا اس نے یقینی فلاح پائی اور جس نے اس کو دبا دیا وہ ناکام و نامراد رہا۔

ان اچھے برے اعمال کی وضاحت، نیک کاموں کی ترغیب اور برے کاموں سے ترہیب اور ان کی جزا و سزا کی پوری تفصیل تمام الہامی صحیفوں میں ہے، اور علم صحیح اور ہدایت و رہنمائی کا سب سے قابل اعتماد ذریعہ یہی صحیفے اور انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن موجودہ دور کے مادی نقطۂ نظر کا سب سے بڑا مغالطہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جبکہ انسانی عقل و شعور حد کمال کو پہنچ گئے ہیں اور اس نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں، سائنس کی ایجادات و انکشافات نے دنیا کو عالم طلسمات اور سامان تعیش کی فراوانی نے نمونۂ جنت بنا دیا ہے، انسانی اولوالعزمی اور عظمت کا جھنڈا سیاروں [illegible] سے بھی حیرت انگیز کارنامے

کے امکانات ہیں عقل کے سوا اس کو اور کسی طاقت کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

انسان کے عقلی و ذہنی کمالات اور سائنس کے کارناموں کے متعلق جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ سب تسلیم ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے کائنات کا معمہ حل کر لیا ہے، اس پر اس کے سارے اسرار منکشف ہو گئے ہیں اور اب کوئی چیز پردۂ راز میں نہیں رہ گئی ہے۔ سائنس کی ساری ترقیوں کے باوجود پوری کائنات کا کیا ذکر، کرۂ ارض کے متعلق بھی اس کا علم اور اس کی تحقیقات بہت محدود اور ناقص ہے اور خود علمائے سائنس کو اس کا اعتراف ہے کہ سائنس نے اب تک جو انکشافات کیے ہیں وہ غیر معلوم چیزوں کے مقابلے میں سمندر کا ایک قطرہ ہیں پھر جس عقل و حواس پر انسان کو ناز ہے وہ صرف کرۂ ارض کے حالات کا ادراک کر سکتے ہیں جو پوری کائنات کا معمولی حصہ ہے۔ پوری کائنات میں اس سے بڑی بڑی بے شمار دنیائیں موجود ہیں ان کے احاطے سے انسانی عقل قاصر ہے اور ابھی بہت سی دنیاؤں کا علم بھی نہیں ہو سکا ہے۔ ان کے طبعی قوانین کرۂ ارض کے قوانین سے بالکل جدا ہیں۔ جو زمین سے چند میل کی بلندی پر بالکل بدل جاتے ہیں اور ہمارے حواس ان کے لیے بالکل بے کار ہو جاتے ہیں اور ہم ان کے بارے میں ظن و تخمین کے علاوہ کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے۔ جب اس مادی کائنات میں ہمارے حواس کے تعطل اور ہماری عقل کی نارسائی کا یہ حال ہے تو اس مادی کائنات کے ماورا جو عالم ہے اس کے احوال و کوائف کا ادراک کس طرح کر سکتی ہیں

اس عالم کے وجود سے انکار کی کوئی عقلی دلیل نہیں، ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علم و تجربے میں نہیں ہے، لیکن کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں۔ خود اس دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک ان کا تجربہ و مشاہدہ نہیں ہوتا ہماری عقل ان کو قبول نہیں کرتی، لیکن تجربہ ہونے کے بعد حقیقت بن جاتی ہیں۔ ریڈیائی لہریں ہمیشہ سے موجود تھیں لیکن اب سے چند سال پہلے کون اس کا یقین کر سکتا تھا کہ دنیا بھر کی آوازیں ہزاروں میل سے آن واحد میں سنی جا سکتی ہیں لیکن آج ایک عامی بھی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور کانوں سے سن رہا ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ اس لیے اس مادی عالم کے ماوراء کسی عالم کے وجود سے انکار کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہے، لیکن جس طرح اس عالم مادی کے حقائق کے ادراک اور اس کے اسرار کے انکشاف کے لیے عقلی و ذہنی قویٰ اور علمی تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ماورائے مادہ عالم کے ادراک اور اس کے احوال و کوائف کی معرفت کے لیے روحانی قویٰ کی ضرورت ہوتی ہے جو انبیاء علیہم السلام اور خدا کے دوسرے برگزیدہ بندوں کو حاصل ہوتے ہیں اور اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ خاص قسم کی ریاضت سے غیر انبیاء کو بھی یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس کو روحانی تلاش و تحقیق کہہ سکتے ہیں لیکن سب سے معتبر ذریعہ وحی الٰہی ہے جس میں کسی غلطی کا احتمال نہیں۔ انبیاء اور اولیاء کے لیے عالم غیب عالم شہود بن جاتا ہے اور وہ اس کو عالم مادی سے زیادہ حقیقی مانتے ہیں۔ اس عالم پر یقین مذہب کی جان ہے۔ اسی لیے سارے مذاہب الہامیہ نے اس پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے اور انسانیت کی فلاح کا صحیح راستہ یہی ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں بھی اس کو فلاح نہیں ہو سکتی۔

اس مادی نظام حیات اور اس کی زائیدہ تہذیب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو اس ایمان و یقین کی دولت اور ان کے حقیقی شرف و عظمت سے محروم کر کے محض گوشت پوست کی ایک مشین اور نفس پرست حیوان بنا دیا ہے جس کی زندگی کی غرض و غایت تعیش و نفس پرستی اور جاہ و اقتدار کا حصول ہے اور اس کے وسائل: دولت اور مادی ترقی اس کا مقصود و معبود بن گئے ہیں۔ ان کے سامنے انسانی شرف و عظمت کے اصلی عناصر حق و صداقت، عدل و مساوات، انسانی ہمدردی اور عفت و پاکیزگی وغیرہ اخلاقی اقدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے جن کے بغیر نہ صرف انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں عدل و مساوات قائم نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی قیود کے ٹوٹنے کے بعد پھر انسانی خود غرضی اور بے راہ روی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ بغیر کسی اخلاقی قید کے نفس کے مطالبات کی تسکین اور زندگی کی لذتوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی کا نتیجہ وہ اخلاقی آوارگی اور فسق و فجور ہے جس کے سامنے حیوانیت بھی شرماتی ہے اور حب جاہ و اقتدار کا نتیجہ ظلم و زیادتی اور فساد فی الارض ہے جس کا مشاہدہ آج کل دنیا میں کیا جا سکتا ہے، ابھی حال تک دنیا کے [illegible] اور

ملکوں اور قوموں کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کے لیے مختلف قسم کے ذرائع اختیار کرتی ہیں۔ اب سیاسی غلامی کا زمانہ ختم ہو چکا اس لیے مختلف خوب صورت ناموں (اور مالی، فوجی اور ٹیکنیکل امداد کے ذریعے چھوٹے اور کمزور ملکوں کو پھانستی ہیں۔ اس دام میں ایشیا کے پس ماندہ اور ترقی پذیر ملک آسانی سے آجاتے ہیں جس سے مشکل ہی سے کوئی ملک مستثنیٰ نکل سکتا ہے۔

اس سے خود ان قوموں میں مستقل رقابت اور کش مکش پیدا ہو گئی ہے اور ان میں ہمیشہ گرم یا سرد جنگ جاری رہتی ہے۔ آپس کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ ایک قوت دوسری قوت سے خائف ہے اور اپنے تحفظ اور حریفوں کے مقابلہ کے لیے اس کی ساری ذہنی و دماغی قوتیں ایسے آلات و اسلحہ کی ایجاد میں صرف ہو رہی ہیں جس سے ان کو زیر کیا جا سکے۔ چنانچہ سائنس کی بیشتر اہم ایجادات جنگ اور اس کے متعلقات ہی کے لیے ہوتی ہیں۔ جن چیزوں کو انسانی عزم و حوصلہ کی فتح اور سائنس کے معجزے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی جذبۂ مسابقت کا نتیجہ ہیں جس نے دنیا کا امن و سکون خطرے میں ڈال دیا ہے۔

اسی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس دور کی سیاست سراسر فریب و نفاق بن گئی ہے۔ دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ، لبوں پر تبسم اور زبان میں شیرینی ہے اور دل میں بغض و عناد کی بھٹی سلگ رہی ہے۔ سیاست کی زبان بھی ذو معنی ہوتی ہے جس کے ظاہری معنے کچھ ہوتے ہیں، اندرونی کچھ، اور معاہدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی ہے۔ مختلف قوموں سے بیک وقت متضاد معاہدے کیے جاتے ہیں۔ اس دور کا سب سے بڑا اور کامیاب مدبر وہی ہے جو سب سے بڑا منافق ہو۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ڈاکٹر اقبال جس زمانے میں لندن میں پڑھتے تھے ان کی لینڈ لیڈی نے ان سے پوچھا "مسٹر اقبال! کیا بات ہے کہ سارے پیغمبر ایشیا میں پیدا ہوئے، یورپ میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔" انھوں نے جواب دیا۔ "یورپ میں شیطان پیدا ہوتے ہیں۔" اس نے کہا "یہ کیسے؟" اقبال نے کہا، "یورپ کے مدبرین شیطان ہی تو ہیں۔" یہ لطیفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے آج دنیا میں جو فساد بھی برپا ہے وہ سب انہی کا لایا ہوا ہے۔

اس تہذیب کی بعض خوبیوں اور مادی فوائد سے انکار نہیں۔ اس کے متعلق جو بھی کہا جاتا ہے سب صحیح ہے۔ اس نے انسانی راحت اور اس کی تکلیفوں کے ازالے کے ایسے ایسے سامان فراہم کر دیے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مغربی قوموں میں انسانی ہمدردی بھی ہے، جب کوئی ملک کسی ارضی و سماوی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ امداد کے لیے دوڑ پڑتی ہیں۔ انھوں نے انسانی بھلائی کے بہت سے کام کیے ہیں مگر ان کے مادی تصور حیات نے ان کی ان خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ یہی قومیں سیاست کے میدان میں چنگیز و ہلاکو بن جاتی ہیں۔ وہ انسانی ہمدردی اور مادی ترقی کس کام کی جو انسان کو جوہر انسانیت سے خالی کر کے اعلیٰ درجہ کا حیوان بنا دے اور انسانی راحت و آسائش کے ساتھ اس کی ہلاکت و تباہی کے سامان بھی فراہم کر رہے ساتھ اس کی

مثال ایسی ہے کہ اعلیٰ درجے کا عرق گلاب کھینچنے کے بعد اس میں نجاست بھی ملا دی جائے

درحقیقت مذہب ہی میں وہ قوت ہے جو انسان کو اس کی حیوانی جبلت اور اخلاقی بے راہ روی سے روکتی ہے اس سے ہماری مراد رسمی مذہب نہیں بلکہ سچی خدا پرستی ہے، جو انسانوں میں ایسا اخلاقی احساس پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ طبعاً نیکی اور بھلائی کی طرف راغب اور برائی سے نفور ہو جاتا ہے، یا کم سے کم برائی کو برائی سمجھتا اور اس کے نتائج سے خائف رہتا ہے۔ برائی کو آرٹ اور ہنر نہیں سمجھتا۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت بھی اس کی پوری پابند نہیں ہوتی اور ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا رہتی ہے۔ حقیقتہً ایسے لوگوں کا مذہب رسمی اور موروثی ہوتا ہے حقیقی نہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ خدا اور مذہب کو مانتے ہیں۔ ان کے دل اس کے خوف سے بالکل خالی نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ان کو اپنی بداعمالی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی اصلاح کی امید رہتی ہے لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں اور ان کا فلسفہ حیات

۴ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ہے، ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ اس لیے موجودہ دنیا کو پہلے زمانے سے زیادہ مذہب کی ضرورت ہے جب انسان کی عقل خام اور اس کی زندگی سادہ تھی، اس کی برائیاں بھی سادہ اور محدود تھیں، تعیش و نفس پروری میں یہ تفنن اور آرٹ نہ پیدا ہوا تھا۔ اس کی وحشت اور درندگی کے نتائج بھی محدود تھے۔ جن سے زیادہ سے زیادہ چند ہزار جانوں کا اتلاف ہوتا تھا، یا ان کو نقصان پہنچتا تھا لیکن موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسانوں کے ہاتھوں ایک ایک جنگ میں لاکھوں انسان ہلاک اور کروڑوں بیکار ہوتے ہیں۔ ہلاکت خیز اسلحہ سے بڑے بڑے بارونق شہر چشم زدن میں خاک کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ ان سفاکیوں کو روکنے، قوموں و ملکوں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام اور ان کے اختلافات کے پُرامن تصفیہ کے لیے بین الاقوامی مجالس قائم ہیں لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام ہیں اور طاقتور قوموں کا آلۂ کار بن گئی ہیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتیں اور آج بھی جس کی لاٹھی، اس کی بھینس کا معاملہ ہے بڑی طاقتیں ان کے فیصلوں کی کوئی پروا نہیں کرتیں اور یہ مجالس ایک تماشا بن کر رہ گئی ہیں۔ اس کا سبب بھی مادی تصور حیات ہے۔ جب تک یہ نہ بدلے گا کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

جب کوئی قوم خدا فراموشی اور اخلاقی گراوٹ کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے۔ ایسی قوموں کا عبرت ناک انجام تاریخوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ بعض با جبروت قومیں ایسی مٹیں کہ آثار قدیمہ کی زبان کے علاوہ ان کی داستان عبرت سنانے والا کوئی نہیں۔ روما کا زوال تو تاریخی عہد کا ہے اس کے دور عروج میں کون اس کے زوال کا یقین کر سکتا تھا، مگر اس کے اخلاقی بگاڑ نے اس کو ایسا مٹایا کہ ...

کے لیے سامان عبرت ہے۔ جو قومیں اپنی بداعمالیوں کے باوجود زندہ ہیں ان کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ ابھی زندگی کے بعض اصولوں پر ان کا عمل ہے۔ مثلاً قومی وحدت، محنت و جفاکشی، علم و تحقیق کی راہ میں جگر کاوی، ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو ترجیح، ملک و قوم کی راہ میں ہر قسم کی جانی و مالی قربانی وغیرہ — لیکن اخلاقی بگاڑ کے ساتھ یہ اوصاف بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے اور ان کے اعمال کا نتیجہ دیر سویر ظاہر ہو کر رہے گا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جس طرح قومیں صدیوں میں بنتی ہیں اسی طرح ان کو بگڑنے اور مٹنے میں بھی ایک زمانہ لگ جاتا ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو قومیں آج بام عروج پر ہیں وہ ہمیشہ رہیں گی۔ ان کے عروج کا ایک سبب ایشیا اور افریقہ کی دولت تھی، وہ ان کے ہاتھوں سے چھن گئی ہے۔ برطانیہ جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا، انگلینڈ کے جزیرے میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہٹلر کا انجام نگاہوں کے سامنے ہے۔ جرمنی کا غرور ٹوٹ چکا۔ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں میں گھن لگ چکا ہے، عجب نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں۔ مادی تہذیب کے ان نتائج کو دیکھ کر یورپ کے مفکرین اس کے انجام سے خائف ہیں۔ قوموں کو ان کے اعمال کی جو سزا ملتی ہے، کبھی وہ خرق عادت کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی قانون قدرت کے مطابق۔ مثلاً سیلاب، زلزلے، طوفان، وبائیں، بدامنی، فتنہ و فساد، جنگ کی خونریزی، قحط، معاشی تنگی وغیرہ۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دنیا کے حالات عذاب الٰہی سے کم نہیں، سرکشی و بغاوت عام اور امن و سکون مفقود ہے۔ ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے۔ بڑی طاقتیں تک ایک دوسرے سے ہراساں اور اپنے تحفظ اور حریف کے مقابلہ کے لیے ہلاکت خیز اسلحہ کی دوڑ میں مشغول ہیں۔ حکومتوں میں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے ہیں۔ ایشیائی ملکوں کا حال اور بھی برا ہے اس کی مثال خود ہمارا ملک ہے۔ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں کم لوگوں کو ملک و قوم کے مفاد کی پروا ہے۔ قانون کا احترام ختم ہو گیا ہے، قانون شکنی عام ہے۔ بات بات پر اسٹرائکیں اور فساد ہوتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں۔ جان و مال کا اتلاف ہوتا ہے۔ دیانتداری عنقا اور رشوت عام ہے جس سے مشکل ہی سے کسی صاحب حیا کا دامن پاک نکل سکتا ہے، دولت معبود و مقصود بن گئی ہے ہر شخص اس کے پیچھے سرگرداں ہے۔ زندگی اتنی گراں ہو گئی ہے کہ وبال جان بن گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک نے صنعتی حیثیت سے بڑی ترقی کی ہے، قومی دولت بھی بڑھ گئی ہے بعض طبقوں کا معیار زندگی بھی اونچا ہو گیا ہے۔ جن کے یہاں حلال و حرام کی قید نہیں لیکن جائز آمدنی سے مشکل ہی سے کوئی آدمی معیار زندگی قائم رکھ سکتا ہے۔ ان ساری خرابیوں کا صرف ایک علاج ہے۔ اس کو مذہب کہیے یا اخلاقی ذمہ داری کا احساس جو بغیر مذہب کے پیدا نہیں ہو سکتا۔

"معارف" [illegible]

قرآن اور مسلمان

(جناب الطاف گوہر)

سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں مرحوم کے صاحبزادے جناب الطاف گوہر نے ایک تقریر بزبان انگریزی ہوٹل کموڈور لاہور میں ایوان افکار کے زیر اہتمام ۵ مئی ۱۹۷۳ء کو کی تھی اور دوسری تقریر اردو میں ۶ مئی ۱۹۷۳ء کو وائی ایم سی اے ہال میں کی تھی۔ انگریزی تقریر کے ترجمہ اور اردو تقریر کی ترتیب کا کام جناب حفیظ الرحمٰن احسن ایم اے نے انجام دیا ہے۔ ان دونوں تقریروں کا مکمل متن ٹیپ ریکارڈ سے لیکر معاصر ہفت روزہ آئین لاہور نے شائع کیا تھا۔ ہم معاصر کے شکریے کے ساتھ دونوں تقریریں ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔ (ادارۂ زندگی)

صاحب صدر اور معزز سامعین!

جناب الطاف حسن قریشی نے میرا ذکر جن محبت بھرے الفاظ کے ساتھ کیا ہے اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ میں آپ کے سامنے جو گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ فی الواقع کسی غیر معمولی تجربے کی عکاسی کرتی ہیں جیسا کہ انہوں نے اس خیال کا اظہار فرمایا ہے۔ جو کچھ میں عرض کروں گا اس کی حیثیت محض قرآن مجید کے ایک کم مایہ طالب علم کی عاجزانہ کاوش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ یہاں ایسے اہل علم حضرات بھی تشریف رکھتے ہیں جنہوں نے اس میدان میں سالہا سال مطالعہ و تحقیق کی ریاضت بہم پہنچائی ہے اور پھر اس مجلس میں بعض گرامی قدر اساتذہ بھی تشریف فرما ہیں جن کے علم و فضل سے میں نے اسی شہر کے اندر اپنے زمانہ طالب علمی میں بھرپور فیض اٹھایا ہے۔

اب سے دو تین ماہ پیشتر روڈیشیا میں ایک صحافی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ چند روز پہلے اسے ۱۷ دن کی قید کے بعد رہا کیا گیا اپنی رہائی کے بعد گزشتہ شب ایک انٹرویو کے دوران میں اس نے اپنی گرفتاری کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا

اس کی یہ نظربندی قید تنہائی کے ایک اذیت ناک تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جونہی اس کو قید تنہائی میں ڈالا گیا اس نے یوں محسوس کیا کہ گویا پوری دنیا سے اس کا رابطہ کٹ گیا ہے۔ اس کے بعد اس کی واحد شعوری کوشش یہی رہی کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے تمام رشتوں، تعلقات اور روابط کو فراموش کر سکے۔ یوں اس نے یہ ا، دن ایک طرح سے معطل شدہ احساس کی کیفیت میں گزارے ہیں ——

میں نے بھی گزشتہ ۱۶ مہینوں میں سے بارہ ماہ کا طویل عرصہ جیل میں گزارا ہے اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس صحافی کے بیان کردہ تجربے کے مطابق فی الواقع یہ ایک معطل شدہ احساس کی کیفیت سے دوچار ہونے کا تجربہ تھا۔

جیل میں میرے مطالعۂ قرآن کا آغاز کسی ارادی انتخاب کا نتیجہ نہیں تھا جب مجھے جیل میں ڈالا گیا تو میرے پاس نہ کوئی کتاب تھی اور نہ کاغذ، پنسل، اس لیے میں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ مانگا۔ یہ کچھ اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات و کیفیات میں ایک شخص اپنے بچپن کے تعصبات یا ابتدائے شعور کی وابستگیوں میں پناہ لینا چاہتا ہے، یا کچھ اس سبب سے کہ ایک شخص ایسے مصیبت کے لمحات میں اپنے والدین کو یاد کرتا ہے یا اس لیے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ایسے حالات میں وہ قرآن کے مطالعہ کی طرف رغبت محسوس کرتا ہے —— دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب جو میرا ارادی انتخاب کے پس منظر میں کارفرما تھا وہ جرم کے متعلق مجھے تجربے سے محسوس ہوا کہ وہ پوری طرح درست نہ تھا، نہ یہ تھا کہ کم از کم یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں کسی تنقید یا اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کر دیا۔

میں نے اپنے قرآن پڑھنے کا آغاز پکتھال کے انگریزی ترجمے سے کیا۔ ابتدائی چند روز یہ پڑھنے کا عمل محض ایک مشینی عمل تھا، کسی کتاب کو بس اس وجہ سے پڑھتے جانا کہ اس کے سوا اور کچھ کرنے کو نہیں ہے۔ اس صورت حال پر کچھ وقت گزرنے کے بعد مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں مجھے اپنے ذہن میں پہلے سے قائم شدہ تصورات، تعصبات، شبہات اور ایک طرح کی کلبیت (Cynicism) کے دبیز پردوں سے گزرنا پڑے گا۔

جب آپ کسی وجہ سے ایک مرتبہ بے کسی اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو آپ ہر چیز کی تعبیر اپنی ذات کے واسطے سے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر وہ نقطہ جس کے متعلق آپ کا یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ آپ کے لیے مفید مطلب اور معاون ہو سکتا ہے۔ اس کا اطلاق آپ اپنی ذات پر کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یوں ایک طرح سے یہ چیز آپ کے لیے ذہنی تسکین اور آسودگی کا باعث بنتی ہے لیکن یہی چیز درحقیقت دوسری جانب اس خاص کتاب کے مفہوم تک آپ کی رسائی کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی کچھ صورتحال [illegible] حالات میں اس وقت بھی پیش آتی ہے جب ایک [illegible]

ذہن پر اس خیال کا غلبہ اور تسلط ہوتا ہے کہ وہ معصوم اور بے گناہ ہے۔ آدمی کی اپنی اس بے گناہی کا احساس روپ بدل بدل کر ابھرتا ہے جس کے نتیجے میں ان اشخاص کے بارے میں جن کے متعلق وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اسے اس تعزیر سے دوچار کرنے کا سبب ہیں، اس کے اندر ایک شدید کینہ اور تلخی جنم لینے لگتی ہے، اور یہ چیز بھی فہم کتاب تک اس کی رسائی کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

کچھ اسی قسم کے مراحل سے خود مجھے گذرنا پڑا۔ تاہم آہستہ آہستہ میرا ذہن کتاب کے مطالب تک پہنچنے کے لیے مستعد ہونے لگا۔ لیکن تب میں ایک اور مشکل وادی میں داخل ہوا۔

قرآن مجید کے گہرے مطالعے کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے میرے اندر اس جستجو نے جنم لیا کہ میں اس خاص اور عظیم نکتے تک رسائی حاصل کرسکوں جس کے بموجب اس کتاب نے ایک عظیم تہذیب کو وجود بخشا اور لاکھوں کروڑوں افرادِ انسانی کی زندگیوں کو ایک بنیادی انقلاب اور تغیر سے ہم کنار کیا۔ جیسا کہ میں اس کے متعلق پڑھ اور سن چکا تھا۔ میرا احساس یہ تھا کہ اس بنیادی نکتے تک رسائی حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا اور یہ بھی کہ اس خاص نکتے کو پالینے کے بعد خود میری اپنی زندگی بھی ایک عظیم تغیر سے ہم کنار ہو سکے گی۔ لیکن آیت کے بعد آیت اور سورت کے بعد سورت کا مطالعہ کر لینے کے باوجود وہ خاص اور بنیادی نکتہ میری گرفتِ شعور میں نہ آسکا اور میں کسی ایسی نئی اور انوکھی چیز کو دریافت نہ کرسکا جسے میں اپنے تمام ذہنی مسائل کا حل قرار دے سکوں۔ ان معنوں میں کہ میں کسی ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ کہہ سکوں کہ یہ وہ نکتہ ہے جس کی تلاش میں میں سرگرداں تھا اور اس کو پالینے کے بعد میں نے اپنا مقصود پالیا ہے۔ تب میں ادراک کے اس مقام پر پہنچا کہ اس خاص نکتے اور مطلوب حل تک رسائی کسی لمحاتی احساس و شعور کا ثمر نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لیے ایک طویل اور مسلسل کاوش اور پیہم فکر و تدبر کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد مجھے پہلے سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی نوعیت کی مشکلات سے سابقہ پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ کچھ ایسے ذہنی مفروضات (Asumptions) کی ضرورت کا احساس ہوا جن کے بغیر قرآنی اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کا آغاز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے ایک مفروضہ تو یہ ہے کہ خدا کے وجود کو ایک معروضی حقیقت (Objective Reality) کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ خدا کے وجود سے انکار پر مبنی تمام افکار و نظریات اس کتاب کے فہم میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کرتے رہیں۔ ایک بڑی سخت الجھن یہ پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ بعض دہریہ افکار کے حامل فلسفیوں نے اسے ایک قطعی نظریے کے طور پر پیش کیا ہے، کہ کیا فی الواقع ان دو قسم کے افکار میں کوئی حقیقی فرق ہے کہ خدا نے انسان کی تخلیق کی ہے، یا انسان نے خدا کا تصور اپنی ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خود تخلیق کیا ہے؟

علاوہ بریں ایک اور الجھن اس نظریے کی شکل میں سامنے آتی ہے جسے سب سے پہلے ہیگل نے پیش کیا تھا کہ خدا اور انسان

کے رشتے کے پس منظر میں دراصل آقا اور غلام کے رشتے کا تصور کارفرما ہے۔ اس کے بقول آپ بہت سے دیوتاؤں کے اوپر ایک بڑا دیوتا تراشتے ہیں اور پھر اس کو ایک اہم و قیمتی حقیقت کے طور پر تسلیم لیکے اس کے سامنے خود کو مکمل غلامی اور ماتحتی کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح درحقیقت خود کو ایک پست غلامانہ مقام پہ لے آتے ہیں۔

پھر ایک تیسری اور بعض اعتبار سے ایک جدید نوعیت کی الجھن ان وجودی فلسفیوں (EXISTENTIALIST)[5] کے افکار کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جن کی نمائندگی اس دور میں ژاں پال سارتر جیسے فلاسفر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس دنیا میں انسان کا وجود ایک ٹھوس اٹل اور ناقابل تردید و اختلاف امر واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا وجود دراصل ایک ایسی معروضی حقیقت ہے جو قوانین فطرت کے اندر جکڑی ہوئی ہے، جو تاریخی دھارے کی گرفت میں ہے اور جسے حالات اور ماحول کی قوت نے پابند کر رکھا ہے اس طرح ان عوامل نے اسے کچھ یوں بے بس کر رکھا ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بدلنے پر کسی درجے میں بھی قادر نہیں ہے۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعہ یہ ہے تو کیا انسان خود اپنے اختیار سے کچھ کرنے کے لیے آزاد ہے؟ — یا اس کا وجود محض اس حد تک بچا ہے کہ بس وہ موجود ہے جیسا کہ سارتر نے اس کی اس حالت کو اپنے فلسفے کے مطابق ایک واقعیت محض Man's facticity سے تعبیر کیا ہے۔

جدلیاتی فلسفے کے مطابق سارتر نے اس مسئلے کو یوں کہہ کر حل کرنا چاہا ہے کہ انسان اپنا ایک داخلی وجود بھی رکھتا ہے جو اس کے تمام اعمال و افعال کا سرچشمہ ہے۔ اس داخلی وجود سے افعال کے صدور کو وہ عمل بے ارادہ یا فعل بے ساختہ (Spontaneity) کا نام دیتا ہے۔ سارتر کے خیال میں انسان کا ہر عمل یا فعل اس کے اس داخلی وجود کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے اور جب وہ عمل ظہور میں آتا ہے، تو اس وقت وہ کسی قانون و ضابطہ کی گرفت میں نہیں ہوتا، نہ اس پر شیت وارد ہوتی ہے۔ تاہم ایک مرتبہ جب وہ عمل ظہور میں آجکتا ہے تب اس پر خارجی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سارتر کے فلسفے کے مطابق یہ ایک بے ساختہ عمل ہے کہ میں آپ کے سامنے تقریر کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میرے اندر میرے داخلی وجود نے اس خواہش کو جنم دیا کہ میں ایسا کروں لیکن ایک مرتبہ اس خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے جب میں آپ کے سامنے تقریر کرنے کے بے ساختہ عمل کا اظہار کر چکوں گا تب اس پر معروضی اور خارجی قوانین کا عمل دخل شروع ہوگا۔ مثال کے طور پر اس شکل میں، کہ میرے اس عمل پر آپ اور آپ کے علاوہ دوسرے افراد کے اندر ایک طرح کا ردعمل پیدا ہوں گے، کچھ اس عمل کا تجزیہ اور محاکمہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ مجھے اس عمل پر کس جذبے نے ابھارا ہے، اور اس کا مقصد ان کے نزدیک کیا ہو سکتا ہے۔ اس طرح میرے اس عمل کے بارے میں ایک رائے قائم کی جائے گی۔ اب جس طرح ... جواب دعویٰ (Anti Thesis) کی مند ...

عملِ بے ارادہ کی کیفیت (Spontaneity) موضوعیت اور خارجیت (Objectivity) کی ضد ہے لیکن انسان کی آزادیِ عمل کا دائرہ اس حقیقت سے شروع ہوتا ہے کہ اگرچہ معروضیت اور واقعیت (Facticity) اپنی جگہ پر مسلم حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم ہر فرد کے اندر اس واقعیت کے جواب میں ایک داخلی ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ بعض افراد کے اس داخلی ردِ عمل کو سارتر سبک ردِ عمل Soft Response کا نام دیتا ہے اور بعض افراد کے معاملے میں اس کو موثر اور قوی ردِ عمل (Virile Response) کہہ کر پکارتا ہے۔ موثر ردِ عمل یہ ہے کہ آپ اس چیز کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں جو آپ کے داخل میں موجود ہے۔ یا اس سے مراد آپ کا بے ساختہ ظہور میں آنے والا عمل ہے۔ قطع نظر اس سے کہ آپ اس میں کس حد تک کامیابی حاصل کرتے ہیں، یا اس کے ذریعے سے آپ خارجی اور معروضی حقیقت میں کس حد تک تغیر و تبدل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

میں ذیل میں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس عملِ بے ارادہ اور معروضی حقیقت کے درمیان کس طرح انحصار اور عمل باہمدگر کا کیا رشتہ ہے۔

> ایک خود مختار آزاد آدمی وہ ہے جو اپنے داخلی وجود کا بھرپور اظہار کرتا ہے، جو اپنے ارادے کو بروئے کار لانے کے عمل کو پیہم جاری رکھتا ہے خواہ اس میں اس کی ناکامی یقینی ہی کیوں نہ ہو۔ اور وہ اس ناکامی کی بدترین مزاحمت کو جرأت و مردانگی اور وقار کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔

یہی وہ فعل و انفعال ہے جو آپ کے وجود کو صحیح معنوں میں ایک معیاری اور باکمال وجود کا آب و رنگ عطا کرتا ہے اور یہی وہ امتیازی حیثیت ہے جو زندگی کے بارے میں آپ کے سارے طرزِ عمل کا تعین کرتی ہے اور ان تمام چیزوں سے آپ کے رشتے کی حد بندی کرتی ہے جو معروضیت اور واقعیت کے دائرے میں آتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ علمی اور ذہنی مسائل جو میری قرآن فہمی کی راہ میں خلل اندازی کا موجب بنے، میرے مسلسل مطالعہ قرآن کے نتیجے میں یا تو حل ہو چکے ہیں یا حل ہو رہے ہیں، اور یہی وہ ذہنی تجربہ ہے جس میں میں آپ حضرات کو شریک کرنا چاہتا ہوں — مختصراً میں اس تجربے کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک شخص کے لیے یہ چنداں ضروری نہیں ہے کہ وہ ان ذہنی علمی اور فلسفیانہ مسائل سے چشم پوشی کر لے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کے لیے ان مسائل سے باخبر ہونا چاہیے۔ اس لیے چاہیے یہ کہ ان مسائل سے آگاہ ہوتے ہوئے آدمی قرآن مجید کا مطالعہ ایک ایسی کتاب کی حیثیت سے شروع کرے کہ جس کے ساتھ انسانی زندگی معروضی طور پر وابستہ ہے اور خواہ ہم زندگی کے مختلف دائرہ ہائے عمل اور نظام ہائے فکر کے بارے میں کوئی انداز نظر بھی اختیار کریں یہ وہ کتاب ہے کہ جس کے ساتھ انسانی زندگی اپنا ایک قریبی رشتہ اور گہرا تعلق قائم کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک اگر یہ ایک بدقسمتی نہیں تو ایک لغزش ضرور ہے کہ کچھ لوگ قرآن کے مطالعے کی قابلیت اور

استعداد رکھتے ہوئے بھی اس کے مطالعہ وفہم کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ بحث ونظر کے ہر دائرے میں ہمیں ایسے مسائل سے سابقہ درپیش ہے اور رہے گا جن پر ہم مختلف نظامہائے فکر کی روشنی میں غور کرنے پر مجبور ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے قرآنی نظام فکر کو لازماً یہ امتیازی مقام حاصل ہے اور ہمیں اس مقام کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم اس کی روشنی میں اپنے جملہ حالات و مسائل کا جائزہ لیں اور ان کا حل تلاش کریں۔

قرآن فہمی کی راہ میں آخری مشکل جس سے میں دوچار ہوا وہ زبان کی مشکل تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جو شخص قرآن مجید کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کی یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے کہ وہ اس کی حقیقی زبان سے واقف ہو۔ لیکن جو شخص عربی زبان نہیں جانتا، سوال یہ ہے کہ اس کی اس مشکل کا مداوا کیا ہو؟

بہت سے حضرات نے مجھ سے یہ کہا کہ اصل چیز تو قرآن کا مطالعہ ہے، نہ یہ کہ ترجمان القرآن یا تفہیم القرآن یا دوسری تفاسیر کے مطالعہ کو ضروری سمجھا جائے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اندر اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قرآن کی حقیقی زبان سے ناواقف ہیں۔ جب یہ ایک حقیقت ہے تو یہ کہنا بیکار ہے کہ میں نے عربی میں ایم اے، یا پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے کیونکہ محض کسی زبان کا ایم اے کر لینے یا اس کی سند حاصل کر لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اس زبان پر واقعی حاوی ہو گئے ہیں۔ خود میں نے فارسی میں ایم اے کیا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں ایرانی دستور یا ایران کی دوسری قانونی دستاویزات کا مطالعہ کر کے انہیں کماحقہ سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ ہم قرآن کو اسی زبان کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جسے ہم جانتے ہیں اور وہ زبان اردو ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ میں نے جیل میں اپنے مطالعہ قرآن کا آغاز پکتھال کے انگریزی ترجمے سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے علامہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کا ایک بڑا حصہ پڑھا۔ اسی طرح مولوی محمد علی کے ترجمے کا کچھ حصہ دیکھا مزید براں راڈویل اور آربری کے انگریزی تراجم قرآن سے بھی استفادہ کیا لیکن جس اردو ترجمہ قرآن نے مجھے قرآنی مفاہیم کے قریب ترین پہنچنے میں مدد دی وہ تفہیم القرآن ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تفہیم القرآن کے ترجمہ قرآن نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں انسانیت کے لیے قرآن کے پیش کردہ نظام زندگی اور نظام اقدار کا فہم حاصل کر سکوں۔ اسی سے میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ میں تفہیم القرآن کی مدد سے اپنی نوجوان نسل کے لیے قرآن مجید کے بعض اجزا کا جدید ترین انگریزی زبان میں ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کروں اور یہی وہ کام ہے جو میں گزشتہ تین چار ماہ سے انجام دے رہا ہوں۔

اس وقت میں آپ کے سامنے' اس ابتدائی گفتگو کے بعد سورۂ فاتحہ کا ترجمہ مع تشریحی حواشی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تشریحی حواشی میں نے بہت سی کتب کے مطالعہ کی بنیاد پر لکھے

ہیں۔ اس غرض کے لیے میں نے سورۂ فاتحہ کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ اس کے توسط سے میں نے دو نقاطِ اخذ کیے ہیں جن کو اگرچہ میں ذاتی نوعیت کے سمجھتا ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ ان پر غور کرنا پسند فرمائیں۔

میرے پیشِ نظر اس وقت دو موضوع ہیں۔ ایک ہے عدل اور دوسرا محاسبۂ آخرت۔

جہاں تک عدل کا تعلق ہے، میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید میں جس طرح تصورِ عدل پر پیہم زور دیا گیا ہے اس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ عدل کے اس تصور کا بہترین انگریزی متبادل لفظ BALANCE ہے۔ خود قرآن مجید میں بھی اس کو میزان سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۙ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ (الرحمٰن، ۷-۸)

میں اس وقت تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ میں یہ بحث شائع کر چکا ہوں۔ اس لیے اس وقت مختصراً یہ عرض کروں گا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو بنیادی اور آفاقی اہمیت کا حامل ہے اور ہمارے موجودہ حالات کے پیشِ نظر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

میرے صحافی دوست اور رفیق کار جناب الطاف حسن قریشی نے اپنے تعارفی خطبے میں جس موجودہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے اور جس عقلی اور فکری صورتِ حال سے ہم دوچار ہیں وہ اس سے پہلے لوگوں پر گذر چکی ہے۔ ہم سے پہلی تہذیبیں، قومیں اور معاشرے اس کا سامنا کر چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دو لفظوں خوف (Fear) اور حزن (Hopelessness) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پائی جانے والی خوف اور حزن کی یہ کیفیت قرآن مجید میں بہ تکرار بیان ہوئی ہے۔ یہ وہ دو چیزیں ہیں جن سے بچنے کے لیے انسان قادرِ مطلق خدا کے حضور میں دست بدعا ہوتا ہے۔ دراصل یہ کیفیت بے یقینی کی کیفیت ہے کیونکہ خوف اور حزن درحقیقت بے یقینی ہی کے دو بنیادی عناصر ہیں۔ اگرچہ خوف اور حزن ایک آدمی کی شخصی زندگی میں بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن یہاں میری مراد اس اجتماعی خوف اور حزن سے ہے جو کسی معاشرے کے اندر بے یقینی اور نتیجۃً مایوسی کو جنم دیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں لوگ کسی چیز کے رونما ہونے کے منتظر رہتے ہیں حالانکہ یہ بات ان کی شعوری سطح پر نہیں ہوتی کہ وہ کس چیز کے رونما ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ صبح کو روزنامہ اخبار اٹھاتے ہیں اور ان کی نگاہیں اس کے صفحات میں کسی ایسی خبر کی تلاش کر رہی ہوتی ہیں جو وہاں موجود نہیں ہوتی حالانکہ اخبار میں سب کچھ موجود ہوتا ہے جو اس میں موجود ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود وہ اخبار کو اس احساس کے ساتھ رکھتے ہیں کہ جس خبر کے وہ غیر شعوری طور پر منتظر ہیں وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ یہی کیفیت بے یقینی کی کیفیت ہے۔ چنانچہ جب ایک عرصے تک وہ اس خاص خبر کو پانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو ان کے اندر یہ مایوسانہ فکر پرورش پانے لگتی ہے کہ جس خبر کے وہ منتظر ہیں وہ ظہور میں نہیں

نہیں آئے گی اور جن راہ کے کھلنے کی وہ تمنا رکھتے ہیں وہ کھلنے والی نہیں ہے اور اپنے مسائل کے جس حل کی طلب ان کے اندر مچل رہی ہے وہ ان کے سامنے ابھرنے والا نہیں ہے۔ تب ایک پژمردگی، مایوسی اور قنوطیت کی کیفیت ان پر چھا جاتی ہے۔

اور میں اپنے محدود مطالعہ قرآن سے یہ بات سمجھا ہوں کہ بے یقینی کی کیفیت کے یہ دو عناصر —— خوف اور حزن —— ہی دراصل کسی تہذیب کے زوال و انحطاط کے پس منظر میں بنیادی عوامل کی حیثیت سے کارفرما ہوتے ہیں۔

ایک تہذیب اس نقطہ انحطاط تک اپنا سفر کس طرح طے کرتی ہے؟ قرآن مجید سے اس سوال کا جواب ہمیں یہ ملتا ہے کہ افراد کی طرح ہر قوم کی بھی ایک مہلت عمل ہوتی ہے جس میں اسے دو چیزیں عطا کی جاتی ہیں۔ ایک ہدایت (GUIDANCE) اور دوسرے مواقع عمل (OPPORTUNITIES)

جہاں تک ہدایت کے ساتھ قوموں کے معاملے کا تعلق ہے وہ کچھ یوں ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی حقیقی روح کو ضائع کرتی چلی جاتی ہیں اور آخرکار پیچھے ایک بے حقیقت چھالک ہی باقی رہ جاتی ہے۔

جہاں تک مواقع عمل کا تعلق ہے وہ ہر فرد اور قوم کو ایک تکوینی فیصلے تک مہیا کیے جاتے ہیں اور ان سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زندگی کے حقائق سے آنکھیں چار کرے اور اپنے گردوپیش کے حالات کی اصلاح و تغیر کے ذریعے سے اجتماعی مفاد اور بھلائی کے سانچے میں ڈھالے

دوسرا موضوع جس پر میں اس وقت گفتگو کرنا چاہتا ہوں وہ ہے محاسبۂ آخرت۔ چونکہ یہ مبحث بھی میں پہلے شائع کر چکا ہوں اس لیے مختصراً ہی کچھ عرض کروں گا اور وہ یہ ہے کہ قرآن کے پیش کردہ تصور حیات کی رو سے ہر فرد، اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت سے اپنے خدا کے حضور میں اپنے اعمال کے لیے مکمل اور حتمی طور پر جوابدہ ہے اور چونکہ حیات انسانی کا یہ سلسلہ ہزارہا برس سے چلا آ رہا ہے اور اسے بہرحال ایک مقام پر جا کر ختم ہونا ہے۔ اس لیے اس کے بعد ایک عالم آخرت وجود میں آنے والا ہے جہاں تمام بنی نوع انسان کو ایک ایک کر کے ہی محاسبہ کے لیے پیش ہونا ہے۔ انسان کی مسئولیت کا یہ تصور عیسائیوں کے اور بعض دوسری قوموں کے کفارے کے عقیدے سے یکسر مختلف اور متضاد ہے۔

ذیل میں میں تفہیم القرآن سے قرآن مجید کی چند آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جو قرآن کے تصور عدل اور محاسبہ آخرت پر وضاحت سے روشنی ڈالتی ہیں۔

سورۃ النساء آیت ۱۳۵ میں ارشاد ہوا ہے:۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارا انصاف اور تمہاری گواہی کی زد تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ (تفہیم القرآن صفحہ ۔۔)

سورۃ النساء ہی سے آیت ۵۸ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ آیت قرآن کے تصور عدل و امانت کے سلسلے میں نہایت اہم بالشان ہے

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۶۲)

انسان کی مسئولیت اور محاسبہ آخرت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل دو آیات خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

سورۃ الانعام آیت ۹۴ میں ارشاد ہوا ہے:۔

"لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا جو کچھ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے، تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

تفہیم القرآن جلد اول ص ۵۶۵

سورۃ طٰہٰ کی آیات ۱۰۵ تا ۱۱۱ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو کہ میرا رب دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل یا سلوٹ نہ دیکھو گے —— اس روز منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے۔ کوئی ذرا اکڑ نہ دکھا سکے گا۔ اور آوازیں رحمان کے آگے دب جائیں گی۔ ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے۔ اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی الا یہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا علم نہیں ہے۔"

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۲۲ تا صفحہ ۱۲۷)

اب میں اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے آپ کے سامنے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ اور تشریحی حواشی پیش کرتا ہوں۔

(مترجم۔ گزشتہ سطور میں پیش کیے جانے والے اقتباسات کے انگریزی تراجم نہیں دیے گئے ہیں کیونکہ تفہیم القرآن اور قرآن مجید کے اردو قارئین کے لیے ان کا مطالعہ زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح یہاں سورۃ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ و حواشی بھی درج نہیں کیے جارہے ہیں۔ انگریزی خواں حضرات ان کا انگریزی میں مطالعہ کرسکتے ہیں۔ البتہ گزشتہ موضوعات کی مناسبت سے ذیل میں الطاف صاحب کا تحریر کردہ سورۃ فاتحہ کی آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا تشریحی نوٹ اردو ترجمے کی شکل میں نذر قارئین کیا جارہا ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

یہ آیت کریمہ انسانی عزت و شرف اور آزادی کا منشور ہے۔

اس آیت کے ذریعے سے انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسے معاہدے میں داخل ہوتا ہے جو اسے تمام درمیانی واسطوں، وسیلوں اور مددگاروں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ انسان اس آیت کے ذریعے سے ہر قسم کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں کو ایک ہی ضرب سے توڑ دیتا ہے۔ وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ صرف خدا ہی کے حضور سر تسلیم خم کرے گا اور صرف اسی سے مدد کا طلب گار ہوگا۔ وہ لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس آیت کی عظمت اور اہمیت کو محسوس کیا تھا —

"اے معبودِ حقیقی! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔"

حقیقۃً یہ ایک آزادی کا لمحہ تھا۔ ایک ایسا لمحہ جس میں میں نے یہ محسوس کیا کہ میرے اندر کے تمام خوف ہوا میں تحلیل ہو کر اڑ گئے ہیں۔ میں نے اعتماد اور یقین کی ایک حیاتِ تازہ کو اپنے اندر ابھرتے اور مچلتے ہوئے محسوس کیا — ہیگل نے خدا کے تصور کو اس بنیاد پر تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا کہ ایسی کسی ہستی کا تصور انسان کے اندر خوف، دوں ہمتی اور خود غرضی کے جذبات کی تخلیق کرتا ہے۔ اس نے ایک موجود خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو اپنے "نظریہ غلام و آقا" کے ذریعے بیان کیا ہے اور اس کی تہ میں یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ کسی الوہی وجود کا تصور لازماً انسانی غلامی و محکومی کے احساسات کو جنم دیتا ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ہیگل اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز رہا ہے کہ خدا پر ایمان انسان کو ہمت، جرات، عالی ظرفی، بلند حوصلگی اور صبر و ثبات کی بلند ترین رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس کی دلیل

کے بالکل برعکس انسان اور خدا کے درمیان بلاواسطہ تعلق استواری، انسان کو ان تمام امکانی بندھنوں سے آزاد کر دیتا ہے جو اسے دوسرے انسانوں کی غلامی و زیر دستی میں جکڑے رہنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلق یعنی معاہدۂ عبدیت دراصل آزادی کا ایسا اقرار نامہ ہے جو تمام دوسرے انسانی رشتوں اور خود ساختہ نظاموں سے فائق اور بالاتر ہے اور جو دراصل انسانی عزت و شرف اور آزادی کی ضمانت ہے۔ یہی اس آیت کا حقیقی اور بنیادی پیغام ہے۔

جنابِ صدر اور برادرانِ اسلام!

میں نے کل بھی یہ عرض کیا تھا اور آج پھر اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ میں قرآن مجید کو سمجھنے کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہا ہوں اور ان منزلوں سے گزرتے ہوئے جو لطف و کیف حاصل کر رہا ہوں۔ میں اپنے اخبار کے پڑھنے والوں کو اس میں شریک بھی کرتا جا رہا ہوں۔ آپ کے سامنے میں اس لیے حاضر ہوں۔ کہ میں اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں اس امید پر کہ آپ میں سے بہت سے ایسے حضرات کی موجودگی کہ جنہوں نے قرآن کے مطالعہ میں زندگی گزار دی ہے۔ ان خیالات کا بیان کرنا دراصل ان کی رہنمائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ میرے فکر میں جو خامیاں اور سقم آپ کو نظر آئیں آپ براہِ کرم ان سے مجھے آگاہ فرمائیں تاکہ اس ملک کے طبقے کو انگریزی زبان میں قرآن کے بنیادی اصولوں اور پیغام سے روشناس کرانے کا جو کام میں نے شروع کر رکھا

سے بحسن و خوبی انجام دے سکوں۔

یقیناً آپ میں سے بہت سے حضرات تفہیم القرآن سے واقف ہوں گے۔ تاہم جو واقف نہیں ہیں میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ اگر وہ عربی زبان نہیں جانتے اور قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ تفہیم القرآن کا مطالعہ کریں۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے کہ اردو زبان میں قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ دوسرے تراجم اور تفاسیر بھی یقیناً اپنی جگہ پر بہت مفید ہیں لیکن میں جدید تعلیم یافتہ ذہن کے لیے خاص طور پر تفہیم القرآن کو زیادہ موزوں خیال کرتا ہوں۔ بعض حضرات کو میری اس بات سے اختلاف بھی ہے اور ان کا حق اختلاف سر آنکھوں پر۔ مثلاً کراچی میں مجھ سے یہ کہا گیا کہ صاحب قرآن تو ہم بھی سمجھتے ہیں تفہیم القرآن صرف آپ سمجھتے ہیں۔ مطلب ان کے کہنے کا یہ تھا کہ تفہیم القرآن قرآن مجید کے سمجھنے کے لیے لازمی یا ضروری نہیں ہے۔ مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے۔ اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہو، عربی زبان کے مزاج سے آشنا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے یہ توفیق دے رکھی ہو کہ وہ قرآن ہی کی زبان میں پڑھ کر سمجھ سکتا ہو تو یقیناً تفہیم القرآن اس کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن اگر عربی زبان سے واقف نہیں ہیں، اس کے ادب سے ناآشنا ہیں اور اس کے مزاج سے ناواقف ہیں۔ علاوہ بریں اگر آپ کو یہ علم نہیں ہے کہ ایک خاص لفظ کے مختلف مقامات پر کیا معانی اور متعلقات ہوتے ہیں لیکن قرآن کے پیغام تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش بہرحال آپ کے اندر ہے تو پھر جہاں اور بہت تراجم اور تفاسیر ہیں وہاں تفہیم القرآن کے ذریعے سے آپ کو قرآن مجید کے مرکزی اور بنیادی پیغام تک پہنچنے میں یقیناً بہت مدد ملے گی جیسے کہ مجھے ملی۔

میں کل اس بات کا بھی ذکر کر چکا ہوں کہ میں نے قرآن کا مطالعہ انگریزی تراجم کے ذریعے سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد (۱۹۶۵ء) میں جب مجھے مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کی ایک جلد نصیب ہوئی تو میں نے اس کے ذریعے سے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا۔ پھر کراچی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک صاحب نے مجھے تفہیم القرآن کی دوسری جلد عنایت فرمائی۔ مجھے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوا کہ اس کے ترجمہ کی زبان ایک حیرت انگیز انداز سے آدمی کے ذہن و قلب تک پہنچتی ہے۔ اس کے ہر لفظ کا دروبست اور جملوں کی برجستگی اپنی تاثیر اور بے ساختگی کے لحاظ سے کچھ ایسی ہے جیسے تیر نشانے پر پیوست ہو جاتا ہے اور پھر اسی سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح کی زبان انگریزی ترجمے میں استعمال کی جائے تو امید ہے ہمارے بہت سے انگریزی داں نوجوان، جو نہ عربی سے واقف ہیں اور نہ اردو سے، اور جن کی تعلیم ایسے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے جہاں ان کا سابقہ ہر وقت انگریزی زبان سے رہتا ہے، قرآن مجید کے مرکزی پیغام تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ یہی وہ سوچ تھی جس نے تفہیم القرآن کے انگریزی زبان میں ترجمہ کے آغاز پر مجھے مجبور کیا۔ چنانچہ میں نے تفہیم القرآن کے سامنے مقدمے کا ترجمہ کیا۔ لندن میں اس کے شائع ہونے پر اس کے

پڑھنے والوں کی طرف سے میری ہمت افزائی ہوئی۔ بہت سے خطوط مجھ تک آئے اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خاص طور پر نوجوان طبقہ اس موضوع میں خاص دلچسپی رکھتا ہے۔

یہ میرا یقین ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ مذہب اور ایمان کے اتنا ہی قریب ہے جتنا کہ ان کے آباء و اجداد تھے۔ لیکن ان کا ذہن ایک سائنٹفک زمانے میں ایک خاص انداز سے نشوونما پا رہا ہے۔ ان میں جستجو اور کرید زیادہ ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو سوال ان کے ذہنوں میں ابھریں ان کے جواب ان کو ساتھ ساتھ ملتے جائیں۔ اسی بنا پر ان کے لیے ایک خاص اسلوب کی ضرورت ہے۔ خود میں نے بھی اپنے ذاتی مطالعہ قرآن سے جو ایک اہم سبق سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا انداز شروع سے آخر تک ایک دلیل و استدلال اور تفہیم و تعلم کا انداز ہے اس میں احکامات اس طرح سے صادر نہیں ہوتے کہ حکم تو صادر کیا جائے لیکن اس کی حکمت و مصلحت نہ بیان کی جائے اس میں دلائل کی روشنی ہے اور براہین کا نور ہے۔

میں آپ کے سامنے قرآن مجید کے بعض حصے پڑھوں گا، جن سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو سکے گی کہ قرآن حکیم کا سارا انداز ایک مدلل انداز ہے۔ قرآن انسان کی عقل اور اس کی فکر اور اس کے فہم سے چیزوں کو علیحدہ رکھ کر محض حاکمانہ انداز سے فیصلے صادر نہیں کرتا ہے، بلکہ ہر مقام پر انسان کی عقل و فہم سے اپیل کرتا ہے۔ اسے غور و فکر اور تفکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے اس لیے جو کتاب خود اپنے مخاطبوں کو عقل و استدلال سے کام لینے پر ابھارتی ہے، اس کی تعلیم و تفہیم کا کام کرتے ہوئے طالبان قرآن سے ہم یہ مطالبہ کرنے میں کیسے حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب ہم سے نہ مانگیں۔

جس قسم کے تراجم اس سے پہلے ہم تک پہنچے ہیں وہ اپنے زمانے میں بہت کارآمد رہے ہیں اور آج بھی ان کی افادیت قائم ہے لیکن اس دور میں موجودہ ذہن کے لیے شاید زبان کا ایک اور انداز ضروری تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ ضرورت تھی جسے تفہیم القرآن نے پورا کیا ہے۔ میں آپ کے سامنے اس وقت تفہیم القرآن کے دیباچے میں سے اقتباس پڑھوں گا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ تفہیم القرآن کے مؤلف جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس میں قرآن کی ترجمانی کا کیا اسلوب اختیار کیا ہے۔

> پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہے۔ آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے

دنیا بھر کو چیلنج کیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہا ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اس کا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ تو چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے اس کے ادب کا حصہ بھی اس سے کم کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگدل سے سنگدل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی۔ جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی۔ جس کی قوت تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سنے گا وہ بالآخر نقد دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اس طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے تو اہل عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی نہ حاصل ہو سکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔

(تفہیم القرآن جلد اول صک)

جیسا کہ خود صاحب تفہیم القرآن نے لکھا ہے انھوں نے لفظی ترجمے کی خامیوں کے پیش نظر ہی قرآن کی ترجمانی کا اسلوب اختیار کیا اور تفہیم القرآن کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اردو داں طبقے کے لیے اس کو بہت زیادہ اہم بنا دیتی ہے۔

قدیم لفظی ترجمے کے انداز سے جس میں ہر آیت کے نیچے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اردو زبان میں ترجمہ دیا جاتا ہے پڑھنے والوں کے لیے ذہنی طور پر جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں ان سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی واقف ہوں۔ اس قسم کے ترجمے کے حق میں دلیل یہ ہے کہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ پوری صحت سے اسی مقام پر آنا چاہیے جہاں وہ لفظ چھپا ہوا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے اور ایک عالم قرآن کے لیے ضروری بھی ہے کہ وہ ایک ایک لفظ کو اس کے ترجمے کے ساتھ دیکھے لیکن علم کے اس مقام تک پہنچنے سے پہلے آپ اور مجھ جیسے لوگوں کے لیے یہ زیادہ ضروری ہے کہ قرآنی آیات کے صحیح معانی اور مطالب پہلے سمجھ لیے جائیں۔ اس کے بعد ہی یہ دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ آپ ایک ایک لفظ کی تحقیق کرکے اس کے گہرے معانی تک پہنچنے کے لیے وہ کاوش کریں جو ایک عالم اور محقق کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ شروع ہی سے یہ کام کریں کہ آپ اصل زبان سے تو قطعی طور پر ناواقف ہوں لیکن ایک لفظ کے نیچے دوسرا لفظ آپ سمجھ لیں اور یوں لفظوں کے معانی سمجھنے اور ان کو دہرانے میں آپ ساری عمر گزار دیں تو اس میں دقت یہ ہوگی کہ شاید آخر میں آپ کچھ معانی تو سمجھ لیں گے لیکن قرآن پر عمل کرنے کا وقت باقی نہ رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑھنے اور سمجھنے کے اس سارے عمل کا تعلق درحقیقت تحقیق سے نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کا پڑھنا کوئی لائبریری کا کام نہیں ہے۔ قرآن پڑھنے کا حقیقی مطلب تو یہ ہے کہ اسے سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ یہ سمجھنا کچھ اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ اسے سمجھنے کے بعد آپ یہ کہہ سکیں کہ میں سمجھ گیا

دل بلکہ یہ سمجھنا اس لیے ہے کہ آپ سمجھنے کے بعد اس پر عمل کرنا شروع کر دیں۔ اگر ساری عمر محض الفاظ کی شد بد حاصل کرنے میں لند رگئی اور قرآن کی اصل دعوت کو سمجھ کر اس پر عمل کی توفیق نصیب نہ ہوئی تو مثال کچھ یوں ہوگی کہ تیرنے کے فن پر کتابیں تو پڑھتے رہے لیکن تیرنا نہ سیکھا اور کشتی ڈوب گئی۔ تب اس ساری کد و کاوش سے کیا حاصل۔ تو یہ وہ چیز ہے جس کی طرف میں اپنے نوجوانوں کی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب ریشمی کپڑوں میں لپیٹ کر بڑے ادب سے اونچے طاق پر رکھنے کی چیز نہیں ہے، یہ کتاب عمل کرنے کی چیز ہے اور عمل کرنے کے لیے اس کا اس حد تک جاننا ضروری ہے کہ اس کے حقیقی پیغام اور دعوت کو سمجھ کر اس کے مطابق عملی زندگی کو ڈھالا جا سکے۔ باقی رہی یہ عالمانہ اور محققانہ باتیں۔ تو ان کا تعلق اہل علم اور اہل تحقیق سے ہے۔ وہ اس کام کو جاری رکھ سکتے ہیں بلکہ انہیں جاری رکھنا چاہیے کیونکہ اس کتاب کی خدمت کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے اور خود اس کتاب کا حق بھی اہل دماغ پر ہے لیکن جہاں تک مجھ جیسے عام آدمیوں کا تعلق ہے ان کی رہنمائی کے لیے ایک ایسا ترجمہ قرآن بہرحال ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے پڑھ کر ہم قرآن کے بنیادی پیغام سے روشناس ہو سکیں۔ بے شک وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو عمل کی راہ پر شروع سے گامزن ہیں لیکن میں تو ان گنہگاروں کا ذکر کر رہا ہوں جن کو نئی نئی راہ ہدایت ملی ہے اور وہ اس راہ پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کل کی تقریر میں میں نے کل دو موضوع بیان کیے تھے، ایک عدل کا اور دوسرا محاسبۂ آخرت کا۔ اس کے بعد تقریب کے صدر محترم نے مجھے یہ توجہ دلائی کہ میں اپنے آئندہ مضامین میں رہنمائی اور قیادت (LEADER SHIP) کے بارے میں قرآن مجید کی روشنی میں اظہار خیال کروں۔ میں چونکہ اس موضوع پر تفہیم القرآن سے کچھ حصے پہلے ہی انتخاب کر چکا تھا اس لیے میں اسی ضمن میں قرآن مجید کی چند آیات کا ترجمہ پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۸ اور ۱۱۹ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا، یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ ان سب اگلے پچھلے گمراہوں کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔ یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں (اس سے بڑھ کر نشانی اور کیا ہو گی کہ) ہم نے تم کو علم حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں، ان کی طرف سے تم ذمہ دار و جوابدہ نہیں ہو۔"

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۰۸)

میں آپ کی توجہ ان الفاظ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ "ہم نے تم کو علم حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں ان کی

طرف سے تم ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔"

قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران میں مجھے اس بات کا بہت گہرا احساس ہوا ہے کہ اسلام میں قیادت (Leadership) کا نظریہ دوسرے مذاہب اور افکار و نظریات کے مقابلے میں ایک المخصوص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمارے ہاں قیادت اور رہنمائی کا ایک مکمل اور آخری نمونہ موجود ہے۔ ایک ایسا نمونہ کہ جو فکری، نظریاتی اور عملی اعتبار سے ایک مکمل اور یکتا نمونہ ہے۔ جس قوم، جس گروہ اور جس تہذیب کے پاس ایک ایسا مثالی نمونہ موجود ہو۔ اس کے لیے قیادت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جاتا ہے۔

قیادت کا مسئلہ اس تہذیب اور ان معاشروں میں ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے موجود رہتا ہے جہاں افکار اور نظریات تو موجود ہوں لیکن ان کا عملی نمونہ (MODEL) موجود نہ ہو۔ اب جس معاشرے اور جس تہذیب کو ایک مکمل اور ایک آخری مثالی نمونہ نصیب ہو جائے اس کے لیے قیادت کا مسئلہ مکمل طور پر اور ہمیشہ کے لیے حل شدہ ہے۔ اس کے بعد تو صرف ایک چیز رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس کسی کو کسی حیثیت سے قیادت کی کوئی ذمہ داری یا اقتدار کا کوئی منصب ملے تو اس مقام پر پہنچ کر وہ اس نمونے کو اپنے سامنے رکھے اور اپنی فکر اور اپنے عمل کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خود کو کوئی ایسا ماڈل بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرے کہ جسے دیکھ کر اس کے خیال کے مطابق دنیا یہ کہے کہ اس جیسا لیڈر اور کوئی نہیں پیدا ہوا ہے۔

آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ سب مشکلات جو ایک قائد اور لیڈر کو پیش آسکتی ہیں و رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آئیں۔ یہ نہیں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے لیے ساری مشکلات کو پہلے ہی سے آسان کر ہو حضورؐ کو ہر طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر قسم کی مشکل سے دوچار ہونا پڑا اور ان تمام کٹھن راہوں سے گزرنا پڑا جو سے کسی راہبر اور قائد کو سابقہ پیش آسکتا ہے۔

حیات طیبہ کا وہ دور قابل توجہ ہے کہ جب قریش کے مظ کی وجہ سے اور اس کے بعد منافقین کے رویے کی بنا پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب محترم پر تھوڑا بہت بددلی اثر تھا اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فطری طور پر ان سے پریشانی محسوس فرماتے تھے۔ چنانچہ کہا گیا کہ اے رسول کہ ان لوگوں کی باتیں بری معلوم ہوتی ہیں اور یہ جو کچھ کہتے ہیں ا سے تمہیں دکھ ہوتا ہے اس کا ہمیں علم ہے۔ لیکن تم سے پہلے جو دوسرے رسول گزر چکے ہیں ان پر بھی یہ وقت آچکا ہے اور ا نے بھی یہ مصائب دیکھے اور برداشت کیے ہیں اور پھر اس خطا میں ایک بڑا نیا لہجہ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

"اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا۔ لہٰذا نادان مت بنو۔ دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو

سننے والے ہیں۔ رہے مُردے تو انہیں اللہ بس قبروں
ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں
پیش ہونے کے لیے) واپس لائے جائیں گے۔"
(الانعام آیت ۳۵، ۳۶۔ تفہیم جلد اول ص۵۳۵)

مراد یہ ہے کہ ان منکرینِ حق کا قبولِ حق سے انکار کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ حق ان پر واضح نہیں ہوا اور اگر ان کو کوئی خاص نشانی دکھا دی جائے تو وہ ایمان لائیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ حق کی کھلی کھلی نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود انکار کی روش پر گامزن ہیں۔ اس لیے اے نبی اکرمؐ تم کو ان کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ ہیں ہی دشمنانِ حق ــ سچائی قبول کرنے کے لیے ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضورؐ کو اپنے مشن کی راہ میں کیسی مشکلات اور کٹھن حالات سے سابقہ پیش آیا

اس سے پہلے جن آیات کا ترجمہ میں نے پیش کیا تھا ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں کہ "ہم نے تم کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

خوش خبری یہ ہے کہ تم وہ پیغام لے کر آئے ہو جو انسانیت کے لیے ابدی فلاح کا ضامن ہے اور وہ پیغام تم نے لوگوں تک مکمل طریقے سے پہنچا دیا ہے۔ زبان سے بھی پہنچایا ہے اور عمل سے بھی پہنچایا ہے۔

اور آپ ڈرانے والے اس اعتبار سے ہیں کہ آپؐ نے لوگوں کو خوب اچھی طرح متنبہ کر دیا ہے کہ اگر تم راہِ حق کو چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلو گے تو اس کے وہی نتائج مرتب ہوں گے جو پہلی قوموں پر ہو چکے ہیں۔ ان کو تاریخ سے مثالیں دے دے کر بتا دیا کہ غلط راستوں پر چلنے کا انجام کیا ہے۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اور اپنے کام کی تکمیل کر دی۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ

"اب جو لوگ جہنم سے اپنا رشتہ جوڑ چکے ہیں ان کی طرف سے تم ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔"

چنانچہ جہاں تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ سے کوئی سبق حاصل کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی عملی زندگی سے قیادت سے کی جو مکمل مثال اور کامل ترین نمونہ پیش فرمایا ہے اس کی ایک اہم امتیازی خصوصیت راہِ حق کا علم ہے اس سے قیادت کا ایک اہم وصف ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ قائد اور راہنما کو راہ کا علم حاصل ہونا چاہیے اور جس کو یہ میسر نہ ہو اسے رہبری اور لیڈری سے اجتناب کرنا چاہیے۔ راہ کے علم میں ایک چیز تو رخ کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ راہبر کو راستے کے پیچ و خم سے اور اس کے مختلف مراحل سے واقفیت ہونی چاہیے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ اسے منزل کی واقفیت بھی ہونی چاہیے۔ راہ کے اس علم میں یہ اعتماد و یقین بھی شامل ہے کہ اس کے علاوہ دوسری راہیں چاہے کتنی ہی خوش نما وادیوں سے کیوں نہ گزرتی ہوں ان کی آخری منزل تباہی ہے۔ اس لیے ایک قائد کا کام اپنی راہ کو چھوڑ کر نت نئی راہوں کی طرف لپکنا نہیں ہے۔

راہ کے علم کے بعد دوسری چیز ہے یقین۔ یعنی قائد کے اندر یہ پختہ یقین ہونا چاہیے کہ جس راہ پر وہ گام زن ہے وہ لازماً منزل تک پہنچتی ہے۔ اس کو یہ پورا یقین ہوتا ہے کہ اس راہ پر چلتے ہوئے دوسری راہوں پر چلنے والے لوگ کٹ کٹ کر آتے جائیں گے اور اس کے ساتھ شامل ہوتے جائیں گے اور اس کے ساتھ شامل ہوتے جائیں گے اور راستے کی ساری مشکلات اور کٹھنائیوں کے باوجود ہم اپنی منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ اس طرح یہ صفات قیادت کے لیے بنیادی اوصاف کی حیثیت رکھتی ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے قیادت کا جو ایک اور نہایت اہم وصف معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قائد کے عمل میں تضاد کی کوئی نوعیت اور کیفیت نہیں پائی جانی چاہیے۔ یعنی تضاد نہ ہو اس کی زبان و دل میں تضاد نہ ہو اس کے قول و فعل میں، اور تضاد نہ ہو اس کے حاضر و غائب میں جو وہ آپ کے سامنے ہو وہی آپ کے پیچھے ہو۔ جو کچھ اس کے دل میں ہو وہی اس کی زبان پر ہو، جو اس کی گفتار ہو وہی اس کا کردار ہو۔ مسلمان قائد کو کردار و عمل کا ایک ایسا نمونہ ہونا چاہیے جس میں کسی قسم کا جھول اور تضاد نہ پایا جاتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنی شخصیت کے کسی تضاد کو چھپانے کے لیے کسی نئے تضاد کا سہارا لے اور پھر اس تضاد کو چھپانے کے لیے کسی دوسرے اس سے بھی بڑے اور نئے تضاد کی پناہ تلاش کرے۔ یہاں تک کہ اس کی ساری شخصیت تضادات کے غبار میں گم ہو جائے

قائد کی شخصیت میں تضاد کے نہیں بلکہ مطابقت اور ہم آہنگی کے پہلو نمایاں ہونے چاہییں۔ اس کی شخصیت کے مختلف پہلو باہم متصادم نہ ہوں بلکہ باہم معاون ہوں اور اس شخصیت و کردار کے ساتھ اس کے عمل کی ہمواری اور استواری کی کیفیت یہ ہو کہ اس کا ہر اٹھنے والا قدم یقین اور اعتماد کو لیے ہوئے ہو اور اس طرح اس کی منزل قریب سے قریب تر آتی چلی جائے اس بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اس کی نظر اپنے نتائج پر ہوتی ہے اور چونکہ اس کا عمل اصولوں سے رہنمائی اور قوت حاصل کرتا ہے اس لیے وہ اپنے اصولوں کو مصلحتوں پر قربان نہیں کرتا اور نتیجۃً کسی تضاد کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ تضادات تو مصلحتوں ہی سے جنم لیتے ہیں۔

ان بنیادی باتوں کے بعد لیڈر شپ اور قیادت کے بارے میں ایک اور اہم بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ قائد کو اپنے پیروؤں کا خیر خواہ اور ان کو بھلائیوں کی طرف مائل کرنے والا ہونا چاہیے۔ یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ جہاں عام انسانوں میں خوبیاں پائی جاتی ہیں وہاں ان میں خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ جہاں قوت کے سرچشمے ہیں وہاں کمزوریاں اور جھول بھی ہیں۔ لیکن جس طرح ایک باپ کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیٹے کی شخصیت میں کیا خوبیاں یا خامیاں ہیں اور اس کی پرورش کرتے ہوئے وہ ان دونوں چیزوں کو نگاہ میں رکھ کر اس کی ذہنی فکری اور عملی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس غرض کے لیے اس کی خوبیوں کو تقویت پہنچاتا اور اس کی خامیوں کو

کرنے کی تدابیر کرتا ہے اسی طرح ایک قائد بھی اپنی قوم کے ساتھ ایسی خیرخواہانہ مشفقانہ اور مربیانہ رویہ اختیار کرتا ہے کیونکہ قائد کا رشتہ اپنی قوم کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے لیکن جب ایک لیڈر اپنی قوم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو کمزور کرنے، بگاڑنے اور تباہ کرنے کی روش پر گامزن ہے۔

میں آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اللہ کی مدد شامل حال ہو تو انسان پہاڑوں کو بھی سر کر لیتا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری تخلیق میں کمزوریاں بھی رکھی گئی ہیں انسانی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کا جو مقصد بھی ہے اس کا ایک پہلو انسانی فطرت کی خامیوں اور خوبیوں اور خیر و شر کی آویزش و کشمکش کا بھی ہے۔ انسان کے اندر بھلائی اور برائی دونوں کی طرف رجحان ودیعت کیا گیا ہے اور انسانی آزادی کا حقیقی مفہوم دراصل یہی ہے کہ ہمیں نیکی اور بدی، بھلائی اور برائی کا شعور دینے کے بعد اس فیصلے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہم ان دونوں راستوں میں سے کس کا انتخاب کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک لیڈر اپنی قوم کے سامنے مختلف راستے پیش کر سکتا ہے اور ان کے ساتھ کئی طرح سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ رابطہ ان کی کمزوریوں کے واسطے سے بھی قائم کر سکتا ہے اور ان کی خوبیوں کے واسطے سے بھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک سچے قائد کا کام کیا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کو اور پھر دنیا کو ایک نئی تہذیب سے روشناس کرایا تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپ نے اہل عرب کی زندگیوں میں جو کہ ہر طرح کی خرابیوں اور برائیوں سے معمور تھیں، ایک ایسا تغیر پیدا کیا جو لوگوں کے لیے حیران کن تھا۔ وہی لوگ جو کل تک اپنی لڑکیوں کو زندہ گاڑتے تھے، بتوں کے سامنے جھکے رہتے تھے اور پانسے پھینک پھینک کر اپنی تقدیر کا حال معلوم کرتے تھے ان کے فکر و نظر میں یہ انقلاب پیدا کیا کہ وہ اب خدا واحد کے سوا کسی کے سامنے سر جھکانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ایسا نہیں ہے کہ ان کی تخلیق کی نوعیت بدل گئی تھی بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ان کے قائد نے ان کی کمزوریوں سے ان کو منزہ کر کے ان کی خوبیوں کو اجاگر کر دیا تھا اور ان کی شخصیتوں کو اٹھا کر ایک ایسی بلند سطح پر فائز کر دیا تھا کہ پھر آہستہ آہستہ ذہن و فکر اور اخلاق و کردار کی اس سطح کو دنیا اور تاریخ کی اعلیٰ ترین سطح سمجھا جانے لگا۔

اس کے بالکل برعکس قیادت کی بدترین شکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی لیڈر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے قوم کے مختلف عناصر کی کمزوریوں کو تاکے اور اس راستے سے لوگوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور رکھے۔ پنجابی محاورے کے مطابق ایک ایک شخص کو کانا کر کے اس کی حیثیت کو مجروح اور داغدار بنانے کی کوشش کرے تاکہ اس کے سامنے اسے سرتابی کی مجال نہ رہے۔ کسی کو روپے کا لالچ ہے تو اسے روپے کا لالچ دے کر خرید لیا جائے۔ کسی کو کرسی کی ہوس ہے تو اس کو کرسی دے کر اپنے ساتھ ملایا جائے۔ اس طرح ایک بدترین ...

اپنا اصول بنا لیا جائے اور اپنی ذاتی مصلحتوں پر تمام اصولوں اور سچائیوں کو بھینٹ چڑھا دیا جائے — حالاں کہ ایک مخلص اور سچے قائد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قیادت کی بنیاد اصولوں کی بالادستی پر رکھتا ہے اور خود کو ہر طرح کی وقتی مصلحتوں سے بالاتر رکھتا ہے۔

اپنی قریبی تاریخ ہی دیکھ لیجیے۔ کیا وجہ ہے کہ لوگ قائد اعظمؒ کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ وہ کسی مصلحت کی خاطر اصول کو قربان نہیں کرتے — یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ کلکتے کی ایک میونسپل کمیٹی کا الیکشن ہونا تھا۔ قائد اعظم کے پاس ان کے کچھ رفقا گئے اور انھوں نے کہا کہ اگر فلاں حلقہ انتخاب constituency کو اس خاص طرح سے بنا لیا جائے تو مسلمان یہ الیکشن جیت سکتے ہیں۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ میں ایسا الیکشن نہیں جیتنا چاہتا جس کے لیے ایک حلقہ انتخاب کے حدود کو اصول سے انحراف کر کے تبدیل کیا جائے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات تھی لیکن قائد اعظمؒ جیسا بااصول لیڈر بظاہر اس چھوٹی سی بے اصولی کو بھی کیونکر گوارا کر سکتا تھا کیوں کہ اصول تو وہی ہے جو میونسپلٹی پر بھی لاگو ہوتا ہے اور پارلیمنٹ پر بھی۔ اور دراصل انسان کے سارے اعمال ہی اس کے زیر اثر ہوتے ہیں — اصول یہ نہیں ہے کہ چھوٹے معاملوں میں تو آپ اصولوں کو مصلحتوں پر قربان کر دیں اور یہ کہیں کہ جب کوئی بڑا معاملہ درپیش ہوگا تو البتہ میں مصلحت سے انکار کر دوں گا — حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی مصلحتیں ہی دراصل ساری زندگی کو غلط نہج پر ڈال دیتی ہیں۔ چھوٹی مصلحت اور بڑی مصلحت میں اسی طرح کوئی فرق نہیں ہے جس طرح چھوٹے جھوٹ اور بڑے جھوٹ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کہنا کہ آج میں چوری کرنے نکلا ہوں لیکن دس روپے سے زیادہ نہیں چراؤں گا۔ اگر عجیب طرح کی فریب کاری نہیں تو ایک حسین خود فریبی ضرور ہے کیونکہ جب چوری کرنا ہی ٹھہرا تو خواہ دس روپے چراؤ یا ہزار روپے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ مصلحتوں کی خاطر اصولوں کو قربان کرنا، خواہ وہ مصلحتیں چھوٹی ہوں یا بڑی، ایک بنیادی اصول کا مسئلہ ہے اور جو شخص اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے (یعنی ایک طرح کی مصلحت کی خاطر) افراد قوم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے وہ بدترین بے اصولی، بلکہ ایک انسانی اور قومی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تاریخ ساز کارنامۂ اصلاح و تعمیر کے ذریعے سے قیادت کا جو پیغام دیا ہے وہ یہی ہے کہ قائد اپنے ساتھیوں کے عمل کی سطح کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرے اور ان کی خامیوں کو خوبیوں میں بدلنے کی تدبیر کرے۔ نہ یہ کہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے تو اس کے بعد اس سے آنکھیں چار نہ کر سکے۔

افسوس کہ اس وقت ہمارے معاشرے کی مجموعی کیفیت ہی یہ ہو گئی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے عیب تلاش کرنے اور انہیں ہدف تنقید بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ نتیجہ ایک بے اعتمادی اور بے اعتقادی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں

اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ کوئی قومی مقصد سامنے نہیں، نہ منزل کا تعین ہے، نہ راہ کا علم ہے اور نہ یقین کی روشنی — اور بنیادی سبب اس ساری صورت حال کا یہ ہے کہ صحیح قیادت کا خلا ہے۔ نگاہیں صحیح قیادت کی پہچان سے عاری ہو چکی ہیں اس لیے غلط قیادتوں کا سکہ خوب چل رہا ہے — دوسرے رخ سے دیکھیں تو قوم کو اس حال تک پہنچانے میں ان غلط قیادتوں کی سحر کاریوں اور کمالات کا حصہ بھی کسی دوسری چیز سے کم نہیں ہے۔

قیادت کے ایک منفی نمونے کی تصویر سورہ البقرہ کی درج ذیل آیت سے ہمیں ملتی ہے۔ ان آیات میں یہ شدید تنبیہ بھی مضمر ہے کہ راہ حق واضح ہو جانے کے بعد انسانوں کا گمراہی پر اصرار کرنا یا حق کو پورے طور پر قبول نہ کرنا کامیابی اور فلاح کا راستہ نہیں ہے بلکہ پیروی شیطان کا ہم معنی ہے اور اس کا انجام محتاج وضاحت نہیں۔ کیا شیطان کی پیروی کرنے کو اس کی لیڈر شپ قبول کرنے کے تصور سے الگ کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوال بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔

ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

• انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں تمہیں دنیا کی زندگی میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے — حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آ چکی ہیں، اگر ان کو پا لینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب ہے اور حکیم و دانا ہے۔ (ان ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے، فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟ — آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔

(البقرہ۔ آیت ۲۰۴ تا ۲۱۰ تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۶۱)

آپ نے دیکھا کہ ان آیات کے ابتدائی حصے میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو باتیں بڑی بھلی اور خوش نما کرتے ہیں لیکن ان کا عمل ان سے بالکل مختلف اور متضاد ہوتا ہے اور دنیا کے اقتدار

ہے کہ قول اور عمل کے اس تضاد سے جو ہمہ گیر فساد پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ بڑی سے بڑی تہذیب کو بھی لے ڈوبتا ہے۔

حضرات! میں نے آپ کو تفہیم القرآن سے قرآن مجید کی چند آیات کے تراجم پڑھ کر سنائے ہیں اور ان سے جو رہنمائی اور نصیحت میں نے حاصل کی ہے اس میں اپنے ساتھ آپ کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی ہے — آخر میں میں پھر اس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ سب سے ضروری بات قرآن کے پیغام کو سمجھنے کی ہے تاکہ اس پر عمل کیا جا سکے اس پر عمل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ انسان خلوص دل کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور ایک مکمل اور مثالی نمونہ کے اپنے سامنے رکھے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس دنیا میں پیدا کر کے خیر و شر کی جس کشمکش میں ڈالا ہے اس میں وہ اپنی کمزوریوں خامیوں پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ اور جن خوبیوں اور قوتوں سے اللہ تعالیٰ نے اسے نوازا ہے ان کو وہ ترقی دینے اور پروان چڑھانے کی تدبیر کرے۔ علاوہ بریں اس ساری تگ و دو میں اس ضابطہ حیات (CODE OF CONDUCT) اور سرچشمہ ہدایت سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے کی سعی کرے جو خالق کی عنایت سے اس کے نصیب میں آئی ہو

میں آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری باتیں سنیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ گذارشات آپ کے دل میں قرآن مجید کے پڑھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا شوق پیدا کرنے میں مفید ثابت ہوں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے۔

جماعت اسلامی ہند

ملک وملت کی تعمیر میں اس کا رول

(جناب افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی ہند)

جماعت اسلامی ہند ایک اصولی اور غیر فرقہ پرست جماعت ہے جو کم و بیش ۳۲ برسوں سے ملک و ملت کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کا پیغام وہی ہے جو اسلام کا پیغام ہے نہ اس سے رتی بھر کم اور نہ رتی بھر زیادہ۔ وہ بے کم و کاست پورے دین اسلام کو قائم کرنے اور باطن سے لیکر ظاہر تک پوری انسانی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال دینے کے لیے کام کر رہی ہے۔

مقاصد

جماعت کی یہی خواہش، کوشش اور دعا ہے کہ ہمارے وطن عزیز میں خدا پرستی و خدا ترسی کا چلن عام ہو۔ بندگان خدا اپنے رب کو راضی کرنے اور اس کی پکڑ سے بچنے کے لیے اس کی عبادت و اطاعت کریں اور اس کی ذات و صفات، اس کے حقوق و اختیارات اور اس کی عبادت و اطاعت میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ باشندگان ملک رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک اور مثالی اسوہ کی اتباع کرکے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کے حامل بنیں۔ ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ ان کو ادا کریں۔ کسی پر ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔ ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اونچ نیچ بھید بھاؤ ختم ہو۔ لوگ ایک دوسرے کو اپنا بھائی اور آدم کی اولاد سمجھیں۔ ملک کی مذہبی و تہذیبی اکائیوں کے درمیان خیر سگالی اور یکجہتی کے جذبات پروان چڑھیں ان کے درمیان دوریاں کم ہوں اور وہ ایک دوسرے کے کام آئیں۔

ملک سے فقر و فاقہ بے کاری و بے روزگاری [illegible] و جہالت اور پستی و پسماندگی دور ہو۔ کوئی بھوکا کھانے کو، کوئی ننگا کپڑے سے اور کوئی مریض دوا علاج سے محروم نہ رہے۔ لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کا احترام کیا جائے۔ بے حیائی و بدکرداری، جوئے سٹے اور شراب نوشی

سودخواری کی لعنت سے نجات ملے۔ افراد کے خیالات و افکار میں پاکیزگی آئے، ان کے عادات سدھریں اور اخلاق سنوریں۔ وہ ہر حال میں قول کے سچے، عہد کے پکے، دیانتدار اور امین ثابت ہوں وہ کیرکٹر والے بنیں تاکہ موافق مخالف سب ان کی سیرت و کردار پر بھروسہ کرسکیں اور ان کے مجموعے سے ایک ایسا ہمدرد و غمخوار صالح اور صحت مند سماج وجود میں آئے جو بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کے استیصال کے لیے سازگار ماحول فراہم کرے اور افراد کی صحیح خطوط پر نشوونما و ارتقا ہوسکے۔ ہمارے ملک کو صاف ستھرا، فرض شناس اور حق و انصاف کا محافظ، بنیادی حقوق کا پشت پناہ، معروفات کو قائم کرنے اور منکرات کو مٹانے والا ایسا مستعد اور چوکس ایڈمنسٹریشن ملے جس میں ذمہ داری و جوابدہی کا احساس ہو۔ ملک سے بدنظمی و بدعنوانی دور ہو، مملکت کے وسائل و ذرائع، باشندگان ملک کی ضروریات کی تکمیل اور ان کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوں۔ غرض وطن عزیز کی تعمیر و ترقی صالح بنیادوں پر کی جائے تاکہ باشندگان ملک کو امن و سکون نصیب ہو وہ پھلیں پھولیں اور دنیوی فلاح کے ساتھ اخروی نجات سے بھی ہم کنار ہوں۔

محرک جماعت کے متوسلین اور کارکنوں کی ساری تگ و دو اور جملہ سرگرمیوں کا محرک صرف یہ جذبہ ہے کہ ہمارا رب ہم عاجز بندوں سے راضی ہو جائے۔ ہم اس کی گرفت سے جو نہایت شدید ہے بچ سکیں۔ ہمارے مالک کی رضا و خوشنودی ہم کو حاصل ہو، ہماری جد و جہد کا محرک نہ تو ہمارا کوئی ذاتی گروہی یا جماعتی مفاد اور دنیوی غرض ہے اور نہ اپنے رب کے سوا کسی دوسرے سے ہم کسی اجر کے طالب ہیں۔ یہ کام خالصۃً لوجہ اللہ ہے۔

ذرائع اور طریقے ان پاکیزہ مقاصد کے حصول کے لیے جماعت افہام و تفہیم، تعلیم و تربیت، تبلیغ و تلقین، نصیحت و ترغیب اور نشر و اشاعت سے کام لیتی اور اس طرح اس جد و جہد کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرتی ہے۔ جماعت کا اس پر کامل یقین ہے کہ پاکیزہ مقاصد پاک ذرائع ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ زور زبردستی یا زیرزمین (Under ground) سرگرمیوں سے فساد تو رونما ہو سکتا ہے، تعمیر و اصلاح ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے جماعت اپنے پیش نظر مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اخلاقی، تعمیری، پُرامن جمہوری اور آئینی طریقے اختیار کرتی ہے۔

نظمِ جماعت جماعت کا پورا نظام اوپر سے نیچے تک شورائی و جمہوری ہے۔ ہر سطح پر اس کے سارے امور باہمی مشوروں سے طے ہوتے ہیں۔ جماعت کے مقامی امراء جماعتی امور میں مقامی ارکان کے مشورے کے پابند ہوتے ہیں۔ امرائے حلقہ جات اپنے حلقے کی مجلس شوریٰ کے مشوروں کے تحت حلقے میں جماعت کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ مجلس ارکان حلقہ کی منتخب کردہ ہوتی ہے۔ امیر جماعت مرکزی مجلس شوریٰ کے مشوروں سے کام کرتا ہے۔ امیر جماعت اور مرکزی مجلس شوریٰ کا انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ ان کا انتخاب مجلس نمائندگان کرتی ہے جو ارکان جماعت کی منتخب

ہوتی ہے۔ مقامی امراء کے تقرر میں مقامی ارکان کی رائے کو اور امیر حلقہ کے مشوروں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ہر دو سال بعد امرائے مقامی کے لیے ارکان مقامی سے اور ہر چار سال بعد امرائے حلقہ کے لیے ارکان حلقہ سے استصواب کرایا جاتا ہے۔ جماعت کی پالیسی اور پروگرام مرتب کرکے سے طے ہوتے ہیں۔

پروگرام منصوبہ بند اور منظم جدوجہد کے لیے چار چار سال کے قلیل المدت پروگرام مرتب کرکے جماعت اسے ملک کی تمام اہم زبانوں میں شائع کرتی رہتی ہے تاکہ بلا لحاظ مذہب و ملت زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے پروگرام سے متعارف ہو سکیں اور رفاہ خیر پسند افراد اور تنظیموں کا ان تعمیری کاموں میں تعاون حاصل ہو سکے۔ ملک میں جو افراد اور تنظیمیں اس طرح کے کام اپنے طور سے انجام دیتی ہیں۔ جماعت اپنے اصولوں کے تحت ان کے ساتھ تعاون بھی کرتی ہے

اصلاح و تربیت اپنے پروگرام میں جماعت جہاں اپنے جملہ متوسلین اور کارکنوں کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنی اور اپنے خاندان کی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ دینے پر اکساتی اور اس کے لیے باضابطہ اہتمام کرتی ہے۔ وہیں خیر پسند افراد اور تنظیموں کی مدد سے دوسرے مسلمان بھائیوں کی ہمہ جہتی اصلاح و تربیت کرکے ان کو بھی دینی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی و تنظیمی نیز صحت و صفائی غرض ہر لحاظ سے اونچا اٹھانے کی امکانی کوشش کرتا ہے تاکہ ہمارے مسلمان بھائی ملک و ملت کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کے سلسلے میں مؤثر رول ادا کر سکیں اور خیر امت کی حیثیت سے ان پر داعی خیر ہونے کا جو فریضہ عائد ہوتا ہے وہ اس کو انجام دینے کے لائق بن سکیں اور اس حق کی قولی و عملی شہادت دے سکیں جس کے وہ امین ہیں۔

مسلمانوں میں دینی تعلیم کی عام ترویج و اشاعت کے لیے جماعت ہمہ وقتی، جز وقتی، صباحی و شبینہ مکاتب، مدارس، اسٹڈی سرکل اور تعلیم بالغان کے مراکز قائم کرتی ہے اور ان کے قیام میں مقامی آبادی سے تعاون حاصل کرنے کے ساتھ دوسروں سے تعاون بھی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی عام تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے اسکولوں اور کالجوں کے قیام کے لیے مسلمانوں کو ابھارتی اور ان کی نگرانی میں قائم ہونے یا چلنے والے اداروں میں مسلمان طلبہ و طالبات کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ تمام اہم علاقائی زبانوں میں قرآن مجید، احادیث، سیرت اور صالح لٹریچر کی اشاعت کے لیے اہل خیر حضرات کے تعاون سے ٹرسٹ قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے اور اپنے طور سے ملک کی بارہ زبانوں میں متعدد کتابیں شائع کر چکی ہے اور برابر شائع کرتی رہتی ہے۔

مذہبی و تہذیبی امور و مسائل مسلم پرسنل لا، اردو زبان کی بقا کے تحفظ، شرعی پنچایتوں کے قیام، شعائر دین کے پاس و لحاظ

اور ملی تشخص کی برقراری کی جد وجہد بھی اس کے پروگرام میں شامل ہے۔ ان تمام مشترک امور و مسائل کو حل کرنے کے لیے وہ کوشش کرتی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے افراد اور جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ ان میں نظم و ضبط پیدا ہو اور وہ متحد و منظم ہو کر باہمی اشتراک و تعاون کے ساتھ جد وجہد کریں اور ان تسلیم شدہ بنیادی حقوق کی برقراری میں جو رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے غیر مسلم بھائیوں کا بھی زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کریں۔

غیر مسلموں میں کام

جماعت غیر مسلم بھائیوں سے بھی وسیع پیمانے پر بے لوث برادرانہ تعلقات اور روابط قائم کر کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور باہمی دوری اور منافرت کو ختم کرنے اور اسلام و تحریک اسلامی سے انہیں صحیح طور سے متعارف کرانے کے ساتھ مشترک امور و مسائل کو مل جل کر حل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور آبادیوں میں عمومی فلاح و بہبود اور خدمت خلق کے لیے رفاہی و فلاحی ادارے قائم کرنے اور بھلائی کے کاموں کو انجام دینے اور سب کی نظروں میں کھٹکنے والی برائیوں کو دور کرنے میں ان کا تعاون حاصل کرتی ہے اور جہاں اس طرح کا کوئی کام پہلے سے ہو رہا ہو وہاں اپنا تعاون بھی پیش کرتی ہے۔

ملک کے سنگین مسائل

اس وقت ملک متعدد سنگین مسائل سے دوچار ہے مثلاً فقر و فاقہ، گرانی و نایابی، لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ اور چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی، بدعنوانی و رشوت ستانی، نظم و نسق کی ابتری، تشدد و لاقانونیت کی بڑھتی ہوئی لہر، غنڈہ گردی، وغنڈہ پروری، ہڑتال کی عام وبا، قومی دولت اور املاک کی وسیع پیمانے پر بربادی، باہمی نفرت و بے اعتمادی، نفسانیت و اباحیت، فحاشی و بے حیائی، اخلاقی انارکی، کام چوری اور غیر ذمہ دارانہ روش، کلیت پسندانہ و آمرانہ رجحانات، بنیادی حقوق کی پامالی، ظلم و ناانصافی، عصبیت و عدم رواداری اور ان سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ کہ جھنجھلاہٹ میں ان کے حل کرنے کے لیے غیر جمہوری اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے رجحان میں دن بدن اضافہ جس سے مسائل سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھ رہے ہیں اور ان کی شدت و سنگینی بڑھتی جا رہی ہے۔ غرض زندگی کے ہر گوشے میں بگاڑ اور فساد رونما ہو چکا ہے اور باشندگان ملک کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔

یہ ہمارے اپنے ہی کرتوتوں کا کڑوا کسیلا پھل اور اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ
أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي
عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سورۃ روم ۴۱)

خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا۔ شاید کہ وہ باز آئیں۔

ملک کے اس ہمہ گیر بگاڑ میں جملہ باشندگان ملک شامل ہیں وہ

کسی پارٹی یا جماعت سے تعلق رکھتے ہوں سب شریک ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس ہمہ گیر بگاڑ میں کسی کا حصہ کم ہے اور کسی کا بہت زیادہ۔

مسائل کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

یہ مسائل پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر لوگوں کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں اور ان برائیوں اور منکرات کو جڑ پکڑنے اور پروان چڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے جن کو انسان طبعاً برا سمجھتے اور ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور جن کے کرنے سے تمام شرائع الٰہیہ نے منع کیا ہے اور ان نیکیوں اور معروفات کو دبنے اور مٹنے دیا جاتا ہے جن کو ہر شخص اپنے لیے طبعاً پسند کرتا ہے جن کو ہمیشہ اچھا سمجھا گیا ہے اور جن کو کرنے کا تمام شرائع الٰہیہ نے حکم دیا ہے۔ ہمارا رب تو ہم پر بے حد مہربان ہے وہ ہمیں پھلتا پھولتا دیکھنا پسند کرتا ہے ظلم اور بگاڑ اسے بے حد ناپسند ہے۔ اس نے ہمیں ایک نہایت خوبصورت سرسبز و شاداب، وسیع و عریض، زرخیز اور سونا اگلنے والی سرزمین عطا فرمائی۔ اس سرزمین کو افرادی قوت اور پیداوار کے لامحدود وسائل و ذرائع سے مالا مال کیا۔ موقع و محل کے اعتبار سے بھی ہمارے وطن عزیز کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے مختلف حیثیتوں سے ہمارا ملک دنیا کے چند بڑے ممالک میں سے ایک ہے۔ ہمارے مالک نے ہماری ایک صدی کی تمناؤں اور کوششوں کے بعد ہمیں آزادی کی نعمت سے نوازا اور اس ملک کا انتظام ہمارے اپنے ہاتھوں میں آیا۔ اس کے نتیجے میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس کے شکر گزار بندے بن کر رہتے ایک دوسرے کے حقوق پہچانتے، سیرت و کردار سنوارنے کی فکر کرتے، وطن عزیز کی تعمیر و ترقی میں لگتے اس کے وسائل و ذرائع سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کے بھی کام آتے۔ مگر یہ تو ہماری بدبختی ہے کہ ہم نے صحیح روش سے گریز کیا اور ۴۰ سال کے اندر تمام ان عیوب اور کمزوریوں کو راہ پانے کا موقع دیا جو زوال خوردہ قوموں کا وطیرہ ہوتی ہیں اور ہندوستان جنت نشان کو اپنے ہاتھوں بگاڑ کر رکھ دیا اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام وسائل و ذرائع کے باوجود ہمارے ملک سے گویا برکت اٹھ گئی ہے

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے کالے کرتوتوں کی وجہ سے ہمارا رب ہم سے ناراض ہے۔ وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اسے بگاڑ بالکل پسند نہیں۔ اب بھی اگر ہم اس کی طرف پلٹیں، اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں پر نادم ہوں۔ اپنے اعمال و اخلاق سنواریں اور اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو مایوسی کی کوئی بات نہیں، وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ توقع ہے کہ وہ اپنی رحمتوں اور نوازشوں کے ساتھ پھر ہم پر نظر کرم فرمائے گا موسلا دھار بارش برسائے گا۔ ہماری کھیتیاں لہلہائیں گی۔ ہمارے کارخانے پیداوار میں اضافہ کریں گے اور رب ہمارے مال اور ہماری اولاد میں برکت دے گا۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝

يُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنّٰتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهٰرًا

(نوح - ۱۰ تا ۱۲)

اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کرے گا۔

حل کی کوشش

موجودہ ناگفتہ بہ حالت کو بدلنے اور ان خرابیوں کی روک تھام کے سلسلے میں جن سے اس وقت ہمارا ملک دوچار ہے۔ جماعت کا رول مثبت ہے وہ تخریبی کے بجائے تعمیری ذہن بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ جماعت باشندگان ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑنے، ان کے دلوں سے اپیل کرنے، ان کی انسانیت اور جذبۂ خیر پسندی کو بیدار کرنے کا اہتمام کرتی ہے اور ہر مسلک، عقیدے اور ہر مکتب فکر کے افراد اور جماعتوں کا زیادہ سے زیادہ عملی تعاون حاصل کرتے ہوئے اصلاح حال کی عملی جدوجہد کر رہی ہے اور بھلے کاموں میں ہر ایک سے تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے۔

خدمت خلق

جماعت بلا لحاظ مذہب و ملت اور دوستی دشمنی تمام ضعفا، مجبوروں اور مظلوموں کی امداد کرنے، گرتے ہوئے کو سہارا دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کرنے، پسماندگی دور کرنے، فقر و فاقہ اور بھیک مانگنے سے لوگوں کو بچانے کی بھی امکانی کوشش کرتی ہے، اس کے لیے متوسلین جماعت انفرادی و اجتماعی کوششوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ خیر پسند مسلمانوں، غیر مسلموں، مردوں، عورتوں، نوجوانوں اور نوعمروں کا تعاون حاصل کر کے چھوٹے بڑے فنڈ بھی قائم کرتے ہیں۔ آبادیوں میں صلہ رحمی اور بندگان خدا کے حقوق کی ادائیگی کی عام فضا بنانے کے ساتھ حسب ضرورت و گنجائش بیت المال اور اس طرح کے فنڈ سے مستحقین کی امداد کی جاتی، یا ضرورت مندوں کو بلا سودی قرض دیا جاتا ہے جہاں وسائل اجازت دیتے ہیں، مفت دوا علاج کے لیے طبی مراکز بھی قائم کیے جاتے ہیں اور ان کا فلاحی و رفاہی کاموں میں صرف حکومت کی امداد پر تکیہ کرنے کے بجائے لوگوں میں انفاق کا جذبہ بیدار کر کے ان کی اعانتوں، صدقات، فطرہ، چرم قربانی وغیرہ سے فنڈ فراہم کر کے جماعت جہاں مقامی وسائل و ذرائع سے کام لیتی ہے وہیں رفاہی فلاحی انجمنوں اور اداروں، سوشل ویلفیئر کے سنٹروں، کمیونٹی ڈولپمنٹ اور پچھڑی ہوئی ذاتوں اور قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے سرکاری اسکیموں، بڑھاپے و کبر سنی کی پنشن وغیرہ مدات سے بھی مستحقین کو اپنا حق وصول کرنے میں تعاون کرتی ہے اور ان اسکیموں سے استفادے میں جو ضوابط مانع ہوتے ہیں مثلاً ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں کے مواقع پر امداد کا بھی سود کی لعنت سے ملوث ہونا یا عملہ کی بدعنوانیوں یا بدنظمیوں کی وجہ سے مستحقین تک امداد پہنچنے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں ان کے خلاف آواز اٹھاتی، نیز ان کے خاتمہ کو ہموار

کرتی اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

مرحمت و مواساۃ اور خدمت خلق کے ان کاموں میں جماعت اس بات کا بڑا لحاظ رکھتی ہے کہ امداد پانے والوں کی خودی مجروح نہ ہو، وہ بھیک مانگنے کے عادی نہ بنیں بلکہ امداد یا قرض لے کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور کاروبار اور دھندوں سے لگ جائیں۔ یہ امداد کسی پر احسان دھرنے یا کوئی دنیوی فائدہ اٹھانے یا نمود و نمائش کے جذبے سے نہ کی جائے بلکہ اپنا فرض اور ان کا حق سمجھ کر صرف خدا کو خوش کرنے کی نیت سے کی جائے۔ انفرادی امداد حتی الامکان اخفاء کے ساتھ ہو تاکہ دینے والے کا اخلاص اور پانے والے کی عزت نفس اور انسانی شرف بحال رہے۔

سرگرمیاں پورے ملک میں اس وقت جماعت کے کم و بیش دو ہزار ارکان ہیں۔ ساڑھے تین سو مقامی جماعتیں ہیں، تیس ہزار متفقین ہیں جن میں مسلمان مرد اور خواتین شامل ہیں۔ ان متفقین کے ایک ہزار حلقے ہیں۔ تقریباً تیرہ ہزار خواتین ہمارے پروگرام سے دلچسپی لیتی ہیں جن کے تین سو حلقے ہیں۔ ان کے علاوہ لاکھوں مسلمان بھائی ایسے ہیں جو ہمارے کاموں کو پسند کرتے اور کسی نہ کسی درجے میں عملی تعاون کرتے ہیں۔ بیس ہزار غیر مسلم بھائیوں سے ہمارے بے لوث برادرانہ روابط ہیں۔ ان میں سے ایک ہزار کے قریب غیر مسلم بھائی ایسے ہیں جو باضابطہ ہمارا اقدام بھر کر ہمارے معاون بن چکے ہیں۔ کثیر تعداد میں نوجوان اور طلبہ و طالبات بھی ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ہمارے کاموں میں تعاون کرتے ہیں اس طرح کے طلبہ کے ۱۸۷ اور طالبات کے ۹۰ منظم حلقے ہیں جو اپنے حلقوں میں اصلاحی و تربیتی اور خدمت خلق کے کام انجام دیتے ہیں۔ رواں چار سالہ میقات میں ہم نے ۱۳۵ محلے اور آبادیاں منتخب کی ہیں تاکہ وہاں زیادہ توجہ مرکوز کر کے انہیں مثالی اور نسبتاً زیادہ اسلامی اقدار کا حامل بنایا جاسکے۔

مذکورہ افرادی قوت اور خیر پسند بھائی بہنوں کی امداد و تعاون سے جماعت کے کارکن جہالت کو دور کرنے اور دین کی بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے لڑکوں کے ساڑھے پانچ سو سے زائد اور لڑکیوں کے پچاس مدارس و مکاتب، تعلیم بالغان کے ساڑھے تین سو مراکز چلاتی ہے جن میں ۷۲ خواتین اور پونے تین سو مردوں کے لیے ہیں۔ فقر و فاقہ اور پس ماندگی دور کرنے کے لیے جہاں متوسلین جماعت انفرادی و اجتماعی طور سے اپنے اپنے مقامات پر جدوجہد کرتے ہیں اور حسب گنجائش بیت المال اور مقامی فنڈ سے مستحقین کی امداد کرتے ہیں وہیں دوسرے خیر پسندوں کے تعاون سے ۲۴ مقامات پر بلاسودی قرض کی اسکیم چلا رہے ہیں جن میں اجودھیا اور ناگم باڑی کی وہ بلاسودی سوسائٹیاں بھی شامل ہیں جن سے گذشتہ مالی سال کے دوران بالترتیب ڈھائی لاکھ اور پونے دو لاکھ بطور قرض دیے گئے۔ متعدد مقامات پر چھوٹی صنعتوں اور سلائی مشین وغیرہ کا انتظام کر کے بیکاری دور کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ قحط و سیلاب، زلزلہ، آتش زدگی کے شکار یا فرقہ وارانہ فسادات کے مظلومین کو

رلیف پہنچانے کے لیے خصوصی فنڈ فراہم کیے جاتے ہیں۔ اور ان تمام حضرات کے تعاون سے جو جماعت پر اعتماد کرتے ہیں رقم، کپڑے، اناج اور دوائیں وغیرہ اکٹھا کر کے بلا لحاظ مذہب و ملت مستحقین کی مدد کی جاتی ہے۔ اب تک اس طرح کے خصوصی فنڈ سے کم و بیش ۸۰ لاکھ روپے مستحقین تک پہنچائے گئے۔ اس میں تین لاکھ کی وہ رقم بھی ہے جو بہار قحط کے موقع پر، اور ۱½ لاکھ نقد، ۱½ لاکھ کی دوائیں اور کپڑے وغیرہ بھی شامل ہیں جو احمد آباد کے فساد کے موقع پر مستحقین میں تقسیم کیے گئے اور جس سے توڑ پھوڑ اور آتش زنی کے نتیجے میں جو مکانات متاثر ہوئے تھے ان کی مرمت کے علاوہ اجڑے ہوؤں کی بازآبادکاری کے لیے ملت نگر کی کالونی بسائی گئی ہے۔ طبی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے جماعت نے چھوٹے بڑے مراکز قائم کیے ہیں جن میں حیدرآباد کا مسلم میٹرنٹی اسپتال، کانپور کا زچہ بچہ اسپتال وغیرہ شامل ہیں۔

لوگوں کے فکر و عمل میں تبدیلی لانے کے لیے جماعت نے سیکڑوں مقامات پر چھوٹی بڑی لائبریریوں، دارالمطالعے، گشتی لائبریریوں، اسٹڈی سرکل کا بھی اہتمام کیا ہے۔ آئے دن جگہ جگہ سمپوزیم و سمینار منعقد کرتی رہتی ہے اور تربیتی اجتماعات کے علاوہ خطاب عام، انفرادی اور تشکیل وفود ملاقاتوں وغیرہ کے ذریعے لوگوں کا ذہن تعمیری رخ پر موڑنے اور اخلاص سے ملک و ملت کی خدمت انجام دینے کے لیے جماعت مسلسل کوششیں کرتی رہتی ہے۔ اس کا لٹریچر ملک کی بارہ زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ بچوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی اس نے کافی لٹریچر تیار کیا ہے جو ہر جگہ مختلف زبانوں میں بآسانی مل سکتا ہے۔ یہ ہے جماعت کی حقیر کوششوں کا ایک مجمل خاکہ، اللہ تعالیٰ شرف قبولیت بخشے۔ آمین

حرفِ آخر جماعت جس راہ کی طرف جملہ باشندگان ملک کو بلاتی ہے وہ ہمارے رب کا سیدھا سچا راستہ ہے۔ یہ وہی دین فطرت، سبیل رب اور صراط مستقیم ہے۔ وہی انسان کے دل کی آواز ہے۔ جماعت کا ایمان اور پختہ یقین ہے کہ اسی راہ کو اپنا کر اور اسی کے مطابق جدو جہد کر کے ملک اور باشندگان ملک کی صحیح خدمت ہو سکتی ہے۔ اسی راستے پر چل کر افراد کی سیرتیں سنور سکتی ہیں۔ عادات سدھر سکتی ہیں اور ان کے اخلاق بلند ہو سکتے ہیں اور افراد کو وہ ذہنی و قلبی سکون حاصل ہو سکتا ہے جس کی ہر ایک کو تلاش اور جس کا ہر فرد طالب ہے۔ اسی کے ذریعے گھروں کی فضا درست ہو سکے گی اور باہمی اعتماد، حسن سلوک اور خاندانی الفت و مسرت نصیب ہوگی۔ پاکیزہ اور ہمدرد و غم خوار سماج وجود میں آ سکے گا اور ہماری مملکت صحیح معنوں میں رفاہی و فلاحی اسٹیٹ بن سکے گی اور ملک کو ایسا صاف ستھرا اور مخلص [illegible] مل سکے گا جو احساس ذمہ داری رکھنے کے ساتھ ساتھ حق کا پشت پناہ، عدل و انصاف کا ضامن، باشندگان ملک کا بہی خواہ، بدعنوانیوں سے پاک، بھلائیوں کو فروغ دینے والا اور برائیوں کو مٹانے والا ہو اور سب سے بڑی اور سب سے اہم بات یہ کہ اگر ہمارے رب کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال رہی تو باشندگان ملک کو دنیوی فلاح کے ساتھ ساتھ

(باقی صفحہ [illegible] پر)

جناب عبدالحق پرنسپل عربک کالج
کانو، نائیجیریا

نائیجیریا کے مسلمان

ایک عبرتناک رپورٹ

تقریباً ۲۵ سال پہلے چاڈ، کیمرون، نائیجیریا، مالی اور نائیجر، گھانا اور مغربی افریقہ کے دوسرے ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں اور یورپ کے دوسرے ممالک کی حکومتوں نے لاکھوں عیسائی مشن کھول کر مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا ہے۔

مغربی افریقہ کے سارے ممالک مسلمانوں پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ میں اس مضمون میں صرف شمالی نائیجیریا کے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے جو حالت شمالی نائیجیریا کے مسلمانوں کی ہے کم و بیش یہی حالت سارے جنوب مغربی افریقہ کی ہے۔

شمالی نائیجیریا پر انگریزوں نے تقریباً ۱۹۰۰ء میں حکومت کرنا شروع کی۔ اور ان کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی پورے ملک میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھ گیا۔ مشنریوں نے ہزاروں اسکول کھول دیئے اور حکومت نے بھی چند اسکول کھول دیے۔

شروع میں یہاں کے مسلمانوں نے ان اسکولوں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو انگریزوں کے شروع کے دور حکومت میں برصغیر کے مسلمانوں نے اختیار کیا تھا۔ یعنی انگریزی زبان اور سائنس کی تعلیم کا بائیکاٹ کیا

مشنریوں نے بہت جلد بت پرستوں کو عیسائی بنا کر سرکاری عہدوں پر فائز کر دیا۔ جب مسلمان خواب غفلت سے جاگے تو تعلیم کے ایسے دیوانے ہوئے کہ اپنا دین و ایمان بھی قربان کر بیٹھے۔ اسلامیہ سکول موجود نہ تھے۔ اس لیے مشن اسکولوں میں بچے بھیجے جانے لگے اور جو بچہ وہاں سے پڑھ کر نکلا وہ عیسائیت کے اثر سے بچ نہ سکا۔

تعلیمی اداروں کی تعداد سے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور اس کے اثرات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

لوکل ایجوکیشن اتھارٹی کے اسکولوں میں (جو جونیر اور سینیر پرائمری ہیں) انہیں کی تعلیم لازمی ہے اور اسلامی تعلیم کا کوئی

انتظام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان مدارس کے اسی فی صد اساتذہ عیسائی ہیں۔ ہر عیسائی تبلیغ عیسائیت اپنا فرض سمجھتا ہے مسلمان اساتذہ اسلام کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتے اس لیے ان کی طرف سے تبلیغ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرائمری اسکولوں میں تعلیم مکمل کر کے یہی طلبا سکنڈری اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کے سکنڈری اسکولوں میں طلبا کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ اسلامی دینیات یا بائیبل نالج میں سے کوئی ایک مضمون لے لیں لیکن اسلامی دینیات کے ساتھ عربی لینا ضروری ہوتی ہے جس کا معیار اتنا بلند ہوتا ہے کہ جس طالب علم نے پہلے عربی نہیں پڑھی وہ محنت کر کے بھی یہ کورس نہیں چلا سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے مسلمان طلبا بائیبل نالج لے لیتے ہیں اور اسلامی تعلیم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں۔

ٹیچرز ٹریننگ کالجوں میں بھی یہی ہوتا ہے جو اسکنڈری اسکولوں میں ہوتا ہے۔ ان کالجوں کی تربیت سے یہ تمام اساتذہ عیسائیت کا پرچار پرائمری اسکولوں میں کرتے ہیں۔

سکنڈری اسکولوں اور ٹریننگ کالجوں میں بچوں کو داخل کرنے کا اختیار بڑی حد تک پرنسپل کو ہے اور کسی بھی سکنڈری اسکول یا ٹریننگ کالج کا کوئی بھی پرنسپل مسلمان نہیں ہے داخلے کے موقع پر وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مسلمان بچوں کو داخل نہ کیا جائے۔ اسکولوں میں تاریخ کی جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں وہ سب مخالفین اسلام کی لکھی ہوئی ہیں اور حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں انہیں بچے پڑھ کر لازمی طور پر اسلام سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ پرائمری، سکنڈری یا ٹیچرز ٹریننگ کالجوں کے مدارج سے گذرنے کے بعد بہت سے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں عیسائی مذہب اختیار کر لیتے ہیں اور جو بچ رہتے ہیں وہ اسلام کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ عیسائیت کو پھیلانے کا دوسرا ذریعہ اسپتال ہیں۔ جہاں مریضوں کو دوا کے ساتھ عیسائیت کی گولیاں بھی دی جاتی ہیں۔ ہر صبح کو مریض کو انجیل پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اور پھر اس کی تفسیر بیان کی جاتی ہے۔ اس طرح جہاں جسمانی شفا پاتا ہے وہاں بیمار روح لیکر اسپتال سے نکلتا ہے

ملک کے سارے اخبارات اور رسائل پر عیسائیوں کا قبضہ ہے اور کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب ان اخبارات اور رسائل میں اسلام کے خلاف زہر نہ اگلا جاتا ہو۔

مختلف زاویوں سے اسلام پر اعتراضات کیے جاتے ہیں اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے متنفر کر کے ان کو عیسائی بنایا جائے یا کم از کم ان میں احساس کمتری ضرور پیدا کر دیا جائے۔ اسکولوں، کالجوں، اسپتالوں، اخبارات و رسائل کی متفقہ جد و جہد کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمان بچے بوڑھے مرد عورتیں تیزی سے عیسائیت کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔ مغربی شمالی نائیجیریا میں جہاں ۲۰ سال پہلے ۷۰ فی صد مسلمان تھے اب صرف ۵۵ فی صد رہ گئے ہیں۔

تبدیلی مذہب کا یہ سلسلہ تیزی سے جاری ہے اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ سال کے عرصے میں اس ملک سے مسلمانوں کا نام

اسی طرح سے مٹ جائے گا جس طرح ہسپانیہ سے مٹ گیا

ایک مشنری ادارے کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کے بچوں کی عیسائی ہو جانے کی روزانہ اوسط گیارہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تبدیلی مذہب کی رفتار اگر یہی رہے تو بھی ہر سال ۱۵۔۱۴ مسلمان بچے عیسائی ہو جائیں گے لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ روزانہ اوسط بڑھتی جائیگی

بدقسمتی سے شمالی نائیجیریا کا اب کوئی خاندان ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے چند افراد عیسائی نہ ہو گئے ہوں۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں لیکن ماں عیسائی ہو یا باپ، بچے ہمیشہ عیسائی ہی ہوتے ہیں۔ مسلمان لڑکیاں، عیسائی لڑکوں سے شادی کرنا قابلِ فخر سمجھتی ہیں۔ مسلمان لڑکے چرچ جانا ترقی پسندی کی علامت سمجھتے ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ حضرات کو کون کہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔

بے حسی اور بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رسالوں اور اخباروں میں کھلم کھلا اعتراض کیے جاتے ہیں اور کوئی جواب دینے والا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے منہ پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے بڑے بڑے توہین آمیز جملے استعمال کیے جاتے ہیں لیکن مسلمان اف تک نہیں کرتے۔ "اسلامک ہسٹری" کورس سے نکال دی گئی لیکن کسی نے اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی۔ ابھی پچھلے دنوں ہی ایک جیلے ڈاکٹر آمنہ شیرین نے (جن کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ پاکستانی مسلمان ہے) اخباروں کو ایک بیان دیا اور کہا کہ اسلام نے سود اور شراب کو ممنوع قرار نہیں دیا ہے ــــ اور اس کے ساتھ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا۔ اخباروں نے اس کے بیان کو خوب اچھالا لیکن مسلمانوں کو ذرا بھی شرم نہ آئی۔

"نالج" (بچوں کا ایک ماہنامہ جو انگلینڈ سے نکلتا ہے) میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر چھپی اور آپ کی زندگی کے حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔

یہاں کے مسلمانوں نے وہ مضمون پڑھا اور ان کی رگ حمیت جوش میں نہ آئی۔ ہم چند مسلمانوں نے جو بسلسلۂ ملازمت یہاں مقیم ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی اس بے حسی کی وجوہات پر غور کیا۔ وجوہات تو بہت سی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ جس پر ہم سب کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام اب تک اس انداز سے پیش کیا جاتا رہا ہے کہ مطالعہ کرنے والا قرآن اور حدیث سے زندگی کے کوئی اصول اخذ نہیں کر سکتا اور اس کو رسموں کا ایسا مجموعہ سمجھتا ہے جو تیرہ سو برس پہلے کے مسائل تو حل کر سکتا تھا لیکن آج کے مسائل حل کرنے سے قاصر۔

قرآن کی تعلیم ناظرہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ قرآن کی تفسیر تو لکھنا بہت بڑا کام ہے۔ اسلام کے کسی پہلو پر مقامی زبان میں کوئی کتاب نہیں ہے۔ چند کتابیں عربی زبان میں ہیں جن کے سمجھنے والے ایک فی صدی سے بھی کم ہیں۔

اسلام کے بارے میں جتنی کتابیں ہیں سب کی سب مخالفِ اسلام کی ہیں۔ اسکولوں کی لائبریریاں اسلام دشمن لٹریچر سے بھری پڑی ہیں۔

اسلام کے خلاف مسلسل کتابیں پڑھتے پڑھتے کون شخص ہے جو اسلام کا دشمن نہ ہو جائے گا۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان نے ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھا ہے۔

ان حالات میں ہم چند مسلمان فرداً فرداً اسلام کی تعلیمات مسلمان بچوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ عیسائیوں کی چھ سو مشنریوں کا مقابلہ کرنا جو سالہا سال سے یہاں کام کر رہی ہیں اور ملک کے کونے کونے میں جن کا جال بچھا ہوا ہے چند مسلمانوں کے لیے بڑا مشکل کام ہے۔ مزید اس لیے کہ ہمارے غیر ملکی اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اس قسم کے کاموں پر پابندی بھی ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ ہمت نہیں ہارے ہیں اور ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں تک دین کی تعلیم پہنچائیں

	مسلم طلبہ	عیسائی مشنری اسکول	لوکل ایجوکیشن اتھارٹی کے یا سرکاری اسکول	اسلامیہ اسکول
سینیئر اور جونیئر پرائمری اسکول	۲۶۰۷	۱۱۲۹	۴۹۶	۱۲
سکنڈری اسکول	۷۷	۷۴	۳۰	×
ٹیچرز ٹریننگ کالج	۵۵	۲۸	۲۷	×

(ماخوذ)

(بقیہ صفحہ) ضروری نجات بھی نصیب ہو سکے گی۔ یہ نہایت اعلیٰ وارفع مقصد ہے اس کے حصول کے لیے غیر معمولی جد وجہد درکار ہے۔ جماعت اپنے محدود وسائل و ذرائع اور قلیل افرادی قوت سے تنہا یہ کام نہیں کر سکتی۔

ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ ہمارے متفق و معاون بن کر اس جد وجہد میں ہماری امداد کریں یا پھر انہی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو ہم سب کو بے حد عزیز ہیں اور جن پر ہماری دین و دنیا کی فلاح و کامرانی کا دار و مدار ہے۔ اپنے طور سے منظم ہو کر سعی و جہد کریں تاکہ ہمارا ملک موجودہ بحران سے نکلے اور ہم باشندگان ملک کو کامیابی و کامرانی نصیب ہو۔ وطن عزیز اور اس کے باشندوں کی یہی صحیح اور سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

رسالت کا انکار اور توحید کا اقرار؟

(جناب محمد ذکی رشعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ اس سلسلہ میں اہلِ اسلام کی طرف سے اگرچہ بے شمار دلیلیں دی جا چکی ہیں لیکن نہ ماننے والے ابھی تک مطمئن نہیں ہو سکے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ دلیلیں اتنی واضح نہیں کہ حق کا متلاشی مطمئن ہو سکے، یا سمجھنے والوں کی فہم کا قصور ہے، یا جس قسم کی دلیلیں یہ لوگ چاہتے ہیں وہ ابھی تک نہیں دی گئیں یا ان کے علاوہ کوئی اور سبب ہے؟ اگر وہ بنیادی سبب معلوم ہو جائے تو ممکن ہے اس موضوع سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

جو لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل نہیں ان میں تین قسم کے لوگ شامل ہیں۔

(۱) وہ جو توحید و رسالت دونوں کے منکر ہیں۔ مثلاً وہ مادہ پرست اور سائنس داں جو کہتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق و فرمانروا نہیں، بلکہ یہ خود بخود وجود میں آگئی اور یونہی چل رہی ہے۔

(۲) وہ جو توحید کے تو بظاہر قائل ہیں لیکن رسالت کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے، مثلاً اہل اسلام، یہود اور نصارٰی کے علاوہ بہت سے قائلین خدا۔ اور

(۳) وہ لوگ جو توحید و رسالت دونوں کے قائل نظر آتے ہیں، بہت سے رسولوں کو مانتے بھی ہیں لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے مثلاً یہود و نصارٰی۔

ان میں سے پہلے گروہ کا موقف بالکل واضح ہے کیونکہ یہ سرے سے خدا ہی کا قائل نہیں اس لئے ان کے نزدیک رسالت کی دلیلیں قطعاً قابل توجہ نہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خدا کا وجود اور اسکا ہونا ثابت کیا جائے پھر رسالت کی ضرورت اور اہمیت وضاحت کی جائے یا ایسی دلیل دی جائے جس سے

توحید و رسالت دونوں کو ثابت کیا جا سکے۔

دوسرا گروہ چونکہ (بظاہر) توحید کا قائل ہے لہٰذا اس کے سامنے رسالت کی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔

رہا تیسرا گروہ جو توحید و رسالت دونوں کو ماننے کا مدعی ہے تو اس کے سامنے صرف ان دلائل کو پیش کرنے کی ضرورت ہے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہو۔ یعنی یہ دکھایا جائے کہ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے تمام انبیائے کرام کی طرح منصب رسالت پر فائز کئے گئے ہیں۔ جس طرح اور رسولوں کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ پیغامات دیئے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی، عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل کی اسی طرح آپ پر قرآن نازل کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ تینوں گروہ عقیدۂ توحید پر تو متفق نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے انکار پر سب متفق ہیں۔ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان کہ خالق کائنات نے آپ کو اپنا رسول بنایا اور قرآن نازل کیا ہے غلط ہے اور یہ کہ قرآن کلام الٰہی نہیں بلکہ آپ ہی کی تصنیف کردہ کتاب ہے۔

دراصل یہ بہت سنگین قسم کا الزام ہے جو اگر ثابت ہو جائے تو اسلام کی ساری عمارت درہم برہم ہو جائے اس لئے اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قرآن عزیز نے بھی اس الزام کو نقل کیا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ۖ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ﴿٤﴾ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٥﴾

(الفرقان ۔ ع ۱)

جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرمان (یعنی قرآن) ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان رسالت جیسا کہ ان لوگوں کا خیال تھا، غلط تھا، تو کیا خدا کو اس کا علم نہیں ہوا ہوگا؟ یقیناً اسی لمحہ ہو گیا ہوگا، تو پھر اس نے کیا کیا؟ آپ مسلسل تیئیس سال تک اس دعوے کو دہراتے رہے، اس طویل مدت میں اللہ تعالیٰ آپ کے دعوے کی تصدیق کرتا رہا یا تردید؟ اس بات کا

فیصلہ کرنے کے لئے کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں، تاریخ موجود ہے۔ ہمدردانہ اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کی بھی شرط نہیں، پوری مخالفت تعصب اور انتہائی جانبداری کے ساتھ بھی اور چن چن کر تاریخی واقعات کی روشنی میں بآسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعلانِ رسالت کی تردید کی؟ دنیا کے کسی گوشہ میں کسی بھی فرد کے پاس خدا کی طرف سے یہ فرمان پہونچا کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط دعویٰ کیا ہے اور خدا نے آپ کو اپنا رسول نہیں بنایا؟ کیا کوئی انسان اس بات کو مان سکتا ہے کہ کوئی شخص خدا کا نام لے کر سینکڑوں احکامات نافذ کرتا ہے اور خدا کی طرف سے کوئی ایکشن نہ لیا جائے؟

دنیا کی حکومتیں بھی باخبر رہتی ہیں اور اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتیں کہ کوئی شخص ان کے نام سے ان کی اجازت کے بغیر فرامین جاری کرتا رہے اور وہ خاموش رہیں۔ ایک بار نہیں ایک ہزار بار اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے کوئی شخص یہ غلط دعویٰ تو کرکے دیکھے کہ مجھے حکومت نے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے اور یہ یہ احکامات جاری کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پھر دیکھئے چند ہی منٹ میں حکومت کی طرف سے اسکی تردید کردی جائے گی اور ہدایت کردی جائے گی کہ اس دھوکے باز سے لوگ ہوشیار رہیں اور پھر ایسے مفتری کو سخت سزا دی جائے گی۔

ہمیں یقین ہے اور پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے نہ آپ کی حیات میں اور نہ بعثت کے بعد سے آج تک کہیں اور کسی شخص کے پاس خدائی حکم آیا جسمیں آپ کی رسالت کی تردید کی گئی ہو۔ اگر اس کائنات میں کسی بھی مخلوق کے پاس خدا کا ایسا فرمان موجود ہے تو وہ دنیا کے سامنے آج تک پیش کیوں نہیں کیا گیا، یا اب پیش کرکے دکھادے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قیامت تک کوئی مخلوق بھی ایسا فرمان پیش نہیں کرسکتی۔

ہاں ایسے فرامین موجود ہیں جن میں منکرین رسالت کے خیال کی تردید کی گئی ہے اور بار بار پرزور الفاظ میں جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کی گئی ہے قرآن عزیز کی بیشمار آیات ایسی ہیں جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی گئی اور مکذبین کو متنبہ کیا گیا ہے۔ اسی آیت میں جسمیں منکرین کا الزام نقل کیا گیا ہے، سختی کے ساتھ اس الزام کی تردید کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

"بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں"

یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کررہے ہیں وہ صریحاً ظلم سے کام لے رہے ہیں۔ غلط بیانی کررہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جناب محمد مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔ سورۂ یٰسین میں ارشاد ہے:۔

"قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔"

کہا جا سکتا ہے (اور کہا جائیگا) کہ یہ بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کہہ دی خدا نے نہیں کہی۔ تو پھر کہنے والا اپنے دعوے کے ثبوت میں خدا کا کوئی حکم یا کوئی آیت پیش کرے، اور اگر پیش نہیں کر سکتا (اور یقیناً نہیں کر سکیگا) تو صاف صاف اعلان کر دے کہ خدا کو اس کا علم ہی نہیں ہوا، یا وہ آپ کے دعوے کی تردید نہیں کر سکا۔ کیا کوئی اتنا جری ہے جو خدا کے بارے میں ایسا کہہ سکے؟ اس کے علاوہ ایک صورت اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ خدا ہی کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہوگی کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے "فلاں" حکومت نے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے اور سب لوگوں کو حکم دیا ہے کہ میری اطاعت کریں ورنہ سخت سزا ملیگی۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ "فلاں" حکومت کونسی ہے، اسکا نام کیا ہے؟ اس پر وہ شخص یہی کہتا رہتا ہے کہ وہ "فلاں" حکومت ہے ظاہر ہے یہ کسی ملک کا نام ہے نہ کسی فرمانروا کا کسی صدر کا نام ہے نہ وزیر اعظم کا یہ تو بالکل ایک فرضی نام ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اب اگر وہ مدعی ہزار احکام بھی اسی فرضی حکومت "فلاں" کے نام سے جاری کرتا رہتا ہے اور مدتوں خود کو اس کا نمائندہ بتاتا رہتا ہے تو ظاہر ہے اس کے دعوے کی تردید ہی نہیں ہو سکتی۔ نہ "فلاں" نام کی کوئی حکومت ہے، نہ اسے خبر ہوگی نہ وہ تردید کرے گی۔

کیا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود کو کسی ایسی ہی موہوم و مبہم ہستی کا رسول بتایا تھا؟ آپ نے خود کو جس ہستی کا رسول بتایا اسکی یہ صفات بیان فرمائی گئی ہیں ارشاد ہے:

"ہم نے یہ قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے۔ نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمان کو۔ وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے مالک ہے سب ان چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین اور آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔ تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ مخفی بات بھی جانتا ہے۔ وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں اس کے لئے بہترین نام ہیں۔" (طٰہٰ)

سورہ الشعراء (ع ۱۱) میں ارشاد خداوندی ہے:۔

"یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف

سے خلق خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں صاف صاف عربی زبان میں اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے "

سورہ ہود میں آپ سے کہلوایا گیا ہے کہ یہ قرآن:۔

"فرمان ہے، جسکی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے، کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی میں اسکی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اسکی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدتِ خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے "

سورہ المومنین میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے۔ سب کچھ جاننے والا ہے گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔ (۱۔۵)

نیز فرمایا کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے، سارے عالم کا پروردگار ہے، عزیز و حکیم ہے، ہر شے کی حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے، جو ہر چیز کا خالق اور ہر شے پر قادر ہے (اسی نے رسول بنایا ہے)

فرمایا:۔

"یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے " (الاحقاف)

" اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا اس کے سوا نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے والا، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس

تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جسکی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔ وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔۔۔۔۔۔۔" (السجدہ)

"نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی جس نے تہ برتہ سات آسمان بنائے۔۔۔۔" (الملک)

"اللہ وہ زندہ جاوید ہستی، جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے)۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے۔ زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے۔ اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ وہی خدا ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔" (آل عمران)

"اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست دانا ہے زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، وہی اوّل بھی اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اس کی طرف رجوع کئے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل

کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔" (الحدید)

اس بات کا انکشاف آپ نے چند لوگوں کے سامنے نہیں کیا، ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں اور مختلف ممالک کے بادشاہوں کے نام فرامین میں علانیہ اظہار فرمایا کہ آپ کو اس کائنات کے خالق نے اپنا رسول بنایا ہے، جو سارے عالم کا مالک پروردگار اور حاکم ہے، جو زندگی اور موت دیتا ہے، خود زندہ جاوید ہے، جس کے علم میں ہر شے ہے مخفی ہو یا ظاہر، جو ہر کام کا فیصلہ کرنے والا ہے، جو مجرموں کو سزا دینے والا، توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا، بے انتہا بخشش کرنے والا قادر مطلق معبود ہے۔

اس اعلان کو تقریباً چودہ سو سال ہو گئے، اس وقت سے اب تک شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرا ہو جس میں یہی بات لاکھوں اور کروڑوں میں دہرائی نہ گئی ہو، کائنات میں برابر یہ صدا گونج رہی ہے۔ کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس ذات کی طرف سے جس کی صفات اوپر بیان ہوئیں کوئی تردیدی حکم نازل ہوا؟

اس کے برخلاف قرآن کا ہر صفحہ، احادیث کا ہر ورق، وقت کا ہر لمحہ سلسلۂ واقعات کی ہر کڑی شاہد ہے، موافقین و مخالفین سب کی متفقہ شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی، دشمنوں کے مقابلہ پر آپ کی مدد فرمائی، آپ کو عظیم اور شاندار کامیابیوں سے نوازا، اور جنہوں نے آپ کی رسالت کا انکار کیا تھا ان کو عبرت ناک سزائیں ملیں، یا پھر انھوں نے حقیقت کو پہچان کر آپ کو خدا کا سچا رسول تسلیم کر لیا۔

کیا کوئی اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ آپ نے ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ اور دوسرے سرداران قریش کو، فراعنۂ وقت اور فرمانروان عجم کو ان الفاظ میں خبردار نہیں کیا تھا:

"تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو کہ جب) فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔" (المزمل)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی بہت سے انبیاء آئے انھوں نے بھی وہی بات کہی جو آپ نے پیش کی، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، شعیب، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی قوموں نے تکذیب کی راہ اختیار کی، تاریخ میں ان کا عبرت ناک انجام محفوظ ہے۔ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوا:

"کیا تمہارے کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں؟

یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں، اپنا بچاؤ کرلیں گے؟ عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائیگا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے ......"! (القمر)

اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ مخالفین نے شکست کھائی اور آپ کامیاب ہوگئے۔ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ السلام نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ کے ساتھ صرف ایک جاں نثار حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے مکہ کے لوگ آپ کی تلاش میں تھے اور جو کچھ کرنا چاہتے تھے، دنیا جانتی ہے۔

اس کے بعد میدان بدر میں مکہ کے لوگ بڑی تعداد میں آپ کے مقابلہ پر آگئے اس وقت آپ کے جاں نثاروں کی تعداد تقریباً تین سو تیرہ تھی، اُحد کے میدان میں یہ تعداد سات سو ہوئی، حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو، فتح مکہ کے دن دس ہزار تک پہنچ گئی، جنگ حنین میں آپ کے ساتھ بارہ ہزار جانباز تھے، تبوک کے موقع پر تیس ہزار اور حج الوداع کے دن ایک لاکھ[1]۔

دس سال کے عرصہ میں یہ سب کچھ کس طرح ہوگیا۔ اگر خالق کائنات نے یہ منظر نہیں دکھایا تو کوئی بتائے کہ کس نے یہ سب کچھ دکھایا، کیا انسان کی قدرت میں یہ سب کچھ ہے اور کیا خدا کی مرضی کے خلاف کوئی شخص اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے؟

[1] دیکھئے تاریخ طبری اور سیرۃ النبیؐ (شبلی)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر بڑا فاتح خدا کا رسول ہوا ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی نامور ہستیاں گذری ہیں جنہوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں مگر یہ کہہ کر نہیں کہ خدا نے ہمیں منصب رسالت پر فائز کیا ہے، یہ سب کچھ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے، ہماری مرضی اور طاقت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی تمام کوششوں کو اپنی ہی طرف منسوب کیا اور اپنی کامیابیوں کو اپنی حکمت عملی اور ذاتی خوبیوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

ان باتوں سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ اگر یہ کائنات مخلوق ہے اس کا کوئی خالق و فرماں روا ہے جو مخلوقات کے ہر حال سے واقف ہے، قادر مطلق ہے، جو فرماں برداروں پر انعامات کی بارش کرتا ہے، گنہ گاروں، مجرموں اور باغیوں کو سزا دینے پر قادر ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے نام سے قرآن جیسی کتاب پیش کی گئی ہو اور وہ خاموش رہا ہو اور اب تک اس کی طرف سے ایک بھی تردیدی نوٹ نہ آیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اتنے بڑے الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایک جامع آیت نازل فرما دی یعنی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الفرقان)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو کہ "اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔"

مطلب یہ کہ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان رسالت اور مخاطبین کا انکار سب اللہ کو معلوم ہے بھلا اس کے علم میں کس طرح نہ ہو جبکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی نظر میں ہے ظاہر و پوشیدہ سب کا یکساں علم رکھتا ہے۔ رسالت کے سلسلہ میں جو اختلاف رونما ہوا ہے اس کا فیصلہ بھی وہی کریگا اور دنیا دیکھ لے گی کہ کون اپنے دعوے میں سچا اور کون جھوٹا ہے اس کے لئے فرمایا کچھ دیر انتظار کرو حقیقت سامنے آجائے گی۔ اس کی تائید وقت نے کی اور کس کی تردید۔ مندرجہ ذیل آیات اسی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہیں:۔

"پس اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اس وقت دیکھتا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

(الشعراء ع ۱۱)

"ان لوگوں سے کہہ دو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کھلی گمراہی میں کون مبتلا ہے۔" (القصص ع ۹)

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو، ہر ایک انجام کار کے انتظار میں ہے پس اب منتظر رہو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔"

(طٰہٰ ع ۸)

"اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لئے ہے عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔" (النمل ع ۷)

"اے نبی ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہوگا جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو۔

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔ آگاہ رہو یہ لوگ اپنے رب کی

ملاقات میں شک رکھتے ہیں سن رکھو وہ ہر چیز محیط ہے۔"

کہو میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو (یعنی فیصلہ کن عذاب آنا) فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہو اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیئے اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے" (الانعام ع ۷)

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہدو کہ لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے، اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لئے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے۔ اور میں تمہارے اوپر حوالہ دار نہیں ہوں۔ اور اے نبی تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے۔ اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے" (یونس ع ۱۱)

"یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے مگر جب خبردار کرنے والا ان کے پاس آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں زیادہ استکبار کرنے لگے اور بری بری چالیں چلنے لگے حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت

ڈرتے تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر کہیں وہ لوگوں کو ان کے کئے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا۔ مگر وہ انہیں ایک مقرر وقت تک کے لئے مہلت دے رہا ہے پھر جب ان کا وقت پورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا۔" (فاطر، ع ۵)

یہی وجہ ہے کہ انکار کرنے والوں کو فوراً ہی سزا نہیں دی گئی، بلکہ مہلت دی گئی، جنہوں نے اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ عذاب کی لپیٹ میں آگئے۔ اور جنہوں نے حق کے سامنے سر جھکا دیا وہ بچ گئے۔

پس اگر کوئی شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے یعنی یہ مانتا ہے ہ اس کائنات کا خالق، مالک، فرمانروا، سمیع، بصیر، علیم، اور دیر ہے اور اس کی وہی صفات ہیں جو قرآن میں جا بجا یان کی گئی ہیں تو وہ یہی نتیجہ نکالے گا کہ جناب محمد مصطفیٰ لی اللہ علیہ وسلم اسی کے رسول ہیں کیونکہ اللہ نے آپ ی ہر بات کو سچا کر دکھایا، اور انکار کرنے والوں کی غلطی اضح کر دی۔ یا یوں کہئے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ پ کو اس کا رسول بھی تسلیم کرتا ہے اور جو آپ کو اللہ ا رسول نہیں مانتا وہ اللہ پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔

اس کو یوں سمجھئے کہ یہاں ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے حکومت امریکہ نے اپنا سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ بات وہ علی الاعلان کہتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر، ہر جلسہ عام میں اسے دہراتا ہے۔ اس کا دعویٰ اخباروں میں شائع ہوتا ہے، ساری دنیا میں اس کی شہرت ہو جاتی ہے لیکن بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود حکومت امریکہ کی طرف سے اس کے دعوے کی تردید نہیں ہوتی، وہ ہزاروں احکامات حکومت امریکہ کے نام سے نافذ کرتا ہے لیکن حکومت امریکہ اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرتی بلکہ اس کی ہر طرح حفاظت کرتی ہے، اس کی تائید کرتی ہے اور وہ شخص پورے وقار کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے۔ اور بالآخر اس کے اکثر مخالفین یہ تسلیم کر ہی لیتے ہیں کہ یہ حکومت امریکہ ہی کا نمائندہ ہے۔

اس پر بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میں حکومت امریکہ کو تو تسلیم کرتا ہوں لیکن اس سفیر کو نہیں مانتا تو کیا اس کی کوئی معقول وجہ بھی بیان کر سکتا ہے؟ سننے والا یہی کہے گا کہ یہ حکومت امریکہ ہی کو نہیں مانتا یا پھر وہ حکومت امریکہ سے مراد کسی ایسے خطہ ارض کی حکومت لے رہا ہے جو کسی نامعلوم سمندر کے ایک جزیرہ پر مشتمل ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حکومت امریکہ کا اسکا کچھ اور ہی تصور ہے اور یہ کہ واقعی وہ سفیر اس امریکہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو اسکے ذہن میں ہے۔

اب جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل آپ کو اس خدا کا رسول نہیں

مانتے جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں جس کی صفات وہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کی بیان کی گئی ہیں۔ ورنہ اگر وہ اس خدا پر ایمان رکھتے جس کی صفات قرآن میں بیان کی گئی ہیں تو وہ ہرگز آپ کی رسالت کا انکار نہ کرتے۔ چنانچہ سورہ الفرقان میں جہاں یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے وہاں پہلے ہی اس کی وضاحت کر دی گئی ہے:۔

نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان (یعنی قرآن) اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہاں والوں کے لئے نذیر ہو۔ وہ جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لئے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو خود اپنے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے۔ اگر خدا سے مراد ایسا خدا ہے جو زمین و آسمان کی بادشاہی میں کوئی دخل نہیں رکھتا تو اس نے واقعی نہ قرآن نازل کیا نہ حضرت محمد مصطفیٰ کو اپنا رسول بنایا۔ اگر خدا سے مراد وہ خدا ہے جس نے کسی کو بیٹا بنا لیا، تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خدا کے رسول نہیں، اگر خدا سے مراد وہ خدا ہے جس کی بادشاہی میں اس کی مخلوق یا برابر کا کوئی اور بھی شریک ہے، اور سلطنت عام کے کسی ایک ہی شعبہ کا انچارج ہے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس خدا کے رسول نہیں۔ اگر خدا سے مراد وہ خدا ہے جس نے کائنات پیدا نہیں کی تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول نہیں، اور اگر خدا سے مراد وہ خدا ہے جو مخلوقات سے بے خبر ہے، ان کی پرورش اور نگہداشت اور ان کے خواص سے بے خبر ہے تو بلاشبہ آپ اس کے بھی رسول نہیں، نہ ہی آپ نے کبھی ایسے کسی خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا۔ جو لوگ کسی ایسے خدا پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ "ان کے" خدا نے نہ قرآن نازل کیا نہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنایا، اور وہ اپنے دعوے میں واقعی سچے ہونگے، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل نہیں کیا، یا اس نے آپ کو منصب رسالت پر فائز نہیں کیا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے مگر توحید کا اقرار کرتے ہیں یعنی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

نیز یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہیں وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے کس دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو لازماً آپ کی رسالت کو مانے

ہی گا، یہی وجہ ہے کہ جنہوں نے اللہ کا انکار کیا انھوں نے پھر کسی طرح آپ کی رسالت کو نہیں مانا، اور ہر دلیل کو رد کر دیا، ایسا نہیں کہ آپ کی رسالت کے ثبوت میں دلائل کی کمی ہے یا وہ واضح نہیں بلکہ بنیادی وجہ یہ ہے کہ منکرین رسالت اللہ ہی کو نہیں مانتے جو رسالت کو تسلیم کریں[1]۔

جس طرح یہ غلط فہمی عام ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر از کم توحید کے تو قائل ہیں، اسی طرح بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ توحید اور آپ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ختم رسالت کا انکار بھی ممکن ہے[2]۔

یہ در اصل چوتھا گروہ ہے جو بظاہر توحید کا بھی قائل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی اقرار کرتا ہے مگر کہتا ہے کہ آپ آخری رسول نہیں، آپ کے بعد بھی رسول آسکتے ہیں اور آ گئے ہیں۔

اس گروہ اور دوسرے منکرین رسالت کے درمیان ایک اہم فرق ہے، وہ یہ کہ اس کے سامنے توحید کے دلائل بیان کرنے کی ضرورت ہے نہ آپ کی رسالت کو ثابت کرنے کی، یہ لوگ قرآن کو کلام الٰہی بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس آیت پر بھی ایمان رکھتے ہیں:-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (الاحزاب ع ۵)

(لوگو) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

---

[1] بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا رسول تسلیم نہیں کرتے وہ بہرحال توحید کے قائل ہیں اور یہ کہ اسلام کے علاوہ دنیا کے بیشتر مذہب توحید کے قائل ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکار رسالت اور اقرار توحید کو یکجا کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

[2] اس سلسلہ میں ایک بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب متفقہ طور پر قانون ساز اسمبلی ایک قانون یا دستور پاس کر رہی ہے جس میں حقوق کی تفصیل، حدود اور جرائم کی تشریح ہوتی ہے تو اس کی کاپیاں شائع ہو جاتی ہیں ایک عرصہ بعد اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے لگے کہ چوری ڈکیتی کوئی جرم نہیں، غداری اور بغاوت ہر شہری کر سکتا ہے، نیز جو جس کا جی چاہے کرے کوئی جرم نہیں تو پھر قانون ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوگا جس میں ایسے شخص کی تردید کی جائے، حکومت کے عملہ کا معمولی فرد ایسے اشخاص کو جواب دینے کے لیے کافی سمجھا جائیگا یعنی تعزیرات یا دستور کی رو سے کوئی بھی سپاہی اس کو سمجھا دیگا کہ یہ قانون شکنی ہے، صریح جرم ہے۔ جب دین مکمل ہو گیا ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا تو اسی کی رو سے نبوت کا ہر مدعی ہمیشہ کے لئے جھوٹا قرار دیا جا چکا، اب براہ راست خدا کی طرف سے تردیدی اعلان کی ضرورت نہیں رہی۔

یہاں آپ کی رسالت کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا کیونکہ آپ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگا دی گئی اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ خاتم کے لغوی معنیٰ مہر لگانے اور ختم کر دینے کے ہیں۔

لفظ ختم کے کوئی معنی بھی لئے جائیں اسمیں یہی ایک مفہوم شامل رہے گا جن کی نبوت پر آپ نے مہر تصدیق ثبت فرما دی ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا، قرآن اور احادیث میں ان انبیاء کی فہرست موجود ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے انبیاء گذرے ہیں جن کا علم اللہ ہی کو ہے۔ اب اگر کوئی نام اور بھی پیش کیا جاتا ہے تو دیکھنا ہوگا کہ آپ کی مہر تصدیق ثبت ہے یا نہیں، یعنی آپ نے نام لے کر فرمایا ہے کہ یہ نبی ہے، اگر ایسا نہیں تو بلا مہر ہم کیا کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر آپ کے بعد کسی شخص کو اس فہرست میں شامل کیا جاتا ہے تو بھی ہمیں یہی دیکھنا ہوگا کہ آپ نے تصدیق فرمائی ہے یا نہیں۔ مثلاً نام لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں متعدد احادیث میں فرمایا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر قرآن میں کسی آنے والے نبی کا نام درج کر دیا گیا ہے یا احادیث میں اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی ہے تو ہمیں اس نبی یا رسول پر ایمان لانا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے کیا کیجئے کہ نہ قرآن میں اس کا ذکر ہے نہ احادیث کے ذخیرہ میں۔ بلکہ اس کے برعکس بیشمار تصریحات موجود ہیں۔

مہر لگانے سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ وہ مہر جو کسی لفافہ یا پیکٹ پر بند کرنے کے بعد لگائی جاتی ہے یعنی سیل (SEAL) تو بھی لغوی اعتبار سے بالکل درست ہوگا۔ اس صورت میں مطلب یہی ہوگا کہ جن حضرات کو نبوت ملنی تھی مل چکی، فہرست مکمل ہو چکی اور اب اس پر سیل (مہر) لگا دی گئی، اس سے نہ صرف خاتمہ کا اعلان ہو گیا تحفظ بھی ہو گیا اب نہ کسی نام کا اضافہ ممکن ہے نہ کمی۔ جو نام درج کر دیئے گئے ان کا انکار ممکن ہے نہ کوئی نام مزید داخل کیا جا سکتا ہے۔

اس کو یوں سمجھئے ہم کسی لفافہ یا پیکٹ میں کچھ کاغذات یا اشیاء رکھتے ہیں، جب ہمیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب اس میں اور کوئی چیز نہ رکھنی ہے نہ نکالنی تو بند کر کے اس پر مہر لگا دیتے ہیں۔ مہر اس بات کی ضمانت رہتی ہے کہ اندر کی چیزیں محفوظ ہیں، ان میں سے کوئی چیز نکالی گئی ہے نہ اسمیں اضافہ کیا گیا ہے، اگر مہر نہ ہو تو پھر اندر کی چیزوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، یا اگر سیل ٹوٹی ہوئی ملی تو بھی گمان یہی کیا جائے گا کہ کسی نے لفافہ یا پیکٹ کو کھول کر اسمیں کچھ رکھا ہے یا اسمیں سے کوئی چیز نکال لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیمتی یا CONZIDENTIAL چیزیں اسی طرح ارسال کی جاتی ہیں کہ ان پر مہر SEAL لگا دی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ انبیائے کرام کی فہرست مکمل ہو جانے کے بعد آپ کی آمد سے سیل لگا دی گئی کیونکہ اس کے بغیر اطمینان ممکن ہی نہ تھا۔ اب اگر کوئی اضافہ کا مدعی ہے تو اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہیں اور پھر یہ بھی بتانا

پڑے گا کہ فلاں رسول یا نبی خاتم النبیّین ہے۔ اب اگر کوئی یہ کام کر سکتا ہے تو کر کے دکھائے۔

اضافہ یا کمی اس صورت میں بھی ممکن ہے کہ ہمیں بعد میں خیال آئے کہ کچھ ضروری کاغذات رکھنے سے رہ گئے یا کوئی زائد چیز لفافہ میں رکھ کر مہر لگا دی۔ اس کا مطلب یہ ہوا مہر قبل از وقت لگ گئی یا غلط لگی۔ چنانچہ ہم مہر توڑتے ہیں پھر اضافہ یا کمی کے بعد مہر لگا دیتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہی خیال ممکن ہے کہ (العیاذ باللہ) اس نے قبل از وقت مہر لگا دی اور بعد میں خیال آیا کہ ابھی کچھ اور نام بھی رہ گئے؟ اس کی تردید ان الفاظ میں فرما دی گئی ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

اسے تو ہر چیز کا علم ہے، نہ اسکے دائرہ علم سے کوئی چیز باہر ہو سکتی ہے پھر اسے مہر لگانے کے بعد اضافہ کی صورت ہو، یہ بھلا کس طرح ممکن ہے؟

ہاں اگر کوئی ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو بھول جاتا ہے، غلطی کر سکتا ہے تو بلا شبہ اس خدا نے نہ قرآن نازل کیا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنایا۔

یہاں یہ نکتہ بھی نظر میں رہے کہ جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تعارف "رسول اللہ" اور "خاتم النبیّین" کی حیثیت سے کرایا گیا ہے، دونوں صفات ایک ہی آیت میں متصلاً بیان کی گئی ہیں۔ آپ سے پہلے بہت سے رسول اور نبی گزر چکے ہیں لیکن آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ کے رسول ہونے کے ساتھ ساتھ خاتم النبیّین بھی ہیں، جو ایک صفت کا انکار کرتا ہے وہ دونوں انکار کر دیتا ہے، اور جو کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ اللہ کا انکار کرتا ہے۔

یہ سوال بھی اپنی جگہ ہے کہ سلسلۂ نبوت کو آخر کسی پر تو ختم ہونا چاہیئے، کوئی تو آخری رسول ہوگا اگر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نہیں تو پھر کس کی ہے ہے کوئی جو اس کا جواب دے سکے؟ اس کے لئے خاتم کے بجائے کونسا لفظ استعمال ہوگا؟

"خاتم النبیّین" کی تشریح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کی ہے؟ اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں ہم صرف بخاری کی ایک مشہور حدیث نقل کرتے ہیں:۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسن و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پہ اظہار حیرت کرتے تھے مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیّین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے

جسے پُر کرنے کے لئے کوئی آئے" (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۴۹)

عمارت مکمل ہو چکی، آخری اینٹ بھی لگا دی گئی، اب کسی اینٹ کی گنجائش یا ضرورت بھی باقی نہیں اب اگر کوئی اینٹ کا بھی اضافہ کرنا چاہے تو عمارت میں تو گنجائش ہے نہیں ادھر ادھر کہیں ڈال دے گا اس طرح وہ خود بھی ناموزوں رہے گی اور عمارت کے حسن کو بھی بگاڑ دے گی، ہاں کسی مناسب جگہ لگانے کے لئے اس مقام کی اینٹ ہٹانی پڑے گی۔ یعنی کسی نبی کے انکار کی اور عملاً یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی نبی کا انکار کر کے اس کی جگہ کسی اور نبی کو تسلیم کر لیا جائے نیز یہ ایک جرم بھی ہے یعنی عمارت کو نقصان پہنچانے کی کوشش۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی جدید نبی پر ایمان لانا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دیا جائے اور یہ توحید کے انکار کے مترادف ہوگا، بالفاظ دیگر ختم رسالت کا انکار اللہ کا انکار ہے۔

حاصل کلام یہ کہ (۱) جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ لازماً جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بھی تسلیم کرے گا، (۲) جو آپ کی رسالت کا منکر ہے وہ درحقیقت اللہ پر بھی ایمان نہیں رکھتا اور (۳) جو آپ کو آخری رسول اور خاتم النبیین تسلیم نہیں کرتا وہ دراصل آپکی رسالت اور اللہ تعالیٰ کا منکر ہے۔

طلاق، بندوق کی گولی نہیں ہے

سید احمد قادری

ماہنامہ زندگی کے طلاق نمبر (جنوری و فروری کا مشترکہ شمارہ) میں میرے دو مقالے شایع ہوئے تھے۔ ایک وہ جو احمد آباد کے سمینار میں پڑھا گیا اور دوسرا مقالہ مسلم شریف کی ایک حدیث پر تھا۔ مولانا عامر عثمانی صاحب نے تجلی کے طلاق نمبر میں میرے ان دونوں مقالوں پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں ایک خط ان کے نام تجلی میں اشاعت کے لئے بھیجا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط زندگی میں بھی شایع کیا جائے ذیل میں اسی خط کی نقل شایع کی جا رہی ہے۔

مکرمی و محترمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بیک مجلس یا بیک کلمہ تین طلاقوں کے مسئلہ پر رام پور میں آپ نے جو گفتگو کی تھی میں برابر اس پر غور کرتا رہا اور اب طلاق نمبر کے مطالعہ کے بعد بھی اس پر غور کیا۔ آپ نے میرے دونوں مقالوں پر جو کچھ لکھا ہے اس کو بغور پڑھنے کے بعد بھی مجھے اپنے موقف میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ میں اس خط میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اس پر آپ غور فرمائیں:

(۱) سیمینار والے مقالے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی دو باتوں پر آپ نے اعتراض کیا ہے۔ ایک یہ کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ احادیث نبوی اور آثار صحابہ نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں، تین ہی ہوتی ہیں تو پھر کس بنیاد پر میں یہ بھی کہتا ہوں کہ:

"اگر طلاق دینے والے نے اس خیال کے تحت تین کی صراحت کے ساتھ طلاق دی ہے کہ اس کے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جانا چاہیے۔"

اس پر آپ نے جو اعتراض کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قانون سے ناواقفیت دین و دنیا کے کسی قانون میں عذر معتبر نہیں اور اگر اس طرح کی مفروضہ جہالت جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے تسلیم کر لی جائے تو لوگوں کا جہل کسی فعل کی تاثیر میں آخر رکاوٹ کیسے بن سکتا ہے؟ اسی بات کو سمجھانے کے لئے آپ نے مثال دی ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے سے بھری ہوئی بندوق داغ دے اور گولی کسی انسان کے سینے میں لگ جائے تو وہ زخمی ہو ہی جائے گا بھولے سے داغی ہوئی گولی بے اثر نہیں رہے گی۔

میں پہلے یہ یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ احادیث نبویؐ اور آثار صحابہ کے حوالہ سے میں نے جو بات لکھی ہے اس کا تعلق علم و فہم کے ساتھ طلاق دینے سے ہے۔ میں نے مقالے کے اخیر میں صراحت کے ساتھ یہ لکھا ہے:

"میں اوپر کے مقالے میں واضح کر چکا کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے تو تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں"۔ (زندگی طلاق نمبر ص ۲۰)

میں نے مزید صراحت ان الفاظ میں کی ہے:

"جو لوگ یہ جان کر اور سمجھ کر کہ بیک دفعہ و بیک کلمہ تین طلاقیں دے ڈالنے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، تین طلاقیں دے ڈالیں۔ ایسے لوگوں کی دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص تین طلاقیں دینے کی نیت سے، میں نے طلاق دی، میں نے طلاق دی، میں نے طلاق دی، کہے تو یہ تین طلاقیں ہوں گی، ان کو ایک قرار دینا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے" (ایضاً ص ۲۰)

ان صراحتوں سے معلوم ہوا کہ میری وہ دونوں عبارتیں جنہیں آپ نے اپنے تبصرے میں نقل کیا ہے دو صورتوں سے متعلق ہیں اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اس یاد دہانی کے بعد اب میں آپ کے اعتراض کے سلسلے میں عرض کرتا ہوں۔

میں نے احادیث اور فقہ کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ طلاق، بندوق کی گولی نہیں ہے بیک دفعہ تین طلاقیں دینے والے "جاہل مطلق" کی طلاقوں کو بندوق کی گولی سے تشبیہ دے کر معارضہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ بندوق کی گولی کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی پاگل بھی کسی شخص کے سینے پر تین گولیاں داغ دے تو تینوں اس کے سینے میں پیوست ہو جائیں گی لیکن اگر وہ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالے تو ایک بھی واقع نہیں ہوگی اور اس پاگل کے الفاظِ طلاق ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔

دوسری مثال: زید سویا ہوا ہے اور بھری ہوئی بندوق اس کے بغل میں رکھی ہوئی ہے، نیند میں اس کا ہاتھ لبلبی پر پڑ جاتا ہے، گولی نکلتی ہے اور اس کی بیوی کو زخمی کر دیتی ہے اور یہی زید نیند میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالتا ہے، کیا یہ تین طلاقیں اس کی بیوی پر واقع ہو جائیں

گی، نہیں ایک طلاق بھی نہیں پڑے گی۔

تیسری مثال : زید نے ناواقفیت میں گنے کا ایسا رس پی لیا جس میں نشہ پیدا ہو گیا تھا اور اس نشے میں اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

چوتھی مثال : زید نے جان بوجھ کر شراب پی لیکن اس سے اس کے سر میں شدید درد پیدا ہو گیا، اور اس نے درد کی شدت میں اپنی بیوی کو طلاق دی، یہ طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

پانچویں مثال : کسی نے زید کے ہاتھ میں بندوق دے کر اس کو مجبور کیا کہ بکر پر گولی چلا دے اس نے حالت اکراہ میں گولی داغ دی، بکر زخمی ہو گیا، گولی اپنا کام کر گئی۔ اسی زید کو کسی نے مجبور کیا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اس نے حالت اکراہ میں طلاق کی نیت اور قصد کے بغیر محض مجبوری میں لفظاً اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو کیا الفاظ طلاق اپنا کام کریں گے؟ مالک و شافعی رحمہم اللہ کا جواب یہ ہے کہ الفاظ طلاق بے اثر رہیں گے اور طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر حالت اکراہ میں کاتب نے طلاق دی ہے یعنی منہ سے طلاق کے الفاظ نہیں نکالے ہیں بلکہ کاغذ پر لکھ دیے ہیں تو فقہ حنفی کا جواب بھی یہ ہے کہ طلاق واقع نہ ہوگی۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ طلاق کو بندوق کی گولی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ بندوق سے گولی نکل کر اپنا کام کر جاتی ہے خواہ بندوق چلانے والا کسی حال میں ہو، لیکن لفظ طلاق ہر حال میں اپنا کام نہیں کرتا۔ جب صورت حال یہ ہے تو مسئلہ یقیناً قابل غور ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جان کر تین طلاقیں دے ڈالے کہ جب تک وہ تین کا لفظ استعمال نہ کرے طلاق واقع ہی نہ ہوگی اور وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہ تھی تو کیا اس کے لفظ کو بندوق کی گولی مان کر اس کو نافذ کر دیا جائے یا یہ مان کر کہ وہ صرف طلاق دینا چاہتا تھا تین کے لفظ کو بے اثر مان کر اس کی نیت کے مطابق ایک طلاق واقع ہونے کا فیصلہ کیا جائے؟ میں نے پہلے بھی غور کیا تھا اور آپ کا معارضہ سن کر اور پھر تجلی میں پڑھ کر بھی غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس صورت میں تین کی صراحت کو غلط فہمی اور دھوکے پر مبنی سمجھ کر طلاق دینے والے کی نیت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ فریب خوردہ کے ساتھ رعایت دین و دنیا کے ہر قانون میں معتبر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی نظیر

ہمیں کتب فقہ میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک چالاک عورت نے اپنے بھولے بھالے شوہر کو دھوکا دے کر اس سے طلاق کے الفاظ کہلوائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب انکار کر رہا ہے۔ اس کے شوہر نے وہاں پہنچ کر اصل واقعہ سنایا تو انہوں نے عورت کو سزا دی اور وقوع طلاق کا فیصلہ نہیں کیا۔ ہدایہ

کی شرح فتح القدیر میں یہ واقعہ بایں الفاظ منقول ہے۔

وقد روی وکیع عن ابن ابی لیلی عن الحکم بن عیینه عن خیثمہ بن عبد الرحمن ان امرأۃ قالت لزوجها سمنی فسماها الطیبة فقالت ماقلت شیئا فقال هات ما اسمیك فقالت سمنی "خلیة طالق" قال فانت خلیة طالق فجاءت الی عمر فقالت له ان زوجی طلقنی فجاء زوجها فقص القصة فاوجع عمر رأسها وقال له خذ بیدها و اوجع رأسها۔ (فتح القدیر ج ۳ مطبوعہ مصر ص ۴۷)

وکیع نے ابن ابی لیلٰے سے، انہوں نے حکم بن عیینہ سے، انہوں نے خیثمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کی ہے کہ ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا میرا کوئی نام رکھیے، اس نے اس کا نام طیبہ رکھا، عورت نے کہا یہ تو تم نے کچھ بھی نہیں کہا، شوہر نے کہا تو اب تمہیں اپنا کوئی نام بتاؤ، اس نے کہا میرا نام "خلیة طالق" رکھو، شوہر نے کہا تو "خلیہ طالق" ہے اس کے بعد وہ عورت حضرت عمرؓ کے پاس گئی اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دیدی ہے، اس کے پیچھے اس کا شوہر پہنچا اور اس نے پورا قصہ سنایا اس کی بات سن کر حضرت عمر نے عورت کے سر پہ ضرب لگائی (درہ مارا) اور شوہر سے کہا اس کا ہاتھ پکڑ اور عورت کے سر پہ ضرب لگائی۔

شوہر نے بیوی سے مخاطب ہو کر اس کو "انت خلیة طالق" کہا، یہ وہ الفاظ ہیں جن سے طلاق بائن پڑ جاتی ہے اور یہی اس عورت کا مقصد تھا۔ حضرت عمر نے دھوکا دے کر کہلوائے ہوئے الفاظِ طلاق کو تسلیم نہیں کیا۔ شوہر نے نادانی میں دھوکا کھا کر وہ الفاظ کہہ دیئے تھے اس کی نیت طلاق دینے کی نہ تھی، شاید عورت کو یہ غلط فہمی تھی کہ خواہ جس طرح بھی ہو شوہر کے منہ سے وہ اپنے لیے طلاق کا لفظ نکلوا دے تو طلاق واقع ہو جائے گی حضرت عمر کے دُرّے نے اس عورت کو بتا دیا ہو گا کہ اس کا خیال غلط تھا۔ لفظ طلاق، بندوق کی گولی نہیں ہے۔

نادانی کی وجہ سے دھوکے میں الفاظ طلاق منہ سے نکالنے کی ایک اور مثال امام الہمام نے خلاصہ کے حوالہ سے لکھی ہے:۔

قالت لزوجها اقرأ علیّ، اعتدی انت طالق ثلاثا ففعل طلقت ثلاثا فی القضاء لا فیما بینه وبین الله تعالیٰ اذا لم یعلم الزوج ولم ینو۔

(ایضاً ص ۴۶)

عورت نے شوہر سے کہا تم مجھے یہ الفاظ سناؤ "عدت گزار تجھے تین طلاق" شوہر نے ایسا ہی کیا تو اگر شوہر الفاظ کا مطلب نہیں جانتا تھا اور اس کی نیت بھی طلاق دینے کی نہ تھی تو قضاءً اس عورت پر تین طلاق پڑ جائے

گی لیکن اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔

جہالت کی وجہ سے دھوکا کھا کر شوہر نے جو الفاظ طلاق منہ سے نکالے اس کی وجہ سے قاضی کی عدالت میں تو تین طلاق واقع ہو جائے گی لیکن دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی، یعنی طلاق فی الحقیقت واقع نہ ہوگی لیکن قاضی وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا جس کا ذکر ابھی اوپر گزرا ہے اور انہوں نے وقوع طلاق کا فیصلہ نہیں کیا اور اسی کے ثبوت میں یہ واقعہ فتح القدیر میں نقل کیا گیا ہے تو پھر فریب دہی کے اس واقعہ میں جس کا ذکر خلاصہ کے حوالے سے گزرا قاضی یہ فیصلہ کیوں نہیں کرے گا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی؟ بہرحال فقہ حنفی یہ تو صراحۃً کہہ رہی ہے کہ نادانی کی وجہ سے قصد طلاق کے بغیر تین طلاق کے الفاظ منہ سے نکل جائیں تو دیانۃً طلاق نہیں ہوگی۔

اب اگر ہم یہ فیصلہ کریں کہ ایسی صورت میں قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی تو حضرت عمرؓ کے فیصلے کے پیش نظر اس کو بالکل بے اساس اور بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ قاضی ظاہر الفاظ پر فیصلہ کرتا ہے کیونکہ دل کا حال اسے معلوم نہیں لیکن اگر قرینہ موجود ہو تو شوہر کے بیان پر فیصلہ کرنے میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں ہے۔

اس طرح کی ایک اور مثال کتب فقہ میں موجود ہے۔ فتاویٰ عالم گیریہ میں "ذخیرہ" کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

واذا قال لامرأته انت طالق ولا یعلم ان ھذا القول طلاق طلقت فی القضاء ولا تطلق فیما بینه وبین الله تعالیٰ۔ (ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۲۵۴)

اور جب کسی نے اپنی بیوی سے کہا "انت طالق" لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ قول، قول طلاق ہے تو اس کی بیوی پر قضاءً طلاق پڑ جائے گی اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان طلاق واقع نہ ہوگی۔

اس صورت میں کہنے والے کا عدم علم حقیقۃً اور دیانۃً وقوع طلاق سے مانع بن گیا ہے۔ وہ طلاق کے صریح الفاظ "انت طالق" بولتا ہے اور اس کے معنی بھی جانتا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اصطلاحی طور پر انہیں الفاظ سے بیوی کو طلاق دی جاتی ہے۔ اس جہل کی وجہ سے اس کی بیوی پر دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی۔ کتب فقہ ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن صورتوں میں طلاق واقع نہیں ہوتی، ان میں مفتی تو عدم وقوع کا فتویٰ دے گا البتہ اگر قاضی کے پاس مقدمہ دائر ہو جائے تو وہ وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو "انت طالق" کہے اور پھر بیوی سے یہ بیان کرے کہ میری نیت اس جملے سے یہ تھی کہ تو اس قید یا پابندی سے آزاد ہے جو میں نے تجھ پر لگا رکھی تھی تو فقہاء کہتے ہیں کہ اس صورت میں صرف قضاءً طلاق واقع ہوگی

دیانۃً نہ ہوگی، اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی نے لکھا ہے:

ای تصح نیتہ فیما بینہ وبین ربہ تعالیٰ لانہ نوی ما یحتملہ لفظہ فیفتیہ المفتی بعدم الوقوع اما القاضی فلا یصدقہ ویقضی علیہ بالوقوع لانہ خلاف الظاھر بلا قرینۃ (شامی ج ۲ مطبوعہ مصر ص ۶۶۶)

یعنی اس کی نیت اس کے اور اس کے بلند و برتر رب کے درمیان صحیح ہے کیوں کہ اس نے اس چیز کی نیت کی جس کا احتمال لفظ طلاق میں موجود ہے لہٰذا مفتی اس کو یہ فتوے دیتا ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی لیکن قاضی اس کی تصدیق نہیں کرے گا اور اس کے خلاف وقوع طلاق کا فیصلہ کر دے گا کیوں کہ طلاق دینے والے کا بیان ظاہر لفظ کے خلاف ہے اور کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔

علامہ شامی کی یہ عبارت اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اگر کوئی قرینہ موجود ہو تو قاضی بھی طلاق واقع نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

اب میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس میں نادانی و جہل کی وجہ سے دی ہوئی طلاق کے بارے میں فقہاء احناف کے ایک گروہ کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق قضاءً بھی واقع نہ ہوگی، وہ مثال یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے شوہر سے اپنے لئے طلاق کے الفاظ لکھوا لئے اور شوہر کو ان الفاظ کے معنی معلوم نہیں ہیں اس صورت میں مشائخ اوزجند کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق بالکل واقع نہ ہوگی نہ دیانۃً نہ قضاءً (بحر الرائق ج ۳ مطبوعہ مصر ص ۲۵۷)

بحر الرائق پر علامہ شامی نے جو حاشیہ لکھا ہے اس میں تاتارخانیہ کے حوالہ سے یہ صراحت کی ہے کہ اوزجند میں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور قاضی امام محمود اوزجندی نے، شہر کے دوسرے فقہاء احناف سے اس مسئلے میں مشورہ کیا اور سب نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ اس صورت میں طلاق بالکل واقع نہ ہوگی، یعنی اگر مقدمہ قاضی کے پاس جائے تو وہ بھی وقوع طلاق کا فیصلہ نہ کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مشائخ اوزجند نے شوہر کی جہالت اور فریب خوردگی کو قضاءً بھی "غیر معتبر" تسلیم کیا۔

یہ تفصیل اس بات کی وضاحت کے لئے پیش کی گئی ہے کہ "جہل" فقہ حنفی میں دیانۃً تو عذر ہے ہی، بعض حالات میں قضاءً بھی اس کو عذر تسلیم کیا گیا ہے۔ آپ نے چوں کہ مسئلہ کا یک رخا مطالعہ کیا ہے اس لئے یہ مثالیں نظر سے اوجھل رہ گئیں یا آپ نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں، میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں وہ فقہی نقطۂ نظر سے بالکل بے اساس و بے بنیاد نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) ایک مجلس کی تین طلاقوں کے طلاق بائن مغلظہ ہونے پر اجماع کے دعوے کو میں نے اپنے مقالے میں محل نظر قرار دیا ہے۔ آپ نے مجھ سے اس پر گفتگو کی تھی۔

اور طلاق نمبر میں بھی آپ نے اس پر گفتگو کی ہے۔ اس کے باوجود اس مسئلے کو اجماعی اور قطعی سمجھنا دشوار ہے میرے نزدیک دعویٰ اجماع کے محل نظر ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ علمار کی ایک جماعت اس مسئلے پر اجماع کا انکار کرتی آرہی ہے (اس سلسلے میں میں نے غلطی سے ابن حزم کا نام بھی لکھ دیا تھا، میرے حافظے میں "بعض اہل الظاہر" کے الفاظ محفوظ تھے، لکھتے وقت داؤد ظاہری کے بجائے ابن حزم کا نام قلمبند ہوگیا۔ اس غلطی پر آپ کی تنبیہ کا میں شکر گزار ہوں)

علمار کی جو جماعت دعویٰ اجماع کا انکار کرتی آرہی ہے اس میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اساطین امت بھی شامل ہیں۔ میں اس کو ایک ثبوت اس لئے مانتا ہوں کہ اگر اس مسئلے پر بلا اشتباہ، یقینی طور پر اجماع ثابت ہوتا تو یہ لوگ اس کا انکار نہ کرتے کیونکہ کسی مسئلہ پر ثابت شدہ اجماع سے انکار گمراہی ہے۔

دعویٰ اجماع کے محل نظر ہونے کا دوسرا ثبوت میرے نزدیک یہ ہے کہ جو علمار و فقہار ایک مجلس کی تین طلاقوں کے طلاق بائن مغلظہ ہونے کے قائل ہیں وہ بھی اپنی کتابوں میں اسے اختلافی مسئلہ قرار دیتے آرہے ہیں اور متعدد صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علمار کی طرف یہ منسوب کرتے آرہے ہیں کہ وہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"مدیر زندگی کا اجماع میں شبہ ظاہر کرنا ظاہراً معقولیت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وہ بجا طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سیکڑوں سال سے اہل علم اپنی کتابوں میں اختلاف کا ذکر کرتے ہی آرہے ہیں اور علمائے سلف کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی نہیں۔ واقعی ایسی صورت حال میں یہ سمجھنا ہی چاہئے کہ مسئلہ کسی درجے میں اختلافی ہے لیکن ہم نے انہیں بتایا کہ یہ فتنے اور اختلاف کا بیج دراصل خوارج اور روافض کا بویا ہوا ہے۔

دس بارہ نام جو بعض کتابوں میں اختلاف کرنے والوں کے درج ہوگئے ہیں، وہ سب دھوکے کی ٹٹی ہیں جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے ان میں سے تو کسی ایک کی طرف بھی اختلاف کی نسبت کذب و افترار کے سوا کچھ نہیں، سفید جھوٹ۔ باقی ناموں میں اکثریت ان کی ہے جو اجتہاد و تفقہ کے بازار میں کھوٹی کوڑی کی بھی قیمت نہیں رکھتے رہے ایک دو، وہ نام جن کی واقعی کوئی اہمیت ہے تو ان کی طرف اختلاف کی نسبت ہی درست نہیں، قوی سندوں سے نقل کا کہیں پتہ نہیں، البتہ اجماع ثابت کرنے والی نقلیں قوی ترین اور کثیر سندوں سے مروی ہیں جنہیں جھٹلانا کسی

واقف فن کے لئے ممکن ہی نہیں۔" (تجلی، دیوبند طلاق نمبر ص ۱۶۹)

گزارش ہے کہ آپ کو اس عبارت پر دوبارہ غور کرنا چاہئے۔ آپ کی تحریر پڑھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن علماء نے اس مسئلے کو اختلافی قرار دیا اور بعض صحابہ و تابعین کی طرف ایک دوسرا قول منسوب کیا ہے، کیا وہ خود افترا کرتے رہے اور سفید جھوٹ بولتے رہے ہیں یا وہ اتنے بے خبر رہے ہیں کہ انہیں اس "دھوکے کی ٹٹی کذب وافترا رسفید جھوٹ" کا احساس تک نہیں ہوا؟ آپ کی یہ عبارت فقہا و علماء کی کثیر جماعت کو کس پوزیشن میں ڈال رہی ہے۔

اب میں ایک اور بات آپ کے ملاحظے کے لئے پیش کرتا ہوں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس مسئلے پر اجماع منعقد ہوگیا ہے۔ ان کی دلیل کیا ہے؟ ان کی سب سے بڑی دلیل مسلم شریف کی وہی روایت ہے جس کے ناقابل استدلال ہونے پر میں نے مقالہ شایع کیا ہے اور آپ نے بھی اپنے انداز میں اس کی پُرزور تائید کی ہے۔ اجماع کا دعویٰ کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار بھی کی جاتی رہی ہوں تو ان کے فیصلے کے بعد اس پر اجماع منعقد ہوگیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں، تین ہی ہوں گی، انہیں ایک شمار نہیں کیا جائے گا۔ انعقاد اجماع کی دلیل یہ ہے کہ کسی نے بھی ان کے فیصلے سے اختلاف نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ روایت ہی قابل احتجاج نہیں ہے تو پھر اس سے اجماع ثابت کرنا کس طرح صحیح ہوگا؟ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس روایت کے سوا کوئی دوسری ایسی روایت موجود نہیں ہے جو اس مسئلے پر انعقاد اجماع کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہو۔ اس صورت حال میں اگر میں نے دعویٰ اجماع کو محل نظر قرار دیا ہے تو کیا غلطی کی ہے؟

اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور فرمائیے۔ اجماع کی اصطلاح تین قسم کے اجماع کے لئے استعمال کی جاتی ہے

(الف) ان احکام و مسائل پر اجماع جو کتاب و سنت کے صریح اور قطعی الثبوت دلائل سے ثابت ہوں۔ جیسے نماز پنجگانہ، زکوٰۃ، صوم رمضان اور حج وغیرہ۔ ان کے لئے بھی علماء "ثابت بالکتاب والسنۃ والاجماع" کے الفاظ لکھتے ہیں۔

(ب) کسی مسئلے پر پہلے کچھ اور حکم تھا اور پھر اس کے خلاف پر اجماع ہوگیا۔ مثلاً پہلے ام ولد کی بیع جائز تھی پھر اس کے عدم جواز پر اجماع منعقد ہوگیا۔

(ج) کسی آیت یا حدیث سے مستنبط، اجتہادی مسئلے پر اجماع۔ مثلاً مانعین زکوٰۃ سے جہاد

اب قابل غور بات یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین ہونے پر آپ جس اجماع کا دعویٰ یا زور دار تائید کرتے ہیں وہ اجماع کی کس قسم میں داخل ہے؟ پہلی قسم میں داخل نہیں اس لئے کہ کوئی اس کا قائل نہیں اور غالباً آپ بھی اس

مسئلے کو نماز پنجگانہ کی طرح قطعی نہیں سمجھتے ہوں گے دوسری قسم میں بھی داخل نہیں اس لئے کہ آپ یہ نہیں مانتے کہ حضرت عمرؓ کے فیصلے سے پہلے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بہرحال ایک شمار کیا جاتا تھا اور بعد کو حضرت عمر نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ تیسری قسم میں بھی داخل نہیں اس لئے کہ آپ اس کو اجتہادی مسئلہ تسلیم نہیں کرتے تو پھر غور فرمائیے کہ آپ نے جس زور شور سے اس مسئلے پر اجماع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ کس قسم کا اجماع ہے ؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ عہد رسالت، عہد صدیقی اور ابتدائے عہد فاروقی میں ایک مجلس کی تین طلاقیں، بہرحال ایک شمار کی جاتی تھیں اور یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ حضرت عمر کے فیصلے کے بعد اس مسئلے پر کوئی اجماع منعقد ہو گیا ہے کہ وہ تین طلاقیں، تین ہی شمار کی جائیں گی بلکہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ جمہور کے مسلک کے دلائل قوی ہیں اس لئے ان کا مسلک راجح ہے اور جن لوگوں نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بہرحال ایک قرار دیا ہے ان کے دلائل ضعیف ہیں اس لئے ان کا مسلک مرجوح ہے۔

(۳) مسلم شریف کی روایت پر میرا جو مقالہ شائع ہوا ہے اس کے تعلق سے آپ نے میری طرف ایک ایسی بات منسوب کی ہے جس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے نیز اس گفتگو میں آپ نے مجھے مخاطب کر کے صرف یہ کہا تھا "آپ فقہاء سے خفا کیوں ہیں؟" آپ نے میری کسی عبارت کی نشاندہی نہیں کی تھی اس لئے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میری کس عبارت میں آپ کو فقہاء کی تحقیر و تخفیف نظر آئی اور میری کس عبارت سے آپ نے یہ معلوم کیا کہ میرے دل میں فقہاء کی طرف سے بدظنی اور کدورت موجود ہے۔ فقہاء کی تعریف اور ان کے احترام میں آپ کی تقریر دلنشین پڑھ کر احساس ہوا کہ مجھ سے زیادہ خود آپ اس کے مخاطب ہیں۔ زبانی آپ نے فرمایا تھا کہ طلاق نمبر آپ نے بہت نرمی کے ساتھ مرتب کیا ہے لیکن آپ کی جارحانہ تنقید کی عادت اپنا کرشمہ دکھانے سے باز نہیں آئی ہے۔

جب آپ نے مجھے تقلید کو دانتوں سے پکڑنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی تقلید پسندی کا اقرار کیا تھا تو میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا تھا کہ آپ کسی مسئلے میں مقلد جامد بن جاتے ہیں اور کسی مسئلے میں مجتہد مطلق ہو جاتے ہیں۔ اب مزید عرض کرتا ہوں کہ اگر میں تقلید کو دانتوں سے پکڑے رہتا تو مسلم شریف کی روایت پر وہ مقالہ کبھی تیار نہ ہوتا جس کو آپ نے بھی "بہت اچھا" کہا ہے۔ اور اگر آپ خود تقلید کو دانتوں سے نہ چھوڑتے تو طلاق نمبر مرتب نہ ہوتا۔ میں بھی اپنے آپ کو مجتہد نہیں سمجھتا جس طرح آپ اپنے کو مجتہد نہیں سمجھتے۔ اس حقیر کو بھی یہ علم ہے کہ اجتہاد کا درجہ بہت بلند ہے

اقبال کی شاعری میں راست انداز بیان

سید احمد قادری

اقبال کی شاعری میں وہ کیا خوبی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے اساطین علم و فضل بھی اس کے گرویدہ ہیں اور ان کی شاعری میں وہ کیا بات ہے کہ ہم اس کو اسلامی شاعری کے لئے بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان کے اس پیغام، اس مقصد اور اس نصب العین سے ملتا ہے جس کے لئے انہوں نے اپنی شاعری کو وسیلہ اور ذریعہ بنایا ہے۔

انہوں نے ایک طرف مغربی تہذیب، اس کے لوازمات اور باطل نظریات و خیالات و توہمات پر دانشگاف انداز میں تنقید کی ہے اور دوسری طرف اسلام کو پوری انسانی زندگی کے لئے بلند ترین معیار اور کامل ترین ہدایت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بہترین قسم کی مقصدی اور تحریکی شاعری بن گئی ہے۔ جو اپنے پڑھنے والوں کو سر بزیری نہیں، سربلندی سکھاتی ہے، وہ انہیں بھیڑ نہیں، شیر بنانا چاہتی ہے، وہ انہیں کرگس نہیں، شاہین بنانا چاہتی ہے، وہ انہیں کبوتر نہیں، باز بنانا چاہتی ہے، وہ انہیں مولا نہیں، عقاب بنانا چاہتی ہے، وہ انہیں راہب نہیں، مجاہد بنانا چاہتی ہے اور وہ انہیں کافر نہیں مومن بننے پر اکساتی ہے۔

لیکن ان کی شاعری کی یہی خوبی، اس کا یہی پیغام اور اس کا یہی مقصد بہت سے شاعروں، ادیبوں اور تنقید نگاروں کے نزدیک وہ عیب ہے جس نے ان کی شاعری کا درجہ گھٹا دیا ہے۔

اقبال کی شاعری پر ناک بھوں چڑھانے والے شعراء کی ایک قسم وہ ہے جس کے نزدیک، شاعری زلف و گیسو، قد و خال، لب و رخسار، دہن و کمر، ہجر و وصال اور مہ جبیناں سخن گفتن کے سوا اور کچھ نہیں ہے، وہ لوگ ایک حسین خیالی پیکر تراشتے ہیں اور اسی پر اپنے اشعاروں کی پھول مالائیں چڑھاتے رہتے ہیں ان کے اشعار کا مطالعہ کرنے والوں یا سننے

والوں کے ذوق شعر کو بھی رفتہ رفتہ یہی روگ لگ جاتا ہے۔ اب ان لوگوں کا زور ٹوٹ چکا ہے اور ان کی تعداد کم ہوگئی ہے لیکن ختم نہیں ہوئی ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے نزدیک شاعری کا میدان اتنا تنگ نہیں بلکہ خاصہ وسیع ہے لیکن وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا جائے رمز و اشارہ میں کہا جائے، اپنے اصلی خیالات واضح طور پر پیش نہ کئے جائیں کیوں کہ ایمائیت و اشاریت ہی ان کے نزدیک شاعری کی جان ہے۔ وہ صاف صاف اظہار خیال کو۔ جس کے لئے راست انداز بیان کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ پروپیگنڈہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کی شاعری ان کے نزدیک "خوانچہ فروش کی صدا" ہوتی ہے اور اگر اسلام کی تبلیغ میں راست انداز بیان اختیار کیا گیا ہو تب تو وہ شاعری ان کے نزدیک دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک شاعری کا فن ایک ایسا نازک شیشہ ہے جو صرف تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور تمثیل و تلمیح ہی کو برداشت کرتا ہے، راست انداز بیان اسے راس نہیں آتا اس کنکر سے یہ شیشہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

جو لوگ ایمائیت و اشاریت ہی کو شاعری کی جان سمجھتے ہیں ان کو اقبال کی شاعری کا معترف بنانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایمائیت و اشاریت کی تعریف ہی بدل دی جائے اور یہ کہا جائے کہ اگر کسی صاف اور واضح خیال کے لئے بھی استعارہ، تشبیہ یا تمثیل و تلمیح استعمال کی گئی ہے تو وہ بھی ایمائیت و اشاریت کے دائرے کی چیز ہے اس سے باہر نہیں ہے۔ چوں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں بکثرت ان چیزوں کا استعمال کیا ہے اس لئے ان کا فن بھی ایمائی ہے۔

اقبال کی طرف سے مدافعت کا یہ طریقہ اطمینان بخش نہیں ہوگا کیوں کہ ایماکی ایک ایسی تعریف یا تشریح کرنا جس کا ساتھ نہ لغت دے اور نہ اصلاح کسی صاحب علم کو مطمئن نہیں کر سکے گا۔ جس طرح کوئی شخص تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل اور تلمیح کو ملا کر ایک کر دینے کی سعی کرے تو یہ سعی مشکور نہ ہوگی۔ اس طرح تو اصطلاحات کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور تنقید کا کوئی اصول ہی باقی نہ رہے گا۔ اس طریقہ کے غیر مفید ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں ان چیزوں سے کوئی چیز استعمال نہیں کی گئی ہے اور حقیقت کو حقیقت ہی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے وہ اشعار اتنے ہی موثر ہیں جتنے وہ اشعار جو تشبیہ و استعارہ وغیرہ سے مالا مال ہیں۔

اقبال کی شاعری کی طرف سے دفاع کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس خیال کی اصلاح کی جائے کہ "ایمائیت و اشاریت ہی شاعری کی جان ہے۔" میں اسی طریقے کو صحیح سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ مبنی بر حقیقت ہے اور خود اقبال کی شاعری اس

پرگوا ہے۔

اقبال نے چھوٹی بڑی سیکڑوں نظمیں کہی ہیں۔ ان کے قطعات، رباعیات اور غزلوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ جن نظموں اور قطعات میں انہوں نے مغربی تہذیب اور اس کے لوازمات و متعلقات اور باطل نظریات پر تنقیدیں کی ہیں اور اسلام اور اس کے لوازمات و مقتضیات کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا ہے وہ سب کی سب راست انداز بیان ہی میں ہیں۔ رمز و ایما (بہ لحاظ معنی لغوی و اصطلاحی) سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

راست انداز بیان میں جو اشعار انہوں نے کہے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور تمثیل و تلمیح میں سے کوئی چیز استعمال نہیں کی گئی ہے یا بہت کم استعمال کی گئی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس میں یہ چیزیں بکثرت استعمال کی گئی ہیں۔ میں اولاً پہلی قسم کے اشعار یہاں پیش کروں گا۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب یا تنقید نگار ان اشعار کو اقبال کی عظمت کا نشان سمجھتا ہے یا نہیں، یہ اپنے اپنے مزاج اور ذوق کی بات ہے کتنے ہی لوگ ہیں جو مثال کے طور پر حالی کے مسدس کو جغرافیہ اور تاریخ کی کتاب سمجھتے ہیں اسے شاعری ماننے پر تیار نہیں ہیں اور کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اسے تعمیری اور مقصدی شاعری کا ایک اچھا نمونہ مانتے ہیں۔

شکوہ و جواب شکوہ، اقبال کی دو طویل نظمیں یا مختصر مسدس ہیں۔ ان دو مسدسوں نے اقبال کی شاعری کو جو شہرت و مقبولیت عطا کی تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ شکوہ میں ۹۳ اشعار ہیں اور جواب شکوہ میں ۱۰۸۔ اشعار کی کل تعداد ۲۰۱ ہے۔ ان میں ان اشعار کی تعداد زیادہ ہے جن میں تشبیہات و استعارات نہیں ہیں یا برائے نام ہیں اور جہاں تک میں جانتا ہوں وہی اشعار زبان زد خاص و عام ہیں جو ان چیزوں سے خالی ہیں۔ میں یہاں ان دونوں میں سے چند بند اور چند متفرق اشعار نقل کروں گا۔

شکوہ اور جواب شکوہ کا پس منظر

"پدرم سلطان بود" کا غلط خیال مسلمانوں کے معاشرے میں پایا جاتا تھا اور اس کے اثرات آج بھی باقی ہیں۔ اس غلط خیال کی اصلاح کے لئے علامہ اقبال نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شکوہ کے انداز میں وہ خیالات پیش کر دیئے جن کی وجہ سے مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ آج بھی ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا وہی معاملہ ہونا چاہیے جو عہد صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جواب شکوہ میں مسلمانوں کے وہ حالات ان کے سامنے رکھ دیئے جو آج پائے جا رہے ہیں۔ ان کا جواب شکوہ درحقیقت "وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ" (اور تمہیں سربلند ہو اگر تم مومن ہو) کی تشریح ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں صرف "وانتم الاعلون" [illegible]

کنندہ ... کی شہرطان کے ذہن سے اوجھل ہوگئی تھی اقبال نے اس شرط کو ابھار کر ان کے سامنے پیش کردیا۔ اس پس منظر میں شکوہ اور جواب شکوہ کے اشعار پڑھنے چاہئیں۔

شکوہ کے چند بند اور متفرق اشعار

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر   کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر   مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا؟

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی   اہلِ چیں، چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی   اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں   خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں   کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز   قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے   بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے
امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں   ...
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر   ...

جواب شکوہ

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک   ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

کون ہے تارک آئین رسول مختار؟ — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار — ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں

کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود — ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود — یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو!

تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے — یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو! — پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں — امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں!

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے — ہم سے کب پیار ہے! ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

ان اشعار میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور تمثیل استعمال نہیں کی گئی ہے اور ایمائیت و اشاریت سے تو انہیں دور کا تعلق بھی نہیں ہے بلکہ خیالات واضح اور سادہ الفاظ میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہر بند اور ہر شعر اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور مؤثر بھی۔

اس کے علاوہ اقبال کا ترانہ ملی پڑھئے، جس نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا ہے اور اب بھی گرما رہا ہے لیکن اس میں اظہار حقیقت کیلئے تشبیہ اور استعارہ کا سہارا بہت کم لیا گیا ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اب میں کچھ اور اشعار پیش کرتا ہوں، انشاءاللہ کلام اقبال کی یہ سیر دلچسپ بھی ہوگی اور مفید بھی۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے زوال، بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی!

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اللہ کی دین ہے جسے دے میراث نہیں بلند نامی

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ
خوابیدگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی — پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام
حکمت مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے — ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز عمل زار و زبوں — ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو — مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
ناصبوری ہے زندگی دل کی — آہ، وہ دل جو ناصبور نہیں
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا — لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک — نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ
بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی — مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید — وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری — جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری
رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں — اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اقبال کی غزلوں کے چند اشعار

رمز و ایما اور تشبیہ و استعارہ کے گرویدہ لوگوں نے غزل کو چھوئی موئی کا پیڑ بنا دیا تھا۔ اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے غزل کو بھی وسیلہ بنایا ہے اور غزلوں میں راست انداز بیان کے سیکڑوں اشعار کہے ہیں۔ ان میں بہت سے اشعار تشبیہ اور استعارہ سے بھی خالی ہیں۔ میں اسی طرح کے چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔

زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی — کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں
بجلی تو سب اقبال سے ہے اک جانے کس کی ہے یہ ملا — پیغام سکوں پہنچا بھی گئی [illegible]

سامان کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی — مقصد ہے اگر منزل، غارت گر ساماں ہو
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیش نظر — آیت لایخلف المیعاد رکھ

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور — میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور
مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے — تیرے نفس میں نہیں گرمیٔ یوم النشور

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو — نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ

اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید — ان امتوں کے باطن نہیں پاک

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد — نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں — نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

حدیثِ بے خبراں "تو با زمانہ بساز" — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

نہ زبان کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بیزار دل سے میں خرد سے

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

یارب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن — کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی — خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہان، نہ سمرقند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال   کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا   وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰے سے مجھے   کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی یہ درویشی   کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت   فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ   ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم
ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق   یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں   فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق
علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا   غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق
مرید سادہ تو رو رو کے ہوگیا تائب   خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق
مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت   ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحب تصدیق
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں   کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری
مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی   کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
دل بینا بھی کر خدا سے طلب!   آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں
کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں   ایک بھی صاحب سرور نہیں!
ناصبوری ہے زندگی دل کی   آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں!
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا   لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک   نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ
بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی   مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری   وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے
نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے   جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
نشان راہ دکھاتے جو ستاروں کو   ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے
نگہ بلند سخن دل نواز، جاں پرسوز   یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی — کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

دنیائے دوں کی کب تک غلامی — یا راہبی کر یا بادشاہی !

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے — کردار بے سوز، گفتار واہی

یہ بندگی خدائی وہ بندگی، گدائی — یا بندہ خدا بن یا بندۂ زمانہ

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے — کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا — یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام — وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

فریب خوردہ منزل ہے کارواں ورنہ — زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل

منزل راہ رواں، دور بھی دشوار بھی ہے — کوئی اس قافلہ میں، قافلہ سالار بھی ہے

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی ! — فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا — تو بھی نمازی میں بھی نمازی

تو زندگی ہے پائندگی ہے — باقی ہے جو کچھ سب خاک بازی

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی — کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار — غلامی سے بتر ہے بے یقینی

نگاہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں — خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں

نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی — اماں شاید ملے اللہ ھو میں

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید ۔۔۔ آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دل روشن، نفس گرم ۔۔۔ محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نم ناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت ۔۔۔ ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
منم کہ توبہ نکردم ز فاش گوئی ۔۔۔ زبیم ایں کہ بسلطان کنند غمازی !
خبر نہیں کیا نام ہے اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی ۔۔۔ عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

اقبال نے فارسی میں جو اشعار کہے ہیں ان میں سے بھی بہت سے اشعار وہ ہیں جن میں ترسیل خیال کے لئے مجاز کا سہارا نہیں لیا گیا ہے بلکہ سادہ اور حقیقی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ میں نے اوپر جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں صرف ایک شعر فارسی کا ہے۔ یہ جو اردو کے اشعار نقل کئے گئے ہیں وہ بھی اتنی تعداد میں ہیں کہ اقبال کے فن پر گفتگو میں ان کو نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جن میں مجاز کی رنگینی گویا نہیں۔ آئندہ ہم ان کے کچھ ایسے اشعار منتخب کریں گے جن میں انہوں نے اپنے واضح خیالات کے لئے تشبیہ اور استعارے کا سہارا لیا ہے۔ میں یہ بات اپنے ایک تبصرے میں لکھ چکا ہوں کہ اشاروں کنایوں میں بات کرنا ایک الگ چیز ہے اور اپنے واضح خیالات کے لئے استعارہ، کنایہ اور تمثیل و تلمیح استعمال کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔

اقبال نے جو نظمیں واضح اور متعین عنوانات سے لکھی ہیں اور ان میں بکثرت تشبیہ اور استعارے کا استعمال کیا گیا ہے ان کا "ایمائیت و اشاریت" سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ سب راست انداز بیان ہی میں لکھی گئی ہیں۔ محض تشبیہ اور استعارے کے استعمال کی بنا پر ترسیل خیال کے ہنج کو "ایمائی" کہنا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ فرض کیجئے کوئی شاعر "اسلام" کے عنوان سے ایک نظم لکھے اور اس میں اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے بکثرت استعارات و تمثیلات استعمال کرے تو کیا اس پر ایمائیت و اشاریت کا اطلاق صحیح ہوگا؟ یا فرض کیجئے کوئی شاعر "حق و باطل" کے عنوان سے ایک نظم لکھے اور اس میں حق کو نور سے اور باطل کو ظلمت سے تشبیہ دے تو کیا اس تشبیہ کی وجہ سے اس نظم کو "ایمائی" کہنا صحیح ہوگا؟ یا فرض کیجئے کہ کوئی شاعر "نعت" کہے اور اظہار جذبات کے لئے استعارات کا انبار لگا دے تو کیا وہ نعت "ایمائی" ہو جائے گی۔

تھائی لینڈ میں اسلام اور مسلمان

عربی سے ترجمہ ——— محمد شعیب

۱۔ تھائی لینڈ میں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

۲۔ تھائی لینڈ کی حکومت کی طرف سے مسلم پرسنل لاء کے مطابق فیصلہ کرنے کے لئے قاضی مقرر ہیں۔!

۳۔ تھائی لینڈ کی حکومت نے ایک "الکلیۃ الاسلامیہ" قائم کیا ہے، جہاں اسلامی، عربی، اور عصری علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔!

۴۔ تھائی سرکاری ملازموں کو حج کیلئے چھٹی ملتی ہے تھائی عورتیں پردہ کرتی ہیں:

(سیام) تھائی لینڈ میں تقریباً ... مسلمان آباد ہیں، یہ متفرق شہروں میں رہتے ہیں مسلمانوں کی کثیر تعداد ملایا سے ملتی ہوئی سرحدی آبادیوں میں رہتی ہے، تھائی لینڈ میں مسلمانوں کے چار بڑے شہر ہیں، فطانی زیکی میٹ، کالا، ساٹم، ان شہروں میں مسلمانوں کی تنظیمی جماعتیں متحرک فعال ہیں۔ حکومت تھائی لینڈ نے مسلم پرسنل لا کے مطابق مسلمانوں کے شخصی مقدمات کے فیصلہ کے لئے قاضی مقرر کئے ہیں۔ حکومت کی طرف سے عربی کی تعلیمی سہولیات فراہم کی جا[تی] ہیں یہی وجہ ہے کہ بنکاک میں سرکار کی طرف سے ایک عربک سیکنڈری اسکول ہے۔ جہاں مسلم طلبا ابتدائی عربی تعلیم [حاصل] کرنے کے بعد داخلہ لیتے ہیں۔ یہاں کے اسکولوں میں دو[سری] زبان عربی ضروری ہے ایک غیر اسلامی اور غیر عرب ملک میں عربی زبان کی یہ زبردست کامیابی کی دلیل ہے۔

ان چاروں مذکورہ شہروں میں مسلمانوں کی با[قاعدہ]

جماعتیں ہیں۔ قاعدہ کے مطابق ان کے عہدیداران بھی ہیں، تھائی لینڈ میں چوبیس مجلسوں پر مشتمل ایک "المجلس الاسلامیہ" بنی ہوئی ہے۔ جن کے مراکز ۲۴ شہروں میں موجود ہیں بنکاک دار السلطنت تھائی لینڈ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے یہاں کی مجلس اسلامی کے ۲۵ ممبران ہیں جن میں ائمہ مساجد کے علاوہ دوسری بڑی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔

مسلمان تھائی کو حکومت نے مذہبی آزادی دے رکھی ہے وہ نماز روزے کے علاوہ حج کا فریضہ ادا کرنے بھی جاتے ہیں۔ مسلمان سرکاری ملازم کو اگر یہاں کے شیخ الاسلام کی طرف سے حج کی اجازت مل جائے تو حکومت ادئے فریضہ کے لئے حج کرنے والے کی چھٹی منظور کر لیتی ہے۔

یہاں کی مختلف جماعت اسلامیہ جغرافیائی ہیں۔ کچھ تنظیمیں صرف تھائی مسلمانوں کی ہیں۔ کچھ ہند و پاک کے مسلمانوں نے بنائی ہیں کئی جماعتوں کے قائد کمبوڈیا اور کمیونسٹ چین کے مسلمان ہیں ان سب کی مساعی ایک ہے اور وہ ہے۔ "اشاعت مذہب کا کام" شمالی تھائی لینڈ میں مساجد کی تعداد تقریباً ایک ہزار سات سو ہے مسجد بنانے میں حکومت کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی۔

تھائی مسلمانوں کا ایک ادارہ "پدھشت" ہے جو مساجد کی تعمیر میں تعاون کرتا ہے۔ ہر مسجد میں امام و مؤذن مقرر ہیں یہاں خطبہ عربی زبان کی بجائے تھائی زبان میں دیا جاتا ہے کہیں کہیں قرآن و حدیث کی ایک دو آیتیں بھی پڑھ دی جاتی ہیں اگرچہ علماء اسے جائز نہیں کہتے۔

ہر مسجد میں ایک مدرسہ بھی ہے جہاں مذہبی تعلیم کا اچھا انتظام ہے، ان عربی اسلامی مدارس کی وجہ سے عربی بولنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان میں ناظرہ و حفظ قرآن کے علاوہ قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر اور احادیث نبویہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ تھائی لینڈ میں سرکاری طور پر ہر شخص کو فوج میں جبراً بھرتی کیا جاتا ہے۔ مگر ائمہ مساجد اور مؤذن کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

خالص مدارس اسلامیہ عربیہ میں قابل ذکر "دار العلوم اسلامیہ حفسا المعہد العلمی الدین بنکاک مفتاح العلوم الدینیہ بنکاک وغیرہ میں جنوبی تھائی لینڈ میں بھی بہت سے مدارس اسلامیہ ہیں مگر یہ مادی و علمی اعتبار سے امداد و تعاون کے محتاج ہیں ان میں سے بعض مدارس وزارت تعلیم سے ملک ۲
میں بعض آزاد ہیں۔

تھائی حکومت نے بنکاک میں ایک عربک کالج قائم کیا ہے "الکلیتہ الاسلامیہ" اس کا نام رکھا گیا ہے اس میں عربی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام اور علوم عصریہ کی تعلیم کا بھی انتظام ہے جس میں تھائی مدارس اسلامیہ کے فارغ مسلم طلبا لیکچرر ہیں۔

تھائی مسلمانوں کا رابطہ عالم اسلامی کے ذریعہ سعودی عرب سے ۱۹۶۷ء میں شاہ فیصل کے دورہ کے بعد ہوا یہاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ملکی غیر ملکی، مسلم غیر مسلم اور شخصی اغراض کی سطح سے الگ ہو کر ہر شخص اپنے اپنے کام میں مشغول ہے۔

رابطہ عالم اسلامی کے مبلغین تھائی مسلمانوں میں مذہبی تعلیم پھیلانے کے علاوہ ان کے اندر غیر اسلامی عقیدے کو ان کے دلوں سے کھرچنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس کے بعد وہ غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کا کام کریں گے، یہاں کے بدھسٹ اور عیسائیوں میں محنت کی ضرورت ہے۔

تھائی لینڈ میں اسلام کی آمد سن بارھویں صدی عیسوی میں جنوبی عرب، ایران، جزیرہ نمائے ہند کے مسلمان کی آمد و رفت کے ذریعہ ہوئی مملکت سیام میں مسلمانوں کی بڑی قدر کی گئی، ان کو حکومت میں جگہ بھی دی گئی تھی۔

چنانچہ اس شاہی دور میں شیخ احمد وزیر خوراک وزیر خارجہ مقرر کئے گئے تھے، ایران میں تھائی لینڈ کا سب سے پہلا سفیر بہتر حالت تھی

تھائی مسلمان دینی شعار کو محفوظ رکھنے میں بڑے حساس اور مستعد واقع ہوئے ہیں۔ رمضان کا چاند دیکھنے کا زبردست اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے رویت نہیں ہو سکی تو ان کی جماعت سعودی عرب کے سفارت خانہ سے رابطہ قائم کرتی ہے اور وہ سعودی عرب کی رویت پر اپنے یہاں رمضان اور عید مناتے ہیں مسلمان عورتوں میں اب تک پردہ اسلامی کا رواج باقی ہے، خاص کر ملیشیا سے ملی ہوئی سرحدوں کے باشندوں میں پردہ کا بڑا اہتمام ہے یہاں کے مسلمان اشاعت دین کے کام میں بڑے انہماک کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ان کو عالمی اسلامی برادری کے مسائل سے بھی دلچسپی ہے اور لگاؤ ہے گاہے اس کا مظاہرہ بھی ہوتا رہتا ہے چنانچہ وہ قضیہ فلسطین میں عربوں کے موقف کی تائید کرتے ہیں
(الجمعیۃ دہلی)

رسائل و مسائل

ایک کاروبار اور اسکے بارے میں چند سوالات

خط: ایک اہم مسئلے پر آپ کی رہنمائی مطلوب ہے۔ امید ہے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے میرے لئے وقت نکال کر تفصیلی جواب عنایت فرمائیں گے۔

(۱) ایک فرم ہے "آل دیل اڈور ڈائزنگ کارپوریشن" اس کا میں پارٹنر ہوں۔ اس فرم میں میرا حصہ ۶۵% فیصد ہے، اس فرم کے کاروبار کی نوعیت یہ ہے کہ مختلف مقامات پر بڑے بڑے بورڈس جنہیں ہورڈنگس (HORDINGS) کہا جاتا ہے نصب کئے جاتے ہیں اور انہیں مختلف کمپنیوں کو ماہانہ کرایے پر ان کے مال کے اشتہار کے لئے دیا جاتا ہے۔ کرایہ سے ہونے والی آمدنی میں سے ضروری اخراجات مثلاً پینٹنگ (PAINTING) جگہ کا کرایہ ٹیکس، آفس کے ماہانہ اخراجات اور پارٹنرس کے اخراجات نکالنے کے بعد جو رقم بچتی ہے اسے ہم نئے بورڈس لگانے پر خرچ کرتے رہے ہیں۔ نیز اکثر مواقع پر ہمارے پاس نئے بورڈس اور اس کے اسٹرکچرس (STRUCTURES) کا سامان بھی کئی ماہ تک رکا رہتا ہے جو ہم وقتاً فوقتاً خرید کر رکھتے ہیں۔

(۲) اس کاروبار سے سالانہ اندازاً تیس چالیس ہزار کا فائدہ ہوتا ہوگا جو کاروبار کی توسیع ہی میں لگایا جاتا ہے۔

(۳) ہمیں اس بات کا تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس سال اتنا منافع ہوا ہے مگر کاروبار کے ابھی ابتدائی مرحلے میں ہونے کی وجہ سے ہم متعین طور پر منافع الگ نہیں کر سکتے یعنی حساب لگا کر یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اتنے روپے اور اتنے پیسے منافع ہوا۔

(۴) ہمارے لگے ہوئے بورڈس میں سے تقریباً دس تا بیس فیصد بورڈس خالی رہتے ہیں ان سے ایسے موقعوں پر کسی طرح کی آمدنی نہیں ہوتی البتہ جگہ کا کرایہ ہمیں دینا پڑتا ہے۔

جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ اس کاروبار یا اس سے حاصل ہونے والی آمدنی پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ اس سے متعلق اب تک جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان سے یکسوئی نہیں ہو سکی ہے۔ براہ کرم مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں حسب ذیل سوالات کے جوابات دے کر مشکور فرمائیے۔

(الف) کرایہ پر چلنے والی ہر چیز پر زکوٰۃ نہیں ہے کیا ہمارا کاروبار بھی اسی کی تعریف میں آتا ہے؟ اگر آتا ہے تو جو آمدنی اندازاً ہمیں ہوتی ہے اس پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالنا صحیح ہے یا اس کے لئے کوئی اور شکل اختیار کرنی ہوگی۔

(ب) کیا یہ شکل صحیح ہوسکتی ہے کہ پورے TURN OVER (کرایوں سے ہونے والی کل آمدنی) پر جو تقریباً ڈیڑھ لاکھ کا ہوتا ہے کچھ فیصد (منافع کے تناسب کے مطابق)، اس مقصد کے لئے مقرر کرکے نکال لیا جائے کیوں کہ متعین طور پر منافع الگ کرنا سردست مشکل ہے اور ہم کوشش کے باوجود اس پر ابھی قابو نہیں پاسکے ہیں۔ یا پھر اس کے علاوہ جو شکل صحیح ہو وہ لکھیں۔

(ج) زکوٰۃ کے مسئلے میں ایک صاحب نے جو ہمارے پارٹنر ہیں، یہ الجھن پیش فرمائی ہے کہ مسئلہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کرایہ پر چلنے والی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ نیز یہ بات کہ ایک آدمی کے پاس لاکھوں روپے کے موتی اور جواہرات ہوں تو اس پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے اور تیسری بات یہ کہ اگر کسی کی ہزاروں روپے کی آمدنی ہوا اور وہ سال گزرنے سے پہلے اس آمدنی سے کوئی مکان خرید لے یا [illegible] خرید لے یا اسے اپنے پاس سال بھر تک رقم رکھنے ہی نہ دے جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہو تو اس آمدنی پر بھی [illegible] ہوتی ہے زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کے پاس بقدر نصاب مال تجارت ہو یا زیورات ہوں تو اس پر زکوٰۃ ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ بات مبنی بر انصاف معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے دولت کی تقسیم ہو اور سوسائٹی کے غریب لوگوں تک بھی دولت پہنچے اگر زکوٰۃ کو چند مخصوص چیزوں اور ذرائع تک محدود کیا جائے تو یہ بات زکوٰۃ کی اسپرٹ کے منافی معلوم ہوتی ہے تیسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر زکوٰۃ کی اسپرٹ کچھ اور ہے اور وہ نہیں ہے جو میں نے سمجھی ہے تو آپ کتاب و سنت کی روشنی میں واضح فرمائیں کیوں کہ جب تک زکوٰۃ کی اصولی حیثیت متعین نہیں ہوجاتی اس وقت تک اس سے متعلق مسائل کو سمجھنے میں الجھنیں پیش آتی رہیں گی۔

آخر میں پھر آپ سے گزارش ہے کہ تمام سوالات کا تفصیلی جواب جلد عنایت فرمائیں۔

جواب : سب سے پہلے یہ عرض ہے کہ میری ایک مختصر کتاب "عشر و زکوٰۃ اور اس کے چند مسائل" مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶ سے شائع ہوئی ہے، کیا آپ نے اس کا مطالعہ کیا ہے؟ آپ کو اور آپ کے رفیق کو جو الجھن پیش آرہی ہے اسی طرح کی الجھنوں کا جواب تفصیل سے اس میں موجود ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد یہی تھا کہ یکساں سوالات کے مفصل جوابات بار بار

نہ لکھنے پڑیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں اس سے آپ کی الجھن دور ہوگی اور اگر کوئی مزید الجھن اس سلسلے میں پیدا ہو تو اس کو دریافت کیجئے تاکہ اس مسئلے میں کوئی گوشہ رہ گیا ہو تو اس کی مزید تفصیل کی جاسکے۔ اب میں آپ کے سوالات کے مختصر جوابات دیتا ہوں۔

(۱) میرا جتنا بھی فقہی مطالعہ ہے اس کے پیش نظر آپ کا کاروبار اجارہ یعنی کرایے کا کاروبار ہے۔ تجارت کا کاروبار نہیں ہے۔ اجارہ اور تجارت میں جو فرق ہے وہ میں نے اپنی کتاب میں جس کا ذکر اوپر گزرا، واضح کر دیا ہے۔

(۲) اس کاروبار سے جو نفع آپ کو حاصل ہوتا ہے اور سال گزرنے کے بعد اس نفع کی جو رقم آپ کے پاس موجود ہو، اسی پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ دینا ہوگی۔ کل آمدنی پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی مختلف مدات پر جو اخراجات آپ کر چکے ہیں وہ زکوٰۃ سے خارج ہو جائیں گے۔

(۳) شریعت نے جو نصاب مقرر کیا ہے اور جو مقدار زکوٰۃ متعین کی ہے اس میں کم و بیش کرنے کا حق ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کل آمدنی پر کچھ فیصد زکوٰۃ نکالنے کی شکل صحیح نہیں ہے اور جیسا کہ ۲ میں لکھا جا چکا ہے آپ کے معاملے میں شرعاً کل آمدنی پر زکوٰۃ عائد ہی نہیں ہوتی۔ اگر اس وقت نفع کی پائی پائی کا حساب نہیں ہو سکتا تو پوری طرح اندازہ لگا کر جو نفع متعین ہو اس پر زکوٰۃ ادا کیجئے۔ ۲ میں میں یہ بھی لکھ چکا کہ نفع کی جو رقم سال گزرنے کے بعد آپ کے پاس موجود ہو اسی پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ نفع کی جو رقم آپ سال گزرنے سے پہلے مزید بورڈس خریدنے پر لگا دیتے ہیں اس پر زکوٰۃ نہیں دینا ہوگی۔

(۴) آپ کے رفیق کو جو الجھن ہے اس کے لئے بھی میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ "عشر و زکوٰۃ اور سود کے چند مسائل" کا مطالعہ کریں۔ اس میں سب سے پہلا مضمون "زکوٰۃ کے چند اصولی احکام" کے عنوان سے ہے۔ وہ اس کا مطالعہ کریں۔ پھر "کرایہ پر چلنے والے مکانات اور سامان پر زکوٰۃ نہیں ہے" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھیں۔ اس کے بعد کوئی الجھن باقی رہے تو مجھے مطلع فرمائیں میرے لئے یہ بہت دشوار ہے کہ جن باتوں کے مفصل جوابات میں شائع کر چکا ہوں۔ بار بار انہیں نقل کر کے لوگوں کو بھیجوں۔ ویسے مختصراً چند باتوں کی طرف انکی توجہ مبذول کرتا ہوں۔

(الف) سب سے بنیادی، جوہری اور اصولی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ اسلام کے چار ارکان میں سے ایک رکن اور عبادت ہے جو اللہ تعالےٰ نے اپنے مومن بندوں پر فرض کی ہے اور اس کے آخری رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ کس قسم کے مالوں پر زکوٰۃ عائد ہوگی اور جن اقسام کے اموال پر زکوٰۃ عاید ہوگی ان میں سے ہر ایک کا نصاب کیا ہوگا اور مقدار

زکوٰۃ کیا ہوگی اور کب وہ زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گی ظاہر ہے کہ رسول خدا کی تشریح میں کوئی ایسی بنیادی چیز نہیں چھوٹ سکتی جو زکوٰۃ کی اسپرٹ کے لحاظ سے ہونی چاہیے تھی، اور آپ نے اسے چھوڑ دیا ہو۔ جن اموال پر زکوٰۃ فرض ہے اور جن پر نہیں ہے اس کی مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی جا سکتی ہیں لیکن اصل بات وہی ہے جو اوپر لکھی گئی ہے۔

(ب) زکوٰۃ کے جو آٹھ مصارف خود اللہ تعالیٰ نے متعین کیے ہیں اور جن کا ذکر سورہ توبہ رکوع ۸ میں موجود ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی وہ اسپرٹ نہیں ہے جو آپ کے رفیق نے سمجھی ہے۔ بہتر ہوگا کہ مصارف زکوٰۃ پر تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مطالعہ کرلیا جائے۔ بے شک زکوٰۃ کا ایک مقصد غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنا ہے لیکن زکوٰۃ کا صرف یہی ایک مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک نمایاں مقصد یہ بھی ہے کہ مسلم سوسائٹی کے مختلف شعبوں اور اسلام کو سربلند کرنے اور سربلند رکھنے کے جو ضروری اخراجات ہیں وہ اس سے پورے ہوتے رہیں۔ چنانچہ مصارف زکوٰۃ میں سے زیادہ تر مصارف ایسے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم مالدار لوگوں تک بھی پہنچتی ہے اور پہنچ سکتی ہے (شریعت کی نظر میں مالدار وہ ہے جو صاحب نصاب ہو)

دیکھیے زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف محکمہ وصولی زکوٰۃ کے کارکنوں کو معاوضہ خدمت ادا کرنا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، اس کا حساب کتاب رکھنے والے، اگر مالدار بھی ہوں تو ان کو ان کے کام کا معاوضہ، زکوٰۃ کی رقم سے دیا جائے گا۔

زکوٰۃ کا ایک مصرف، مؤلفۃ القلوب ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ اگر ایسے لوگ اپنے قبیلے کے رئیس اور سردار بھی ہوں تو ان کو زکوٰۃ کی مد سے مال دیا جائے گا۔ زکوٰۃ کا ایک مصرف غلام آزاد کرنا ہے۔ غلام آزاد کرنا ہو یا اسیران جنگ کا فدیہ دینا ہو اس صورت میں بھی عام طور سے زکوٰۃ کا مال جن لوگوں تک پہنچتا ہے وہ غریب اور محتاج نہیں ہوتے۔ زکوٰۃ کا ایک اور مصرف کسی کے تاوان یا قرض کی ادائیگی ہے۔ اس مصرف میں بھی زکوٰۃ کا مال جن لوگوں تک پہنچتا ہے وہ عام طور سے غریب اور محتاج نہیں ہوتے اور جن لوگوں کی طرف سے زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جاتا ہے ان کا غریب اور محتاج ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ فرض کیجیے زید دو ہزار روپیہ کا مقروض ہے اور اس کے پاس چار سو روپے موجود ہیں وہ اگرچہ خود صاحب نصاب ہے لیکن اپنا قرض ادا کرنے سے معذور ہے۔ اس کا قرض زکوٰۃ کی رقم سے ادا کیا گیا اور جس کو وہ رقم دی گئی وہ بھی مالدار ہے اس صورت میں ان دونوں میں سے کوئی غریب اور محتاج نہیں ہے زکوٰۃ کا ایک اور مصرف مسافر ہے۔ اگر کوئی مالدار شخص ہنگامی طور پر سفر میں ضرورت مند ہو گیا ہو تو زکوٰۃ کا مال اس کو دیا جائے گا اور یہ ضروری نہیں کہ وہ مالدار شخص فقیر یا مسکین ہی ہو گیا ہو۔ وہ صاحب نصاب رہتے

ے بھی مستحق زکوٰۃ ہوسکتا ہے، فرض کیجئے اس کے پاس
رقم بچ رہی ہے وہ ایک نصاب کے برابر تو ہے
ن وہ اتنے میں اپنے وطن نہیں پہونچ سکتا تو اس کو
وٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ زکوٰۃ کا ایک اور مصرف
فی سبیل اللہ" ہے۔ یہ مصرف اپنے اندر بہت وسعت
تا ہے اور اس میں بہت سے حالات میں زکوٰۃ کا
ن ایسے اشخاص تک پہنچتا ہے جو غریب اور محتاج
یں ہوتے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے
ٹھ مصارف میں سے چھ مصارف ایسے ہیں جن میں
یبوں تک زکوٰۃ کا مال پہنچانا مقصود نہیں ہے
ں لئے یہ سمجھنا کہ زکوٰۃ کی اسپرٹ یہ ہے کہ "غریبوں تک
ا دولت پہنچے" صحیح نہیں ہے۔ فقراء اور مساکین،
مصارف زکوٰۃ کا ایک جزء ہیں، کل نہیں ہیں۔

رح ایک مومن کا ایمان اور اس کی عقل یہ کہتی ہے
ہ "حقیقی عدل" کا علم اللہ تعالےٰ کو ہے، کیوں کہ
قیقی انصاف تک پہنچنے کے لئے حقیقی اور ہمہ گیر علم کی
ضرورت ہے جو کسی انسان کے پاس نہیں ہے۔ انسان
ی عقلیں تو اتنی ناقص اور متفاوت ہیں کہ ایک شخص
ی عقل جس چیز کو انصاف قرار دیتی ہے دوسرے
ی عقل اسی چیز کو ظلم سمجھتی ہے۔ اس لئے عدل و ظلم کی
یین کے لئے معیار اللہ تعالےٰ کی بھیجی ہوئی وحی ہے
ہ کہ انسان کی عقل۔

انسان طبعی طور پر موت کو ناپسند کرتا ہے

خط: میں نے آپ کی کتاب "اولیاء اللہ" کا مطالعہ کیا۔ ص ۲۴ پر جو حدیث درج کی ہے اور ترجمہ ۲۵ پر جاکر ختم ہوا ہے اس ترجمہ کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

"مجھے اپنے بندۂ مومن کی روح قبض کرنے میں جو تردد ہوتا ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ہوتا کیوں کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ بندۂ مومن ہوتے ہوئے موت کو ناپسند کرتا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ جب کہ معلوم ہوتا ہے کہ موت برحق ہے اور موت کو برابر یاد کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

جواب: آپ کے سوال کا جواب اختصار کے ساتھ کتاب "اولیاء اللہ" میں ہی موجود ہے۔ میں نے اس حدیث کے ہر ٹکڑے کی تشریح کی ہے، آخری ٹکڑے کی تشریح میں ص ۳۵ پر لکھا ہے۔

"لازمی ہے کہ وہ موت کا مزہ چکھے، خواہ طبعی طور پر موت اسے کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔"

موت کے برحق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر متنفس کو موت کا مزہ ضرور چکھنا ہے جس کو اس دنیا میں زندگی ملی ہے، اس کے لئے موت بھی مقدر ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ (ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) موت کے برحق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ انسان کے لئے

کوئی پسندیدہ اور خوش گوار شے ہے۔ آپ کو موت کے برحق ہونے کا صحیح مطلب ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ خود قرآن میں موت کو مصیبت کہا گیا ہے۔

إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ۔ (المائدہ ۱۰۶)

اگر تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت پیش آجائے۔

موت چوں کہ ایک بڑا تکلیف دہ مرحلہ ہے اس لئے طبعاً ہر انسان اسے ناپسند کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کانٹے کی چبھن اور چاقو کی دھار ہر ایک کو تکلیف پہنچاتی ہے اور کوئی اس کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن مومن اور کافر میں فرق یہ ہے کہ مومن کو جب اپنے اجر آخرت اور وہاں کی زندگی کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے تو موت اس کی سب سے محبوب شے بن جاتی ہے۔ حدیث میں جو کہا گیا ہے کہ "وہ موت کو ناپسند کرتا ہے" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ طبعاً موت کو ناپسند کرتا ہے۔ حسن اتفاق سے ایک صحیح حدیث میں اس کی توضیح موجود ہے۔

'ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی موت کو اور اللہ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے تو اللہ بھی اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو کوئی موت کو اور اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا، یا رسول اللہ ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ حضور نے جواب میں فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مومن کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کو رضائے الٰہی اور اس عزت و فضیلت کی خوش خبری سنائی جاتی ہے جو اللہ کے پاس اس کے لئے ہے تو اس وقت مومن کو اس سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں رہتی جو اس کے آگے آنے والی ہے وہ اللہ سے ملاقات کا مشتاق ہو جاتا ہے اور اللہ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جب کافر کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کو اللہ کے عذاب کی خبر دی جاتی ہے، اس وقت کافر کو اس سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں ہوتی جو اس کے آگے آنے والی ہے۔

(مشکوۃ کتاب الجنائز)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحت و قوت کی حالت میں طبعی طور پر موت کو ناپسند کرنا مومن کی شان اور اس کے ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ موت کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کوئی بہت محبوب چیز ہے جس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن پر غفلت طاری نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ موت کو بھول کر اللہ کی نافرمانی کرنے لگے۔

شوہر اپنی مردہ بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے

خط : یہاں جب کبھی کسی سہاگن کا انتقال ہوتا ہے تو قبر میں اتارنے کے بعد بھی اس کے شوہر سے پردہ کرایا جاتا ہے۔ وہ اس کا چہرا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے، کیا شریعت کا یہی حکم ہے ؟ یا یہاں کے مقامی لوگوں نے من گھڑت طریقہ رائج کر رکھا ہے !۔

براہ کرم اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

جواب : بیوی کے انتقال کے بعد اس کے شوہر کے لئے اس کو غسل دینا یا اس کے کھلے ہوئے جسم کو ہاتھ لگانا فقہ حنفی میں جائز نہیں ہے لیکن وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ کفن میں لپٹے ہوئے جسم کو پلنگ پر رکھ سکتا ہے۔ اور خود قبر میں اس کو اتار سکتا ہے۔

مرنے کے بعد شوہر سے بیوی کا پردہ کرا دینا یہاں تک کہ قبر میں اتارنے کے بعد بھی اس سے پردہ کرانا من گھڑت چیز ہے۔ شریعت نے یہ سختی نہیں برتی ہے

مہوا کی تجارت جائز ہے

خط : مہوا کی تجارت جائز ہے یا ناجائز ؟ ہمارے یہاں مہوا کے درخت ہوتے ہیں جن کے پھول گرتے ہیں۔ دیہاتی لوگ اس کو چن کر لاتے اور خشک کر کے بیچتے ہیں، پھر یہ خشک مہوے سال بھر کرانہ کی دکانوں میں بکتے رہتے ہیں۔ عام طور پر غیر بیسنے والے اس سے ہاتھ بھٹی کے ذریعے چوری چھپے شراب کشید کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ قابل دست اندازی پولیس جرم ہے اس لئے ایک مسلمان کے لئے مہوا کی تجارت جائز ہے یا ناجائز ؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مہوا بیچنا درست نہیں ہے چوں کہ سب جانتے ہیں کہ اس سے شراب کشید کی جاتی ہے پھر ایسے مشہور مقصد کے لئے استعمال ہونے والی چیز کی خرید و فروخت کیسے جائز ہو سکتی ہے، مگر ایک صاحب کہتے ہیں کہ مہوا بیچنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چوں کہ انگور کی تجارت جائز ہے۔ حالاں کہ انگور سے بھی شراب کشید کی جاتی ہے۔ جب انگور کی تجارت جائز ہے تو مہوا کی تجارت کے ناجائز ہونے کی وجہ کیا ہے ؟

جواب : مہوا (یا موہا) کی تجارت شرعاً جائز ہے۔ شریعت نے جائز اور حلال چیزوں کی خرید و فروخت کو محض اس وجہ سے کہ لوگ اس سے کوئی ناجائز چیز بنا لیں گے، ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ جو لوگ مہوے یا موہے کی تجارت کو انگور پر قیاس کرتے ہیں انہیں کا قیاس صحیح ہے۔ انگور سے شراب کشید کرنے کا کام عہد قدیم سے اب تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے صوبہ بہار میں ادیباسی قبیلہ عام طور سے، چاول سے شراب کشید کر کے پیتا ہے۔ اس بنا پر کسی ادیباسی سے چاول فروخت کرنا ناجائز نہیں ہو سکتا۔ فقہ کی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر انگور سے نچوڑا ہوا رس، کسی ایسے شخص سے فروخت کیا جائے جو اس سے شراب بناتا ہے تو یہ بیع بھی جائز

ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ولا بأس بیع العصیر ممن یتخذ ماخمرا۔

(فتاوی عالمگیریہ ج ۳ ص ۱۱۶)

انگور کا رس، اس شخص سے فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جو اس کو شراب بنا لیتا ہے

نکاح سے متعلق دو سوالات

خط: مہربانی کر کے مندرجہ ذیل دو سوالات کے جواب سے بذریعہ خط جلد آگاہ فرمایئے اور زندگی میں بھی شایع فرما دیجئے۔

(۱) کریم اور رحیم دو سگے بھائی ہیں، کریم سے ایک لڑکی زینب ہے اور رحیم سے ایک لڑکا سعید ہے، زینب سے ایک لڑکی عابدہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سعید اور عابدہ کا نکاح ہوسکتا ہے جب کہ یہ دونوں ماموں بھانجی ہیں۔

(۲) زید کی مرحومہ بیوی سے ایک لڑکا اسلم ہے اور سلمہ کے مرحوم شوہر سے ایک لڑکی نور جہاں ہے۔ ایک مدت کے بعد زید سلمہ سے شادی کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اسلم کا نکاح نور جہاں سے ہوسکتا ہے۔ اگر ہوسکتا ہے تو کیسے؟ وضاحت کیجئے اور نہیں ہوسکتا ہے تو کیوں؟ وضاحت کیجئے۔

جواب: (۱) سعید کا نکاح عابدہ سے ہوسکتا ہے، کیوں کہ عابدہ، سعید کی چچازاد بہن کی لڑکی ہے، نہ زینب سعید کے محرمات میں داخل ہے اور نہ اس کی لڑکی۔ سگے ماموں اور سگی بھانجی کے درمیان نکاح حرام ہے سعید اور عابدہ سگے ماموں بھانجی نہیں ہیں اس لئے دونوں کے درمیان نکاح جائز ہے۔

(۲) اسلم کا نکاح نور جہاں سے ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلم اور نور جہاں کے درمیان حرمت کا کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ نور جہاں، اسلم کی بہن نہیں ہے، نہ سگی، نہ سوتیلی، نہ ماں جائی نہ دودھ شریک، اس لئے ان دونوں کے درمیان نکاح ناجائز ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ جن بہنوں سے شرعاً نکاح حرام ہے ان کی یہی چار قسمیں ہیں۔ نور جہاں ان چار قسموں میں سے کسی قسم میں داخل نہیں ہے محض بول چال میں کسی کو بہن کہنے سے اس سے نکاح حرام نہیں ہوتا۔

باسمہ سبحانہ

روداد سالانہ اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ

جماعت اسلامی ہند بنگلور، جون ۱۹۷۴ء

الحمد للہ کہ مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجلاس محلہ لال باغ بنگلور میں زیر صدارت مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی ۱۳؍ جون صبح ۸ بجے سے شروع ہو کر ۲۲؍ جون کی رات میں بخیر و خوبی ختم ہوا۔ ریزرویشن نہ ہو سکنے کے باعث بیشتر ارکانِ شوریٰ ۱۲؍ جون کی شب میں تاخیر سے بنگلور پہنچے اس لیے حسب اعلان اجلاس ۱۲؍ جون کی سہ پہر کے بجائے ۱۳؍ جون کی صبح سے شروع ہو سکا۔ محترم امیر جماعت اپنی علالت کی وجہ سے ۱۴؍ جون سہ پہر کی نشست سے شریک اجلاس ہوئے۔ اجلاس ۱۵؍ جون تک تو مسلسل چلتا رہا اس کے بعد ۱۶؍ جون سے ۲۲؍ جون کے دوران بھی کسی دن مختصر نشستیں ہوئیں۔

اجلاس کا آغاز مولانا سید احمد عروج قادری صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

مولانا صدر الدین صاحب صدر مجلس نے حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔

رفقائے محترم!

مجلس شوریٰ کے سالانہ اجلاس کا آغاز ہو رہا ہے اس کے بعد انشاء اللہ خصوصی اجلاس ہوگا اس موقع پہ افسوس ہو رہا ہے کہ محترم امیر جماعت اسلامی ہند اپنی علالت کی وجہ سے اس نشست میں شرکت نہ فرما سکے۔ توقع ہے انشاء اللہ وہ کل تشریف لا سکیں گے بعض ارکان شوریٰ بھی اپنی معذوریوں کی وجہ سے آج نہیں پہنچ سکے ہیں امید ہے وہ حضرات بھی جلد شریک ہو جائیں گے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالےٰ ان حضرات کی معذوریاں دور فرمائے تاکہ وہ شریک اجلاس ہو سکیں۔

ہمارے ایک رفیق رجناب عبدالرزاق لطیفی صاحب ایک نہایت موذی مرض میں مبتلا

تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور اب وہ صحت یاب ہوکر اس اجلاس میں شریک ہیں۔ اس پر ہم سب کو بے حد مسرت ہے۔ ان کی مکمل صحت کے لئے آپ سب حضرات دعا فرمائیں۔

محترم رفقاء! ہمیں مختلف اہم مسائل پر غور اور فیصلہ کرنا ہے۔ وقت بہت محدود ہے۔ اس لئے ہمیں اس بات کا پورا لحاظ رکھنا ہے کہ ہماری گفتگو مختصر، جامع اور موضوع سے متعلق ہو تاکہ اس محدود وقت میں زیادہ سے زیادہ کام ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم کو اخلاص اور پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس سلسلے میں ہم پر عائد ہوتا ہے۔ آمین

سابقہ روداد کی خواندگی

صدر مجلس کے افتتاحی کلمات کے بعد اوقات کی تعیین کی گئی اور ایجنڈے کے مطابق مرکزی مجلس شوریٰ کے سالانہ اجلاس مئی سنہ ۱۹۸۲ء کی روداد کی خواندگی ہوئی، ارکان مجلس نے بعض امور کی طرف توجہ دلائی اور پھر رجسٹر پر دستخط ثبت کئے۔

جماعت کی سالانہ رپورٹ

[illegible] فراغت کے بعد جماعت اسلامی ہند کی سالانہ رپورٹ (اپریل سنہ ۸۲ء تا مارچ سنہ ۸۳ء) پیش کی گئی جس میں واضح کیا گیا تھا کہ مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلوں پر کس طرح عمل درآمد ہوا، اور پوری جماعت نے دوران سال موجودہ پروگرام کے تحت کیا کام انجام دیا اور کارگزاری کی رفتار کیا رہی۔

آمد و خرچ کی رپورٹ معہ رپورٹ آڈیٹر

اس کے بعد سال گذشتہ (اپریل سنہ ۸۲ء تا مارچ سنہ ۸۳ء) کے بجٹ کی روشنی میں مرکزی بیت المال کی آمد و صرف کی رپورٹ معہ رپورٹ آڈیٹر پیش کی گئی اور توضیح طلب باتوں کی وضاحت کی گئی، جس کے بعد مجلس نے اس کی توثیق کی۔

آل انڈیا اجتماع

بعض ارکان مجلس نے بڑھتی ہوئی گرانی اور متوسلین جماعت کی معاشی حالت کے پیش نظر اس کے انعقاد کو کچھ دنوں ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد مجلس نے طے کیا کہ:

★ حسب فیصلہ آل انڈیا اجتماع نومبر سنہ ۸۳ء ہی میں ہونا چاہیے اور دہلی ہی میں ہونا چاہیے۔

★ اجتماع کی تاریخیں ۸، ۹، ۱۰ نومبر سنہ ۸۳ء (بروز جمعہ، سنیچر، اتوار) مناسب ہوں گی۔

★ اجتماع کا پروگرام تجویز کرنے کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے۔

(۱) جناب محمد مسلم صاحب مدیر دعوت
(۲) جناب محمد نجات اللہ صدیقی صاحب علی گڑھ
(۳) مولانا سید حامد علی صاحب مرکز

(۴) سید حامد حسین صاحب مرکز (کنوینر)

* ارکان کے اجتماع کا تفصیلی پروگرام بھی یہی کمیٹی تجویز کرے گی۔

* جماعت کے کاموں اور سرگرمیوں نیز اب تک جماعت جو کچھ کرتی رہی ہے اس کا تعارف کرانے کے لئے ایک کتابچہ شائع کرنے کا مشورہ بھی سامنے آیا۔

طلبہ کا آل انڈیا فیڈریشن

طلبہ کا آل انڈیا فیڈریشن بنانے کا مسئلہ بھی زیر غور آیا۔ ایک متعین تجویز بھی سامنے آئی طے ہوا کہ :۔

مجوزہ آل انڈیا اسلامک ایسوسی ایشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشنز (ALL INDIA ISLAMIC ASSOCIATION OF STUDENTS ORGANISATIONS) کی تشکیل مناسب نہیں ہے۔

تصنیفی تربیت پانے والے طلبہ کے وظائف

جدید تعلیم یافتہ اور عربی مدارس سے فارغ تصنیفی تربیت پانے والے طلبہ کے وظائف میں جو تفاوت تھا اس کے مختلف پہلوؤں پر غور ہوا اور طے ہوا کہ :

تصنیفی تربیت پانے والے تمام طلبہ کو بلا تخصیص -/200 ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔

مکان کی خریداری

مکان نمبر 2525 بارہ دری شیر افگن کی جماعت کے ضرورت اور اس کی خریداری کے سلسلے میں گفتگو ہوئی اور طے ہوا کہ یہ مکان -/50,000 روپئے میں خرید لیا جائے۔

بجٹ

اپریل ۸۰ء تا مارچ ۸۱ء کا مجوزہ بجٹ پیش کیا گیا جسے مناسب ترمیم و اضافہ کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اس میں -/35,600 کا خسارہ تھا۔ اس خسارہ میں -/50,000 کی وہ رقم شامل نہیں ہے جو مکان کی خریداری میں صرف ہوگی۔ یہ خسارہ قرض لے کر اور رفقاء کی اعانتوں سے پورا کیا جاسکے گا۔

مرکزی بیت المال کی سقیم حالت اور مرکز پر دن بدن بڑھتے ہوئے قرض پر ارکان مجلس نے تشویش کا اظہار کیا اور توقع ظاہر کی گئی کہ رفقاء خصوصی اعانتوں کا اہتمام کرکے نہ صرف خسارہ پورا کرنے کی کوشش کریں گے بلکہ سابقہ قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ہاتھ بٹائیں گے۔

دیگر امور

ان کے علاوہ تنظیمی حلقوں سے متعلق اور بعض دوسرے تنظیمی مسائل زیر غور آئے اور ان پر مناسب فیصلے کئے گئے۔

شرکائے اجلاس

مندرجہ ذیل ارکان شوریٰ شریک اجلاس ہوئے:

(۱) جناب ٹی۔ کے۔ عبداللہ صاحب مولوی (کیرلہ)
(۲) جناب محمد سراج الحسن صاحب (کرناٹک)
(۳) جناب عبدالعزیز صاحب (ٹمل ناڈو)
(۴) جناب محمد عبدالرزاق لطیفی صاحب (آندھرا)
(۵) جناب شمس پیرزادہ صاحب (مہاراشٹر)
(۶) جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب (مدھیہ پردیش)
(۷) جناب محمد شفیع مونس صاحب (یو۔پی)
(۸) جناب محمد عبدالفتاح صاحب (مغربی بنگال)
(۹) مولانا سید احمد عروج قادری صاحب (زندگی)
(۱۰) جناب محمد مسلم صاحب (دعوت)
(۱۱) جناب محمد یوسف صدیقی صاحب (ریڈینس)
(۱۲) جناب محمد عبدالحیٔ صاحب (رامپور)
(۱۳) مولانا صدرالدین صاحب (ادارۂ تصنیف)
(۱۴) جناب فضل الرحمٰن فریدی صاحب (علی گڑھ)
(۱۵) جناب محمد نجات اللہ صدیقی صاحب (علی گڑھ)
(۱۶) جناب حامد حسین صاحب (مرکز)
(۱۷) افضل حسین قیم جماعت

جناب مولانا ابواللیث صاحب ندوی اپنی بچیوں کے رشتوں کے سلسلے میں مصروفیت اور مولانا سید حامد علی صاحب اپنی شدید علالت کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

۲۲ر جون کی نصف شب کے قریب دعا پر یہ اجلاس برخاست ہوا *

والسلام ـــــ افضل حسین

(بقیہ " تنقید و تبصرہ")

وہ ضخیم کتابوں کے مطالعہ کی فرصت نہیں پاتے اس لیے ضروری ہے کہ مختصر مضامین اور مختصر کتابوں کے ذریعہ ان تک دین کا پیغام پہنچایا جائے۔ اسی محرک کے تحت انہوں نے یہ مختصر پمفلٹ شائع کیا ہے۔

(۱) مذہب انسان کے لیے اہم ہے؟ (۲) اسلام اور آزادخیالی (۳) اسلام زندہ ہوتا ہے .....! اس پمفلٹ میں یہ تین مقالے ہیں۔ اور مترجم کا مقدمہ بھی ہے۔ مقالات کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں، ہر پڑھنے والے کو اس سے فائدہ ہوگا۔

ترجمے کی زبان اور بہتر ہونی چاہیے تھی۔ آیات قرآنی کی کتابت میں بھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اگر اس پر قابو پانا مشکل تھا تو صرف آیات کے ترجمے شائع کرنا بہتر تھا۔

امید ہے کہ لوگ اس پمفلٹ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

تنقید و تبصرہ

مسلمان اور سیکولر ہندوستان

ڈاکٹر مشیر الحق — صفحات ۱۰۰

کاغذ، طباعت، کتابت اعلیٰ، مجلد دیدہ زیب ٹائیٹل، قیمت ۹/۵۰

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ہندوستان کی سکولر ریاست میں، ہندوستانی مسلمانوں کا روشن مستقبل کس چیز پر موقوف ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اس کا جواب مسلمان اہل علم اور غیر مسلم دانشور دونوں ہی کی طرف سے دیا گیا ہے اور آئندہ بھی دیا جائے گا۔ بہت سے مسلم و غیر مسلم دانشوروں کی طرف سے مخلصانہ اور خیر خواہانہ یہ بات کہی گئی ہے اور کہی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کا روشن مستقبل اس پر موقوف ہے کہ وہ سیکولرزم کو دل سے قبول کریں، اپنے آپ کو قومی دھارے سے الگ نہ رکھیں اور اپنے آپ کو سیکولر ریاست کے چوکھٹے میں پوری طرح فٹ کرلیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ سیکولرزم اور قومی دھارا ہے کیا چیز؟ تو اس کا جواب کوئی ایک نہیں ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی موضوع سے متعلق ہے، کتاب حسب ذیل چھ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) مذہب، سیکولرزم اور سیکولر ریاست (۲) دینی تعلیم (۳) مذہبی رہنمائی: ماضی کا ورثہ (۴) قانون اور شریعت (۵) مبہم سیکولرزم (۶) خلاصۂ بحث۔ کتاب کے آغاز میں مصنف کا پیش لفظ اور دیباچہ ہے آخر میں تین ضمیمے اور ماخذ کتاب کی فہرست ہے۔ اس مختصر کتاب کے لئے ماخذ کی لمبی فہرست دی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب بہت کچھ پڑھ کر مرتب کی ہے اور انہیں خاصہ وقت لگانا پڑا ہے۔ پہلے باب میں "مذہب، سیکولرزم اور سیکولر ریاست اور ان کے درمیان باہمی تعلق پر مختلف طبقوں اور حلقوں کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں مسلمانوں کی دینی تعلیم، عربی مدارس، نصاب تعلیم، "طریقہ درس وتدریس"، ان سے فارغ ہوکر نکلنے والے علماء اور ان مدارس کے اثرات نیز اس طرح کی دوسری باتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یوپی و بہار کے عربی مدارس اور ان میں تعلیم پانے والے طلبہ کے اعداد و شمار اور کالا تو بحث کے جدول بھی دیئے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں تفصیل سے یہ بحث کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کس طرح دینی معاملات میں علماء کی دینی رہنمائی پر اعتماد

کرتے رہے ہیں، مفتیوں کے فتووں کا کیا انداز رہا ہے۔ استفتار کی عبارت کیا ہوتی ہے اور جواب میں فقہ کی کتابوں سے کس طرح استفادہ کیا جاتا ہے۔ چوتھے باب میں قانون اور شریعت پر گفتگو کی گئی ہے اور پانچویں باب میں ان مشکلات کی نشاندہی کی گئی ہے جو سیکولرزم کا کوئی واضح اور متعین تصور پیش نہ کرنے اور ذمہ داران حکومت اس کا جو تصور پیش کرتے ہیں اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے پیش آرہی ہیں، اور چھٹے باب میں ان تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں یہ تین ضمیمے ہیں (۱) مسلم پرسنل لا (قانونی اطلاق شریعت (۱۹۳۷ء) کا خلاصہ (۲) قانون تنسیخ نکاح (۱۹۳۹ء) کا خلاصہ (۳) خصوصی قانون نکاح ۱۹۵۴ء (اسپیشل میرج ایکٹ) کا خلاصہ۔

اس طرح اس مختصر کتاب میں مسلمان اور سیکولر ہندوستان کو جاننے اور سمجھنے کی بہت سی چیزیں جمع کر دی گئی ہیں، طرز تحریر سنجیدہ، زبان سلیس اور انداز بیان واضح ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر سید عابد حسین جامعہ ملیہ کے نام معنون کی گئی ہے۔ فاضل مصنف صرف ان کے خیالات ہی سے نہیں بلکہ ان کے طرز تحریر سے بھی کافی متاثر ہیں۔ اس کتاب کے متعدد مقالے "اسلام اور عصر جدید" میں شایع ہو چکے ہیں۔ فاضل مصنف نے پیش لفظ میں اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے مسائل کا پوری غیر جانب داری کے ساتھ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طرف سے خود کوئی نتیجہ نکالنے سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے لیکن خود ہی اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ:

"مکمل غیر جانبدارانہ معروضیت تو صرف کمپیوٹر کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔"

یہ اعتراف ان کی انصاف پسندی کی دلیل ہے کیونکہ متعدد مقامات پر ان کا اپنا خیال و رجحان بھی ظاہر ہو گیا ہے۔

مسلم پرسنل لا میں اصلاحات کے سوال پر فاضل مصنف کے نزدیک مسلمانوں کی قیادت تین طبقوں میں بٹی ہوئی ہے (۱) اساس پسند (۲) معتدل تجدد پسند (۳) انتہا پسند متجددین۔ اول الذکر سے مراد ان کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو مسلم پرسنل لا کو مذہب کا ایک جز سمجھتے ہیں اس لئے کسی قسم کے رد و بدل کے قائل نہیں ہیں، ان لوگوں کے کہنے کے مطابق غیروں کے ہاتھوں مسلم پرسنل لا میں رد و بدل کا دوسرا نام تنسیخ شریعت ہے (ص ۱۰۷) معتدل تجدد پسندوں سے ان کی مراد وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان ہیں جو اصلاحات کے حق میں تو ہیں لیکن اصلاحات کو حکومت کی طرف سے جبراً نافذ کرنے کے خلاف ہیں، ان کا خیال ہے کہ مسلم عوام کے ذہن میں اصلاح کی اہمیت کو آہستہ آہستہ بٹھایا جائے اور انہیں اس پر تیار کیا جائے کہ خود اصلاح کا مطالبہ کرنے لگیں (۱۰۸)۔ انتہا پسند متجددین سے مراد وہ مسلم و غیر مسلم دانشور ہیں جو مسلم پرسنل لا میں فوری تبدیلی کے خواہاں ہیں خواہ یہ تبدیلی عام مسلمانوں کے علی الرغم قانون کے ذریعے ہی کیوں نہ حاصل ہو (۱۱۲) مصنف نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے، صرف طریقہ کار میں فرق ہے۔ مصنف نے اپنے آپ کو صراحۃً کسی گروہ میں شامل نہیں کیا

ہے لیکن ان کا کھلا ہوا رجحان اعتدال پسندوں کی طرف ہے۔ وہ آصف فیضی کو "اسلامی قانون کا مشہور محقق" اور اعتدال پسند سمجھتے ہیں، اگر ہم اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیانی فرق کو اپنے الفاظ میں واضح کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ انتہا پسند ایک ہی وار میں مسلم پرسنل لا کا سر قلم کر دینا چاہتے ہیں اور اعتدال پسند اسے زہر کی تھوڑی تھوڑی مقدار کھلا کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں ــــ مصنف کی اعتدال پسندی کا حال یہ ہے کہ وہ اس سے خوش نہیں ہیں کہ علماء اجتہاد کو صرف اپنا حق سمجھیں (۱۰۲)، اس سے آگے بڑھ کر وہ اس سے بھی خوش نہیں ہیں کہ قرآن وحدیث کے منصوص احکام اور اجماعی مسائل میں اجتہاد نہ کرنے کی شرط لگائی جائے (۱۴۰)، گویا ان کے نزدیک قرآن اور حدیث اور اجماع سے ثابت شدہ مسائل میں بھی اجتہاد ہونا چاہیے اور اجتہاد کا حق علماء کے ساتھ مخصوص نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ حق جدید تعلیم یافتہ افراد کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اسلامی شریعت کی جو مرمت ہوگی اس کا تصور ہر صاحب علم کر سکتا ہے ــــ ڈاکٹر سید عابد حسین اور اس طرح کے دوسرے اعتدال پسندوں کی طرح فاضل مصنف نے بھی علماء کو دو باتوں سے ڈرایا ہے ایک یہ کہ اگر علماء نے مسلم پرسنل لا میں خود اصلاح نہ کی (اور اصلاح کا دائرہ وہ ہے جس کی نشاندہی یہ اعتدال پسند حضرات کرتے ہیں) تو حکومت مسلم پرسنل لا کو بدل کر رکھ دے گی۔ یہ ڈراوا ایسا ہے جیسے کوئی کسی سے کہے کہ اگر تم خودکشی نہ کرو گے تو کوئی دوسرا تمہیں قتل کر دے گا۔ لہٰذا مناسب اور معقول بات یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو خود ہی مار ڈالو۔ دوسری بات جس سے مصنف نے علماء کو ڈرایا ہے یہ ہے کہ اگر آپ نے کاٹ چھانٹ کر شریعت کو جدید زمانے کے چوکھٹے میں فٹ نہیں کیا تو نئی نسل آپ کی دینی قیادت سے انکار کر دے گی۔ گویا علماء کو اپنی دینی قیادت باقی رکھنے کے لئے خود دین میں کتر بیونت کر دینا چاہیے۔

تبصرہ نگار کو مصنف سے کوئی شکایت نہیں ہے اس لیے کہ دین کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کے مطابق ان کے مشورے مخلصانہ ہی کہے جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہی وہ خیالات اور مشورے ہیں جن سے کسی شخص کو موجودہ ہندوستان میں عیش و آرام کے وسائل اور اونچے مناصب حاصل ہو سکتے ہیں۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں فقہ، فتویٰ اور سیکولرزم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، نیز ان کی تحریروں میں جو تضاد بیانی ہے اگر ان سب پر مفصل تبصرہ کیا جائے تو اتنی ہی ضخامت کی ایک دوسری کتاب تیار ہو سکتی ہے، ہم اس وقت کوئی کتاب تیار نہیں کر رہے ہیں، اس لیے صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کر کے ہم یہ تبصرہ ختم کر دینا چاہتے ہیں ــــ ایک یہ کہ مصنف کا خیال ہے سیکولرزم چونکہ دوسری زبان کا لفظ ہے اس لیے اردو میں اس کے غلط ترجمے کی وجہ سے بھی مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر سید عابد حسین

کے حوالے سے اس کا صحیح ترجمہ پیش کیا ہے۔

"ہم اردو میں سیکولر کا ترجمہ لادینی، غیر مذہبی یا لامذہبی کرتے ہیں اور یہ سب الفاظ مذہب کی مخالفت یا اس سے بے پروائی پر دلالت کرتے ہیں، حالانکہ سیکولر کے معنی ہیں اس دنیا کی یا دنیوی اور یہ دینی کا نقیض نہیں بلکہ آخروی کا نقیض ہے اس دنیا کی چیزیں لازمی طور پر دین کی مخالف یا اس سے بے تعلق نہیں ہوتیں۔" (۴۳)

ڈاکٹر صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر سیکولر کا ترجمہ "دنیوی" کیا جائے تو یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہوگی کہ سیکولرزم دین و مذہب کے خلاف کوئی چیز ہے، سوال یہ ہے کہ جو لوگ دین و مذہب کو دنیا اور آخرت یا دنیوی و اخروی معاملات و امور کا جامع سمجھتے ہیں ان کے نزدیک جو چیز "اخروی" کی نقیض ہوگی کیا وہ دین کی نقیض نہ ہوگی؟ کیا "اخروی" دین سے خارج ہے؟ اور جو لوگ دین و مذہب کو صرف آخرت سے متعلق سمجھتے ہیں ان کے نزدیک جو چیز اخروی کی نقیض ہوگی اسے تو بدرجۂ اولیٰ دین کی نقیض ہونا چاہیے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سیکولر کا ترجمہ "دنیوی" کیا جائے تو کس طرح ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہوگی جو سیکولرزم کو دین کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس سے بھی واقف ہوں گے کہ دنیا کی صرف وہی چیزیں دین کی مخالف اور اس سے بے تعلق نہیں ہوتیں جن کا رشتہ دین سے جڑا ہوا ہو اور جو دینی احکام کے ماتحت ہوں ان کے علاوہ وہ تمام چیزیں جن کا رشتہ دین سے کٹا ہوا ہو اور جو دینی احکام کے ماتحت نہ ہوں وہ سب دین کے خلاف ہوتی ہیں۔ مخلص مسلمان کے نزدیک جو چیز اخروی کی نقیض ہوگی وہ اس کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا اصل مطمح نظر تو آخرت ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیکولر کا ترجمہ لادینی کیا جائے یا دنیوی ان دونوں میں میں کوئی معنوی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف نے استحسان کی تعریف "مفادِ عامہ" سے کی ہے (۹۵) یہ صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے اصول فقہ کی کسی کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا ہے۔ استحسان بھی قیاس شرعی ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ ایک اصولی بحث ہے جو اس مختصر تبصرے میں نہیں کی جا سکتی۔

یہ کتاب بحیثیت مجموعی اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

مذہب افیم ہے؟

ترجمہ شبیر احمد قادر آبادی

صفحات ۶۴ قیمت ۲۰/۱

ناشر: اسلامک بک ہاؤس، مسجد پٹھان۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱۔

سید قطب شہید کے بھائی محمد قطب کی عربی کتاب "شبہات حول الاسلام" ایک مقبول و مشہور کتاب ہے۔ زیرِ تبصرہ پمفلٹ اسی کتاب کے تین مقالوں کا اردو ترجمہ ہے جو جناب شبیر احمد قادر آبادی نے کیا ہے۔ آغاز میں اس کتاب کے ناشر جناب رحمت علی صاحب نے "میری بات" کے عنوان سے اس پمفلٹ کی اشاعت کا سبب بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لوگوں کے پاس وقت کم ہے اس لیے

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

آزادی کی ۲۷ ویں سالگرہ کے موقع پر

حکومت اتر پردیش کا عہد

عوام کی خدمت کے لیے ایک صحت مند، چاق و چوبند اور مستعد نظم و نسق یرپردیش کو سماجی اور معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ بناکر ریاست کے ساتھ وابستہ لفظ "پسماندہ" کو مٹا دینا۔

اس سمت میں حکومت کے کچھ ٹھوس قدم

- قانون دفاع ہند اور دیگر قوانین کے تحت ۴۴ ضلعوں میں ۳۴۴۳ چھاپے مارے گئے۔ ریاست بھر میں اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے ۹۰ چوکیاں قایم کی گئیں۔
- محکمہ پولیس تیسرے اور چوتھے درجہ کی سرکاری ملازمتوں میں ہریجنوں اور اقوام مندرجہ فہرست کے لیے ۵۰ فیصد آسامیاں محفوظ۔
- ہریجنوں پر ظلم و تشدد کے معاملہ میں اب پولیس اور سول حکام سے جواب طلب کیے جانے کا بندوبست۔
- ایک ہمہ وقتی ڈپٹی انسپکٹر جنرل (برائے تحفظ ہریجن) کی تقرری۔
- ۵۴ لاکھ سے زیادہ کھیت مزدوروں کی کم سے کم یومیہ اجرت میں ایک روپیہ ۲۰ پیسہ کا اضافہ۔
- شکر ملوں کے ۹۰ ہزار مزدوروں کے مہنگائی بھتہ میں ۳۲ روپیہ ماہوار تک کا اضافہ۔
- چوتھے پنجسالہ منصوبہ کے اختتام پر ریاستی وسائل سے آبپاشی کی مجموعی صلاحیت ۵۶ لاکھ ہیکٹر ہو گئی۔
- چھوٹی آبپاشی اسکیموں کے تحت سنہ ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران ۱۳۰۰ ریاستی ٹیوب ویل، ۵۰۰۰ نجی ٹیوب ویل اور ۱۹۰۰ پمپنگ سیٹ لگانے کی تجویز۔
- پانچویں پنجسالہ منصوبہ میں ہینڈلوم صنعت کی ترقی کے لیے ۷،۵۰ کروڑ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے جس سے امدادِ باہمی کا ہینڈلوم کپڑے کی پیداوار ۸ کروڑ میٹر سے بڑھ کر ۲۸ کروڑ میٹر ہو جائے گی۔
- ریاست میں سوت کی کمی کو دور کرنے کے لیے ۳۰ کتائی ملیں قایم کرنے کی تجویز۔ جن میں سے آٹھ ملوں کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔
- دیہی علاقوں میں روزگار کے تیز رفتار پروگرام کے تحت گذشتہ مالیاتی سال میں ۴۶۹۲ کیلومیٹر لمبی سڑکوں اور ۱۰۴۱ پلیوں کی تعمیر

یہ ہیں ہماری ہر دل عزیز سرکار کے بعض ٹھوس قدم



ماہنامہ

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ممالک غیر سے دو ڈالر ہوائی ڈاک سے	# زندگی رام پور (مدیر: سید احمد قادری)	ہندوستان سے -/12 پاکستان سے -/12 ششماہی ہندوستان سے -/6 پاکستان سے -/6 قیمت فی پرچہ 1/20

جلد ۵۳	رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۴ء	شمارہ: ۴

اشارات — سید احمد قادری — ۲

مطالعۂ قرآن

روزے کا اثر انسان کی صلاحیت کار پر — مولانا امین احسن اصلاحی — ۵

مقالات

کیا اسلام ہندوستان کی قیادت کر سکتا ہے — جناب اشتیاق حسین ایم اے — ۹

نفقۂ اولاد — مولانا جلال الدین عمری — ۱۹

رویت ہلال — مولانا عبدالوہاب رام پوری — ۲۶

سوامی وویکانند — مولانا فارقلیط — ۳۴

مین طالم کے ہر فیصلہ — ماخوذ — ۳۶

یو کے اسلامک مشن — " — ۴۱

تراجم و اقتباسات

مصنوعی اور حقیقی دین کا فرق — ڈاکٹر احمد امین — ۴۶

رسائل و مسائل — ع ق — ۴۹

تنقید و تبصرہ — ع ق — ۵۲

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔ منیجر "زندگی" رام پور

مالک سید حامد شاہ دلی ملا اڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس رام پور یوپی۔ مقام اشاعت دفتر زندگی رام پور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

زندگی کا یہ شمارہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں قارئین زندگی کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ یہ پورا مہینہ تزکیہ تربیت اور عبادت کا مہینہ ہے۔ بالخصوص اس کا آخری عشرہ عبادات میں مزید سرگرمی و انہماک کا عشرہ ہوتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی والہانہ عبادت و اطاعت میں مشغول رہتے تھے اور اس مبارک مہینے میں آپ کے ذوق بندگی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر اس کے آخری دنوں میں گزشتہ بیس دنوں سے بھی زیادہ سرگرم ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت تھی جس کے اظہار کے لیے حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کے لیے اپنی کمر کس لیتے تھے۔ رات کے بیشتر حصہ میں خود بیدار رہتے اور عبادت کے لیے اپنے اہل و عیال کو بھی جگاتے تھے۔

(بخاری و مسلم)

ہم اس وقت خصوصیت سے جماعت اسلامی ہند کے ارکان کو اپنا مخاطب بنا رہے ہیں۔ امید یہی ہے کہ ہمارے رفقاء نیکیوں کی اس فصل بہار سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہوں گے۔ ان کے دن روزوں سے معمور اور ان کی راتیں فرائض و واجبات کے علاوہ تراویح و تہجد کی نمازوں سے پُرنور ہوں گی۔ اسی کے ساتھ وہ ہر پہلو سے اپنا جائزہ بھی لے رہے ہوں گے۔ کیونکہ صحیح ترین جائزہ وہی ہوتا اور ہو سکتا ہے جو ہر شخص اپنے بارے میں خود لیتا ہے۔ دوسرے لوگ صرف ہمارے ظاہر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہمارا باطن سب سے پہلے ہمارے خالق کے سامنے ہے اور پھر خود ہمارے سامنے —— دوسرے لوگ ہمارے باطن ہمارے محرکات عمل اور ہماری نیتوں کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ وہ ہمارے ظاہر سے دھوکا کھا سکتے اور ہمارے بارے میں بہت اچھی رائے قائم کر سکتے ہیں لیکن اگر ہمارا قلب درست نہیں، نیتیں

صحیح نہیں اور باطن صاف ستھرا نہیں تو تمام دنیا بھی ہمارے بارے میں اچھی رائے قائم کرلے تو فی الواقع ہم اچھے نہیں ہو سکتے۔ اچھا اور نیک تو وہ ہے جو خدا کی نظر میں اچھا اور نیک ہو ــــ دوسرے تو پھر دوسرے ہیں انسان کے خود اپنے نفس بہانہ ساز کا حال یہ ہے کہ طرح طرح کے بہانے تراش کر انسان کو اس کی کوتاہی منکر و عمل پر مطمئن کرتا رہتا ہو لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے نفس بہانہ ساز و خطا کار کے ساتھ نفس ملامت گر کو بھی لگا دیا ہے جو ہر برائی و کوتاہی پر انسان کو ٹوکتا رہتا ہے اور ہر خطا پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں اسی نفس لوامہ (ملامت گر) کی قسم کھائی گئی ہے اور پھر اسی کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

بلِ الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ و
لوالقی معاذیرہ (القیامۃ)

بلکہ انسان اپنے لیے آپ بصیرت ہے اگرچہ اپنے بہانے پیش کرے۔

"انسان کے نفس کے اندر ایک باطنی واعظ اور ایک اندرونی ناصح کی بولتی ہوئی زبان موجود ہے جو غلطیوں اور برائیوں پر اس کو برابر ٹوکتی اور نصیحت کرتی رہتی ہے تاکہ نفس خود اپنی ہی آواز پر چل کر راضیۃ مرضیۃ اللہ کی جماعت میں داخل ہو جائے اور اس کے اندر انکار و سرکشی کا کوئی داعیہ نہ ابھرنے پائے۔ یہی باطنی حس ہے جس کو قرآن نے بصیرۃ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ ......

نفس لوامہ کی صفت بصیرت بیان فرمائی ہو اور بصیرت کا ناقابل انکار ہونا اس امر سے ثابت کیا ہے کہ انسان اپنے جرائم پر اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے کتنے ہی بہانے اور حیلے گڑھے لیکن وہ کسی طرح بھی اس کو مطمئن نہیں کر پاتا دل کے پردوں میں کوئی چھپی ہوئی زبان برابر اس کو ٹوکتی اور سرزنش کرتی ہی رہتی ہے اور اندر سے ملامت کی کھٹک برابر اٹھتی ہی رہتی ہو

(مجموعہ تفسیر فراہی، تفسیر القیامۃ)

یہی وجہ ہے کہ قیامت میں انسان سے کہا جائے گا

اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۚ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (بنی اسرائیل آیت ۱۴)

اگر ہم اور آپ چاہتے ہیں کہ قیامت میں ہمارا نامۂ اعمال داہنے ہاتھوں میں دیا جائے تو ضروری ہے کہ اسی دنیا میں ہم اپنا محاسبہ کرکے اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے بھرتے رہیں۔ امیر کو اپنے منصب اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے اپنا احتساب کرنا چاہیے اور مامورین کو اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے اپنا جائزہ لینا چاہیے۔

احتساب و جائزے کے بیسیوں پہلو ہیں لیکن ہم اس وقت اس مبارک مہینے میں جس کا جہاد فی سبیل اللہ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اپنے آپ کو اور اپنے رفقائے کرام کو

صرف ایک پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنا مخلصانہ جائزہ لے کر یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ اس نصب العین سے (جسے قبول کر کے ہم جماعت اسلامی میں داخل ہوئے ہیں) ہمارا کتنا اور کیسا تعلق ہے؟ جماعت اسلامی کی وہ کیا خصوصیات اور کیا امتیازات ہیں جن کی وجہ سے ہم نے مسلمانوں کی متعدد تنظیموں اور جماعتوں کو چھوڑ کر جماعت اسلامی کا رکن بننا پسند کیا؟ ہم کہاں سے چلے تھے، کہاں کھڑے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ اللہ و رسول کی محبت، اطاعت اور راہِ خدا کی جدوجہد کا ہماری زندگی میں کیا مقام ہے؟ کیا یہ جدوجہد واقعی ہماری زندگیوں میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہے؟ کیا واقعی یہ ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے؟ کیا واقعی یہ ہمارے افکار و خیالات اعمال و حرکات اور احساسات و جذبات کا محور بن گئی ہے؟ کیا واقعی ہم نے قریب ترین رشتہ داریوں حصولِ معاش کی سرگرمیوں اور گھر بار کی محبتوں کو اپنی زندگیوں میں ثانوی اور ضمنی حیثیت دے رکھی ہے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ معاملہ برعکس ہو ——— جس طرح ہم دوسروں کے سامنے یہ حقیقت پیش کرتے ہیں کہ محض نام اور خاندان کے لحاظ سے مسلمان ہونا اللہ کی رحمتوں اور خوشنودیوں کا مستحق نہیں بناتا بلکہ اس کے لیے عقیدہ و عمل ہر جہت سے کتاب و سنت کی پیروی ضروری ہے اسی طرح ہمیں اپنے آپ تک بھی یہ حقیقت پہنچانی چاہیے کہ جماعت اسلامی کی محض رکنیت کسی کو خدا کی رحمتوں اور خوشنودیوں کی سند عطا نہیں کرتی بلکہ رکنیت ہم پر ذمہ داریوں کا مزید بوجھ ڈالتی ہے کیونکہ ہم شعوری ایمان کے مدعی ہیں۔

رمضان کے ان مبارک ایام میں مجھے اور میرے تمام رفقاء کو کڑی نظروں سے اپنا احتساب کرنا چاہیے۔

اے اللہ تو ہمارا مالک و مولیٰ ہے۔ ہم تیرے در کے بھکاری ہیں، ہمیں حلاوت ایمان عطا فرما۔ ہمیں توفیق خیر دے اور ہم سب کو اقامت دین کی جدوجہد کا مخلص سپاہی بنا دے۔ آمین!

وی پی واپس کرنے والوں سے

جن خریداروں کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے ان کو خط سے اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور پرچے میں سرخ نشان لگایا جاتا ہے لیکن ایسا بہت ہوتا ہے کہ خریدار حضرات پرچہ بند کرنے کی اطلاع نہیں دیتے اور وی پی واپس کر دیتے ہیں۔ یہ صورت بعض ایجنسیوں کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ اب ڈاک کا خرچ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اس لیے اس طرح ادارے کو خاصہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ہم خریداروں سے بھی اور ایجنسیوں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ وی پی واپس کر کے ادارے کو نقصان نہ پہنچا [illegible]

منیجر ماہنامہ زندگی

روزہ کا اثر انسان کی صلاحیت کار پر

(مولانا امین احسن اصلاحی)

تدبر قرآن جلد اول میں آیات صوم کی تفسیر کے بعد مذکورہ بالا عنوان کے تحت مولانا امین احسن نے جو نفیس بحث کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ روزے پر اعتراض کا معقول جواب ہے بلکہ اس سے روزے کے فوائد پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے اور اس کی حکمت و مصلحت ایک نئے اور دلکش انداز سے سامنے آتی ہے۔ (زندگی)

اس زمانے میں جو لوگ مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفۂ زندگی سے متاثر ہیں وہ روزے کے خلاف یہ آواز اٹھاتے ہیں کہ اس سے انسان کی صلاحیت کار اور اس کی قوت کارکردگی بہت کم ہو جاتی ہے جس سے فرد اور معاشرہ دونوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کرنے والے دو بنیادی حقیقتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں انسان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے وہ محض اس کے مادی وجود کی ہے۔ اس کے روحانی وجود کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ایک فربہ بیل زیادہ ہل چلا سکتا ہے اسی طرح ایک آسودہ اور پیٹ بھرا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا مسیحؑ کی اس حکمت سے بالکل ناآشنا ہیں کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل بے بہرہ ہیں جس کی طرف ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے:۔

انی ابیت لی مطعم یطعمنی وساق یسقینی

میں اس حال میں رات گذارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔"

انسان اگر صرف گوشت پوست کا مجموعہ ہے تب تو بلاشبہ ان معترضین کے اعتراض کے اندر کچھ وزن ہے لیکن اگر انسان کے اندر روح نامی کوئی شے بھی ہے تو یہ ہے کہ اس کی تازگی و توانائی کے لیے کچھ

ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کیا یہی دو وجہ نمکین، جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اس کے لیے بھی کافی ہیں یا اس کے لیے کسی اور تدبیر کی ضرورت ہے۔ مذہب اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان کے اندر روح کا جوہر ارضی نہیں بلکہ آسمانی اور خدائی ہے اس وجہ سے اس کی غذا اس زمین سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق و توسل اور اس کے کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق خدا سے قریب تر اور قوی تر اس وقت ہوتا ہے جب یہ جسم کے (جو اس کے لیے صرف ایک مرکب کی حیثیت رکھتا ہے) تقاضوں اس کی خواہشات اور اس کے جذبات و میلانات سے فی الجملہ آزاد ہوتی ہے جب تک یہ انہی سفلی پابندیوں میں گرفتار رہتی ہے اس وقت تک یہ ان بلندیوں پر پرواز نہیں کر سکتی جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کی اصلی جولانگاہ ہیں اور جن میں پرواز کرنے ہی سے اس کے وہ شاہانہ کارنامے ظہور میں آتے ہیں جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

روزہ، روح کو یہ آزادی دلانے کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کے نفس کی جو تربیت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ روح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہے، انسان کی قوت ضبط اور اس کی قوت ارادی مضبوط ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فرماں بردار غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلے وہ ایک صاحب عزم و ایمان کی طرح اپنی خواہشات و جذبات کو اپنے رب کی رضا اور اس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

غور کیجیے تو یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ انسان کے اندر قوت اور طاقت کا اصلی خزانہ اس کے جسم کے اندر نہیں بلکہ اس کے دل اور اس کی روح کے اندر ہے اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو نہایت راحت و تنعم میں پلے ہوئے جسموں کا یہ حال ہوتا ہے گویا وہ لکڑی کے کندے ہیں جن کو خوب صورت پوشاک پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ان کے خوف و بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ۔ دنیا کے کسی گوشے میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے۔ برعکس اس کے جن کی روح بیدار، جن کے دل پرعزم اور جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں وہ نان جویں پر گذارہ کر کے بھی بازوئے حیدر کے کارنامے دکھاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے:۔

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ۔

کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی

بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔

اور اسی چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دوسری حقیقت جس سے یہ معترضین غفلت برت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے وقتی اثرات و نتائج سے نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ اس مستقل اور پائدار اثر سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے جو زندگی پر اس کا پڑتا ہے یا متوقع ہوتا ہے بشرطیکہ صحیح طور پر اس کو برتا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دوا تقویت قلب و دماغ کے لیے نہایت مفید و مجرب ہو۔ اس کے اثرات نہایت پائدار مترتب ہوتے ہوں لیکن فوری طور پر اس کا ردعمل سستی یا اعضا شکنی یا خمار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہو ظاہر ہے کہ اس دوا کے فوری اثر کو دلیل قرار دے کر اس کو ایک مضر یا بے قیمت دوا قرار دے دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

ٹھیک یہی حال روزے کا ہے' اس کا فوری اثر — خاص طور پر خام اور نومشق لوگوں پر — تو ضرور کسل اور اضمحلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے وقتی طور پر ان کی صلاحیت کار بھی متاثر ہوتی ہے لیکن دیکھنے کی چیز اس کا یہ وقتی اثر نہیں ہے بلکہ وہ پائدار اثر ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر (بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک برتا جائے) اس پر مترتب ہوتا ہے۔

روزے کے لیے عربی میں صوم کا لفظ ہے۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلے میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ یہ لفظ گھوڑوں کے لیے استعمال ہوا جن کو جوانی پر آنے کے بعد جنگ کے لیے تیار کیا جاتا اور اس تیاری کے لیے تدریجاً ان کا چارہ اور دانہ کم کیا جاتا تاکہ ان کا بدن بھی دوڑ کے لیے مشاق نکل آئے اور وہ میدان جنگ کی سختیوں اور بھوک پیاس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے اچھی طرح قابل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ گھوڑوں پر یہ عمل اس لیے نہیں کیا جاتا تھا کہ اس سے ان کی قوت کارکردگی کم ہو بلکہ مقصود اس سے ان کی قوت کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے مقصد تخلیق کے لیے پوری طرح کارآمد ہو جائیں۔ ایک پلے ہوئے گھوڑے پر اگرچہ اس ٹریننگ کا فوری اثر اچھا نہیں پڑتا' وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے لیکن ٹریننگ دینے والے اس کے پائدار اثر کو نگاہ میں رکھتے ہیں جو گھوڑے کو ہر سختی و نرمی کے برداشت کے قابل بنا دیتا ہے اور جس سے وہ تھان پر بندھے ہوئے ایک پرخور جانور کے بجائے میدان جنگ کا ایک سخت کوش اور جاں باز سپاہی بن جاتا ہے۔

یہی صوم (روزہ) ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیت کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ اس صلاحیت کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں خواہ یہ

طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہوسکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلے میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدود الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو۔ لیکن دیکھنے کی چیز فوری اثر نہیں بلکہ اس کا مستقل اثر ہے اس کا مستقل اثر یقیناً اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں یہی ہونا چاہیے کہ بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو اس کا دل توانا ہو، اس کی قوت ارادی منضبط ہو۔ اس کی قوت برداشت بڑھ جائے وہ جہاد زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہوجائے۔

غور کیجیے کہ یہ انسان کی صلاحیت کار کا گھٹنا ہے یا بڑھنا ہمارے نزدیک تو جن کے اندر یہ صفات ہوں وہ درحقیقت انسانیت کے گل سر سبد ہیں۔ جن میں یہ صفات نہیں وہ آدمی نہیں بلکہ گاو بیدار کھے ہیں



(بقیہ رسائل مسائل)

کی تمام اولاد کے درمیان بھائی بہن کا رشتہ ہوتا ہے خواہ وہ اولاد ایک بیوی سے ہو یا چند بیویوں سے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کا رضاعی باپ ہوگیا تو اس کے تمام لڑکے اور لڑکیاں اس رضاعی بیٹے یا بیٹی کے رضاعی بھائی بہن ہوگئے خواہ وہ رضاعی باپ کی اس بیوی کے بطن سے ہوں جس کا دودھ پیا گیا ہے یا اس کی کسی دوسری بیوی کے بطن سے۔

اشتیاق حسین ایم اے
ادارہ تصنیف جماعت اسلامی ہند علی گڈھ

کیا اسلام اس ملک کی قیادت کرسکتا ہے

(۱)

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ کیا اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین و احکام یہاں کے باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ شعبہ جات پر حکمرانی کرسکتے ہیں؟ بالفاظ دیگر کیا ہندوستان میں اس بات کا امکان ہے کہ یہاں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی کی تعمیر اسلامی بنیادوں پر ہو سکے؟

اس کا سادہ سا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ امکان بہر حال ہے اور اسلام پوری طرح یہاں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حکمرانی کرسکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کا تعلق ساری دنیا سے ہے۔ وہ سارے عالم انسانیت کی قیادت و رہنمائی کے لیے آیا ہے اور ہندوستان کو اس عمومیت سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ بات کہ اسلام کا تعلق ہر قوم اور ہر ملک سے ہے، اس قدر صراحت کے ساتھ قرآن میں مذکور ہے کہ کوئی باخبر آدمی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ قرآن کا کہنا ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ

(الفاطر: ۲۴)

اور کوئی امت ایسی نہیں گذری جس میں کوئی تنبیہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

اس سے یہ بات لازمی طور پر نکلتی ہے کہ یہاں کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندے بھیجے ہوں گے جن کا مقصد لوگوں تک اللہ کی باتیں پہنچانا اور آخرت کے عذاب سے ڈرانا رہا ہوگا۔ اور یہ چیز ایک لازمی مفروضے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ کا دین یہاں کے انسانوں کی بھی قیادت کرسکتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا لہٰذا ناگزیر ہے کہ آپ کی دعوت زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہو کر ساری عالم انسانیت کے لیے ہو چنانچہ اس سلسلے میں بھی بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں۔ صرف دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝ (سبا: ۲۸)

اور (اے نبی!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ۱۵۸)

اے محمدؐ! کہو کہ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں۔

قرآن خود اپنے متعلق بھی وضاحت کرتا ہے کہ کا تعلق سارے انسانوں سے ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ (الزمر ۴۱)

"(اے نبی!) ہم نے تم پر یہ کتاب سب انسانوں کے لیے حق کے ساتھ نازل کی ہے

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۲۰)

یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لیے اور ہدایت و رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران ۱۳۸)

یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح بیان ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لیے ہدایت و نصیحت

مذکورہ بالا آیتوں میں عموم کے بعد متقین اور قوم یوقنون کے الفاظ لا کر اس کی صفت موعظت، رحمت اور ہدایت کو ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اختصاص خود بھی زمان و مکان کی قیود اور حدود سے بالاتر ہے ان کا کسی مخصوص ملک، نسل یا زمانے سے تعلق نہیں۔ تقوےٰ اور یقین انسان کی بنیادی صفات ہیں جو کسی بھی زمانے کسی بھی ملک اور کسی بھی ثقافتی مظہر میں نمایاں ہو سکتی ہیں چنانچہ تاریخ بھی اس حقیقت پر شاہد ہے۔

ہدایت اور رحمت تک راہ نمائی کرنے کے اس عمومی انتظام کے بعد یہ بھی ضروری ہوا کہ اسلام کے بنیادی مطالبے بھی سارے انسانوں سے متعلق ہوں۔ مندرجہ ذیل دو آیتیں ہم کو یہ بھی بتاتی ہیں کہ اسلام کا مطالبہ عبادت اور تقوےٰ سارے انسانوں سے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرہ ۲۱)

لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء ۱)

اے انسانو! اپنے رب کی نافرمانی سے بچو جس نے تم سب کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اس

متنفس (کی جنس) سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیے

یہاں تک کہ قرآن واضح الفاظ میں یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ خدا کے یہاں واحد مقبول دین اسلام ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

(آل عمران ۱۹)

اللہ کے نزدیک (پسندیدہ یا مقبول) دین (صرف) اسلام ہے

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (آل عمران ۸۵)

اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

اور ایسا کہنے میں قرآن حق بجانب بھی ہے کیوں کہ اس کا پیغام بھی حق ہے اور پھر وہ عمومی بھی ہے اور اس کی تعلیمات سارے انسانوں کے لیے ہیں۔

ان تمام مباحث سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام ہندوستان کے باشندوں سے بھی قطعی طور پر متعلق ہے وہ چونکہ سارے انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے اس لیے وہ لازمی طور پر یہاں کے باشندوں کی بھی قیادت کر سکتا ہے کیونکہ کسی اصول کی عمومیت اس بات کی ضامن ہے کہ اسے ہر جگہ نافذ کیا جا سکتا ہے

الا یہ کہ کسی خاص زمانے اور ملک کا مزاج اور خصوصیات اس اصول کے مزاج اور خصوصیات کے بنیادی طور پر متناقض ہوں اور ان سے میل نہ کھاتے ہوں۔ اب اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا یہاں کا معاشرتی مزاج اور سماجی خصوصیات بنیادی طور پر اسلامی مزاج اور خصوصیات کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اسلامی مزاج اور اسلامی خصوصیات نیز ہندوستان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا جائزہ لیکر دیکھنا پڑے گا کہ ان دونوں میں بنیادی طور پر مطابقت ہے یا منافرت۔ اور یہ جائزہ ہی یہ بھی طے کرے گا کہ اگر ہم کو ہندوستان میں اسلام کے لیے کام کرنا ہے تو اس کا طریقہ کار اور نوعیت کیا ہونا چاہیے کیونکہ کوئی چیز عالمی اور آفاقی ہوتے ہوئے بھی زمان و مکان سے مکمل طور پر بے نیاز نہیں رہ سکتی اور ملک کے حالات اور مزاج سے بے گانہ رہ کر کسی جگہ انقلابی کام کی امید فضول اور بے سود ہے لہٰذا طریقہ کار کی تعیین کے لیے بھی حالات کا تجزیہ ضروری ہے

جائزے کے لیے آگے بڑھنے سے قبل ہم اپنے سوال کو مزید دو حصوں میں تقسیم کریں گے

۱۔ کیا مضمراتی طور پر (POTENTIALLY) اسلام اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ یہاں کے باشندوں کی قیادت کر سکے

۲۔ اگر وہ اس اہلیت کا حامل ہے تو وہ طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے جو اسلام کی ان مضمراتی صلاحیتوں کو عملی شکل

عطا کرنے میں مدد کرے۔ یہ دو اہم سوالات ہیں۔ پہلا سوال تو بنیادی ہے اور دوسرا اس کا عملی نتیجہ۔

ان دونوں سوالوں کے جوابات الگ الگ درکار ہیں لہذا اب ہماری گفتگو ان ہی دو حصوں میں منقسم ہوگی۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس میں پہلے ہم اسلام کا تعارف مختصر طور پر پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد ہندوستان کے سماجی مزاج اور حالات کا جائزہ لیکر دیکھیں گے کہ یہ کس حد تک اسلام کے لیے موزوں ہے۔ اور اسلام اپنی خصوصیات اور مزاج کے اعتبار سے کہاں تک اس ملک کی قیادت میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

اسلام کا تعلق زندگی سے ہے۔ زندگی کو بحیثیت مجموعی ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ فکری ۲۔ جذباتی اور ۳۔ عملی

یہ تین حصے درحقیقت زندگی کے تین پہلو ہیں۔ زندگی ان تینوں پہلوؤں سے مل کر ہی مکمل ہوتی ہے۔ ان میں کسی پہلو کے کمزور یا غیر پختہ رہ جانے کے نتیجے میں زندگی میں نقص واقع ہوتا ہے۔ زندگی کامیاب اس وقت کہلائی جائے گی جبکہ ان تینوں پہلوؤں کا ارتقا صحیح انداز پر ہوا ہو۔ اسلام مختصر طور پر یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے زندگی کے ان تینوں پہلوؤں میں خدا کی مرضی اور اس کے احکام و قوانین کو داخل کرلیا جائے یا یہ کہ ان تینوں پہلوؤں کی تعمیر خدا کی مرضی کے مطابق ہو۔ اسلامی اصطلاحات میں ان تینوں پہلوؤں کو علی الترتیب ایمان، تقویٰ اور اطاعت رسول کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اپنی وسعت کے اعتبار سے یہ تینوں اسلامی اصطلاحات زندگی کے تینوں پہلوؤں پر حاوی ہیں لیکن فی الحقیقت تینوں میں سے ہر ایک کا جھکاؤ ایک خاص پہلو کی طرف ہے۔ اسی اعتبار سے ہم نے ان کو تین الگ الگ پہلوؤں پر منطبق کیا ہے۔ یہ تینوں چیزیں (جیسا کہ ہم ابھی ان کی تشریح کریں گے) مل کر ہی اسلامی زندگی کی تعمیر کرتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز جس قدر کم ہوگی اسلامی اعتبار سے زندگی میں اتنا ہی خلا ہوگا۔ اور یہی تینوں چیزیں جب مل جاتی ہیں تو انہیں عبادت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عبادت کا جھکاؤ کسی ایک طرف نہیں ہے . . . .

. . . .

. . . .

. . . . بلکہ یہ لفظ جامعیت کے اعتبار سے ان تینوں پر حاوی ہے۔ چنانچہ اگر کہا جائے کہ اسلامی زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے تو یہ بات قرآن کے عین مطابق ہوگی۔ سورۃ الذاریات میں ارشاد باری ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(الذٰریٰت ۵۲)

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اب ہم ان مطالبات کی تشریح کریں گے جو زندگی کے

ان تینوں پہلوؤں کے متعلق اسلام ہم سے کرتا ہے۔

فکری اعتبار سے اسلام کے دو بنیادی مطالبے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہم ذہنی تعطل اور فکری جمود کا شکار نہ ہوں بلکہ خدا کی دی ہوئی عقل، نظر اور بصیرت کو پوری طرح استعمال میں لائیں اور ان کے ذریعے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کریں اور دوسرا یہ کہ ہماری فکر تعصبات کا شکار نہ ہو اور نہ ہی اس کا تعین سابقہ مفروضات کی بنیاد پر ہوا ہو بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم غیر جانبداری کے ساتھ اپنی عقل کے ذریعے سوچیں اور عقل و وجدان کی میزان پر سابقہ مفروضات کو بھی پرکھنے کی کوشش کریں اور ان میں جو چیز حق سمجھ میں آئے اس کو قبول کرلیں اور جو ناحق ہو اس سے قطع تعلق اختیار کرلیں۔

ان دو بنیادی مطالبوں کے بعد جو مطالبہ اسلام ہم سے کرتا ہے اسے ہم ایمان کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔ ایمان انسان، کائنات زندگی اور خدا کے متعلق چند بنیادی حقیقتوں کے تسلیم کرلینے کا نام ہے۔ ان حقیقتوں کی طرف ہماری وہ فکر (جو دو بنیادی مطالبات پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں بنی ہے) اشارہ تو ضرور کرے گی لیکن واضح اور متعین شکل میں کوئی راستہ نہیں بتائے گی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی نارسائی کا بھی اظہار کرے گی۔ ان حقائق کی طرف اشارہ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی نارسائی کا اظہار اس بات کی دلیل ہیں کہ کچھ حقائق کائنات میں ایسے ہیں جن کی طرف عقل ہم کو مفصل طور پر رہنمائی نہیں کرسکتی لہٰذا ان کے لیے کسی دوسرے ذریعہ کی ضرورت ہو اور اس دوسرے ذریعے کا نام وحی ہے لیکن خود اس وحی پر ایمان عقل و بصیرت کے ذریعے ہی لایا جاسکتا ہے۔ اسلامی اعتبار سے ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم تسلیم کریں کہ یہ کائنات خود ہی نہیں پیدا ہوگئی ہے بلکہ اس کائنات کا کوئی خالق، مالک اور رب ہے وہ اکیلا ہے اس کی ذات وصفات اور مخصوص افعال میں کوئی اس کا شریک و ہمسر نہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں نے جتنے خدا بنالیے ہیں سب باطل اور جھوٹے ہیں۔ اسی نے انسان کو بنایا، اس کو زندگی عطا کی۔ لہٰذا سارے انسان اسی کے بندے ہیں اور یہ کہ یہ زندگی دائمی نہیں ہے بلکہ عارضی اور وقتی ہے۔ ایک وقت مقررہ پر یہ ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک دائمی زندگی آنے والی ہے جہاں فنا نہیں ہے بلکہ ہمیشگی ہے۔ یہ عارضی زندگی ایک مقصد کے تحت ہم کو عطا کی گئی ہے اور آنے والی دوامی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہماری یہاں کی زندگی پر ہے۔ اگر یہاں ہم نے اس مقصد کے حصول کی کوشش کی ہے تو وہاں ہماری زندگی کامیاب ہوگی ورنہ ناکام۔ اس لحاظ سے یہ دنیوی زندگی دارالعمل ہے اور اخروی زندگی دارالجزا۔ اور وہ مقصد جس کے تحت ہم کو یہاں کی زندگی گذارنا ہے یہ ہے کہ ہم اپنی ساری زندگی بس اللہ کی عبادت کریں۔ اپنی زندگی میں وہ کام کریں جن کے لیے اللہ نے حکم دیا ہے ان کاموں سے بچ جائیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

مختصر یہ کہ ہماری زندگی اس کی مرضی کی آئینہ دار ہو

اس کی ہدایت کے مطابق ہو۔ جہاں تک اس کی مرضی اور اس کے بتائے ہوئے راستے کا سوال ہے اس کے لیے ہر زمانے میں انسانوں کی ہدایت کے لیے مخصوص لوگ آتے رہے ہیں جن کو اللہ تعالے نے اپنا پیغام دے کر اس دنیا میں بھیجا اور جنھوں نے قول وعمل سے اللہ کی وہ مرضی لوگوں کے سامنے رکھی جو اللہ اپنے بندوں کو دینا چاہتا تھا۔ اللہ کے یہ بندے جن کو اصطلاحاً نبی اور رسول کہا جاتا ہے، ہر دور اور ہر ملک میں آتے رہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہذا اب رہتی دنیا تک انسانوں کا فرض ہے کہ ان کو اپنا رہنما اور قائد مان کر ان کی پیروی کریں کیونکہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ نے قولاً اور عملاً لوگوں کو اللہ کی مرضی بتائی یہ تھا ہم سے اسلام کا فکری مطالبہ جسے ہم مختصر طور پر ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

دوسرا مطالبہ جس کا تعلق ہماری شخصیت یا ہماری زندگی کے محرکاتی یا جذباتی پہلو سے ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی ایک مشینی یا میکانکی طرز کی زندگی نہ ہونا چاہیے بلکہ ہماری زندگی میں ایک مقصدیت اور ایک شعور ہونا ضروری ہے اور اس شعوری مقصد سے ہم کو ایک طرح کا قلبی لگاؤ ہو۔ کسی مقصد کے تحت سرزد ہونے والے اعمال ہماری جسمانی مشین کی محض ایک پیداوار نہ ہوں بلکہ ان کا گہرا تعلق ہمارے جذبات، ہمارے وجدان اور ہمارے محرکات سے بھی ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جذبا اور یہ محرکات رضائے الٰہی سے ہٹا کر کسی دوسری طرف لے جانے والے نہ ہوں بلکہ ہماری مساعی اور جد وجہد کا صرف رضائے الٰہی ہو، ریا، خود غرضی اور نفس پرستی ہماری زندگی پاک ہو۔ وہ کام جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے پسند فرمایا ہے ان کے لیے ہمارا قل آمادہ ہو اور وہ اعمال جو ان دونوں کی نظر میں ناپسند ہیں ان سے ہم کو بھی نفرت ہو۔ اسی قلبی نفرت ومحبت تقویٰ اور احسان کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تیسرا پہلو عملی ہے۔ اس میں بھی سب سے پہلے تو سے یہ مطالبہ ہے کہ ہماری عملی زندگی تعطل اور جمود کا شکا نہ ہو۔ پھر یہ کہ یہ عملی سرگرمی اور جد وجہد اس کی مقرر کردہ کو تجاوز نہ کر جائے۔ ہم اس کے اوامر پر عمل پیرا ہوں ا اس کے بتائے ہوئے نواہی سے اجتناب کریں۔ ہماری عم زندگی میں اللہ اور رسول کی مرضیات کو پورا دخل ہو۔ ا کا بنایا ہوا قانون ہماری عملی زندگی میں نمایاں طور پر نا کرے۔ یہ عمل انفرادی بھی ہو اور اجتماعی بھی۔ یہ ہے اسلا کا وہ مطالبہ جو ہماری زندگی کے تینوں پہلوؤں سے ہے اور یہی ہے اسلام کا مختصر سا تعارف۔

اب اسلام کے متعلق ان بنیادی باتوں کو ذہن میں ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینا ہے کہ آیا یہاں کے حالا مزاج کے مطابق ہیں یا نہیں؟

ہندوستانی مزاج کا جائزہ لیتے وقت جو چیز نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہاں کا شرک ہے جس کا مظہر بت پرستی ہے۔ بتوں کی پرستش یہاں عام ہے۔ اب یہ پرستش خواہ اصنام ہی کو خدا سمجھ لینے کا نتیجہ ہو یا خدائے قادر وقہار تک وسیلے کے طور پر۔ اسلامی اعتبار سے دونوں ہی غلط ہیں۔ وہ جیسا کہ ابھی اس کے تعارف سے واضح ہوا توحید کی تعلیم دیتا ہے اور اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ اس کے علاوہ کسی بھی ہستی کے آگے خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان ـــ سر جھکایا جائے۔ لہذا یہ چیز اسلامی مزاج کے سراسر منافی ہے۔

دوسری چیز جو بت پرستی سے قریبی تعلق رکھتی ہے وہ یہاں کی مظاہر پرستی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں ایک رجحان معنوی اعتبار سے روحانی ارتقا کا بھی رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عوام میں جو مذہب کا تصور ہے وہ بہت زیادہ اظہار شان وشوکت اور زیب وزینت سے متعلق ہو گیا ہے۔

اسی طرح سے توہم پرستی بھی یہاں کے عوام میں بہت حد تک سرایت کی ہوئی ہے۔ جبکہ یہ سب چیزیں اسلامی روح اور اس کے مزاج کے خلاف ہیں۔

ایک اور اہم چیز یہاں کا عمیق مابعدالطبیعی فلسفہ ہے جس کا تعلق براہ راست عملی زندگی سے بہت کم ہے لیکن اس کے باوجود اس منطقی فلسفیانہ نظام کے کچھ مظاہر کو یہاں کے عوام کی زندگی میں بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ نظریۂ تناسخ اور ذات پات کا نظام اسی کے مظاہر ہیں۔ جبکہ یہ دونوں ہی چیزیں اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔ اس لیے کہ اسلام کے مطابق تمام انسان بحیثیت انسان برابر ہیں اور ان میں فوقیت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۱۳)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور اسی طرح مسئلہ تناسخ جیسا کوئی تصور اسلامی تعلیمات میں نہیں ملتا بلکہ اسلام میں جو تصور اس زندگی کے بعد ملتا ہے اس نظریے سے بالکل الگ ہے اور صورت حال یہ ہے کہ تصور تناسخ ہو یا ذات پات کا نظریہ، یہاں کی اکثریت کا تعلق ان نظریات سے گہرا ہے اور وہ ان سے آزاد ہونے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہے۔

ایک اور رجحان جو یہاں کے عوام کی عملی زندگی میں بہت زیادہ نمایاں ہے اور جس کے اثرات یہاں کی سماجی ثقافتی اور معاشرتی زندگی میں گہرے ہیں وہ اباحیت پسند

کا رجحان ہے جسے ہم سیکولرزم اور مادیت پرستی جیسے دوسرے ناموں سے بھی یاد کرسکتے ہیں۔ اس کا مطلب مذہب سے نفرت نہیں ہے بلکہ مذہب تو یہاں کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ یہاں جو چیز مراد ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد کی ذاتی زندگی تک محدود کر دیا گیا ہے۔ خدا اور بندے کا معاملہ ایک پرائیوٹ معاملہ ہے یعنی کچھ مخصوص قسم کے افعال جو مذہب سے منسوب ہوں ان کو فرد اپنے طور پر انجام دے لے اور پھر اس کے بعد وہ آزاد ہے۔ اس کی سماجی زندگی کس نوعیت کی ہو اس میں وہ کیا کام کرتا ہے؟ لوگوں سے اس کا برتاؤ کس طرح کا ہے؟ ان سب سے اس کے مذہب کو کوئی غرض نہیں۔ حلال اور حرام کا تصور صرف چند مخصوص انفرادی اعمال تک محدود ہے باقی زندگی میں اس قسم کے تصورات نہیں ملتے۔ اب ظاہر ہے ایسی صورت میں ان مخصوص مراسم کے علاوہ فرد کی مساعی کا محور مادی کامیابی ہوگا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے جائز اور ناجائز کا تصور تقریباً مفقود ہے اور یہ صورت حال کسی ایک مذہبی طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تقریباً ہر طبقہ میں خواہ نظری طور پر کہیں اس طرز فکر کی تردید کی جاتی ہو عملاً یہ چیز بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اسی طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ مذہب کی حیثیت ثانوی ہوگئی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اس طرز فکر کی قطعی طور پر کاٹ کرتا ہے۔

اسلام کے مذکورہ بالا تعارف سے پتہ چلتا ہے اسلام نام ہی اس چیز کا ہے کہ فرد اپنی ساری زندگی میں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خدا کی مرضی کے آگے پورے طور پر سر تسلیم خم کردے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (البقرہ: ۲۰۸)

اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ

اور اس رویے پر تنبیہ کی ہے کہ کتاب اللہ کے بعض حصے کو مانا جائے اور بعض حصہ کا انکار کر دیا جائے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (البقرہ ۸۵)

تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو

لہٰذا جب ہم اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیمات خدا اور بندے کے ذاتی تعلقات سے لیکر انسانی حقوق و تعلقات معیشت اور حکومت کے ایوا تک وسیع ہے۔ بہرحال مذہب کے سلسلے میں ہندوستانی عوا کا یہ طرز فکر اسلامی انقلاب کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے

مذہب کے بارے میں ایک اور تصور یہاں پایا جاتا ہے اور وہ وحدت ادیان کا تصور ہے۔ ہندوستان زما قدیم سے مختلف تہذیبوں اور مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا ہے چنانچہ ایک طرز فکر یہاں پر یہ بھی ابھرا کہ تمام مذاہب فی الحقیقت

ایک ہی ہیں سب کا مقصود ایک ہے۔ موجودہ اختلاف صرف مظاہر اور شکلوں کا اختلاف ہے۔ لہٰذا تمام مذاہب کے جوہر کو جس میں خدا پرستی اور اخلاقی اقدار کو شامل کیا جا سکتا ہے لے لیا جائے اور اس اعتبار سے ہر مذہب ہی برحق ہوگا اور یہ طرزِ فکر نہ صرف یہ کہ عوام کا ہے بلکہ یہاں کے مفکرین عام طور پر اس نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے اور اس کی تبلیغ کرتے ہیں

دوسرے مذاہب سے قطع نظر کم از کم اسلام کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہاں اس تصور کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ جب کفار مکہ نے اس قسم کی پیش کش کی تھی تو اس کا جواب اس طرح دے دیا گیا تھا:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا
تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَاۤ اَعْبُدُ (الکافرون ۱ تا ۳)

کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔

اور صاف صاف الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

(آل عمران ۱۹)

اللہ کے نزدیک (پسندیدہ اور مقبول) دین (صرف) اسلام ہے)

وحدتِ ادیان کا تصور اگر مان لیا جائے تو توحید اور رسالت کا وہ تصور جو اسلام ہمیں دیتا ہے بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

مادیت پسندی اور مظاہر پرستی زندگی کو کوئی مخصوص اور معنوی مقصد دینے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یہاں کے عوام نظریاتی طور پر مطمئن سے ہو گئے اور نظریاتی شعور نام کی کوئی چیز یہاں کی زندگی میں موجود نہیں۔ وہ نظریاتی شعور جو زندگی کو کچھ معنوی خصوصیات دے کر تعمیر کی راہوں پر گامزن کر دے۔ لہٰذا بظاہر زندگی کا کوئی خاص مقصد نظر نہیں آتا۔ جب کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کا محور اور مرکز صرف معاشی فارغ البالی یا مادی خوش حالی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک مقصدِ حیات درکار ہے۔ اور وہ مقصد ایک معنوی مقصد ہے جس کی اصطلاحات مادی نفع و نقصان کی اصطلاحات سے بالاتر ہیں۔

سب سے آخر میں جو چیز ہندوستانی مزاج کے سلسلے میں عرض کرنی ہے وہ یہاں کی فرقہ وارانہ منافرت ہے۔ عرصے سے یہاں دو خاص مذہبی گروہ رہتے چلے آئے ہیں تاریخی اعتبار سے یہاں فرقہ وارانہ منافرت کا وجود تھا یا نہیں یہ ایک الگ سوال ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہاں کی فضا فرقہ وارانہ منافرت اور کش مکش سے آلود رہی ہے۔ اس وقت اس کے اسباب بھی [illegible] نہیں۔ وہ معاشرتی اور لسانی بھی ہو سکتے ہیں اور سیاسی [illegible] بھی۔ جہاں تک اس صورت حال کے اثرات کا تعلق ہے وہ بہت گہرے ہیں اس کے نتیجے میں اکثریتی اور اقلیتی فرقوں

کے مابین بہت ہی وسیع خلیج قائم ہو گئی ہے اور دونوں فرقوں کے افراد میں ایک دوسرے کے متعلق غلط مفروضات اور شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں متعلقہ مذاہب کے بارے میں بھی شبہات پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب اس صورت حال کے نتیجے میں ہندو مذہب کے بارے میں کیا غلط اور غیر حقیقی تصورات قائم کر لیے گئے ہیں۔ ان سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف اسلام کا ذکر کریں گے کیونکہ اس وقت موضوع بحث اسلام ہے۔ سیاسی اعتبار سے اقلیت کے ساتھ قوم مخالف تصورات وابستہ ہو گئے ہیں جن میں پاکستان، تقسیم ہند سے قبل کی مسلم لیگ اور ایک جداگانہ سیاسی حکمت عملی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بدقسمتی سے ہوا یہ کہ اسلام بھی ان ہی تصورات کا ہم معنی لفظ بن گیا۔ بالخصوص اسلام کے تصور جہاد کو غلط طور پر سمجھنے سے اس خیال کو اور تقویت ملی اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اسلام ایک جداگانہ اور علیحدگی پسند مذہب کی حیثیت سے سامنے آیا بلکہ وہ مسلمانوں کے لیے ایک منبع تحریک سمجھا جانے لگا جس کا نتیجہ مسلم جارحیت ہے۔ یہ خیالات صحیح ہیں یا غلط۔ ایک الگ بحث ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تصورات ہیں جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام سے متعلق ہو گئے۔ نتیجۃً اسلام کی اصلی اور مثبت تعلیم چھپ کر رہ گئی۔ جہاں تک اس تصور کے قائم ہونے کا سوال ہے اس کے عوامل بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن ایک سبب خود مسلمانوں کا اپنا رویہ ہے۔ مسلمانوں کے رویے کے سلسلے میں سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے یہاں کے عوام کو کوئی مثبت پیغام دینے کی کوشش نہیں کی۔ اسلام جو ایک اقدامی مذہب ہے انھوں نے اسے اپنے ہی تک محدود رکھا۔ نتیجۃً اسلام بھی قومیت اور طبقہ واریت کی ایک بنیاد بن گیا۔ اور اس کی یہ خصوصیت کہ وہ سارے انسانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھر کچھ عرصے سے مسلمانوں کی اجتماعی سرگرمیاں زیادہ تر دفاعی رہیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد جو نظروں کے سامنے آئی اس کی نوعیت قوم پرستانہ اور فرقہ وارانہ زیادہ رہی۔ فرقہ وارانہ نوعیت سے مراد وہ کوشش ہے جو کسی ایک خاص طبقہ کی حفاظت اور دفاع کے لیے کی جائے خواہ دوسرے کا استحصال مقصود ہو یا نہ ہو۔ اب یہ سرگرمیاں اور یہ کارروائیاں حق بجانب تھیں یا نہیں خود اقلیت کو اپنے دفاع کے واسطے یہ کام کرنے چاہییں یا نہیں یہ بالکل الگ سوال ہے۔ اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اتفاق بھی۔ ہمیں فی الوقت اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرنا ہے لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے لیے یہ سرگرمیاں کسی حد تک مضر ثابت ہوئیں اور نتیجۃً اسلام کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، اردو، مسلم لیگ اور مسلمانوں کے قومی مطالبات کے ہم معنی سمجھ لیا گیا اور اسلام دوسروں کے سامنے ایک راہ حق کے بجائے ایک جارح مذہب اور ایک چیلنج بن کر آیا جس کا مقصد گویا صرف یہ ہو کہ وہ ایک فرقہ کی بھلائی کے لیے دوسرے فرقوں کا استحصال کرنے کے درپے ہو۔ ایسی صورت میں اسلام یہاں کی اکثریت کیلیے ایک اجنبی یا غیر مذہب ہے اور یہ چیز ہندوستان میں اشاعت اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

نفقۂ اولاد

(آخری قسط)

مولانا سید جلال الدین عمری (ادارۂ تصنیف علی گڑھ)

گزشتہ بحث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ بچہ جب تک قابل کسب نہ ہوجائے یا اس کی معاش کا کوئی معقول انتظام نہ ہوجائے، باپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کا نان نفقہ برداشت کرے۔ لیکن ایک سوال یہ ہے کہ یہ تنہا باپ ہی کی ذمہ داری ہے یا خاندان کے دوسرے افراد بھی اس میں شریک ہیں؟ اس کا جواب قرآن مجید کی اس آیت میں ہمیں ملتا ہے۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

اس شخص پر جس کا بچہ ہے دستور کے مطابق ان کا کھانا اور کپڑا واجب ہے۔

آیت کے الفاظ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ بچے کے اخراجات کی ساری ذمہ داری باپ پر ہے اور جب تک وہ موجود ہے کسی دوسرے پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسی آیت کی بنیاد پر بحر الرائق میں لکھا ہے۔

ان الاب ینفرد بتحمل نفقۃ الولد لا یشارکہ فیہا احد[1]

بچہ کے نفقہ (اخراجات) کو تنہا باپ اٹھاتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک نہیں ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ماں اور باپ دونوں کا بچہ سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اور دونوں قانونی طور پر اس کے وارث ہوتے ہیں، بلکہ جذباتی لحاظ سے ماں بچے سے باپ کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے صرف باپ کو بچے کے اخراجات برداشت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی موجودگی میں کسی بھی وارث پر اس کی معاشی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی

---

[1] ابن نجیم: البحر الرائق ۴/

جصاص اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ رضاعت کے اخراجات تنہا باپ کو اٹھانے ہوں گے۔ اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ پر لازم کیا ہے کہ وہ ماں کو اخراجات رضاعت دے، حالانکہ دونوں وارث ہیں۔ ماں اور باپ دونوں کی موجودگی میں صرف باپ پر ان اخراجات کو لازم قرار دینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچہ کا نفقہ باپ پر واجب ہے۔ بچہ کم سن ہو یا یہ کہ بڑا ہونے کے باوجود معذور ہو تو اس کے نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہے۔[1]

اس مسئلے میں فقہ حنفی کا مسلک سرخسی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ثم فی ظاہر الروایۃ لا یشارک الاب فی النفقۃ احد[2]

ظاہر روایت میں بچہ کا نفقہ ادا کرنے میں باپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص شریک نہیں ہوتا۔

اولاد کا نفقہ نہ صرف یہ کہ ادا کرنا واجب ہے بلکہ بر وقت ادا کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اس میں تاخیر سے بچہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔[2]

نفقۂ اولاد کے وجوب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ باپ صاحب حیثیت اور دولتمند ہی ہو بلکہ اگر وہ صحیح و سالم اور تندرست ہے اور کمانے کی طاقت رکھتا ہے تو اس پر نفقہ واجب ہو جائے گا۔ طاقت کے باوجود اگر کوئی شخص محنت و مشقت کرنے سے جی چرائے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اولاد کے نفقہ کی خاطر کوئی ذریعہ معاش اختیار کرے اور اولاد کی ضروریات پوری کرے۔[3]

اسلام عورت کو جہاں تک ہو سکے، معاشی ذمہ داریوں سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے ماں پر اولاد کے نان و نفقہ کا کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے یہ بہت بڑا کار ثواب ہے کہ ماں بچہ کی پرورش، تربیت اور فلاح و بہبود پر اپنا پیسہ خرچ کرے۔ یہ ان دوسری بہت سی مدوں سے بہتر ہے جہاں وہ اپنی دولت صرف کرتی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ تنگ دست ہیں۔ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا خرچ پورا نہیں کر پاتے۔ اس لیے جو صدقہ و خیرات میں دوسروں پر کرتی ہوں وہ ان پر اور ان کے بچوں پر کروں تو کیا یہ صحیح ہوگا؟ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سوال ایک اور انصاری خاتون کا بھی تھا۔ آپ نے ان کو جواب دیا کہ شوہر اور بچوں پر خرچ

[1] جصاص: احکام القرآن

[2] ان دونوں مسائل پر اس سے پہلے بحث گزر چکی ہے

[3] سرخسی: المبسوط ۵/۲۲۳

[4] ملاحظہ ہو ماہنامہ زندگی اگست ۷۲ء، مضمون اسلام میں [illegible]

کرنا۔ حضرت یہ کہہ رہے ہیں بلکہ اس میں تمہیں دوگنا اجر ملے گا ایک رشتہ دار کا حق پہچاننے کا اور دوسرا صدقہ و خیرات کا۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی سے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ جب تمہارے بچے حاجت مند ہیں اور تم ان کی ضرورت پوری کرسکتی ہو تو تمہارے لیے اس کا پورا کرنا ضروری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں پر بچوں کی معاشی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ ایک صاحب حیثیت ماں کو وقت ضرورت اولاد کا معاشی بوجھ اٹھانا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان کے قریب ترین افراد ہی اس کے حسن سلوک کے سب سے زیادہ مستحق ہوتے ہیں اور اولاد سے زیادہ قریب کون ہو سکتا ہے۔

فقہاء کے نزدیک بچوں کا معاشی تعاون ماں کے لیے محض ایک اخلاقی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات وہ قانونی اہمیت بھی اختیار کرلیتا ہے۔ چنانچہ فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ باپ تنگ دست اور مفلس ہو تو صاحب حیثیت ماں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے کے اخراجات پورے کرے البتہ یہ سارے اخراجات باپ کے ذمے قرض متصور ہوں گے۔ اس لیے کہ باپ ہی اصلاً بچے کے نفقے کا ذمہ دار ہے جب بھی باپ اس قرض کو ادا کرنے کے قابل ہو جائے اسے ادا کرنا ہوگا۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں

لوكان الاب معسرا والام موسرة امرت بان تنفق من مالها على الولد ويكون ذالك دينا على الاب اذا ايسر[2]

باپ تنگ دست اور ماں خوش حال ہو تو ماں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنا مال بچہ پر خرچ کرے اور یہ باپ کے ذمہ قرض ہوگا (جس کو وہ اس وقت ادا کرے گا) جب کہ وہ خوش حال ہو جائے۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ ماں اگر بچوں کے لیے باپ کو قرض دے سکتی ہے تو کسی دوسرے شخص کو جیسے کہ بچہ کے دادا کو بھی قرض دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ابن نجیم فرماتے ہیں:۔

لوكان الاب معسرا والام موسرة والصغير جد موسر تؤمر الام بالانفاق من مال نفسها ثم ترجع على الاب ولا يؤمر الجد بذالك لانها اقرب الى الصغير[3]

بچہ کا باپ تنگ دست اور اس کی ماں اور دادا خوش حال ہوں تو ماں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے مال میں سے اس پر خرچ کرے پھر باپ سے اس کا مطالبہ کرے۔ یہ حکم ماں کی موجودگی میں دادا کو نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے کہ دادا کے مقابلے میں ماں بچے سے زیادہ قریب

۱ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقہ والصدقہ علی الاقربین الخ۔ مسند احمد

۲ سرخسی: المبسوط ۵/۲۲۳

۳ ابن نجیم: البحر الرائق ۴/۲۰۸

ہوتی ہے۔

اس طرح فقہ حنفی کی رو سے ماں پر اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری تو نہیں ہے لیکن جب کبھی باپ کو اس کے مالی تعاون کی ضرورت پیش آئے اور وہ تعاون کرنے کی حیثیت میں ہو تو اس کے لیے تعاون کرنا ضروری ہو اس میں شک نہیں کہ اس تعاون کی حیثیت قرض کی ہے لیکن بہرحال ہے یہ تعاون — جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ باپ کی عدم موجودگی میں تو اس کو دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ مل کر بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری براہ راست اٹھانی بھی پڑتی ہے۔ علامہ کاسانی لکھتے ہیں۔

لما جعل اللہ عز وجل کل النفقة
علی الاب لقوله وعلى المولود له رزقهن
وكسوتهن تعذر ايجابها على الام
حال قيام الاب فيجعل على حال
عدمه[1]

وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن
کے ذریعے جب اللہ نے بچے کے پورے نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ڈال دی تو ماں پر بچہ کے نفقے کو واجب قرار دینا دشوار ہے۔ لہذا باپ کی عدم موجودگی میں ماں پر نفقہ واجب ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ باپ کے ساتھ ماں بھی تنگ دست

[1] کاسانی: بدائع الصنائع ۴/۳۲-۳۳

ہو تو اس صورت میں قریب کے رشتہ داروں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ باپ کو قرض دیں۔ قریب کے رشتہ دار نہ ہوں تو دور کے رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی۔

ابن الہمام کہتے ہیں:-

واذا لم يف كسبه بحاجتهم او لم
يكتسب لعدم تيسر الكسب انفق عليهم
القريب ويرجع على الاب اذا ايسر۔

جب باپ کی آمدنی بچوں کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو یا یہ کہ کسی ذریعہ کسب کے نہ ہونے کی وجہ سے باپ نہ کما سکے تو قریبی رشتہ داران پر خرچ کرے گا اور باپ کے لیے جب اس کا ادا کرنا آسان ہو جائے

اس سے اس کا مطالبہ کرے گا۔

اس کے بعد جوامع الفقہ کے حوالے سے اس سلسلے میں یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے۔

اذا لم يكن للاب مال والجد او
الام او الخال او العم موسر يجبر
على نفقة الصغير ويرجع بها على
الاب اذا ايسر وكذا يجبر الابعد
اذا غاب الاقرب ثم يرجع عليه[1]

باپ کے پاس مال نہ ہو اور دادا، یا ماں یا ماموں یا چچا صاحب حیثیت ہو تو اسے بچے کے نفقے پر

[1] ابن الہمام: فتح القدیر ۳/۳۴۴

مجبور کیا جائے گا۔ جب باپ کی مالی حالت ٹھیک ہو جائے تو وہ نفقہ کے اخراجات کا باپ سے مطالبہ کرے گا۔ اسی طرح اگر قریب کا رشتہ دار موجود نہ ہو تو دور کے رشتہ دار کو نفقہ کے لیے مجبور کیا جائے گا اور بعد میں وہ اس سلسلے میں باپ کی طرف رجوع کرے گا۔

اس کی وجہ مبسوط میں یہ بیان کی گئی ہے کہ "نفقہ باپ پر واجب ہے لیکن چونکہ اس کی ادائیگی میں تاخیر نہیں ہو سکتی اس لیے دوسرے کے مال کو باپ کے مال کے قائم مقام سمجھا جائے گا تاکہ بچہ کی ضروریات اس سے پوری کی جا سکیں۔ البتہ یہ باپ کے ذمہ ایک قرض ہوگا، جس کو وہ ادا کرنے کے قابل ہونے کے بعد ادا کرے گا[1]

تنگ دست باپ کی اولاد کے نفقہ پر کوئی بھی دوسرا شخص جو رقم صرف کرتا ہے وہ باپ کے ذمہ قرض اس وقت شمار ہوگی جب کہ وہ جسمانی طور پر محنت مشقت کرنے اور کمانے کے قابل ہو جائے۔ علامہ کاشانی نے اس شرط کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ولو كان الاب معسرا غير عاجز عن الكسب والام موسرة فالنفقة على الاب لكن تؤمر الام بالنفقة ثم ترجع بها على الاب اذا ايسر لانها

تصیر دینا فی ذمتہ[1]

باپ تنگ دست ہو لیکن کسب معاش سے عاجز نہ ہو اور ماں پیسے والی ہو تو نفقہ کی ذمہ داری باپ ہی پر ہوگی البتہ ماں سے کہا جائے گا کہ وہ بچہ کا نفقہ اپنے پاس سے دے اور باپ کے لیے جب گنجائش پیدا ہو جائے تو اخراجات کے لیے اس کی طرف رجوع کرے اس لیے کہ یہ اس کے ذمہ قرض ہے ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

اذا كان الاب معسرا والجد موسر فنفقته على الاب ايضا اذا لم يكن زمنا لكن يؤمر الجد بان ينفق ثم يرجع على الاب اذا ايسر[2]

باپ تنگ دست اور دادا خوش حال ہو تو نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہوگی بشرطیکہ وہ اپاہج نہ ہو البتہ اس صورت میں دادا سے کہا جائے گا کہ وہ بچہ پر خرچ کرے اور باپ جب خوش حال ہو تو اس سے خرچ واپس لے لے۔

فقہ حنفی میں ایک دوسرا نقطہ نظر یہ پایا جاتا ہے کہ باپ فقیر و محتاج ہو تو اس کو مردہ سمجھ کر نفقہ کی ذمہ داری دادا پر ڈال دی جائے۔ ابن نجیم نے اسی کو صحیح نقطہ نظر کہا ہے۔

ان الاب الفقير يلحق بالميت في

---

[1] السرخسی: المبسوط ۵/۲۲۳

[1] کاسانی۔ بدائع الصنائع ۴/۳۴

[2] حوالۂ سابق ص ۳۴

استحقاق النفقة علی الجد وھذا ھو الصحیح[1]

صحیح بات یہ ہے کہ محتاج باپ کو میت کے حکم میں شامل کر دیا جائے گا اور بچہ کا نفقہ دادا پر واجب ہوگا۔

لیکن اس نقطہ نظر پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جب تک آدمی اپنی معاش حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہے خود اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اس کے باپ پر عائد نہیں ہوتی پھر پوتے کے نفقہ کی ذمہ داری اس پر کیسے عائد ہو جائے گی۔ ہاں اگر وہ اپاہج اور معذور ہے تو دادا پر باپ اور پوتے دونوں کا نفقہ واجب ہوگا

چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:۔

انھا لا تجب علی الجد عند وجود الاب القادر علی الکسب الا تری انہ لا یجب علی الجد نفقة ابنہ المذکور فنفقة اولادہ اولی نعم لو کان الاب زمنا قضی بنفقتھم و نفقة الاب علی الجد[2]

باپ کسب معاش کی طاقت رکھتا ہو تو اس کی موجودگی میں اس کے بچہ کا نفقہ دادا پر واجب نہیں ہے اس لیے کہ کسب معاش کی طاقت رکھنے والے لڑکے کا نفقہ ہی جب باپ پر واجب نہیں ہے تو اس کے بچوں (پوتوں) کا نفقہ کیسے واجب ہوگا۔ ہاں باپ اگر اپاہج ہو تو اس کا نفقہ بھی اور اس کے بچوں کا نفقہ بھی دادا پر واجب ہوگا۔

اس پر ایک دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ باپ کے افلاس اور غربت کی وجہ سے جب دولتمند ماں پر بچہ کا نفقہ واجب نہیں ہوتا اور وہ اس مد میں جو کچھ خرچ کرتی ہے اس کا بعد میں بچہ کی ماں، باپ سے مطالبہ کر سکتی ہے تو دادا یا چچا وغیرہ پر بچہ کا نفقہ کیسے واجب ہوگا جبکہ ماں ان سب کی بہ نسبت بچہ سے زیادہ اور قریبی تعلق رکھتی ہے[3]

بہرحال اتنی بات طے ہے کہ آدمی اپاہج اور کمانے کے قابل نہ ہو تو اس کا اور اس کے بچوں کا نفقہ دادا پر واجب ہو جاتا ہے اور وہ ان میں سے کسی سے اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ بحر الرائق میں ہے:۔

ان کان الاب زمنا قضی بنفقة الصغار علی الجد ولم یرجع علی احد بالانفاق لان نفقة الاب فی ھذہ الحالة علی الجد فکذا نفقة الصغار[4]

باپ اپاہج ہو تو عدالت دادا پر چھوٹے بچوں کے نفقہ کو واجب قرار دے گی اور وہ ان بچوں پر جو بھی خرچ کرے گا اس کا وہ باپ سے مطالبہ نہیں

---

[1] ابن نجیم: البحر الرائق ۴/۲۰۹

[2] کاسانی: بدائع الصنائع ۴/۳۲

[3] ابن عابدین: رد المحتار علی الدر المختار ۲/۹۲۴

[4] ابن نجیم: البحر الرائق ۴/۲۰۹

کر سکے گا۔ اس لیے کہ اس صورت میں باپ کے نفقہ کی ذمہ داری دادا پر ہے۔ اسی طرح بچوں کے نفقہ کی بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپاہج اور معذور باپ کے سلسلے میں تو اتفاق ہے کہ اس کا اور اس کے بچوں کا نفقہ ادا یا کسی دوسرے شخص کو اٹھانا چاہیے اختلاف صرف اس میں ہے کہ باپ تندرست اور نادار ہو تو بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری کسی پر عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ اس سے قطع نظر کہ اس مسئلے میں فقہ حنفی کی رو سے کون سا مسلک صحیح ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات زیادہ عملی، زیادہ معقول اور اسلامی مزاج سے قریب تر ہے۔ کہ غریب اور مفلس شخص کو جس کی بظاہر آمدنی کی کوئی صورت نہ ہو، بھی اپاہج کے حکم میں شامل کر دیا جائے اور اس کے بچوں کا معاشی بار ان کی ماں یا کسی دوسرے شخص پر ڈال دیا جائے بشرطیکہ وہ اس کو اٹھانے کی طاقت رکھتا ہو اس کی تائید فقہ کے دوسرے مکاتب سے بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ فقہ حنبلی کی رو سے باپ تنگ دست اور محتاج ہو اور ماں بچوں کا خرچ برداشت کر سکتی ہو تو ان کا نفقہ ماں پر واجب ہوگا۔ اس صورت میں چونکہ نفقہ ماں پر واجب ہو جاتا ہے اس لیے وہ نہ تو باپ کے ذمہ قرض متصور ہوگا [illegible] کی عسرت ختم ہونے کے بعد اس کا ادا کرنا اس کے لیے واجب ہوگا۔[1]

امام ابن حزم کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے عورت پر بھی ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس سے صرف اولاد کا نفقہ مستثنیٰ ہے۔ اگر باپ اس کی قدرت رکھتا ہو تو عورت پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے۔ مسلمانوں کا اسی پر عمل ہے چاہے وہ قدیم ہوں یا جدید۔ لیکن اگر باپ عاجز ہو یا اس کا انتقال ہو جائے اور بچوں کا اپنا مال نہ ہو تو ان کا کھانا کپڑا ماں پر واجب ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے۔

لا تضار والدۃ بولدھا ولا مولود لہ بولدہ

اس سے بڑی ضرر رسانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ماں کے ہوتے اس کے بچے دروازوں پر روٹی مانگتے پھریں۔ علاوہ ازیں جو احکام اس سلسلے میں آئے ہیں وہ مرد یا عورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ایک ہی انداز میں سب سے خطاب کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] ابن قدامہ۔ المغنی ۲۵۷/۹

[2] ابن حزم۔ المحلی ۱۰۹/۹

معذرت

پرمٹ کا کاغذ دیر میں ملنے اور بعض دوسری دشواریوں کی وجہ سے زندگی کی اشاعت بہت پیچھے ہو رہی ہے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ رسالہ وقت پر شائع ہونے لگے۔ بعض اوقات ایسی دشواریاں سامنے آ جاتی ہیں کہ ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں خود رسالے کے لیٹ ہو جانے کا شدید احساس ہے۔ (ادارہ)

رویتِ ہلال سے متعلّق

چند سوالات کے جوابات

(مولانا عبدالوہاب صاحب' رامپور)

محترمی مولانا عبدالوہاب صاحب رامپور کے علماء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انھوں نے رویتِ ہلال سے متعلق ریڈیو' ٹیلی فون' وائرلیس' ٹیلی گرام اور خطوط کی خبروں کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں چند سوالات کے اصولی اور مدلل جوابات تحریر فرمائے تھے' ہم موصوف کی وہ تحریر شکریے کے ساتھ یہاں شائع کر رہے ہیں۔

(ادارہ زندگی)

نئے حالات اور نئے ظروف کے ساتھ نئے حوادث اور نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن سے صرفِ نظر قریب قریب ناممکن ہے۔ ان نت نئے پیش آنے والے مسائل کے بارے میں جہاں مفتیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بے کم و کاست اسلامی حکم بیان کر دیں وہاں ان کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ حالات اور ظروف کو سمجھیں' ان کے تقاضوں کا صحیح جائزہ لیں اور مصالح کا حتی الامکان لحاظ کریں۔ وقت کے قابلِ غور اور اہم مسائل میں سے ریڈیو اور ٹیلی فون کی خبروں کی شرعی حیثیت کا بھی مسئلہ ہے۔ علماء نے پہلے تو شرعی امور میں ان آلات کی خبروں کا اعتبار نہیں کیا تھا خود خاکسار کی بھی ابتداءً یہی رائے تھی

لیکن حالات کا دباؤ برابر اس رائے کے خلاف بڑھتا گیا اور رائے میں ترمیم و نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی گئی سیاسی' معاشی' معاشرتی ہر طرح کے معاملات میں ان آلات کی خبروں پر اعتماد و اعتبار کیا جا رہا ہے اور ہماری حیات کے ہر قسم کے شعبے اور ہمارے ہر طرح کے ادارے ان آلات سے دی ہوئی خبروں سے اثر پذیر بھی ہوتے ہیں اور اثر انداز بھی۔ قومی اور بین الاقوامی دونوں طرح کے معاملات میں ان آلات کی خبروں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ خواص و عوام' تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب ان سے دی ہوئی خبروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ قومی یا بین الاقوامی شخصیت کی

تقریر یا پیغام جان آلات کی مدد سے پہنچتا ہے اس کو اسی شخصیت سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں شرعی امور میں ان وسائل کو قطعی نظر انداز کر دینے کی توجیہ تشفی بخش نہیں ہوتی۔ چنانچہ اب علماء بھی پرانی رائے سے مطمئن نظر نہیں آتے اور قابل قبول اور تشفی بخش حل نکالنے کی طرف متوجہ ہیں۔ ساتھ ساتھ مسئلہ بھی ہر بار پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ پیش آگے چلا جا رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر رمضان و عید کے بارے میں رویت ہلال کی ریڈیو اور ٹیلی فون سے اطلاع ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ سال جمعیۃ العلماء کے دہلی کے اجتماع میں یہ مسئلہ پیش ہوا لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ مراد آباد کے اجلاس میں زیر بحث آیا اور اخبار الجمعیۃ کے بقول علماء کرام نے ایک اطمینان بخش فیصلہ فرما دیا لیکن یہ فیصلہ ناچیز کے خیال میں مختصر بھی ہے اور شاید نامکمل بھی جس کی وجہ عجلت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ بھارت میں پیش آنے والی صورتوں میں سے غالباً سب سے زیادہ غیر اغلب صورت کا یہ جواب ہے۔ اغلب صورتوں کے بارے میں یہ فیصلہ تشفی بخش نہیں ممکن ہے آئندہ کسی موقع پر مکمل اور مفصل فیصلہ ہو جائے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم نے ایک سوال کے جواب میں اس فیصلے کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالی ہے لیکن خاکسار کے خیال میں مسئلے کی پیچیدگی پھر بھی دور نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ باوجود شدید ضرورت کے یہ مسئلہ ابھی اس منزل میں نہیں پہنچا جس میں اس مسئلے کے تمام گوشے پوری طرح صاف ہو جائیں۔

گذشتہ سال خاکسار نے ناظم صاحب جمیعۃ العلماء کی خدمت میں ایک تحریر بھیجی تھی جو اس مسئلے کے بعض گوشوں کی تفصیل سے متعلق تھی لیکن شاید اس کو اجتماع میں پیش ہونے کا موقع نہیں آیا۔ چنانچہ اسی تحریر کو حذف و اضافات کے ساتھ اس وقت پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی فقط اتنی غرض ہے کہ علماء کو غور کرنے کے لیے کچھ مواد مہیا ہو جائے۔ یہ تحریر فی الحال مسودے سے زیادہ نہیں۔ اگر حضرات علماء کرام اس کی تصحیح فرما دیں یا کوئی دوسرا حل پیش فرما دیں جو مسئلے کے سب پہلوؤں پر حاوی ہو تو میری غرض حاصل ہو جائے گی۔

خاکسار عبدالوہاب

استفسار

۱۔ ہلال رمضان و عید کی رویت کے متعلق ریڈیو سے نشر کی ہوئی اطلاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا اس اطلاع کی بنا پر رویت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

۲۔ رویت ہلال کی شہادت ٹیلی فون پر دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

۳۔ وائرلیس، ٹیلی گرام اور خطوط سے دی ہوئی خبروں کی شرعاً کیا حیثیت ہے

۴۔ ایک یا ایک سے زائد حسب ضرورت اہل شہادت پشاور یا جمبئی وغیرہ دور دراز مقامات سے چاند دیکھ کر ہوائی جہاز سے رات ہی رات میں آجائیں اور رویت کی شہادت

دیں تو بھارت کے رہنے والوں پر روزہ یا افطار واجب ہو جائے گا یا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شرعاً اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کے حدود کیا ہیں؟

جواب

احکام شرعیہ کا اصل ماخذ کتاب و سنت ہے ان کے بعد ان کلیات کا مرتبہ ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ پھر فقہی نظائر کا درجہ ہے۔ ان سوالات کے جوابوں میں بھی فقہاء کے ان مسلم طریقوں کا برتنا مفید ہوگا۔ قبل ازیں کہ اصل جواب دینے کی کوشش کی جائے چند باتوں کا پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا۔

(الف) شہادت اصل میں یقینی خبر کو کہا جاتا ہے شرعاً اس یقینی خبر کو شہادت کہتے ہیں جو اثبات حق کے لیے مجلس قضا میں بالفاظ شہادت بیان کی جائے۔ اسلام، بلوغ، عدالت، مروت، ضبط (وقت تحمل و ادا) جس طرح شہادت کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح خبر کے لیے بھی ضروری ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ شہادت کے لیے حریت، عدد، ذکورت وغیرہ کی بھی ضرورت ہے اور خبر کے لیے نہیں۔

(ب) شہادت خود مقصود نہیں بلکہ مشہود بہ کے بارے میں علم یا غالب ظن مقصود ہے[1]۔ چنانچہ ذاتی علم کی بنا پر قاضی کے لیے فیصلہ دینا جائز ہے۔ اصل مذہب یہی ہے یہ الگ بات ہے کہ حالات کے تقاضوں، دیانت کی کمی اور بے لاگ غیر جانبداری کے فقدان نے فقہاء کو اصل مذہب میں ترمیم کرنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے محض قاضی کے علم کو فیصلے کے لیے ناکافی ہونے کا فتویٰ دیا۔

(ج) عام حالات میں مشہود علیہ کو دیکھے اور پہچانے محض اس کی آواز پہچان کر شہادت دینے کا اعتبار نہیں اسی طرح خود شاہد کا مجلس قضا میں حاضر ہونا بھی ضروری ہے لیکن خاص حالات میں جبکہ قرائن مشہود علیہ کو متعین کر دیں تو چونکہ اصل مقصود مشہود بہ کے بارے میں علم یا غالب ظن حاصل کر لینا ہے، شہادت بالسمع بھی معتبر ہے[2]۔ اسی طرح اگر حالات اور قرائن شاہد کو متعین کر دیں

---

[1] وھذا لان المقصود من البینۃ لیس بیننا بل حصول العلم بالشہادۃ علی غالب الرای و اکثر الظن والحاصل بالحس والشاھدۃ علم القطع و الیقین (باقی کالم ۲ پر)

فکان ھذا اقوی فکان القضاء بہ اولی۔ (بدائع الصنائع جلد ہفتم ص)

[2] محققین فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر قرائن ہوں اور اشتباہ کا احتمال نہ ہو تو آواز کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسی پر مختبی کی شہادت تسلیم کی گئی ہے۔ اکثر محدثین فقہا نے نابینا کی شہادت کا اعتبار کیا ہے چنانچہ حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ والشہادۃ بالسمع غیر الشہادۃ بالسامع والاولی جائزۃ مطلقا فاد قلت ان الصوت یشبہ الصوت قلنا نعم ولکنہ اعتبروا القرائن فاذا تبین بالقرائن انہ صوت فلان جاز ان یشہد بہ (فیض الباری سوم ص)

اس کا مجلس قضا سے مستور ہونا بھی مضر نہیں ہونا چاہیے۔[1]

(د) ہلال رمضان اور ہلال عید دونوں کی روئیت کے ثبوت کے لیے خبر مستفیض کا بھی اسی طرح اعتبار ہے جس طرح شہادت کا۔ روئیت ہلال کے بارے میں خبر مستفیض کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شہر یا قصبے سے لوگوں نے روئیت ہلال کی بنا پر روزہ رکھا ہے۔ اگرچہ ان جماعتوں نے نہ قاضی کا فیصلہ سنا ہے اور نہ شہادتیں سنی ہیں۔ فقہاء کے نزدیک ایسی خبر متواتر جیسی ہے اور علم و یقین کے لیے کافی

---

[1] روئیت ہلال کے مسائل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء نے روئیت کے ثبوت کو قضاء قاضی پر کلیۃً منحصر نہیں کر رکھا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خود ہلال دیکھے تو محض ذاتی روئیت سے اس پر روزہ واجب ہو جاتا ہے۔ گو قاضی کی موجودگی میں محض اپنی روئیت کی بنا پر افطار نہیں کر سکتا جس کی وجہ اتباع مسلمین کے علاوہ خود روئیت کی مشکوکیت بھی ہے۔ استفاضہ کی حالت میں بھی قضا کا سوال فقط استفاضہ اور شہرت کے امتیاز کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ جم غفیر یا دو شاہدوں کی شہادت حسب ضرورت موجب عمل ہو جاتی ہے۔ اب اگر قاضی موجود ہو اور وہ ان شہادتوں کو قبول نہ کرے تو محض اس لیے کہ یہ شہادتیں قابل اعتماد نہیں ہیں یا سرے سے شہادتیں ہی نہیں ہیں اصل روئیت مشتبہ ہو جاتی ہے اس لیے موجب عمل نہیں رہتی۔ غرض یہ ہے کہ اس میں اصل یہ ہے کہ ثبوت روئیت خود مکلفین کے لیے کسی حد تک متیقن اور مظنون ہے۔ چنانچہ روئیت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں خصوصیت سے اصل مقصود روئیت کا ظن غالب ہے، وہ جس طرح بھی حاصل ہو۔ علاوہ ازیں معاملات میں شاہدوں کے لیے محض آواز سن کر کسی حق کے ثبوت کے لیے شہادت دینی جائز ہے بشرطیکہ قرائن آواز کے اشتباہ کو رفع کر دیں اور قاضی کو حقوق عباد جیسے ذمہ دارانہ قضیے میں اس قسم کی شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ گویا فیصلہ دینے کے لیے نہ مشہود علیہ کا مشاہدہ ضروری ہے اور نہ شہادت دینے کے لیے بلکہ قاضی اور شاہدوں کا یقین بلکہ ظن غالب کافی ہے کہ مشہود علیہ حقیقۃً وہی ہے جس کے بارے میں شہادت دی جارہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر عینی شاہد قاضی کی نظروں سے اوجھل ہوں لیکن قرائن شاہدوں کی شخصیت متعین کر دیں اور اشتباہ کا احتمال نہ ہو تو محض آواز کی بنا پر قاضی کے لیے فیصلہ دینا جائز ہے یا نہیں، خصوصاً حقوق اللہ اور خالص عبادات میں۔ مجھے اس بارے میں کوئی فقہی روایت نہیں ملی قیاس یہ چاہتا ہے کہ قاضی کو ایسے شاہدوں کی شہادت پر فیصلہ کرنے کا حق ہے، کیونکہ مشہود علیہ کے مخفی ہونے کی صورت میں وہ شاہد تو پہچان سکتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ شاہد کی مجلس قضا کی موجودگی کے بعد بھی ان کی شخصیت کے تعین کا (اگر قاضی پہلے سے ان کو بطور خود نہ جانتا ہو) اور ان میں شرائط شہادت کی موجودگی دونوں ہی دونوں قاضی کے مشاہدے سے خارج ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں دوسرے ذرائع سے جو کچھ بھی علم ہوتا ہے وہ بہرحال مشاہدہ نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سمجھی گئی ہے ¹

(۱۱) رویت ہلال کے بارے میں ظن غالب ہو جانا روزے یا افطار کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ اگر کسی آبادی میں رویت نہ ہو لیکن کسی دوسری آبادی کی ایسی علامتیں نمایاں ہوں جو وہاں رویت ہلال کے لیے مقرر ہیں مثلاً توپوں کا دغنا یا قندیلوں کا جلنا، تو اس آبادی کے لیے بھی رویت ثابت ہو جاتی ہے ²

(۱۲) زمانے کے حالات اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت اصول کو سامنے رکھتے ہوئے شرعی مصالح کے پیش نظر فرعی احکام میں تغیر و تبدل کی گنجائش ہے ³ بلکہ چنانچہ رویت ہلال کے سلسلے کی ہی بہترین مثال یہ ہے کہ مطلع صاف ہونے کی حالت میں جم غفیر کی شہادت ضروری سمجھی جاتی تھی لیکن شوق کی کمی اور عام کسل و سستی کے پیش نظر فقہاء کو محض دو شخصوں کی شہادت کو کافی ماننے کو اختیار کرنا پڑا ⁴

ان تمہیدی اصول کی صحت کی صورت میں امور مستفسرہ کا جواب چنداں دشوار نہیں اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا فیصلہ تشفی بخش طریقے سے ہو سکے گا۔

---

¹ نعم لو استفاض الخبر فی البلدة الاخری لزمهم علی الصحیح من المذهب ۔۔۔۔ وفی الذخیرة قال شمس الائمة الحلوانی الصحیح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض و تحقق فیما بین اهل البلدة الاخری یلزمهم حکم هذه البلدة ومثله فی الشرنبلالیة عن المغنی ۔ قلت وجه الاستدراك ان هذه الاستفاضة لیس فیها مشاهدة علی قضاء قاض ولا علی شهادة لکن لما کان بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا یوم کذا الزم العمل بها وقال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تاتی من تلك البلدة جماعات متعددون کل منهم یخبر عن تلك البلدة انهم صاموا عن رؤیته لا مجرد الشیوع من غیر علم بمن شاعه ۔ (شامی جلد دوم ص۱۲۱)

گویا شہود شہر اور ظہور ہلال کا تو رویت پر موقوف ہے لیکن جو صوم یا افطار کے لیے رویت ضروری نہیں بلکہ غیر رویت کا متعلق [illegible] ہونا کافی ہے

---

² قلت الظاهر انه یلزم اهل القری الصوم بسماع المدافع او رؤیة القنادیل من المصر علامة ظاهرة تفید غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل کما صرحوا به (شامی جلد دوم ص۱۲۵)

³ اقول انت خبیر بان کثیرا من الاحکام تتغیر بتغیر الزمان ۔ (شامی جلد دوم ص۱۲۱)

⁴ وعن الامام انه یکتفی بشاهدین واختاره فی البحر حیث قال وینبغی العمل علی هذه الروایة فی زماننا لان الناس تکاسلت عن ترائی الاهلة (شامی جلد دوم ص۱۲۱)

جواب ۱

رویت ہلال کے بارے میں ریڈیو سے اعلان کی چند صورتیں پیش آتی ہیں۔

۱۔ ملک کے متعدد گوشوں کے اسٹیشنوں سے متعدد مقامات کی رویت کا اعلان۔

۲۔ متعدد اسٹیشنوں سے کسی ایک ہی مقام کی رویت کا اعلان

۳۔ کسی ایک ہی اسٹیشن سے صرف مقامی رویت کا اعلان

۴۔ کسی ایک ہی اسٹیشن سے غیر مقامی رویت کا اعلان

۵۔ کسی ایک ہی اسٹیشن سے مقامی اور غیر مقامی رویت کا اعلان۔

پہلی دونوں صورتوں میں رویت کا ظن غالب ہو جاتا ہے۔ عوام و خواص، عالم و جاہل کسی کو بھی اس اعلان کی صحت میں شبہ نہیں رہتا۔ متعدد اسٹیشنوں سے متعدد مقامات یا ایک ہی مقام کی رویت کے اعلان کی حیثیت موجودہ ماحول کے اعتبار سے متعدد جماعتوں کے آنے اور رویت کی خبر دینے سے غلبۂ ظن پیدا کرنے میں کسی طرح کم نہیں قرار دی جا سکتی۔ چنانچہ اس کی نوعیت مستفیض خبر کی سی ہے۔ متعدد ٹیلی گرام ریڈیو اور متعدد خطوط سے حاصل کی ہوئی خبریں اکثر علماء کے نزدیک استفاضہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں[۱] باوجودیکہ ٹیلی گرام صوتی رموز ہوتے ہیں اور خطوط تحریری علامتیں تو ریڈیو کے متعدد اعلان جو انسانی الفاظ ہیں اور مقررہ افراد کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور سامعین ان کو خود سنتے ہیں۔ استفاضے کی حیثیت کیوں نہیں کہیں گے۔ استفاضے میں چونکہ شہادت اور اس کی شرائط وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے ان اعلانوں میں بھی نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں اگر محض توپوں کی آواز سے اور قندیلوں کی روشنی سے بشرطیکہ انہیں رویت ہلال کی علامت قرار دے دیا گیا ہو روزہ اور افطار دونوں ثابت ہو جاتے ہیں تو مختلف آبادی سے رویت کے اعلان روزے یا افطار کے موجب کیوں نہ ہوں۔ آخری تینوں صورتوں میں چونکہ صرف ایک اسٹیشن سے اعلان ہے اس کو استفاضہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور بشرطیکہ عوام یا حکومت نے صراحۃً یا حکماً ریڈیو کے مقامی اعلان کو واقعی رویت کی علامت بنانے کا التزام نہ کیا ہو نہ اس کی صحت کی خصوصی ذمہ داری لی ہو۔ تیسری اور چوتھی صورت کے اعلان کو علامت نہیں کہا جا سکتا اس لیے ان سب صورتوں کی حیثیت خبر کی سی ہے اور غلبۂ ظن پیدا کرنے کے لیے خبر میں جو شرائط شرعاً ضروری ہیں۔ وہ اس اعلان میں مفقود ہیں اس لیے جب تک دوسرے ذرائع سے غلبۂ ظن نہ پیدا ہو محض یہ اعلان نامعتبر سمجھا جائے گا۔

جواب ۲

ٹیلی فون پر شہادت کی نوعیت پس پردہ شہادت کی طرح ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پس پردہ میں فاصلہ کم ہوتا ہے

---

[۱] اور یہی حال ہے تار برقی کا بدون استفاضہ کے مذکور کے موجب عمل نہیں لیکن ایسی صورت میں کہ ظن حاصل ہو جائے اور شبہ قوی کا باقی نہ رہے اور خبر تار یا خط بدرجہ کثرت پہنچ جائے تو ایسی شکل ہو سکتی ہے۔ فتاویٰ عبدالحی جس کا ایسی قسم پر مشاہیر علماء کے دستخط ہیں۔

اور فون میں بہت زیادہ بھی۔ تاہم آواز پہچانی جاتی ہے اور شاہد کا اگر نام معلوم ہوا اور اس کی آواز پہلے سے فون پر سنی ہوئی ہو تو کہنے والے کہتے ہیں کہ اشتباہ قطعاً جاتا رہتا ہے۔ بہرحال اگر شاہد اور قاضی ایسی حیثیت میں ہیں کہ قاضی کو اس کے تعین میں اشتباہ باقی نہیں ہے اور اس میں حضور مجلس کے علاوہ شہادت کی سب شرائط پائی جاتی ہیں تو اس شہادت کو نہ قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چناں چہ اگر نصاب مکمل ہوا اور شرائط شہادت ہوں تو محض ایک فون کی شہادت پر روزے یا افطار کا حکم دیا جائے گا اور اگر شرائط نہ ہوں تو محض خبر رہے گی۔

چنانچہ اگر متعدد افراد کے متعدد فونوں سے اس خبر کی توثیق ہو کر یہ خبر مستفیض کا درجہ حاصل کرلے تو اس پر مستفیض کا حکم جاری کیا جائے گا۔

جواب ۳

علماء مصر نے ٹیلی گرام کی خبروں کو شرعاً معتبر تسلیم کیا ہے (جہاں تک وائرلیس کا تعلق ہے بے تار والے ٹیلی گرام کے ہی حکم میں ہے) لیکن علماء ہند شرعاً امور میں عموماً ٹیلی گرام کا اعتبار نہیں کرتے الا یہ کہ استفاضے کے درجے کو پہنچ جائے۔

خطوط کی حیثیت بھی ٹیلی گرام سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ ٹیلی گرام عموماً رموز ہیں اور خطوط منقوش علامتیں۔ دوسرے یہ کہ خطوط اگر ہاتھ سے لکھے ہوں تو کاتب کے خود نقوش دیکھ کر بھی تعین کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اشتباہ خطوط کا احتمال باقی رہتا ہے لیکن ٹیلی گرام میں یہ بھی ممکن نہیں بہرحال ان میں سے کوئی بھی الفاظ کی نوع سے نہیں کہ اس کو خبر یا شہادت کہا جاسکے۔ تاہم قیاس یہ چاہتا ہے کہ ٹیلی گرام اور خط دونوں قرائن اور حالات کے ساتھ بھیجنے والے کی حیثیت قاضی کے غلبۂ ظن کے سامنے رکھ کر ثبوت رویت یا عدم ثبوت رویت کا حکم ہونا چاہیے۔ اطلاقی حکم غالباً زیادہ صحیح نہ ہو۔

جواب ۴

اختلاف مطالع کے اعتبار کرنے اور نہ کرنے میں علماء اور مشائخ کا اختلاف ہے۔

حنابلہ اور اکثر حنفیہ مطالع کے اختلاف کا قطعی اعتبار نہیں چناں چہ اگر مشرق کے رہنے والوں کے پاس مغرب کی رویت ہلال کی شرعی شہادت پہنچ جائے تو اسی کے مطابق روزہ یا افطار واجب ہوگا۔ شافعیہ اور محققین حنفیہ کے نزدیک مطالع کے اختلاف کا اعتبار کیا جائے گا۔[1]

[1] اهل بلدة اذا رای الهلال یلزم فی حق کل بلدة اختلف المشائخ فیه فبعضهم قالوا لا یلزم وفی الخانیة لا عبرة باختلاف المطالع فی ظاهر الرو وفی القدوری ان کان بین البلدتین تفاوت لا یختلف بالمطالع یلزم وذکر شمس الائمة الحلوانی انه الصحیح من مذهب اصحابنا تاتارخانیه۔ و قیل یختلف ثبوته باختلاف المطالع واختاره صاحب التجرید قال الطحطاوی و هو الاشبه۔ مراقی الفلاح اکثر المشائخ علی انه لا یعتبر اختلاف المطالع فی الا

قاضی ابن رشد نے مالکیہ کا اس مسئلے پر اجماع نقل کیا ہے۔ حضرت مولانا انورشاہ صاحب[1] اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب[2] نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا ہے اور یہی مسلک روایت اور درایت کے مطابق ہے اور اس زمانے میں اسی پر فتوی دینا مناسب ہے۔ جن لوگوں نے اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے ان میں باہم اس مسافت کی مقدار میں اختلاف ہے جس میں اختلاف مطالع کا لحاظ کیا جائے گا۔ زیادہ تر فقہاء نے ایک مہینے کی مسافت کا اختلاف مطالع کے سلسلے میں اعتبار کیا ہے لیکن اس کا میلوں میں تحویل کرنا اشکال در اشکال پیدا کرتا ہے۔ اس بارے میں سب سے بہتر اور سب سے سہل صورت یہ ہے کہ ہیئت و جغرافیہ کے جدید معلومات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں جو معلومات میں نے حاصل کی ہیں وہ یہ ہیں۔

غروب آفتاب کے وقت اگر ہلال افق سے آٹھ درجے بلند یا دوسرے لفظوں میں اگر ہلال غروب آفتاب کے وقت اتنا بلند ہو کہ اس کے غروب میں ۳۲ منٹ صرف ہوں تو اس مقام سے جانب شرق میں ۵۶۰ میل تک افق کے اوپر ہلال رہے گا اور ان سب مقامات پر اس کو دکھنا چاہیے جو اس جگہ سے ۵۶۰ میل تک جانب شرق میں ہیں۔ ہر ستر میل پر ایک درجے کا فرق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقام سے ۷۰ میل بجانب شرق ہلال کی بلندی سات درجے ہو جائے گی اور ۷۰ میل غرب ہلال کی بلندی نو درجے پر ہو جائے گی۔ چنانچہ جس مقام پر بھی رویت ثابت ہو جائے گی تو اس سے بجانب غرب آبادی میں رویت فن ہیئت کے اعتبار سے مسلم سمجھی جائے گی۔

اس توضیح کے بعد اصل سوال کا جواب کھلا ہوا ہے کہ اگر کسی جانب غرب کی آبادی میں رویت ہلال ثابت ہو جائے تو اس کی شرقی آبادیوں ۵۶۰ میل تک رویت کا اعتبار ہوگا۔ اس کے بعد نہیں اور غربی جانب میں بلا خصوصیت فاصلہ رویت مسلم ہوگی۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

(بقیہ حاشیہ ص۲۰۲) انہ یعتبر لان کل قوم مخاطبون بما عندھم وانفصال الھلال من شعاع الشمس یختلف باختلاف الاقطار والدلیل علی اعتبارہ ما روی عن کریب ان ام الفضل بنت الحارث بعثتہ الی معاویۃ بالشام قال فقدمت بالشام فقضیت حاجتہا واستھل علی رمضان وانا بالشام فرایت الھلال لیلۃ الجمعۃ ثم قدمت المدینۃ فی اخر الشھر فسالنی عبد اللہ بن عباس ثم ذکر الھلال فقال متی رایتم الھلال فقلت رایناہ لیلۃ الجمعۃ فقال انت رایتہ فقلت نعم وراٰہ الناس وصاموا وصام معاویۃ فقال لکنا رایناہ لیلۃ السبت فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلثین او نراہ فقلت اولا نکتفی برویۃ معاویۃ وصیامہ فقال لا ھکذا امرنا رسول اللہ ﷺ رواہ مسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی۔ واضح رہے کہ شام، مدینہ منورہ سے شمال میں واقع ہے اور ان دونوں میں تقریباً ۔ ۷ میل کی مسافت ہے اتنا بعید مسافت کی وجہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے۔ [1] العرف الشذی [2] فتاوی عبدالحی جلد اول

سوامی ویکانند اور مساوات کا اسلامی پیغام

مولینا محمد عثمان فارقلیط

آج انسانی مساوات پر بہت زور دیا جا رہا ہے کوئی حکومت نہیں جو مساوات اور بھائی چارہ پر زور نہ دیتی ہو متحدہ اقوام کے منشور میں بھی انسانی مساوات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کا سسٹم قدیم زمانے سے جاری ہے۔ کروڑوں انسانوں کو اچھوت اور نیچ قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن یہاں بھی مساوات اور بھائی چارے کا شور بلند ہے اور ہمارے دستور نے چھوت چھات کو قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔ اگرچہ مذہب کے سامنے قانون شکست کھا چکا ہے۔ پھر بھی حکومت اور سنجیدہ عوام یہی چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی پیشانی کا یہ داغ مٹ جائے اور ہمارا ملک انسانی مساوات کے لحاظ سے ایک مثالی ملک ثابت ہو۔

یہ بات ماننی پڑے گی کہ انسانی مساوات کا اولین تصور ہندوستان کو اسلام نے دیا۔ بعض یورپی مصنفین نے لکھا ہے کہ یورپ صدیوں عیسوی تک عیسائی دنیا انسانی مساوات اور بھائی چارے سے واقف تک نہ تھی۔ جب اسلام کا یہ پیغام پہنچا تو یورپ کی آنکھیں کھلیں۔ یہ تاسف کی بات ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اس دین کا مشکل ہی سے اعتراف کیا جاتا ہے، بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ مساوات کے اسلامی پیغام کا کوئی تذکرہ نہ ہو اور اس کا ذکر اس طرح آئے گویا یہ پیغام بھی قدیم ہندوستان ہی نے دیا ہے۔ ہندوستان کو اسلام نے جو جو نعمتیں دی ہیں ان کو پوری دلیری کے ساتھ اپنی طرف منسوب کر لیا گیا۔ اسلام نے لڑکیوں کا ورثہ مقرر کیا اور جب ہندو کوڈ بل کے ذریعے اصلاح کی گئی تو اسلام کو یہ انعام ملا کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں امتیاز کرتا اور لڑکیوں کو نصف ورثہ دلاتا ہے۔

دنیا کے لیے خاص طور پر انسانی مساوات اور بھائی چارہ بہت بڑی نعمت ہے اور یہی ہندوستانی قوم کی ترقی کی بنیاد ہے اس معنے میں مسلمانوں کا وجود بھی ملک کے لیے بہت

بڑی نعمت ہے۔ مسلمانوں سے مل جل کر ہی یہاں انسانی قدروں کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ہم اس بارے میں سوامی وویکانند کی ایک شہادت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے خطوط جو انگریزی میں ہیں آدیتہ آشرم دلنگڈن لین ۱۲ نے شائع کیے ہیں خط کا نمبر CLXXVI ہے جو کتاب مذکور کے صفحہ ۵۱۸ پر درج ہے سوامی جی نے یہ خط الموڑہ سے ۱۰ رجون ۱۸۹۸ء میں اپنے ایک دوست سرفراز حسین کو نینی تال تحریر کیا تھا۔ اس خط میں مذکور ہے:۔

> ویدانت کے فلسفہ کا سہرا ہندوؤں کے سر بندھنا چاہیے۔ دوسروں نے اس فلسفہ کی صرف خوشہ چینی کی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہودیوں اور عربوں کے مقابلے میں ہندو قدامت کے علمبردار ہیں لیکن جہاں تک انسانی مساوات کے عملی پہلو کا تعلق ہے اسے ہندوؤں میں کبھی نشو ونما پانے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے خلاف میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر مساوات کو کسی مذہب نے قائم کیا ہے اور اسے قابل قبول طریقے پر پھیلایا تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں عملی مساوات کی مدد کے بغیر ویدانت کی تھیوری خواہ وہ کتنی ہی حیرت انگیز اور بہتر ہو عوام کے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اور ہند ہی وہ مقام اتصال ہے جہاں ہندو ازم اور اسلام مل کر انسانیت کے لیے پیغام امید بن سکتے ہیں۔ ہندوؤں میں وویکانند جی بہت بڑے ریشی شمار کیے

جاتے ہیں۔ بہت سے ہندو اہل قلم نے آنجہانی کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اور ان کی انسانی خدمات کو بے حد سراہا ہے لیکن انھوں نے سوامی جی کے مندرجہ بالا خط پر بحث تو کیا کرنی تھی اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ گورو گولوکر کی بنچ آف تھاٹ کے اسلام دشمن مضامین اکثر لوگوں کو ازبر ہوں گے لیکن ان کا یہ خط چونکہ اسلام کی برتری اور اس کے بنیادی پیغام کا حامل تھا اسی لیے کسی کی زبان پر اس کا کوئی تذکرہ نہیں سا کروڑ لوگ ہرشی سوامی دیانند اور گول والکر کی تحریروں اور خیالات سے متاثر ہیں لیکن ان کا حافظہ سوامی وویکانند کے اس خط اور اس کے مضمون سے بالکل خالی ہوگا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان کی یہ بات کسی کے دل کو اپیل نہ کر سکی۔ کہ انسانی مساوات اور انسانی قدروں سے اسلام ہی نے ہندوستان کو روشناس کیا اور اسی سنگم پر دونوں طبقے انسانیت کے لیے پیغام امید بن سکتے ہیں۔ کیا حکومت کا فرض نہیں کہ وہ سوامی وویکانند جی کے اس خط کو عام کرے اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں اسے آویزاں کر کے ملک کے اتحاد کو تقویت پہنچائے؟

مسلمانوں کو اس بات پر فخر ہے کہ انھوں نے ہندوستان آکر یہاں کی آبادی کو بہت کچھ دیا۔ یہ دوسروں کا ظرف ہے کہ وہ اسلام کے احسانات کا اعتراف تک نہ کر سکے۔ لیکن یہاں آکر اب تک مسلمانوں نے دوسروں سے کچھ نہیں لیا کیونکہ دوسروں سے لینے والی بھی باتیں خود اسلام میں موجود ہیں انہیں نہ دریافت کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ کسی دوسرے نظریہ حیات کی۔ یورپ نے بھی اسلام اور مسلمانوں (باقی صفحہ پر)

میں ظالم کے ہر فیصلے کو

خندہ پیشانی سے قبول کروں گا

آمریت کے خلاف جہد آزادی کا اعلان

فلپائن میں جہاں آج کل مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کی "مقدس جنگ" جاری ہے پہلے ایک جمہوری نظام تھا گیارہ ماہ ہوئے اس کے صدر نے اچانک ملک کی تمام اسمبلیاں اور دستور توڑ کر مارشل لا نافذ کر دیا۔ مارشل لا کے پردے میں صدر مارکوس نے اپنے تمام حریفوں کو پکڑ لیا اور ان میں سے بیشتر آج تک جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ مارکوس کا ایک پرانا حریف لبرل پارٹی کا جنرل سکریٹری اکینو تھا یہ اس سے پہلے سینیٹر بھی رہ چکا ہے۔ مارکوس نے مارشل لا نافذ کرتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اکینو کو متعدد الزامات میں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔ یہ الزامات ناجائز اسلحہ رکھنے اور قتل اور کمیونسٹ باغیوں کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف سازش کرنے کے تھے۔ اگر یہ الزامات واقعی طور پر ثابت ہو جاتے ہیں تو اکینو کے لیے موت سے کم سزا نہیں ہو سکتی لیکن فلپائن کے سیاسی حلقے خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام الزامات حقیقت میں سیاسی انتقام کی حیلہ سازی ہے۔

پچھلے ماہ جب اکینو کو فوجی عدالت میں سماعت کے لیے پیش کیا گیا تو اس نے عدالت سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا مجھے اس عدالت سے انصاف کی کوئی توقع نہیں جسے مارکوس نے اپنی مرضی سے مرتب کیا ہے۔ یہ عدالت مجھے چھوڑنے کا اختیار نہیں رکھتی صرف مارنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس لیے میں اس عدالتی کارروائی کے ڈھونگ کا شریک کار نہیں بننا چاہتا مجھے اپنی کال کوٹھری میں واپس بھیج دیجیے۔

عدالت کے سربراہ یہ سن کر گم سم بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے اکینو کو اپنا بیان داخل کرنے کی اجازت دے دی جو عدالتی کارروائی کا حصہ بن کر عالمی پریس میں چھپ چکا ہے۔ یہ عدالتی بیان اپنے اسلوب اور مضمون کی بنا پر آمریت کے خلاف جدوجہد کی تاریخ میں ایک روشن باب بن گیا ہے۔ جب اکینو اپنا بیان

پڑھ رہا تھا تو کمرۂ عدالت میں کوئی آنکھ نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔ قریب دو صد اخباری رپورٹر موجود تھے ان میں اکثر عالمی پریس سے تعلق رکھتے تھے اور اکینو کے اس بیان کے بارے میں خود صدر مارکوس کو اتنا اضطراب تھا کہ ایک اطلاع کے مطابق اس نے یہ ساری کارروائی اپنے ٹیلی وژن پر دیکھی۔

اکینو کا احتجاج خالی نہ گیا اور دنیا داری کے لیے مارکوس نے فوجی عدالت کی بجائے اکینو کا مقدمہ سننے کے لیے ایک پانچ رکنی ٹریبونل مقرر کر دیا۔

بیان اکینو

پچھلے گیارہ ماہ سے میں اپنے بیوی بچوں سے جدا کر دیا گیا ہوں۔ میں بنیادی حقوق شہریت سے محروم ہوں اور میری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ پچھلے چھ ماہ سے میں قریب قریب مکمل قید تنہائی میں ہوں۔ میں نے بھیانک تنہائی کو بھی کاٹا ہے اور رسوائی کے تلخ جام بھی انڈیلے ہیں۔ اس تنہائی میں مجھے سوچنے غور کرنے اور دعا کرنے کا وافر موقع میسر آیا ہے۔ انسانی صحبت کے انقطاع نے میرے اندر سے تمام نفرت تلخی اور غیظ کو دھو کر رکھ دیا ہے۔

میں نے اس پر بھی غور کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مسٹر مارکوس نے جمہوریہ فلپائن پر مارشل لا کے ذریعے اپنا اقتدار قائم کرنے کا کیوں فیصلہ کیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس کی جگہ کھڑا کر کے سوچا اور اس کو ہر شک کا فائدہ دیا لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس کی اس حرکت کے لیے کوئی وجہ جواز نہ مل سکی۔

۔۔ مطلق العنانوں کا ہمیشہ ایک طریق کار رہتا ہے یہ کہ اپنے حریفوں کو پچھاڑنے اور کچلنے کے لیے سازشوں میں من گھڑت افسانے اور فرضی پلاٹ تیار کیے جائیں۔

ان آمروں کے محبوب ہتھیار جبر اور تشدد ہوتے ہیں یہ انسانوں کو رسوا اور ذلیل کرتے ہیں۔ شہری آزادیوں کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ ذرائع نشر و اشاعت پر پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ سیاست دانوں اور سیاسی عمل کو کلیتہً مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اپنے سیاسی مخالفین کو حوالہ زنداں یا حوالۂ سیف کرتے ہیں۔ ایوان نمائندگان کو توڑ کر اپنا حکم جاری کرتے ہیں۔ تمام آمروں نے ان ہی ہتھکنڈوں کو استعمال کیا ہے اور اس بہانے سے کیا ہے کہ ملک کو ایک طاقتور دشمن سے سخت خطرہ ہے۔ لیکن دوستو وسکی کے زندہ جاوید ناول "آسیب زدہ" کے ایک کردار کے قول کے مطابق یہ عمل غیر محدود اختیارات سے شروع ہو کر غیر محدود مطلق العنانی پر ختم ہوتا ہے۔

"تاریخ عالم میں مسٹر مارکوس پہلا شخص نہیں ہے جس نے فرد واحد کی حکومت قائم کی ہو اس سے پہلے بھی بہت سے کردار گزرے ہیں جو اس اسوہ میں مارکوس سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ اس فہرست میں آپ کو ہیرڈ (جس نے ایک رقاصہ کی طلب پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کرنے کا حکم دیا تھا) سے اسٹالن تک اور مسولینی سے ہٹلر تک بہت سے تاریخی نام ملیں گے

مسٹر مارکوس نے اپنے لیے غیر محدود اختیارات مخصوص کر لیے ہیں کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ ہماری تاریخ کے اجداد جمہوریت

کا جو طریقہ ہمارے لیے ترکہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ غیر مؤثر ثابت ہوا ہے۔ مسٹر مارکوس ایک ایسی نئی سوسائٹی کے تخیل کو بروئے کار لانے کا دعویٰ کرتا ہے جس میں عوام کو فوجی تنظیم سے متحد رکھا جائے گا اور ان کی اس طرح رہنمائی کی جائے گی جیسے بکریوں کے ریوڑ کو ہانکا جاتا ہے۔ حقیقت میں مسٹر مارکوس کے نزدیک عوام اتنے احمق اور بے بصیرت ہیں کہ انہیں اس رخ میں از خود چلنے کی اجازت نہیں دی جاتی

میرا عقیدہ ہے کہ کاروبار حکومت میں حق کبھی روشن نہیں ہو سکتا جب تک پریس آزاد نہ ہو اور تبادلہ خیال کا اذن عام نہ ہو۔ مجھے اس امر میں ایک لمحہ کے لیے بھی شبہہ نہیں پیدا ہوا ہے کہ فوجی حکومت ایک فلپائنی کے اندر اس کی صلاحیت کے تمام سوتوں کو خشک کر دے گی، نہ اس میں بلندی روح باقی رہے گی، نہ کام کا جذبہ، نہ جدت نہ اخلاقی جرأت اور روحانی توانائی اور یہی وہ صفات ہیں جو ایک قوم کو عظیم اور توانا بناتی ہیں۔ فوجی حکومت زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک سطحی ذہنیت کو عام کر دے۔

ایک فرد کو گرفتار کر کے کسی فوجی کیمپ میں قید کر دینا اور اس کو مجبور کرنا کہ وہ ایسی زندگی کو قبول کرے جس میں اسے اپنی پسند کا نصب العین اختیار کرنے کا اختیار نہ ہو اس پر سب دروازے بند کر کے صرف ایک دروازہ کھلا رکھنا چاہے وہ دروازہ کتنے ہی عظیم قصر پر کھلتا ہو، یا اس قیدی کے لیے منصوبہ بندی کرنے والے کتنے ہی مخلص اور نیک نیت ہوں، یہ سب کچھ اس عظیم صداقت کے خلاف ایک مکروہ سازش ہے کہ آدمی حیوان سے ممیز ہے اور وہ اپنی زندگی خود گذارنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔

لیکن سیاسی رہنما عوام کو بے شعور اور تدبر و اخلاق سے عاری مخلوق سمجھتے ہیں ان کی رائے میں ایک عام آدمی ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو آزادی سے نبھا سکے اس لیے اسے آزادی و حریت کے مبہم تصورات کے مقابلے میں امن و سکون کی زیادہ ضرورت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ایسے خیالات کی ہرگز تائید نہیں کر سکتا۔ مجھے اہل فلپائن کے بارے میں یقین کامل ہے کہ اگر انہیں حقائق اور سچائی سے آگاہ کر دیا جائے تو وہ ہر مشکل کا مقابلہ پامردی کے ساتھ کر سکتے ہیں اور جس مثالی معاشرے کا تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مجھے اس حقیقت پر بھی یقین ہے کہ ایک فلپائنی عظمت کی کسی پکار پر جبر سے نہیں رغبت سے چلنا پسند کرے گا۔ وہ دہشت گردی کے نہیں آزادی کے راستے چاہتا ہے۔

میں جن اصولوں کو مقدس گردانتا ہوں۔ مثلاً انسان کا مجد و شرف، اس کی تقریر و فکر کی آزادی، پریس کی آزادی بغیر کسی خوف یا دباؤ کے اپنی پسند کی راہ اختیار کرنے کی آزادی اور جمہوریت کے وہ تمام عظیم اصول جو جمہوریت کے مشعل برداروں نے آج تک روشن رکھے ہیں۔ یہ سب بالائے طاق رکھ دیے گئے ہیں تاکہ ایک شخص کے اقتدار کی راہ صاف رہے۔

میرے قانونی مشیروں نے سپریم کورٹ کے سامنے دلائل

پیش کیے ہیں کہ ایک شہری پر امن کی حالت میں فوجی عدالت میں فوجداری کا مقدمہ نہیں چل سکتا۔ تمام مہذب دنیا اس پر انگشت بدنداں ہے کہ ایک شہری پر فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے لیکن میرے ساتھ انوکھا معاملہ کیا جا رہا ہے۔ آج سے دو سال قبل پلازا میرانڈا کے خوفناک قتل عام کے تین دن بعد افواج کے سپریم کمانڈر انچیف اور صدر مملکت نے مجھ پر بہ نفس نفیس یہ الزامات عائد کیے تھے۔ حالانکہ مجھ پر یہ الزامات عدالت کے ذریعے بھی عائد ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ اتنا بے تاب تھا کہ اس نے دستوری اور قانونی کارروائی کی پرواہ کیے بغیر مجھ پر الزامات عائد کر دیے۔ پھر مجھ پر ان الزامات کے تحت سول عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے لیکن مارکوس کی اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی اور وہ اس انتظار میں رہا کہ اس کی پسند کا مارشل لا نافذ ہوا اور وہ میرے لیے ایک خصوصی ٹریبونل تخلیق کرے۔ میں عدالت کے معزز ارکان سے دریافت کرتا ہوں کیا وہ صدر کی منشا کے خلاف کوئی فیصلہ سنا سکتے ہیں؟ بالفرض آپ کا ضمیر آپ کو حق بات کہنے پر مجبور کر دیتا ہے تو کیا صدر مملکت کے پاس صدارتی حکم نامے نمبر ۳۹ کے تحت اس فیصلے کو بدلنے کا اختیار نہیں ہے؟

معزز سربراہان عدالت! میں جانتا ہوں کہ آپ ہر اعتبار سے واجب الاحترام ہیں لیکن ایک ناقابل تغیر حقیقت موجود ہے کہ آپ صدر کے تابع ہیں۔ آپ میری جان بچانا چاہیں تب بھی صدر مجھے موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ بعض دوست مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ مجھے رحم کی اپیل کرنی چاہیے لیکن میں یہ کام اپنے زندہ ضمیر کے ساتھ ہرگز نہیں کر سکتا۔ میں عزت و وقار کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر پھانسی کے پھندے کو چوم سکتا ہوں لیکن گھٹنے ٹیک کر ذلت و شرمساری کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

میرے دوستوں اور عزیزوں کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے میرے بعض حامیوں کو حوالۂ زنداں کر دیا گیا ہے جن شاہدوں کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ سب خوف زدہ ہیں۔ اس لیے میں ان سب کو مزید ابتلا میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بنا بریں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اس عدالتی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لوں گا۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ ساری کارروائی محض مذاق اور بے ضمیری کا ڈھونگ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میرے وجود کا ہر حصہ، میرا دل، میرا دل، میرا ضمیر، میری روح ہر قسم کی آمریت کے سخت خلاف ہے میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ اگر ہمیں قدم بڑھا کر چلنا ہے تو ہمیں اپنے ملک میں امن و امان اور نظم قائم رکھنے کی شدید ضرورت ہے لیکن امن و سکون اور نظم کی حیثیت بغیر آزادی کے محض غلامی کی سی ہے۔ تنظیم بغیر عدل کے استبداد ہے میرا یقین ہے کہ ہم امن اور خوشحالی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے معاشرتی ڈھانچے کی بنیاد آزادی اور انصاف پر استوار نہیں کریں گے۔ اس لیے موجودہ عدالتی کارروائی سے میرا عدم تعاون میرے اس عقیدے کا عکاس ہے کہ میں

بالآخر جبروت پر غالب آکر رہے گی اور شر خیر سے مغلوب ہو کر رہے گا۔ میں بڑے عجز و انکساری کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے وطن کو زنجیریں پہنا کر جس دکھ درد اور کرب سے دوچار کیا جارہا ہے۔ میں اس سے علیحدہ نہیں رہنا چاہتا ہوں۔

۲۴ ستمبر کو وطن عزیز کو ایک کالی کوٹھری میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں بے لبسی کی حالت میں اوندھے منھ گرے ہوئے ہیں۔ ان پر من مانے حکم چلائے جارہے ہیں اور ان کو محکوم رکھنے کے لیے وہی کروہ اصول اپنایا گیا ہے جسے عرف عام میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کہتے ہیں۔

محترم صدر اور سربراہان فوجی عدالت! میں خوب جانتا ہوں کہ میرے فیصلے کا کیا انجام ہوگا۔ آپ اپنا فرض بجا لائیں مجھے اپنی افسوسناک تقدیر سے دوچار ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے ضمیر کی ہدایت کے مطابق ظالم کے ہر فیصلہ کو خندہ پیشانی سے قبول کروں گا خدا ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین!

(بقیہ صفحہ ۳۵)

سے بہت کچھ سیکھا۔ مگر مسلمانوں نے اس سے برائیاں آکر اور اس سے اچھائیوں کو اپنانے سے گریز کیا۔ مسلمانوں نے مغربی تہذیب پر ہاتھ مارا مگر اس کی ایجادات اور اختراعات سے کچھ حاصل نہ کر سکے۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ

خذ ما صفا ودع ما کدر۔ اچھی باتوں کو اختیار کرو اور بری باتوں کو چھوڑ دو۔

مسلمانوں کے لیے سینے کی مشین میں کوئی سبق نہیں اگر سبق ہے تو اخلاقی آوارگی اور فیشن پرستی میں اب تو آزادی کے بعد مسلمان بھی بھول چکے کہ ان کے اسلاف ہندوستان کو کیا دے گئے۔ انسانی مساوات کا عملی نمونہ انھوں نے ہی پیش کیا تھا۔ خود فراموشی کی یہ مثال تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے اور اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں کی خود فراموشی پر ہے۔ (الجمعیۃ)

یو کے اسلامک مشن کی

دسویں سالانہ کانفرنس

یو کے اسلامک مشن انگلستان میں مقیم مسلمانوں کی سب سے بڑی منظم دینی تنظیم ہے۔ یہ تحریک ہر سال اگست کے آخر میں BANK HOLIDAYS کے دوران اپنی سالانہ کانفرنس کا انعقاد کرتی ہے۔ تاکہ تمام کارکن مختلف شہروں سے ایک مرکز پر جمع ہوں، ان کی اجتماعی طور پر تربیت کی جائے اور ان کے دعوتی تجربات سے ایک دوسرے کو کام کرنے میں تقویت ملے۔ مشن کی مرکزی تنظیم کانفرنس کے موقع پر اس امر کا اہتمام بھی کرتی ہے کہ مختلف ممالک سے مسلمان مفکر اسکالر اور دانشور تشریف لا کر کارکنوں سے خطاب کریں۔ یو کے اسلامک مشن کی پالیسی ہے کہ اپنی سالانہ کانفرنس برطانیہ کے مختلف شہروں میں ہر سال کیا کرے لہٰذا اس سالانہ کانفرنس کے لیے لیسٹر یونیورسٹی کا انتخاب کیا گیا۔ لیسٹر یونیورسٹی ہمارے لیے اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اسی یونیورسٹی سے تحریک اسلامی کے مایہ ناز سپاہی پروفیسر خورشید احمد صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

۲۵ اگست بروز ہفتہ یو کے اسلامک مشن کے کارکنوں کے سامنے منزل لیسٹر یونیورسٹی STAMPFORD ہال تھی۔ برطانیہ میں ۲۳ بڑے بڑے شہروں دوسرے لفظوں میں انگلستان کے ہر ہر کونے سے شرکاء کانفرنس کے کارواں ریل اور ہوائی جہازوں سے لیسٹر پہنچ رہے تھے۔ ہر کارکن دفتر استقبالیہ میں جا کر اپنی رجسٹریشن کرواتا۔ اس کے بعد ہر کارکن کو ایک فائل دی جاتی جس میں پروگرام سالانہ رپورٹ اور مالیات کی رپورٹ ہوتی اور اس کے ساتھ چند سفید کاغذ نوٹس لکھنے کے لیے ہوتے۔ ساتھ ہی کانفرنس میں شرکت کا بیج بھی دیا جاتا اور کمرے اور بلاک کا نمبر الاٹ کیا جاتا تاکہ پھر گائیڈ حضرات ہر آدمی کو اس کے کمرے تک پہنچانے میں مدد کرتے۔ اس کے بعد چائے کے ساتھ مہمانوں کی تواضع کی جاتی۔ جوں جوں کانفرنس کا وقت قریب آتا گیا ایک ایسا سماں دیکھنے میں آیا جسے قلم تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ تمام لوگ ایک ہی کنبے کے فرد ہیں۔ دو

لفظوں میں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج لیسٹر یونیورسٹی میں اسلامی نظام نافذ ہو گیا ہے۔

کانفرنس کا آغاز ٹھیک ۵ بجے شام تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ اس کے بعد صدر مشن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا۔

میرے واجب الاحترام بزرگو! اور عزیز بھائیو! اس رب العزت کی ذات کا جتنا بھی شکر کیا جائے اتنا ہی کم ہے جس نے ہم سب کو برطانیہ کے کونے کونے سے اپنے سچے دین کے لیے یہاں پر اکٹھا ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ اس کانفرنس کے دوران آپ کو زیادہ سے زیادہ اسلامی غذا مہیا کی جائے۔ تاکہ اس کانفرنس سے واپس جا کر آپ خدا کے سچے دین کا کام بہتر سے بہتر طریقے سے کرسکیں۔ آپ وہ خوش نصیب انسان ہیں جو اسلام کا مطالعہ کرکے مشن کے تنظیم کے قریب آئے ہیں تاکہ اسلامی دعوت کے خطابات کو سمجھ کر یہ دعوت دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچائیں۔

سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو کڑی آزمائشوں سے آزمایا جاتا ہے کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ کلمے کے تقاضے پورے کرنا اصل کام ہے۔ الحمدللہ یوکے اسلامک مشن سے وابستہ حضرات میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اس راستے میں ہم پر مصیبتیں آئیں گی اگر ہم ان پر پورے اترے۔ تو پھر اللہ کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی۔

کانفرنس کے ۳ دنوں کے دوران ہم سب کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا محاسبہ کرنا ہے کہ ہم اسلام کے مطابق پورے اتر رہے ہیں یا نہیں اگر ہم میں کوئی کمی پائی جاتی ہے تو اس کی فوری تلافی کرنی چاہیے۔ اسی میں ہماری اخروی نجات اور اللہ کی خوشنودی ہے۔

جناب عبدالسلام صاحب نے مائیک پر آکر ڈاکٹر فاضل جمالی سابق وزیر خارجہ اور وزیر اعظم عراق کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ملک میں بہت سے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں فوجی حکومت نے آپ کو پھانسی کی سزا دے دی بعد میں جب دوسرا فوجی انقلاب آیا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی پھانسی کی سزا منسوخ کر دی۔ اس وقت سے آپ ٹیونس یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں۔ موصوف بہت سی اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر فاضل جمالی صاحب نے "اسلامی نظام حیات اور اس کا فلسفہ" پر بڑی مؤثر اور مدلل تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہم کو زندگی میں عظیم موقع دیا ہے کہ ہم اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کے درمیان رابطہ قائم کرکے انہیں اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچائیں اور اسلام کی لازوال نعمتوں کو دنیا کے سامنے عقلی دلائل اور پورے عزم یقین کے ساتھ پیش کریں۔ یاد رکھیے اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم ان لوگوں کے اور اللہ تعالیٰ کے سخت مجرم ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ برطانیہ کا معاشرہ انتہائی ترقی یافتہ ہے اس لیے یہاں پر مقیم مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور سائنسی تحقیق کے ساتھ ساتھ آپ

لوگ دین پر بھی تحقیقی کام کریں۔ انشاءاللہ آپ دین پر جتنی ریسرچ کرتے جائیں گے آپ کا اللہ کی ذات پر ایمان اتنا ہی پختہ ہوتا جائے گا۔

آپ نے تلقین فرمائی کہ اس وقت مسلمانوں کو زیادہ توجہ نظام تعلیم کی طرف دینی چاہیے تاکہ ہم نئی نسل کی صحیح تربیت کر سکیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحیح طرح کے اسلامی اسکول، کالج و یونیورسٹیاں اور دینی ذہن کے اساتذہ مہیا کریں۔ پھر آگے چل کر یہی ذہین طبقہ ایک اچھی مسلمان قیادت مہیا کرے گا اور مسلمان لیڈر شپ پھر اس پوزیشن میں ہو گی کہ صحیح اسلام پر مبنی معاشرے کی تشکیل کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ معاشرہ جنت کا نمونہ ہو گا۔

دوسرے دن کے اجلاس سے ڈاکٹر خورشید احمد صاحب نے "معراج النبی ﷺ" کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر خورشید احمد اپنی دینی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے باعث یہاں کے مسلمانوں کے درمیان تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

میرے عزیز بھائیو! ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم یہاں پر ۲۷ رجب کو جمع ہوئے ہیں۔ معراج کا واقعہ اسلامی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کے پیدا کرنے والے نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر بلا کر کچھ ایسے احکامات دیے اور اپنی خدائی کے کچھ ایسے نشانات بتلائے جو کہ رہتی دنیا تک لوگوں کے درمیان گواہ ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ اسلام کے نظام حیات کے لیے بہت اہم تھا۔ کیونکہ مکہ کے گرد و نواح تک اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا۔ اور وہاں سے دعوت اسلامی کی توسیع شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت شدید ضرورت تھی کہ مکہ میں اسلامی حکومت قائم ہو۔ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے اسلامی معاشرے کے عدل اجتماعی اور حقانیت کا مظاہرہ دیکھ کر خدا کے سچے دین اسلام میں داخل ہو سکیں۔

کانفرنس کے دوسرے مہمان مقرر ڈاکٹر مصطفےٰ مومن کا تعارف جناب رشید احمد صدیقی صاحب نے کرایا۔ آپ نے بتایا کہ ڈاکٹر مصطفےٰ مومن ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں جنہوں نے اخوان کے مرشد حسن البنا شہید کی قیادت میں رہ کر کام کیا ہے۔ آپ ۱۹۴۰ء میں اخوان کی تحریک کے ساتھ منسلک ہوئے۔ آپ نے پولیٹیکل سائنس اور اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور صحافت میں ایم اے کیا ہے۔ ملک بدر ہونے کی وجہ سے آج کل لیبیا میں مقیم ہیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

میرے پیارے عزیز مسلمان بھائیو! میں آپ کے سامنے کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا۔ بلکہ وہ حالات اور مسائل رکھوں گا جن سے آج کل مسلمان ممالک دوچار ہیں۔ مسلمان ممالک میں CIVIL WARS جاری ہے۔ عراق مین پاکستان انڈونیشیا اور سوڈان و دیگر عرب ممالک ۴۰ سال سے جنگ سے دوچار ہیں۔

یہ ہماری بدبختی ہے کہ سب سے بڑے مسلمان ملک [illegible]ستان کے ایک بازو کو کاٹ گیا اور کم و بیش یہی حالات انڈونیشیا میں رہے ہیں۔ پاکستان کی افواج پر قادیانیوں کا قبضہ ہے اور یہی حالت افریقہ کی ہے۔ یہ ہماری مسلم قوم کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ اس کے باوجود ہماری تعداد ۸۰ کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے [illegible] کے لحاظ سے ہم دنیا کی دوسری قوت ہیں۔ اس وقت مسلمان ممالک میں ۱۰۲ یونیورسٹیاں ہیں اور تمام مسلمانوں کے پاس ۳۰۰۰۰ سے زیادہ بمبار ہوائی جہاز ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل اور خوار ہو رہے ہیں۔ آئیے اس اہم مسئلے پر غور و فکر کریں میں نے خود اس مسئلے پر جتنا غور کیا۔ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم مسلمانوں کے قول و فعل میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا میں ذلیل اور خوار کر رہا ہے

اس وقت دنیا میں ۴۰ سے زیادہ مسلمان ملک ہیں لیکن بدقسمتی سے کسی ملک میں اسلام کا عدل اجتماعی نافذ نہیں ہے لہٰذا ہمیں پورے وسائل سے کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمان ملکوں میں اللہ کا قانون جاری و ساری ہو۔ اقتدار میں آکر ہم معاشرے اور سوسائٹی کو خرابیوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔ ایک مبلغ ۱۰۰ سال تک اتنا زیادہ کام نہیں کر سکتا جو کہ حکمران ایک قانون کے نفاذ کے ذریعے کر سکتا ہے۔ آپ نے کرنل قذافی کی مثال دی کہ اس نے ایک ہی قانون کے ذریعے سے شراب کا پینا، پلانا اور فروخت کرنا ممنوع قرار دے دیا ہے۔

آج مسلمانوں کے سر پر گولڈا میئر اور [illegible] کا منحوس سایہ ہے۔ ان دونوں کو مغربی ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں پر بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہماری صفوں میں پہلے سے زیادہ اتحاد اور ہمارے درمیان اخوت اور بھائی چارے کا زبردست رشتہ موجود ہو اور ہم پوری طاقت اور وسائل سے کام لے کر دین کا نظام نافذ کریں ——— یاد رکھیے اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو وقت ہمارا انتظار نہیں کریگا اور ہم اپنے ساتھ اپنے دین کو بھی رسوا کریں گے۔

پروفیسر غلام اعظم صاحب امیر جماعت اسلامی مشرقی پاکستان جنہیں لوگ یہاں مجاہد اعظم کے نام سے پکارتے ہیں، نے بھی کانفرنس سے مختلف عنوانوں سے خطاب فرمایا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی ہر تقریر میں پورا حق ادا کیا آپ نے "مسلم دنیا میں تحریک اسلامی" کے عنوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام کو نظام حیات کے طور پر رائج کرنے کے لیے دنیا بھر میں کام ہو رہا ہے۔ اخوان المسلمین اور تحریک اسلامی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افراد دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے افراد دنیا کے جس کونے اور خطے میں ہیں۔ ان کے دلوں میں دینی تڑپ کی وجہ سے دین کا کام کسی نہ کسی نام سے ہو رہا ہے اس وقت دنیا میں ان کا اچھا خاصا IMPECT ہے۔ کوئی مسلمان ملک منافقت کے باوجود اسلام کو مکمل نظام حیات تسلیم نہ کرنے کی کھلم کھلا جسارت نہیں کر سکتا۔ تمام مسلمانوں پر ان کا اثر ہے۔ ان اسلامی تحریکوں کے لٹریچر اور

ان کے مخلص کارکنوں کی مساعی کی وجہ سے نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی دنیا میں اسلام کو مکمل نظام حیات ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جو مسلم ممالک آزاد ہوئے ہیں وہ صرف اسلام کے نام پر آزاد ہوئے ہیں۔ لیکن آزادی دینے والی طاقتوں نے زمام کار اسلام کو نہ ماننے والے عناصر کے ہاتھوں میں دے کر اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو کچلنے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ بڑی طاقتوں نے مسلم ممالک کو اسلامی اخوت کے جذبے کے تحت جمع نہ ہونے دیا۔ بہت زیادہ مسلمانوں کے آزاد ممالک میں نیشنلزم اور سوشلزم کے ذریعے انتشار پھیلایا گیا۔ کمیونزم نے سب سے زیادہ کام مصر میں کیا لیکن مصر میں آج بھی حکومت کو کھل کر اسلام کے خلاف بات کرنے کی ہمت اور جرأت نہیں۔

دنیا بھر میں اسلامی تحریک جس دور سے گذر رہی ہے اسے بین الاقوامی منصوبہ بندی کے ساتھ مدینہ تلاش کرنا پڑے گا۔ دانشوروں اور تحریکی کارکنوں کی تعداد طاقت اور وسائل کو مجتمع کر کے ان سب کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسلامی نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

آخری اجلاس میں معزز مہمان ڈاکٹر کطانی کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر کطانی نے رابطہ عالم اسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کی۔ ڈاکٹر کطانی نے مغربی ممالک میں مسلمانوں کی بقا کے عنوان سے بہت ہی مفصل اور مدلل تقریر فرمائی۔ آپ نے اپنی تقریر کی ابتدا میں اس اطمینان کا اظہار فرمایا کہ مغرب کے جدید اور انتہائی ترقی یافتہ اور مادہ پرست ماحول میں آپ لوگ خدا کے دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی اور میری دلی دعا ہے کہ اللہ آپ کے عزم میں مزید پختگی اور دینی جدوجہد میں برکت دے۔

آخر میں سالانہ انتخابات ہوئے جس میں مندرجہ ذیل حضرات کثرت رائے سے منتخب ہوئے۔

صدر مولانا حبیب الرحمٰن مانچسٹر۔ نائب صدر۔ رشید احمد صدیقی صاحب لندن۔ سکریٹری جنرل محمد سلیم کیانی صاحب۔ لندن۔ خازن سعید احمد صاحب۔ لیوٹن

مجلس انتظامیہ۔ عبدالسلام صاحب لندن۔ مولانا سید نقی علی صاحب علوی راچڈیل۔ وحید الرحمٰن صاحب روچسٹر ڈاکٹر ذکاء الدین صاحب گلاسکو۔ مختار سلیم صاحب مانچسٹر نجم النور صاحب ہائیڈ

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صدر یوکے اسلامک مشن نے اپنی اختتامی تقریر میں فرمایا کہ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اس سال بہت اچھے ساتھی دیے ہیں۔ آپ نے سالانہ رپورٹ میں دیکھا ہوگا کہ اس سال رفیقوں اور رکنوں کی تعداد میں اچھا اضافہ ہوا ہے آپ نے کارکنوں کو تلقین فرمائی کہ نمازوں کا اہتمام کریں اور قرآن و حدیث اور اسلامی کتب کا مطالعہ اپنی زندگی کا لازمی جزو بنائیں۔

آخر میں مولانا نے فرمایا کہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ اس کانفرنس سے واپس جا کر اپنے علاقوں میں جا کر اقامت دین کا کام پہلے سے زیادہ بہتر طریقے سے کریں گے۔

تحریر:۔ ڈاکٹر احمد امین   ترجمہ:۔ ندیم الواجدی

حقیقی اور مصنوعی دین کا فرق

کیا آپ قدرتی ریشم اور مصنوعی ریشم کے فرق سے واقف ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ شیر اور شیر کی تصویر میں کیا فرق ہے؟ زمین کی حقیقی دنیا اور نقشے پر بنی ہوئی دنیا سے بھی آپ واقف ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ جاگنے کی حالت کے عمل اور سونے کی حالت کے عمل میں کتنا فرق ہے؟ آپ ان دو انسانوں میں امتیاز کر سکتے ہیں جن میں سے ایک زندگی کی دوڑ میں جد وجہد کرتا ہے اور دوسرا پتھر سے بنا کر دو کانوں پر رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس پر کپڑے لٹکائے جاسکیں۔ آپ ان آنسوؤں کا فرق بھی جانتے ہوں گے جو ایک ایسی عورت کی آنکھوں سے بہتے ہیں جو اپنا بچہ کھو چکی ہو اور دوسری عورت رونے کے لیے اجرت پر حاصل کی جاتی ہو؟ آپ اس آنکھ کو جو قدرتی طور پر سیاہ ہے اس آنکھ سے ممتاز کر سکتے ہیں جسے سرمہ ڈال کر سیاہ کیا گیا ہو۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ اس تلوار کو جو میدان جنگ میں سپاہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس تلوار سے کیا نسبت ہے جسے جمعہ کے دن خطیب اٹھاتا ہے؟ کیا آپ زندہ اور جاندار انسان کو پردہ کے متحرک اور بے روح انسان سے ممتاز کر سکتے ہیں؟ اگر آپ یہ سب فرق جانتے ہیں تو آپ مصنوعی اور حقیقی دین کے فرق سے بھی واقف ہیں۔

ہمارے دور کے مورخ اور تحقیق نگار مسلمانوں کے ایک پہلو کا سبب جاننے کے لیے تاریخ کی کتابوں میں سر کھپانے میں مصروف ہیں۔ ان کے سامنے یہ سوال ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے آغاز میں بھی حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں اور اس دور میں بھی، پہلے انھوں نے جنگیں لڑیں اور فتح حاصل اور پوری دنیا کی قیادت کی۔ اس دور میں وہ کمزور پڑے، ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنے پر مجبور ہوئے ایسا کیوں؟ ــــ قرآن اب بھی قرآن ہی ہے۔ اسلام کی تعلیم اب بھی اسلام کی تعلیم ہی ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تب بھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی ہے۔ ہر چیز وہی ہے، کچھ بھی تو بدلا ہوا نہیں ہے اس ذیل میں بہت سے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بہت سے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف ایک سبب ہے اور وہ ہے حقیقی اور مصنوعی دین کا فرق۔

مصنوعی دین چند حرکات و سکنات اور چند لفظوں کا نام ہے اور کچھ بھی نہیں، مگر حقیقی دین روح، قلب اور عقیدے کا نام ہے، مصنوعی دین میں نماز کی حقیقت

. . . .

. . . . مصنوعی دین میں

دینی مظاہر کی وہی حقیقت ہے جو پردے کے مظاہر کی ہے

لا الٰہ الا اللہ مصنوعی دین میں ایک ایسا خوبصورت جملہ ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ مگر حقیقی دین میں یہ جملہ مال کی پرستش، اقتدار کی پرستش، عزت و جاہ کی پرستش، خواہشات کی پرستش اور اللہ کے سوا کسی بھی معبود یا خدا کی پرستش کے خلاف اعلان جنگ کے مرادف ہے

مصنوعی دین میں لا الٰہ الا اللہ سر جھکانے، اور جسمانی شہوتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پر اتفاق کر سکتا ہے ذلت اور رسوائی بھی اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے مگر دین حق میں یہ کلمہ صرف حق کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، مصنوعی دین میں یہ جملہ ایک پھونک میں اڑ سکتا ہے مگر دین حق میں پہاڑوں کو ہلا دینے کی قوت رکھتا ہے۔

مصنوعی دین تجارت اور پارچہ بافی کی صنعت کی طرح ایک پیشہ ہے اس پیشے میں وہی لوگ مہارت حاصل کرتے ہیں جن کے تجربات زیادہ ہوتے ہیں حقیقی دین ایک روح عقیدے اور قلب کا نام ہے، کسی پیشے کا نام نہیں، یہ عمل نہیں تاہم اس کے یہاں نیک عمل ضروری ہے۔ یہ نیک عمل پر ابھارتا اور زور دیتا ہے۔

حقیقی دین کو ایک ایسی مجرب اکسیر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اگر کسی بے جان اور مردہ جسم کی روح میں حلول کر جائے تو اس کی رگوں میں زندگی کی لہر دوڑ جائے۔ کسی کمزور کے جسم میں پھیل جائے تو قوت اس میں پیدا کر دے۔ یہ وہ پتھر ہے جو تانبے، چاندی اور سیسہ کو سونا بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے حقیقی دین ایک ایسے عقیدے کو کہتے ہیں جس سے معجزات جنم لیتے ہیں۔ وہ معجزات جن کے سامنے علم، سائنس، تاریخ اور فلسفہ سب عاجز اور حیران ہیں۔

یہ وہ تریاق ہے جس کی تھوڑی مقدار بھی پورے جسم کے زہر کو زائل کر دیتی ہے۔ یہ وہ کیمیاوی عنصر بھی ہے جس کے ساتھ اگر دین کا امتزاج ہو تو اللہ سے قربت کا سبب بن سکتا ہے۔ راہوں کی سخت ترین دشواریاں ختم ہو سکتی ہیں اور مقصد کے چہرے سے غبار صاف ہو جاتا ہے۔ یہ وہ دین ہے جو سعادت مند لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور بد قسمت لوگ اس سے محروم رہتے ہیں حقیقی دین ایک ایسے کرنٹ سے مشابہ ہے جو اگر دوڑا دیا جائے تو ان سے نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ ہوا میں گھول دیا جائے تو اس میں آواز کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے

حقیقی دین اپنے ماننے والے کو اپنے لیے زندہ رہنے اور اپنے لیے لٹنے اور قربان ہو جانے پر ابھارتا ہے۔ مصنوعی دین سے وابستہ اپنا دین فروخت کرتا ہے اس کا مطمح نظر صرف تجارت ہوتا ہے حقیقی دین کا ماننے والا ہر اقتدار اور ہر سیاست پر قابض ہوتا ہے مگر مصنوعی دین پر اعتقاد رکھنے والا

دین کا استحصال کرتا ہے وہ اس کے ذریعے سیاست اور اقتصاد کی خدمت کرتا ہے۔ حقیقی دین، قلب اور قوت کا نام ہے اور مصنوعی دین نحو و صرف اعراب کلام اور تفسیر کا نام ہے۔ حقیقی دین کی تعبیر روح اور خون کے امتزاج حق کے لیے جنگ ظلم سے نفرت اور انصاف کی راہ میں موت سے کی جاتی ہے۔ مصنوعی دین ایک خوب صورت اور چمکدار عبا کی طرح ہے۔ حقیقی دین میں شہادت وہ ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض میں خرید لی ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں قتل کرتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں۔

مگر مصنوعی دین میں شہادت جملے کے اعراب، متن کی تخریج، تفسیر تشریح، توجیہ حاشیہ، تصحیح عبارت، اعتراض اور جواب اعتراض کو کہتے ہیں۔

حقیقی دین خدا اور بندے کے تعلقات بھی سدھارتا ہے اور ایک انسان کی دوسرے انسان سے وابستگی بہتر بنانے کی تاکید بھی کرتا ہے۔ مگر صرف اس لیے کہ انسان کا خالق سے رشتہ استوار ہو، مضبوط اور مستحکم ہو۔ مصنوعی دین میں انسان کا تعلق انسان سے صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس طرح استحصال رزق، اکتساب جاہ اور منافع کا حصول ہو سکے۔

جس نے بھی کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے اس دنیا وابستہ لوگ وہی چیز اختیار کر کے سدھر سکتے ہیں جو ان کے اسلاف نے کی تھی۔

دین داروں کا جرم یہی ہے کہ وہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ روح سے دور ہو گئے ہیں اور صرف ظاہری شکل و صورت کی ... کرنے لگے ہیں ان کے یہاں اب روح کی محبت نہیں شکل ... کی قیمت ہے۔ ایمان عشق کا نام ہے جو سر زمین کو گرمی، پستی کو بلندی، ذلت کو عظمت اور رجب ذات کو ایثار سے بدل دیتا ہے۔ ایمان جادو کا ڈنڈا ہے جو مردے کے جسم میں روح بھر دیتا ہے۔ کوئی ایسا شخص ہے جو اس مصنوعی دین کے عوض حقیقی دین کا ایک ذرہ بھی ...

آئندہ ماہ سے زندگی کی قیمت میں اضافہ

جیسا کہ ہم جون اور جولائی کے شماروں میں اعلان کر چکے ہیں آئندہ ماہ سے "زندگی" کی قیمت میں مجبوراً اضافہ کیا جا رہا ہے آئندہ ماہ سے زندگی کی ایک کاپی کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہوگی۔ قارئین کو احساس ہوگا کہ جس رفتار سے کاغذ طباعت کتابت گراں ہوئی ہے اس حساب سے یہ اضافہ بہت معمولی ہے سالانہ چندہ -/15 ہوگا۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء تک چندہ بھیجنے والوں کو ... رعایت حاصل رہے گی۔ منیجر

میراث اور نکاح کے چند مسائل

خط

چند مسائل حل طلب در پیش ہیں۔ مہربانی کر کے ان کے شرعی جوابات عنایت فرمائیں۔

زید کے پانچ لڑکے تھے۔ الف، ب، ت، ث، ج۔ لڑکی صرف ایک تھی جس کا انتقال بعد ولادت ایک لڑکے، زید کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ نواسہ زندہ ہے۔ زید کی زندگی میں اس کے بڑے لڑکے الف کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس نے دو لڑکے اور ایک بیوہ چھوڑی۔ اس بیوہ سے زید نے اپنے پانچویں لڑکے ج کا نکاح کر دیا۔ زید نے اپنے لڑکوں کو علیحدہ کر دیا اور صرف اپنے لڑکے ج اور اس کی منکوحہ اور یتیم پوتوں کی شرکت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ الف مرحوم کی بیوہ پانچ سال تک ج کی منکوحہ رہ کر انتقال کر گئی۔ ج کی کوئی اولاد اس عورت سے نہ ہوئی۔ کچھ عرصے بعد زید کی زندگی ہی میں چوتھے لڑکے ث کا انتقال ہو گیا اور چھوٹے ث کی بیوہ سے بھی مدت گزرنے کے بعد ج کا نکاح کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد زید کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت زید کے تین لڑکے ب، ت، ج موجود تھے۔ زید نے اپنی زندگی میں اپنے دونوں یتیم پوتوں کو ایک مکان دے دیا تھا جو مشترکہ حویلی کا ایک حصہ تھا۔ قریب پانچ ماہ قبل مرحوم زید کے پانچویں لڑکے ج کا بھی انتقال ہو گیا۔ ج کی دوسری منکوحہ سے بھی اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مرحوم ج نے کچھ مال و اسباب اور رہائشی مکان چھوڑا ہے جس پر وہ اپنے والد زید کی موجودگی ہی کے وقت سے قابض تھا۔ یہ تمام مال و اسباب اور مکان بیوہ کے قبضہ میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ عورت کو اپنے دونوں شوہروں کے ترکے میں کتنا حصہ ملے گا اور مکان جس پر وہ قابض ہے اور جس میں جھگڑا پیدا ہو گیا ہے کس کی ملکیت ہو گی؟ عورت کا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ وراثت کو کیا ملے گا؟

ایک اور مسئلہ جواب طلب یہ ہے کہ ج کی بیوہ کے

الف مرحوم کے دونوں لڑکوں میں سے کسی ایک کا
نکاح جائز ہے یا نہیں؟ یہ عورت ان لڑکوں کی چچی
بھی ہوتی ہے اور ان لڑکوں کی سوتیلی ماں بھی ہوتی
ہے کیونکہ ان لڑکوں کی والدہ کا نکاح بھی ج سے
ہوا تھا۔ اور پھر ج کا نکاح اس عورت سے جو موجود
ہے ہوا تھا۔ (۳) یتیم لڑکوں کا زید کی میراث میں
کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ اور وہ مکان جس میں یہ دونوں
رہتے ہیں ان کی ملک ہے یا نہیں؟ زید نے کوئی
وصیت نہیں کی اور نہ زبانی ہبہ کیا بلکہ صرف عملاً
مکان ان دونوں کو رہنے کے لیے دے دیا تھا۔
سوال گنجلک ہو گیا ہے، غور فرمالیں اور شرعی جواب
عنایت کریں۔

جواب

آپ نے جو تفصیل لکھی ہے اور جو سوالات کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ زید کے انتقال کے وقت اس کے پانچ بیٹوں اور ایک بیٹی میں سے صرف تین بیٹے زندہ تھے ان تین میں سے ج کا انتقال اب ہوا ہے

(۲) زید کے پوتوں کا اس ترکے میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ اور وہ مکان جس میں وہ مقیم ہیں ان کی ملکیت ہے یا نہیں؟

(۳) جو عورت موجود ہے اس کو اس کے دونوں شوہروں کے ترکے میں کتنا حصہ ملے گا؟ اس کے بعد ج کے اور زندہ بھائیوں کو کتنا حصہ ملے گا؟

(۴) جو عورت موجود ہے اس کا نکاح الف کے لڑکے سے ہو سکتا ہے یا نہیں؟

ان سوالات کے مختصر جوابات نمبروار یہ ہیں۔

۱۔ زید کے تین بیٹے جو زید کی وفات کے وقت موجود تھے وہی زید کے وارث ہوں گے

۲۔ زید کا نواسہ اور اس کے دونوں پوتے زید کی وراثت سے محروم ہیں۔ کیونکہ نواسے کی ماں بھی اپنے باپ کی زندگی میں وفات پا گئی تھی اور پوتوں کا باپ بھی انتقال کر چکا تھا۔ ان تینوں کا زید کے ترکے میں کوئی حصہ نہیں ہے

اسی طرح وہ مکان بھی جس میں یہ لوگ رہتے ہیں وہ اس کے مالک نہیں ہیں کیونکہ زید نے اس کے بارے میں نہ کوئی وصیت کی اور نہ زبانی یا تحریری ہبہ کیا بلکہ صرف عاریتاً ان کو رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ اس مکان کے مالک زید کے تینوں لڑکے ہوئے جو زید کی وفات کے وقت موجود تھے

۳۔ آپ نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ اس عورت سے ش کی کوئی اولاد ہے یا نہیں؟ اندازہ یہ ہے کہ اس عورت سے ش کی بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اگر بات یہی ہو تو اس عورت کو دونوں شوہروں میں سے ہر ایک کے ترکے میں چوتھا حصہ (ربع) ملے گا۔ آپ نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ش کی اپنی کوئی جائداد یا مال و اسباب موجود ہے یا نہیں۔ واضح رہے کہ زید کے ترکے میں ش کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

بہرحال عورت کو دونوں شوہروں کے ترکے میں چوتھا

حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ ج کے دونوں بھائیوں کا ہوگا جو زندہ ہیں۔

۴۔ ش کی بیوہ جو بعد کو ج کے نکاح میں آئی اور پھر بیوہ ہوئی وہ الف کے دونوں لڑکوں کی صرف چچی ہے۔ سوتیلی ماں نہیں ہے جس شخص کے حقیقی باپ نے اس کی ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے نکاح کیا ہو صرف وہی سوتیلی ماں ہوتی ہے اور اس سے نکاح حرام ہوتا ہے۔ چونکہ وہ عورت الف کے لڑکوں کی صرف چچی ہے اس لیے ایک لڑکے سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔

ذبح کے وقت غلطی سے جانور کا سر الگ ہو گیا

خط

ایک مسئلہ پر یہاں بحث ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مرغا ذبح کرنے میں غلطی سے پوری گردن دھڑ سے الگ ہو گئی۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ مرغ مکروہ ہو گیا اور ایک صاحب کہتے ہیں کہ مردار ہو گیا۔ مہربانی کر کے صحیح مسئلہ بتائیے۔

جواب

ذبح کرنے والے کی غلطی سے اگر جانور کا سر الگ ہو جائے تو وہ جانور حلال ہے نہ مکروہ ہوا اور نہ مردار۔ ذبح کرنے والے پر بھی کوئی الزام عائد نہیں ہوگا کیونکہ اس نے قصداً ایسا نہیں کیا ہے۔ البتہ اگر ذبح کرنے والا قصداً سر کو الگ کر دے تو اس کا یہ فعل مکروہ ہے کیونکہ ذبح کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سر کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ لیکن ذبح کرنے والے کے اس مکروہ فعل سے اس جانور میں کراہت پیدا نہ ہوگی اس کا دھڑ اور سر دونوں حلال ہیں۔

رضاعی باپ کی تمام اولاد سے بھی رضاعت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے

سوال

ہندہ نے ایک عورت کا دودھ پیا۔ اس عورت یعنی ہندہ کی رضاعی ماں کے تمام لڑکے اور لڑکیاں تو ہندہ کے رضاعی بھائی بہن ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس عورت کے شوہر کے اس بیٹے سے جو کسی دوسری عورت کے بطن سے ہے ہندہ کا نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب

جس طرح وہ عورت جس کا دودھ ہندہ نے پیا ہے اس کی رضاعی ماں ہو گئی اسی طرح اس عورت کا شوہر بھی ہندہ کا رضاعی باپ ہو گیا اور رضاعی باپ کی تمام اولاد سے بھی رضاعت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس لیے رضاعی باپ کے اس لڑکے سے بھی ہندہ کا نکاح نہیں ہو سکتا جو کسی دوسری عورت کے بطن سے ہو کیونکہ وہ لڑکا بھی ہندہ کا رضاعی بھائی ہو گیا۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ [illegible] بھائی ہے۔

تنقید و تبصرہ

خلافت راشدہ اور ہندوستان

تالیف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ سائز بڑا، صفحات ۲۸۰، قیمت مجلد گردپوش کے ساتھ نو روپیے۔ قیمت غیر مجلد آٹھ روپیے۔ ناشر: ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

یہ کتاب عمدہ کاغذ اور اعلیٰ کتابت و طباعت سے مزین ہوکر ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ نہ یہ ادارہ تعارف کا محتاج ہے اور نہ اس کتاب کے فاضل مؤلف۔ جن سے پہلے بھی ماہنامہ زندگی میں ان کی ایک کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومت" پر اکتوبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی یہ دوسری کتاب ہے جس پر ہم تبصرہ کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر مولانا اطہر صاحب کی ایک اور کتاب "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" بھی شائع ہوئی ہے جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ سے معلوم ہوا لیکن افسوس کہ یہ کتاب ہمارے پاس تبصرے کے لیے نہیں آئی اس لیے اب تک اس کے مطالعہ کا موقع نہ مل سکا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "خلافت راشدہ اور ہندوستان" قاضی اطہر صاحب کی عربی تالیف "العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین" کا اردو ترجمہ ہے جو جدید ترتیب و تہذیب سے آراستہ ہوکر ایک مستقل تالیف کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ موصوف نے بہت سی قیمتی معلومات اور غیر معمولی اضافوں کے بعد تین جداگانہ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ یہی خلافت راشدہ اور ہندوستان ہے۔ باقی دو حصے "خلافت بنی امیہ اور ہندوستان" اور "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" اس کے بعد شائع ہوں گے۔ بجا طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف و اشاعت کے بعد بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ عرب و ہند کے قدیم تعلقات کے موضوع پر یہ ذخیرہ ایک لاجواب تاریخی ذخیرہ بن گیا ہے اور اب اس کو ایک گراں قدر [illegible] علمی دستاویز کی حیثیت سے [illegible] تاریخ کی دستاویز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جو کچھ ہے اس کے نمایاں امتیازات مثلاً کے صفات

درج کر دیے گئے ہیں۔ یعنی اس کتاب میں:

"خلافت راشدہ کے دور میں ہندوستان میں اسلامی غزوات و فتوحات۔ امارات و نظام عرب کے مسلمان ہندوستان میں۔ ہندوستان کے مسلمان عرب میں۔ صحابہ و تابعین کی آمد اور ان کے حالات۔ عرب و ہند کے گوناگوں تعلقات اور اس موضوع سے متعلق نادر و نایاب معلومات مباحث، سیر و مغازی اور تاریخ و طبقات کی قدیم و مستند کتابوں سے یوں جمع کیے گئے ہیں کہ اس ملک میں خلافت راشدہ کے مقدس دور کا صحیح اور واضح نقشہ پہلی بار نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔"

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ قاضی صاحب وسیع المطالعہ عالم دین ہیں اور ان کا مزاج تحقیق پسند ہے۔ تاریخ اور سیر و سوانح کو انھوں نے اپنے لیے موضوع تحقیق و جستجو بنالیا ہے اور اب تک بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کے ماخذ کی جو فہرست دی ہے اس میں کتابوں کی تعداد ۷۵ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کتاب مرتب کرنے میں کتنی محنت کی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں بھی انھوں نے متعدد اہم باتیں لکھی ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں منکر روایات کا بھی ذکر کیا ہے۔ عرب و ہند کے تعلقات سے متعلق تحقیق کرنے والوں اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی بہت کم ہیں لیکن کسی کتاب کا طبعی غلطیوں سے بالکل پاک ہونا ایک ایسی بات ہے جس کی صرف تمنا کی جاسکتی ہے۔ صفحہ ۲۲ کی آخری سطر میں کعب بن زہیر چھپ گیا ہے۔ اس کو کعب بن زہیر ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۳ میں حضرت حکیم بن ابوالعاص چھپا ہے اگرچہ آگے کی عبارتوں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ نام حکم ہے، حکیم نہیں۔ یہ کتاب بڑی قابل قدر اور اردو زبان میں ایک اہم تاریخی اضافہ ہے۔

اہلِ حدیث اور سیاست

تصنیف مولانا نذیر احمد رحمانی

صفحات ۴۳۶ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت نو روپیے

ناشر:۔ دارالترجمۃ والتالیف جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس۔ یوپی۔

مولانا نذیر احمد مرحوم و مغفور، اہل علم کے درمیان محتاج تعارف نہیں ہیں اور جماعت اسلامی کا حلقہ بھی ان سے واقف ہے۔ مولانا مرحوم جماعت اہل حدیث میں ایک ممتاز و نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں بعض افراد اہل حدیث کی طرف سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائی گئی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا مرحوم نے اپنے بعض ہم مذہب دوستوں کے غلط اور نارضامندی کو

یہ انھیں کی تھی اور مولانا مودودی کی تضلیل و تفسیق
کے لیے جو استفتا مرتب کیا گیا تھا اس کا انھوں نے
ایک طویل محققانہ اور منصفانہ جواب لکھا تھا۔ وہ استفتا
اور مولانا کا جواب دو قسطوں میں "افشائے راز" کے عنوان
سے ماہنامہ زندگی جلد ۷ شمارہ ۳ و ۴ جنوری و فروری ۱۹۵۲ء
میں شائع ہوا تھا۔ توقع کے مطابق مولانا مرحوم کا وہ جواب
ان صاحب کو پسند نہیں آیا تھا جنھوں نے مولانا مودودی
کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔ انھوں نے مولانا کا جواب پڑھ کر
ان کو ایک خط لکھا تھا۔ وہ استفتا، اور مولانا کا جواب دو
قسطوں میں "افشائے راز" کے عنوان سے ماہنامہ زندگی
جلد ۷ شمارہ ۳ و ۴ جنوری و فروری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا
تھا۔ توقع کے مطابق مولانا مرحوم کا وہ جواب ان صاحب
کو پسند نہیں آیا تھا جنھوں نے مولانا مودودی کے خلاف
مہم چلا رکھی تھی۔ انھوں نے مولانا کا جواب پڑھ کر ان کو
ایک خط لکھا تھا وہ خط اور مولانا مرحوم کا جواب بھی ماہنامہ
زندگی کے انھیں دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ جہاں تک
تبصرہ نگار کو علم ہے مولانا مرحوم نے کبھی بھی مولانا مودودی
پر غلط الزامات و اتہامات کی تائید نہیں کی۔ یہ ان کی
حق پسندی کی دلیل ہے۔ وہ مولانا مودودی کے تمام
خیالات سے متفق نہ تھے لیکن ان کی عبارتوں کو مسخ کر کے
یا ان کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کو گمراہ ثابت کرنے
کی غلط روش کو ناپسند کرتے تھے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مولانا مرحوم نے علمائے اہلحدیث
پر لوگوں کے غلط الزامات کی تردید کی ہے۔ عرض ناشر میں
وضاحت کی گئی ہے کہ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ دوسرا
حصہ جس میں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ
علیہ کے بعد سے اب تک کے حالات ہیں، ابھی طبع نہیں ہوا
ہے۔ زیر تبصرہ پہلے حصہ میں مولانا سید احمد شہید اور مولانا
اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ تعالیٰ کے وقت سے میاں صاحب
محدث دہلوی تک متعدد علمائے اہلحدیث کے حالات بیان
کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب تبصرہ نگار نے پڑھی۔ خصوصیت کے
ساتھ مولانا سید نذیر حسین کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے
اس سے تبصرہ نگار کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ میاں صاحب
پر الزامات کی تردید اس کتاب کے ص ۲۷۱ سے ص ۳۴۵
تک پھیلی ہوئی ہے۔

راقم الحروف کو ہندوستان میں حرب عقائد سے متعلق کتابوں
سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لیے علمائے احناف اور علمائے
اہلحدیث کے درمیان جن مباحث پر مناظرے ہوئے یا
کتابیں لکھی گئی ہیں اسی طرح دیوبندی اور بریلوی علماء
کے درمیان جن مباحث پر کتابوں سے الماریاں بھری
گئی ہیں ان کے مطالعہ کے لیے میں کبھی وقت نہیں نکال
سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں میری معلومات بہت
کم ہیں۔ یہ کتاب چونکہ تبصرے کے لیے آئی تھی اس لیے
مجھے پڑھنی پڑی۔ میں محاکمہ کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہوں
لیکن اس کتاب کے مطالعے سے اتنا اندازہ ہوا کہ
علمائے [illegible] اور علمائے اہلحدیث کے [illegible]

کا عالی اور عبرت انگیز نقشہ سامنے آگیا۔ راقم الحروف کی نظر میں کتاب کا یہ پہلا حصہ عنوان کتاب سے کم تعلق رکھتا ہے۔ اس کا زیادہ تعلق ان کوششوں کی تفصیل پیش کرنے سے ہے جو علمائے اہل حدیث کے خلاف کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مناظرانہ رنگ غالب آگیا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ مولانا رحمانی نے اپنے مزاج کے مطابق سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور ایک آدھ جگہ کے علاوہ اپنے مخالفین کے لیے سخت الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ کتاب پڑھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ تردید کے بجائے مثبت انداز میں کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی جس میں علمائے اہل حدیث کے وہ علمی و اصلاحی کارنامے بیان کیے جاتے جو انھوں نے ہندوستان میں انجام دیے ہیں۔

اس کتاب کے آغاز میں جناب آزاد رحمانی نے ۴۳ صفحات میں مصنف کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔

جماعت اسلامی ہند کا پانچواں کل ہند اجتماع

مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ بنگلور میں طے کیا گیا تھا کہ جماعت اسلامی ہند کا سالانہ اجتماع دہلی میں ۸ تا ۱۰ نومبر ۷۴ء منعقد کیا جائے۔ اس کے بعد یکم ستمبر ۷۴ء کو مرکزی مجلس شوریٰ کے قریبی ارکان کی نشست میں اجتماع کے پروگرام کو سامنے رکھ کر یہ طے کیا گیا کہ ۱۱ نومبر ۷۴ء کو ارکان جماعت کا خصوصی اجتماع ہو۔ اخبار دعوت دہلی میں اجتماع سے متعلق متعدد اعلانات برابر شائع ہو رہے ہیں۔ ناظم اجتماع نے جو اعلانات شائع کیے ہیں ان میں کا ایک اعلان یہ ہے:۔

رفقاء و متوسلین جماعت کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ کل ہند اجتماع کے لیے ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں نہایت موزوں و مناسب جگہ مل گئی ہے۔

- اجتماع ان شاء اللہ اعلان شدہ تاریخوں کے مطابق ۸ تا ۱۰ نومبر ۷۴ء منعقد ہوگا جس میں تمام ارکان، متفقین، معاونین، مشاہدین اور خیر خواہان جماعت شرکت کر سکیں گے۔
- ارکان جماعت کا خصوصی اجتماع ان شاء اللہ ۱۱ نومبر کو ہوگا۔
- اجتماع کا آغاز بعد نماز جمعہ محترم امیر جماعت اسلامی ہند کے خطبۂ صدارت سے ہوگا۔
- اجتماع میں شرکت کرنے اور [illegible] دنیا کے مختلف ممالک میں تحریک اسلامی کی رفتار ترقی سے [illegible] تحریکات اسلامی کے ممتاز قائدین اور رابطہ عالم اسلامی کے اہم رہنماؤں کو بھی مدعو کیا جا رہا ہے۔
- اسلام اور ملت اسلامیہ ہند کے مختلف مسائل کے سلسلے میں استفادہ کرنے کے لیے ملک کے ممتاز علمائے کرام اور مفکرین سے شرکت کی درخواست کی جا رہی ہے۔
- [illegible] زیادہ تعداد میں شرکت [illegible] ہوں گے۔

Regd No. MRD 66 Monthly ZINDGI Rampur U. P.
October 1974

نائشنل دہلی آرٹ پریس میں چھپا

زندگی

سالانہ چندہ	**سالانہ چندہ**
ہندوستان سے 15/-	ممالک غیر سے
پاکستان سے 15/-	[illegible] دو ڈالر
ششماہی	ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے 7/50	
پاکستان سے 7/50	
قیمت فی پرچہ 1/50	

زندگی رام پور

(مدیر: سید احمد قادری)

جلد: ۵۳ | شوال المکرم ۱۳۹۴ھ مطابق نومبر ۱۹۷۴ء | شمارہ: ۵

اشارات — سید احمد قادری — ۳

مطالعۂ قرآن

میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا — مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی — ۱۱

مقالات

کیا اسلام اس ملک کی قیادت کر سکتا ہے؟ — جناب اشتیاق حسین — ۱۸

قرآن کے اثرات انسانی تاریخ پر — اے۔ کے بروہی — ۲۸

پیش لفظ — مولانا صدر الدین اصلاحی — ۳۵

ہندوستان میں اسلامی انقلاب کی راہ — ابو اختر اعظمی — ۴۸

تنقید و تبصرہ — ع۔ ق — ۶۱

اس دائرے ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہِ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ ورنہ اگلا پرچہ وی پی سے بھیج دیا جائے گا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

مالک: ادارہ [illegible]، ایڈیٹر: سید احمد قادری، پرنٹر پبلشر: احمد حسن، مطبع: ناظم پریس، بالمقابل [illegible] رام پور، یوپی

مقام اشاعت: دفتر زندگی، رام پور، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

(سید احمد قادری)

اپریل ۷۶ء کے ماہنامہ زندگی میں جماعت اسلامی ہند کا ایک مختصر تاریخی جائزہ میں نے اشارات کے صفحات میں پیش کیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ اسے دوبارہ پیش کر دیا جائے۔

جہاں تک میں نے جائزہ لیا ہے جماعت اسلامی ہند دو سخت مرحلوں سے گزر کر ایک تیسرے سخت مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور آج وہ ایک نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ ان تینوں مرحلوں کی تھوڑی سی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ ان کو بیان کرنے سے پہلے اپنی یادداشت میں یہ بات تازہ کر لینی چاہیے کہ جماعت اسلامی کی تشکیل و تاسیس کیوں اور کس نظریے کے ماتحت ہوئی تھی۔

جماعت اسلامی کس غرض سے منظم ہوئی تھی؟

یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں مختلف جزوی مقاصد کے لیے کام کرنے والی جماعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں اور آج بھی پائی جاتی ہیں۔ کسی نے مسلمان قوم کے جزوی مفاد و حقوق کے حصول کو اپنی کوششوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ کسی نے محدود مذہبی امور و مسائل کے لیے اپنی توانائی وقف کر رکھی ہے اور کسی کی انتہائی معراج یہ ہے کہ بھارت میں امت مسلمہ کے پرسنل لا محفوظ رہ جائیں اور اسے مذہبی و معاشی تحفظ حاصل ہو جائے۔

۱۹۴۱ء میں جس وقت جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی اس وقت بھی کام کرنے والی جماعتیں موجود تھیں اور یہ بات دوسرے لوگ تسلیم کریں یا نہ کریں ہم لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی تشکیل محض اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ جماعتوں میں ایک اور جماعت کا اضافہ کر دیا جائے۔ جماعت سازی کا شوق اس کی تنظیم و تشکیل کا محرک نہ تھا بلکہ ایک نئی جماعت کی تشکیل کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس نصب العین کے لیے کام نہیں کر رہی تھی جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے اور جس کے ...

یہ اس کوشش میں ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف لے چلیں جو امت مسلمہ
کا مقصد وجود اور نصب العین مقرر کیا گیا ہے۔ جب تک یہ
امت مسلمہ اس نصب العین کے لیے اپنی تمام توانائیاں وقف
نہیں کرے گی وہ اپنے مقصد وجود کو حاصل نہیں کر سکے گی
اس کو اس بات کا بھی یقین حاصل ہے کہ اسی نصب العین
کے لیے جد وجہد اس کے تمام پیچیدہ مسائل کا بھی صحیح
اور پائیدار حل ہے۔ یہ بات جماعت اسلامی کے دائرے
میں ہمیشہ عجیب و غریب سمجھی جاتی رہی ہے کہ مسلمان ایک
طرف تو دین اسلام کو دنیا کے تمام مسائل کا حل کہتے ہیں۔
اور دوسری طرف اس کی اقامت کے لیے اجتماعی جد وجہد
پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ جب اپنے پیچیدہ مسائل کو حل
کرنے کی تدبیریں سوچتے ہیں تو اس دین کی بتائی ہوئی
تعلیمات سے صرف نظر کر کے کچھ دوسری ہی تدبیریں اختیار
کر لیتے ہیں۔ یعنی جس بات کا اپنے قول سے اقرار کرتے
ہیں اسی کی اپنے عمل سے تردید کر دیتے ہیں، ان کے عمل سے
جو خیال جھلکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے مسائل تو دوسری
ہی تدبیروں سے حل ہوں گے اور جب وہ حل ہو جائیں گے
تو اسلام اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ تشریف لے آئے گا
مسلمانوں میں عام طور پر جماعت اسلامی کے غیر مقبول ہونے
کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کی ایک اصولی
جماعت کی حیثیت سے اسلام کے مطالبہ کو ہر دوسرے مفاد
پر بالاتر رکھتی ہے اور دوسری یہ کہ زندگی کے ہر مسئلے میں
اسلام سے فتویٰ طلب کرتی ہے [illegible] مدرسہ

سے تعلق ہو یا معاملات اور اجتماعیات سے۔

جماعت اسلامی ہند کا نصب العین

جماعت اسلامی ہند نے جو نصب العین اختیار کیا ہے
وہ یہ ہے :-

"جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین
ہے جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح
آخرت کا حصول ہے۔"

تشریح :- اقامت دین میں لفظ دین سے مراد وہ دین
حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعہ
مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری
اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری
نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا اور جو
اب دنیا میں ایک ہی مستند محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے
اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے
تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات
اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک
زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے
سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن
ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین
نظام زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی

مصالح اور ترقی پذیر تعمیری صلاحیتوں کی تعمیر سے ممکن ہے۔

اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یک سو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین عملی نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔

(دستور جماعت اسلامی ہند)

یہ ہے ہمارے سفر کی ابتدا جہاں سے ہم چلے ہیں اور یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے جماعت اسلامی وجود میں آئی ہے۔ یہ ہے وہ نصب العین جس نے جوڑ کر ہمیں ایک بنایا ہے۔ یہ ہے وہ محور جس کے گرد ہماری جدوجہد گھومتی رہی ہے۔ یہ ہے وہ منزل مقصود جس پر پہنچنے کی آرزو میں ہزاروں دل دھڑک رہے ہیں اور سیکڑوں قدم اپنے اپنے گوشۂ عافیت سے نکل آئے ہیں، کسی نے خانقاہوں کے پرسکون ماحول کو چھوڑا ہے، کسی نے قیمتی ملازمتوں پر لات ماری ہے، کسی نے تجارتی کاروبار کو مختصر کیا ہے اور کسی نے مستقبل کے چمکیلے اور بھڑکیلے مناصب کی قربانی دی ہے۔ اس محبوب و مطلوب کے لیے رشتے منقطع ہوئے ہیں اور قریبی عزیزوں کے تعلقات متاثر ہوئے ہیں۔

اس نصب العین کے حصول کے لیے جو طریقہ ہونا ہو اس کے بنیادی اصول مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی نے اپنے رسالہ "جماعت اسلامی اس کا مقصد اور طریقہ" میں تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ میں اختصار کے ساتھ انہیں یہاں نقل کرتا ہوں:-

پہلا اصول

پہلا اصول اس طرح کی تحریک کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کو اس کی اصلی شکل میں قائم کرنے کی کوشش کرے۔ نہ اپنی طرف سے اس میں کسی بات کا اضافہ کرے اور نہ اس میں کسی طرح کی کمی کرے کیونکہ اضافہ اور کمی کا مطلب یہ ہوگا کہ دین اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا اور ہم نے اپنے لیے ایک نیا دین ایجاد کر لیا۔ یہ دونوں باتیں گمراہی کی ہیں خواہ وہ بظاہر کسی دینی جذبے ہی کے تحت کیوں نہ عمل میں آئیں۔ یہود و نصاریٰ کی اصل گمراہی اسی طرح کی افراط و تفریط کا نتیجہ تھی۔ اسی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی شدت کے ساتھ نئی بات پیدا کرنے سے روکا ہے۔

دوسرا اصول

دوسرا اصول اس تحریک کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کے پورے مجموعہ کو جو اس کے مستند ذرائع علم سے ثابت ہوا اپنے سامنے رکھے۔ نہ کہ اس کے کسی خاص جزء کو بالفاظ دیگر اس کی جدوجہد کا

کلی شکل میں قائم ہو، نہ یہ کہ وہ اس مجموعہ میں سے کچھ خاص خاص باتوں کو چھانٹ لے اور پھر انہی باتوں پر اپنی سعی و عمل کو مرکوز کر دے۔

تیسرا اصول

تیسرا اصول اس تحریک کا یہ ہونا چاہیے کہ اس میں جس طرح اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ دین میں کوئی کمی بیشی نہ ہو اسی طرح اس بات کا بھی لحاظ کیا جائے کہ دین کے مجموعے میں جس چیز کو جس قدر کم یا زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کو پوری شدت کے ساتھ برقرار رکھا جائے اس میں کسی طرح کا ردو بدل نہ ہونے دیا جائے کیونکہ اہمیت کے لحاظ سے کمی بیشی بھی دین میں تحریف ہی کی ایک قسم ہے کہ شریعت میں جس چیز کا اہمیت کے لحاظ سے جو مقام ہے اس میں ہم اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کریں

چوتھا اصول

چوتھی چیز جو اس تحریک کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ جس طرح ہم اس کے اجزاء میں ان کی کیفیت کے اعتبار سے کوئی ردو بدل نہ کریں۔ اسی طرح ان اجزاء میں جو تقدیم و تاخیر یا ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اس میں بھی کسی طرح کا فرق واقع نہ ہونے دیں ورنہ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ شریعت کا مجموعہ اپنی اصل شکل میں برقرار نہیں رہ سکے گا۔ مثلاً یہ

تمام احکام و اعمال کی دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ اگر عقائد کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو [illegible] اعمال کی جو عمارت تعمیر ہوگی وہ کوئی صحیح اسلامی عمارت نہ ہوگی یا مثلاً اسلام کا جو اقتصادی یا سیاسی نظام ہے وہ اپنے آگے پیچھے عقائد و اعمال کا ایک پورا سلسلہ رکھتا ہے۔ اگر اس نظام کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا کر کوئی اپنانے کی کوشش کرے تو وہ اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ممکن ہے اسلامی کہا جائے لیکن حقیقتہً وہ اس کا مستحق نہیں ہوگا اور اس سے وہ خیر و برکات ظاہر ہو سکیں گی جن کی توقع صحیح اسلامی نظام معاشرت سے بجا طور پر وابستہ کی جا سکتی ہے

پانچواں اصول

پانچواں اصول جس کا اس طرح کی تحریک میں لحاظ رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس کو ہر طرح کی قومی و وطنی تعصبات اور دلچسپیوں سے پاک رکھا جائے

یہ اصول بیان کرنے کے بعد امیر جماعت اسلامی نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جماعت اسلامی ہند انہیں اصولوں کو لے کر چلنا چاہتی ہے۔ قوم پرستی اور وطن پرستی سے جماعت کی علیحدگی کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اس جماعت کی تشکیل کے زمانے کا بھی حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

چنانچہ اسی بنا پر ہم نے اب تک اپنے کو قومی اور وطنی تعصبات سے ہر طرح علیحدہ رکھنے کی کوشش

گیا ہے جو وقت کی ایک کافی زمانہ میں وہ زمانہ
ہے جب ملک میں اسی طرح کی تحریکیں اپنے شباب
پر تھیں۔ ایک طرف استخلاص وطن کی جد وجہد
ہو رہی تھی اور دوسری طرف قومی حقوق کے تحفظ کی جنگیں
چل رہی تھیں [illegible] اپنے کو جان بوجھ کر الگ رکھا۔ اگرچہ
اس کے نتیجہ میں انہیں طرح طرح کی مخالفتوں اور
بعض دقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ یہ تحریکات
کلی طور سے ہمارے اصولوں سے مطابقت نہیں
رکھتی تھیں۔ ہمارے نزدیک آزادی صرف یہی نہیں ہے
کہ ایک قوم کے افراد دوسری قوم کی غلامی سے
نجات پا جائیں بلکہ اصلی آزادی یہ ہے کہ ایک
طرف وہ اپنے ہی جیسے انسانوں اور خود اپنے
نفس کی غلامی سے آزاد ہو جائیں اور دوسری
طرف اپنے حقیقی آقا کے غلام بن جائیں۔ اسی طرح
ہمارے نزدیک مسلمانوں کا یہ مقام نہیں ہے کہ
وہ دنیا کی اور قوموں کی طرح اپنے کو بھی ایک
قوم فرض کر لیں اور پھر انہی قوموں کی طرح قومی
عزت و سربلندی کی فکر میں لگ جائیں اور اس طرح
دنیا کے مفسد گروہوں میں ایک اور مفسد گروہ کا
اضافہ کریں بلکہ ان کا اصلی مقام یہ ہے کہ وہ ایک
اصولی جماعت اور پارٹی بن کر دنیا کے سامنے آئیں
اور اپنے اصولوں کی عزت اور سربلندی کے لیے
کوشاں ہوں جن پر قوم و ملک کی حقیقی سعادتوں کا
دارومدار ہے۔ [illegible] حقیقت کو بھلا دیا گیا
ہے کہ اسلام کا مفاد اور مسلم قوم کا ہر طرح کا
مفاد دونوں ہر حال میں ایک نہیں ہیں اور جب
دونوں میں مطابقت ممکن نہ ہو تو ایک حقیقی مسلم
کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اسلام کے
مفاد کو ترجیح دے اور مسلمانوں کے جھوٹے مفاد
قومی کو ترک اور نظر انداز کر دے ورنہ اس کا
نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ اس کی اسلامی حیثیت
مجروح ہو جائے گی بلکہ اس طرز عمل کی بنا پر خود
اسلام بھی بدنام ہو جائے گا اور اس کی ترقی
کی راہیں مسدود ہو جائیں گی جیسا کہ آج فی الواقع
مسلمانوں کے اس قسم کے طرز عمل سے ہندوستان
میں ہو رہا ہے کیونکہ قومی مفاد کے لیے جد وجہد کرتے
ہوئے کسی فرد یا جماعت کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے
کہ وہ عالمگیر اصولوں کی علمبردار ہے اور اگر ایسا
کرتے ہوئے کوئی یہ کہنے کی جرأت کرتا ہو تو
ایسے شخص یا جماعت کی بات سننے کے لیے کوئی
شخص بھی آمادہ نہیں ہو سکتا۔

یہ پورا اقتباس اس لائق ہے کہ تحریک اقامت دین
کے کارکن اپنا کوئی بھی رویہ متعین کرتے وقت پیش نظر
رکھیں۔ جماعت اسلامی جو نظام پیش کرتی ہے اس میں
اور اس نظام زندگی میں جس پر کہ دنیا کی حکومتیں [illegible]
چل رہی ہیں سب سے بڑا اور سب سے بنیادی فرق

یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی اساس لادینی پر قائم ہے
اور دوسرے کی لادینیت (سیکولرازم) اور جیسا کہ ہم نے بتایا
ہے اس تصورِ زندگی کو ترویج و تقویت اگر ان کے ذریعے پہنچائی جاتی
اسلامی زندگی کے نفاذ و قیام کا کوئی سوال پیدا نہیں
ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی ہمیشہ لادینیت
کے تصورِ زندگی کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھتی اور
کہتی آئی ہے۔ امیر جماعت اسلامی ہند اپنے رسالہ تجارت
کی نئی تعمیر اھ ۱۹۷۸ء میں ملک کے سربراہوں کی کوششوں
کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اگر فی الواقع یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ملک کی بھلائی
و ترقی کے لیے ایسے اشخاص درکار ہیں جو نہایت
اعلیٰ جذبات و صفات سے متصف ہوں اور
اس کے لیے کسی درجے میں اس بات کی بھی ضرورت
محسوس کی جا رہی ہے کہ ملک میں اس غرض
کے لیے کوئی سازگار ماحول پیدا کرنے کا انتظام
کیا جائے تو رہنماؤں کو یہ بھی بتانا چاہیے
کہ آزادی کے بعد سے ایسے لوگ اور ایسا ماحول
پیدا کرنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ کیا اس کے
جواب میں وہ سیکولرازم کا نام لیں گے؟ جس کو
سب ہی رہنما بڑے شوق اور پیار سے پروان
چڑھانے میں مشغول ہیں؟ حالانکہ جیسا کہ
آپ جانتے ہیں سیکولرازم ہی درحقیقت جملہ خرابیوں
کی جڑ ہے۔ کیا اس کے جواب میں ان کی کوششوں

گویا عقلاً لایا جائے گا جو قوم پرستی کا
شاخسانہ ہو گئے کے پیچھے کی جا رہی ہیں لیکن قوم پرستی
تو خود ایک طرح کی خود غرضی ہی کا نام ہے۔ اس
میں اور ذاتی خود غرضی میں فرق چھوٹے اور بڑے
درجے ہی کا تو ہے ورنہ روح اور حقیقت کے
لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ پھر یہ صفت محمود
کس طرح ہو جائے گی؟ حالانکہ یہ خود غرضی
بڑی ہونے کی وجہ سے اور زیادہ قابلِ مذمت
ہونی چاہیے اور جب قوم پرستی بھی خود غرضی کا
کا دوسرا نام ہے تو جو شخص قوم و ملک کے
فائدے کے لیے خود غرضی کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ
آخر ذاتی اغراض کے لیے کیوں اس سے باز
رہے گا؟ کیا چیز اس سے مانع ہو سکتی ہے؟"

پھر محترم امیر جماعت "خرابیوں کی جڑ" کے عنوان کے
تحت لکھتے ہیں:-

"اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق
اس کے فکر و عقیدے کی پیداوار ہیں۔ افکار و
عقائد تخم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اعمال و اخلاق اس
کے برگ و بار کی۔ تو آپ ہی سوچیں کہ مغربی تہذیب
و تمدن اور لادینی نظامِ زندگی کے خراب نتائج
کیا ہو سکتے ہیں؟ اگر اس دنیا کا کوئی خالق و
مالک نہیں ہے جس کی رضا کا حصول ہماری
انفرادی و اجتماعی کوشش کا مقصود ہو

اور جب اس کا معیار یہ ہو کہ کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں ہے جس کو سامنے رکھ کر افراد و اقوام اچھائی یا برائی کا فیصلہ کر سکیں اور جب اپنے اعمال کا کسی خدا یا ہستی کے سامنے کوئی جواب دہی کا بھی نہیں ہے جس کا اندیشہ ہو یا اخلاق بدل سکے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ ہر فرد و قوم کیوں نہ زیادہ سے زیادہ اس دنیا کے مزے لوٹنے کی کوشش کرے کیوں نہ وہ اخلاقی ضابطے اپنی پسند و مرضی کے مطابق بنائے اور کیوں نہ وہ اپنے اغراض کے لیے دوسروں کی حق تلفیاں کرے اور کون نہیں جانتا کہ انہیں افکار و تصورات پر مغربی تہذیب و تمدن کی پوری عمارت قائم ہوئی ہے۔

آگے وہ محدود مذہبیت کے تحت لکھتے ہیں:-

دوسری بات جو اس موقع پر عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اس بات سے اطمینان محسوس نہ کریں کہ چونکہ ہندوستان نے ابھی دین کو بالکل خیرباد نہیں کہہ دیا ہے بلکہ یہاں کے لوگ مسجد و مندر کے ساتھ اب بھی اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں لادینیت کی وہ خرابیاں رونما نہ ہو سکیں گی جو دوسرے ملکوں میں رونما ہو چکی ہیں۔ یہ اطمینان سراسر غلط فہمی کا نتیجہ ہوگا۔ لادینیت کا مطلب ہر صورت میں یہ نہیں ہے کہ مذہب کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی جائے جن ملکوں میں لادینیت رائج ہے وہاں بھی مذہب کو صرف عام کاروبار زندگی سے نکالا گیا ہے لیکن انسان کی پرائیوٹ زندگی کی حد تک اس کو باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ کثرت سے لوگ مذہب کو مان رہے ہیں اور اس کے اس محدود تصور کے ماتحت اب بھی ایک حد تک مذہبی زندگی گزار رہے ہیں لیکن یہ مذہبیت خرابیوں کے لیے کسی درجے میں رکاوٹ نہیں بن سکی۔ اس لیے آپ یہ دیکھ کر کہ لوگ اپنی پرائیوٹ زندگی میں رسمی عبادت یا پوجا پاٹ کرتے رہتے ہیں، یہ اطمینان ہرگز محسوس نہ کریں کہ اس کی وجہ سے وہ خرابیاں پیدا نہ ہو سکیں گی جو لادینیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ سوال کہ اس قسم کی مذہبیت کو کہاں تک مذہبیت کا نام دیا جا سکتا ہے ایک علیحدہ سوال ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے صرف اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب ہماری زندگی کے کاروبار خدا سے بے نیاز ہو کر انجام پائیں اور اسی کا چرچا بھی ہو تو مذہب کے ساتھ یہ پرائیوٹ تعلق زندگی پر کس درجہ اثر انداز ہو سکتا ہے اور باقی بھی رہ سکتا ہے یا نہیں؟ ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال پر محض نظری حیثیت سے غور کرنے کے بجائے آپ واقعات کی روشنی میں غور کریں کیا واقعہ یہی ہے کہ

کے مسائل سے بھی تعلق بھی روز بروز مضمحل
ہوتا جا رہا ہے اور جو لوگ اس وقت مذہب کے
علمبردار ہیں وہ خود بھی لادینیت کے سیلاب میں
بہتے نہیں چلے جا رہے ہیں۔

وہ اسلامی نظام حیات کی توضیح کرتے ہوئے
ایک جگہ پھر لکھتے ہیں:۔

"آپ کو معلوم ہے کہ لادینیت صرف ایک
نظریہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے اثرات زندگی
کے کسی خاص گوشے تک محدود ہیں، بلکہ یہ زندگی
کے ہر ہر شعبے پر حاوی ہو چکی ہے اور اس کی بنیاد پر
ہر شعبہ زندگی کے متعلق مستقل نظام فکر بن چکے ہیں
یہ جمہوریت، یہ قوم پرستانہ ڈکٹیٹر شپ اور آخر میں یہ
اشتراکیت، یہ سب اسی لادینی تصور حیات کے
پیدا کردہ سیاسی و معاشی نظام ہیں اور یہ شاید آپ کو
معلوم ہوگا کہ ان نظاموں نے دنیا کو کس قسم کے
پھل دیے ہیں؟

آگے چل کر ایک جگہ وہ بطور خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:۔

خلاصہ یہ کہ اس وقت دنیا کو جس قسم کے بھی
اندرونی و بیرونی مسائل درپیش ہیں ان کا صحیح حل درحقیقت
اس بات پر موقوف ہے کہ دنیا مغرب کے لادینی
اثرات سے اپنے کو پاک کر کے پھر سے اپنی اصل کی
طرف رجوع کرے۔ اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اپنے
کو اس کا محکوم و غلام سمجھے اور پوری زندگی اس کی دی
ہوئی ہدایات کے سانچے میں ڈھال کر اس کی حقیقی فلاح
حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

لادینیت پر اگر مگر سے خالی یہ واشگاف تنقید جماعت
اسلامی کے ان امتیازات میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے
یہ دوسری جماعتوں سے الگ پہچانی جاتی ہے اور یہ تنقید اس
کے نصب العین کا فطری تقاضا ہے۔ جماعت اسلامی کو جو
خصوصیات حاصل ہیں ان کا تذکرہ بھی امیر جماعت اسلامی ہند
کی زبان سے سنیے ـــ "بھارت کی نئی تعمیر اور ہم" میں طریق
کار کے تحت فرماتے ہیں:۔

پہلی یہ کہ یہ خدا پرستی کی دعوت ہے۔ اس لیے
اس میں کسی دنیاوی غرض کا شائبہ نہیں پایا جا سکتا۔
اور اگر ہو تو یہ اس کا نقص ہے جو خود اس کے ہی لیے
تباہ کن ہو سکتا ہے

دوسری یہ کہ خدا پرستی کا مفہوم اس کے
نزدیک نہایت وسیع ہے۔ اس کے دائرے میں انسان
کی صرف نجی زندگی ہی نہیں آتی بلکہ اجتماعی زندگی بھی
اپنے جملہ شعبوں سمیت اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

تیسری یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ جس میں لامحالہ
وحدت اللہ اور وحدت انسانیت کا تصور شامل ہے
قوم پرستی، وطن پرستی اور نسل پرستی وغیرہ پرستیوں کا
کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا۔ اس لیے جماعت کی دعوت
بھی کسی خاص قوم و ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے
اس کا تعلق ہر قوم و ملک سے ہے سبھی اس کے مخاطب

ہیں اور ہمیں کا مفاد اس کے پیش نظر ہے۔ ان خصوصیات کو نگاہ میں رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جماعت کا طریق کار ان سیاسی اور مذہبی طریق کار سے قطعاً مختلف ہونا چاہیے جو یا مذہب کے محدود تصور کے ساتھ کام کر رہی ہیں یا اپنے سامنے صرف دنیاوی یا کسی خاص ملک و قوم کے قومی و ملکی مفاد کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی نہ محدود معنوں میں کوئی مذہبی جماعت ہے اور نہ رائج الوقت معنوں میں سیاسی جماعت اور اسی بنا پر ہمارا اب تک طریق کار یہ رہا ہے کہ ہم نے اپنے کو نہ صرف ہر اس تحریک سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی ہے جس کا مدعا محض کوئی دنیاوی و مادی غرض ہو اور اسی بنا پر ہمیں اب بھی ایسی تحریکات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو کسی دنیاوی غرض کے لیے ہوں۔

ان تینوں خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہم دوسری جماعتوں کی طرح اپنے گرد کوئی بھیڑ جمع کرنا نہیں چاہتے جس سے وقتی طور سے جوش دلا کر کچھ کام لینا مقصود ہو بلکہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ سب سے پہلے لوگ فکری طور سے ہماری دعوت پر متفق ہوں اور اس کے بعد جب وہ اسے حق سمجھ لیں تو اس کو اپنی پوری وسعت اور استطاعت کے مطابق اپنی زندگی کی خصوصیت بنائیں اور اس کے خلاف کسی بات کو گوارا ہی نہ کریں اختیار نہ کریں اور آخر یہ کہ اپنے اندر فکر و عمل کی ضروری تبدیلی پیدا کر کے اس بات کے لیے تیار ہو جائیں کہ سب مل کر حق کے علمبردار بنیں اور اپنے نمونے سے بھی اس کے حق ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

جماعت اسلامی جس نصب العین کے لیے قائم ہوئی ا[ور] جن خیالات و نظریات کے ساتھ قائم ہوئی ان کا یہ بہت ہی مختصر خاکہ ہے جو میں نے اپنے الفاظ میں پیش کرنے کے بجائے محترم امیر جماعت اسلامی ہند کے الفاظ میں پیش کرنا پسند کیا ہے۔ کیونکہ ان کے الفاظ میرے الفاظ سے زیادہ مستند ہیں۔ اس خاکے کو سامنے رکھ کر اب ان تین مرحلوں کی تھوڑی سی تفصیل سنیے جن کا ذکر اوپر گذر رہا ہے

پہلا مرحلہ

ایک ایسی عظیم انقلابی دعوت لیکر اٹھنے والی جماعت کا استقبال جس طرح اس ملک میں ہوا ہوگا اس کو عقل و قیاس کی نگاہ بھی دیکھ سکتی ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ ابھی اس جماعت کے السابقون الاولون موجود ہیں اور جو کچھ گزر رہی ہے وہ خود ان پر گذر رہی ہے۔ جماعت ہند کا پہلا سخت مرحلہ تقسیم ہند کا مرحلہ تھا۔ تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان دونوں ہی ملکوں پر جو قیامت ٹوٹی اور انسانی شکل و صورت رکھنے والی مخلوق نے جس بہیمیت حیوانیت اور درندگی کا ثبوت دیا اس پر ابھی زیادہ دن

نہیں گذری ہے اور بھارت میں رہنے والے مسلمانوں پر آفتوں کا جو کالا بادل ٹوٹ کر برسا اسے بھی ہم بھولے نہیں ہیں۔ اس خطرناک دور کی یاد آج بھی ہمیں سہما دیتی ہے اور جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے اس کا تو ایسا تیا پانچہ ہوا کہ بھارت میں اس کے پھر اٹھ کھڑے ہونے کی بہت مشکل سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کے ارکان کی نہ صرف اکثریت پاکستان کے حصہ میں جا چکی تھی بلکہ اس وقت کے کل ہند امیر، قیم، شعبۂ تنظیم، مکتبۂ جماعت کا آرگن اور مرکزی دفتر، غرض سب کچھ پاکستان منتقل ہو چکا تھا اور یہاں بھارت میں وہ سو چالیس عملاً منتشر ارکان کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ ملک کی حالت یہ تھی کہ پبلک مقامات پر اسلام کا نام لینا بھی ایک جہاد سے کم نہ تھا اور خوف و ہراس کی وہ کیفیت طاری تھی جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اس وقت جو حالت تھی اس کا مختصر نقشہ قیم جماعت اسلامی ہند نے بھی اپنی اس مرکزی رپورٹ میں کھینچا ہے جسے انھوں نے سنہ ۱۹۵۱ء کے کل ہند اجتماع رام پور میں پڑھا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"جس وقت جماعت اسلامی ہند کی تشکیل ہوئی وہ ہمارے لیے ایک نازک دور تھا۔ ایک طرف تو غیر مسلموں میں اشتعال، انتقام، عصبیت اور تعصب کے جذبات بھڑک رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں پر خوف و ہراس اور انتشار کی حالت طاری تھی۔ مسلمان ایک طرف اکثریت سے اور دوسری طرف نئے نظام حکومت سے خائف و مرعوب تھے۔ دن رات فرقہ پرستی، بیزاری خود سیاست سے بیزاری اور شاذ و نادر نعوذ باللہ اسلام سے بیزاری مسلمانوں کا اور ان کی انجمنوں کا عام دستور بنا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں مسلم قوم کے چند افراد کا مل کر ملک اور قوم کے مسائل پر غور و فکر کرنا اور سدھار و اصلاح حال کا کوئی کام کرنا ایک بڑا مشکل اور صبر آزما معاملہ تھا۔

(روداد اجتماع رامپور)

ان تاریک حالات میں امید کا صرف ایک چراغ روشن تھا وہ یہ کہ بفضل الٰہی کوئی رکن خدا کو نہ بھولا تھا جس سے اس نے عہد کیا تھا۔ کسی کے دل سے اس کی حمایت و نصرت کا عقیدہ گم نہ ہوا تھا جس پر اسے بھروسہ تھا ان ارکان کو متحد کرنے والی چیز کوئی شخصیت نہ تھی جس کے ہٹ جانے سے یہ اتحاد پاش پاش ہو جاتا۔ بلکہ اللہ پر ایمان نصب العین مقصد حیات اور اسلام کے اصولوں نے انہیں متحد کیا تھا اور یہ سب کے سب جوں کے توں موجود تھے وہ حی و قیوم خدا جو تمام کائنات کو تھامے ہوئے ہے اپنی پوری شان جلال و جمال کے ساتھ موجود تھا، موجود ہے، موجود رہے گا۔ وسط اپریل ۱۹۴۸ء میں بمقام الٰہ آباد بھارت کے ارکان جماعت اسلامی کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جس میں راقم الحروف بھی موجود تھا۔ حالات کے

دباؤ کی وجہ سے جماعت اسلامی ہند کے نام سے از سر نو سابق غیر منقسم جماعت اسلامی کی تنظیم ایک نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی لیکن اللہ کی نصرت وحمایت کے بھروسے پر ارکان کی غالب اکثریت نے نام، نصب العین اور طریقہ کار میں کسی معمولی ترمیم و تبدیلی کے بغیر اس جماعت کے احیاء کا فیصلہ کر کے متفقہ طور پر مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ جماعت اسلامی پاکستان سے اس کے تمام مالی، مشاورتی اور تنظیمی تعلقات باضابطہ توڑ لیے گئے اور ہندوستان میں ایک مستقل بالذات جماعت اسلامی وجود میں آگئی جس خدا کے بھروسے پر اس کی تنظیم نو عمل میں آئی تھی اس نے اسے اپنی مدد سے محروم نہ رکھا اور خزانہ غیب سے اس کے لیے تمام ساز و برگ مہیا کر دیے اس نے نہ صرف ارکان جماعت کے دلوں کو تقویت بخشی بلکہ اس جماعت کے ذریعہ دوسرے مسلمانوں کے دلوں سے بھی خوف وہراس دور کرنے کی خدمت لی۔ ان حالات میں یہاں کے دہشت زدہ مسلمانوں نے جب حکومت الٰہیہ، اسلامی ریاست، اقامت دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی آوازیں سنیں تو ان کے دلوں کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ان نازک حالات میں جماعت اسلامی نے صرف قول سے نہیں اپنے عمل سے بھی یہ بات ثابت کی کہ وہ جس تحریک کی علمبردار ہے وہ قومی تعصبات اور مسلم قوم پرستی سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتی۔ وہ جن اصولوں پر یقین رکھتی ہے اور جنھیں بلا لحاظ قوم وملت پورے ملک کے سامنے پیش کر رہی ہے وہ باد سحر کے نرم جھونکوں اور سورج کی سنہری کرنوں کی طرح تمام انسانوں کے لیے عام ہیں۔ اس طرح جماعت اسلامی ہند اپنے پہلے مرحلے سے بخیریت گذر گئی۔

دوسرا مرحلہ

میرے نزدیک جماعت اسلامی ہند کو ۱۹۵۱ء میں دوسرا سخت مرحلہ پیش آیا جب مختلف مذہبی حلقوں کے نے اس کے خلاف اجتماعی فتاویٰ کے دہانے بیک وقت کھول دیے۔ انفرادی طور پر الگ الگ، مضامین اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی شکل میں تو یہ خدمت غیر منقسم ہند کے وقت سے انجام دی جارہی تھی لیکن اجتماعی طور پر چہار طرف سے یہ حملہ ۱۹۵۱ء میں کیا گیا اور خالص مذہبی رنگ میں کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے درمیان اس جماعت کی ہوا بالکل اکھاڑ دی جائے اور یہ ٹھٹھر کر رہ جائے۔ اگرچہ خود جماعت میں مختلف طبقوں کے علماء موجود تھے اور ان کی اخلاقی تائید بھی جماعت کو حاصل تھی لیکن اس کے باوجود ان علماء کے اثرات مسلم عوام وخواص پر بہت زیادہ تھے جو جماعت اسلامی کو بالکل گردن زدنی قرار دے رہے تھے۔ ہندوستان کی بہت بڑی علمی دینی اور سیاسی شخصیت کی طرف سے الزامات کی ایک لمبی فہرست پیش کی گئی تھی جس کا حاصل یہ تھا کہ مسلمانوں کے تمام گمراہ فرقے ایک طرف اور جماعت اسلامی تنہا ایک طرف یعنی اس میں تمام گمراہ فرقوں کی گمراہیاں اور خر

یک جا ہوگئی ہیں۔ ان شدید حملوں کے دواعی و اسباب کیا تھے۔ ان پر اس مختصر مقالے میں بحث بے کار ہے۔ اگر کبھی جماعت اسلامی ہند کی مفصل تاریخ مرتب ہوئی تو اس میں ان پر تفصیلی بحث ہوگی۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اس سخت مرحلے سے جماعت اسلامی کا بخیریت گزر جانا تین وجوہ سے ممکن ہوا۔

ایک یہ کہ فی الواقع ان الزامات کی کوئی حقیقت نہ تھی، وہ جھوٹ کا طومار تھے، یا غلط فہمیوں کا انبار۔ جماعت کے ارکان کہیں خلا میں معلق نہ تھے، بلکہ عام مسلمانوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمان اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جن لوگوں پر الزامات لگائے جا رہے تھے، ان کی زندگیاں اُن سے پاک ہیں۔

دوسری وجہ صبر و ضبط و استقامت کی وہ کیفیت تھی جو ارکان پر پورے ہندوستان میں چھائی ہوئی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ امیر جماعت اسلامی ہند اور دوسرے ذمہ داران جماعت نے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ اپنے بیانات و تصریحات میں جماعتی نصب العین اور جماعتی موقف کی نمائندگی کی اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی خواہش کی بنیاد پر بھی اپنے عقائد و نظریات، اپنے نصب العین، اپنے طریقہ کار اور اپنے موقف میں کوئی تبدیلی نہ کی، بلکہ کسی مداہنت کو بھی گوارا نہ کیا۔ اس استقامت اور اتحاد فکر و عمل نے ہر حملے کو ناکام بنا دیا۔ اس وقت امیر جماعت اسلامی ہند نے جو تحریریں لکھی تھیں

ان میں کا ایک پیراگراف بڑا موثر اور قیمتی ہے۔ انھوں نے ماہنامہ زندگی جون، جولائی، اگست ۱۹۵۱ء کے مشترک شمارے کے اشارات میں لکھا تھا۔

> جماعت اسلامی جو دعوت لے کر کھڑی ہوئی ہے وہ ایک ہمہ گیر انقلابی، اصلاحی دعوت ہے جو زندگی کی پوری عمارت کو اسلام کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتی ہے اور چونکہ بدقسمتی سے صدیوں سے ہمارا حال یہ رہا ہے کہ ہم اسلام کی اس جامعیت کو عملاً فراموش کر چکے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کی اس حیثیت سے اعتقادی طور سے بھی بے تعلق ہو چکے ہیں اس لیے دعوت اور اس کی سرگرمیوں سے بہت سے لوگوں کا اپرانا اور پھر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے جس وقت ہم نے اس راہ میں قدم اٹھایا تھا اسی وقت اس کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ ہم ایک ایسے کام کا بیڑا اٹھا رہے ہیں جس کی صحیح نوعیت اور اہمیت کا اگر لوگ اعتراف کریں گے تو ایک عرصے کے بعد ــــــ اور اس سے پہلے ہمارے خلاف غلط فہمیوں، بدگمانیوں اعتراضوں، بہتان طرازیوں اور انتہائی مخالفتوں کا ایک طویل دور گذرے گا جس سے بچنے کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ہم اپنی دعوت میں لوگوں کی خواہش کے مطابق بنیادی

تھیں کہ ہمیں اسلام سے کم پر راضی ہو جانا چاہیئے جتنا کہ فی الواقع اسلام کا مطالبہ ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے ہماری حیثیت دین کے پیرو اور داعی کی ہے نہ کہ اس میں اصلاح و ترمیم کرنے والوں کی۔ اس لیے اگر ہمیں اپنا کام جاری رکھنا ہے اور اس کے لیے شرعاً اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں تو پھر قدرتی طور پر ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ ہماری مخالفتیں کی جائیں، ہم پر لعن و طعن کی بوچھار ہو، ہمارا مقاطعہ کیا جائے اور ہمیں قتل تک کی دھمکیاں دی جائیں چنانچہ آج یہی سب کچھ ہو رہا ہے

یہ تھا اپنے موقف پر وہ یقین جس نے ہر شیطانی اغوا اور ہر شیطانی خواہش کو ہمارے اندر گھس آنے سے روک دیا اور ہم اپنے عقائد و نظریات اور اپنے نصب العین پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ کاش استقامت و یقین کی وہی کیفیت آج بھی حاصل ہوتی اور ہر غلط دباؤ کے مقابلہ میں آج بھی ہم سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے۔

تیسرا مرحلہ

تیسرے مرحلے پر گفتگو سے پہلے مناسب ہوگا کہ ارکان جماعت اسلامی پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے اس ذمہ داری اور فرض کی یاد دہانی کرا دی جائے جو ہم میں سے ہر ایک پر خود جماعت، نصب العین اور دستور کے تعلق سے عائد ہوتی ہے۔ تشکیل جماعت کی بالکل ابتدا میں یہ فرض ان الفاظ میں ارکان کے سامنے رکھا گیا تھا

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا جو فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اس کے معنے صرف یہی نہیں ہیں کہ بیرونی حملوں سے آپ اس کی حفاظت کریں، بلکہ یہ بھی ہیں کہ اندرونی امراض سے بھی اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت مستعد رہیں۔ جو نظام جماعت کو خراب کرنے والے ہیں جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو راہ راست سے نہ ہٹنے دیا جائے۔ اس میں غلط مقاصد اور غلط خیالات اور غلط طریقوں کے پھیلنے کو روکا جائے۔ اس میں نفسانی دھڑے بندیاں نہ ہونے دی جائیں۔ اس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے۔ اس میں کسی دنیوی غرض یا کسی شخصیت کو بت نہ بننے دیا جائے اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے۔"

(روداد حصہ اول ص۱۵)

آگے جو کچھ لکھا جائے گا اس میں اس جذبۂ خیر خواہی کے سوا اور کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ میرے نزدیک جماعت اسلامی ہند آج ۱۹۶۳ء میں جہاں کھڑی ہے وہ اس کے لیے تیسرا مرحلہ ہے جو پہلے دو مرحلوں سے زیادہ سخت اور جماعت اسلامی کی دعوت، اس کے نصب العین

اس کے خیالات و افکار اور اس کے امتیازات و خصوصیات کا جو مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے اور پھر دو مرحلوں کی سرگذشت میں اس کے نظم و ضبط، نصب العین پر استقامت، جذبۂ ایثار و قربانی نظامِ حق سے محبت اور نظامِ باطل سے نفرت اپنے مسلک و موقف پر پختہ یقین اور اس معاملے میں لوگوں کی خواہشات کے قبول نہ کرنے کے عزم کا جو مختصر نقشہ گزرا ہے اس کو معیار بنا کر جائزہ لیجیے۔ کیا ہم ۱۹۶۳ء میں بھی اسی اونچے مقام پر کھڑے ہیں جہاں ۱۹۵۲ء میں کھڑے تھے۔ حالانکہ ملک کے امن و امان کی کیفیت اور خارجی حالات آج اس خطرناک دور کے مقابلے میں جو گذر گیا کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

کیا آج بھی ہم اتحادِ فکر و عمل کی اسی منزل میں ہیں جہاں آج سے ۱۰ سال پہلے تھے۔ کیا آج بھی ہماری توانائیوں کا ... اقامتِ دین کے نصب العین پر صرف ہو رہا ہے۔ کیا آج بھی واقعی یہی نصب العین ہماری تمام جد و جہد کا مرکز و محور بنا ہوا ہے۔ ابھی حال میں ایک دینی حلقہ کی طرف سے چھپے چھپے لفظوں میں ہم پر اپنے نصب العین سے ... ہٹ جانے اور قوم پرستانہ رخ اختیار کر لینے کا الزام لگایا گیا ہے۔ کیا واقعی وہ سو فیصدی غلط ہے آج ہمارے کانوں سے بعض لوگوں کی یہ بات ٹکرا رہی ہے کہ جماعت اسلامی والے ٹھوکریں کھا کر اسی راہ پر ہیں جس پر ہم چل رہے ہیں تو کیا ان کی یہ بات ... اصل ہے؟ میری خیر خواہی کا تقاضا تھا کہ میں ان سوالات کی طرف توجہ مبذول کراؤں۔ ان ... کو نظر انداز کرنا اور ان سے جان چرانا جماعت کے لیے کسی حال میں بھی مفید نہیں ہے۔ ہم ... ہر جماعت کے دستور و نصب العین کی خیر ... اور ہر شخص کو یہ فرض انجام دینا چاہیے۔ میں جماعت اور دستور کی خیر خواہی سے منہ موڑنے کا مجرم بنوں گا اگر اپنا یہ احساس ظاہر نہ کروں کہ اوپر جس معیار کا ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے ہم ۵۲ء کے مقابلے میں بہت پست مقام پر کھڑے ہیں۔ حالانکہ ۵۲ء کا مقام بھی معیارِ مطلوب سے نیچے ہی تھا۔

خدا کرے یہ اندیشہ کبھی صحیح ثابت نہ ہو کہ ہم دستور کی عبارتیں پڑھتے پڑھاتے ہوئے عملاً اس سے بالکل بدل چکے ہوں۔ میں گڑگڑا کر قرآن نازل کرنے والے اللہ رب العلمین کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ جماعت اسلامی ہند کو اس سخت مرحلے سے بھی بخیریت گزار دے۔ مسلم حقوق و مفاد کے استحفاظ کے لیے یہاں پہلے بھی جماعتیں موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں لیکن تیرے بھیجے ہوئے دین کی اقامت و تنفیذ کے لیے اس ایک جماعت کے سوا کوئی دوسری جماعت کام کرنے والی نہیں ہے۔ تو اسے بگڑنے سے بچا لے۔

جن سوالات کی طرف اپریل ۶۳ء میں توجہ مبذول کرائی گئی تھی وہ نومبر ۶۳ء میں اپنی جگہ قائم ہیں اور ہم سے جوابات طلب کر رہے ہیں۔

میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝
قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ۝ (القصص : ۱۶-۱۷)

ترجمہ :- (موسیٰ نے) کہا۔ اے میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا۔ میری مغفرت فرما دے۔ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی وہ غفور و رحیم ہے۔ موسیٰ نے عہد کیا کہ اے میرے رب یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے۔ اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔[1]

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ عہد بہت وسیع الفاظ میں ہے۔ اس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ میں کسی مجرم فرد کا مددگار نہیں بنوں گا۔ بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ میری امداد و اعانت کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ ہوگی جو دنیا میں ظلم و ستم کرتے ہیں۔ ابن جریر اور متعدد دوسرے مفسرین نے اس کا یہ مطلب بالکل ٹھیک لیا ہے کہ اسی روز حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی حکومت سے قطع تعلق کر لینے کا عہد کر لیا۔ کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت تھی اور اس نے خدا کی زمین پر ایک مجرمانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کسی ایمان دار آدمی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظالم سلطنت کا کا[رندہ] بن کر رہے اور اس کی حشمت و طاقت میں اضافے کا موجب بنے۔

علماء اسلام نے بالعموم حضرت موسیٰؑ کے اس عہ[د] سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک مومن کو ظالم کی اعان[ت] سے کامل اجتناب کرنا چاہیے۔ خواہ وہ ظالم فرد ہو، گروہ یا حکومت و سلطنت۔

مشہور تابعی حضرت عطاء بن رباح سے کسی نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنی امیہ کی حکومت میں ... کے گورنر کا کاتب (سکریٹری) ہے۔ معاملات کے فیصلے

اس کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو مفلس ہو جائے۔ حضرت عطاء نے جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا تیرے بھائی کو چاہیے کہ اپنا قلم پھینک دے رزق دینے والا اللہ ہے۔

ایک اور کاتب نے عامر شعبی سے پوچھا۔ اے ابو عمر! میں بس احکام لکھ کر جاری کرنے کا ذمہ دار ہوں۔ فیصلے کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیا یہ رزق میرے لیے جائز ہے"۔ انھوں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ کسی بے گناہ کے قتل کا فیصلہ کیا جائے اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کا مال ناحق ضبط کیا جائے یا کسی کا گھر گرانے کا حکم دیا جائے اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو"۔ پھر امام موصوف نے یہ آیت پڑھی جسے سنتے ہی کاتب (سکریٹری) نے کہا۔ آج کے بعد میرا قلم بنی امیہ کے احکام جاری کرنے میں استعمال نہ ہوگا۔ امام نے کہا۔ پھر اللہ بھی رزق سے محروم نہ فرمائے گا

ضحاک کو تو عبدالرحمٰن بن مسلم نے صرف اس خدمت پر بھیجنا چاہا تھا کہ وہ بخارا کے لوگوں کی تنخواہیں جا کر بانٹ آئیں مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں نے کہا۔ آخر اس میں کیا حرج ہے۔ انھوں نے کہا میں ظالموں کے کسی کام میں بھی مددگار نہیں بننا چاہتا۔ روح المعانی جلد ۲ ص

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہ واقعہ ان کے تمام مستند سوانح نگاروں الموفق المکی۔ ابن البزاز الکردی۔ ملا علی قاری وغیرہم نے لکھا ہے کہ انہیں کی تلقین پر منصور کے کمانڈر انچیف حسن بن قحطبہ نے یہ کہہ کر اپنے عہدے سے استعفا دے دیا تھا کہ آج تک میں نے آپ کی سلطنت کی حمایت کے لیے جو کچھ کیا ہے یہ اگر خدا کی راہ میں تھا تو میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ لیکن اگر یہ ظلم کی راہ میں تھا تو میں اپنے نامہ اعمال میں مزید جرائم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۶۲۳-۶۲۴)

کیا اسلام اس ملک کی قیادت کرسکتا ہے

(آخری قسط)

(جناب اشتیاق حسین ایم اے - ادارہ تصنیف علی گڈھ)

یہ ہیں اسلام کی وہ خصوصیات جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ہندوستان میں موجود رکاوٹوں کو دور کرکے خود کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن مزید خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ خود ہندوستان کے حالات بھی پورے طور پر تاریک نہیں ہیں بلکہ کچھ باتیں یہاں پر بھی ایسی ہیں جن کی بنا پر ہم اسلام کے لیے ایک خوش آئند مستقبل کی امید کر سکتے ہیں اور وہ باتیں یہ ہیں

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلے میں قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ عوام کا مزاج زمانۂ قدیم سے مذہبی رہا ہے اور آج بھی یہ صورت حال کم و بیش موجود ہے یہی وہ نکتہ ہے جہاں دعوت اسلام اور یہاں کے حالات کا بُعد (DIMENSION) ملتا ہوا نظر آتا ہے - لہذا کم سے کم اس بات کا اندیشہ نہیں ہے یا بہت کم ہے کہ یہاں اس قسم کی رکاوٹیں سامنے آئیں گی جس قسم کی رکاوٹیں ایک مذہب بیزار اور باغی خدا سماج میں پیش آسکتی ہیں۔

دوسری خصوصیت جس کا ذکر ہم ہندوستانی حالات کے ضمن میں کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہاں کے باشندے نظریاتی اعتبار سے صفت مزاحمت کے بہت زیادہ شیدا نہیں ہیں جیسا کہ حقیقت ہے زمانہ قدیم سے مختلف قومیں اور مختلف نسلیں آآکر ہندوستان میں آباد ہوتی رہی ہیں انھوں نے یہاں کے سماجی، معاشرتی اور ثقافتی اثرات قبول کیے ہیں لیکن آنے والے باشندے بھی اپنے ساتھ مخصوص تہذیبی اور ثقافتی اثرات لیکر آئے جن کے سلسلے میں یہاں کے عوام نے بہت زیادہ مزاحمت کا رویہ نہیں اپنایا بلکہ بہت حد تک ان اثرات کو قبول کیا۔ یہ چیز اسلام کو یہاں کے عوام کی زندگی میں داخل کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب صورت حال یہ رہی ہے تو اسلام تو

یہاں ضمنیت قبل ہوچکا تھا، پھر یہاں کے عوام کی زندگی اسلامی طرز کیوں نہ اختیار کرسکی ہے۔ دراصل کسی دوسری تہذیب کے اثرات قبول کرنا اور بات ہے اور کسی دوسری تہذیب یا نظریہ کو شعوری طور پر تسلیم کرکے اپنی زندگی میں داخل کرلینا ایک دوسری بات ہے اور یہ دوسری شکل اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ کسی نظریے کے حامی اعلانیہ طور پر اس کی طرف دعوت دیتے ہیں اگرچہ مزاحمت کا بہت زیادہ نہ ہونا اس دوسری شکل کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ یہاں ایک شبہہ اور پیدا ہوسکتا ہے کہ چونکہ یہاں کے باشندے دوسرے تمدنوں اور ثقافتوں کے اثرات قبول کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اسلام کے تعلق سے بھی یہاں کے عوام کو ایک مخصوص تمدن اور ثقافت کی طرف دعوت دی جانی چاہیے جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے اور آگے پھر ذکر کرے گا۔ اسلام کسی خاص تمدن ثقافت یا نسل پرستی کی طرف دعوت نہیں دیتا بلکہ اس کا پیغام آفاقی اور عمومی ہے لہٰذا اسلامی دعوت اس قسم کی نہیں ہوگی۔ اس مقام پر ہندوستان کی اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کی اس اجتماعی قوت برداشت کے واسطے دلیل فراہم کرنا مقصود تھا جو اسلام کی نظریاتی دعوت کے لیے بھی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم چیز جو یہاں کی زندگی میں شامل ہے وہ جمہوریت ہے جو بظاہر سیاسی اعتبار سے ایک خاص طرز کی حکومت ہے لیکن اس کے [illegible] نتائج بہت دور رس اور اس کے اثرات زیادہ وسیع دائرے میں رونما ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے نتیجے میں یہاں ہر مذہب اور نظریے کے حامی لوگوں کو نظریات، مذہب اور اصول کی تبلیغ اور پروپیگنڈے کا پورا پورا حق ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر شخص کو آزادی رائے کا حق بھی حاصل ہے۔ وہ حدود کے اندر رہ کر جس نظام پر چاہے تنقید کرسکتا ہے اور حدود ہی کے اندر رہ کر اپنے پسندیدہ طریقہ زندگی کی اشاعت کے لیے وہ پریس رسل و رسائل اور دیگر وسائل استعمال کرنے کے لیے بھی آزاد ہے۔ اور یہ حق بھی ہر شخص کو حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو مذہب چاہے اختیار کرے یا اپنا مذہب تبدیل کرکے دوسرے مذہب سے اپنا تعلق قائم کرلے۔ چنانچہ اسلامی تحریکیں جس طرح ہندوستان میں اپنے نظریات اور افکار کا پروپیگنڈہ کررہی ہیں وہ ایک بڑی چیز ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ خصوصیت ہندوستان کی قابل فخر خصوصیات میں سے ہے کیونکہ اس کرۂ ارض پر ایسے مسلم ممالک بھی موجود ہیں جہاں اسلامی تحریک دقیانوسیت یا بغاوت کی علمبردار سمجھی جاتی ہے۔

بڑھتی ہوئی مادیت پرستی نے یہاں کے عوام میں ایک طرف اطمینان کی فضا پیدا کردی ہے اور انسان کو معنوی چیز کی تلاش سے بے نیاز بنادیا ہے وہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اس بڑھتی ہوئی مادیت پرستی کے [illegible]

تحریکات نے یہاں کے باشندوں بالخصوص نوجوان طبقہ میں ایک ردعمل بھی پیدا کر دیا ہے اور وہ ردعمل یہ ہے کہ یہاں کے عوام اس بے لگام مادیت پرستی سے تنگ آ رہے ہیں۔ نوجوانوں کے ایک خاص طبقے میں کسی معنوی مقصدیات کی تلاش پیدا ہو گئی ہے اور وہ کسی ایسے معنوی سہارے کو ڈھونڈ رہے ہیں جو انہیں اطمینان اور سکون بخش سکے اور خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ یہاں کے مختلف نظریات اور مختلف مذہبوں کو بھی آزما چکے ہیں اور کسی نے بھی ان کو کچھ نہیں دیا ہے۔ لہٰذا اب ان کو ایسی پناہ کی طلب ہے جو انہیں انفرادی اعتبار سے اور [illegible] عطا کر سکے۔ اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے اندر اس پریشانی کا حل بھی رکھتا ہے۔

اوپر ہم مادیت، شرک، بت پرستی اور نظریہ تناسخ وغیرہ کا ذکر کر چکے ہیں جو کہ اسلام کے مخالف ہیں لیکن خوش قسمتی سے ہندوستان کے مذہبی لٹریچر میں کسی نہ کسی شکل میں ان کے مخالف نظریات بھی ملتے ہیں جو اسلامی عقائد ہی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ مثلاً روحانیت، توحید، بتوں کی مخالفت اور تصور آخرت وغیرہ۔ اگرچہ یہ پہلو بہت دبے ہوئے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے ان پہلوؤں کو تلاش کر کے ابھارا جائے۔

الغرض یہ ہیں وہ خوش کن حالات جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اور اسلام کے واسطے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ [illegible] کے ساتھ ساتھ خود اسلام کے اندر بھی ایسی قیادتی خصوصیات موجود ہیں جو ان بہت سی رکاوٹوں کو دور کر کے اسلام کے مستقبل کو تابناک بنانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں اور اس پوری صورت حال کے نتیجے میں ہم اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ مضمراتی طور پر یہاں کے عوام کی زندگی میں داخل ہو کر ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر حکمرانی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

یہ تھا پہلے سوال کا جواب، اور وہ سوال یہ تھا "کیا مضمراتی طور پر اسلام اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ یہاں کے باشندوں کی قیادت کر سکے؟" لیکن صرف اس نتیجے پر پہنچ جانا کافی نہیں ہے کہ اسلام مضمراتی اور امکانی طور پر اس ملک کی قیادت کر سکتا ہے کیونکہ کسی چیز کے اندر ایک مخفی صلاحیت کا ہونا اس بات کے لیے کافی دلیل نہیں ہے کہ فی الواقع عملی شکل میں اس کا ظہور بھی ہو سکتا ہے۔ کسی چیز کا کسی کام کے لیے اہل اور باصلاحیت ہونا اور بات ہے اور اس کا عملی شکل اختیار کرنا ایک دوسری بات ہے۔ ایک نوزائیدہ بچہ بے بس ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر مضمراتی طور پر اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہے لیکن اس وقت اس کا ان صلاحیتوں کا حامل ہونا اور ان صلاحیتوں سے محروم رہنا دونوں برابر ہیں۔ ان صلاحیتوں کا موجود ہونا تبھی سود مند ہوگا جبکہ وہ صلاحیتیں عملی شکل اختیار کر لیں گی۔ اب جہاں تک عملی شکل کے اختیار کیے جانے کا سوال ہے یہ عمل اسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ خارجی عوامل ا

براہ راست انداز میں یعنی اس کے لیے باہر سے کوشش کی جائے اس کو عملی شکل دینے کے لیے جد و جہد کی جائے اور اس کی ان مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ مخصوص طریقۂ کار اپنایا جائے۔ یہی چیز اسلام کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ہر چند کہ اسلام میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اپیل کر کے ان کی زندگیوں میں داخل ہو سکے لیکن عملاً ایسا ہونے کے لیے کچھ کرنا پڑیگا اس کے لیے کوشش اور جد و جہد درکار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ باطل قوتوں کو شکست دے کر اسلام عملی زندگی میں اسی وقت آ سکا جبکہ اس لیے کوشش کی گئی اس کی مخفی صلاحیتوں کے ارتقاء کے لیے عملی جد و جہد کی گئی اس کو پھیلانے اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے کام کیا گیا اور اس کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ اس کے بغیر صلاحیتیں خواہ جس قدر اعلیٰ اور ارفع ہوں ان کی حیثیت اس بیج کی سی ہوتی ہے جو صالح آب و ہوا اور صحیح خارجی خدمت کی کمی کے سبب ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہاں کی عملی زندگی میں اسلام بحیثیت ایک حکمراں طاقت کے داخل ہو تو اس کے لیے کوشش کرنا ہوگی اور اگر اس کی مضمر صلاحیتوں کو ارتقائی شکل دے کر انہیں بروئے کار لانا ہے تو شعوری جد و جہد اس کے لیے جد و جہد درکار ہے اور تب ہی ہمیں یہ کہنے کا حق ہوگا کہ یہاں اسلام بحیثیت ایک قائد کے سامنے آ سکتا ہے۔

لیکن اس جد و جہد کے لیے ایک مخصوص طریقۂ کار اپنانا پڑے گا کیونکہ ظاہر ہے کسی بھی چھوٹے پیمانے کی جد و جہد کے لیے ایک مخصوص طریقۂ کار کی ضرورت پڑتی ہے چہ جائیکہ اتنے عظیم مقصد کے لیے وہ طریقۂ کار جو دعوتِ اسلام کے واسطے بروئے کار لانا پڑے گا اگرچہ خود اسلامی تعلیمات اور اصولوں سے مستنبط ہوگا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خاص زمانے اور خاص مقام کے حالات سے بھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے ان دونوں ہی چیزوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس کام کے سلسلے میں ہندوستان میں جو چیز بہت بڑی رکاوٹ کی حیثیت سے سامنے آتی ہے وہ یہاں کی فرقہ وارانہ کش مکش ہے۔ اس فرقہ وارانہ کش مکش کا نقصان اسلام کو بھی پہنچا اور اس کی آفاقیت اور سلامتی کی تصویر نظروں سے اوجھل رہی اور اس کے برعکس اس کی جو شکل ذہنوں میں آئی وہ ایک متحارب، جارح اور دوسروں کا استحصال کرنے والی طاقت کی حیثیت سے آئی اور گویا وہ مسلم قوم پرستی کے لیے ایک محرک فراہم کرنے والا ہو، مسلم قوم کو بلند کرکے دیگر اقوام کو ذلیل کرنا اس کا مقصد بن گیا ہو۔ اس پوری صورت حال نے اسلام کو بھی فرقہ وارانہ رنگ دے دیا۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو اس فرقہ وارانہ رنگ سے الگ کرکے اس کی بالکل خالص اور صحیح شکل میں اس کو پیش کیا جائے۔ اس کو اس حیثیت سے سامنے لایا جائے کہ وہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ سارے

انسانیت کا بہی خواہ ہے۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کی حمایت اور ان کا دفاع نہیں بلکہ وہ سارے انسانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کی عملی شکل ایک یہ ہو سکتی ہے کہ مسلم مطالبات و حقوق سے الگ ہو کر ایک ایسی جماعت کا قیام عمل میں آئے جو دعوت الی الخیر کے لیے مخصوص ہو جس کا کام ہی یہ ہو کہ وہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں۔ بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

دعوتی کام کے لیے اس کے علاوہ اور بھی دوسرے لوازمات درکار ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ کہ کچھ باصلاحیت افراد فراہم کیے جائیں، خواہ وہ قلیل تعداد میں کیوں نہ ہوں لیکن وہ اس بات کے لیے آمادہ ہوں کہ اس کام میں اپنے آپ کو کھپا کر اس فریضے کو انجام دیں گے۔ باصلاحیت اس معنے میں کہ وہ اس کام کے نشیب و فراز سے واقف ہوں اور اس بات کی ہمت بھی رکھتے ہوں کہ وہ اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کو انگیز کر لیں گے۔

دعوت اسلامی کے سلسلے میں دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ اسلام کو خالص انداز میں بنیادی عقائد کے پیش کیا جائے جیسا کہ ہمیں قرآن و حدیث کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے اسلام کے بنیادی عقائد تین ہیں۔ توحید رسالت اور آخرت اور باقی عقائد و تعلیمات ان ہی کا لازمی نتیجہ۔ ان ہی تینوں چیزوں پر زور دیا جائے۔ ان ہی پر خصوصیت سے روشنی ڈالی جائے اور ان ہی کی روشنی میں زندگی سے متعلق اسلام کے مطالبات کو لوگوں کے سامنے رکھا جائے تاکہ جزئیات میں الجھے بغیر اسلام کی حقیقت سے لوگ واقف ہو سکیں۔

اسلام کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مثبت پیغام کے ساتھ ساتھ کچھ منفی پہلو بھی رکھتا ہے۔ جن کو ہدف بنا کر وہ ان کی کاٹ کرتا ہے۔ ان کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے وہ دنیا سے ان کو ختم کرنا چاہتا ہے اور پُر زور الفاظ میں ان پر تنقید کرتا ہے۔ لہٰذا صرف توحید رسالت اور آخرت کو مثبت انداز میں پیش کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے منفی پہلوؤں اور منفی مضمرات کو بھی نشانہ بنانا ہوگا۔ وہ منفی پہلو جن پر تنقید کرنا ہوگی نفس پرستی بھی ہو سکتی ہے۔ آباء و اجداد کی تقلید بھی، شرک و بت پرستی بھی ہو سکتی ہے اور قوم پرستی بھی۔ قرآن نے واضح الفاظ میں بتوں کے متعلق کہہ دیا ہے۔

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا
أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا

سُلْطٰنٍ ؕ (النجم ۲۳)

دراصل یہ کچھ نہیں ہیں، مگر بس چند نام جو تم
نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ
نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔

اور ان ہی کے ساتھ ساتھ مادیت پرستی، ذات پات
جھگڑوں اور دیگر سماجی برائیوں کو بھی ہدف بنانا ہوگا
ں اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر مدنظر رہنی چاہیے
ہماری تنقید کا نشانہ وہ بنیادی عقائد ہوں گے
کے خلاف عقل گواہی دیتی ہے اور اسلام ان کو
ں اور غلط قرار دیتا ہے اور اسی طرح ہمارا نشانہ
ست وہ سماجی برائیاں بنیں گی جو واقعی انسانیت کے
ایک مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ انسان ان سے نفرت کرتا
آیا ہے اور اسلام بھی انہیں غلط قرار دیتا ہے۔
الفاظ دیگر ہماری تنقید فرقہ وارانہ یا طبقہ وارانہ ہرگز
ں ہونا چاہیے۔ ہماری ملامت کا نشانہ نہ کوئی خاص
ہوگا اور نہ کوئی خاص گروہ، نہ کوئی خاص زبان اور
ئی خاص کلچر اور نہ ہی کوئی خاص مذہب اور نہ کسی
ں مذہب کے پیشوا۔ اور اسی طرح سے ہماری مثبت
ت بھی مسلم قوم پرستی، اردو، خاص مسلم تہذیب
صحیح معنے میں اسلامی تہذیب کی ترجمان نہیں ہے
بہت زیادہ ترکی، ایرانی اور خود ہندوستانی تہذیب
بھی متاثر ہے) کی طرف تعلق نہیں ہوگی۔ اسلام
نقطہ پر جس دین کی طرف بلاتا ہے اس کی بنیاد رنگ
نسل اور وطن پر نہیں ہے بلکہ عالمی اور آفاقی اصولوں پر
ہے اور اس طرح سے اس کی تنقید کی بنیاد بھی کوئی خاص
تمدن، کوئی خاص ملک اور کوئی خاص طبقہ نہیں ہوتا بلکہ
وہ ان بنیادوں اور ان برائیوں کو ہدف بناتا ہے جو سماج
میں فساد کا باعث بنتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہماری
مثبت دعوت اور تنقید جارحیت اور حملہ آوری کا دوسرا
نام بھی نہیں ہوں گی بلکہ وہ دونوں سنجیدگی کی حامل اور
غور و فکر کی دعوت کے ساتھ ہوں گی کہ اسلام کا تقاضا
یہی ہے۔

چونکہ یہ کام ہم کو ہندوستان میں انجام دینا ہے ہم
یہاں کی زبان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اسی زبان
میں بات کرنا ہوگی جو یہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندی
کو اس میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ لہذا ہمیں ہندی
زبان کا بھی سہارا لینا پڑے گا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ
کا ارشاد ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم ۴)

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول
بھیجا ہے۔ اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام
دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے

نہ صرف ہندی زبان بلکہ یہاں کی دوسری علاقائی
زبانوں کو بھی اپنانا ہوگا۔ کیونکہ یہاں اسلام کے داعیوں اور
مخاطبوں کے درمیان ایک اجنبیت کی دیوار حائل ہے اور

اور اس دیار کے دُعا نے یا اسے کمزور کرتے میں یہ چیز بہت حد تک مددگار ثابت ہوسکتی ہے اور اس بات میں کوئی حکمت نظر نہیں آتی کہ ہم ہندوستان ہی کی زبانوں سے ناواقف رہیں۔

اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آخرت کو اہم قرار دے کر دنیا کے مسائل کو نظر انداز بھی نہیں کرتا بلکہ دنیا کی پریشانیوں اور مسائل کے حل بھی پیش کرتا ہے لہذا اسلام کے اس پہلو کو نمایاں کرنا بھی صحیح ہے۔ حضرت نوح ؑ اپنی قوم کو یوں بھی مخاطب کرتے ہیں۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا
يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝
وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ
لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝

(نوح ۱۰ تا ۱۲)

اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا۔ تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کردے گا۔

اور وہ انسانوں کے اپنے کرتوت کو دنیا کے فساد کا سبب قرار دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (الروم ۴۱)

خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔

اس حقیقت کے پیش نظر ہم بھی دنیا کے مسائل سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان میں غریبی پس ماند اور اخلاقی جرائم وغیرہ مسائل ہیں۔ لہذا ان کے حل کو تعلیمات اسلامی سے وابستہ کرکے پیش کرنا پڑے گا۔ ہم کو اس بات کی بھی وضاحت کرنا ہوگی کہ یہ مشکلا اسی وقت ختم ہوسکتی ہیں جب کہ اسلامی تعلیمات پر مبنی معاشرہ تعمیر کیا جائے لیکن ان سب کے باوجود ہمار دعوت کو جس نکتے پر مرکوز ہونا چاہیے وہ اخروی ہے یعنی مخاطبین کو یہ تصور دینا کہ یہ دنیا ہی سب نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک زندگی اور آنے وال جو ہمیشہ کی زندگی ہے اور وہاں فنا نہیں ہے بلکہ بقا دوام ہے۔ اصل کامیابی وہاں کی کامیابی ہے او کی ناکامی اصل ناکامی ہے۔ لہذا ہمیں اپنی مساعی کو آخرت پر مرکوز کرنا ہے۔ ہماری جدوجہد کا محرک آ میں نجات اور اس میں کامیابی ہے اور اس کا وا ذریعہ اسلام ہے بالکل واضح اور صاف ستھرے فطری انداز میں اس عقیدے کو پیش کرنا ہوگا تاکہ میں موشگافیاں کرنے کے بجائے انسان اس سے حاصل کرے اور یہ عقیدہ انسان کو جھنجھوڑ کر ا پر لگا دے۔

ایک اہم چیز جو اس سلسلے میں لازمی طور پر

وہ یہ ہے کہ خود داعیوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلامی تعلیمات کا نمونہ ہو۔ اگرچہ دعوت اور داعی کی شخصیت دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن مخاطبین عام طور پر ان دونوں میں امتیاز نہیں کرپاتے اور دعوت کے تعارف کے ساتھ نگاہیں داعی کی شخصیت پر پڑتی ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ دعوت اور داعی کی شخصیت میں مطابقت ہو۔ یعنی وہ اگر اللہ کی طرف بلا رہا ہے تو وہ خود بھی اللہ کی طرف بڑھنے والا ہو۔ خود اس کی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گذر رہی ہو اور اس کی ناپسندیدگی سے وہ بچنے والا ہو۔ اپنے اس کام میں وہ اللہ تعالےٰ سے خصوصی طور پر مدد کی درخواست کرتا ہو۔ اس سے توبہ و استغفار اور دعا کرنے کا عادی ہو۔ ساتھ ہی اس کے اور بندوں کے تعلقات خوشگوار ہوں اور وہ ان کے حقوق ادا کرتا ہو

ایک اور چیز اس کام کی شدید ترین ضرورتوں میں سے ہے اور وہ اجتماعیت اور تنظیم ہے۔ عملی زندگی میں ہم جانتے ہیں کوئی چھوٹے سے چھوٹا تعلیمی یا تجارتی ادارہ بھی ایک فرد واحد خواہ وہ کتنا ہی باصلاحیت اور باہمت انسان ہو نہیں چلا سکتا۔ بلکہ اس کے لیے افراد درکار ہیں اور نہ صرف یہ کہ افراد درکار ہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ افراد ایک طرف تو مقصد کا شعور رکھتے ہوں اور دوسری طرف اس مقصد کے لیے عملی جدوجہد میں اپنے آپ کو لگانے کا عزم بھی رکھتے ہوں وہ سب الگ الگ اپنے طور پر کام کرنے کے بجائے ایک ٹیم کی شکل میں جمع ہوں۔ باہم مشاورت کے ذریعے کام کی نوعیت اور مقامی اور وقتی ضروریات کا جائزہ لیکر ایک منصوبہ اور اسکیم تیار کریں۔ اور اسکیم کو سامنے رکھ کر افراد کے مابین مناسب طریقے سے حسب صلاحیت تقسیم کار ہو اور پھر ہر فرد اپنی اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں لگ جائے اور وہ لوگ جو اس مقصد کے پختہ اور عمیق شعور کے حامل ہوں نیز وہ اس راہ کی قربانیوں پر لبیک کہنے کے واسطے تیار ہوں۔ اس پورے کام کی مرکزی ذمہ داریوں کے فرائض انجام دیں تاکہ یہ کام بحسن و خوبی چل سکے اور اسی کا نام ہے اجتماعیت اور تنظیم۔ یہ چیز اس کام کی شدید ترین ضرورتوں میں سے ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے بغیر دعوت الی اللہ اور تبلیغ اسلام کا کام نہیں کیا جا سکتا دعوت و تبلیغ اس کے بغیر بھی ممکن ہے اور اس کے مثبت اثرات بھی سامنے آتے ہیں لیکن ان اثرات کی نوعیت زیادہ سے زیادہ مقامی اور علاقائی ہوتی ہے۔ ایک وسیع اور ملک گیر پیمانے پر ان اثرات کی امید رکھنا پتہ نہیں منطقی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط لیکن شاید تاریخ اس طرح کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور جس کام کے متعلق ہم اظہار خیال کر رہے ہیں اس کا تعلق اسی دوسری شکل سے ہے۔ یعنی ہماری کوششوں کا مقصود علاقائی یا مقامی تبدیلی ہی نہیں ہے بلکہ ملکی اور عالمی تبدیلی بھی ہے۔ اب ظاہر ہے ایسی صورت میں اجتماعیت اور تنظیم کے بغیر کسی ملک گیر انقلاب یا وسیع پیمانے پر تبدیلی کی امید رکھنا فضول اور عبث ہوگا۔

الغرض یہ ہیں وہ ضروری حوائج جو دعوت کو [illegible]

میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ لہذا اگر ان خصوصیات کے ساتھ دعوت اسلامی کا کام کیا گیا اور اس کے لیے جدوجہد کی گئی تو امید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی مخفی اور مضمراتی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں گی اور اسلام یہاں کے عوام کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں داخل ہو کر ان کی حکمرانی کر سکے گا۔ لیکن اس کے بغیر اس کی وہ صلاحیتیں تو بہر حال برقرار رہیں گی ان کے عملی شکل اختیار کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اس تجزیے کے بعد ہم اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "کیا اسلام اس ملک کی قیادت کر سکتا ہے" کے مثبت جواب کا انحصار ایک دوسرے سوال پر ہے اور وہ یہ کہ

"کیا باصلاحیت افراد کا ایک طبقہ شعور کے
ساتھ اجتماعی اور منظم طور پر اس کے واسطے
صحیح طرح سے جدوجہد کرے گا؟"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ○

قرآن کے اثرات انسانی تاریخ پر

(جناب اے، کے، بروہی (ایڈووکیٹ)

جناب اے کے بروہی کی ایک تقریر کے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں (ادارہ)

جدید دنیا پر قرآنی پیغام کی لابدی ضرورت کو ظاہر کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک ایک کر کے موجودہ زمانے کے عمدگی کے معیاروں کو لیا جائے یعنی ان اقدار اور مقاصد کو جن کو دور حاضر کی انسانیت کا تعلیم یافتہ طبقہ قبول اور نمایاں کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال کیا جائے کہ ان اقدار و مقاصد کی پیدائش کہاں ہوئی یہ کہاں سے آئے اور خاص طور پر یہ سوال پوچھا جائے کہ کیا یہ تمام اقدار و مقاصد قبل اسلام کی کسی مذہبی تعلیمات میں بھی پائے جاتے ہیں یا ان کو قابل تعریف بتایا گیا ہے۔ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دور حاضر کے مقاصد اور اقدار کسی مذہب کی نظر میں اس قابل ہیں کہ انہیں قبول اور اختیار کیا جائے اور وہ پہلی مرتبہ اسلام نے الہامی طریقے پر پیش کیے۔ تب تو یہ واقعہ کہ چودہ سو برس کے بعد بھی وہ پیغام اصولاً اب تک رائج ہے اس بات کا کافی ثبوت ہوگا۔ قرآن دنیا کے سامنے جو دعوے کرتا ہے وہ آج بھی قابل قبول ہے۔

اگر منفی طور پر یہ کہا جائے کہ قرآنی پیغام آج از کار رفتہ ہو چکا ہے یا یہ کہ چند نئے اقدار و مقاصد دور حاضر میں رائج ہو گئے ہیں جن پر قرآن نے زور نہیں دیا تب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن ایک وقتی کتاب ہے اور اس کا پیغام از کار رفتہ ہو چکا ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ انسانیت کا تعلیم یافتہ طبقہ کن اقدار کو اس بیسویں صدی کے وسط میں قابل قبول سمجھتا ہے تو میں ان کو حسب ذیل سلسلے میں پیش کروں گا۔

۱۔ انسانی برادری کی بنیادی مساوات
۲۔ آزاد تحقیقات کا جذبہ اور سائنسی معلومات کی اہمیت
۳۔ مذہبی رواداری پر عملدرآمد
۴۔ عورت کی آزادی اور مرد سے اس کی روحانی مساوات

۵۔ ہر قسم کی غلامی سے آزادی

۶۔ جسمانی محنت کا وقار

۷۔ نوعِ انسانی کے واحد ہونے کا جذبہ جو رنگ نسل وغیرہ کے امتیازات سے مبرا ہو اور اخلاقی اور روحانی اصولوں کی بنیاد پر نوعِ انسانی کا اتحاد ایسے غرور و تکبر کا ازالہ جس کی بنیاد رنگ، دولت وغیرہ کی برتری پر ہو

۸۔ نفس کشی کے فلسفے کا ترک

دورِ حاضر کے انسان کے اس ایجنڈے کی ہر مد ایک اولو العزم اور شریفانہ کوشش ہے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان تمام مدوں کی قرآن کے مختلف احکام سے کامل اور مکمل طور پر حمایت ہوتی ہے اور پیغمبر اسلام نے جس طرح اپنی زندگی بسر کی اس سے ایک مثال قائم ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلام کو غیر معمولی حیثیت اس لحاظ سے حاصل ہے کہ آپؐ انسان ہیں اور پیغمبر بھی۔ قرآن پاک بار بار آپ سے یہ کہلواتا ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح آپ بھی ایک انسان ہیں الّا اس کے کہ جبرئیل امین آپ کو وحی پہنچاتے ہیں۔ آپ ہی ایک واحد پیغمبر ہیں جو معجزہ نہ دکھانا ہی اپنے لیے طغرائے امتیاز قرار دیتے ہیں۔ آپ الوہی نسل سے ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ آپ صرف ایک معمولی انسان بننے سے مطمئن ہیں۔ آپ نے نہایت دیانتدارانہ زندگی بسر کی اور ساری زندگی سرگرم عمل رہے اور انسانی وقار کے ساتھ زندگی بسر کی۔ آپ ایک قابل اور فدا ہونے والے باپ ہیں۔ ایک محبت کرنے والے شوہر ہیں۔ آپ ایک قابل اعتماد دوست ہیں اور ایک عقلمند حکمران ہیں۔ آپ نے ہر لحاظ سے زندگی کے تقدس کو برقرار رکھا۔ آپ نے ساری زمین کو عبادت گاہ بنایا۔ آپ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ عرب کسی غیر عرب پر کوئی برتری رکھتا ہے یا کوئی غیر عرب کسی عرب پر فائق ہے۔ آپ انسانی روح کی بلندی، برتری اور رفعت کے لیے صرف ایک فیصلہ کن معیار مقرر کرتے ہیں جو اپنے آپ کو قابو میں رکھنے اور راست بازی سے عمل کرنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ جب پورے عرب کے حکمران بن گئے تب بھی اپنی سادہ زندگی اور اپنے طریقوں کو ترک نہیں کرتے اور اپنی ذات پر اور اپنے پیروؤں پر یہ لازم گردانتے ہیں کہ وہ ضرورتمندوں کو ضرورت کی چیزیں دیا کریں۔

آپؐ فرماتے ہیں کہ اس طرح دو کہ تمہارے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو کہ تمہارے دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔ آپ اپنے پیروؤں کو ترکِ دنیا کی ممانعت کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ہر جگہ ہے اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ تعلیمی عمل کو قرآن جو اہمیت دیتا ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ اس کتاب کا آغاز ہی پڑھنے کے حکم سے ہوا۔ "پڑھ اس رب کے نام سے جس نے سب کو پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے" (سورہ اقرء آیت ۱، ۲)

"اور تیرا رب سب سے بڑھ کر کرم کرنے والا ہے، جس نے سکھایا قلم سے" سورہ ۹۶ آیت ۳، ۴

سیاہی اور قلم اور جو کچھ ان سے لکھا جاتا ہے قرآن

میں ان کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ (سورہ ۸۰ آیت ۲)

قرآن پاک تفکر، تعمق، تعقل اور تفحص کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ ایک طرح سے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ ساری کتاب میں اس طریق کار اور تکنیک کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔ جن کے ذریعے انسان کتاب فطرت کو پڑھ سکتا ہے اور اپنے اندر الوہی علامتوں کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ تمام کائنات ایک ہے اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو غور سے دیکھے اور اس سے سبق حاصل کرے۔ قرآن پاک بار بار ہم کو یہ حکم دیتا ہے کہ ہم فطرت کے مختلف حادثات کو بہ نظر غور دیکھیں اور ہمیں للکارتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر نظر ڈالیں اور تلاش کریں کہ اس میں کوئی سُقم بھی موجود ہے۔ وہ اس پر قناعت نہیں کرتا کہ ہم کائنات پر ایک ہی نظر ڈالیں بلکہ یہ دعوت دیتا ہے کہ ہم اس پر دوسری نظر بھی ڈالیں قرآن کے مطابق بلاشبہ ہماری نگاہ تھک کر لوٹ آئے گی اور ہم اس مالک کی تخلیق میں کوئی سقم نہیں پا سکتے۔"

(سورہ ۶۷، آیت ۳،۴)

اس کے بعد ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم فطرت کی ہم آہنگی میں تبدیلیوں کو بغور دیکھیں جن میں ہمارے رب کی نشانیاں ہیں۔ مثلاً رات اور دن۔ ایسے ہیں جیسے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہوں۔ ہمیں یہ بھی حکم دے دیا گیا کہ اس کا بھی مطالعہ کریں کہ بارش سے مردہ زمین کس طرح زندہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں موسموں کی تبدیلی اور چاند سورج کی گردش پر بھی غور کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ قرآن پاک کی تیرھویں سورت کی تیسری اور چوتھی آیت میں یہ بھی ارشاد ہے کہ سوچنے والے لوگوں کے لیے فطرت کے اندر بہت سی نشانیاں موجود ہیں ـــــ قرآن پاک کا اپنے معجزانہ الفاظ میں ارشاد ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے زمین پھیلائی اور اس پر مضبوط پہاڑ جمائے اور ندیاں جاری کیں اور تمام پھلوں کو اس نے دو دو کا جوڑ پیدا کیا۔ اس نے رات کو اس قابل بنایا کہ دن پر چھا جائے۔ یقیناً اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں جن میں انگور کی بیلیں ہیں، غلہ ہے کھجور کے درخت ہیں بعض ایک جڑ سے اور بعض علیحدہ علیحدہ جڑوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہم چند درختوں کو دوسروں سے زیادہ میوہ پیدا کرنے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ بے شک سمجھنے والوں کے لیے ان میں نشانیاں موجود ہیں۔

اس مسلسل دعوت کا نتیجہ فطرت کا مشاہدہ اور اس کے اسرار کو سمجھنا تھا جس نے اسلام کے ابتدائی زمانے کے عربوں کو سائنس اور سائنسی طریقوں کا پیش رو بنایا۔ آج کل انسانی ثقافت کے مورخ ہر چیز کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے عربی سائنس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہمارے لیے ہر چیز یونانیوں نے دریافت کی تھی۔

یورپین ثقافت اور تہذیب کے اخلاقی اور ذہنی کا سرچشمہ اس کے علاوہ کہیں اور تھا جس کو محقق ملے

طور پر قرار دیتے ہیں۔ یورپ کی تہذیب خود پروٹسٹنٹ
تحریک کے بعد کی پیداوار ہے۔ آج یورپ کے اسکول کے
ہر پڑھنے والے لڑکے کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اصلاح
مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا نتیجہ
تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ
کی ترکی فتح کے بعد تحریک احیاء العلوم کے باعث رونما
ہوئی۔ بہرحال یورپ کے تاریک دور کا یکایک خاتمہ
ہو گیا اور نشاۃ ثانیہ کی روشنی پھیل گئی۔ یہ تمام باتیں
مہذب یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں آزاد تعلیم
کے نام سے پڑھائی جاتی ہیں اور خود اس نشاۃ ثانیہ کی
اصلیت کے مطابق ہر قسم کی غلط توضیحیں موجود ہیں
اور نئی نئی تراشی جاتی ہیں لیکن ڈاکٹر رابرٹ کی تاریخی
تجزیے کی ایک دیانت دارانہ کوشش ظاہر کرتی ہے کہ:۔

پندرہویں صدی میں عربی اور مسلم اثرات کی وجہ سے
حقیقی نشاۃ ثانیہ رونما ہوئی۔ اٹلی نہیں، بلکہ اسپین
یورپ کی نئی زندگی کا گہوارہ تھا۔ آہستہ آہستہ بربریت کے
غار میں گرتے گرتے یورپ کی قومیں جہالت اور ذلت کی
تاریک ترین گہرائی میں جا پڑی تھیں۔ اس زمانے میں
اسلامی دنیا کے شہر بغداد، قاہرہ، قرطبہ طلیطلہ تہذیب
اور ذہنی سرگرمیوں کے ترقی پذیر مرکز تھے۔ یہی شہر
تھے جہاں نئی زندگی پیدا ہوئی جو بعد میں نشوونما پاکر
انسانی ارتقاء کا ایک نیا پہلو بن گئی۔ جس وقت سے
ان شہروں کی ثقافت کے اثرات محسوس ہونے لگے تب سے

ایک نئی زندگی کی حرکت شروع ہوئی
اغلب یہ ہے کہ عربوں کے بغیر یورپ کی جدید تہذ
کبھی ترقی ہی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات تو قطعی یقینی۔
کہ یہ کبھی اس وضع کی نہ ہوتی کہ ارتقا کے سابقہ تما
پہلوؤں پر سبقت لے جا سکتی۔ اگرچہ یورپ کی ترقی
ایک بھی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں اسلام کا فیصلہ کن
اثر نہ پایا جاتا ہو اور یہ اثر اتنا واضح اور نمایاں اور
نہیں جتنا کہ جدید دنیا کی سب سے نمایاں طاقت ا
اس کی فتوحات کے سب سے بڑے چشمے یعنی نیچرل سائنس
اور سائنسی اسپرٹ میں موجود ہے۔

THE MAKINGT OF HUMANITY, PP
188 - 90

جدید یورپ کے صرف ذہنی ارتقاء ہی میں اسلا
اثر مانا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی مصنف کہتا ہے کہ اس
کی ذہنی ثقافت کے اثرات کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی ا
بھی رونما ہوتا رہا ہے جو مذکورہ بالا اثرات سے کسی ط
سے کم نہیں۔ عیسائی یورپ کی وحشیانہ عدم رواداری کے مقابلے
میں اس رواداری کے مقابلے میں زیادہ باعث اشتع
تھی، جو مذہب کا امتیاز نہ کر کے عیسائی اور یہودی د
کو یکساں طور پر اعزاز اور عہدے عطا کرتی تھی جن سے
لوگوں کا اسلامی تہذیب سے واسطہ پڑا ان میں د
اثرات سرایت کیے بغیر نہ رہے اور بربریت پسند یور
اس سے متاثر ہونے کا اعتراف کیے بغیر نہ رہا۔ اس

پین کے بہادروں اور المنصور کے سے خوفناک۔ نیلیر،
ریف سپاہیوں کے (جس کا یہ بیان تھا)[1] اگرچہ اس نے
ست سے دشمنوں کو جنگ میں قتل کیا لیکن کسی کی ہتک
ہیں کی) بلند وسیع الخیالی اور بہادری کے معیاری نمونے
سے اسی بربریت پسند یورپ کو بڑا سخت ڈنک لگا۔
ور اس نے مسلمانوں کی برابری یا ان سے برتری حاصل
کرنے کا عزم کر لیا۔ بہادری کے نصب العین اور وقار
کو اگر بیسویں صدی کا انگلستان پیش نظر رکھتا تو فائدے
میں رہتا۔ فرنگی سپاہیوں کو صلاح الدین کی بہادری اس
کی فیاضی اور شاندار کردار نے شرمندہ کر دیا تھا اور
بہادری کی ایک بڑی صفت منصبی بلند اخلاقی کی روایت
قائم ہو گئی تھی۔ شاعری اور افسانوں پر عربی خیالات کا
گہرا رنگ چڑھ گیا۔ اس زمانے میں یعنی غیر مذہبی ادب تھا
اس کی خوب اشاعت ہوتی تھی۔ اور عوامی تخیل متاثر ہوتا تھا۔
اگرچہ اس بات سے ذہنوں کو بہت بڑا دھکا لگے گا اور
ہمارے روایتی خیالات کے لیے ایک معمہ ثابت ہوگا۔ اگر یہ
خالص سچائی بیان کی جائے کہ یورپ کے حقیقی عملی اور نظریاتی
اخلاق کو اسلام نے اتنا زیادہ فائدہ پہنچایا جتنا کہ اخلاقیات
کے بلند تر عقیدے کو پہنچایا تھا۔

[1] THE MAKING OF HUMANITY PP. 307 - 09.

اسی طرح قبل اسلام کے دور میں عورتوں کی حیثیت اتنی
شرمناک تھی کہ جدید انسان کو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اسلام
نے اس میں کتنی تبدیلی کر دی۔ اسلام نے عورت کی عزت و
تکریم کرنے کی ضرورت پر انسانیت کو نئے احکام کا پابند
بنایا۔ عربوں میں یہ رواج ہو چلا تھا کہ اپنے گھروں میں
لڑکی کی پرورش کو گوارا نہیں کرتے تھے وہ لڑکیوں کو
اپنے بلند مرتبے کے لیے باعث ذلت سمجھتے تھے وہ انہیں
زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام نے اس کی سخت ممانعت
کر دی۔ میراث کے متعلق جو قانون رائج کیا گیا اس کی
رو سے لڑکی کو اپنے بھائی کا حصہ دار بنایا گیا۔ یہ بات
اس وقت کتنی عجیب نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب
یافتہ انگلستان میں بھی ۱۹۲۲ء تک بھی کوئی شادی شدہ
عورت کسی جائداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی۔ اسلام نے
عورت کو نہ صرف جائداد میں ورثہ پانے کا حق عطا کیا بلکہ
وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں جائداد کی مالکہ بھی بن سکتی ہے
یہ حق یہاں تک وسعت رکھتا ہے کہ اگر اس کا شوہر اس
کی جائداد کو خرد برد کرنے کا مرتکب ہو تو عورت محض اس
بنا پر شوہر سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ بیوہ کو اپنے شوہر
کی جائیداد میں حصہ پانے کا حق حاصل ہے۔ شوہر کو
اپنی بیویوں کے حقوق تسلیم کرنے پڑتے ہیں اس کے متعلق
سورت ۲ آیت ۲۲۸ تا ۲۴۲ اور سورۃ ۴ آیت ۳۴
آیت ۵۶۸، ۵۷۰، ۵۷۲ میں واضح احکام موجود ہیں
۱۳ سو برس پہلے عورت کو طلاق حاصل کرنے کا حق دیا گیا تھا
جب کہ عیسائی دنیا کے مذہبی قانون کے تحت عورت کا طلاق
حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جدید غیر رسمی قوانین نے عیسائی عورتوں

میں طلاق کے حق کو تسلیم کر لیا ہے۔ جو گویا اس مسئلے میں قرآن کی حکمت کو بالواسطہ تسلیم کر لینا ہے۔

ایک زمانہ تھا جبکہ عورتوں کے متعلق یورپ میں یہ کہا جاتا عام تھا کہ مرد خدا کے لیے اور عورت اس خدا کے لیے جو اس کے شوہر کے اندر موجود ہے۔ لیکن اسلام نے عورت کی آزاد شخصیت کو مان لیا اور وہ براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ قرار دی گئی ہے۔ قرآن نے عورت کا اتنا احترام کیا ہے کہ اس کی ایک سورۃ ہی کا نام النساء (عورت) ہے اور عورت کی حیثیت اور وقار کے متعلق بہت سے حوالے موجود ہیں۔ یہ بات عورت کی قبل اسلام حیثیت کے بالکل متغائر اور برعکس ہے۔ اگر اس موضوع کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآنی تعلیمات میں عورت کی جو حیثیت مقرر کی گئی ہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں عورت کی موجودہ حیثیت سے بلند تر ہے۔ تاریخ میں عورتوں کی آزادی کے سلسلے میں جو کامیابیاں حاصل کی گئیں۔ ان کے متعلق میں یہی عرض کروں گا۔ وہ قرآن کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح اسلام نے دور غلامی کو ختم کرنے پر کمر باندھی تھی غلاموں کو آزاد کرنا اسلام نے انتہائی اعزاز قرار دیا ہے (سورہ ۹۰، آیت ۱۳) انسان کی آزادی کے متعلق قرآن میں اتنی وسعت کے ساتھ بحث کی ہے کہ قرآن کو انسانی آزادی کا منشور قرار دیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ انسان آزاد ہے اس کا خدا سے اتنا ہی گہرا تعلق ہے کہ اس نے مذہبی پیشواؤں کو بھی درمیان سے نکال پھینکا لیکن انسان جب تک سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی استحصال سے آزاد نہ ہو خدا کی عبادت آزادی کے ساتھ کس طرح کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ شہ رگ سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے۔ پس اس کی مرضی کو ہم پر کوئی دوسرا کس طرح واضح کر سکتا ہے۔

آج کی ساری دنیا مذہبی رواداری کی قائل ہے اور مذہبی اور ذہنی رواداری کے جو بھی نصب العین دنیا کے مہذب ملکوں میں رائج ہیں۔ وہ سب انسان کے اس پیدائشی حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اپنی کمزوریوں اور قوتوں اور ذرائع کے مطابق جس نصب العین کو چاہے اپنے سامنے رکھ سکتا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں قرآن ہی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے جو ایک طرف تو پیروانِ اسلام کو واضح الفاظ سے ترغیب دیتا ہے کہ اپنا مذہب پھیلانے کا حکم دیتی ہے لیکن ساتھ ہی دوسری طرف قرآن اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے :۔

خدا کے علاوہ دوسرے معبودوں کو برا نہ کہو اس اندیشہ سے کہ ان کے ماننے والے اپنی جہالت اور دشمنی سے اللہ کو برا کہنے لگیں۔ ہم نے ہر فرقے کے اعمال اس کی نظروں میں اچھے کر دکھائے ہیں۔ اسی کو وہ پسند کرتے ہیں لیکن آخر کار اللہ کی طرف پلٹنا پڑے گا اور اللہ انہیں بتائے گا کہ ان کے اعمال کیا تھے؟ (سورۃ ۶، آیت ۱۰۸)

اس قسم کی مذہبی رواداری آج تک اسلام نے تعلیم کی

وہ جس پر مسلمانوں نے عمل کیا ایک بلند تر صداقت کا نتیجہ ہے اور وہ صداقت دین ہے یعنی وہ طریقۂ حیات جن کو اللہ تعالیٰ نے الہام کے ذریعے پیغمبروں تک پہنچا دیا تاکہ وہ نوع انسان تک پہنچا دیں۔ یہ حکم اپنے بنیادی پہلوؤں میں ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک قانون اور ایک کھلا راستہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہی ایک نمونے کا بنا دیتا اس نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس کے مطابق تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے پس تم اعمال نیک میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے والے بنو (سورہ ۵، آیت ۵۱)

اسی طرح قرآن پاک اس بڑی صداقت کی طرف اشارہ کرتا ہے :۔ "ہر امت کے لیے ہم نے مقرر کر دیا ایک طریقہ عبادت کا جس پر وہ چلتے ہیں۔ پس نہ جھگڑا کریں تجھ سے اس معاملے میں اور بلا ان کو اپنے رب کی طرف بے شک تو ہی راہ راست پر ہے۔ (سورہ ۲۲ آیت ۶۷)

اسی طرح نسلی برتری کو بھی قرآن نے رد کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے تمام بنی نوع انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا ہے۔ شیطان صرف اس لیے ملعون قرار دیا گیا ہے کہ اس نے اپنی اونچی نسل اور انسان کی پست حقیقت کا مقابلہ کر کے اپنی برتری کا دعوے کیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے اور میں آگ سے بنایا گیا ہوں۔" اس قسم کی برتری کے احساس کا جو کسی قوم میں اپنے اعلیٰ نسل کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے صاف الفاظ میں تردید کر دی ہے اور اس کی پرواہ نہیں کی کہ پیغمبر اسلام کے مخالفین کیا کہیں گے۔ تاریخ مابعد اسلام کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام ہی وہ تنہا مذہب ہے جس نے نسل رنگ اور حسب کی اہمیت کو کامیابی کے ساتھ ملیامیٹ کر دیا اس نے اپنے پیروؤں کو نسل یا جغرافیائی وحدت کی بنا پر نوع انسان کو مختلف گروہوں میں منظم کرنے کی ممانعت کر دی۔ اسلام کے لحاظ سے وہی شخص قابل عزت ہے جو متقی ہے یعنی جو شخص اپنے آپ پر قابو رکھتا ہوا اور اللہ کے قانون پر چلتا ہو۔ انفرادی زندگی کے تمام اعزازات غلط ہیں ان کا کوئی مطلب نہیں۔

آج اس دنیا میں جو ہر قسم کی گروہ بندی میں مبتلا ہے اور "قوم پرستی" کے جھوٹے خدا کی عبادت کرتی ہے نوع انسانی کو یہ بات محسوس ہو رہی ہے کہ انسانی برادری کی بنیاد صرف ایک روحانی اصول پر قائم کی جا سکتی ہے نہ کہ رنگ اور نسل کی بنیاد پر۔ وہ روحانی اصول انسانی برادری کی تنظیم کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ انسانی برادری کی تنظیم صرف اس بنیاد پر کہ انسان 'انسان' ہے اس لیے نہیں کہ اس کے پاس کیا ہے' بلکہ اس لیے کہ وہ کون ہے وہ لوگ جو نسلی برتری کو مانتے تھے اب ہر جگہ پیچھے ہٹائے جا رہے ہیں وہ لوگ جو نسلی برتری کو مانتے تھے معاشی اور صنعتی ترقی کے معیار سے جانچتے تھے اب ہر

ان سے نفرت کی جاتی ہے اور اس سے بد تر بات یہ ہے کہ یہ خود بھی آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔ سالانہ حج جو فریضہ اسلام نے عائد کیا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں روحانی اصول کی یہی ایک عملی مثال ہے۔ ہر سال مکے میں مسلمانوں کا جمع ہو جانا پورے نوع انسانی کے اتحاد کی طرف ایک قدم ہے۔ یہ ایک نمونہ ہے جس کے مطابق بنی نوع انسان کی بین الاقوامی وحدت قائم ہو سکتی ہے۔

وہ روحانی اصول جس پر بنی نوع انسان کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے بموجب انصاف کے نصب العین کو اپنانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کی شدید ضرورت پر متعدد جگہ زور دیا گیا ہے۔

ایک بڑی غلطی کی معذرت

اگست و ستمبر ۷۰ء کے مشترک شمارے میں "قرآن اور مسلمان" کے عنوان سے جناب الطاف گوہر کی دو تقریریں شائع کی گئی تھیں۔ تعارفی نوٹ میں ان کو صدر ایوب مرحوم کا صاحبزادہ لکھ دیا گیا۔ یہ بڑی غلطی گوہر ایوب اور الطاف گوہر کے درمیان التباس کی وجہ سے صادر ہوئی۔ الطاف گوہر صدر ایوب کے لڑکے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس غلطی کو معاف فرمائے۔ آمین۔

(ادارۂ زندگی)

پیش لفظ

(جناب مولانا صدرالدین اصلاحی)

"مجاہد کی اذان" (اس کتاب پر تبصرہ اس شمارے میں شائع ہو رہا ہے) کے لیے یہ پیش لفظ لکھا گیا تھا لیکن اس کے لکھنے میں تاخیر ہوئی اور کتاب میں یہ شائع نہیں ہو سکا۔ مولانا نے پیش لفظ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اپنی جگہ خود ایک مستقل چیز ہے اس لیے اس کی افادیت کے پیش نظر ہم اسے زندگی میں شائع کر رہے ہیں

(ادارہ)

اٹھارھویں صدی سے مسلمانانِ عالم پر جو ہمہ جہتی زوال طاری ہونا شروع ہوا تھا' بیسویں صدی کے اوائل میں وہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ کسی بھی قوم یا ملت کے زوال کا نقطۂ عروج اس کے لیے ایک اہم تاریخی موڑ بھی ہوا کرتا ہے۔ اس وقت یا تو وہ بحیثیت قوم ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جاتی ہے' یا یکایک اس کی خودشناسی بیدار ہو اٹھتی ہے اور اس کی زبوں حالی اس کے احساس خودی کے لیے تازیانہ بن جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ از سر نو عزت و اقبال کی زندگی حاصل کر لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یہ خوش آئند انقلاب ان قوموں کی تاریخ میں آیا کرتا ہے جن کی ایک طرف تو بنیادوں میں ابھی توانائی موجود ہوا کرتی ہے تو دوسری طرف قدرت کا بھی ارادہ اپنی کسی بالاتر حکیم کے پیش نظر ان کے حق میں فضل و احسان نو کا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی نمایاں ترین مثال ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے جس کی تعبیر قرآن حکیم کے اندر " وَنُرِيدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا الخ کے جامع الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے بارے میں بھی اس وقت کچھ ایسا ہی ارادہ الٰہی ظہور میں آ رہا ہے۔ جنگ عالمگیر ثانی کا ثمرعظیم ان کے حق میں جیسے ایک غیر مترقبہ خیر بن گیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے کوئی تین درجن مسلم ملک آزاد قوموں کی صف میں آ کھڑے ہوئے اور اب ایک طرح کے ایک دوسرے غیر متوقع واقعہ — تیل کی بے پناہ دولت کے ظہور — نے ان میں سے کتنی ہی قوموں کے لیے اقتصادی آزادی اور سیاسی عظمت کے دروازے کھول دیے ہیں

دوسری طرف تجدید حیات کا ایک اور بھی انقلاب ان کے اندر پرورش پا رہا ہے جس کی اہمیت اہل نظر کی نگاہوں میں اس سارے اقتصادی اور سیاسی عروج سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ اس انقلاب سے مراد وہ علمی اور دینی تحریکیں ہیں جو اکثر ممالک اسلامیہ کے اندر مختلف انداز میں اور مختلف سطحوں پر احیاء اسلام کے لیے سرگرم ہیں۔ دینی اصلاح کی انفرادی کوششوں سے تو یہ امت بحمد اللہ کبھی بھی غافل نہیں رہی۔ اسی طرح اجتماعی اور سیاسی سطح کی مساعی بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں مگر اسلام کے پورے نظام کو انسانی زندگی پر غالب و نافذ کر دینے کی عام ہمہ گیر منظم اور سنجیدہ کوششوں سے مسلسل جدوجہد کا تجربہ جس طرح ماضی قریب میں ہوا ہے وہ ایک خاص نوعیت رکھتا ہے۔

اقامت و غلبہ اسلام کی ان منظم تحریکوں میں سرزمین مصر سے برپا ہونے والی تحریک — الاخوان المسلمون — اپنے وسیع حلقہ اثر، اپنی تیز رفتار ترقی اور اپنے جذبۂ ایثار و قربانی کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس تحریک کے بانی حسن البنا شہید تھے۔ آپ نے ایک علمی خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں۔ والد ماجد ایک ذی علم بزرگ تھے۔ اس طرح دین کا گہرا علم حسن البنا کو گویا وراثت میں ملا تھا مگر یہ ان کی شخصیت کا اصل جمال نہ تھا۔ ان کا اصل جمال وہ غیر معمولی جوش و اضطراب تھا جو دین کو مسجد اور خانقاہوں کی محدود فضا سے آگے بہت آگے لیجا کر اسے پوری زندگی پر محیط کر دینے کے لیے ان کے سینے میں موجزن رہا کرتا تھا۔ وہ بڑی مؤثر اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ علم و معرفت، اخلاص و انابت، حرکت و عمل، تحریکیت اور تنظیم، تعلیم و تربیت، سعی و جہد، دلسوزی و جاں نوازی، قربانی و جاں فروشی ان سب چیزوں کے مجموعے کا نام حسن البنا تھا۔ ان کی تحریک احیائے دین بڑی تیزی سے اطراف ملک میں پھیلتی گئی اور جلد ہی مصر کے باہر دوسرے عرب ممالک میں بھی اسے اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مصر میں تو اس کے وابستگان کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی تھی لیکن جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، تحریک کا حلقہ جوں جوں وسیع ہوتا گیا اقتدار وقت کی پیشانی پر بل پڑتا گیا اور مظالم کا سلسلہ جاری ہو گیا جس کی ابتدا خود حسن البنا کی شہادت سے ہوئی۔ مصر کی مسلمان حکومت کے ایما پر تحریک اخوان کے اس جلیل القدر بانی اور مرشد عام کو دن دہاڑے خاک و خون میں تڑپا دیا گیا (رحمہ اللہ و رضی عنہ) تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس کے متوسلین کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ بعد میں جب شیخ حسن الہضیبی اخوان کے مرشد عام منتخب ہوئے تو ان حالات میں قدرے اعتدال پیدا ہو گیا اور اخوان کو کچھ عرصے کے لیے اپنا مشن جاری رکھنے کے مواقع پھر میسر آ گئے لیکن جب کرنل جمال عبدالناصر صاحب برسر اقتدار آئے تو تحریک کا افق پھر تاریک بلکہ تاریک ترین ہو گیا۔ وہ غیر قانونی اور اس کے نام لیوا گردن زدنی قرار پا گئے۔ جیلوں میں ایسے مظالم کیے گئے جن کے تصور تک

سے انسانیت اور جمہوریت کی آنکھیں اُبل پڑتی ہیں۔

حسن ہضیبی مرحوم کا خود اپنا بیان ہے کہ جیلوں میں ان برادران کے ساتھیوں پر تعذیب کے لیے خونخوار کتے چھوڑے جاتے تھے اور یہ کہ انہیں برتن صرف ایک دیا گیا جس کو پانی پینے کے لیے بھی انہیں استعمال کرنا ہوتا تھا اور پیشاب کرنے کے لیے بھی پھر عبدالقادر عودہ شہیدؒ اور سید قطب شہیدؒ جیسے دینی و ملی اساطین کو جس طرح تختۂ دار کی نذر کر دیا گیا اور اس سلسلے میں انصاف کے بنیادی تقاضوں تک کو جس طرح پامال کیا گیا اس سے پوری دنیا واقف ہے سید قطب شہیدؒ کی نعش تک ان کے ورثہ کو نہیں دی گئی حتیٰ کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی قبر کہاں بنائی گئی اور بنائی بھی گئی یا نہیں؟ دوسرے عرب ممالک میں اس ظلم و بربریت کا مظاہرہ تو نہیں کیا گیا اگرچہ جہاں تک تحریک کو خلاف قانون قرار دینے کا تعلق ہے کوئی ملک پیچھے نہیں رہا تحریک اخوان کی یہ سرگذشت جب بھی یاد آتی ہے وقت کے مشہور صاحب نظر کا یہ قول ذہن کے پردے پر ابھر آتا ہے کہ احیائے دین کی جس جدوجہد کے جرم میں غیر مسلم حکومتیں قید و بند کی سزا دیں گی مسلم حکومتیں پھانسی سے کم پر راضی نہیں ہوں گی۔

کرنل ناصر صاحب کے بعد انور السادات برسراقتدار آئے تو اخوانیوں کی معتوبیت کی شدت بڑی حد تک کم ہو گئی ہے لیکن ان کی تحریک اور جماعت پر پابندی بدستور عائد ہے اور اب بھی کوئی دو سو کے قریب اخوانی جیلوں میں بند ہیں جن کی رہائی کے لیے ابھی مکہ معظمہ میں ۶ اپریل سے ۱۰ اپریل ۱۹۷۴ء تک منعقد ہونے والی تنظیمات اسلامیہ کی عالمی کانفرنس نے اپیل کی ہے بلکہ مطالبہ کیا ہے خدا کرے کہ اسے قبول کر لیا جائے اور تاریخ اسلامی کا یہ تکلیف دہ باب بند ہو جائے۔

تحریک اخوان کے ساتھ اتنا بھیانک اور نامعقول رویہ کیوں اپنایا گیا؟ اس سوال کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ جاہلیت نے چاہے وہ خالص ہو چاہے مخلوط خالص حق اور ٹھیٹھ اسلام کو کبھی برداشت نہیں کیا ہے اور یہی اس کی فطرت کا عین تقاضا بھی ہے۔ چنانچہ جب بھی اللہ کے دین نے قدم آگے بڑھایا ہے اس نے سختی سے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی راہیں روکی ہیں ایک طرف تو جبر و تشدد کا بازار گرم کیا ہے دوسری طرف تہمتوں، افترا پردازیوں اور جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعے اس کا چہرہ مسخ کرنے کی دیوانہ وار کوششیں کی ہیں تحریک اخوان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا غیروں کی طرف سے کہیں بڑھ کر خود اپنوں کی طرف سے ہوا۔ اس کے خلاف سازشیں کی گئیں جھوٹے الزامات تصنیف کیے گئے اسے بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی اور قوم و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھی گئی کہ اسے کچل کر رکھ دیا جائے۔

یہ کتاب — مجاہد کی اذان — بانیٔ تحریک حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل و مقالات کا ترجمہ ہے جو موقر

نے اپنی دعوت کی وضاحت اور اپنی تحریک کے تعارف کے لیے سپردقلم فرمائے تھے جو لوگ بھی تحریک اخوان کو روس، امریکہ اور یورپ کی متعصب اور اسلام دشمن خبر رساں ایجنسیوں اور ناصرازم کی زبان سے نہیں بلکہ خود اس کی اپنی زبان سے سمجھنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

حسن بنا شہید کے رسائل کا ترجمہ عزیزی مولوی عنایت اللہ سبحانی اصلاحی نے کیا ہے جو ایک فاضل عربی داں ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس ترجمے کے بارے میں صحت کا اطمینان نہ رکھا جائے۔ وہ اس سے پہلے بھی سید قطب شہید کی مشہور عالم کتاب معالم فی الطریق کا ترجمہ کر کے نقوش راہ کے نام سے اردو دانوں کے سامنے پیش کر چکے ہیں جس سے ذوق مطالعہ رکھنے والے ناواقف نہ ہوں گے۔ امید ہے اب ان کی یہ دوسری پیش کش بھی مقبول ہوگی۔ دعا ہے کہ یہ نہ صرف مقبول ہو بلکہ لوگوں کے دلوں میں حسن بنا کے قلب مضطرب کی روح پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بن جائے۔

ہندوستان میں اسلامی انقلاب کی راہ

(مرتبہ: ابواختر اعظمی)

جماعت اسلامی کے ایک متفق نے ناظم جماعت اسلامی میرٹھ ڈویژن سے ملک میں "اسلامی انقلاب کی راہ" پر کئی نشستوں میں گفتگو کی، گفتگو خاصی اہم تھی اس لئے اُسے قلم بند کر لیا گیا ہے اور اشاعت کے لئے پیش کیا جا رہا ہے "م" سے مراد متفق جماعت اور "ن" سے مراد ناظم ڈویژن (ابواختر اعظمی)

م۔ میں نے جماعت اسلامی ہند کے تمام لٹریچر کا بغور مطالعہ کر لیا ہے، مجھے اس جماعت سے قلبی لگاؤ ہے میں اس کے مقصد، نصب العین اور طریقہ کار سے پوری طرح متفق ہوں۔ پھر بھی میرے ذہن میں کچھ الجھنیں باقی رہ گئی ہیں میں چاہتا ہوں کہ وہ سب بھی سلجھ جائیں تاکہ میں عملاً کلی طور سے اس جماعت اور تحریک سے پوری طرح وابستہ ہو سکوں۔

ن۔ مجھے بے انتہا خوشی ہے کہ آپ اپنی ان الجھنوں کو افہام و تفہیم کے ذریعہ حل کرنا چاہتے ہیں۔ پیش فرمائیں ہم دونوں مل کر غور و فکر کریں گے تو انشاء اللہ انھیں حل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ جب دونوں جانب خلوص و للّٰہیت کارفرما ہے تو تائید ایزدی بھی انشاء اللہ شاملِ حال ہوگی۔

م۔ جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے۔ میں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ جماعت بہ کم و کاست پورے دین اسلام کو قائم کرنے اور باطن سے لے کر ظاہر تک انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ملک میں کام کر رہی ہے۔ جماعت اسلامی ہند کو یقین ہے کہ ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے اور ملک کے افراد جس فکری، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی بحران میں مبتلا ہیں اسلام ان کا بہترین اور موزوں حل ہے

اسی اسلام کی اقامت کے لئے جماعت اسلامی ہند جد وجہد کر رہی ہے۔

ن۔ جزاک اللہ! آپ نے جماعت اسلامی کے نصب العین کی صحیح ترجمانی کی ہے، یہ حقیقت تو آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گی کہ جماعت اسلامی کی تمام سرگرمیوں کا واحد محرک آخرت کی فلاح اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

م۔ جی ہاں! آج ہم جس ملک میں فریضۂ اقامت دین کی سعی و جہد کر رہے ہیں صورت حال یہ ہے کہ ہر آٹھ افراد میں سات غیر مسلم ہیں اس طرح پورے ملک کی آبادی کا ⅞ حصہ غیر مسلم برادرانِ وطن پر مشتمل ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ جب تک ہم ان غیر مسلم برادرانِ وطن کو خدا کے پیغام اور اس کے دین سے خاطر خواہ واقف نہ کرا دیں گے اس وقت تک اس ملک میں دینی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

ہمارے پیش نظر ملک کے صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل تمام باشندگان ملک ہیں ہمیں صرف انقلاب کی خاطر باشندگان ملک کے ایک بڑے حصہ ہی کو نہیں بلکہ فلاحِ دارین کی خاطر پورے ملک اور اس کے ایک ایک فرد کو خدا کے دین سے اچھی طرح واقف کرا دینا ہے تاکہ ملک کا ہر ایک فرد اور مجموعی طور پر پورا ملک خدا پرست بن جائے۔

رہا ایک صالح سیاسی انقلاب کا مسئلہ تو ہم پوری طرح مطمئن ہیں کہ دعوت اسلامی کا یہ ایک لازمی نتیجہ ہو گا کہ ملک کی فضا میں ارتعاش پیدا ہو گا، سماج کے اندر حق و باطل کی کشمکش برپا ہو گی، باطل حق کی راہ روکنے اور مسدود کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دے گا اور حق پوری قوت کے ساتھ باطل کو زیر کرنے کی کوشش کرے گا اور یہ اللہ کی سنت پوری ہو کر رہے گی کہ حق غالب اور سربلند اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے گا البتہ ہمیں اس بات کا خصوصی طور پر خیال رکھنا ہو گا کہ دعوت اسلامی ملک کے سامنے اپنی صحیح شکل میں آئے۔ اس کا کوئی پہلو کوئی جزء مصلحت پرستی یا کوتاہ بینی کی نذر نہ ہونے پائے۔

م۔ مگر میرا تاثر ہے کہ اگر ملک کی اکثریت کو پہلے ہی قدم پر محسوس کرا دیا گیا کہ ہم اس ملک میں ایک اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو مجھے سخت اندیشہ ہے کہ یہاں کی اکثریت ہم سے بدظن ہو جائے گی۔ ویسے بھی ہماری اس ملک کی ہزار سالہ تاریخ بیشمار غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی حامل رہی ہے اور چوتھائی صدی قبل تحریک آزادی اور تقسیم ملک کے دوران مسلمانوں کا جو مجموعی رول رہا ہے اس کا خمیازہ آج تک یہاں کے مسلمان بھگت رہے ہیں اور نہ معلوم کب تک بھگتتے رہیں گے۔ ایسی حالت میں جب انھیں یہ محسوس ہو گا کہ ہم اس ملک کے اندر ایک خدا پرست انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو وہ فی الفور ہمارے بارے میں یہ گمان قائم کریں گے کہ اس طرح گویا ہم ان پر اسلام کو مسلط کرنا چاہتے ہیں یا ایک نئے پاکستان کی داغ بیل ڈال رہے ہیں یہ گمان ہمارے اور ان کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کر دے گا جو آج ہمارے درمیان

ہے اس طرح ہماری تصویر ان کے سامنے وہ نہ ہوگی جو
فی الحقیقت ہے اور ہونی چاہیے۔

۳۔ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ بات تو متفق علیہ ہے اور ہونی چاہیے کہ باشندگان ملک کو خدا کے پیغام سے روشناس کرانا ہے۔ خدا پرستی کی دعوت دینا ہے توحید، رسالت اور آخرت کے حقائق ان کے سامنے پیش کرتے ہیں ٹھیک ٹھیک اسی شکل میں جس شکل میں قرآن حکیم اور سنت رسول نے پیش فرمایا ہے اس میں ہماری طرف سے کسی طرح کی کوئی کمی ہوگی اور نہ اضافہ ہوگا۔ براہ کرم آپ اس کی وضاحت فرمادیں کہ آپ کے ذہن میں باشندگان ملک کو خدا کے دین سے واقف کرانے کی کیا صورت ہے۔ ہم کیا طریقے اختیار کریں کہ ایک طرف تو ملک کے باشندے خدا کے پیغام اور اس کے دین سے پوری طرح واقف ہو جائیں اور دوسری طرف انھیں کوئی غلط فہمی یا بدگمانی بھی لاحق نہ ہونے پائے۔

۴۔ میرے سوچنے کا انداز یہ رہا ہے کہ ہم سب سے پہلے اس فاصلے کو کم اور ختم کریں جو ان کے اور ہمارے درمیان اول روز سے پایا جا رہا ہے۔ ہم ان سے اور وہ ہم سے قریب ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ انھیں ۹۰ فیصد غلط فہمیاں اور بدگمانیاں محض اس دوری اور بُعد کی وجہ سے لاحق ہوئی ہیں۔ جب ایک دوسرے سے قرب حاصل ہونے پر از خود [illegible] ہو جائیں گی باقی ۱۰ فیصدی کے لئے [illegible] کوشش کرنی پڑے گی [illegible]

کو کامیاب بنانے میں زبردست معاون ہوگا اور جب کبھی ہم اقامت دین ہی کی راہ ہموار کرتے اور [illegible] کی دعوت دینے کی خاطر ہی کریں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سوچی سمجھی اسکیم کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی مگر جو بھی وقت اس پر صرف ہوگا وہ فریضہ [illegible] کی ادائیگی میں شمار ہوگا۔

مابین کے فاصلے کو کم کرنے اور ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کی صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم ابتدائی دور میں ان امور کو اہمیت دیں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں اور ان کے لئے مخلصانہ طور پر بھرپور کوشش کریں مثلاً پسماندہ لوگوں کو سماجی اعتبار سے اونچا اٹھانے اور بے روزگاروں کو روزگار دلانے کی ملی جلی اجتماعی کوشش، امدادی اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، صفائی، ستھرائی، حفظان صحت کا اور طبی سہولتیں بہم پہنچانے کا اہتمام، اونچ نیچ اور چھوت چھات ختم کرکے بھائی چارہ، انسانی مساوات اور رواداری کو فروغ دینے اور باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کی مل جل کر کوشش یہ اور اسی طرح کے بہت سے امور ہو سکتے ہیں جو ان کے اور ہمارے درمیان مشترک ہوں گے۔ اسی ضمن میں ہم سب کی نظروں میں کھٹکنے والی برائیوں اور سماج میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں اور انھیں دور کرنے کے لئے باہمی تعاون حاصل کر سکتے [illegible]

اس طرح جب ہم مابین کی خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہو [illegible]

تب ہم انھیں خدا پرستی کی دعوت دیں اس وقت آپ محسوس کریں گے کہ ان کے اذہان و قلوب ہماری دعوت کے لئے کس قدر کشادہ ہو گئے ہوں گے، پھر وہ ہماری دعوت پر ہمدردانہ انداز میں غور و فکر بھی کریں گے اور ہمارے پیغام پر لبیک بھی کہیں گے۔

۔ تھوڑی سی اور وضاحت فرما دیں کہ اس پیریڈ میں ہمیں مسلمانوں کے اندر کیا کام کس طرح انجام دینا چاہئیے اور انجام دینا بھی چاہئیے یا نہیں — ؟

۔ مسلمانوں میں ہماری دعوتی اور تحریکی سرگرمیاں علیٰ حالہٖ برقرار رہیں بلکہ تیز تر ہونی چاہئیں ہم انھیں دین اسلام اور اس کے تقاضوں کو وضاحت کے ساتھ بتائیں گے، انھیں ان کے اس حقیقی مقام اور منصب کی یاددہانی کرائیں گے جس پر خدا اور اس کے رسول نے انھیں فائز کیا ہے، ہم انھیں بتائیں گے کہ وہ اس ملک کے اندر ایک قوم نہیں بلکہ ایک اصولی گروہ ہیں — ایک داعی گروہ۔ نہ کہ ایک فریق قوم، ہم کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کے اندر سے عقیدہ و عمل کا تضاد دور ہو، تناقضات سے ان کی زندگیاں پاک ہوں، خدا کا دین ہی ان کے درمیان رشتۂ اتحاد ہو، وہ اجتماعی پر نظام حق کے علمبردار ہوں، ہم انھیں باطل نظام اور نظریات کی ہلاکت آفرینیوں سے آگاہ کریں گے تاکہ ان کے اندر خدا بیزاری اور آخرت فراموشی سے نفرت پیدا ہو اور وہ لادینی نظریات کے استیصال کے لئے کمربستہ ہو کر اٹھ سکیں، ہم ان کے اندر فرائض منصبی کا شعور و احساس بیدار کریں گے، انھیں قرآن حکیم، سنت رسول اور دینی لٹریچر کا مطالعہ کرائیں گے تاکہ انھیں دین اسلام کی صحیح اور مستند معلومات حاصل ہوں۔

ن۔ غیر مسلم برادران وطن میں دعوتی کام انجام دینے کے لئے ابتدائی مدت میں جن مشترک امور کی آپ نے نشاندہی فرمائی ہے تقریباً وہ سب کے سب ہمارے چہار سالہ پروگرام میں شامل ہیں مگر آپ کے اور ہمارے انداز فکر میں ایک بین فرق ہے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں۔

سب سے پہلے تو یہ بنیادی بات آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ جن مشترک خرابیوں اور بے اعتدالیوں کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے اور سب کی نظروں میں کھٹکنے والی جو برائیاں آپ کو نظر آ رہی ہیں یہ سب نتیجہ ہیں خدا بیزار اور آخرت فراموش فکر و عمل کا، بے خدا نظریۂ حیات اور لادینی نظام اطاعت کے یہ سب برگ و بار اور کڑوے کسیلے پھل ہیں جنھیں آج دنیائے انسانیت چکھ رہی ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے "چہار سالہ پالیسی اور پروگرام" کے اندر اسی تلخ حقیقت کو ان الفاظ اور جملوں میں واضح کیا ہے:

"جماعت اسلامی کو یقین ہے کہ ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے اور ملک کے افراد جس فکری، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی بحرانات

مبتلا ہیں اسلام ان کا بہترین اور موزوں حل ہے اسی اسلام کی اقامت کے لئے جماعت اسلامی ہند جد و جہد کر رہی ہے۔

آج جو گمراہ کن نظریۂ حیات ہمارے ملک میں کار فرما ہے اس کی رو سے اس دنیا کی چند روزہ زندگی ہی سب کچھ ہے "اس میں زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرو اور زندگی کو عیش و عشرت کے بام عروج تک پہنچاؤ" زندگی کے مسادی معیار کو بلند کرنے کی اسپرٹ جبکہ وہ خدا کے خوف اور آخرت میں جوابدہی کے احساس سے محروم ہو لازمی طور پر سماج کے اندر ان سب برائیوں اور خامیوں کو جنم دے گی اور پروان چڑھائے گی جن سے آج تمام باشندگان ملک دوچار ہیں ایسی صورت میں ملک سے استحصال، لوٹ کھسوٹ، پسماندگی، غربت، افلاس اور بدکرداری صرف الفاظ اور جملوں کی بازی گری سے دور نہ ہوں گی۔ ملک کے افراد میں اعلیٰ کیرکٹر پیدا کرنے اور ملکی سماج کو صاف ستھرا اور صحت مند دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پورے زور اور قوت کے ساتھ اس نظریۂ حیات کو پیش کریں جو انسان کی فطری آواز ہے اور پوری کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ جس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے یہ خدا پرستانہ نظریۂ حیات ہے جو خدا کی طرف سے سب انسانوں کے لئے ہے۔

آپ انھیں بتایئے کہ خالق کائنات ہی ان کا بھی خالق مالک، آقا، حاکم، رازق اور رب ہے عبادت اور اطاعت صرف اسی کی ہونی چاہیئے آپ نشاندہی کیجیے کہ ... ہدایات اور اطاعت الٰہی کا نظام خالق کائنات نے ... انسانوں کے لئے اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ رہتی دنیا تک کے لئے ارسال فرمایا ہے۔

آپ باشندگانِ ملک پر واضح کیجیے کہ یہی زندگی سب کچھ نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک امتحان گاہ ہے اموت کے بعد کی زندگی اصل اور دائمی زندگی ہوگی۔ ہر ایک کو خدا کی عدالت میں حاضر ہوکر اپنی اس چند روزہ زندگی کی جوابدہی کرنی ہوگی، وہاں کامرانی اور فلاح اسی زندگی کو حاصل ہوگی جو خدا پرستی میں بسر ہوئی ہوگی۔ جو لوگ اطاعتِ الٰہی سے محروم ہوکر اس کی نافرمانی اور بغاوت کی روش پر چلتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں گے وہاں انھیں ناکامی و نامرادی اور خدا کے عذاب و عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آپ توحید، رسالت اور آخرت کے حقائق اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات و نتائج کی وضاحت کریں اور ساتھ ہی ساتھ شرک اور اس کے لوازمات و محرکات اور اس کی فتنہ سامانیوں سے انھیں آگاہ اور متنبہ کریں، لادینی نظام اطاعت اور بے خدا نظریات کی ہلاکت خیزیوں سے اپنے برادرانِ وطن کو واقف کرائیں، انسان پر انسان کی غلامی کی لعنت کو ملت از بام کریں جب تک آپ راست انداز میں خدا پرستی کی دعوت پیش نہ کریں گے

یہی وقت ایک شجرِ خبیث کے بار آور ہونے کیلئے پھلوں کو خوش ذائقہ اور مزاج پرور بنانے کی تمام تر کوششیں بے سود اور لاحاصل ہوں گی، کفر و شرک اور الحاد و دہریت کی جڑیں کامل توحید ہی کے تیشے سے کٹ سکتی ہیں۔

سماج کے اندر چھوت چھات اور اونچ نیچ کی تفریق، گھاس پھوس کے مانند نہیں ہے جسے آپ معمولی توجہ دے کر ختم کر سکتے ہوں اس کی پشت پر ایک عظیم مشرکانہ فلسفہ کارفرما ہے، ایک مخصوص فکر ہے جس کی اساسِ حیات اسی تفریق پر ہے، جو تفریق ستائیس سالوں سے قانوناً جرم کی حیثیت میں ہمارے ملک کے اندر پھل پھول اور پروان چڑھ رہی ہو کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اُسے برادرانِ وطن کے تعاون سے ختم کر دیں گے؟

آپ کی نظروں میں کھٹکنے والی برائیاں کون سی ہیں؟ کیا شراب؟ زنا؟ جوا اور سٹہ؟ سود اور رشوت؟ ذخیرہ اندوزی؟ چور بازاری، جھوٹ اور بے ایمانی؟ اگر یہی برائیاں مراد ہیں جو آپ کے دلوں میں کھٹک رہی ہیں تو آخر یہ ہمارے سماج میں دن بدن پروان کیوں چڑھ رہی ہیں؟ کیا باطل نظام کے مزاج میں یہ پوری طرح رچ بس نہیں گئی ہیں اور کیا حکومت ان کا سرپرست نہیں ہے؟ بے خدا حکومت سے بڑھ کر سود خوار کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں؟ اقتدار وقت سے بڑا چور بازاری اور سٹے باز آپ نے کبھی دیکھا ہے؟ ام الخبائث کی ترویج میں حکومت سے بڑھ کر کوئی شرابی آپ کے علم میں ہے؟ جو ملک کی گلیوں اور محلوں کو شراب خانوں کی لعنت سے آراستہ کون کر رہا ہے؟ بڑے بڑے شہروں میں کس کے ذریعہ الاٹ ہو رہے ہیں؟ زنا اگر صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی لڑکی کو بجبر اغوا کرے اور اس سے اپنا منہ کالا کر لے بلکہ زنا یہ بھی ہے کہ کوئی مرد کسی غیر محرم عورت کو برضا و رغبت اپنے ساتھ رکھے اور طرفین کی رضامندی، آپس کی روسیاہی کے لئے سب سے بڑی وجہ جواز ہو تو میں آپ سے دریافت کروں گا کہ زنا اور اس کے محرکات کو فروغ دینے کی سب سے بڑی ذمہ دار کیا خود ہماری حکومت نہیں ہے؟ مخلوط تعلیمی اداروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس، سینما ہاؤس وغیرہ کو بے حیائی، بے پردگی، آوارہ گردی اور فحاشی و زناکاری کا ذریعہ کون بنا رہا ہے؟ چھوٹے بڑے شہروں میں بدکاری کے اڈوں کے لائسنس کون جاری کر رہا ہے؟ ثقافت کے نام پر ملک کی بہو اور بیٹیوں کے حسن کے مقابلوں کا اہتمام کون کرا رہا ہے؟

آپ فرماتے ہیں کہ برادرانِ ملت کو توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت اس وقت دی جائے جبکہ درمیانی خلیج مشترک امور میں مشترکہ کوششوں سے کامیابی حاصل کر کے اچھی طرح پاٹ دی جائے۔ اگر فی الحقیقت آپ کا منشا یہی ہے تو ......

م۔ نہیں میرا منشا یہ ہرگز نہیں ہے مجھے بھی اچھی طرح یقین ہے کہ سماج کی تمام خرابیوں اور فتنوں کا مخزن اور منبع اصل اقتدار اور لادینی حکومت ہی ہے، میرا مقصد اصل یہ ہے کہ اگر ان مشترک امور، رفاہی کاموں اور خدمتِ خلق وغیرہ

اور سب کی نگاہوں میں کھٹکنے والی خرابیوں اور برائیوں کے
ازالے میں ہم دلچسپی لیں اور برادران وطن کا تعاون حاصل
کریں یا اُن کو تعاون دیں اور ان ہی بُرائیوں اور خرابیوں
کو نشانہ بنا کر حکومت وقت پر شدید تنقیدیں کریں تو حکومت
اور برادران وطن کی نگاہوں میں ہماری حب الوطنی ہر
شک وشبہ سے بالاتر ہو جائے گی پھر ان کے قلوب کے
دروازے ہماری دعوت کے لئے کھل جائیں گے وہ سنجیدگی
اور متانت کے ساتھ ہماری دعوت پر غور وفکر کریں گے۔

ن ــــ میں اسے بھی تسلیم کئے لیتا ہوں کہ ہم اور وہ ایک
دوسرے کے قریب ہوں گے تو ہمارے اخلاق وکردار کا
لازماً ان پر اثر پڑے گا اس لئے عملی تبلیغ تو اوّل روز ہی
سے ان پر ہونے لگے گی مگر میں عرض کروں گا کہ اس کا
تھوڑا سا امکان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ان برائیوں،
خرابیوں اور رفاہی کاموں میں باہمی تعاون اور تعامل ان
کے اپنے ذاتی، گروہی اور قومی مفادات میں حائل نہ ہو رہا
ہو اور آپ بھی اپنی تصویر کو بگاڑ کر یا چھپا کر ان کے سامنے
لائیں یعنی یہ کہ آپ کی تصویر ایک خدا پرست کی تصویر نہ ہو
خدائی نظام اطاعت کے علمبردار کی تصویر نہ ہو اسلامی
انقلاب کے داعی کی تصویر نہ ہو، شرک اور اس کے لوازمات
سے متنفر کی تصویر نہ ہو مومن حنیف کی تصویر نہ ہو مزید یہ کہ
کہ آپ جس دینی جماعت اور تحریک کے فرد ہیں اس جماعت
اور تحریک کی ہوا تک بھی انھیں نہ لگنے پائے اس کے مقصد
نصب العین اور اس کی سرگرمیوں سے وہ بالکل نابلد رہیں

اس کے مشن سے انھیں کوئی واقفیت نہ ہو، آپ کے جماعتی
کردار سے بھی وہ بے خبر رہیں اور آپ کا لٹریچر، آپ کے
اخبارات ورسائل باوجود تلاش وجستجو کے انھیں حاصل
نہ ہونے پائیں، وہ آپ کے اور آپ ان کے پڑوسی بھی
نہ ہوں، ان کی دنیا آپ کی دنیا سے بالکل علیحدہ ہو، ان سے
کسی طرح کا کوئی کاروباری تعلق بھی نہ ہو۔ ان سب کا
اطمینان بخش اہتمام کر لینے کے بعد ہی آپ ایک اچھے فرد
کی شکل میں ان کے سامنے آسکیں گے جو سب کا بھلا چاہنے
والا ہو، سب کے دکھ درد میں کام آنے والا ہو اور ان سب
برائیوں کو برائیاں کہنے والا ہو جو سب لوگوں کی نگاہ میں
کھٹکتی ہوں۔ جب جا کر آپ کے قول کے مطابق لوگوں کا
تعاون حاصل ہوگا اور درمیانی فاصلہ کم سے کم تر ہوتا چلا
جائے گا پھر کوئی ایسا پیمانہ بھی ہونا چاہیے جو کسی وقت
آپ کو یہ بتا سکے کہ اب آپ انھیں خدا پرستی کی دعوت دیں
اب یہ سب لوگ آپ کی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے
اور منتظر ہیں۔ اب آپ کے بارے میں انھیں کوئی غلط فہمی
اور بدگمانی نہیں رہی، کیا آپ کے ذہن میں اس ملک کے
اندر فریضہ اقامت دین کا نقشہ کار یہی ہے جس سے آپ
توقع رکھتے ہیں کہ آپ اس فریضہ کی ادائگی سے کبھی سبکدوش
ہو سکیں گے اور ملک کے اندر خدا پرستانہ انقلاب
برپا ہو جائے گا؟ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن میں رکھئے
کہ خدا پرستی کو نظر انداز کر کے ۱۰۰ اچھے اوصاف بھی
اگر قابل عمل ہوتے تو دنیا کے انسانیت کو خدا کی ہدایت

اور نظام اطاعتِ الٰہی کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی خداپرستی سے محروم ”اچھا انسان“ نہ خدا کو محبوب ہے اور نہ انسانی سماج کو اس کی ضرورت ہے، یہ لکڑی یا پتھر کا ایک مجسمہ تو ہو سکتا ہے جو عجائب گھر کی زینت بن کر رہے وہ انسان بہرحال نہیں ہو سکتا جس کی آج سماج کو ضرورت ہے!

جب خدا آپ کو جزا کے خیر دے واقعی ہیں تو اسی وہم وگمان میں مبتلا تھا، یہ تو ایک ناقابل عمل تصور ہے اس سے تو ہم اپنی راہ اور منزل کو بھی کھو بیٹھیں گے، ہمارا مقام بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا اور وہ مقاصد بھی حاصل نہ ہو سکیں گے جن کی خاطر ہم یہ سب کچھ کریں گے بیشک خدا پرستی کی دعوت راست انداز ہی میں دینی چاہیے اور اس میں کسی طرح کی مصلحت کو آڑے نہ آنے دینا چاہیے جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوں حکمت اور دانشمندی کے ساتھ ان کا ازالہ کرنا چاہیے اور ان تمام آلام ومصائب کو ہنس کھیل کر انگیز کرنا چاہیے جو اس راہ میں پیش آئیں۔

[illegible] بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا تو آپ حکمت و دانشمندی کے ساتھ ازالہ کر سکتے ہیں، مسئلہ ہے دراصل مخالفت کا ۔ [illegible] مخالفت کا ۔ کیا آپ اسے بھی خندہ پیشانی کے ساتھ [illegible] کر سکتے ہیں اگر اتنا عزم اور حوصلہ ہے تو آپ اقامت دین کا [illegible] انجام دے سکتے ہیں اور نہیں ہے تو آپ خدا کے [illegible] کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت بھی نہیں کر سکتے۔ دین اسلام [illegible] نظام زندگی تو ہے ہی ان حوصلہ مندوں کے لئے [illegible] ان کی ہتھیلیوں پر اور جو اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی عزیز ترین جان بھی اس راہ میں جان آفریں کے حوالے کر دینے پر بھی یہی محسوس کریں کہ ؂

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب آپ خدا کے دین کی دعوت کو راست انداز میں پیش کریں گے تو موجودہ صورت حال کی نوعیت کافی بدلی ہوئی ملے گی۔ آپ جہاں توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت پیش کریں گے دین اسلام کا تعارف کرائیں گے وہیں باطل افکار و نظریات اور لادینی نظام اطاعت پر کھل کر تنقید کریں گے، ساتھ ہی ساتھ آپ مسلم قوم اور قومی جماعتوں کو دین اسلام اور اس کے تقاضوں سے آگاہ کرتے ہوئے ان میں احساسِ ذمہ داری کو بیدار کریں گے ان کی غیر اسلامی حرکات ورجحانات اور غیر دینی سرگرمیوں پر کھل کر تنقید کریں گے یاد رکھئے کہ ماضی کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی تلافی اور ازالہ نسبتاً آسان ہے حال کی غلطیوں اور غیر دینی سرگرمیوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے ازالہ سے!

ملک میں ہماری ہزار سالہ تاریخ بلاشبہ اسلام کی مجموعی طور پر ترجمان نہیں ہے اگرچہ اس ملک میں ایک طویل عرصہ تک مسلمان حکمراں رہے ہیں مگر کوئی ایسا مبارک لمحہ ہمارے علم میں نہیں ہے جس میں اسلام اپنی صحیح شکل میں یہاں کے اندر جلوہ افروز ہوا ہو۔ اس کے برعکس ایسے مسلم بادشاہوں کا علم ہمیں ہے جنھوں نے اسلام کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ایسے بادشاہوں کی کمی نہیں [illegible]

نقطۂ نظر کے حامل تھے مگر کون نہیں جانتا کہ اس ملک کا کوئی ایک بھی صاحب علم مسلمان ان مسلم حکومتوں کو اسلامی حکومت تصور نہیں کرتا۔ مسلمانان عالم نے جب بنو امیہ و بنو عباس کی حکومتوں کو اسلام کی مثالی حکومت تسلیم نہیں کیا تو وہ مغلیہ حکومت کو یا آج کی دیگر مسلمان حکومتوں کو اسلامی حکومت کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔

اس لئے اگر ہماری ہزار سالہ تاریخ سے کوئی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے تو ہم تاریخ ہی کے حوالوں سے اسے رفع بھی کر سکتے ہیں اور اپنی تاریخی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف بھی کر سکتے ہیں مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم قوم پرست جماعتیں قوم پرستانہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ مسلمانوں کو ایک حریف قوم کی صورت میں سامنے لا رہی ہیں۔ وہ باطل نظام کی مشنری میں کل پرزے بننے کی خاطر نعرۂ تکبیر بلند کرتی ہیں، لادینی عہدوں کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی ہیں اور اگر کوئی مسلمان کسی کلیدی عہدے پر فائز ہو جاتا ہے تو وہ مسرت کے شادیانے اس انداز میں بجانے لگتی ہیں گویا خدا کے دین کی راہ میں ایک عظیم فتح حاصل ہو گئی ہو۔ برسر اقتدار گروہ کی غلط کاریوں کی پردہ پوشی کو قومی ڈپلومیسی کا نام دیتی ہیں، باطل نظریات کی علمبردار تحریکوں سے مصالحت اور معاونت کو صلح حدیبیہ سے تعبیر کرتی ہیں، سفر کانہ افعال کو اختیار کر کے اسلامی رواداری کا ثبوت پیش کرتی ہیں، خدا بیزار راہوں میں جنگ کو جہاد، مقتول کو شہید اور فاتح کو غازی کے لقب سے نوازتی ہیں اور پھر بھی

اگر ان سب سرگرمیوں اور حرکتوں پر ہماری زبانیں خاموش اور ہمارے قلم مفلوج ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں دین اسلام اور ملت اسلامیہ کے سلسلہ میں جو بدگمانیاں پیدا ہوں گی ان کا ازالہ کس طرح ممکن ہو سکے گا؟ ایسی حالت میں اگر ہم لَا اِلٰہ کو نظر انداز کر کے اِلَّا اللّٰہ کی دعوت دیں، وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ کو ترک کر کے یومن باللہ کی دعوت دیا کریں تو اسے دنیا ایک سوچی سمجھی "چال" ہی تصور کرے گی اس خاموشی اور سکوت کو ہماری بزدلی اور ابن الوقتی پر محمول نہ کرے گی۔

م۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پھر ہمیں مسلم پرسنل لا، مسلم یونیورسٹی، دینی تعلیم اور اردو زبان وغیرہ جیسے ملی و قومی مسائل میں بھی کوئی دلچسپی نہ لینی چاہیئے کیونکہ اس سے ہم پر ایک حریف قوم ہونے کا شبہ کیا جانے لگے گا؟ اور ہماری داعی حق گروہ کی حیثیت بری طرح مجروح ہو گی۔

ن۔ جی نہیں۔ یقیناً ہم ان سب امور و مسائل میں حصہ لیں گے ان کیلئے سعی و جہد کریں گے۔ مگر اسی حد تک جس حد تک دین و شریعت کا تقاضہ ہوگا اور اسی انداز میں جو ایک خیر امت کے شایان شان ہوگا، ظاہر ہے کہ ان مسائل کو ہم اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنائیں گے ان کو حل کرنے کے لئے جذباتی نعرے بازی اور ہیجان انگیز طرز عمل اختیار نہیں کریں گے، ہم برادران وطن پر واضح کریں گے کہ ہم کیوں اس میں دلچسپی لے رہے ہیں ہمارا مدعا کیا ہے؟

م۔ خدا کے پیغمبر ولی اللہ اور صوفیوں کا طریقہ ...

امد کیا رہا ہے؟ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

ج — قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی قوم — نہیں بلکہ پورے ملک اور پوری دنیا میں تنہا داعی حق تھے، جن حالات میں آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا وہ ہمارے ملک کے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، برائیوں اور خرابیوں کی وہ قسمیں بھی تھیں جو سب کی نگاہوں میں کھٹکتی تھیں اور وہ قسمیں بھی تھیں جو داعی کی نگاہ میں کھٹک پیدا کرتی تھیں، قومی اور وطنی مسائل اور الجھنوں کی بھرمار تھی، فقر و فاقہ، مرض و جہالت، ظلم و ناانصافی، معاشی استحصال، اونچ نیچ، عدم رواداری، خدا ناشناسی اور بے شمار اخلاقی کمزوریوں کی اس وقت ایک سرسبز و شاداب فصل تھی جو لہلہا رہی تھی گویا شجر خبیث اپنے پورے شباب پر تھا، آپؐ نے ان حالات کے اندر توحید کی آواز بلند کی، شرک اور مشرکانہ امور کو نشانہ بنایا، آپ کی دعوت پر جو لوگ ایمان لاتے گئے ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اعلانِ توحید کے لئے بے چین رہتے اور شرک کے خلاف پیش پیش ہوتے۔ حضور ایک اعلیٰ اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ کی چالیس سالہ ابتدائی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، آپ کا دامن بالکل بے داغ تھا مگر ظالم و سرداروں اور حق ناشناس لیڈروں نے مذہبی ٹھیکیداروں اور جاہل عوام نے آپ کے اور آپ کے مبارک ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے آج کون واقف نہیں؟ اس میں جہاں داعیانِ حق کے لئے کام کرنے والوں کے لئے سبق موجود ہے وہیں

حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں کے لئے بھی سامانِ عبرت موجود ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ خدا ایک ہے اس کے سوا کوئی عبادت و اطاعت کے لائق نہیں مگر رعشہ براندام ہو رہے ہیں سردارانِ قریش، آپ فرما رہے ہیں کہ میں خدا کا رسول ہوں مگر پیچ و تاب کھا رہی ہے وقت کی قیادت، آخرت کا تصور پیش کیا جا رہا ہے مگر زلزلے آ رہے ہیں باطل ایوانوں میں، خدا پرستی کی دعوت پیش کی جا رہی ہے مگر سماج میں خطرے کا الارم دیا جا رہا ہے، لکڑی اور پتھر کے قومی معبودوں کی پرستش سے باز رکھنے کی دعوت دی جا رہی ہے مگر سیاسی رہنماؤں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، آغاز میں اس دعوت و تحریک کو نظر انداز کرنے کی کوشش، پھر اس کے استہزاء اور تخفیف کا دور پھر جسمانی آلام و مصائب حتیٰ کہ وہ دن بھی آ جاتا ہے جبکہ آپ کو اپنے خاندان کے ساتھ شعب ابی طالب میں نظر بند کر کے سماجی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جاتا ہے، وہ دن بھی آتا ہے جبکہ اہل وطن اپنے ہی ایک صالح اور بے داغ مگر حق کے داعی کی قیام گاہ کو گھیر لیتے ہیں اور اپنی بے نیام تلواروں سے من مانا فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، داعی کو بھرپور یقین ہے اور یہی یقین وہ اپنے کارکنوں میں پیدا کر رہا ہے کہ وہ دن قریب ہے جبکہ حق کو غلبہ حاصل ہوگا۔ وہ وقت آئے گا جبکہ حرم کعبہ کی چابیاں ہمارے ہاتھوں میں ہوں گی ہم جسے چاہیں گے دیں گے، اور وہ وقت آئے گا جبکہ ایک شخص سونا اچھالتا ہوا صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا مگر اسے درندوں کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا کونسی غلط فہمی اور بدگمانی تھی جس نے جنم نہ لیا ہو، کون سا الزام تھا جو آپ پر عائد نہ کیا

گیا ہو، کونسا ہتھیار تھا جو آپ کے خلاف استعمال نہ ہوا ہو، آپ کی چالیس سالہ بے داغ ابتدائی زندگی آپ کے خاندان کی عظمت کے باعث کیا ان کی شرمناک اور مذموم سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع ہوئی؟

غور فرمائیے کہ کیا توحید خالص کے سوا کوئی اور بات کہی گئی، رسالت اور آخرت کے حقائق ہی تو پیش کئے گئے تھے، اقتدار کے لئے کوئی دوڑ دھوپ تو نہیں ہوئی تھی، عہدوں کی تقسیم کا کوئی مسئلہ تو نہ تھا، قومی یا وطنی یا ذاتی کوئی مفاد تو نہ تھا جس کے حصول کی کوشش ہوئی ہو پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے صرف اس لئے کہ حق بے نقاب ہو کر سامنے آگیا تھا اور باطل کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا اور باطل کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مقابلہ پر آجائے اور اپنے تمام ہتھکنڈوں کو حسب سابق ایک ایک کر کے استعمال کر ڈالے، سو اس نے یہ سب کچھ کر لیا، اس کا ٹھیک وہی انجام ہوا جو حق و باطل کی کشمکش کی تاریخ میں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے "جاء الحق وزھق الباطل، انّ الباطل کانَ زھوقا"

(حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے ہی والا ہے)

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے یہی تو کہا تھا کہ "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی اختیار کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے" اس سیدھی اور سچی بات کا جو جواب حضرت نوحؑ کو ملا وہ یہ تھا "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہو" حضرت نوحؑ کے پیروکاروں پر زہر میں بجھے ہوئے تیر اس طرح چلائے گئے، کہا کہ "کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے" حق کی نافرمانی کو انھوں نے اپنی عظیم شرافت کی علامت تصور کیا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے راست انداز میں یہی تو دعوت دی تھی کہ "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی اختیار کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے پھر کیا تم غلط پیروی سے پرہیز نہ کرو گے؟" قوم کے سربراہوں کا جواب تھا "ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا پاتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو" یہ بڑے سچے، پاکباز اور عقل کے مالک تھے جو حق سے روگردانی کر کے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سہارے زندہ رہنا چاہتے تھے چنانچہ کہا کہ "اے ہود! کیا تو ہمارے پاس اسی لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔"

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بے لگام لوگوں کی اطاعت سے باز آجاؤ جو اللہ کی زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح کا کام نہیں کرتے" تو اس پر خدا کے رسول کو یہ جواب ملا کہ "تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہمیں سخت شبہ ہے جس نے ہم کو خلجان میں ڈال رکھا ہے" جن کی گردنوں میں ہزاروں معبودوں کی غلامی کے قلادے پڑے ہوئے تھے وہ اللہ واحد کی اطاعت و عبادت کا نام سن کر اپنے سروں کو پیٹنے لگتے ہیں، یہ قوم کے "بڑے لوگ" تھے

جنھوں نے کہا "ایک اکیلا آدمی جو ہمارے ہی اندر کا ہے کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں، اس کی اتباع ہم قبول کرلیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے وقت کے فرعون سے یہی تو کہا تھا کہ "ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانیاں لے کر آئے ہیں اور سلامتی اس کے لئے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔"

موسیٰ علیہ السلام نے جب خدا کی دی ہوئی نشانیوں کو پیش کر دیا تو فرعون اپنے مصاحبوں سے بولا:۔

"یہ شخص یقیناً جادوگر ہے چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

حضرت موسیٰؑ سے صاف طور پر کہا گیا کہ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ اور دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے اور تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں" بالآخر ایک روز فرعون نے کہہ دیا کہ:۔

"چھوڑ دو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل کئے دیتا ہوں اور پکار دیکھے اپنے رب کو، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔"

میں سمجھتا ہوں کہ انبیاء کرام کی اس دعوت اور اس کے رد عمل سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ خدا پرستی کی دعوت کیا ہوتی ہے۔ کس طرح پیش کی جاتی ہے اور اس اور اس کا رد عمل کیا ہوتا ہے؟

رہی یہ بات کہ ملک میں اسلامی انقلاب کا طریقہ کیا ہو تو عرض یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ آج جو حالات پائے جاتے ہیں وہی کل بھی پائے جائیں، البتہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اسلامی انقلاب جب بھی آئے گا اور جن راستوں سے آئے گا رحمت و برکت بن کر آئے گا، وہ توڑ پھوڑ کے ذریعہ غیر اخلاقی طور پر، معصوم انسانوں کی لاشوں کو روندتا ہوا نہیں آئے گا۔

تنقید و تبصرہ

مجاہد کی اذان ترجمہ محمد عنایت اللہ سبحانی

اصلاحی صفحات ۴۶۴

کاغذ، کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت مجلد دس روپے۔

پتہ: مکتبۃ الحسنات رامپور

پہلے صفحہ پر اس کتاب کا تعارف اس طرح درج ہے

"امام حسن البنّا شہید کے وہ انقلابی رسائل جن سے باطل کی بنیادیں ہل گئیں اور مصر و عرب کے ہزاروں مغرب زدہ نوجوان ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال اور جوشِ عمل سے سرشار ہو گئے انہیں رسائل کا نہایت نفیس اردو ترجمہ"

اس سے پہلے فاضل مترجم نے سید قطب شہید کی شہرۂ آفاق کتاب "معالم الطریق" کا ترجمہ "نقوشِ راہ" کے نام سے کیا تھا جو بہت مقبول ہوا ماہنامہ زندگی میں نقوشِ راہ پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے اس کے بعد انھوں نے امام حسن البنّا شہید کے بعض رسائل کا ترجمہ "زاد و راحلہ" کے نام سے کیا تھا۔ "زندگی" میں اس پر بھی تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اس زیرِ تبصرہ کتاب میں زاد و راحلہ بھی شامل ہے اور اب "مجاہد کی اذان" کے عنوان سے حسن البنّا رحمہ اللہ کے چند اور رسائل کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی ابتداء میں "امام حسن البنا شہیدؒ" کے عنوان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک مختصر تحریر ہے۔ اس کے بعد "ہم دونوں کی منزل ایک تھی" کے عنوان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے الاستاذ حسن الہضیبیؒ کی وفات پر لاہور کے ایک تعزیتی جلسے میں کی تھی۔ مولانا کی تقریر کا عربی ترجمہ کویت کے ہفت روزہ المجتمع میں شائع ہوا تھا۔ جناب عنایت اللہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مولانا کی اصل تقریر انہیں نہیں مل سکی۔ پھر "کلمۂ خیر" کے عنوان سے مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی شارح مشکوٰۃ شریف کی ایک تحریر ہے اس کے بعد "عرضِ مترجم" کے عنوان سے فاضل مترجم نے تقریباً بیس صفحات میں امام حسن البنا شہید کے حالات

لکھے ہیں۔ یہ سب کچھ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب یعنی امام حسن البنا کے عربی رسائل کا ترجمہ شروع ہوتا ہے۔ امام شہید کے عربی رسائل تبصرہ نگار جیسے کسی شخص کے تعارف سے بے نیاز ہیں۔ البتہ ترجمہ کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اصل عربی رسائل تبصرہ نگار کے سامنے نہیں ہیں۔ ترجمہ شستہ اور رواں ہے اور بھروسہ ہے کہ صحیح بھی ہوگا۔ امام شہید کے متعدد چھوٹے بڑے رسائل " رسائل حسن البنا " کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ " مجاہد کی اذان " انہیں رسائل کا اردو ترجمہ ہے۔ ان کے ایک رسالہ " رسالۃ التعالیم " کا ترجمہ " زاد راہ " کے نام سے فاضل مترجم نے کیا تھا جو پہلے شائع ہو چکا ہے اور اب اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے لیے پیش لفظ لکھنے کی درخواست مولانا صدرالدین اصلاحی سے کی گئی تھی۔ لیکن وہ پیش لفظ دیر سے ملا اس لیے اس کتاب میں شائع نہیں ہو سکا عنایت اللہ صاحب نے وہ پیش لفظ ماہنامہ زندگی کو عنایت کیا تھا جو اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

امام حسن البنا نے " الاخوان المسلمون " کے نام سے مصر میں " انقلاب امامت " کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اصلاً وہی تھی جو غیر منقسم ہندوستان میں " جماعت اسلامی " کے نام سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے شروع کی۔ مولانا مودودی نے اپنی اس تقریر میں جو اس کتاب میں موجود ہے کہا ہے کہ ان دونوں تحریکوں کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں، زائد سے زائد دو سال کا فرق ہے۔

تبصرہ نگار عرض کرتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی تحریک فہم و شعور کے ساتھ شروع کی جائے گی وہ اصلاً ایک ہی ہوگی کیونکہ اس کا سرچشمہ اللہ کی کتاب، رسول اللہ کی سنت اور خلفائے راشدین کی تاریخ ہے۔ فرق جو کچھ ہوگا تحریک چلانے والوں میں ہوگا۔ " مجاہد کی اذان " ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے کی جدوجہد سے دلچسپی رکھتا ہے یا عملاً اس جدوجہد میں شریک ہے

ہندوستانی مفسرین اور اُن کی تفسیریں

ڈاکٹر سالم قدوائی صفحات ۳۵۲ کاغذ کتابت طباعت عمدہ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت ۱۸ روپے ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے صاحبزادے محمد سالم قدوائی کو اس مقالے پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ڈاکٹر محمد سالم صاحب نے یہ مقالہ پروفیسر اور سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جناب عبدالعلیم صاحب کی نگرانی میں تیار کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول تفسیر

باب۲ اجزائے قرآن کی تفسیریں۔ باب۳ تفسیروں کی شرحیں اور حواشی۔ باب۴ متعلقات قرآن مجید۔ باب۵ ان لوگوں کے حالات، جن کی تفسیریں نہیں ملتیں۔ اخیر میں تین فہرستیں ہیں۔ تفسیروں کی فہرست، مفسرین کی فہرست اور حوالے کی کتابیں۔

پہلے باب میں ہندوستانی مفسرین کی ان عربی تفسیروں کا ذکر ہے جو مکمل ہوگئیں خواہ وہ مکمل ملتی ہوں یا ان کا کوئی حصہ۔ دوسرے باب میں غیر مکمل یعنی بعض اجزائے قرآن کی تفسیروں کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں قدیم مفسرین کی تفسیروں کے حواشی اور شرحوں کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں متعلقات قرآن کا ذکر ہے۔ جیسے ناسخ و منسوخ۔ رسم خط۔ تخریج آیات۔ مفردات قرآن، فضائل قرآن اور احکام قرآن وغیرہ اور پانچویں باب میں ان علماء کے حالات بیان کیے ہیں جن کی تفسیروں کا پتہ نہیں چلتا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے اور محنت سے تیار کی گئی ہے۔ قرآن مجید اور اس کی عربی تفسیروں سے دلچسپی رکھنے والوں اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مفید ہے اور آئندہ اس میں اضافے ہوتے رہیں گے۔ کتاب کے مصنف نے محنت کی ہے لیکن ابھی کتنی ہی مکمل اور غیر مکمل تفسیریں یا حاشیے ہوں گے جن کا پتہ مصنف نہیں لگا سکے ہوں گے۔ مثال کے طور پر وہ خاندان شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ایک عالم شیخ سلام اللہ محدث رام پوری کے حاشیہ "کمالین بر جلالین" سے واقفیت حاصل نہیں کر سکے۔ حالانکہ یہ حاشیہ جلالین کے ساتھ ۱۲۸۷ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہو چکا ہے اور یہ مطبوعہ نسخہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ میں یہ بات "تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی" کے حوالے سے لکھ رہا ہوں۔ جن مفسرین کی عربی تفسیریں نہیں ملتیں، ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی ہیں۔ ان کا ذکر زیر تبصرہ کتاب میں ص۲۱۳ پر ہے۔ لیکن ان تفسیروں کے نام مصنف نے نہیں لکھے ہیں جو محدث دہلوی نے لکھی تھیں اور اب ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ان میں سے ایک کا نام "التعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی" ہے۔ یہ بیضاوی کے جزء اول کے ربع اول پر مفصل حاشیہ ہے۔ دوسری تفسیر کا نام "شرح الصدور بتفسیر آیۃ النور" ہے۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی)۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا یہ کتاب بحیثیت مجموعی لائق مطالعہ ہے۔

لارڈ منٹو کی خفیہ ڈائری

م' احمد ایم اے۔ صفحات ۲۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ:۔
الجمعیۃ بکڈپو، گلی قاسم جان۔ بلیماران۔ دہلی

طنز نگاری، ادب کی ایک مستقل صنف ہے۔ اگر طنز نگار کا مقصد، اصلاح و تعمیر ہو تو اس صنف ادب سے

بہت کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب تعمیری طنز نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں بے شمار خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں اور یہاں کا معاشرہ "تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم" کا مصداق ہے جناب م۔ احمد کی نظر ان تمام خرابیوں پر ہے اور انھوں نے جن خرابیوں پر اپنی طنز کے نشتر چلائے ہیں ان کو شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ ہم یہاں ان کی طنز کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ناجائز کمائی کو جائز بنانے کا طریقہ

لارڈ ممبکٹو نے اپنی ڈائری میں ایک جگہ سردار مستان سنگھ مست قلندر کا یہ قول نقل کیا تھا:۔

اپنے دیش میں نیک دل لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی ناجائز کمائی سے کچھ خیرات نکالنے ــــ اور اس کمائی میں بھگوان کو شریک کر لینے سے وہ کمائی جائز ہو جائے گی۔"

رات بھر مذہبی شور

لارڈ نے ایک اور جگہ لکھا تھا:۔

پروفیسر حقنس نے مجھ سے کہا کہ کچھ ہندوستانی رات بھر لاؤڈ اسپیکروں پر مذہبی شور مچاتے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے پڑوسیوں کو بھی جگاتے ہیں کیا اس لیے کہ ان کی تھوس کراری یا بلغم آلود ــــ یا نزلہ والی آواز اوپر تک پہنچ جائے؟

کرۂ ارض ان کی گود میں

ایک اور جگہ لکھا تھا:۔

ماسٹر بہاری لال جوالہ مکھی نے مجھے بتایا کہ اپنے منتری مہودے ماسٹر مفت لال جی جب گول تکیہ سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتے ہیں اور موج میں اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو ان کو بڑا آنند ہوتا ہے۔ توند پر ہاتھ پھیرنے سے ان کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ کرۂ ارض ان کی گود میں ہے۔

دیوانے یہ قول پڑھ کر خوب ہنستے رہے۔ سردار لندن توڑ بولے ،، ان کے لیے ان کی توند مذہبی کرۂ ارض ہے اور بس۔ صلا

الحاج درد قریشی۔ صفحات ۴۶

جمال مصطفےٰ پاکٹ سائز۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ علمستان ۱۹۲، اصطبل چار باغ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

اس پمفلیٹ میں جناب رئیس نعمانی نے الحاج درد قریشی کی چند نعتیں اور اسلامی نظمیں شائع کی ہیں پیش لفظ میں انھوں نے اردو شاعری کی ایک اہم صنف "نعت" پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے درد قریشی مرحوم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک باکردار انسان تھے اور ان کے ظاہر و باطن اور گفتار و کردار میں یکسانی پائی جاتی تھی

درد و تڑپ ہی کے سامنے نعت گوئی کا متوازن نقطۂ نظر تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں بے احتیاطی اور حدودِ شریعت سے متجاوز مدح بہت کم پائی جاتی ہے ان کی نعتوں اور اسلامی نظموں کے اس مجموعے میں جو کچھ شائع کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ موجودہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر وہ کڑھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان پھر خدا و رسول کی اطاعت کی طرف پلٹیں تاکہ ان کی موجودہ ذلت، عزت سے بدل جائے

اگرچہ ان کی شاعری میں زبان و بیان کی خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن اکثر و بیشتر اشعار میں انھوں نے صحیح اور کارآمد خیالات پیش کیے ہیں۔ اس بہت مختصر کتابچے میں بھی مطبعی غلطیاں کافی ہیں اور کئی مصرعے تو کوئی لفظ یا حرف چھوٹ جانے کی وجہ سے ناموزوں شائع ہو گئے ہیں مثلاً ص ۲۹ پر "جام کیا" کوثر و تسنیم بجا آتے ہیں" چھپ گیا ہے۔ اس میں "میم" چھوٹ گئی ہے۔ "بجام آتے ہیں۔ ص ۴۴ پر "وہ جلوہ خدا کی سامنے ہے" شائع ہوا ہے۔ غالباً خدا کے بعد قسم کا لفظ چھوٹ گیا ہے ص ۴۴ پر "نہ: آخری مصرع میں "ہو" کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے۔

الفرقان لکھنؤ۔ اشاعت خاص صفحات ۴۸۰ قیمت پانچ روپے

پتہ:۔ دفتر ماہنامہ الفرقان۔ کچہری روڈ، لکھنؤ۔

ماہنامہ الفرقان اب ۳۲ سال سے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی ادارت میں نکل رہا ہے اور ہندوستان کے ان علمی، دینی و اصلاحی ماہناموں میں ہے جو خود اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں۔ الفرقان کی عمر کے ۳۰ سال پورے ہو جانے کے بعد مولانا نعمانی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس مدت میں شائع ہونے والے اہم مضامین ایک خاص اشاعت میں جمع کر دیے جائیں مگر جب مضامین کے انتخاب کے لیے قدیم جلدوں کی ورق گردانی کی گئی تو اندازہ ہوا کہ ایسے مضامین ایک نمبر میں نہیں سمیٹے جا سکیں گے بلکہ متعدد نمبر شائع کرنے پڑیں گے اس لیے طے کیا گیا کہ اس سلسلے کے پہلے نمبر میں الفرقان کے صرف ابتدائی ۱۳ سالہ دور کے مضامین کا انتخاب شائع کیا جائے جبکہ وہ بریلی سے نکلتا تھا۔ یہی وہ پہلا خاص نمبر ہے جو آپ کے سامنے ہے"۔ یہ بات مولانا منظور نعمانی نے "نگاہ اولیں" میں تحریر فرمائی ہے۔ اس اشاعت خاص کے مضامین کو حسب ذیل ابواب کے تحت جمع کیا گیا ہے:

باب ۱ ایمان و عقائد۔ باب ۲ ننگ کی نامسلمانی سے فریاد۔ باب ۳ سیر قادیانیت۔ باب ۴ نکار و بار شرک و بدعت اور نور کتاب و سنت۔ باب ۵ عبرت کی باتیں باب ۶ دعوت تجدید و اصلاح

ان ابواب کے تحت ۳۶ مضامین نثر و نظم جمع کیے گئے ہیں۔ تبصرہ نگار بالاستیعاب تمام مضامین کا مطالعہ

نہیں کرسکا اور وقت فرصت کا انتظار کیا جاتا تو تبصرے میں مزید تاخیر ہوتی۔ بعض مضامین تو پورے پڑھے ہیں اور اکثر پہ سرسری نظر ڈالی ہے۔ ماہنامہ الفرقان غیر معروف نہ اس کی اصلاحی کوششیں غیر معروف اور نہ اس کے محترم مدیر غیر معروف اس لیے تبصرہ نگار کو بھروسہ ہے کہ مضامین میں کوئی بات کتاب و سنت کے خلاف نہیں لکھی گئی ہوگی۔ تبصرہ نگار کو مضامین مفید معلوم ہوئے اور امید ہے کہ اس اشاعت خاص سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس اشاعت خاص میں سب سے پہلے ایک نظم "حمد" کے عنوان سے ہے۔ اس نظم کے دو بند پر نگاہ رکی اور کچھ کھٹک محسوس ہوئی ہے۔ پہلا بند یہ ہے:۔

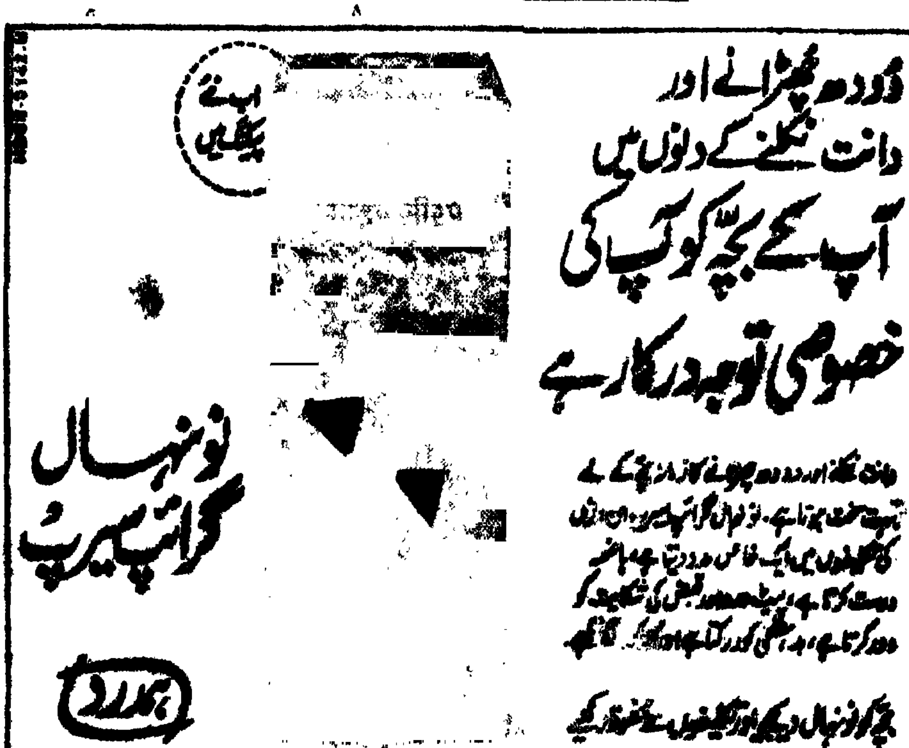
ہیں مسجد و مندر و کلیسا　　اس کے ہی جمال سے مجلّا

دوسرا بند یہ ہے:۔

ہر چیز، ہر ایک بات وہ ہے　　القصّہ یہ کائنات وہ ہے

ان دونوں بندوں سے وحدت الوجود کے غلط نظریے کی بو آرہی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ اشاعت خاص لائق مطالعہ و استفادہ ہے۔



Regd No. MRD 66 Monthly ZINDGI Rampur U. P.
November 1974

ٹائٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا

ماہنامہ

زندگی

رامپور

سالانہ -/15   اس شمارے کی قیمت - Rs. 1/50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

ماہنامہ

زندگی رام پور

(ایڈیٹر:- سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 15/-
پاکستان سے 15/-
ششماہی
ہندوستان سے 7/-50
پاکستان سے 7/-56
قیمت فی پرچہ:- 1/-50

جلد ۵۳ | ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۴ء | شمارہ: ۶

اشارات	سید احمد قادری	۲
مطالعۂ قرآن		
فساد فی الارض کا مفہوم	مولانا امین احسن اصلاحی	۷
مقالات		
سنت و بدعت کی کشمکش	مولانا سید ابوالاعلیٰ	۹
حضرت موسیٰ کی قوم شرک کا انتساب	جناب محمد ذکی	۱۳
تحریک اسلامی اور ہمارے نوجوان	جناب احسن مستقیمی	۲۰
اشتراکیت	جناب ڈاکٹر نثار احمد	۲۸
منصب خلافت کی ایک اہم ذمہ داری	سید احمد قادری	۳۴
تراجم و اقتباسات		
تھائی لینڈ میں مسلمان	جناب محمود الازہار ندوی	۴۶
رسائل و مسائل		
رضائے الٰہی اور جنت	سید احمد قادری	۵۱

کیا آپ کی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے؟

اس دائرے ( ) میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری دسمبر کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ امید ہے آپ زندگی پسند فرماتے اور مفید خیال فرماتے ہوں گے۔ براہ کرم سالانہ چندہ = 15/ زیادہ سے زیادہ ۲۵ دسمبر تک ضرور ارسال فرما دیں۔ اگر آپ کسی مجبوری سے خریداری جاری رکھنے سے معذور ہوں تو براہ کرم ایک کارڈ سے خریداری بند کرنے کی اطلاع ضرور دے دیں۔ اگر آپ نے چندہ منی آرڈر سے نہیں بھیجا اور خریداری بند کرنے کا خط بھی نہیں لکھا تو آئندہ شمارہ اجتماع نمبر سالانہ چندہ اور v.p فیس سمیت 16/75 کی v.p. سے حاضر ہوگا۔ امید ہے v.p وصول کرنا آپ اپنی ذمہ داری سمجھیں گے۔ منیجر ماہنامہ زندگی رامپور

مالک: دعوت ٹرسٹ دہلی۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع ناظم پریس رام پور۔ یوپی۔ مقام اشاعت دفتر زندگی رام پور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

۶ر نومبر ۱۹۶۷ء کو دہلی گیا تھا اور ۱۵ر نومبر ۱۹۶۷ء کو رام پور واپس آیا۔ جماعت اسلامی ہند کا پانچواں کل ہند اجتماع ۸ر تا ۱۱ر نومبر ۶۷ء گاندھی درشن میدان (متصل گاندھی سمادھی) میں منعقد ہوا۔ ۱۱ر نومبر کی تاریخ ارکان جماعت کے اجتماع کے لیے مخصوص تھی۔

مجھے جماعت اسلامی ہند کے چار کل ہند اجتماعات میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ پہلا کل ہند اجتماع جو اپریل ۱۹۵۱ء میں بمقام رام پور منعقد ہوا تھا میں اس وقت مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (بہار) کا ایک سینیر مدرس تھا۔ اس اجتماع میں میری شرکت بڑی کشش اور جذبات کے ساتھ ہوئی تھی اس کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ دوسرا کل ہند اجتماع جو نومبر ۵۲ء میں بمقام حیدرآباد منعقد ہوا تھا' میں اس وقت بھی مدرسہ شمس الہدیٰ میں تھا اور اس اجتماع میں شریک نہیں ہوسکا تھا۔ تیسرا کل ہند اجتماع نومبر ۱۹۶۰ء میں بمقام دہلی منعقد ہوا تھا اور میں اس اجتماع میں شریک تھا میں اس وقت مدرسہ شمس الہدیٰ سے کئی سال پہلے ہی برخاست کیا جا چکا تھا اور رام پور میں مقیم تھا۔ چوتھا کل ہند اجتماع نومبر ۱۹۶۷ء میں بمقام حیدرآباد منعقد ہوا تھا اور مجھے شرکت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اور اب یہ پانچواں کل ہند اجتماع جو دہلی میں منعقد ہوا —— میں اس وقت جبکہ یہ شمارہ پریس جانے کے لیے بالکل تیار ہے اس پانچویں کل ہند اجتماع کی کوئی تفصیل پیش نہیں کرسکتا آئندہ انشاء اللہ "زندگی" کے اجتماع نمبر میں کچھ تفصیل آئے گی اس نمبر کا پہلے بھی اعلان کیا جا چکا ہے (پوسٹر اور ہینڈبل کے ذریعے) اور اس شمارے میں بھی اس کا اعلان قارئین زندگی کی نظروں سے گزرے گا۔

جماعت اسلامی ہند کے پہلے کل ہند اجتماع کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ مرکز کی طرف سے اس کی ایک باضابطہ مفصل روداد کتابی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد

اب تک مرکز کی طرف سے کتابی شکل میں کوئی روداد شائع نہیں ہوئی ہے۔ خدا کرے اس پانچویں کل ہند اجتماع کی کوئی روداد کتابی شکل میں شائع ہو۔ اگر تمام اجتماعات کی رودادیں شائع ہو گئی ہوتیں تو کسی مورخ کو جماعت اسلامی ہند کی تاریخ مرتب کرنے میں سہولت ہوتی، ویسے ان پانچوں اجتماعات کے صدارتی خطبات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ کوئی ذہین و فہیم شخص ان خطبات کو سامنے رکھ کر ان کا تقابلی مطالعہ کرے تو یہ ایک دلچسپ اور مفید کام ہوگا۔

دنیا میں مسلمانوں کی نسبت سے دو قسم کے ممالک پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن میں ان کی تعداد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور دوسرے وہ جن میں ان کی تعداد کم ہے اور انہیں ایک اقلیت شمار کیا جاتا ہے۔ اکثریت اور اقلیت کے تناسب پر یہاں گفتگو غیر ضروری ہے۔ کسی ملک کے اندر خواہ مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، اقامت دین کی جد وجہد کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی بنیادی و جوہری فرق نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب دین اسلام کی اقامت مقصود ہے، اس کی اساس اور بنیاد عقیدۂ توحید ہے۔ جب تک کسی ملک کی اکثریت اس توحید پر مخلصانہ ایمان نہیں لے آتی جس کی تعلیم قرآن مجید نے دی ہے اس وقت تک اقامت دین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غیر مسلم ہی نہیں، آج مسلمانوں کی بھی بہت بڑی تعداد یا تو اس توحید سے نا واقف ہے یا اس پر اس کا یقین کمزور ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے وہاں شرعی قوانین اور شریعت کی مقرر کردہ حدود و تعزیرات کے نفاذ کی کوشش اور اس کی دعوت ان جمہوریت پسند ممالک سے بھی زیادہ مشکل اور دشوار ہے جن میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔

ہمارا تعلق اس ملک سے ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے اور انہیں ایک اقلیت شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اقامت دین کی جد وجہد کے سلسلے میں دعوت دین اور اسلام کا تعارف اولین مرحلہ ہے اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خود دین اسلام کی اولین اساس —— توحید —— کا تعارف کس طرح کرایا جائے؟ آیا اس طرح جس طرح اس کا تعارف قرآن و احادیث نے کرایا ہے یا اس طرح جس طرح ہمارا جی چاہے یا جس طرح اس کا تعارف مجالس وعظ کے واعظین اور محافل میلاد کے مقررین کراتے ہیں؟ یہ لوگ تو صدیوں سے اسلام اور توحید کا تعارف کرا رہے ہیں لیکن نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ مسلمان اپنے پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بھی چیخ رہے ہیں اور اندیشہ محسوس کر رہے ہیں کہ نہ جانے کب وہ نکاح طلاق اور میراث کے شرعی قوانین پر عمل کرنے سے بھی محروم کر دیے جائیں۔

انسانوں کی بہت بڑی اکثریت پہلے بھی خدا کے وجود

کی قائل رہی ہے اور آج بھی ہے۔ کروڑوں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو خدا کو ایک مانتے ہیں لیکن خدا کے بارے میں قسم قسم کے عقائد اور ان کے زیر اثر بھانت بھانت کے اعمال کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کا خدا الگ ہے، وہ حقیقی خدا کو نہ جانتے ہیں، نہ مانتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا خدا فرضی خدا ہے جس کو اس کے وہم و قیاس نے گھڑ لیا ہے۔ کسی کا خدا صرف اس بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ محض اس کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے۔ کسی کا خدا صرف اس سے راضی ہو جاتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی کائنات کے حسن، اس کی وسعت اور اس کے مستحکم نظم کی تعریف کر دی جائے۔ کسی کا خدا صرف اس سے راضی ہو جاتا ہے کہ اس کی پرستش کر لی جائے۔ غرض یہ کہ جس نے جس انداز کا خدا وضع کیا ہے، اسے خوش کرنے کے لیے اس نے خود کچھ اعمال اور طریقے وضع کر لیے ہیں باقی رہے وہ لوگ جو قرآن اور حدیث کا نام لیتے ہیں وہ بھی سیکڑوں قسموں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان میں بہت سے لوگوں نے یہودیوں کی طرح ان چند اعمال و احکام کو اپنے لیے چن لیا اور انہیں کو مکمل دین قرار دے لیا ہے جن پر عمل کرنا ان کے خیال میں آسان ہے۔ اس عمل میں سر کٹانے، مال لٹانے اور گھر بار کو برباد کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کچھ ذہین لوگوں نے دین کی تعبیر کا ایک نیا بہانہ ایجاد کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی آیات اور احادیث سر آنکھوں پر لیکن ان کی تعبیر ہم کریں گے۔ ان کا مطلب ہم بیان کریں گے۔ ان کا مفہوم ہم نکالیں گے۔ صدیوں پہلے کی تعبیرات، مطالب اور مفاہیم ہمارے کام کی نہیں ہیں۔ گویا زمانے اور حالات کے تغیر سے دین کی تعبیر بھی بدل جاتی ہے۔ میں آج ان لوگوں سے یہاں بحث نہیں کر رہا ہوں جو سچائی کے ساتھ دل میں کچھ چھپائے بغیر اس کا اعلان کرتے ہیں کہ قرآن بہت پہلے عرب میں آیا تھا اور اب اس ایٹمی دور میں وہ قابل عمل نہیں ہے (نعوذ باللہ) فرسودہ ہو چکا ہے۔ یہ کھلے ہوئے کافر، منافقین سے کہیں بہتر ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دین اسلام کی تعبیرات کا ایک وسیع جنگل پھیل گیا ہے اور فی الواقع اسی پر "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر" کا مصرع صادق آتا ہے۔

ابھی حال میں، میں نے ایک معتدل قسم کے اہل علم و صاحب قلم نیشنلسٹ کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے دستور نے انہیں وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جو وہ چاہتے ہیں اس لیے انہیں اپنا نصب العین یہ بنانا چاہیے کہ وہ اس دستور کو پورے طور پر بروئے کار لانے کی سعی کریں۔ انھوں نے اپنے خیال کے مطابق ریاست کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اور اس کے لیے لکھا ہے:۔

آپ ہندوستان کے دستور اساسی کا خصوصاً بنیادی

مقاصد کی دفعات کا جائزہ لیجیے تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس دستور میں مسلم اقلیت کے نقطہ نظر کے مطابق مطلوبہ ریاست کا خاکہ موجود ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض ایک تصوری خاکہ ہے جس میں حقیقت کا رنگ بھرنا ہے یہ محض ایک پیکر خیالی ہے جسے حقیقت کا جامہ پہنانا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا جماعت کی حیثیت سے اگر کوئی مقصد زندگی ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس سیکولر، جمہوری اشتراکی ریاست کے خاکے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی اس خیالی ہیئت اجتماعی کو وجود میں لانے کی دل وجان سے سعی کریں۔ یہ ایک عظیم الشان نصب العین ہے جس کی راہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنا بھی ہمت وجرأت کا بڑے صبر واستقلال کا کام ہے۔ یہ کام ہندوستانی مسلمانوں کو خدا کا نام لیکر شروع کرنا ہے اور اس وقت تک جاری رکھنا ہے جب تک پورا نہ ہو جائے۔ یقیناً اس ضمن میں اور بہت سے نظری مسائل اور عملی مسائل اٹھتے ہیں لیکن اگر اصل مقصد پر اتفاق رائے ہو جائے تو فروعی اختلافات دور ہونے کی راہ کھل جائے گی۔

سیکولر، جمہوری، اشتراکی ریاست کے خاکے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کو ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا واحد مقصد قرار دینا، اس کو عظیم الشان نصب العین کہنا اور خدا کا نام لیکر اس مقصد کے حصول کی کوشش شروع کرنے کی دعوت دینا یہ ہیں اس تحریک کے نمایاں اجزاء۔

اس عبارت سے خدا کا تصور جو جھلک رہا ہے اور دین اسلام کی جو تعبیر سامنے آرہی ہے وہ خدا کے مختلف تصورات اور دین کی مختلف تعبیرات کے جنگل ہی کا ایک حصہ ہے۔ جماعت اسلامی جس مقصد سے وجود میں آئی ہے وہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک دین کی ان تعبیرات یا معنوی تحریفات کے تاریک جنگل کو صاف نہ کر دیا جائے۔ تحریک اسلامی کا اولین مرحلہ یہ ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ تمام انسانوں کو دین اسلام کی اس تعبیر تک پہنچایا جائے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس ساتھیوں کی قولی و عملی تشریحات اور ان کے کارناموں میں محفوظ ہے۔

ہندوستان میں اقامت دین کی راہ کا ایک بہت بڑا پتھر خدا کا وہ تصور اور مذہب کی وہ تعبیر ہے جس کی جھلک متحدہ قومیت، سیکولرزم اور سوشلزم کے ایک مسلمان چمپین کی تحریر میں اوپر گذری۔ میں نے اس کو ایک بہت بڑا پتھر اس لیے کہا کہ خدا کے اس تصور اور مذہب کی اس تعبیر کو اقتدار وقت کی تائید حاصل ہے۔

خدا کے اس تصور کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں سے صرف اپنی پرستش کرانا چاہتا ہے اور بس — دین کی اس تعبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے جس کا تعلق انسان کی پرائیوٹ زندگی سے ہے۔ سیاست و

[redacted]

سیاست سے اس کا نہ صرف یہ کہ کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان دونوں سے اس کا تعلق جوڑنا ایک تخریبی عمل ہے۔ اگر کسی ملک کا دستور اور وہاں کا اقتدار مسلمانوں کو یہ "مذہبی آزادی" عطا کردے تو پھر مسلمانوں کے مذہبی تقاضے پورے ہو جاتے ہیں لہٰذا ان کو اس دستور اور اس اقتدار کا نہ صرف خادم بلکہ خیمہ بردار بن جانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس پتھر کو ہٹایا نہ جائے کسی ملک میں اقامت دین کی راہ کھل نہیں سکتی۔

اللہ رب العلمین جس طرح اپنی تکوینی حاکمیت میں یگانہ یکتا ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح وہ اپنی تشریعی حاکمیت میں بھی یگانہ و یکتا ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔۔ مشرکین ہمیشہ سے خدا کی تکوینی حاکمیت کے قائل رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا، ان کے انکار و مخالفت کا سارا زور خدا کی تشریعی حاکمیت کے مقابلہ میں رہا ہے۔ وہ کبھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور آج بھی نہیں ہیں کہ ان کی زندگی کے اختیاری حصے پر بھی خدا کی حکومت ہو اور ان کی اختیاری زندگی بھی خدا کے قانون ہدایت کی پابند ہو جائے۔ عقیدۂ توحید کا یہی جزء درحقیقت اس عقیدے کی جان ہے اسے حذف کر دیجیے تو پھر یہ عقیدہ بے روح ہو کر رہ جائے گا اور دنیا میں کبھی بھی اللہ کا دین دوسرے ادیان باطلہ پر غالب نہیں ہو سکے گا بلکہ ہمیشہ یہ دین دوسرے ادیان کے تابع بنکر رہے گا جیسا کہ صدیوں سے یہ دوسرے ادیان کا محکوم و تابع بنا ہوا ہے۔

جماعت اسلامی جس مقصد سے وجود میں آئی ہے وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم بھی اسلام اور توحید کا وہ ناقص اور بے روح تعارف کرانے لگیں جو صدیوں سے اس ملک میں عام طور سے کرایا جا رہا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس وقت غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں عملاً بدل ڈالنے کا کوئی سوال نہیں ہے کیونکہ ابھی تو ہم دعوت اور تعارف ہی کے مرحلے میں ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی نظریاتی تحریک اپنے پہلے مرحلے میں عملاً بروئے کار نہیں آتی۔ اس وقت سوال صرف یہ ہے کہ ہم اسلامی عقائد و نظریات کو لوگوں کے سامنے کس طرح پیش کریں اور وہ نصب العین جو جماعت اسلامی ہند کے دستور میں درج ہے۔ باشندگان ملک کے سامنے کس طرح رکھیں؟ انہیں ہم صاف صاف یہ بتائیں یا نہیں کہ ہم چاہتے کیا ہیں اور ہماری آخری منزل کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم نے اپنے دستور میں جو کچھ لکھ رکھا ہے اس کو وضاحت کے ساتھ پیش کریں ــــ حکمت کے ساتھ دعوت دینا ضروری ہے لیکن دعوت اسلامی کے کسی اہم اور ضروری جزء کو چھپا لینا یا انہیں گول مول اور غت ربود کر دینا حکمت نہیں ہے۔

فساد فی الارض کا مفہوم

(مولانا امین احسن اصلاحی)

فساد کا لفظ اردو زبان میں لڑائی دنگے، مار دھاڑ، خون ریزی، لوٹ مار، آتش زنی اور اسی طرح کے افعال و حرکات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اب تو عام طور سے یہ لفظ فرقہ وارانہ لڑائی دنگے کے لیے استعمال ہو رہا ہے لیکن قرآن میں یہ لفظ اصلاً جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ قرآن کی اس اصطلاح سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر اسلامی اور ملحدانہ نظام ہائے زندگی کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات غلط ہو کر رہ گئے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن جلد اول میں قرآن کریم کی چند آیتوں کے تحت فساد فی الارض (زمین میں فساد) کی جو توضیح کی ہے ہم اسے یہاں نقل کر رہے ہیں تاکہ قرآن کی اس اصطلاح کا صحیح مفہوم ہمارے ذہن نشین ہو سکے۔

ادارہ زندگی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (البقرۃ: ۱۱-۱۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔

تشریح لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ :- افساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرام علیہم السلام لیکر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات کا نظام تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر و قہار کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر

کے اندر کسی اور کا زور و اختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح اس کے نظامِ تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت و اطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظامِ تمدن کو خراب کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔

آگے وہ سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ کے تحت مزید توضیح کرتے ہیں:۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے۔)

قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم و نسق اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقہ پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے۔ زمین کے اصلی حکمراں کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے۔ عام اس سے کہ یہ دھینگا مشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پر امن طریقے پر۔ اس زمین کا اصلی حکمراں اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر حکمراں کی نہیں بلکہ اصل حکمراں کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدا ہی کا قانون چلے۔ اگر اس کے کسی حصہ میں بھی خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس حصہ میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور یہ چیز پوری زمین کے لیے خطرہ ہے۔

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانونِ عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرماں روائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی بھی شخص کی جان یا مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین، بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہم دگر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن ان کے جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور یکساں آزادی بخشتا ہے۔

تقریر: ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

سنّت و بدعت کی کشمکش

(ترتیب ۔ نعیم صدیقی)

ہر مسلمان کا یہ زندہ ایقان ہے کہ ہمارے لیے حقیقی عہد سعادت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کا عہد ہے۔ اس عہد کی خصوصیات اور اس کی برکات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقع تو یہ نہیں۔ کیونکہ جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اس کا اصل موضوع یہ نہیں ہے لیکن چونکہ ہماری تمام کوششوں کا ہدف اور اصل مقصود وہی عہد ہے۔ اس لیے سب سے پہلے میں مختصر طور پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس عہد کی خصوصیات اور برکات کیا تھیں۔

وحدت فکر

وحدت نصب العین

اور وحدت جماعت

اس کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ اس عہد میں ہمارے اندر پوری پوری وحدت فکر موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ کی توحید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، قرآن مجید کو اپنی زندگی کا قانون تسلیم کرنا۔ آخرت کی جواب دہی و مسئولیت کا یقین ——— یہ وہ چیزیں تھیں جن پر تمام لوگ جو اس عہد کی مسلم سوسائٹی میں شامل تھے۔ پوری طرح متحد تھے اگر کچھ فرق تھا تو اس لحاظ سے کہ ایک دیہاتی کا فہم کچھ اور تھا اور صاحب فکر کا فہم اور تھا۔ فہم کے مدارج میں ضرور فرق تھا۔ لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا کہ اللہ تعالےٰ ہے یا نہیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اصل ہدایت ہے یا نہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ کوئی ان باتوں کو مانتا ہو اور کوئی شک رکھتا ہو۔

اسی طرح دنیوی زندگی کے بارے میں ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ ایک عارضی زندگی ہے جس کے بارے میں ایک دن جواب دہی کرنی ہوگی اور اس زندگی کے نتائج آخرت میں ملیں گے اور وہی اصلی اور حقیقی نتائج ہیں۔

یہ وحدت فکر پوری مسلم سوسائٹی میں قائم تھی ——

اور پھر اس دور سعادت میں وحدت مقصد بھی تھی پوری جماعت اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کا مقصد اللہ کا کلمہ بلند کرنا، معروف کو پھیلانا اور منکر کو مٹانا ہے ایک ایک فرد

جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اس کی زندگی کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے۔ اس بارے میں بھی کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔

پھر ان لوگوں کے اندر وحدت جماعت بھی تھی۔ پوری جماعت ایک صالح اقتدار کی مطیع فرمان اور ایک مرکز سے وابستہ تھی کسی قسم کا انتشار اور تفرقہ نہ تھا۔ اور جماعت میں کوئی ابتری نہ تھی

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بحیثیت مجموعی اخلاق عامہ کا معیار بلند تھا اور احترام کی بنا اخلاق پر تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جرم اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے سرے سے تھے ہی نہیں اور اخلاقی حیثیت سے سب ایک ہی بلند ترین معیار پر قائم تھے۔ نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سواد اعظم کا اخلاق بلند تھا۔ گرے ہوئے اخلاق کے نمونے بہت ہی قلیل تعداد میں پائے جاتے تھے۔ نیز چونکہ اس دور میں قیادت کی باگیں صالح ہاتھوں میں تھیں۔ اس لیے اخلاق کے معاملے میں عوام کی نگاہیں ان پر جمتی تھیں اور یہی ان میں سے پاکیزہ ترین لوگ تھے ــــ ملک میں جو گرے ہوئے لوگ پائے جاتے تھے وہ گرے اور دبے ہوئے تھے۔ وہ آگے چلنے والے نہیں بلکہ پیچھے رہ جانے والے ہوتے تھے۔ آگے صرف وہ لوگ آتے تھے جو اخلاقی لحاظ سے بہترین اور پاکیزہ اخلاق رکھنے والے تھے۔

عہد سعادت کی برکات پھر ایک عظیم الشان برکت یہ تھی کہ اس دور میں سوسائٹی کا نظام تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے اصول پر قائم تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کا ہر وہ کام جو کیا جا رہا ہو لازم ہے اسے پروان چڑھانے میں سب کے سب شریک ہو لیکن اگر کوئی بدی پروان چڑھے تو کوئی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہو، بلکہ سب کے سب مل کر اس کے روکنے اور دبانے کے لیے زور لگائیں۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ایک ایسا صالح تمدن پیدا کیا جس میں بھلا پروان چڑھتی تھیں اور برائیاں مٹتی تھیں۔

یہ تو تھیں اندرونی برکات، لیکن جب یہ سوسائٹی اعلائے کلمۃ اللہ کے ابتدائی مراحل کو طے کر کے ملک کی اندرونی اصلاح سے فارغ ہوئی۔ تو اس کے سامنے سار دنیا کی اصلاح کا سوال آیا۔ آپ میں سے ہر شخص جا ہے کہ چند ہی سال کی مدت میں اس کے کارکن اور کار جہاں جہاں پہنچے۔ انھوں نے برائیوں کو مٹایا، بھلائیو کو پروان چڑھایا، انصاف کی حکومت قائم کی او اسی صالح تمدن کو ہر جگہ نشوونما دی جس کی برکات سے خود بہرہ یاب ہو چکے تھے۔

سنت و بدعت کی کش مکش کا آغاز

جب یہ عہد سعادت گذر گیا تو اس کے بعد مسلما کی امت دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ بدعت کا اور دوسرا اہل سنت کا۔

میں بدعت کا لفظ ان محدود معنوں میں نہیں بول رہا ہوں جن میں عام طور پر یہ بولا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے اصل معنے یہ ہیں کہ اسلام کے نظام اور اسلامی زندگی میں اسلام سے باہر کی کوئی ایسی چیز لے آنا جو اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

مدرسے کا ایک خاص نظام اور اس کی ایک خاص فضا ہوتی ہے جس کا خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کرائے اور وہاں اس کے بیٹھنے کے لیے صوفہ لا کے رکھ دے اور ایک خادم کھڑا کر دے جو اسے پنکھا جھلتا رہے تو مدرسے کے اساتذہ صاف صاف کہہ دیں گے کہ اس نظام میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں۔ یہاں کسی اجنبی چیز کو لا کر داخل کرنے کی حرکت نہیں کی جا سکتی۔ بخلاف اس کے اگر ایک لنگڑا بچہ مدرسے میں داخل ہوا تو باوجودیکہ مدرسے میں لاٹھی اور لکڑی ٹیک کر آنا قاعدے کے خلاف ہے۔ لنگڑے بچے کو اجازت دی جائے گی کہ وہ لکڑی کا سہارا لے سکے۔ کیونکہ یہ اس کی ایک حقیقی ضرورت ہے لیکن صوفے اور پنکھا جھلنے والے خادم کے لیے مدرسے کے نظم میں کوئی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی۔

اس مثال سے آپ بدعت کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ اسلام میں کسی ایسی چیز کو لا کے داخل کر دینا جو اس کے اصولوں اور اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو، بدعت کی تعریف میں آتی ہے۔ جب کہ سنت کا مطلب اس طریقے کے مطابق کام کرنا ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نظام کو قائم کیا تھا۔ اسلام میں جن معاملات کے لیے صاف صاف حکم نہ ملتا ہو ان کے بارے میں قرآن و سنت کے اصولوں کو سامنے رکھ کر کوئی حکم لگانا بدعت نہیں اجتہاد ہے اور یہ عین سنت کے مطابق ہے۔ یہی سنت کا طریقہ تھا جس پر دورِ سعادت کے لوگ قائم تھے۔

اب جب بدعت کا آغاز ہوا تو امت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔

ایک طرف اہل بدعت تھے جو بیرونی فلسفوں، بیرونی مذہبوں اور بیرونی تہذیبوں سے متاثر ہونے کے بعد باہر سے کچھ چیزیں لا کر اسلام میں کھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری طرف اہل سنت تھے جو صدق دل سے اس بات کو مانتے تھے کہ ہمارے اصول، ہمارا نظام اور ہمارا تمدن وہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے وقت میں تھا۔ اس گروہ کی پوری کوشش یہ تھی کہ زندگی ٹھیک انہی اصولوں پر قائم رہے جو رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے دیے تھے۔

بدعت انتشار کا اصل سبب

ان دونوں گروہوں میں کشمکش بنی امیہ کے دور میں شروع ہو گئی اور آج تک چلی آ رہی ہے۔

بنو امیہ نے ملوکیت اور قیصریت کی بدعت کو لا کے

اسلام میں داخل کر دیا۔ اہل سنت نے اسے روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ کوڑے کھائے، بال بچے کٹوا دیے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ تاکہ بدعت کا یہ سیلاب پھیلنے نہ پائے۔ پھر آگے چل کر بنو عباس کے زمانے میں بیرونی فلسفے و بیرونی مذاہب اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات داخل ہونے شروع ہوئے۔ اہل بدعت وہ سارے کام کرنے چاہتے تھے جن سے اسلامی زندگی مسخ ہو۔ دوسری طرف اہل سنت برابر کوشش کرتے رہے کہ بدعتوں کے دروازے بند ہوں اور صحیح اسلام اپنی اصلی صورت میں قائم رہ سکے۔

اسلامی سوسائٹی میں بدعت کا ظہور اصل سبب انتشار ہے۔ لفظ انتشار اجتماع کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں اجتماع کی بنیاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قرآن کے اتباع اللہ تعالے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کے حجت ہونے پر ہے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو اس بنیاد سے ہٹانے والی ہو سبب انتشار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کے فضل سے مسلمان کبھی بدعت پر جمع نہیں ہوئے۔ گمراہیاں ضرور پھیلیں لیکن یہ بات کبھی نہیں ہوئی کہ ساری امت بدعت پر جمع ہو جائے۔ امت کی اکثریت اور اس کا سواد اعظم ہمیشہ سنت کو پسند کرتا رہا۔ اپنے سارے بگاڑ کے باوجود مسلمانوں نے بدعت کو کبھی پسند نہیں کیا۔ آج بھی دیکھ لیجیے کہ اگرچہ ملت کی تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہ، بڑے بڑے سپہ سالار اور جرنیل اور بڑے بڑے امیر اور دولت مند گزر چکے ہیں لیکن کیا ان میں سے کسی کی عقیدت بھی مسلمان عوام میں اس درجے کی ہے جیسی امام ابو حنیفہؒ امام احمد بن حنبل رح امام مالکؒ امام شافعیؒ اور شاہ ولی اللہ رح جیسے ائمہ کی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بڑی دردناک ہے کہ اگرچہ ہماری اکثریت ہمیشہ بدعت پیدا کرنے والوں پر ناک بھوں چڑھاتی رہی ہے ہمارے اندر معاشی اور سیاسی اقتدار کی باگیں صدیوں سے اہل بدعت کے ہاتھوں میں چلی آرہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظام زندگی درست ہو کر عہد سعادت کی طرف نہ پلٹ سکا۔ (ماخوذ از "آئین")

(بقیہ صفحہ ۵۵) بڑے حسنِ مظہر کا ادراک انسان کس طرح کرے گا یہ بات آخرت ہی میں معلوم ہو سکتی ہے

(۳) جس طرح توحید تمام عقائد و اعمال کی اصل الاصول ہے اسی طرح رضائے الٰہی آخرت کی تمام کامیابیوں اور نعمتوں کی اصل ہے جنت کو مقصود بنانا اسی اصل کی ایک فرع ہے۔

(۴) رضائے الٰہی کو محض ذریعہ کی حیثیت دینا اور جنت کو مقصود اصلی قرار دینا غلط ہے اس خیال کی اصلاح ہونی چاہیے البتہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ جنت کو مقصود بنانا در اصل رضائے الٰہی کو مقصود بنانے کے مترادف ہے تو اس کا خیال صحیح ہے

حضرت موسیٰ ؑ کی طرف شرک کا انتساب

(جناب محمد ذکی شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

موسیٰ علیہ السلام کے حالات کے لیے قدیم ترین اور اہل کتاب کے نزدیک سب سے زیادہ مستند ماخذ بائیبل ہے۔ اس میں ان کے بارے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

اب سے تقریباً تین ہزار سال پہلے، جبکہ مصری تہذیب اپنے عروج پر تھی، ہر طرف فراعنۂ مصر کی بادشاہت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اسی دور میں وہاں بنی اسرائیل غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم ہو رہے تھے۔ ان کو کمزور و محکوم رکھنے کے لیے فرعون وقت نے متعلقہ لوگوں کو ہدایات جاری کر دی تھی کہ ان میں جو بھی لڑکا پیدا ہو، اسے قتل کر دیں۔ اگر لڑکی ہو تو اسے چھوڑ دیں۔ ان حالات میں ایک اسرائیلی کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ کچھ دنوں تو ماں چھپا کر پالتی رہی لیکن جب اسے بچے کی جان کا خطرہ ہوا تو اسے ٹوکرے میں رکھ کر دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ ٹوکرا بہتا بہتا شاہی محل تک پہنچا جہاں بادشاہ وقت (فرعون) کے گھر والوں نے اٹھا لیا اور محل کی ایک خاتون کی سفارش پر شاہی نگرانی میں اس کی پرورش ہونے لگی۔ اسی کا نام موسیٰ رکھا گیا۔

اس طرح موسیٰ ؑ پل کر جوان ہو گئے۔ ایک دن بستی میں انھوں نے دیکھا کہ ایک مصری ان کے ہم قوم (عبرانی) کو مار رہا ہے۔ انھوں نے اس مصری کو قتل کر دیا اور جب راز فاش ہو گیا تو فرعون کے ڈر سے مصر چھوڑ کر مدین چلے گئے اور وہاں کے کاہن کے پاس رہنے لگے اور وہاں ہی کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔

ایک دن اپنے خسر کی بکریاں چراتے ہوئے موسیٰ "خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک" آنکلے وہاں خداوند نے ان سے اس طرح کلام کیا۔

میں تیرے باپ کا خدا یعنی ابرہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں.....

میں نے اپنے لوگوں کی تکلیف جو مصر میں ہیں خوب دیکھی..... اور میں اترا ہوں کہ ان کو مصریوں

کے ہاتھ سے چھڑاؤں اور اس ملک سے نکال کر ان کو ایک اچھے اور وسیع ملک میں جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے یعنی کنعانیوں اور حتیوں اور اموریوں ...... کے ملک میں پہنچاؤں .... سو اب آ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو میری قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے ...... تب موسیٰ نے خدا سے کہا جب میں بنی اسرائیل کے پاس جا کر ان کو کہوں کہ تمہارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور وہ مجھے کہیں کہ اس کا نام کیا ہے؟ تو میں ان کو کیا بتاؤں؟ خدا نے موسےٰ سے کہا۔ میں جو ہوں سو ہوں۔ سو تو بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ میں جو ہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے ......

اس کے بعد خداوند نے موسےٰؑ کو دو معجزے عطا کیے یعنی لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ان کے ہاتھ کا "کوڑھ" سے برف کی مانند سفید ہو جانا پھر کہا تو فرعون سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے اور میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کرے۔

چنانچہ موسےٰؑ فرعون کے پاس گئے اور کہا۔ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لیے عید کریں۔ فرعون نے کہا خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات کو مان کر بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور میں بنی اسرائیل کو جانے بھی نہیں دوں گا۔ تب انھوں نے (یعنی موسےٰ اور ہارون نے) کہا کہ عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے ......

پھر خدا نے موسیٰ سے کہا میں خداوند ہوں۔ اور میں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب کو خدائے قادر مطلق کے طور پر دکھائی دیا لیکن اپنے یہوواہ نام سے ان پر ظاہر نہیں ہوا۔ اور میں نے ان کے ساتھ اپنا عہد بھی باندھا ہے کہ ملک کنعان جو ان کی مسافرت کا ملک تھا اور جس میں وہ پردیسی تھے ان کو دوں گا

قصہ مختصر یہ کہ فرعون نے موسےٰؑ کی بات نہیں مانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خداوند نے طرح طرح کی بلائیں مصریوں پر نازل کیں مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر ایک دن بنی اسرائیل مصریوں کے زیورات لے کر فرار ہو گئے۔ فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، سامنے سمندر اور پیچھے فرعون کی فوجیں دیکھ کر بنی اسرائیل گھبرا گئے۔

تب موسےٰ نے لوگوں سے کہا .... خداوند تمہاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے ...... خداوند نے موسےٰ سے کہا .... تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اس کے دو حصے کر۔

اس طرح سمندر کے دو حصے ہو گئے۔ بنی اسرائیل پار اتر گئے۔ فرعون اپنے لشکروں کے ساتھ پیچھا کرتا رہا اور پھر سمندر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا۔ فرعون اور اس کے چیدہ چیدہ سپاہی غرق ہو گئے۔ موسےٰؑ کے خسر نے جب یہ روداد سنی تو پکار اٹھے :-

اب میں جان گیا کہ خداوند سب معبودوں سے بڑا ہے۔[1]

بائیبل کے مذکورہ بالا بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ موسےٰؑ مشرک تھے کیونکہ ان کا زور دے کر بار بار یہ کہنا کہ بنی اسرائیل کے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔ عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ بنی اسرائیل کا معبود اور ہے اور فرعون اور دوسری قوموں کے معبود اور ہیں۔ چنانچہ ان کے خسر نے یہ بات بھی واضح کر دی تھی یہ کہہ کر (اسرائیلی) خداوند سب سے بڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی علماء میں جو اہل الرائے ہیں اور جنھوں نے بائیبل کا بہت گہرا اور عمیق مطالعہ کیا ہے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :-

ابتدا میں یہود آفتاب پرستی کے علاوہ بہت سے مختلف جانوروں مثلاً بیل بھیڑ اور سانپ وغیرہ کی عبادت کرتے تھے[2] ان کا مشہور معبود یہواہ دراصل گلہ بانی کا دیوتا تھا، کنعانی ماحول میں زراعت کی نگرانی بھی اس کے سپرد کر دی گئی[3] بعض کے نزدیک یہ کنعان کا گرج کا دیوتا تھا جسے یہودیوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا[4] ایک رائے یہ ہے کہ یہ موسےٰؑ کے خسر کے قبیلے کا دیوتا تھا اور موسیٰ نے بھی اس کی عبادت کی دعوت دی تھی[5]

اس معبود کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے :-

یہ ایک قسم کا جنگ پسند دیوتا ہے جس کا علم محدود ہے، جو غلطی کر سکتا ہے، جو آدم کو پیدا کر کے پچھتایا، جو لالچی اور خون آشام ہے، جو دھوکے فریب کو گوارا کر لیتا ہے جس کا ضمیر ڈانواڈول رہتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک پادری کا سیاسی معاملات میں رہتا ہے، جو بہت با قوت ہے جنگ میں اپنے پجاریوں کی مدد کرتا ہے۔ رب الافواج ہے جو مدتوں کی شکست خوردگی، سیاسی محکومی اور اخلاقی ترقی کے بعد باپ کے روپ میں آیا جو حمد پسند ہے، وحشیانہ افعال کراتا ہے، آباء کے جرموں کی سزا ان کی اولاد کو دیتا ہے، جس کو

[1] ملاحظہ ہو بائیبل (اردو ترجمہ) خروج باب ۱ تا ۱۵

[2] A Servey of westerin civil is ation, H.E. Burnes. P.82

[3] The harper history of civiligation, J.W. Swain, P.84

[4] Our oriental heritage, will durant, P.310

[5] A Survey ......, P.82

غصہ کی حالت میں موسےٰؑ سمجھاتے ہیں اور وہ نادم ہوتا ہے جو بیٹے کی بے رحمانہ قربانی کا مطالبہ کرتا ہے جس کو ابراہیمؑ اخلاقی اصول سکھاتے ہیں۔ شروع میں یہودی یہوواہ کے علاوہ اور بھی معبودوں کو مانتے تھے۔ موسےٰؑ اور سلیمانؑ کے اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی یہوواہ کو صرف سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ [1]

علمائے بائیبل کی تشریحات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ موسےٰ بہت سے معبودوں کے قائل تھے۔ صدیوں تک بائیبل کو الہامی کتاب ماننے والے اسی نظریے کو صحیح تسلیم کرتے رہے کیونکہ اس سے نسلی برتری اور قومی عصبیت کے جذبات کو ہوا ملتی تھی لیکن جب سے عقلیت کا دور شروع ہوا خود علمائے اہل کتاب نے اس پر اعتراضات کرنے شروع کر دیے اور اس سائنٹفک دور میں جبکہ ہر چیز کو عقل کے معیار پر دیکھا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ تعدد الٰہ (بہت سے خداؤں) کے تصور کو قطعاً غلط اور بے بنیاد سمجھتے ہیں اور "قومی خدا" کے عقیدے کو تنگ نظری پر محمول کرتے ہیں۔ چنانچہ مغربی دانشوروں کے طبقہ نے اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا اور بائیبل پر تنقیدی نظر ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ نے ایسی ہی باتوں کی بنا پر بائیبل کو آسمانی یا الہامی کتاب ماننے سے انکار کر دیا لیکن "قدامت پسند" گروہ نے بائیبل کو بچانے کی خاطر

[1] Our Oriental Heritage. 31.

یہ اعلان کیا کہ اس میں تعدد الٰہ کی تعلیم نہیں بلکہ ایک ہی خدا (توحید) کی تعلیم ہے۔ کیونکہ بائبل کے اوپر کے بیان اور اس کی تشریح کو دنیا میں کسی بھی قوم کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک غیر اسرائیلی پر اس کا ردعمل یہ ہوگا کہ اسے "اسرائیلی خداوند" سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی بلکہ وہ چاہے گا کہ اس کے "قومی خدا" کا غلبہ تسلیم کیا جائے اور اگر ہر قوم اسی نظریے پر کاربند ہو جائے تو قومی خداؤں کی کش مکش کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو جائے گا۔ پھر کیا لوگ یہ نہیں پوچھیں گے کہ "عبرانیوں کا خداوند" دوسرے معبودوں سے کس بنا پر بڑا ہو گیا۔ کیا یہ کائنات بہت سے خداؤں نے بنائی ہے، کیا اس پر بہت سے خداؤں کی فرماں روائی ہے، کیا "عبرانی خداوند" کائنات کے کسی بڑے یا اہم حصہ کا مالک ہے؟ نیز بنی اسرائیل سے پہلے جو لوگ دنیا میں آباد تھے ان کا معبود کون تھا؟ اسی طرح کے بے شمار سوالات کیے جا سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے ان کے جوابات نہ تو بائبل دے سکتی ہے نہ ہی اس کے ماننے والے دے سکتے ہیں۔ اس لیے اہل کتاب کے ایک گروہ نے بائبل کی اصل تعلیمات سے چشم پوشی کرتے ہوئے (درحقیقت اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے) "ایک خدا" پر عقیدہ کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہ عقیدہ بہت سے اہل کتاب کا تو ہو سکتا ہے، بائبل میں نہیں ملتا۔ لہٰذا جو شخص بھی بائبل سے موسیٰؑ کی داستان سنائے گا اسے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ وہ بہت سے

خداؤں کے قائل تھے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موسےٰ کا قصہ اہل کتاب سے سنکر قرآن میں داخل کر دیا۔ جیسا کہ مغربی مورخین کا دعویٰ ہے، تو قرآن میں بھی ان کی وہی حیثیت ہونی چاہیے جو بائبل میں ہے اور وہی عقائد منسوب ہونے چاہییں جو بائبل میں ہیں۔ آئیے دیکھیں قرآن میں وہ شرک کے علمبردار نظر آتے ہیں یا توحید کے مبلغ، کیونکہ یہی مسئلہ سارے قصہ کی جان ہے

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ (جب موسےٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے تو انہیں پکارا گیا:۔

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ میں ہی تیرا رب ہوں ۔

پھر فرمایا:۔

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي

میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر۔

بائبل تو بتاتی ہے کہ موسےٰ بہت سے خداؤں کے قائل تھے، اور قرآن بتاتا ہے کہ وہ توحید کے علمبردار تھے یعنی ان کا یقین تھا اور اسی کی دعوت انھوں نے دی کہ اس کائنات میں کوئی چھوٹا یا بڑا معبود ہے ہی نہیں سوائے اللہ کے۔

اگر کوئی بائبل سے نقل کرے تو یوں کہے گا کہ خداوند نے موسےٰ سے کہا

"تو فرعون سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا ہے، بلکہ میرا پہلوٹھا ہے"

چنانچہ انھوں نے فرعون سے کہا کہ:۔

"خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے"

اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارونؑ سے فرمایا کہ:۔

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ
فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۞

(طٰہٰ ع ۲)

جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے۔

چنانچہ جب وہاں پہنچے تو یہ بھی اعلان کر دیا:۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ
مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (اعراف ع ۱۳)

موسےٰ نے کہا "اے فرعون! میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔

اس کے بعد فرعون سے جو مکالمہ ہوا وہ اگر بائبل سے لیا گیا ہوتا تو یوں ہوتا:۔

فرعون نے کہا۔ خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات کو مان کر بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور میں بنی اسرائیل کو جانے بھی نہیں دوں گا۔ تب انھوں نے کہا کہ عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے۔ (خروج ۵، ۳)

لیکن قرآن کریم میں اس کے بالکل برعکس ہے —

فرعون نے کہا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے
اے موسےٰ!

موسےٰ نے جواب دیا۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا"

فرعون بولا۔" اور پہلے جو نسلیں گزر چکیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟"

موسےٰ نے کہا۔" اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چوکتا ہے، نہ بھولتا ہے۔ (طٰہٰ ۲۶)

فرعون نے کہا۔" اور یہ رب العلمین کیا ہوتا ہے؟"

موسےٰ نے جواب دیا۔" آسمانوں اور زمین کا رب اور ان چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں اگر تم یقین لانے والے ہو۔

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا" سنتے ہو؟"

موسیٰ نے کہا۔" تمہارا رب بھی، اور تمہارے ان آباؤ اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔"

فرعون نے (حاضرین سے) کہا" تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔

موسےٰ نے کہا" مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں (الشعراء ۲۶)

بائبل کی مذکورہ بالا چند سطریں اور قرآن کی یہ چند آیات کسی جاہل سے جاہل اور احمق سے احمق آدمی کے سامنے بھی پڑ جائیں تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں جگہ ایک ہی بات کہی گ کجا یہ کہنا کہ قرآنی آیات کا مضمون بائبل سے ماخوذ ہے معلوم نہیں ایسا دعویٰ کرنے والوں نے اس حقیقت پر کبھی ت ہے اور اگر یہ فرق ان کے ذہن میں بھی واضح رہا ہے ا بھی یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ موسےٰ کا قصہ بائبل سے قرآن میں ہوا ہے تو پھر تعجب ہی تعجب ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں بائبل میں جو کچھ کہا گیا ہے اور علماء نے جو شرح کی ہے اس کی اشاعت تو درکنار خود ا کتاب اس پر ایمان رکھنے کا بھی اعلان نہیں کر سکتے۔ ک جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے اتنے اعتراضات ہوں کہ جواب دینا مشکل کیا ناممکن ہو جائے گا۔ اب صرف راستہ رہ جاتا ہے کہ بائبل کے بیانات سے چشم پوشی کہہ دیا جائے کہ موسےٰ[۲] ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے اسی کی تعلیم دوسروں کو بھی دیتے تھے[۱] اور یہ کہ ان ماننے والے بھی ایک ہی خدا کے قائل ہیں۔ لیکن یہ تو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس صورت میں لوگ سکتے ہیں___

ایک خدا سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد خدا کائنات ہے، جو تنہا پوری کائنات کا مالک و فرماں ر جس کی ذرہ ذرہ پر حکومت ہے، جو سارے عالم کا پر

[۱] اگر حقیقت یہی ہے اور قرآن کا بیان زیادہ وا معقول ہے تو قرآن نے بائبل کے بیان کی نقل کی ہے یا تصحیح

ہے جو اپنی مخلوق کے ہر حال سے باخبر ہے، جو حکیم ہے، جس کا ہر کام عین حکمت کے موافق ہوتا ہے جس کے کسی کام میں کوئی نقص و عیب نہیں، جو کوئی کام بلا مقصد اور بے کار نہیں کرتا ہے، جو اپنی مخلوق پر مہربان ہے، جو کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتا، جس کے سوا کائنات میں کوئی اس کا مستحق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اگر ایک خدا کا یہی تصور ہے تو۔

کیا موسےٰ علیہ السلام کو اسی نے اپنا پیغمبر بنایا تھا؟ اگر موسےٰ خالق کائنات کے رسول تھے، تو کیا ان سے پہلے بھی اس نے کسی کو رسول بنایا تھا؟ اگر نہیں بنایا تو کیا ان سے پہلے کسی بھی قوم کی اصلاح کی ضرورت نہیں ہوئی؟ اگر ان سے پہلے بھی رسول مقرر کیے گئے تھے تو ان میں سے چند کے نام، اور ان کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بتایا جا سکتا ہے؟

رسولوں کی پہچان کیا رہی ہے؟ اگر "عصا" اور "ید بیضا" ہی کو معیار مانا جائے تو کیا ان سے پہلے جتنے رسول آئے سب کو یہی معجزات دیے گئے تھے؟ اگر نہیں تو انہیں کس بنا پر رسول مانا جائے؟ کیا دنیا کی ہر قوم میں رسول آئے ہیں یا صرف دنیا کے ایک مخصوص خطہ اور قوم میں آتے رہے ہیں؟

توحید اور موسےٰ علیہ السلام کی رسالت کا اقرار کرتے ہی ایسے بے شمار سوالات کی یلغار ہو جائے گی، اگر اہل کتاب نے ان پر سنجیدگی سے غور کیا اور صحیح سمت اختیار کی تو انہیں بہت جلد احساس ہو جائے گا کہ وہ ایک ایسے راستے پر آ گئے جو بالکل فطری ہے۔ جہاں نسلی برتری، قومی عصبیت، تنگ نظری، قوم پرستی اور فرقہ پرستی کی ساری بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی کی وسیع شاہراہ ان کے سامنے ہوگی۔ انہیں ایسا محسوس ہونے لگے گا کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے، وہی رب العٰلمین ہے سب انسان اسی کے محتاج ہیں۔ اس نے سب ہی انسانوں کو صحیح راہ دکھائی ہے، سب ہی قوموں میں رہنما بھیجے ہیں۔ اور جس نظام حیات میں یہ باتیں پائی جائیں گی وہ یقیناً ایک عالمگیر نظام حیات ہوگا۔ ایسے فطری راستہ اور نظام حیات سے جو لوگ کتراتے ہیں تو اس لیے کہ اس کا نام اسلام ہے، یا اس کے ماننے والے مسلمان کہلائے جاتے ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کی نسلی یا قومی برتری ختم ہو جائے گی، انہیں تنگ نظری کی جگہ وسیع النظری سے کام لینا پڑ جائے گا، انہیں تسلیم کرنا پڑ جائے گا کہ سچائی کسی مخصوص نسل یا قوم کی میراث نہیں۔ انہیں ماننا پڑ جائے گا کہ دنیا کے سارے انسان پروردگار عالم کی رحمتوں سے نوازے گئے ہیں، سب ہی قوموں میں ہادی اور پیغمبر بھیجے گئے ہیں۔ اس کائنات کے انسانوں کے بہت سے فرضی معبود کر بنا کر انہیں تقسیم نہیں کیا جا سکے گا۔ اور اپنے قومی خداؤں کے نام پر دوسری قوموں پر حکومت نہیں کی جا سکے گی۔ ایسی ہی بہت سی چیزیں ہیں جو نظر میں وسعت پیدا نہیں ہونے دیتیں۔

ایسے لوگ بہت سے خداؤں اور توحید کا اقرار و انکار اس طرح کرتے ہیں کہ کسی ایک کے بھی تقاضے پورے نہ کرنے پڑیں اور دوسرے مذاہب پر اس لیے نکتہ چینی کرتے ہیں کہ لوگ اپنے دماغ میں محفوظ رکھیں وہ ان کے پاس جو کچھ ہے اس پر پردہ پڑا رہے

تحریک اسلامی اور ہماری خواتین

(جناب احسن مستقیمی، ناظم میرٹھ ڈویژن)

(یہ تقریر فیروزآباد کے خواتین کے ایک اجتماع میں کی گئی)

ماؤ اور بہنو!

جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کا پیغام روئے زمین پر بسنے والے تمام بندگان خدا کے لیے ہے۔ خواہ وہ کسی قوم نسل اور زبان سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت کی دعوت اور اس کا پیغام ٹھیک وہی پیغام اور دعوت ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے بھیجا ہے۔ چونکہ سارے انسان اسی ایک خدا کے بنائے ہیں اس لیے اس کا پیغام بھی سارے انسانوں کے لیے ہے۔

جماعت اسلامی کی دعوت

جماعت اسلامی ساری دنیا کے انسانوں کو بالعموم اور بھارت کے باشندوں کو بالخصوص جو دعوت دیتی ہے وہ یہ کہ اس پوری کائنات اور اس کے ایک ایک جزء کا مالک، خالق اور حاکم اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہ پوری کائنات اور اس کی ایک ایک شے اسی کے قانون اور ضابطے کی پابند ہے۔ حتیٰ کہ خود انسان بھی اور اس کے جسمانی نظام کا ایک ایک کل پرزہ اسی کے بنائے ہوئے ضابطے میں جکڑا ہوا ہے۔ البتہ دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو خداوند قدوس نے سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی آزادی دے رکھی ہے۔ انسانی فطرت کا یہ عین تقاضا ہے کہ انسان اپنی اس مختصر سی آزادی کو تابع امر رب بنادے یعنی وہ اپنی اختیاری زندگی میں بھی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی کا تابع فرمان ہو۔ عبادت اور اطاعت صرف اللہ ہی کی ہو۔ دین اسلام اسی احکم الحاکمین کے پسندیدہ اور نازل کردہ نظام اطاعت کا نام ہے۔ قرآن حکیم اور سنت رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) ہدایات الٰہی کو معلوم کرنے کے دو اولین اور اہم ترین ذرائع ہیں۔ جماعت اسلامی کی دعوت یہی ہے کہ انسان خدا کے اس پیغام کو سمجھے، اس کے دین سے خاطر خواہ واقف ہو اور مخلصانہ

طور پر اسی کی اطاعت و فرماں برداری میں اپنی پوری زندگی بسر کرے ۔ اگر کائنات کا ایک اہم جزو انسان بھی اطاعت الٰہی کو اپنی زندگی کا نظام بنالیتا ہے اور اپنی مرضی اور پسند وناپسند کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے تو پوری کائنات میں ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے ۔ حضرت آدم علیہ السلام خدا کے اطاعت گذار اور تابع دار تھے ۔ لائق باپ کی اولاد بھی لائق اولاد اسی وقت ہوگی جبکہ یہ بھی خدا کی اطاعت گذار ہو ۔ اسی صورت میں وہ اپنے باپ کی وراثت (جنت) کی جائز وارث قرار پائے گی ۔

جماعت اسلامی اس حقیقت پر پختہ یقین رکھتی ہے اور دوسرے انسانوں کے سامنے بھی پورے وثوق کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ ایک ایسا وقت آئے گا جبکہ یہ وجود عدم میں تبدیل ہوجائے گا ۔ کائنات کا یہ سارا نظم درہم برہم ہوجائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ سارے انسانوں کو اپنے دربار میں طلب فرمائے گا اور ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی ۔ وہاں پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس طرح گذاری ۔ جوانی کے ایام کس طرح بسر کیے ، اس کی آمدنی کے ذرائع کیا تھے اور صرف کے راستے کیا رہے ۔ جن حقائق کا علم اسے ہوا تھا اس کے مطابق اس نے اپنے عمل کو آراستہ کیا یا نہیں ۔ اس طرح وہ لوگ خداوند قدوس کے دامن رحمت میں جگہ پائیں گے ۔ انہیں اس کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی جن کی زندگیاں تابع امر رب بنکر بسر ہوئی ہونگی اور جو خدا کے باغی اور نافرمان رہے ہوں گے ، ان کی وہاں پکڑ ہوگی اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے

جماعت اسلامی کو اس حقیقت پر بھی یقین ہے جسے وہ باشندگان ملک کو ذہن نشین کرانا چاہتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے انسان کی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعے رہنمائی فرمائی ہے ۔ اس طرح ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کے اندر خدا کے رسول اور پیغمبر آئے ہیں اور اپنی قوم اور باشندگان ملک کے سامنے انھوں نے خدا کے پیغام اور اس کے دین کو پیش کیا ہے ۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سلسلہ رسالت کی آخری کڑی ہیں ۔ آپ صرف عرب کے یا صرف مسلم قوم کے پیغمبر نہیں بلکہ تمام اولاد آدم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ۔ آپ کی تعلیم سارے انسانوں کے لیے ہے ۔ آپ نے ان تعلیمات کو جو خدا کی طرف سے مختلف ادوار میں اور مختلف قوموں اور ملکوں میں اس کے پیغمبر اور رسول پیش کرتے رہے ہیں جامع اور مکمل شکل میں رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے پیش فرمایا ہے ۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے جس دین کو پیش فرمایا ہے عربی زبان میں اسے دین اسلام کہتے ہیں اسلام خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کو کہتے ہیں ۔

دین اسلام کا مطلب خدائی اطاعت اور فرماں برداری کا وہ کامل اور جامع نظام حیات ہے جسے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا والوں کے سامنے پیش فرمایا ۔ آج کی دنیا میں یہی وہ واحد نظام اطاعت ہے جو ہر پہلو سے کامل اور جامع ہے ۔ مستند ، نقائص سے پاک اور آفاقی ہے ۔

قابل عمل اور لائق نفاذ ہے۔ یہی وہ واحد دین ہے جو آج سے تیرہ سو سال قبل اپنی پوری آن بان کے ساتھ غالب و نافذ ہو چکا ہے اور دنیائے انسانیت کو یہ ٹھوس ثبوت فراہم کر چکا ہے کہ یہی دین انسان کے تمام الجھے ہوئے مسائل کا واحد حل ہے۔ یہی انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا ہے۔ یہی تمام امراض انسانی کے لیے واحد نسخہ شفا ہے یہی دین فرد کی تربیت و تزکیہ، سماج کی صحتمند تعمیر اور ریاست کی ارتقا پذیر تشکیل کر سکتا ہے۔ اسی کے غلبہ و نفاذ سے انسانی معاشرہ امن و مسرت کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

خواتین محترم! خدا کا یہ دین تقاضا کرتا ہے کہ جو لوگ اسے قبول کریں بے کم و کاست مکمل طور پر قبول کریں اس میں کسی طرح کی کانٹ چھانٹ اور حصے بخرے نہ کریں۔ بنی اسرائیل نے خدا کے دین کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کیا کہ وہ کتاب الٰہی کے ان حصوں کو لے لیتے تھے جو انہیں مرغوب تھے اور ان حصوں کو چھوڑ دیتے تھے جو ان سے محنت، جاں فشانی اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتے تھے۔ اپنی اس روش کا انہیں یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ خدا کا دین اپنے ماننے والوں سے یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسے تمام بندگان خدا کے سامنے پیش کریں۔ اپنے قول و فعل اور اپنی انفرادیت و اجتماعیت کے ذریعہ اس دین کی شہادت دیں اور مل جل کر اس کی اقامت اور اس کے غلبہ و نفاذ کے لیے اجتماعی طور پر سرگرم عمل ہوں۔

چونکہ دین اسلام اس روئے زمین پر ایک ہی جامع اور مستند دین ہے اس لیے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسانی زندگی اور انسانی سماج و ریاست کا دین قرار پائے اس کی نگاہ میں دوسرے تمام ادیان و نظریات سر تا سر باطل اور مہلک انسانیت ہیں۔

کسی بھی ملک کے اندر اسلام کے علمبرداروں اور اس کے نام لیواؤں کے قیام کا واحد منشا یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ وہ اس ملک کے تمام باشندوں کو خدا کے دین سے آگاہ کریں اور خود ان کی زندگی مجموعی طور پر دین اسلام کی ترجمان ہو۔ الله کا رنگ ہو یعنی ان کی معاشرت و معیشت، ان کی انفرادیت و اجتماعیت ان کی سیاست و حکومت سب کچھ خدا کے دین کی شاہد اور ترجمان ہو۔ مسلم گروہ فی الحقیقت کوئی قومی گروہ نہیں، بلکہ ایک اصولی گروہ ہے۔ وہ کسی قوم کا ذیلی نہیں، بلکہ دین حق کا شاہد ایک داعی گروہ ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ لادینی نظام و نظریات سے مصالحت کی روش اختیار کرے۔ وہ حقوق کا بھکاری نہیں بلکہ حقوق کو ادا کرنے والا ہے۔

ماؤ، بہنو اور بیٹیو! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے ..کسی مسلمان کو انکار کی مجال نہیں ہے۔ آپ کسی بھی مسلمان سے دریافت کریں کہ کیا دین اسلام ایک مکمل، جامع اور خدا کا پسندیدہ دین ہے؟ کیا یہی دین حق ہے اور دوسرے تمام ادیان باطل ہیں؟ کیا دین اسلام ہی لائق عمل ہے؟ کیا روئے زمین پر غلبہ و نفاذ کا جائز حقدار دین اسلام ہی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی

ہے اور یہ کسی اور نظام اطاعت سے مصالحت کا قائل نہیں ہے؟ اور کیا یہ انسان کی پوری زندگی کا طالب نہیں ہے؟ اور کیا مسلمان کا نصب العین فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی نہیں ہے۔ کیا مسلمان ایک داعی گروہ نہیں ہیں؟ دین سے واقف اور مخلص ایک بھی مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو ان سوالات کا جواب اثبات میں نہ دے۔ اس کے باوجود آپ دیکھ رہی ہیں کہ آج نیچے سے اوپر تک مسلم قوم کی حالت کیا ہے؟ جماعت اسلامی کے قیام کا واحد منشا یہی ہے کہ ایک ایسی تنظیم اس ملک کے اندر ابھرے اور پروان چڑھے جو ہر پہلو سے اسلام کی ترجمان ہو اور غیر اسلامی افکار و نظریات اور باطل نظامہائے حیات کا ابطال و استیصال کرے۔

یہ تحریک بفضلہ تعالیٰ اس ملک میں سرگرم رول ادا کر رہی ہے مگر جب تک اس کا نصف حصہ، یعنی خواتین اس کے ساتھ نہ ہوں، یہ تحریک اپنی کامیابی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ دورِ اول میں جہاں مردوں نے اس تحریک کی اپنے خون پسینے سے آبیاری کی وہیں خواتین بھی بعض پہلوؤں سے اس راہ میں مردوں پر سبقت لے گئیں۔ اگر آپ مکی دور کا مطالعہ فرمائیں اور مدنی دور کے حالات سے حاصل کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دورِ اول میں اصل کش مکش اسی ایک بات کی تھی کہ انسانی زندگی میں اطاعت خدا کی ہو یا انسان کی۔ عبادت کا جو محدود مفہوم آج کے دور میں رائج ہے اس مفہوم کی حامل عبادت کی اس وقت کوئی نزاع نہ تھی اس وقت جو عبادت باعثِ نزاع تھی وہ وہی تھی جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے جس میں اطاعت شامل ہے جو عبادت خانے کی چہار دیواری میں محصور نہیں ہے۔ سردارانِ قریش کو اندیشہ تھا کہ اس تحریک و دعوت کو اگر فروغ حاصل ہوگیا تو ان کی سرداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ بندگانِ خدا کی گردنیں ان کے طوقِ غلامی سے آزاد ہو جائیں گی۔ شرک و کفر، لات و منات اور عزیٰ و ہبل کو اس دور میں جو سیاسی اہمیت حاصل تھی وہی اہمیت آج وطن، قوم، سیکولرزم، سوشلزم وغیرہ کو حاصل ہے۔ تصورِ اطاعت و عبادت آج بھی وہی ہے جو تیرہ سو سال قبل رہا ہے۔ جو شرک اس وقت تھا وہی آج بھی ہمارے سماج میں کارفرما ہے۔ فرق اگر ہے تو "قالب کا ہے" نہ کہ روح کا۔ اس لیے یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اگر آج بھی دین اسلام کو اس کی اپنی اصلی شکل میں پیش کیا جائے، اگر آج بھی توحید و رسالت اور آخرت کے تصور کو بے آمیز طور پر سامنے لایا جائے تو یہ ناممکن ہے کہ موجودہ فضا کے اندر ارتعاش پیدا نہ ہو۔ اسلام کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے اور جاہلیت کا اپنا ایک مخصوص مزاج، دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ شرک اور توحید پر امن طور پر ساتھ رہ سکیں۔ اسلام اور جاہلیت، باہم مصالحت کرلیں۔ اگر ایسا ہوگا تو توحید بے جان ہوگی اور اسلام بے روح۔ اگر انگاروں میں حدت نہیں تو یہ انگارے نہ ہوں گے، بجھے ہوئے کوئلے ہوں گے جنہیں

انکار سے تصور کیا جا رہا ہوگا۔

دور اول میں حق و باطل کی جو کش مکش پیدا ہوئی اس میں خواتین نے کیا رول ادا کیا اس کی تفصیلات تو آپ اسوہ صحابیات کے مطالعہ سے حاصل کر سکتی ہیں یہاں میں اختصار کے ساتھ چند خواتین کا ذکر کروں گا جو اس محاذ پر پیش پیش تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں یہ شرف ایک خاتون کو حاصل ہوا کہ وہ ایمان لانے والوں میں سر فہرست ہے۔ پھر آپ نے نبی آخر الزماں صلعم کے ساتھ بھرپور تعاون اور حوصلہ افزائی میں جو رول ادا کیا وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ جن لوگوں نے اس وقت اپنے ایمان و اسلام کا اعلان کیا تھا کہ اعلان کرنا آلام و مصائب کے عظیم طوفان کو دعوت دینے کے ہم معنی تھا۔ ان کی تعداد سات تھی اور ساتواں نمبر حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ کا تھا۔ یہی وہ اول خاتون تھیں جنھوں نے سب سے پہلے راہ حق میں جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن کا مشہور واقعہ جو بعض روایات کی رو سے خود حضرت عمرؓ کے مشرف باسلام ہونے کا محرک ثابت ہوا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اگر خواتین دین اسلام پر جم جائیں تو وہ اپنے شوہر، بھائی، والدین ہر ایک پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ واقعہ یہی تو تھا کہ بہن اسلام قبول کر چکی تھیں مگر بھائی اسلام کے سخت دشمن تھے جب بھائی کو بہن کے ایمان کی اطلاع ملی تو یہ فوراً بہن کے گھر پہنچے اس وقت وہ قرآن حکیم کا مطالعہ فرما رہی تھیں حق گوئی اور حق پسندی کے جرم میں بھائی نے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ وہ غصے میں کہتے کہ میں اس لیے نہیں رکا کہ مجھے تم پر رحم آگیا ہو بلکہ اس لیے کہ میں مارتے مارتے خود تھک گیا ہوں۔ بہن کی حق پر ثابت قدمی، اثبات حق اور ابطال باطل کا بین ثبوت تھی جس نے حضرت عمر کو متاثر کیا اور انہیں ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ بہن کے علاوہ دو کنیزیں (حضرت لبینہ اور حضرت زنیرہ) بھی اسلام قبول کر چکی تھیں حضرت عمرؓ نے انہیں بھی اذیت ناک سزائیں دیں مگر کسی ایک کو جادہ حق سے ایک انچ بھی ہٹایا نہ جا سکا۔

حضرت ام سلمہ ایمان لاتی ہیں تو ان کے اعزا انہیں چلچلاتی دھوپ میں لے جا کر کھڑا کر دیتے۔ اسی حالت میں انہیں روٹی کے ساتھ شہد جیسی گرم چیز دیتے مگر پانی نہ پلاتے اس طرح جب تین دن گذر گئے تو ان ظالموں نے کہا کہ اگر تم اسلام سے تائب ہو جاؤ تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ حضرت ام سلمہ تکلیف کی شدت سے اس قدر بدحواس تھیں کہ سمجھ نہ سکیں کہ ان سے کیا کہا جا رہا ہے مگر جب ان ظالموں نے آسمان کی طرف انگلی کا اشارہ کیا تو یہ سمجھیں کہ ان سے توحید کا انکار کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ بولیں:۔

میں توحید پر جمی ہوئی ہوں اور جمی رہوں گی"

حضرت سمیہ کو تو لوہے کی زرہ پہنا کر گرم گرم ریت پر ڈال دیا جاتا جب وہ اس کے باوجود اپنے ایمان میں پختہ تر ہوتی گئیں تو بالآخر ابوجہل نے ان کی ران میں برچھی

ادر کر شہید کر دیا

یہ اور اسی طرح کے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں خواتین نے کس قدر اہم رول ادا کیا ہے ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی ہماری مسلم خواتین اگر معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں تو وہ تحریک اسلامی میں اپنا واقعی مقام حاصل کر سکتی ہیں اور دورِ حاضر کی تاریخ ساز بن سکتی ہیں۔

جماعت اسلامی ہند ایک انقلابی تحریک ہے آپ کے شوہر، بھائی، باپ بیٹے وغیرہ اس تحریک کی طرف مائل ہیں اگر انہیں آپ کا تعاون حاصل نہ رہا تو یہ چند قدم چل کر تھک ہار کر بیٹھ سکتے ہیں۔ پھر اس سے اہم بات یہ کہ آپ کو اپنی عاقبت بنانی ہے۔ آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول آپ کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز و محور ہونا چاہیے جوابدہی آپ کو کرنی ہے۔ آپ کے عوض کوئی اور جوابدہی نہ کر سکے گا۔ آخرت کی تیاری کا تمام تر انحصار اسی بات پر ہے کہ آپ اس دنیا کی چند روزہ زندگی میں ان فرائض کو محسوس کریں اور انجام دیں جو خدا و رسول کی جانب سے آپ پر عائد ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی آپ سے جو مطالبہ کرتی ہے وہ ٹھیک وہی ہے جو قرآن حکیم اور سنت رسول کا مطالبہ ہے جو دین اسلام کا مطالبہ ہے اور وہ یہ کہ:۔

۱۔ آپ مستحکم عزم کر لیں، سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر لیں کہ آپ اپنی مرضیات و اختیارات کو اطاعتِ الٰہی کے تابع بنائیں گی کسی کام کے کرنے یا کسی کام سے رک جانے کے لیے بس اتنی بات کافی ہو کہ اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیا ہے۔

۲۔ اس فیصلے کے بعد آپ کی اہم ذمہ داری ہے کہ آپ خدا کے دین کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مطالعے کا اہتمام کریں قرآن حکیم کا سمجھ کر مطالعہ، احادیث رسول کا مطالعہ قرآن و حدیث کے مستند ترجمے آپ اپنی زبان میں حاصل کر سکتی ہیں۔ تفہیم القرآن، راہِ عمل، انتخاب حدیث، اور زادِ راہ، جیسی کتابوں

کا مطالعہ آپ کے لیے آسان ہوگا۔ پھر آپ دینی لٹریچر کا مطالعہ کر ڈالیں۔ عبادات، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب و تمدن، علم و ادب ہر موضوع پر آپ کو مستند کتابیں مل سکتی ہیں۔

میں اپنی تعلیم یافتہ بہنوں سے گذارش کروں گا کہ وہ جلد از جلد خود کو تیار کر لیں۔ آج ہماری خواتین ہی کا محاذ ہے جس پر تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہیں۔ جدیدیت اور روشن خیالی کے نام پر آج کی عورت کو اس ذلیل ترین مقام تک گرایا جا رہا ہے جس کا تصور دورِ جاہلیت کے وہ لوگ بھی نہ کر سکتے تھے جو اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے آج مساوات کے نام پر عورت گھر کی لونڈی بھی ہے اور شوہر کی داسی بھی۔ آفس کی ملازمہ بھی ہے اور کلب کی رونق

بھی، بازار کا سودا بھی ہے اور عیاشوں کا ہتھیار بھی — آج اس کا حسن، اس کی عفت و عصمت اور اس کا سہاگ سب کچھ کھلے بازاروں میں نیلام ہو رہا ہے۔ ثقافت کے نام پر عورتوں کی عصمتوں سے کھیلنے والے مسلم خواتین کو بھی ٹھیک اسی مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں جس پر آج تہذیب جدید کی ماری ہوئی خواتین پہنچ کر بے حیائی کے صدمے سہنے پر مجبور ہیں۔ اسلام نے ایک شوہر کو سیکڑوں خواتین سے رشتہ نکاح قائم کرنے کی رسم جاہلیت سے روک کر بیک وقت چار تک کی محدود و مشروط اجازت دی ہے مگر آج مغربی تہذیب کا مارا ہوا انسان ایک "قانونی بیوی" ایک زوجگی کا سہارا لیکر سیکڑوں فرینڈ گرلس کو اپنی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھا کر بھی خواتین کا ہمدرد و غمگسار ہی رہتا ہے۔ حرامی بچوں کی پرورش و پرداخت سے بچنے کی خاطر مانع حمل گولیاں اور اولاد کش دوائیں استعمال کرا کے ان خواتین کی صحت و تندرستی سے کھلا مذاق کرتا ہے مگر پھر بھی کچھ خواتین اسے ترقی پسند اور عورت کا محافظ ہی تصور کرتی ہیں۔ آج ان کے حقوق پر کھلے طور سے ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں۔ موجودہ ہندو کوڈ بل آج کی ہندو عورت کے ساتھ ظلم کا واضح نشان ہے۔ مگر یہ کس قدر ستم ظریفی کی بات ہے کہ جو لوگ اپنی خواتین کے حقوق کے قائل ہی نہ تھے جن کے سماج میں عورت گناہ کی پوٹلی تھی۔ شوہر کے مرنے پر جہاں عورت کو جینے کا حق حاصل نہ تھا۔ انہیں آج اگر کچھ احساس ہوا بھی تو وہ اپنی خواتین کو جائز حقوق دینے کے بجائے مسلم خواتین کے ان حقوق پر دست درازی کرنا چاہتے ہیں جو خدا اور رسول نے عنایت فرمائے ہیں اور اس کے لیے یکساں سول کوڈ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ اٹھئے تعلیم یافتہ مسلم خواتین کو بیدار کیجیے اور یہ ثابت کر دکھلائیے کہ آج بھی ہر فرعون کے لیے موسیٰ اور ہر نمرود کے لیے ابراہیم موجود ہے۔

۲۔ جو خواتین پڑھی لکھی نہیں ہیں انہیں چاہیے کہ وہ پڑھا کریں اور روزانہ تھوڑا تھوڑا وقت لکھنے پڑھنے پر صرف کریں۔ اگر ایسا کریں گی تو سال چھ ماہ میں بآسانی عام فہم لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگیں گی۔

۳۔ مسلم خواتین کی ایک اور اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں اور نونہالوں کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصیت سے خیال رکھیں آج جس تنگ ظرف اور متعصب نظام تعلیم سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ ہے اس کا منشاء صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو خدا و رسول کے تصور سے بالکل محروم کر دے بچے کو تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ "گنگا جی، شیو جی کی جٹا سے نکلی ہیں" اور سورج دیوتا کے کارنامے کیا ہیں۔ مگر اسے یہ معلوم نہ ہوگا کہ توحید کیا چیز ہے اور شرک کسے کہتے ہیں۔ ایسے منصوبہ بند نظام تعلیم سے اپنے بچوں کو بچا کر دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا دور حاضر کا ایک بڑا جہاد ہے جس میں آپ کو بڑھ کر حصہ لینا چاہیے

آپ کی گود، آپ کا گھر اور ماحول بچے کی ابتدائی درسگاہ ہے۔ آپ جیسی کچھ ہوں گی اسی کا عکس آپ کے بچوں پر پڑے گا۔ آپ اعلیٰ اخلاق اور مضبوط کردار کی حامل ہوں گی تو بچہ بھی اسی کا ترجمان ہو گا۔ آپ خدا پرست اور دیندار ہوں گی تو بچہ بھی خدا کا سپاہی بنکر اٹھے گا۔

ہم یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج کے مسلم معاشرے میں بے شمار غلط اور خلاف شرع رسمیں ہلاکت و تباہی کا باعث بن رہی ہیں اور ان رسموں کو زیادہ تر آپ ہی سے تقویت ملی ہے۔ آپ اگر ایک اچھا سماج چاہتی ہیں تو آپ کو ان رسموں کے خلاف کوشش کر کے انہیں اپنے گھروں اور اپنے سماج سے نکالنا پڑیگا۔

۵۔ آپ کو ہر جگہ اپنی تنظیم قائم کرنا چاہیے۔ محلہ محلہ، بستی بستی آپ کے حلقے منظم ہوں اور آپ جاہلیت کے خلاف اپنی اجتماعی طاقت کا استعمال کریں گی تب آپ باطل کو شکست دے سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

اشتراکیت

ایک گمراہ کن نظریۂ حیات

جناب ڈاکٹر نثار احمد صاحب، کانپور

یہ مقالہ جماعت اسلامی کانپور کے ہفتہ وار اجتماع میں پڑھا گیا

خداوند عالم نے اپنے رسولوں کے ذریعے انسانی ہدایت کے وہ متوازن قوانین عطا فرمائے ہیں جو انسان کی روح اور جسم کے متوازن مطالبوں، تقاضوں، قوتوں، خواہشوں جذبات و رجحانات کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور کسی پہلو کے ساتھ بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم و ناانصافی نہیں کرتے لیکن انسان جب اس نور ہدایت سے روشنی لینے کے بجائے اپنے من مانے ڈھنگ سے زندگی گذارنے کا اصول وضع کرتا ہے تو اپنی علمی و نظری کوتاہی کی بنا پر شاہراہ حیات کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے اور انسانی ضرورتوں، قوتوں اور خواہشوں کے چند گوشوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا ہے جس سے حیات انسانی کے کچھ دوسرے گوشے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان محروم گوشوں کا استحصال شروع ہو جاتا ہے ان کے ساتھ ناانصافی ہونے لگتی ہے جب وہ بری طرح دبائے جاتے ہیں تو ان میں بغاوت کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں دونوں کے درمیان ایک طویل کشمکش کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح تہذیب و تمدن میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس نئے انقلاب سے زندگی کے ان دبے ہوئے گوشوں کی بالیدگی تو بلاشبہ شروع ہو جاتی ہے اور کچھ زیادہ ہی [illegible] ہے مگر کچھ دوسرے پہلو دب کر رہ جاتے ہیں اور تہذیب و تمدن کا دوسرا میلان رونما ہونا شروع ہو جاتا ہے یعنی کچھ دوسری قدروں کا استحصال شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح قانون قدرت سے انحراف کے بعد انسان ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف مسلسل ظلمات کے اندھیرے میں دوڑتا پھرتا ہے

ہر نئی دریافت کو وہ ایک مستقل حل سمجھ کر اختیار کرتا ہے ہر نئے راستے کو صراط مستقیم سمجھتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ کبھی راہ راست نہیں حاصل کر سکتا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے جرمن فلسفی ہیگل نے ایک نتیجہ اخذ کیا کہ انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کا ارتقاء فلسفہ جدلی عمل (Dialectic Process) میں مضمر ہے اس کے خیال میں ارتقاء تہذیب و تمدن کا یہی راستہ ہے یعنی ایک تہذیب و تمدن جب بام عروج پر پہنچ جاتی ہے تو در اصل وہ ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (Thesis) ہوتا ہے جو ایک رخ پر بہائے جاتا ہے اس انتہا پسندانہ دعویٰ سے ہی ایک دوسرے جواب دعوے (Anti Thesis) کی پیدائش ہوتی ہے اور وہ تہذیب و تمدن کو دوسری انتہا کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس طرح دونوں میں ایک طویل کش مکش پیدا ہو جاتی ہے اس کش مکش کو ختم کرانے کیلئے ایک عقل کل دونوں کے درمیان صلح کرا دیتی اور دونوں کے امتزاج (Synthesis) سے ایک تہذیب وجود میں آتی ہے اسی طرح یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

ہیگل کے اس نظریہ کا سہارا لیکر ڈاروِن نے حیات انسانی کے ارتقاء کا اصول پیش کیا۔ ڈاروِن کہتا ہے کہ ایک مادی وجود تنازع للبقاء (Struggle for existence) کے مرحلے سے گذر کر انتخاب طبعی (NATURAL SELECTION) کی تلاش میں بقائے اصلح (Survival of the Fittest) پر انسانی وجود میں متشکل ہو گیا ہے یعنی انسان کسی وقت ایک حقیر کیڑا تھا جو پانی سے پیدا ہوا اور پھر تاریخ کے لمبے زمانوں میں مختلف جانداروں کی شکل اختیار کرتا ہوا بندر بنا اور بندر سے انسان۔

انیسویں صدی میں مارکس نے مندرجہ بالا فلسفوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے سماجی ارتقاء (Social Evolution) سے جوڑ دیا اس کا کہنا ہے کہ جس طرح ایک لمبے تاریخی عمل سے مادہ نے انسانی شکل اختیار کر لی ٹھیک اسی طرح ضروریات زندگی کے حصول میں انسان کی جدوجہد اور معاشی ذرائع و وسائل کی تبدیلیاں وہ بنیادی عوامل ہیں جو انسانی زندگی کو مسلسل ارتقاء کی طرف لیے جا رہی ہیں انسانی ضروریات زندگی کے حصول کے لیے لازمی قانون کے طور پر ایک اقتصادی دور وجود میں آتا ہے وہ کچھ دنوں کے بعد ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اسی سے ایک دوسرا دور پیدا ہوتا ہے جو زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی انتہا پر پہنچ کر ٹوٹ جاتا ہے اور ایک تیسرا دور پیدا ہوتا ہے اس طرح پے در پے ایک ترقی یافتہ دور کی تلاش میں سرگرداں رہنا ہے تاکہ ایک ایسا دور وجود میں آ جائے جہاں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

ایسے دور تک پہنچنے کے لیے اس نے انسان کے

معاشی مسئلے کو اس کا واحد مدار ٹھیرایا۔ اس نے معاشیات کا مطالعہ کیا۔ انگریز ماہر اقتصادیات ڈیوڈ ریکارڈو (David Ricardo) کا خیال کہ "کسی تجارتی سامان کی قیمت اس مقدار محنت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے جو اس کی تیاری میں صرف کی گئی ہو"۔ سے اس نے قدر زائد کا نظریہ اخذ کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان جو کچھ کماتا ہے یا اپنے لیے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ محض انسانی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے جو لوگ محنت کرکے جو کچھ حاصل کر رہے ہیں وہ اپنی محنت کی جائز کمائی لے رہے ہیں اور جو لوگ دوسروں کو مزدور رکھ کر ان سے کوئی کام کراتے ہیں اور دوسروں کی کمائی پر اپنا منافع لیتے ہیں وہ سوسائٹی کا استحصال کرنے والے ہیں اور دوسروں کی محنت کا ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ایک آدمی بہت سارے آدمیوں کو کام پر لگا کر ان کی محنت کے حاصل پر قبضہ کر لیتا ہے اور سرمایہ دار بن جاتا ہے۔ وہ مزدوروں کو ان کے کام کے معاوضہ میں تھوڑی سی مزدوری دیتا ہے اور ان کی کمائی کے بقیہ حصہ کو خود لے لیتا ہے۔ گویا کسی مزدور کے حاصل محنت کی وہ مقدار جو مزدور کو نہیں دی گئی اور جس پر سرمایہ دار نے قبضہ کر لیا اس کے نزدیک قدر زائد ہے۔

اس فلسفہ کو پیش کرکے مارکس اس استحصال کو ختم کرنے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ اس کی نظر فرانسیسی فلسفہ کی طرف پڑتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک فرانسیسی مفکر جان کالوین (John Kalvin) نے شخصی حکومتوں کے خلاف جمہوری حکومت کا فلسفہ پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ سیاسی اختیارات اصل فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں یہ جس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں وہ دوسروں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے اور سماج کے تمام اداروں کو سماج کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے عام پبلک کو آزاد کرنے کے لیے سیاسی اختیارات چند ہاتھوں میں نہ ہوں، بلکہ عوام کے ہاتھوں میں ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کی حکومت میں مخالفت اور باہمی کش مکش ختم ہو جائے گی۔ جب عوام خود حاکم ہوں گے تو کون کس پر ظلم کرے گا کون کس کی مخالفت کرے گا۔ اس طرح اس نے سیاسی اختیارات کو سماج کی ملکیت بنانے کا تصور دیا۔

مارکس نے اس کی اپنے فلسفہ معاشیات میں پیوندکاری کی۔ اس نے کہا چونکہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ انسان کا معاشی مسئلہ ہے اور معاشی میدان میں یہ نجی ملکیت ہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ جس کی وجہ سے ایک شخص کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دولت کے خزانوں کو اپنی ملکیت بنا کر دوسروں کو اس سے محروم کر دے لہذا معاشی پیداوار کے ذرائع کو افراد کے قبضہ سے نکال کر پوری سائٹی کے قبضہ میں دے دیا جائے اور نجی ملکیت کو ختم کر دیا جائے۔ رزق حاصل کرنے کے ذرائع کو سارے انسانوں کی مشترک ملکیت بنا دیا جائے۔ اس طرح رزق کے خزانوں پر چند افراد کی

اجارہ داری خود بخود ختم ہو جائے گی اور زمین کی دولت اور جو کچھ اس زمین پر ہے وہ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو ملنے لگے گی۔ اس طرح اس نے معاشی اختیارات کو سماج کی ملکیت بنا دینے کی پرزور حمایت کی۔ اس کے خیال میں یہی وہ عوامل ہیں جو لوگوں کا استحصال کرتے ہیں

"یہ ہے وہ نظریہ حیات جس کی بنیاد مارکس
نے جرمن فلسفہ پر رکھ کر برطانوی علم معاشیات
اور فرانسیسی علم سیاسیات کے اینٹ گارے
سے اشتراکیت کی عمارت کھڑی کی۔"

جس دور میں یہ فلسفہ پیش کیا گیا اس وقت نظام جاگیرداری کا انحطاط ہو چکا تھا اس کی جگہ نظام سرمایہ داری نے لے لی تھی جس نے نظام جاگیرداری کی ناانصافیوں اور ظلم کو آلہ کار بنا کر اسے ہٹایا تھا۔ یعنی جس جگہ پہلے مالکان زمین ارباب کلیسا اور شاہی خاندان تھے اب وہاں بورژوا طبقہ آ گیا تھا۔ جس جگہ بورژوا طبقہ کھڑا ظلم و زیادتی اور ہٹ دھرمی کا شکوہ و شکایت اور غصہ و احتجاج کر رہا تھا اس کی جگہ مزدور نے لی تھی ایسے موقع پر مزدوروں کی مظلومیت کا مداوا کرنے کے نام پر ایک غیر فطری فلسفہ نظم معیشت پیش کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر بروقت غلطی کا احساس کر کے صحیح طور پر خدائی ہدایت کی روشنی میں کسی نظام کی بنا ڈالی جاتی تو تاریخ کے اندر ایک ظلم کے بجائے دوسرا ظلم اور اس کے رد عمل میں نظام معیشت کی اساس ہی کو بدل کر فکری اور تاریخی غلطی کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اشتراکی نظام نے بے قید نظم کے مقابلے میں ایک منضبط نظام معیشت کے ذریعے بھی انسانیت کے مرض کا علاج پیش کیا مگر یہ ایلوپیتھی کی طرح صرف مرض کو اندرونی جسم میں دبا دینے کا مصداق ثابت ہوا جو بعد میں مہلک مرض کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس علاج کی بنیاد خدا اور خدائی قانون و ہدایت کی نفی پر رکھی گئی اس نے انسان کے لیے قانون حیات وضع کرنے کی ذمہ داری خود انسانوں کو دے دی جس کی محدود عقل و نظر اور ناقص علم نے رد عمل میں تاریخی حقائق کے خلاف ایک غیر فطری "اجتماعی ملکیت" کا تصور دے کر لوگوں کی ذاتی ملکیتوں کو چھین لیا اور اسے اسٹیٹ کو دے کر سارے انسانوں کو ذہنی غلامی میں جکڑ دیا۔ انسانوں کو معاشی حیوان بنا دیا۔ اسے پنجرے کا وہ طوطا بنا دیا جسے بلاشبہ اس آزاد طوطے کے مقابلے میں جسے سال کے چند مہینوں میں فاقے بھی کرنے ہوتے ہیں۔ اچھا کھانے کو اور رہائش کا اچھا بندوبست دے کر اپنی بولی بلوانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

حالانکہ خدا نے زندگی کے تمام معاملات میں وہ ہدایات دی ہیں جو فطرت انسانی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے قوانین کے ذریعے ان راستوں کو بند کر دیتی ہیں جن سے خرابیاں داخل ہوتی ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر آزاد ہو۔ اس کا ذہن جو کچھ سوچے اسے وہ برملا کہہ بھی سکے اسی طرح حصول معاش میں بھی اس کا فطری جذبہ اور طرز عمل

یہی ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ جد وجہد کرکے معاش حاصل کرے اور جو کچھ حاصل کرے اسے اپنی تحویل میں رکھے اور وہ اس کا خود مالک ہو۔ یہی وہ فطری جذبہ ہے جو اسے اپنے نجی کاموں میں دلچسپی دکھانے پر مجبور کرتا ہے جبکہ وہ دوسروں کے کام میں وہ دلچسپی نہیں دکھاتا اس کے اس جذبے کی شہادت پوری تاریخ انسانی دے رہی ہے سوائے ان بے بنیاد مفروضات کے جنہیں مارکس نے بطور مثال پیش کیا ہے جن میں عورتوں تک کو اجتماعی ملکیت میں دکھایا گیا ہے

اسی طرح جب انسان خدائی ہدایت سے راہ فرار اختیار کرتا ہے تو وہ بنیادی سوالات تک کے حل میں غلطی کرتا ہے چنانچہ اشتراکیت کا مبلغ اعظم کہتا ہے کہ

"آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے اس کے بعد ہی وہ فلسفہ وسیاست کے مسائل پر غور کرتا ہے"

یہ اسی بنیادی غلطی کی نشان دہی ہے حالانکہ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ انسان پیدائش کی ابتدا ہی میں آنکھ کھولتے اپنے گرد وپیش بے شمار سامان زندگی دیکھتا ہے، شفیق ورحیم ماں باپ کو پاتا ہے جو اپنی خوشیوں کی قربانی دے کر اس کی کفالت کا بار خوشی خوشی اپنے کاندھو پر اٹھاتے ہیں وہ دیکھتا ہے کہ اس کی حیات کی بقا کے لیے جو چیز جس قدر ضروری ہے وہ اسی قدر وافر مقدار میں اس کے گرد موجود ہے۔ یہ ہوا جو حیات کی بقا کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے جو آکسیجن بہم پہنچاتی ہے ... ترین اور بکثرت موجود ہے۔ سورج جو حرارت اور ... دیتا ہے پابندی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے ... یہ میٹھے پانی کے اتھاہ ذخیرے جو زمین پر ہی رواں نہ ... بلکہ زیر زمین اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بشکل برف محفوظ ہیں جو نہ صرف انسان کی پیاس ہی بجھاتا ہے بلکہ ... ضروریات کی پیدائش کا بھی ایک لازمی جزو ہے۔ ... طرح کے جمادات، نباتات، حیوانات پاتا ہے جو ... ضروریات پوری کرنے کے لیے ہر وقت خادموں کی ... موجود رہتے ہیں۔ یہ انتظامات دیکھ کر کوئی کم عقل بھی ... کہہ سکتا کہ انسان کی بنیادی ضرورت روٹی اور کپڑا ... کیونکہ اس وقت جبکہ اس کو روٹی کا نام اور کپڑے کا شعور بھی نہ تھا اس کے لیے یہ سارے سامان زیست مہیا کر دیے گئے تھے۔

اس سلسلے میں ایک تاریخی غلطی کا بھی دخل ہے جیسے کہ خود مولانا مودودی صاحب نے صحیفۂ ہدایت کے مطالعہ کے بعد اظہار کیا کہ "جب آنکھ کھول کر قرآن پڑھا ... بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا۔ علم کی ... اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نطشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقرو ...

میں حل کرکے رکھ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ فلاسفہ باطل کو راہ ہدایت کا صحیفہ دیکھنے کو نہیں ملا ان بے چاروں کے سامنے خدائی ہدایت کے صحیفے آئے بھی تو تحریف شدہ جن پر باطل کے موٹے غلاف پڑے ہوئے تھے اور عمل میدان میں صحیفہ ہدایت رکھنے والے کورے ہو چکے تھے جو عملی میدان اور فکری دیوالیہ پن کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا تھے راہ ہدایت کی نشان دہی کرنے کے بجائے اس کی تفہیم میں تاویلیں پیش کرنے لگے اور فلاسفہ باطل کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

اس طرح راہ ہدایت سے بھٹکا ہوا نظریہ حیات سامنے آیا پروان چڑھا، دنیا نے اسے آزمایا اور رد کر دیا۔ آج پھر دنیا ایک صحیح نظام حیات کی تلاش میں اسی جگہ کھڑی ہے جہاں سے اگر رہنمائی نہ ہوئی تو اس کے کسی دوسری انتہا کی طرف مڑ جانے کے روشن امکانات ہیں۔ یہ موجودہ عالمی سطح کی بے چینی اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کو ایک ایسے نظام کی تلاش ہے جو روح وجسم کی متوازن بالیدگی کا ضامن ہو اور انسانوں کو فلاح و خیر کے صراط مستقیم پر گامزن کر دے۔ اب ہماری باری ہے مگر یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے کہ ہم ـ جن کے پاس ایسا متوازن ضابطہ حیات ہے اسے زندگی کے ہر ہر میدان میں صرف گفتار ہی سے نہیں بلکہ عمل و کردار سے بطور نمونہ پیش کر دیں تاکہ دنیا اس سے روشنی حاصل کرکے گمراہی کے ظلمت کدے سے نکل سکے۔ ہم اگر اپنے اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کریں گے تو یقیناً دنیا کسی دوسرے ظلمت کدہ کی انتہا کی طرف بھٹک جائے گی اور ہم کو اپنی کوتاہیوں کی سزا نہ صرف اس دنیا میں ملے گی بلکہ آخرت میں رب کائنات کی عدالت میں بھی ملے گی

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایجنٹ حضرات سے

زندگی کا آئندہ شمارہ "اجتماع نمبر" ہوگا۔ جس کی قیمت -/5 ہوگی۔ نمبر کا تفصیلی خاکہ اسی شمارہ کے صفحہ ۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔ ہم نے طے کیا ہے کہ اس خاص نمبر کے موقع پر ہم اپنے ایجنٹوں کو خصوصی کمیشن دیں گے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۵ سے ۱۰ پرچوں تک ۲۵ فی صدی ـــ ۱۰ سے ۳۰ پرچوں تک ۳۰ فی صدی ـــ ۳۰ سے ۵۰ پرچوں تک ۳۳ فی صدی ـــ ۵۰ سے زائد پر ۳۵ فی صدی

براہ کرم آپ اپنی زیادہ سے زیادہ مقدار سے جلد مطلع فرمائیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ تاخیر سے مطلع فرمائیں اور ہم بھیجنے سے معذور رہیں۔

منیجر ماہ نامہ "زندگی" رامپور۔ یوپی

منصب خلافت کی ایک اہم ذمہ داری

(سید احمد قادری)

ماہنامہ زندگی کے طلاق نمبر میں شائع شدہ میرے دو مقالوں پر جناب مدیر تجلی دیوبند نے جو تنقید کی تھی اس کے جواب میں میں نے انہیں ایک مفصل خط لکھا تھا اور اپنے موقف کی وضاحت کی تھی۔ یہ خط زندگی کے مشترک شمارہ (اگست و ستمبر ۱۹۷۴ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس خط میں میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلہ کی نظیر پیش کی تھی اور لکھا تھا:۔

ہمیں کتب فقہ میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک چالاک عورت نے اپنے بھولے بھالے شوہر کو دھوکا دے کر اس سے طلاق کے الفاظ کہلوائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب انکار کر رہا ہے۔ اس کے شوہر نے وہاں پہنچ کر اصل واقعہ سنایا تو انھوں نے عورت کو سزا دی اور وقوع طلاق کا فیصلہ نہیں کیا۔

جناب مولانا عامر عثمانی نے تجلی دیوبند اگست و ستمبر ۱۹۷۴ء کے مشترک شمارے میں حضرت عمر رضؓ کے فیصلے اور میری مذکورہ بالا عبارت پر، منصب امارت اور منصب قضا سے میری ناواقفیت واضح کرنے کے لیے جو کچھ لکھا ہے، میں عبرت کے لیے اسے یہاں نقل کر رہا ہوں: وہ لکھتے ہیں:۔

پہلی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے جس فیصلے کو آپ نظیر بنا رہے ہیں وہ انھوں نے قاضی کی حیثیت سے نہیں صرف امیر المومنین کی حیثیت سے دیا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں اور نہ جانتے ہوں تو اب جان لیں کہ یہ دونوں حیثیتیں الگ الگ ہیں اور خلفائے راشدین نے کبھی انہیں خلط ملط نہیں کیا۔ وہ خود اپنا مقدمہ لے کر قاضی کی عدالت میں جایا کرتے تھے۔ اگر امیر المومنین ہونے کی بنا پر وہ لازماً قاضی بھی ہوتے تو اور کہیں مقدمہ کیوں لے جاتے۔ حضرت عمرؓ نے مذکورہ معاملے میں جو بھی فیصلہ نافذ کیا وہ اس

امیرالمومنین کی حیثیت سے نافذ کیا جس کی ذمہ داریاں اور فرائض بعینہٖ وہ نہیں ہوتے جو قاضی کے ہوتے ہیں۔" (تجلی دیوبند اگست ستمبر ۶۴ء ص۶۵)

آگے مزید رقمطراز ہیں:۔

آپ نے محض روا داری میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ "حضرت عمر کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا" حضرت عمرؓ کبھی مسندِ قضا پر فائز نہیں ہوئے انھوں نے کسی عدالت میں بطور قاضی اجلاس نہیں کیا الفاظ کے غلط استعمال کی کوئی حد ہونی چاہیے گفتگو ایک دقیق آئینی مسئلے میں ہو رہی ہے۔ آپ شاعری فرما رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت عمرؓ حاکم وقت تھے نہ کہ قاضی ان کے آگے اسی حیثیت میں قضیہ لایا بھی گیا تھا۔ ان پر کسی قاضی کی طرح یہ قانونی پابندی نہ تھی کہ نیتوں کی طرف توجہ نہ کرو۔" (ایضاً ص۶۶)

ملاحظہ کیجیے ـــــ "اور نہ جانتے ہوں تو اب جان لیں" "الفاظ کے غلط استعمال کی کوئی حد ہونی چاہیے"۔ جناب مدیر تجلی کے ان جملوں میں اپنے علم کا کیسا طنطنہ ہے اور میری نادانی اور نمایاں کرنے کے لیے مزید ارشاد فرماتے ہیں

"آپ فقہاء یعنی مقننین سے مجتہدانہ اختلاف کرنے سے پہلے منصب امارت اور منصب قضا کے باریک فرق کو سمجھیں اور پھر معترض ہوں۔" (ایضاً ص۶۷)

واقعہ یہ ہے کہ جناب مدیر تجلی کی یہ عبارتیں پڑھ کر افسوس ہوا۔ کاش وہ مجھے جواب دینے سے پہلے منصب امارت اور منصب قضا کے بارے میں تھوڑی سی واقفیت بھی حاصل کر لیتے وہ جواب دینے کی جلدی میں ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جو منصب خلافت سے ناواقفیت کا شاہکار کہی جا سکتی ہیں۔ ان کی اسی لاجواب نادانی نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں اس موضوع پر ایک مختصر مقالہ پیش کروں۔ صدیوں سے ہم ہندوستانی مسلمان مسائل امامت و خلافت سے دور ہیں اس لیے مدیر تجلی جیسے صاحب علم افراد بھی اس سے بے خبر ہیں۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے امید ہے کہ اب وہ اس موضوع کی کتابوں کا مطالعہ کر لیں گے لیکن جو لوگ عربی اور فارسی نہیں جانتے ان کی واقفیت کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ ایک مختصر مقالہ پیش کر دیا جائے تاکہ اجمالاً ہی یہ معلوم ہو جائے کہ منصب امامت و خلافت کی ایک اہم ذمہ داری قضاء شرعی بھی ہے مسلمانوں کے امام اعظم یا دوسرے لفظوں میں خلیفۃ المسلمین کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قضا یعنی فصل خصومات و نزاعات کا کام بھی انجام دے کیونکہ امیرالمومنین بیک وقت اسلامی حکومت کا سربراہ، فوجوں کا سپہ سالار اعظم اور اپنے وقت کا سب سے بڑا قاضی ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کے تمام قاضی فصل خصومات میں اس کے نائب ہوتے ہیں جو اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں اس کی معاونت کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین بذات خود یہ کام کرتے تھے اور اپنے نائبین سے بھی یہ خدمت لیتے تھے۔

اللہ کے رسولوں کی ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے جتنے رسول بھیجے وہ سب اس کے خلیفہ اور نائب تھے۔ ان سب کی ایک اہم ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں کے مطابق باہمی نزاعات و مقدمات کے فیصلے کریں۔ رسولوں کے بعد ان کی امتوں میں سے جو لوگ ان کے جانشین ہوئے منصب خلافت کے ساتھ منصب قضا کی ذمہ داری بھی ان کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا اس مقدمہ کی سرگذشت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ

"اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ کبھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا (اگر ایسا کرو گے تو) وہ خدا کے رستے سے تم کو بھٹکا دے گی۔"

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس آیت کے تحت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے اپنے حاشیے میں لکھا ہے:۔

"یعنی خدا نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنایا، لہذا اس کے حکم پر چلو اور معاملات کے فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ شریعت الٰہی کے موافق کرتے رہو کبھی کسی معاملے میں خواہش نفس کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ آنے پائے کیونکہ یہ چیز آدمی کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دینے والی ہے اور جب انسان اللہ کی راہ سے بھٹکا تو پھر ٹھکانا کہاں۔"

رسولوں کے بعد جو لوگ ان کے جانشین ہوئے خواہ وہ منصب نبوت پر فائز ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں ان کی بھی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ قانون الٰہی کے مطابق فصل خصومات و قطع منازعات کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی وہ اپنی زندگی میں اس کے مطابق معاملات کے فیصلے کرتے رہے۔ ان کے بعد انبیاء بنی اسرائیل اور ان کے جانشین علماء اسی کتاب کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے رہے جیسا کہ سورہ المائدہ میں کہا گیا ہے:۔

ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودی بن جانے والوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ (المائدہ آیت ۴۴)

سورۂ مائدہ میں توریت کے قانون قصاص کو بیان کرنے

کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیل اور اہل انجیل کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں (المائدہ : ۴۷)

پھر اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ قرآن نازل ہوا اور آپ پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کے مطابق حکم دینے اور فیصلہ کرنے کی ذمہ داری ڈالی۔ مدینہ منورہ میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو حضورؐ بیک وقت اس حکومت کے سربراہ، فوج کے سب سے بڑے سردار اور نزاعات و خصومات کے فیصلے کے لیے سب سے بڑے قاضی تھے اور منصب رسالت کی وجہ سے آپ کا درجہ یہ تھا کہ باہمی نزاعات میں آپ کو قاضی بنانے اور آپ کا فیصلہ دل سے قبول کرنے کو اللہ نے مخلصانہ ایمان کی علامت قرار دیا۔ ارشاد ربانی یہ ہے :۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

(النساء آیت ۶۵)

نہیں، اے محمد تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

اس آیت میں لفظ قَضَيْتَ خاص طور پر قابل لحاظ ہے اسی طرح لفظ تحکیم (يُحَكِّمُوكَ) بھی خاص طور پر قابل غور ہے پھر اسی سورہ نساء میں آگے آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (آیۃ ۱۰۵)

اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اور پھر سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے :۔

پھر ہم نے اے محمد! تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لیکر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو اس کے سامنے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے لہذا تم خدا کے

نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

(آیت ۴۸)

مزید تاکید کے لیے آیت ۴۹ میں پھر یہ حکم دیا گیا

پس اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ (المائدہ ۵ آیت ۴۹)

حضورؐ نے بنفس نفیس مقدمات کے جو فیصلے کیے ہیں وہ احادیث و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ مدینہ سے دور کے علاقوں میں آپ نے جن صحابہ کرام کو قاضی بنا کر بھیجا ان کے نام بھی احادیث و سیر میں محفوظ ہیں۔ نبوت و رسالت تو حضورؐ کی ذات پر ختم کر دی گئی لیکن امامت و خلافت باقی رہی چنانچہ حضورؐ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے آپ کے جانشین ہوئے۔ یہ خلفائے راشدین صرف امیر المومنین ہی نہیں بلکہ اپنے وقت کے سب سے بڑے قاضی بھی تھے کیونکہ منصب خلافت کے ساتھ منصب قضا جڑا ہوا ہے۔

خلافت کی تعریف

علماء و فقہاء نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اور خلیفہ کی جن ذمہ داریوں کا صراحۃً ذکر کیا ہے ان میں ایک اہم ذمہ داری قضاء یعنی فصل خصومات و قطع منازعت بھی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء میں خلافت کی یہ تعریف کی ہے:۔

هي الرياسة العامة في التصدي لاقامة الدين باحياء العلوم الدينية واقامة اركان الاسلام والقيام بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب الجيوش والفرض للمقاتلة واعطاءهم من الفيء والقيام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنهي عن المنكر نيابة عن النبي صلى الله عليه وسلم (ص ۲)

خلافت ریاست عامہ کا نام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں اقامت دین کے لیے قائم ہوتی ہے اور جس کی ذمہ داریاں یہ ہوتی ہیں۔ دینی علوم کو زندہ کرنا، ارکان اسلام کو قائم کرنا، جہاد اور اس سے تعلق رکھنے والے کام۔ لشکروں کی ترتیب، مجاہدین کے لیے وظائف کی تعین اور فے میں سے ان کے عطیات کا اہتمام و انصرام کرنا۔ قضا کا حق ادا کرنا مظالم کو دور کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اس فہرست میں قضا یعنی فصل خصومات اور حدود کی تنفیذ

اور رفع مظالم کا تعلق منصب قضا سے ہے۔ شاہ ولی اللہ نے خلافت کی تعریف کرکے اس کے ہر جز کی تشریح کی ہے چونکہ ان کے نزدیک خلافت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت ہے اس لیے انھوں نے پہلے حضورؐ کے ان کاموں کی طرف مجمل ارشارے کیے ہیں جن کا ذکر انھوں نے خلافت کی تعریف میں کیا ہے۔ حضورؐ کے کاموں کی فہرست کو انھوں نے درج ذیل عبارت پر ختم کیا ہے۔

وقیام آں حضرتؐ بقضا در خصومات ونصب قضاۃ در بلاد اسلام واقامت حدود وامر معروف ونہی عن منکر مستغنی از آنست کہ بہ تنبیہ احتیاج داشتہ باشد۔

(ازالۃ الخفا مقصد اول ص۳)

نزاعات کا فیصلہ کرنے، اسلامی شہروں میں قاضی مقرر کرنے، حدود نافذ کرنے اور امر معروف اور نہی منکر کرنے میں آں حضرت نے جو اہتمام فرمایا وہ اس سے مستغنی ہے کہ اسے بتانے کی ضرورت پیش آئے

اس کے بعد شاہ صاحب نے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے امام اعظم یا دوسرے لفظوں میں خلیفۃ المسلمین کی خلافت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

چوں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم برفیق اعلیٰ انتقال فرمودند، واجب شد اقامت دین بہماں تفصیل کہ گزشت واقامت دین موقوف افتاد بر نصب شخصے کہ اہتمام عظیم فرماید دریں امر ونواب را بآفاق فرستد وبرحال ایشاں مطلع باشد وایشاں از امروے تجاوز نہ کنند وبرحسب اشارہ وے جاری شوند وآں شخص خلیفہ آں حضرت باشد ونائب مطلق وے۔

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفیق اعلیٰ کی طرف انتقال فرمایا تو اسی تفصیل کے ساتھ اقامت دین واجب ہوئی اور اقامت دین موقوف ہوئی ایک ایسے شخص کے تقرر پر جو اس معاملہ میں بڑے اہتمام سے کام لے اور اپنے نائبین دور کے علاقوں میں بھیجے اور ان کے حالات سے خود واقف ہو۔ وہ اس کے حکم سے تجاوز نہ کریں اور اس کے اشارے پر نیابت کی خدمات انجام دیں اور وہ شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور آپ کا نائب مطلق ہو۔

آگے خلیفہ کی فرائض کی تفصیل پیش کرتے ہوئے وہ پھر صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

وفیصل کند میان اہل خصومت یعنی قضا کند در دعاوی ونصب قضاۃ نماید برائے آں

(ازالۃ الخفا مقصد اول ص۴)

اور اہل خصومت کے درمیان فیصلہ کرے یعنی مقدمات میں قضا کی خدمت انجام دے اور اس کام کے لیے قاضیوں کا تقرر کرے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی ان تصریحات سے

معلوم ہوا کہ امیر المومنین کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ قضا کی خدمت انجام دے اور اس کام کے لیے قاضیوں کا تقرر بھی کرے جو اس کی نیابت میں قضا کی خدمت انجام دیں۔ اس سے واضح ہوا کہ مسلمانوں کا امام اعظم اپنی مملکت کا سب سے بڑا قاضی ہوتا ہے اور جہاں تک خلفائے راشدین کا تعلق ہے اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنی اسلامی حکومتوں کے سب سے بڑے قاضی بھی تھے اور ان میں حضرات عمر و علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں تو یہ معلوم ہے کہ وہ قضا کی خدمت عہدِ رسالت ہی سے انجام دیتے آ رہے تھے تفصیل آگے آرہی ہے۔

کتب فقہ کی صراحتیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ اس مسئلے میں فقہائے کرام نے کتب فقہ میں کیا لکھا ہے۔

امام علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ نے اپنی بے نظیر فقہی تصنیف "بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" میں قاضی اور امام کے تقرر کی فرضیت پر جامع اور مختصر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے نصب امام کے فرض ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ احکام کی تنفیذ، ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کے ساتھ انصاف، باہمی نزاعات کے تصفیہ اور اسی طرح دوسرے مصالح جن کی بجاآوری امام کے بغیر نہیں ہوسکتی اس کے بیان کی اپنی عبارت یہ ہے:۔

و معلوم انه لا یمکنه القیام بما نصب له بنفسه فیحتاج الی نائب یقوم مقامه فی ذالک و هو القاضی و لهذا کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یبعث الی الآفاق قضاة فبعث سیدنا معاذا رضی اللہ عنه الی الیمن و بعث عتاب بن اسید الی مکة فکان نصب القاضی من ضرورات نصب الامام فکان فرضا

(جلد ۷، ص ۲، کتاب ادب القاضی)

اور یہ بات معلوم ہے کہ جن کاموں کے لیے امام کا تقرر ہوتا ہے "تنہا وہ انہیں انجام نہیں دے سکتا لہذا وہ ایک ایسے نائب کا محتاج ہوتا ہے جو اس کا قائم مقام ہو اور وہ قاضی ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے دور کے علاقوں میں قاضی مقرر کرکے بھیجتے تھے چنانچہ آپ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن اور عتاب بن اسید کو قاضی بنا کر مکہ بھیجا۔ اسی بنا پر قاضی کا تقرر نصب امام کی ضروریات میں داخل ہے لہذا وہ بھی نصب امام ہی کی طرح فرض ہوگا۔"

معلوم ہوا کہ قضاء یعنی قطع خصومات و منازعات امر خلیفۃ المسلمین کی ذمہ داری ہے لیکن تنہا ایک شخص یہ ذمہ دا پوری نہیں کرسکتا۔ اس لیے خلیفۃ المسلمین قاضیوں کا تقرر کرے گا تاکہ وہ اس کی نیابت میں مقدمات کے فیصلے کرے امام کی طرف سے اگر کسی کے سامنے منصب قضا پیش کیا جائے تو اس کو قبول کر لینا جائز ہے۔ علامہ کاسانی نے اس کے جواز

کے لیے جو دلیل دی ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے ۔

اما جواز القبول فلان الانبیاء
والمرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین
قضوا بین الامم بانفسہم وقلدوا
غیرھم وامروا بذالک

قبول کرنے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام نے خود بنفس نفیس اپنی امتوں کے درمیان قضاء کی خدمت انجام دی ہے اور دوسروں کو یہ ذمہ داری سپرد کی ہے اور اس کا حکم دیا ہے ۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت معاذ رض وغیرہ کو قاضی بنا کر مدینے سے باہر بھیجنے کا ذکر کیا ۔ اس کے بعد لکھا ہے

وکذا الخلفاء الراشدون قضوا
بانفسہم وقلدوا غیرھم فقلد سیدنا
عمر رضی اللہ عنہ شریحا القضاء
وقلدہ سیدنا عثمان وسیدنا علی
رضی اللہ عنہما (بدائع جلد ۷ ص ۳-۴)

اور اسی طرح خلفائے راشدین نے بذات خود قضا کی خدمت انجام دی ہے اور دوسروں کو منصب قضا سپرد کیا ہے، چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شریح کو قاضی مقرر کیا پھر ان کے بعد سیدنا عثمان اور سیدنا علی نے بھی ان کو اس منصب پر برقرار رکھا ۔

فقہاء نے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ مجلس قضا کے لیے کون سی جگہ بہتر ہوگی ۔ فقہاء احناف نے مسجد کو اس کے لیے بہتر جگہ قرار دیا ہے ۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں :-

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یفصل الخصومۃ فی معتکفہ وکذا الخلفاء
الراشدون کانوا یجلسون فی المساجد
لفصل الخصومات ولان القضاء عبادۃ
فیجوز اقامتہا فی المسجد
(ہدایہ مع فتح القدیر مطبوعہ مصر جلد ۵ ص ۴۶۵)

اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معتکف (اعتکاف) کی جگہ میں جھگڑا چکایا کرتے تھے اور اسی طرح خلفائے راشدین فصل خصومات کے لیے مساجد میں بیٹھتے تھے اور اس لیے کہ قضاء عبادت ہے لہذا مسجد میں اس کی انجام دہی جائز ہوگی ۔"

فقہاء کی یہ عبارتیں پڑھیے اور پھر جناب مدیر تجلی دیوبند کی ان عبارتوں پر نظر ڈالیے جو انھوں نے تجلی کے لیے لکھی ہیں ۔ تعجب ہوتا ہے کہ منصب امارت سے بے نظیر ناواقفیت کے باوجود وہ عبارتیں کس طرح ان کے قلم سے نکلیں۔

امام اکمل الدین بابرتی متوفی ۷۸۶ھ نے عنایہ شرح ہدایہ میں لکھا ہے :-

اس میں کوئی شک نہیں کہ حق کے ساتھ تنازعات کا فیصلہ کرنا اللہ پر ایمان لانے کے بعد فرائض میں

قوی ترین فریضہ اور عبادات میں اشرف ترین عبادت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو دیا ہے ۔ یہاں تک کہ خاتم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا ہے ۔

(عنایہ کتاب ادب القاضی)

امام سرخسیؒ المبسوط کتاب القاضی میں لکھتے ہیں :۔

جان لو حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ، ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادت میں سے ہے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے لیے خلیفہ کا نام تجویز کیا اور ارشاد ہوا "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" اور یہی چیز داؤد علیہ السلام کے لیے ثابت رکھی اور فرمایا ۔

"اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے"

اور اسی بات کا ہر نبی حتیٰ کہ خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی حکم دیا ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔

ہم نے توراۃ اتاری اس میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ۔ تم اس ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو جو تم پر نازل کی گئی ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ۔"

غور فرمائیے کہ قضا جو ایمان کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادات میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس کی ذمہ داری اپنے پیغمبروں کو سپرد کی تھی بمثال کے طور

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے حاکم بھی تھے اور ان کے سب سے بڑے جج بھی اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے حاکم بھی تھے اور سب سے بڑے جج بھی لیکن سیدنا محمدؐ کے خلیفہ حضرت عمر فاروق کے بارے میں مدیر تجلی فرماتے ہیں کہ

"حضرت عمر حاکم وقت تھے نہ کہ قاضی"

گویا ان کے نزدیک جو حاکم وقت ہو وہ قاضی نہیں ہو سکتا ۔ اب اس کے بارے میں کیا اظہار خیال کیا جائے بات یہ ہے کہ انھوں نے منصب امارت اور منصب قضا کے بارے میں واقفیت حاصل نہیں کی اور اپنے مزعومہ تصور کی بنا پر ان دونوں کے درمیان " باریک فرق بھی ایجاد کر لیا

عمومی طور پر یہ صراحتیں اوپر گذر چکیں کہ خلفائے راشدین نے بذات خود بھی قضاء کی خدمت انجام دی ہے اور اپنے نائبین سے بھی یہ خدمت لی ہے ۔ اب میں خصوصی طور پر حضرت عمر فاروق کے بارے میں چند صراحتیں پیش کر رہا ہوں

حضرت عمرؓ عہد رسالت میں بھی قاضی تھے ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کے سامنے منصب قضا پیش کیا ۔ ابن عمر نے ان سے درخواست کی کہ اس کام سے انہیں معاف رکھا جائے ان کی درخواست پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا : ۔

قال فان اباك كان يقضى فقال ان ابى لو اشكل عليه شيئ سال رسول الله

صلے اللہ علیہ وسلم ولو اشکل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئ سال جبریل علیہ السلام وانی لا اجد من اسالہ

حضرت عثمان نے ابن عمر سے کہا کہ تمہارے والد تو قضا کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ابن عمر نے جواب میں کہا۔ اگر میرے والد کو کسی معاملے میں مشکل پیش آتی تھی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے اور اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی معاملے میں مشکل پیش آتی تھی تو وہ جبریل علیہ السلام سے پوچھتے تھے اور میں ان میں سے کسی کو نہیں پاتا کہ اس سے پوچھ سکوں۔

{مشکوٰۃ بحوالہ رزین کتاب الامارۃ
مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور ص ۳۲۵}

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے جواب سے بصراحت معلوم ہوا کہ حضرت عمر رض عہد رسالت میں قاضی تھے اور حضور کی نیابت میں منصب قضا کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اسی مفہوم کی ایک روایت ترمذی میں بھی ہے مگر اس میں عہد رسالت کی صراحت نہیں ہے۔ صرف حضرت عمر رض کے قاضی ہونے کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عمر نے جب یہ منصب قبول کرنے سے معذرت کی تو حضرت عثمان رض نے فرمایا تھا کہ "تمہارے والد تو قضا کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔

علامہ ثناءاللہ پانی پتی رح نے سورۃ النساء آیت ۶۰ کی تفسیر میں ثعلبی ابن ابی حاتم اور بغوی کے حوالے سے حضرت ابن عباس کی یہ روایت نقل کی ہے۔

ایک منافق کا ایک یہودی سے جھگڑا ہوا یہودی نے منافق کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلنے کی دعوت دی اور منافق نے یہودی کو کعب بن اشرف کے پاس چلنے کو کہا لیکن یہودی نے انکار کیا اور اصرار کیا کہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے۔ مجبوراً وہ منافق یہودی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کیا جب وہ دونوں آپ کے پاس سے باہر آئے تو وہ منافق اس یہودی سے چمٹ گیا اور اس سے کہا کہ ہمیں عمر کی عدالت میں چلنا چاہیے وہ دونوں حضرت عمر کے پاس پہنچے۔ یہودی نے ان سے کہا میں اور یہ اپنا جھگڑا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے تو آپ نے اس کے خلاف اور میرے حق میں فیصلہ کیا لیکن یہ ان کے فیصلے سے راضی نہیں ہوا اور اب آپ کے پاس مقدمہ لایا ہے یہ سنکر عمر رضی اللہ عنہ نے اس منافق سے پوچھا کیا واقعہ یہی ہے؟ اس نے کہا ہاں حضرت عمر نے کہا اتنی دیر انتظار کرو کہ میں گھر سے باہر آؤں وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تلوار لی اور باہر آئے اور اس منافق کو قتل کر دیا اور کہا۔

ھٰکذا اقضی بین من لم یرض بقضاء اللہ وقضاء رسولہ

جو اللہ و رسول کے فیصلے پر راضی نہ ہو میں اس
کے درمیان اسی طرح فیصلہ کرتا ہوں۔"
(تفسیر مظہری ج ۲ ص ۴۵ ۴)

مولانا شبیر احمد صاحب نے بھی اپنے حاشیہ قرآن میں
یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے:۔

"اور حضرت عمرؓ آپ کے حکم سے مدینہ میں جھگڑے
فیصل کیا کرتے تھے"

اس صراحت سے واضح ہوا کہ وہ منافق حضرت عمرؓ کے
پاس یوں ہی نہیں پہنچا تھا بلکہ وہ ان کی عدالت میں مرافعہ کرنا
چاہتا تھا کیونکہ وہ حضورؐ کی طرف سے منصب قضا پر فائز
تھے۔ وہ احمق منافق یہ سمجھ رہا تھا کہ حضرت عمر اپنے مزاج کی
تیزی کی وجہ سے یہودی کے مقابلے میں اس نام نہاد مسلمان
کی حمایت کریں گے۔ رسول خدا کی عدالت نے جو فیصلہ صادر
کر دیا اس کے خلاف کسی دوسری عدالت میں مرافعہ کرنا
چونکہ ارتداد کا اعلان تھا اور حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے
اس کی سزا اس منافق کو دے دی۔ روایتوں میں آتا ہے
کہ حضرت عمر کو اسی فیصلے کی وجہ سے "فاروق" کا لقب
عطا کیا گیا تھا۔

حضرت عمر عہد صدیقی میں بھی قاضی رہے

تاریخ ابن اثیر میں ہے:۔

"وفیہا استقضی ابوبکر عمر بن الخطاب
وکان یقضی بین الناس خلافتہ کلھا"

اور اس سال ابوبکرؓ نے عمر بن الخطابؓ کو قاضی
بنایا اور خلافت صدیقی بھر قضا کا کام کرتے رہے
(صدیق اکبر" مرتبہ سعید اکبر آبادی ص ۲۲۱
بحوالہ ابن اثیر جلد ۲ ص ۲۶۰)

حضرت عمرؓ کے منصب قضا پر فائز ہونے کی ابتدا عہد
رسالت سے ہوئی اور پھر وہ زندگی بھر قضا کی خدمت انجام
دیتے رہے۔ جی ہاں۔ انہیں حضرت عمر کے بارے میں مدیر
تجلی فرماتے ہیں:۔

"حضرت عمر کبھی مسند قضا پر فائز نہیں ہوئے
انھوں نے کسی عدالت بطور قاضی اجلاس نہیں کیا
الفاظ کے غلط استعمال کی کوئی حد ہونی چاہیے گفتگو
ایک دقیق آئینی مسئلے میں ہو رہی ہے۔ آپ شاعری
فرما رہے ہیں کہ حضرت عمر کی عدالت میں مقدمہ
دائر کر دیا۔"
(تجلی دیوبند اگست ستمبر ۷۴ء ص ۶۵)

کسی چیز سے کامل ناواقفیت کے ساتھ اس طرح کے حتمی
اور ادعائی الفاظ کس طرح لوگوں کے قلم سے نکلتے ہیں اس
پر تعجب ہوتا ہے۔ کاش ہمارے دوست مدیر تجلی اپنے مزاج
کی جارحیت اور ادعائیت کم کرنے پر قادر ہوتے۔

کوئی شخص اپنے خلاف کسی مقدمے کا خود قاضی نہیں بن سکتا

عقل و شعور رکھنے والے ناخواندہ اشخاص بھی اس سے
واقف ہوں گے کہ جس شخص سے دوسرے شخص کا کسی معاملہ
میں تنازعہ ہو وہ شخص بحیثیت قاضی (جج) اس تنازعہ کا خود

فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس معقول اصول کا اس کے منصب پر متمکن فائز ہونے یا نہ ہونے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی مقدمے کا کوئی فریق اس مقدمے کا قاضی نہیں بن سکتا خواہ وہ بذات خود قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہی کیوں نہ ہو لیکن جناب مدیر تجلی لکھتے ہیں:۔

"وہ خود اپنا مقدمہ لیکر قاضی کی عدالت میں جایا کرتے تھے۔ اگر امیر المومنین ہونے کی بنا پر وہ ان زمات سے مستغنی بھی ہوتے تو کہیں اور مقدمہ کیوں لے جاتے۔" (تجلی ص۶۵)

محترم مدیر تجلی یہ نہیں سوچ سکے کہ کسی قاضی کی عدالت میں مقدمہ لے جانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ خلفائے راشدین خود قاضی نہ تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس تنازع کا ان کی ذات سے تعلق ہوتا اور وہ اس کے ایک فریق ہوتے اس کا فیصلہ خود نہیں کر سکتے تھے۔ خلفائے راشدین میں سے کوئی بھی کسی دوسری عدالت میں ایسا کوئی مقدمہ نہیں لے گئے جس کا ان کی ذات سے تعلق نہ ہو۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ اور ایک یہودی کے درمیان زرہ کے معاملہ میں جو نزاع ہوئی تھی اس کا فیصلہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ مقدمہ ایک دوسرے قاضی کی عدالت میں لے گئے۔

مدیر تجلی منصب خلافت کی ذمہ داریوں سے ناواقف سہی لیکن یہ اتنی موٹی بات ہے کہ ان پر میری تغلیط و تردید کا جذبہ مستولی نہ ہوتا تو وہ اس کو سمجھ سکتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ طلاق کے مسئلے میں حضرت عمرؓ کے فیصلے کی جو نظیر میں نے پیش کی اس کو پڑھ کر وہ گھبرا گئے اور جو کچھ جی میں آیا لکھتے چلے گئے۔

اس مضمون کا مقصد

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے اس مضمون کی اصل غرض مدیر تجلی کو جواب دینا نہیں ہے بلکہ اصولی طور پر صرف یہ واضح کرنا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی ایک اہم ذمہ داری خصومات و نزاعات کا فیصلہ کرنا بھی ہے اور اسلامی مملکت کے تمام قاضی اس کام میں اس کے نائب اور خلیفہ ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ خلفائے راشدین اپنے وقت کے سب سے بڑے قاضی بھی تھے۔ ان کے عدالتی فیصلے کتب احادیث و فقہ و تاریخ و سوانح اور منصب خلافت و امامت سے متعلق کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر ان سب کو تفصیل کے ساتھ یکجا کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔

تھائی لینڈ میں مسلمان

(محمود الازہار ندوی۔ ایم اے)

فطان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ملتی تھی ان کی تاریخ و ثقافت مستقل خصوصیات کی حامل تھی لیکن ۱۸۳۲ء میں تھائی لینڈ نے قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر زندگی دوبھر کر دی مدرسے بند کر دیے۔ اسلامی نام رکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ عربی رسم الخط پر پابندی لگا دی۔ مسلم لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا لیکن اب وہ اپنا وجود قائم رکھنے، حق و انصاف اور آزادی حاصل کرنے کے لیے حکومت سے برسرپیکار ہیں

تھائی لینڈ میں بدھسٹ اکثریت میں

تھائی لینڈ جنوب ایشیا کا ملک ہے۔ لاؤس، کمبوڈیا، برما اور ملیشیا کے درمیان واقع ہے۔ سرکاری مذہب بدھ ہے آبادی ۴ کروڑ کی ہے اور مسلمان دس فی صد ہیں۔ عیسائی نصف ملین سے زائد نہیں ہیں۔ دوسرے مذہب بہت ہی کم ہیں اور بودھسٹ اکثریت میں ہیں۔ راجدھانی بنکاک ہے جہاں دو لاکھ مسلمان ہیں۔

فطانی ریاست

تھائی لینڈ کا جنوبی حصہ فطان کہلاتا ہے اور اسی نام سے فطانی مسلم قوم منسوب ہے نسلاً ملیشیائی ہیں۔ مذہب اسلام اور وطن فطان ہے آبادی ۳۰ لاکھ ہے یعنی آبادی کی ۹۰ ٪ ہے۔ دس فیصد تھائی النسل ہیں فطان پانچ اسلامی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ یالا، نلبسا، ناراتیوات، شینناک، فطان۔ رقبہ ۱۲۰۰۰ مربع میل ہے۔ ان سب پر اس وقت تھائی حکومت کا قبضہ ہے۔

حدود اربعہ اور برآمدات

فطان کے جنوب میں ملیشیا، شمال میں تھائی لینڈ، مشرق میں بحر چین اور مغرب میں بحر اندیمان ہے جو بحر ہند سے ملا ہوا ہے۔ برآمدات میں ربڑ، لکڑی، چاول، نمک، لوہا اور معدنی اشیاء ہیں، مونگ پھلی، کھی اور سونا ہے۔ فطان دنیا کے

تین بڑے ربڑ برآمد کرنے والے ملکوں میں سے ہے۔ ۳۰۰۰۰ ٹن ربڑ برآمد کرتا ہے

ریلوے لائن، سڑکیں اور ہوائی اڈے سونگکلا اور ہادیائی میں ہے۔ فطان کی گودی اسی علاقہ میں اہم اور بڑی مانی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت زراعت کرتی اور جانوروں کو پالتی ہے اور بہت کم تعداد تجارت کرتی ہے۔

تھائی لینڈ کا قبضہ

مملکت فطان کی الگ حکومت تھی۔ ۱۸ سلطان ہوئے سولھویں صدی عیسوی اس مملکت کا عروج کا زمانہ تھا۔ تھائی لینڈ نے ۱۸۳۲ء میں طویل جنگ کے بعد قبضہ کر لیا اور اپنی مملکت میں ضم کر لیا۔

فطان، مسلم تھائی لینڈ ہوگیا۔

تھائی لینڈ کے تسلط اور طاقت کے بل پر حکومت کے زمانے میں فطان کی مسلم قوم اپنے ملیشیائی بھائیوں سے الگ ہوگئی اور تمام رشتے منقطع ہوگئے اور حکومت تھائی لینڈ نے ملیشیائی قوم کا اتحاد نہ ہونے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالی اور مسلم فطان، مسلم تھائی لینڈ کا نام دیا کیونکہ تھائی لینڈ بودھ مذہب کی پیرو ہے اور اس طرح تھائی حکومت نے فطانی (لفظ) اور ملیشیائی عنصر کو ختم کر دیا اور آخیر میں اس نے اس علاقے کو ایک نئے نام "کیک فنو مبا نغ" رکھ دیا جس کے معنے در اندازکے ہیں اور اس طرح ملک کی اصلی آبادی تھائی قوم بودھسٹ مان لی گئی اور مسلمان خارجی کہلائے۔

نسل، قوم، زبان، مذہب، ثقافت الگ ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ فطانی قوم ملیشیائی نژاد ہے مسلمان ہیں۔ تھائی قوم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے نہ نسلاً ہی ایک ہیں، نہ زبان اور ثقافت کے اعتبار ہی سے اور نہ عادات و اطوار ہی یکساں ہیں اور نہ مذہب ہی میں مماثلت ہے۔ تھائی قوم اپنا سلسلہ نسب مغل نسل سے جوڑتی ہے۔ ان کی زبان الگ اور مذہب بودھ ہے۔

فطان تھائی لینڈ کا ایک حصہ تسلیم کر لیا گیا

بیسویں صدی کی ابتدا میں فطانی سلاطین نے جبکہ وہ برطانیہ کی نوآبادی تھی، ملیشیا سے الحاق کرنا چاہا اور بودھ سرکار سے جان چھڑانی چاہی کیونکہ دونوں ایک ہی نسل اور مذہب کے پیرو تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ۱۹۰۹ء میں فطانی وحدت کے متعلق تھائی حکومت سے ایک معاہدہ کر لیا جس سے فطان تھائی لینڈ کا ایک جزو بن گیا۔

تھائی مسلمانوں کا شدید ردعمل

تھائی مسلمانوں نے اس معاہدے کو تسلیم نہیں کیا اور باطل کہہ کر رد کر دیا اور کہا برطانیہ کو تھائی لینڈ کا ایک حصہ تسلیم کرنے کا نہ کوئی حق ہے اور نہ جائز ہے فطانی اپنے ملک کے خود مالک ہیں اور اپنی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ بات دونوں ملکوں کے لیے واضح تھی کہ فطانی کسی بھی صورت میں راضی نہ ہوں گے اور نہ تسلیم کرنے کے حق میں ہیں۔

سرکاری مذہب بودھ ہے   بودھ مذہب تھائی

کا سرکاری مذہب ہے اور اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ۱۹۴۱ء میں تھائی ذمہ داروں نے مسلمانوں کے رہے سہے اثرات اور انفرادی حقوق، شرعی قاضی کی جگہ ختم کر دی۔ عقدِ نکاح اور وراثت جیسے دینی معاملات کو ختم کر دیا۔

اسلامی قوانین کے اجراء کا مطالبہ

۱۹۴۶ء میں حکومت نے ایک خاص کمیٹی مقرر کی جس کے ذمہ مسلم علاقوں میں دینی مدارس اور کالجوں کی نگرانی کا کام سونپا گیا۔ اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا اور ایک وفد لیکر اپنے مطالبات حکومت کے سامنے عرضداشت کی شکل میں پیش کیے۔ اس میں اسلامی احکام کا اجراء اور خاص طور پر عقد، شادی، طلاق اور وراثت وغیرہ کو باقی رکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

مسلمانوں سے سخت رویہ

۱۹۴۷ء میں بسول سونگرام نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور اسلام کے معاملے میں سخت رویہ اختیار کیا اس کے خلاف مسلمانوں نے برطانوی ذمہ داروں کے سامنے ایک احتجاجی مراسلہ بھی بھیجا جس میں مسلمانوں کی خراب حالت اور مسلم علاقوں کی آزادی شامل تھی۔

اسی سال الحاج محمد سلیمان بن عبدالقادر جو الحاج سونگ گے نام سے مشہور ہیں۔ حکومت کے سامنے ایک منصوبہ کا خاکہ پیش کیا اور مسلم علاقوں میں مسلم صدر اور شریعت اسلامی کی بنیاد پر اسلامی قانون بنانے کا مطالبہ کیا۔

مسلمان لیڈروں پر مظالم

۱۹۴۸ء میں تھائی حکومت نے الحاج محمد سلیمان عبدالقادر کو گرفتار کر لیا گیا اور عدالت نے تین سال قید سخت کی سزا دی اور فطانی مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے کیے اور الحاج محمد سلیمان بن عبدالقادر کے خلاف الزام پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کیا۔ تب ۲۸ اپریل ۱۹۴۸ء حکومت نے اپنا فیصلہ عوام کے سامنے ظاہر کیا۔

تنظیم کا قیام

ملیشیا میں تنکو محمود محی الدین نے فطانی مسلمانوں کی و تعارف کے لیے۔ گمبار منظمہ حرکۃ فطانی الکبریٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم نے اپنی شکایتیں اقوام متحدہ پیش کیں اور تھائی حکومت کے غیر منصفانہ برتاؤ کے خلاف مدد چاہی۔

آزادی کا مطالبہ

وقت گذرا اور حالات بدلے۔ فطانیوں نے میثاق اٹلانٹک فصل ثالث کی رو سے آزادی کا مطالبہ کیا کہ اس میں قوموں کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے بنیادی حق کا احترام لازمی ہے۔

۱۹۵۲ء میں الحاج محمد سلیمان آزاد ہو گئے لیکن زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے۔ آزادی کے صرف دو سال بعد ۱۲ ۱۹۵۴ء کو شہید کر دیے گئے۔

مسلح بغاوت

فطانی تھائی حکومت کا اچھی طرح مقابلہ کر رہے ہیں

۱۹۷۶ء میں تھائی سرکار کے خلاف مسلح بغاوت پھوٹ پڑی اور الحاج یوسف کمائی کی قیادت میں ۱۹۷۶ء تک جاری رہی لیکن اب فطانی قوم سخت کش مکش کا شکار ہے

حکومت کے خلاف گوریلا جنگ

تھائی سرکار کے ذمہ داروں نے الحاج یوسف اور دوسرے لیڈروں کو گرفتار کرنا چاہا اور اس کے لیے فوجی کارروائی بھی کی اس کے بعد مسلمانوں نے ایک قومی جماعت قائم کی جس کا مقصد فطان کی آزادی کے لیے کوشش کرنا تھا۔ الحاج ادریس گوریلا جنگ کے قائد منتخب ہوئے الحاج ادریس نے مسلمانوں سے کہا۔ آزادی پھولوں کی سیج پر نہیں ملتی ہے بلکہ بموں کے دھماکوں اور قربانی کے لاشوں پر حاصل ہوتی ہے اور جنوب ایشیا میں امن سکون اور اطمینان فطانی مسئلہ کو بغیر حل کیے نہیں ہو سکتا ہے ورنہ جنوب ایشیا بے چینی اور سیاسی کش مکش کا آماجگاہ بنا رہے گا۔

تھائی حکومت نے ملیشیا اور انڈونیشیا پر فطانیوں کو بغاوت پر اکسانے اور مدد کرنے کا الزام لگایا جبکہ فطانی قوم پرست اسی قسم کی امداد کے متعلق کچھ جانتے تک نہیں تھے جبکہ فطانی خود چاہ رہے تھے کہ کاش یہ الزام صحیح ہوتا۔ کیونکہ بغاوت کو مزید طاقتور بنانے کے لیے خارجی امداد درکار ہوتی ہے۔ الحاج یوسف نے ایک نشری تقریر کے ذریعے ان تمام الزامات کا نفی میں جواب دیا اور کہا انڈونیشیا اور ملیشیا کو تھائی سرکار کے خلاف ملوث نہیں کرنا چاہتا ہوں ہم کو ان ملکوں کا موقف اور تھائی حکومت سے تعلقات کا بخوبی علم ہے۔ ہم کمیونسٹ نہیں ہیں بلکہ ہم تو کمیونسٹوں کے سخت دشمن ہیں۔ ہم صرف آزادی کا مع حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مسلم نام رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

جنوری ۱۹۶۰ء میں تھائی گورنمنٹ نے اسلامی مدرسوں اور درسگاہوں پر قبضہ کر لیا اور حکومت کے کنٹرول میں لے لیا۔ اسی طرح عربی رسم الخط کو بدل دیا اور وہ تمام کتابیں جو طلبا کو تھائی وزارت تعلیم کی جانب سے تھائی رسم الخط میں اسلامی مدرسوں میں مسلم طلبا کو پڑھائی جاتی تھیں بدل دی گئیں اور مدرسوں میں داخلہ کے لیے مسلم نام کی جگہ بودھ نام سے موسوم ہونا لازمی قرار دے دیا اور اسی طرح سرکاری اداروں میں بغیر بودھ نام لکھائے نوکری نہیں مل سکتی ہے۔

اقوام متحدہ کی اپیل

۱۰ نومبر ۱۹۷۰ء کو فطانی لیڈروں نے اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری او تھانٹ کو ایک توجہ نامہ بھیجا اور اس وقت اپنے قیام کی ۲۵ ویں سالگرہ منا رہی تھی۔ فطانیوں نے اسی موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اقوام متحدہ کی نظر فطانی مسلمانوں کی حالت زار کی طرف مبذول کرائی اور ایک قرارداد کے ذریعے قوموں کو اپنا وجود قائم رکھنے کی اجازت دی گئی اور اسی طرح میثاق اقوام متحدہ نے محکوم قوموں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے حق کو تسلیم کر لیا۔ فطان بھی کسی نوآبادی

سے کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سکریٹری جنرل سے تھائی سرکار کے ہاتھوں فطانی قوم کا اجتماعی قتل عام روکنے کا مطالبہ کیا گیا

مسلمانوں پر سخت پابندیاں لگا دی گئی ہیں

فطانی مسلمان تھائی لینڈ سے اپنے حقوق، دین اور عقیدہ کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اپنی نسلی خصوصیات مذہبی روایات اور قومی اثرات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن تھائی سرکار نے ان پر سخت پابندیاں لگا دی ہیں اور آئے دن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تھائی زبان کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ اسلامی مدرسے بودھسٹ تربیت گاہوں میں بدل دیے گئے ہیں یا بند کر دیے گئے ہیں۔ جدید اسلامی مدرسے کھولنے پر پابندی ہے۔ بودھ بھکشو اسکولوں اور کالجوں میں درس و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اسلامی ناموں کو بودھ ناموں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مسلمان لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے بودھوں کو مسلم علاقے میں سکونت کی غرض سے اور مسلمانوں کو بودھوں کے علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ مسلم علاقوں میں بودھ مندر قائم کیے جا رہے ہیں۔ باہر سے آنے والے مسلم صحافیوں کو مسلم علاقوں کی زیارت اور مسلم لیڈروں سے ملاقات پر پابندی لگا دی ہے۔ مسلم طلبا کو تعلیم کے معاملے میں سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا ہے۔ سرکار نے تو مدرسوں پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیبیا، سعودی، سوڈان، تونس، عراق، پاکستان، مصر اور انڈونیشیا میں طلبا ایک تعداد زیر تعلیم ہے لیکن یہ سہولت بالکل ہی ناکافی ہے



رسائل و مسائل

رضائے الٰہی اور جنت

خط

ایک صاحب علم نے قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بتایا کہ مومن اپنی زندگی میں اللہ کی راہ میں جو کوشش کرتا ہے اس کا اصل مقصود "جنت" ہونا چاہیے نہ کہ رضائے الٰہی۔ وہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اپنی جدوجہد کا مقصود رضائے الٰہی کو بنایا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ رضائے الٰہی مقصود اصلی نہیں بلکہ ذریعہ ہے مقصود اصلی کا۔ آیات کی روشنی میں براہ کرم یہ بتائیے کہ رضائے الٰہی کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کوئی حسی مظہر ہوگا جو اس کے حاصل کرنے والے محسوس کریں گے۔ انسان کس شکل میں اس کا ادراک کرے گا؟ قدر و قیمت اور فضیلت کے لحاظ سے جنت کو مقصود بنانے اور رضائے الٰہی کو مقصود بنانے میں کیا فرق ہے؟

اگر رضائے الٰہی کو ذریعہ اور جنت کو حاصل مطلب سمجھا جائے تو عقیدۃً کیا فرق پڑتا ہے؟

اپنا جواب زندگی میں بھی شائع کر دیں تاکہ دوسرے لوگ بھی فائدہ حاصل کریں اور جو الجھن پیدا کر دی گئی ہے وہ دور ہو۔

جواب

مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کے یہاں ایک تنظیم جنت کو مقصود اصلی اور رضائے الٰہی کو اس کے حصول کا ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اس تنظیم کے سربراہ (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) نے لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ مومن کا مقصد حیات نہ عبادت ہے اور نہ رضائے الٰہی کا حصول، کیونکہ یہ مقصود اصلی کو حاصل کرنے کا ذریعہ اور سبب ہیں خود مقصود نہیں۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تمام آیات کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ بعض آیات پر نظر جما لی گئی ہے۔ قرآن اور احادیث سے استفادے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی موضوع سے متعلق تمام آیات اور تمام

احادیث کو سامنے رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو غلط فہمی لازمی ہے۔ صحیح جواب تک انسان پہنچ ہی نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص بھی سمجھ کر قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ یہ پائے گا کہ قرآن نے رضائے الٰہی کے حصول ہی کو مومن کی تمام جدوجہد کا آخری ہدف اور حقیقی مقصود قرار دیا ہے لیکن اس کے لیے مختلف اور متعدد تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ کہیں ابتغاء مرضات اللہ کی تعبیر ہے اور کہیں ابتغاء رضوان اللہ کی۔ کہیں اس کو ابتغاء وجہ اللہ کہا گیا ہے اور کہیں آخرت کی کامیابی سے اس کی تعبیر کی گئی ہے۔ کہیں طلب جنت کی ترغیب دی گئی ہے اور کہیں جہنم سے استعاذے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ان تمام تعبیرات کا مقصود اصلی صرف ایک ہے اور وہ ہے آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول جنت کو مقصود اور اپنے اعمال خیر کی غرض و غایت بنانا۔ رضائے الٰہی کو مقصود بنانے سے کوئی متضاد اور مختلف شے نہیں ہے بلکہ رضائے الٰہی مقصود ہے اور جنت اس کا انعام۔ یہ انعام اسی کو ملے گا جس سے اللہ راضی اور خوش ہوگا اور جس سے اللہ راضی ہوگا اس کو جنت ضرور ملے گی کیونکہ اللہ نے اپنے فرماں بردار بندوں سے اس کا وعدہ کیا ہے۔

میں یہاں رضائے الٰہی کو مقصود و مطلوب بنانے کے سلسلے کی چند آیتوں کے ترجمے نقل کرتا ہوں۔ مناسب ہوگا کہ قارئین زندگی ان آیتوں کے الفاظ قرآن میں پڑھ لیں۔

ابتغاء مرضات اللہ

(۱) اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ (البقرۃ: ۲۰۷)

(۲) جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر کوئی باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔ (البقرۃ ۲۶۵)

(۳) اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ (نساء ۱۱۴)

ابتغاء رضوان اللہ

(۱) تم انہیں رکوع اور سجدے کرتے ہوئے دیکھو گے (وہ اس حال میں) اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں۔ (الفتح آخری آیت)

ابتغاء وجہ اللہ

(۱) ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا طلب کرتے ہوئے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو

بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہیں لوگوں کے لیے ہے۔ (رعد: ۲۲)

اس آیت نے صراحت کے ساتھ بتایا کہ صبر ہو یا اقامت صلوٰۃ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو یا برائی کو بھلائی سے دفع کرنا ان چیزوں کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہے اور جن لوگوں کو اللہ کی رضا حاصل ہوگی انہیں کو آخرت کی کامیابی نصیب ہوگی۔

(۲) اور جو لوگ اپنے رب کو دن رات پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔
(انعام: ۵۲)

(۳) وہ خود کھانے کی رغبت و محبت رکھتے ہوئے محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کو کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے اس کا نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری۔ ہم اپنے رب سے ڈرتے ہیں ایک ایسے دن سے جو بڑا اداس اور سخت ہوگا
(دہر: ۸ تا ۱۰)

دیکھیے ان آیتوں میں ایک طرف رضائے الٰہی کی طلب ہے اور دوسری طرف قیامت کا خوف ہے یعنی رضائے الٰہی کی طلب اور عذاب آخرت سے بچنے کا جذبہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

(۴) اور عنقریب جہنم سے اسے بچا لیا جائے گا جو سب سے زیادہ متقی ہے، جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دیا جائے (بلکہ وہ مال خرچ کرتا ہے) اپنے رب اعلیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔ (اللیل: آخری آیات)

اب تک جن آیتوں کے ترجمے نقل کیے گئے ہیں انہیں پڑھ کر کیا کوئی صاحب علم اس کا خیال بھی کر سکتا ہے کہ مومن کی جدوجہد کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول نہیں ہے! لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ایسے صاحبان علم موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کو مقصود بنانا غلط ہے۔ اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ انھوں نے تمام آیتوں کو سامنے نہیں رکھا، بلکہ بعض آیتوں پر نظر جما دی۔

آخرت کی کامیابی

قرآن نے ایک جگہ بڑے جامع انداز میں یہ بتایا ہے کہ آخرت کی کامیابی کیا چیز ہے

"ہر متنفس موت کا مزا چکھنے والا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہی کامیاب ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔ (آل عمران: ۱۸۵)

ظاہر ہے کہ جہنم سے وہی شخص دور رکھا جائے گا اور بہشت میں وہی داخل ہوگا جس سے اللہ راضی ہوگا اور جسے رضائے الٰہی کی نعمت بے بہا حاصل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ

قرآن میں جنت کو اللہ کی رحمت سے بھی تعبیر کیا گیا۔

رہے وہ لوگ جن کے چہرے (قیامت میں)
روشن ہوں گے تو انہیں اللہ کی رحمت میں جگہ ملے
گی اور ہمیشہ وہ اسی میں رہیں گے۔ (آل عمران ۱۰۷)

یہاں "رحمۃ اللہ" جنت ہی کو کہا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے :۔

"یعنی انہیں جنت میں جگہ ملے گی اور اس میں
وہ ہمیشہ رہیں گے کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے"

اس کی تائید اس صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تک اللہ مجھے اپنی مغفرت و رحمت سے ڈھانک نہ لے میں بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن میں جنت کو "اللہ کا فضل" بھی کہا گیا ہے۔

دوڑو اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف
جس کا پھیلاؤ آسمان و زمین کے پھیلاؤ کی طرح ہے
اور یہ جنت ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ
اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یہ اللہ کا فضل
ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے
فضل والا ہے۔ (حدید: ۲۱)

اس آیت سے اس حقیقت پر پوری روشنی پڑتی ہے کہ جب تک اللہ کی مغفرت، رحمت، فضل اور اس کی رضا شریک حال نہ ہو تو کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔

اس آیت پر اس پہلو سے غور کیجیے کہ اس میں ایک طرف اللہ کی مغفرت اور جنت کی طرف لپکنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جنت جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے اور دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا کرے۔ معلوم ہوا اصل چیز اللہ کا کرم ہے۔ اس آیت کے ساتھ سورہ (فتح) کی وہ آیت پڑھیے جس میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

"تم انہیں رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے (وہ
اس حال میں) اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے
رہتے ہیں"

اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ہی مقصود ہے۔ جنت اس اصل کی فرع اور اس کا پھل ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی مقصود اصلی نہیں ہے وہ بالکل غلط اور الٹی بات کہتے ہیں۔ قرآن نے اللہ کی رضا جنت سے بڑی چیز قرار دیا ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے :۔

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے
جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں
وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور جاوداں بہشتوں میں نفیس
مسکنوں کا وعدہ کیا ہے اور اللہ کی رضا ان سب سے
بڑی ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے"
(توبہ: ۷۲)

دور کرنے کے لیے قرآن نے نوع بنوع انداز میں بالفاظ صریح یہ اعلان کیا ہے کہ خدا کے وفا داروں اور باغیوں کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ خدا کے نزدیک عزت والے، کامیاب و بامراد اور اس کے محبوب وہ لوگ ہیں جو پرہیزگار اور اس کے وفا دار ہوں۔ کہیں اس نے مسلم و مجرم یا مومن و فاسق کے الفاظ استعمال کر کے ان دونوں کے درمیان عدم مساوات کا اعلان کیا ہے۔ کہیں اس نے فرماں بردار کو بینا اور نافرمان کو اندھا اور کہیں زندہ و مردہ اور کہیں طیب و خبیث کہہ کر یہ بتایا ہے کہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کہیں اس نے استفہام انکاری کے انداز میں ان دونوں فریقوں کی نابرابری واضح کی ہے۔ غرض مختلف اسالیب بیان سے یہ بات اچھی طرح کھول دی ہے کہ بحیثیت نسل، مساوی ہونے کے باوجود عقیدہ و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان عظیم تفاوت موجود ہے۔ نہ ان کی زندگیاں یکساں ہیں اور نہ ان کی موت یکساں، خدا کے وفادار اور باغی دنیا میں بھی دو فریق ہیں اور آخرت میں بھی دو فریق ہوں گے۔

فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (الشوریٰ)

(اس دن ایک فریق بہشت میں ہوگا اور دوسرا فریق دوزخ میں)

اگر قرآن ایسا نہ کرتا تو پھر اس کا نزول ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا کیونکہ وہ تو اترا ہی اس لیے ہے کہ اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کو وفادار و فرماں بردار بنائے اور انہیں انکار حق، بغاوت اور نافرمانی کے انجام بد سے خدا کے دنیا ... بتلاتا ہے۔ اگر ایمان اور عمل صالح ... کے ساتھ

نہ ہو اور خدا کا باغی حقیر چوپائے سے بھی بدتر ہے۔ اگر اپنی بغاوت سے باز نہ آئے۔ میں یہاں چند ذیلی عنوانات کے تحت قرآن کی آیتوں کے ترجمے نقل کرتا ہوں۔

مومن و فاسق کے درمیان مساوات نہیں ہے

۱۔ بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے

(السجدہ: ۱۸)

۲۔ اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائے اور ایمان دار و صالح اور بدکار برابر ٹھیریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔ (المومن: ۵۸)

۳۔ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندہ اور مردے مساوی ہیں۔

(فاطر: ۱۹ تا ۲۲)

۴۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے سننے والا کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے (ہود: ۲۴)

۵۔ اہل دوزخ اور اہل جنت برابر نہیں ہیں۔ اہل جنت ہی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ (الحشر: ۲۰)

۶۔ کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں جیسا کر دیں تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو (القلم: ۳۵-۳۶)

۷۔ کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے

تھے۔ ابوالصہباءؓ نے ان سے سوال کیا تھا اور جواب میں انھوں نے ان کی تصدیق کی تھی ؟۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ طاؤسؒ کی روایت میں جو بات کہی گئی ہے وہ ایک مسلسل واقعہ کا اظہار ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کی روایت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طاؤسؒ کی حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت انتہائی شاذ ہے اور اس کے عجیب وغریب ہونے کا اعتراف مسلم شریف کی تیسری روایت میں خود موجود ہے۔ جب کہ ابوالصہباءؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا تھا "هَاتِ مِنْ هَنَاتِكَ" اس جملے کی تشریح نووی نے اپنی شرح مسلم میں اور علی بن سلیمان نے "وشی الدیباج" میں یہ کی ہے "ای اخبارک وامورک المستغربہ" یعنی ابوالصہباءؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا تھا کہ اپنے غریب ونادر اخبار وامور میں سے بتایئے کہ کیا تین طلاقیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کے زمانے میں ایک نہ تھیں ؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابوالصہباءؓ کو خود اعتراف تھا کہ یہ بات حضرت ابن عباسؓ کے سوا اور کسی کے علم میں نہیں ہے۔ جو لوگ طاؤسؒ کی روایت سے استدلال کر کے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں وہ معلوم نہیں "هَاتِ من هناتك" کی کیا توجیہ کرتے ہیں۔ میں نے اس روایت سے استدلال کرنے والوں کے جو مضامین پاکستان میں پڑھی ہیں ان میں کسی میں اس جملے کی توجیہ نظر سے نہیں گزری۔ البتہ یہ دیکھا کہ مسلم کی اس تیسری روایت کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

ایک اور بات جو طاؤسؒ کی اس روایت کے بارے میں خلش پیدا کرتی ہے یہ ہے کہ خود اس واقعہ کے راوی حضرت ابن عباسؓ نے اس کے خلاف فتوے دیئے ہیں اور ان کے اکثر شاگردوں نے ان سے یہی نقل کیا ہے کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین ہی ہونے کا فتویٰ دیتے تھے، (۱) سعید بن جبیرؓ (۲) عطاء بن رباحؒ (۳) مجاہدؒ (۴) عمرو بن دینارؒ (۵) مالک بن الحارثؒ (۶) محمد بن ایاس (۷) معاویہ بن ابی عیاشؓ۔ یہ سب کے سب ان سے یہی نقل کرتے ہیں کہ وہ تین یکجائی طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے تھے۔ امام بیہقی نے سند کے ساتھ ان کی روایتیں سنن بیہقی میں درج کی ہیں اور ابوداؤد نے بھی سنن ابوداؤد میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی ابن عباسؓ کے متعدد شاگردوں کے نام لکھ کر کہا ہے کہ یہ سب ان سے تین طلاق کے تین ہی ہونے کی روایت کرتے ہیں

(۱) یہ حضرت ابن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں ان کے متعلق محدثین نے لکھا ہے کان اعلم التابعین بالطلاق سعید بن جبیر تابعین میں مسائل طلاق کے سب سے بڑے عالم سعید بن جبیر